اسے دوام بخشیں ؟

کیا ممکن ہے اسلام یہ چاہتا ہو کہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے — تمام مقدسات ونوامیس الٰہی کی توہین کو دیکھتے رہیں اور سانس تک نہ لیں کیا فکر سلیم ایسی باتوں کو قبول کرتی ہے ؟

جو شخص بھی قرآن سے سروکار رکھتا ہے، اگر اپنی طبع سلیم کی طرف رجوع کرے تو بخوبی جان لے گا کہ اسلامی منطق اور خداوند عالم کا منشاء ظالم سے سازباز، اس کے ظلم کے مقابلہ میں لاتعلقی اور چپ سادھنا نہیں ہے ۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم یہ دیکھیں کہ بعض روایتیں ایسے ناقابل قبول مفہوم کی حامل ہوں ۔ اور وہ از لحاظ سند قابل اعتقاد ہوں، تو ان کی درست توجیہ کرنی چاہئے اور اگر وہ روایتیں توجیہ کے قابل بھی نہ ہوں تو ائمۂ معصومین علیہم السلام کے حکم کے مطابق ان کے مفاہیم کے ادراک کو خود ان کے حوالہ کر دینا چاہئے ۔

یہ تو اس طرح کی روایتوں کا اجمالی جواب تھا اب تفصیلی جواب سنئے ۔

اس موضوع کے متعلق وہ روایتیں جن سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے مرحوم شیخ حر عاملی کی کتاب "وسائل الشیعہ" اور مرحوم حاجی نوری کی "مستدرک الوسائل" کتاب جہاد باب "حکم خروج السیف قبل قیام القائم" سے — اور ایک روایت مقدمۂ صحیفۂ سجادیہ سے بھی نقل کی گئی ہیں ۔

ان روایتوں کی کیفیت کو واضح کرنے کے لئے بہتر ہے کہ ان کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ پہلے یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کتنی روایتیں اس طرح کا دعویٰ کرنے والوں سے ربط رکھتی ہیں اور وہ روایتیں بھی سند و دلالت اور قابل توجیہ ہونے کی حیثیت سے کیسی ہیں ۔

ان روایتوں کی چند قسمیں ہیں ،

الف : وہ روایتیں جن کا مطلب — مسلحانہ اقدام کی حرمت ہے یعنی ظہور امام زمانہؑ سے پہلے تلوار لے کر — خروج و تحریک ، خود تحریک کے بانیوں کو طاغوت ثابت کرتی ہیں ۔ مثلاً — یہ روایتیں :-

۱۔ عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال: کل رایۃ ترفع او قال

تخرج قبل رایۃ القائم علیہ السلام فصاحبہا طاغوت![1]

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ ہر وہ پرچم جو امام قائم علیہ السلام کے پرچم سے پہلے بلند کیا جائے (یا ظاہر کیا جائے گا) اس کا بلند کرنے والا طاغوت ہوگا!

۲۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال: کل رایۃ ترفع قبل قیام القائم فصاحبہا طاغوت یعبد من دون اللہ عزّ وجل۔[2]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ہر وہ پرچم جو قائمؑ کے ظہور کے پہلے بلند کیا جائے گا اس کا اٹھانے والا طاغوت اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والا ہوگا۔

گویا اس طرح کی روایتیں امام زمانہؑ سے پہلے کی ہر تحریک و اقدام کو رد کرتی ہیں۔

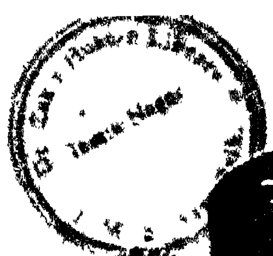
ان روایات سے متعلق پہلا جواب:

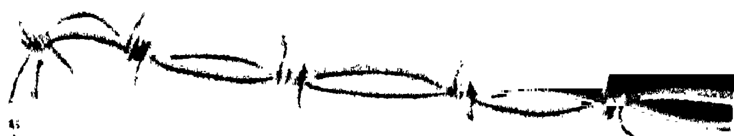
ان روایتوں میں قائم علیہ السلام کے قیام و ظہور سے پہلے بلند کئے جانے والے پرچم سے مراد (اس قرینہ کے ساتھ کہ اس کا بلند کرنے والا طاغوت یعنی خدا کے مقابلے میں بہت زیادہ طغیان کرنے والا ہے) وہ پرچم ہے، جو خدا و رسول و امام کے مقابلہ میں بلند کیا گیا ہو اور اس پرچم کا مالک لوگوں کو اپنی طرف بلائے۔ بنا بر ایں ایسے فقیہ کو جو امام زمانہؑ علیہ السلام کی نیابت میں، ان ہی کی عطا کردہ ولایت و اختیارات کے سہارے اقدام کرتے ہوئے اس امام برحقؑ کے پرچم کو بلند کرے، اسے نہ ان حدیثوں کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے طاغوت کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی روایات حق پرست تحریکوں پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور اس کی بہترین گواہ زید شہید فرزند امام زین العابدینؑ کے لئے امام صادق و امام رضا علیہما السلام کی تائیدات ہیں۔ جبکہ جناب زید شہید نے ظہور قائمؑ سے پہلے اپنی تحریک شروع کی تھی۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں (ہر اقدام کو زید کے اقدام پر قیاس نہ کرو) زید مرد عالم، دانشمند اور راستگو تھے۔ انہوں نے کبھی لوگوں کو اپنی طرف نہیں بلایا

[1] مستدرک الوسائل ۲/۲۴۸ نقل از غیبت نعمانی [2] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۷ نقل از روضہ کافی

توحی





اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

توحید

جلد ۴، شمارہ ۱، جمادی الاوّل۔جمادی الثانی ۱۴۰۷ھ / جنوری۔فروری ۱۹۸۷ء

مقاصد

کلمة التوحید
و
توحید الکلمہ

- قرآن وسنت وسیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی وعملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق ومغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری وسماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر وصاحبان قلم سے
تعاون کی آرزو ہے۔

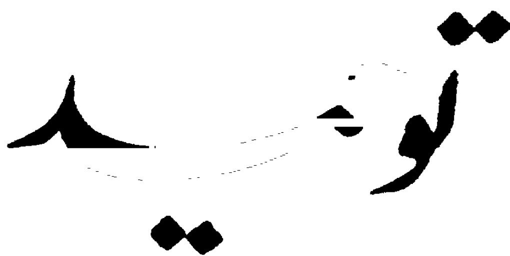
بدل اشتراک

ملک	فی مجلد
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی، نبش فرصت
تہران۔جمہوری اسلامی ایران

مدیر: علی حسین رضوی



اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد ۴ شمارہ ۱

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

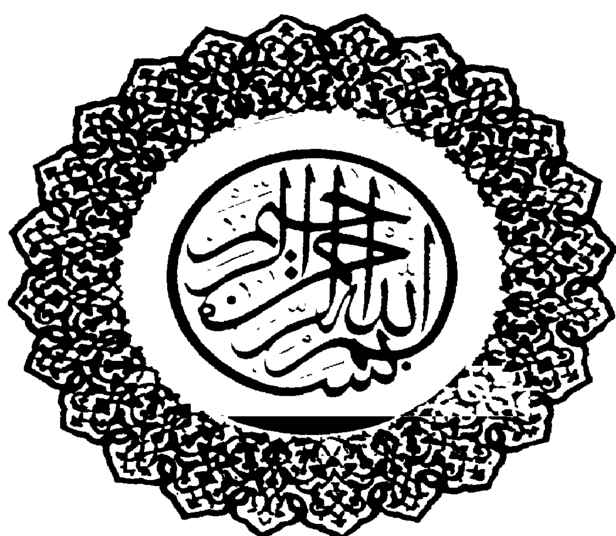
فون : ۲۴۵۸۴



جمادی الاول - جمادی الثانی ۱۴۰۷ھ / جنوری - فروری ۱۹۸۷ء

فکر و فلسفہ

فقہ و قانون


بسم الله الرحمن الرحيم

شذرہ

اسلامی سیاست ۔ چند جھلکیاں

فکر و عمل، انسان کا خاصہ ہے، نسل آدم کا یہ امتیاز ہے کہ اس کا ہر عمل، ایک مخصوص فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فلاسفہ نے فنی رنگ دیتے ہوئے، اسی فکر و عمل کو شائستہ بنا کر حکمت کا لباس عطا کیا اور اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، حکمت نظری اور حکمت عملی۔ حکمت عملی بھی تین حصوں میں تقسیم ہوئی:

۱۔ تہذیب نفس۔

۲۔ تدبیر منزل۔

۳۔ سیاست مدن۔

سیاست مدن، درحقیقت تدبیر منزل ہی کی وسیع شکل ہے۔ تدبیر منزل میں اصلاح، خیر اندیشی اور انتظامی امور کا دائرہ گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتا ہے لیکن سیاست مدن میں ان امور کا دائرہ، ایک شہر، ملک اور بعض اوقات پوری دنیا کو شامل کر لیتا ہے۔ لہٰذا حکمت عملی کو دو حصوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب نفس۔ اور۔ تدبیر منزل اور اگر اسے ایک جملہ میں خلاصہ کرنا چاہیں تو ــــ "تعمیر فرد و معاشرہ" کہہ سکتے ہیں۔ ہر حکمت عملی، ایک خاص حکمت نظری کی تابع ہوتی ہے۔ کائنات، اس کے خالق اور اس میں موجود مخلوقات کے متعلق جیسا نظریہ ہوگا ویسی ہی حکمت عملی اور سیاست وجود میں آئے گی۔ اسی لئے خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کی حکمت عملی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اخلاقیات کی بنیادی حیثیت تسلیم کرنے والوں اور اسے ثانوی درجہ دینے والوں کی سیاست میں اختلاف ہے۔

لہٰذا کسی بھی معاشرہ کی حکمت عملی کو سمجھنے کے لئے اس کی حکمت نظری اور آئیڈیالوجی کو سمجھنا نہایت ضروری ہے جکمت نظری سے بے بہرہ شخص حکمت عملی کے سلسلہ میں اظہار رائے کا حق نہیں رکھتا۔ اسلامی سیاست اور الٰہی حکمت عملی کو سمجھنے، نیز اس کے متعلق زبان کھولنے سے پہلے اسلامی حکمت نظری اور اس کے بنیادی عقائد سے اچھی طرح باخبر ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ، اگر اسلامی حکمت نظری، جھوٹ، دغابازی، فریب اور مکاری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تو اس کی سیاست میں ان چیزوں کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اسلامی حکمت نظری میں مسلمانوں پر کفار کے تسلط کی گنجائش نہیں تو اس کی حکمت عملی میں سربراہان کفر کے لئے نرم گوشہ کی توقع بچکانہ سی بات ہوگی۔ اگر اسلامی نظریات، اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ پر بھروسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تو اس کی حکمت عملی سے بڑی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی امید رکھنا سفاہت ہے۔ اگر اسلامی حکمت نظری، مسلمانوں کی جان ومال کا دفاع کرنے اور جارح کو کیفر کردار تک پہنچانے کا حکم دیتی ہے تو پھر اس کی حکمت عملی سے کسی سفاک جارح سے صلح کا تقاضہ نادانی وجہالت ہے۔ اگر اسلامی حکمت نظری میں "حق الناس" کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ یوم محشر ممکن ہے، خدا، بندے کے استغفار کے نتیجہ میں ان گناہوں کو معاف کردے جو اس نے معصیت الٰہی کے تحت انجام دیئے ہیں، لیکن ان مظالم کو ہرگز معاف نہیں کرسکتا جو انسان نے انسانوں پر کئے ہیں، تو اس کی حکمت عملی سے ان مجرموں اور سفاک ظالموں کو معاف کردینے کا مطالبہ جنھوں نے ہزاروں بے گناہوں کو انتہائی درندگی وبربریت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا، بے عقلی ہے۔



روئے زمین پر ایران، واحد ملک ہے جس نے اپنی حکمت عملی کے لئے اسلامی حکمت نظری کو انتخاب کیا ہے اور اپنے آٹھ سالہ دور میں اس پر سختی سے کاربند رہا ہے۔ بدخواہوں کے طعن وتشنیع اور استکباری طاقتوں کی پروپیگنڈہ مشینریوں کی ہا ہو، نیز ان کی افترا پردازی اور بہتان تراشیوں کے باوجود سیسہ پلائی دیوار کی طرح اپنے اسلامی موقف پر قائم۔ اور ہر طرح کے نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی وحشت انگیز یلغار کا تن تنہا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے۔

اسلامی حکمت نظری کے دشمنوں کی طرف سے اسلامی ایران کی حکمت عملی پر اعتراضوں کی بوچھار سمجھ میں آنے والی بات ہے، ان سے اسی کی توقع تھی اور ہے بلکہ ان کا اعتراض و مخالفت نہ کرنا باعث تعجب ہوتا۔ البتہ حیرت ان لوگوں پر ہے جو خود کو اسلامی حکمت نظری کا علمبردار بتاتے ہیں اور خود ہی اس کی آئینہ دار حکمت عملی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

صحیح تو یہ ہے کہ کسی فرد، گروہ، ملک یا جماعت کی حکمت نظری کو اس کی حکمت عملی سے ہی پرکھا جا سکتا ہے ورنہ دعوی تو ہر شخص کر سکتا ہے۔ اسلامی ایران کی بنیادی سیاست و حکمت عملی پر اعتراض نے بہت سے چہروں پر پڑی ہوئی نقاب الٹ دی ہے۔ کل تک جو جماعتیں اور افراد اسلامی حکمت نظری کے ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے اور اپنے کو سب سے بڑا "موحد" سمجھتے تھے، آج میدان عمل میں ان کے مکروہ چہروں سے نقاب ہٹ گئی اور اصلی صورت سامنے آگئی۔

نام نہاد عالمی ادارہ "رابطہ العالم الاسلامی" جس نے ابتداء سے آج تک مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے، عالم اسلام کو خواب غفلت میں مبتلا کرنے اور دنیا کی تمام استکباری طاقتوں کے مفادات کی حفاظت کرنے کے سوا کوئی کام نہ کیا ہے جسے رابطہ عالم اسلامی کے بجائے "رابطہ عالم استکباری" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ عالمی ادارہ ایک مدت سے اسلامی حکمت نظری کی علمبرداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا لیکن جب عالم استکبار کے مقابلہ میں ایران کی اسلامی سیاست سے روبرو ہوا تو اس نے اسی حکمت عملی کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی جس کی حکمت نظری کا پرچار کر رہا تھا۔ عجب تماشا ہے، اسلامی حکمت نظری کے تو حامی ہیں لیکن اس کی حکمت عملی اپنانے پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں۔



اسلامی ایران پر اعتراض ہے کہ:

بعثی کفر کے سرغنہ، عالم استکبار کے ایجنٹ، ہزاروں بے گناہوں کے قاتل اور اسلامی ملک پر جارحیت کے مرتکب صدام سے صلح کیوں نہیں کرتا، جنگ بندی پر تیار کیوں نہیں ہوتا؟

اس کا جواب ایران کی حکمت نظری میں تلاش کیجئے، قرآن و سنت اسلامی جمہوریہ کی اساس ہے۔ قرآن ایسوں سے ہرگز صلح کی اجازت نہیں دیتا۔ ارشاد رب العزت ہے:۔

اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ (حج/۳۹)

جن لوگوں پر جنگ مسلط کی گئی ہے اور ان پر ظلم ہوا ہے، خداوند عالم نے انھیں ظالم کی تنبیہ کے لئے جنگ کا حکم دیا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

آج دنیا میں کون ایسا انصاف پسند شخص ہے جو صدام کو جارح و ظالم نہ سمجھتا ہو، جو افراد یا جماعتیں ایران کو دعوت صلح دیتی ہیں وہ بھی معترف ہیں کہ صدام نے جنگ کا آغاز کرکے لاکھوں افراد پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے ہیں۔

۲ وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ (بقرہ/۱۹۳)

ان لوگوں سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہ جائے اور اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔ ایران بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

۳ فقاتلوا اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفاً (نساء/۷۶)

شیطان کے ہواخواہوں سے جنگ کرو، ان کی ہاہو کی پرواہ نہ کرو کیونکہ شیطان کا داؤ بہت ہی بودا ہے۔

۴ وان نکثوا ایمانہم من بعد عہدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر، انہم لا ایمان لہم لعلہم ینتہون۔ (توبہ/۱۲)

اگر یہ لوگ عہد کر چکنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں تم کو طعنہ دیں تو تم کفر کے سربرآوردہ لوگوں سے ڈٹ کر لڑائی کرو، ان کی قسموں کا ہرگز کوئی اعتبار نہیں تاکہ یہ لوگ اپنی شرارت سے باز آجائیں۔

صدام نے الجزائر میں ۱۹۷۵ میں ایک معاہدہ کیا۔ ۱۹۸۰ میں طاقت کے نشہ میں

ٹیلی ویژن پر اسے چاک کر ڈالا، اسلامی انقلاب کی کامیابی اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے فوراً بعد ہی اس کی بیخ کنی میں مشغول ہو گیا، اس کے وعدوں اور معاہدوں کا کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

فلا تھنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون واللہ معکم ولن یترکم اعمالکم (محمد/۳۵)

سستی و کاہلی سے کام نہ لو اور نہ دشمنان دین سے صلح کی دعوت دو، ڈرو نہیں، تم برتر و سربلند ہو، خدا تمہارے ساتھ ہے، وہ تمہارے اعمال کے ثواب کو ہرگز کم نہیں کرے گا، تمہاری مشقتوں اور زحمتوں کا اجر محفوظ ہے۔

آیہ شریفہ مسلمانوں کو دین دشمنوں سے صلح سے منع ہی نہیں کرتی بلکہ دعوت صلح کو بھی حرام سمجھتی ہے۔ بعثی حکومت کا کفر اور دین دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، اس کے منشور کا ایک سرسری مطالعہ اور اس کے کارناموں کا جائزہ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

ب: نہ شرقی، نہ غربی کی پالیسی غیر معقول ہے۔ دنیا میں دو ہی بڑی طاقتیں ہیں۔ روس اور امریکہ دونوں سے منہ موڑ لینا دانشمندانہ اقدام نہیں، جب دونوں ہی طاقتیں ایران سے خوشگوار تعلقات کی خواہاں ہیں تو پھر ایران اپنی ضد پر کیوں اڑا ہوا ہے؟

ایران کی ہرگز یہ سیاست نہیں کہ وہ دنیا سے قطع تعلق کر لے۔ البتہ وہ خدا کے سوا کسی غیر کو "بڑی طاقت" نہیں سمجھتا، ایران جس "تعلق" سے گریزاں ہے وہ "بھیڑ" اور "بھیڑیا" کا رابطہ ہے، یہ طاقتیں، خاص کر امریکہ کبھی بھی خوشگوار تعلق کا خواہاں نہیں رہا ہے بلکہ تسلط و غلبہ چاہتا ہے، ظلم و بربریت کی حکمرانی چاہتا ہے۔ دوسروں کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ قرآن ایسوں سے اس قسم کے تعلقات برقرار کرنے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود/۱۱۳)

ظالموں کی طرف مائل نہ ہو ورنہ دوزخ کی آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ خدا کے سوا تمہارا کوئی سرپرست ہے نہ مددگار۔

امریکہ "الذین ظلموا" کا واضح ترین مصداق ہے۔ اس کا ظلم اظہر من الشمس ہے، دنیا کے چپہ چپہ پر اس کے ظلم و ستم کی داستانیں رقم ہیں۔

ج۔ امریکی صدر، ریگن نے اپنے خصوصی ایلچی "مک فارلین" کو خیر سگالی دورے پر بھیس بدل کر ایران بھیجا۔ امریکہ جیسے بڑے ملک کے لئے یہ انتہائی ذلت آمیز اقدام تھا کہ وہ ایران کے سامنے اس قدر جھک جائے، ایران کو چاہئے تھا کہ مک فارلین کا گرمجوشی سے استقبال کرتا اور تعلقات کو بہتر بنانے کی امریکی تجویز کو مان لیتا۔ لیکن ایران نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا جب کہ اسے امریکی اسلحہ کی شدید ضرورت ہے۔ یہ حکمت عملی عاقلانہ نہیں ہے۔

ارشادِ پیغمبرؐ ہے: المومن لایلدغ من جحر مرتین۔ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جا سکتا، امام خمینی نے امریکہ کو "شیطان بزرگ" کا صحیح نام دیا ہے۔ مک فارلین کا سفر شیطانی سازش کی ایک کڑی تھی۔ ریگن یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ دنیا کی کوئی تحریک ہم بڑی طاقتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایران جیسے "کٹر" ملک کو بھی آخر کار ہمارے سامنے جھکنا پڑا، اس طرح دنیا کی دیگر اسلامی تحریکوں کے حوصلے پست کر دیئے جائیں جو ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد بلند ہوئے تھے۔ چنانچہ امام خمینی نے اپنی ایمانی فراست سے کام لیتے ہوئے جملہ ذمہ داران مملکت کو مک فارلین سے گفتگو کرنے سے منع کر دیا اور متنبہ کیا کہ اس سفر کا مقصد ہمیں فائدہ پہنچانا یا ہماری مدد کرنا نہیں ہے بلکہ ہمیں بدنام کرنے کے لئے یہ ایک شیطانی سازش ہے۔ بعد کے واقعات نے رہبر انقلاب کے اس نظریہ کی توثیق کر دی۔

تفسیر

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:

ان کو راہ پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے اور، ہاں (لیکن) اللہ جس کو چاہے راہ پر لے آئے اور تم لوگ جو مال خرچ کرتے ہو وہ اپنے لیے (خرچ کرتے ہو) اور تم، تو اللہ ہی کے لئے خرچ کرتے ہو مال، یا کچھ اور، جو بھی خرچ کرو گے وہ تو پورا ادا کیا جائے گا اور تمہارا حق مارا نہیں جائے گا (۲۷۲)

تفسیر:

وسعتِ ظرف ضروری ہے۔ انفاق میں سب کو حصہ دو۔ حاجت مند کوئی بھی ہو، دولت ہو تو دوسروں کو دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے منصب اور جوابدہی، انسان دوستی اور جذبۂ ہدایت کی بنا پر چاہتے تھے کہ سب انسان مسلمان ہو جائیں اور سب مسلمان مسلمانوں کی مدد کریں۔ اللہ نے فرمایا۔ میرے محبوب، آخر یہ فکر آپ کیوں کرتے ہیں؟ آپ کا منصب ہے میرا حکم صحیح طریقے سے لوگوں تک پہنچانا۔ اس کے بعد یہ سب آپ کی راہ پر آجاتے ہیں یا نہیں؟ یہ آپ کے سوچنے اور پریشان ہونے کی بات نہیں، جس میں جب صلاحیت ابھرے گی وہ اسلام لائے گا۔ اللہ مدد کرے گا۔

مسلمان داد و دہش کرنے والے، غیر مسلموں کو بطور امداد روپیہ پیسہ دینے سے ہچکچاتے تھے۔ جیسے آج بھی لوگ سوچتے ہیں۔ فلاں کو کیوں دیں، وہ مسلمان نہیں ہے۔ اللہ عز اسمہٗ نے فرمایا: جو مال، بوجہ اللہ خرچ کرتے ہو، وہ دیکھنے میں تو تہی دست کو دینا ہے مگر حقیقت میں وہ اپنے آپ کو دے

رہے ہو۔ اپنے فائدے میں صرف کر رہے ہو۔ تمہارا دیا تمہارے ہی کام آئے گا۔ اللہ عادل و رحمان و رحیم ہے۔

ارباب دولت۔ انفاق۔ میں صرف مسلمانوں ہی کو پیش نظر نہ رکھیں۔ اسلام حوصلے اور نظر میں وسعت چاہتا ہے۔ پیسے کی خاطر کسی کا دین نہیں بکوا تا۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

ترجمہ:

(داد و دہش) ان بے نواؤں کے لیے ہے جنھوں نے اپنے تئیں راہ الٰہی کے لیے پابند کر لیا ہے۔ وہ ملکوں بازاروں میں (کاروبار کے لیے) گھوم پھر نہیں سکتے انجان لوگ ان کی خود داری کی وجہ سے انھیں امیر سمجھتے ہیں۔ تم ان کی تنگ حالی کو ان کے بشرے سے بھانپ لوگے۔ وہ لوگوں سے چمٹ کر مانگتے نہیں ہیں۔ اور تم جو بھلائی میں خرچ کروگے اللہ اس کا پوری طرح علم رکھتا ہے (۲۷۳)

تفسیر:

کہتے ہیں کہ آیت اصحاب صفہ کے بارے میں ہے، یہ حضرات اسلامی حقائق و تعلیمات اور جہاد کے لیے اپنے تئیں وقف کر چکے تھے، مسجد النبیؐ میں ان کے لیے ایک جگہ "صفہ" کے نام سے موسوم تھی یہ لوگ اسی چبوترے پر رہتے اور تعلیم و تربیت حاصل کرتے اور جہاں ضرورت پڑتی وہاں رضاکارانہ حاضری دیتے تھے۔

آیت ہر دور میں پیدا ہونے والے ایسے رضاکاروں، طالب علموں اور مخلصوں کی خبر گیری پر توجہ دلا رہی ہے جن لوگوں نے اپنی زندگیاں تعلیم کتاب و سنت کے لیے وقف کر دی ہوں۔ یہ خوددار لوگ "اہل انفاق" کی توجہ کے پہلے مستحق ہیں یہ لوگ شب و روز ایک مقصد کی تلاش میں مصروف ہیں اور فقط دین کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ چونکہ مانگتے نہیں، خوش پوش اور صابر ہیں اس لیے بے خبر لوگ انھیں پیسے والا مانتے ہیں۔ ان کی صورتیں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کس قدر ضرورت مند ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم خیر اور بھلائی کا کیا کام کرتے ہو اور کس کی امداد کرتے ہو۔ ایسوں کی امداد بہر حال ضروری ہے۔

الَّذِينَ

يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

ترجمہ:

جو لوگ اپنا مال رات کو اور دن کو خرچ کرتے ہیں۔ چھپا کر اور علانیہ، ان کے لیے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۲۷۴)

تفسیر:

یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں اتری ہے۔ حضرت نے ایک مرتبہ ایک درہم رات کو دیا۔ دوسرا درہم دن کو، ایک درہم چپکے سے دیا کہ ہاتھ کی ہاتھ کو خبر نہ ہو اور ایک درہم علانیہ دے دیا، حضرت کے پاس کل چار درہم تھے۔ اللہ نے اس خلوص، للّٰہیت اور انداز انفاق کو پسند فرما کر مسلمانوں کے لئے "مثالیہ" قرار دیا۔ علیؑ کی تعریف فرمائی اور اہل خیر کو سبق دیا اور اطمینان کہ ایسے کردار کا مالک خوف و حزن سے قیامت میں بھی آزاد ہوگا۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَوٰا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ
مِثْلُ الرِّبَوٰا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰا ۚ فَمَنْ جَاءَهُ
مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ
وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝
يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ
كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝

ترجمہ:

جو لوگ (ربا) سود کھاتے ہیں وہ لوگ قیامت میں کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے (آسیب زدہ) وہ شخص جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا تھا "سوداگری" بھی تو ایسی ہی ہے جیسے (ربا) سود لینا حالانکہ اللہ نے سوداگری کو حلال اور سود لینے کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر جسے اس کے رب کی طرف سے "موعظت" (نصیحت) آچکی اور وہ باز آگیا، تو گذشتہ اسے معاف ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو شخص دوبارہ سود لے گا تو وہی جہنمی اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ (۲۷۵) اللہ، ربا کو مٹاتا اور صدقات (داد و دہش) کو فروغ دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرا گنہ گار کو پسند نہیں فرماتا (۲۷۶)

سیر:

ربا: زیادہ لینا۔ ناپ کر یا تول کر بیچی جانے والی بعض نوع کی چیزوں میں عوض کے
ءوقت زیادتی، خواہ معاملہ (سوداگری) ہو یا قرض (آلاءالرحمن: بلاغی رح) دوسری لفظو
ں کوئی شئے دے کر اس کا مماثل لینا اور مدت پر اس میں اضافہ (المیزان: طباطبائی رح)
ربا: نفع خوری وافزائش طلبی، وقت نزول آیت اس لفظ اور اس کے معانی کا پس منظر مدینہ
نیز مکہ کا وہ اقتصادی نظام ہے جس میں ایک مدت معین کے لئے کوئی چیز یا رقم قرض
دی جاتی تھی اور واپسی کے وقت مع اضافہ وہ شئے واپس لیتے تھے، وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت
میں سود در سود کا حساب ہوتا، آخر کار، زن و فرزند، گھر اور اثاثہ سب قرض خواہ و سود
خوار کا ہو جاتا تھا۔

شریعت میں "ربا" ایک قانونی اصطلاح ہے اور ہر قانون کی طرح اس کے حدود
و اطلاقات ہیں جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ روپے کا اضافے کے ساتھ تبادلہ۔ ایک
نوع کی دو چیزوں (تول یا ناپ سے بکنے والی چیزوں) کا باضافہ تبادلہ۔ قرض ہو یا نقد۔ ہر
ایک کے جزئیات الگ الگ اور احکام جدا جدا ہیں۔ فقیہ سے رجوع کرنا چاہئے۔

"الذین یاکلون الربا" الذین ینفقون اموالھم کے بعد، حسن بیان
کی لاجواب مثال ہے۔ انفاق کرنے والے تقوے اور انسان دوستی۔ بے خوف و خطر ہوں گے
مطمئن و آسودہ حال ہوں گے اور سود خوار انسان دشمنی اور کفر کی بنا پر پاگل اور حواس باختہ
مخبور ہوں گے۔ یہ عقل دشمن سوداگری کو سودکاری کے برابر جانتے ہیں۔ حالانکہ دونوں
میں بہت سے اقتصادی تضادات ہیں اور اللہ نے بیع کو مباح اور "ربا" کو حرام قرار دیا
ہے۔ یہ احکام مکے میں آچکے، سورۃ الروم کی انتالیسویں آیت میں مذمت، آل عمران کی
ایک سو تیسویں آیت میں حرمت اور اسی سورہ کی دو سو نواسی نمبر آیت میں تندید وارننگ
مذکور ہے۔ تجارت، پیداوار، گردش زر، محنت و کاوش کو فروغ دیتی ہے اور سود خوری
حرص، ارتکاز سرمایہ، غریبوں کو تباہ کرتی ہے۔ اس آیت کے ذریعہ آخری وارننگ دے کر

سابقہ معاملات کو نظر انداز کیا گیا اور ان کا معاملہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے کر اعلان کیا کہ آیندہ جو سود کاری کرے گا وہ مشرکوں کی طرح ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

۱۷۶ یمحق اللہ الربا ....

اللہ، ربا کو مٹانا پسند کرتا ہے اور صدقات کو فروغ دینے میں اس کی رضا ہے۔ یعنی اسلامی اقتصادیات میں "انفاق" پر بہت زور ہے۔ عوام و سرمایہ دار خوشی خوشی

صدقہ، خیرات، کمک، زکواۃ، خمس ادا کرکے طبقاتی فرق کو مٹائیں اور پیسے سے محبت کرکے خدا کو نہ بھولیں۔ انسان دشمن نہیں اور جو اللہ کی نعمت کا منکر ہوگا، دولت سے محبت

کرکے خدا کو نہ بھولیں۔ انسان دشمن نہیں اور جو اللہ کی نعمت کا منکر ہوگا، دولت سے محبت کرکے اسلامی معاشرے میں نکبت و افلاس چاہے گا اس گنہ کار کافر سے اللہ راضی نہ ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

ترجمہ:

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے اور پابندی سے نماز پڑھی اور زکاۃ دی ان کا اجر ان کے رب کے پاس (محفوظ) ہے اور (روز قیامت) نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ دل ہوں گے ۝ ۲۷۷

تفسیر:

اللہ، رسول، کتاب و شریعت ماننے اور اعمالِ صالحہ بجالانے کے بعد وہ عذاب سے مطمئن اور ثواب کے منتظر رہیں، اللہ کے وہ پسندیدہ بندے ہیں۔ اقتصادِ اسلامی کے اساسی نکتے پر گفتگو کے دوران یہ آیت نماز و زکات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے آئی۔ جیسے آیت دو سو اڑتیس، نکاح و طلاق کے درمیان گذری۔ ایک نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے۔ اعمالِ صالحہ میں نماز و زکات داخل ہیں، مگر انھیں الگ بیان کرنا ان کے مقامی ربط کی بات ہے۔ نماز، منکرات سے روکتی ہے اس لئے ربا سے روکے گی۔ زکات اہلِ ضرورت کی امداد ہے لہٰذا وہ سودی قرضے سے بچیں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

ترجمہ:

مومنو! اللہ سے ڈرتے رہو اور جو سود لوگوں کے ذمے رہ گیا اسے

چھوڑ دو (نہ لو) اگر تم ایمان قبول کر چکے ہو (۲۷۸) اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو، اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کر لی تو اصل مال تمہارا ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ (۲۷۹)

اور اگر (قرض دار) تنگ حال تھا تو اسے خوش حالی تک کی مہلت دو اور اگر وہ مال اسے (بطور) صدقہ دے ہی دو (تو) تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو (۲۸۰)

اور اس دن سے ڈرو، جس دن تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر جس شخص نے جو کچھ کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔ (۲۸۱)

تفسیر:

۲۷۸۔ یاایھاالذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا.....

جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے اور سود کا کاروبار کرتے تھے یا کرتے ہیں وہ وہ پابند ہیں کہ جس کے ذمے جتنا "ربا" ہے اسے چھوڑ دیں۔

۲۷۹۔ فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب.....

اگر کوئی شخص اسلام لانے اور اس حکم کو سننے کے بعد بھی سود نہیں چھوڑتا، تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ اللہ نے اصل زر واپس دلا دیا کیا یہ رحم کم ہے؟ تم ظلم سے باز نہیں آتے یہ بڑی جرأت ہے۔

اس موقع پر اللہ کے ساتھ رسول کا ذکر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بظاہر اشارہ یہ ہے کہ اللہ قانون بنانے والا اور رسول قانون نافذ کرنے والے ہیں۔ مجرم، قرض خواہ پر ظلم اور ان دونوں آقاؤں کی حکم عدولی کرتا ہے۔ یعنی حاکم ہونے کی حیثیت سے دونوں کو ایک درجہ حاصل ہے۔

۲۸۰۔ وان کان ذو عسرۃ ....

سود کی معانی کے ساتھ قرض خواہوں کو نمبر ۱۔ مہلت دو، ذرا امکان ہو تو پیسے دیں۔ نمبر ۲۔ سود، ناجائز مال بہت کما چکے ہو، بہتر ہے کہ قرضہ معاف کر دو۔ نمبر ۳۔ اگر علم و خرد سے ہاتھ نہیں دھوئے تو یہ تمہارے حسن کردار حسن نیت و حسن اسلام کی بات ہے تمہیں اس سے سماجی فائدہ ہوگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اللہ عزوجل نے ربا حرام کیا کہ لوگ کار نیک سے ہاتھ نہ روکیں (وسائل الشیعہ)

۲۸۱۔ واتقوا یوما ترجعون فیہ .....

عقائد اسلام کی پہلی منزل ہے "اللہ" کو ماننا۔ دوسرا مرحلہ ہے قیامت کو برحق جاننا۔ دونوں عقیدوں کا نتیجہ تقویٰ۔ خوف خدا۔ ظلم سے بچنے اور انصاف کرنے کا ذریعہ ہے۔ اللہ کو عادل مانو عدل کو اصل اصول جانو۔ وہ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے نہ کسی کے ظلم کو معاف کرے گا۔

جناب شیخ محمود قانصوہ

شیعہ سنّی کتب میں مشترک روایات

جس نے قضا رمضان میں اتنی تاخیر کی کہ دوسرا رمضان آگیا تو اس پر قضا و اطعام دونوں واجب ہے۔

روایات اہلبیتؑ:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن حريز، عن محمد بن مسلم، عن أبي جعفر وأبي عبدالله (ع)، قال: سألتهما عن رجل مرض فلم يصم حتى أدركه رمضان آخر. فقالا: إنْ كان برئ ثم توانى قبل أن يدركه الرمضان الآخر صام الذى أدركه وتصدَّق عن كل يوم بمدٍّ من طعام على مسكين وعليه قضاؤه. (الحديث) [٢٤].

۱۔ .... محمد بن مسلم کہتے ہیں میں نے امام باقرؑ و امام صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا یہاں تک کہ دوسرا رمضان آگیا۔ حضرت نے فرمایا: اگر وہ شفایاب ہوگیا تھا اور دوسرے رمضان آنے تک روزہ رکھنے کے سلسلہ میں کوتاہی کی تو اس دوسرے رمضان کا روزہ رکھے گا اور گذشتہ رمضان کے روزے کی بعد میں قضا کرے گا اور ہر دن کے بدلہ میں مسکینوں کو ایک مد طعام دے گا۔

٢ ــ محمد بن يعقوب عنه ــ علي بن ابراهيم ــ عن أبيه وعن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان، جميعاً عن بن أبي عمير، عن جميل، عن زرارة، عن أبي جعفر(ع) في الرجل يمرض فيدركه شهر رمضان ويخرج عنه وهو مريض ولا يصح حتى يدركه شهر رمضان آخر، قال: يتصدق عن الأول ويصوم الثاني، فإن كان صح فيما بينهما ولم يصم حتى أدركه شهر رمضان آخر صامهما جميعاً ويتصدق عن الأول[٢٥].

٢. . . . . زرارۃ امام باقرؑ سے اس شخص کے بارے میں روایت کرتے ہیں جس نے حالت بیماری میں ماہ رمضان کا استقبال کیا اور بیماری ہی کی حالت میں ماہ رمضان ختم بھی ہو گیا، اس کی علالت اتنی طویل ہوئی کہ دوسرا رمضان آگیا، حضرتؑ نے اس کے سلسلہ میں فرمایا: پہلے رمضان کے بدلہ میں صدقے دے گا اور دوسرے رمضان کے روزے رکھے گا۔ لیکن اگر دونوں رمضانوں کے درمیان شفایاب ہوجانے کے باوجود پہلے رمضان کی قضا نہ کرے تو اسے دونوں ماہ کے روزے رکھنے ہوں گے اور پہلے رمضان کے روزوں کے بدلے میں صدقہ بھی دینا ہوگا۔

روایات اہل سنت:

١ ــ وأخبرنا أبو الحسين بن الفضل القطان ببغداد، أنبأ أبوسهل بن زياد القطان، حدثنا علي بن محمد بن أبي الشوارب، حدثنا سهل بن بكار، حدثنا أبو عوانة، عن رقبة، قال: زعم عطاء أنه سمع أبا هريرة قال في المريض يمرض ولا يصوم رمضان ثم يبرأ ولا يصوم حتى يدركه رمضان آخر. قال: يصوم الذي حضره ويصوم الآخر ويطعم لكل ليلة مسكيناً[٢٦].

١. . . . . رقبہ کہتے ہیں: عطا کا خیال ہے کہ انھوں نے ابوہریرہ کو اس مریض کے بارے میں جو بیماری کی وجہ سے ماہ رمضان میں روزے نہ رکھ سکا اور شفایاب ہونے کے بعد قضا بھی نہ کی یہاں تک کہ دوسرا رمضان آگیا

یہ کہتے سنا ہے کہ: پہلے موجودہ رمضان کے روزے رکھے گا اس کے بعد گذشتہ رمضان کے روزے اور ہر شب کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے گا۔

۲ ــ أخبرنا أبوعبد الله الحافظ، حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب، حدثنا الحسن بن مكرم، حدثنا يزيد بن هارون، حدثنا شعبة، عن الحكم، عن ميمون بن مهران، عن ابن عباس في رجل أدركه رمضان وعليه رمضان آخر؟ قال: يصوم هذا ويطعم عن ذاك كل يوم مسكيناً ويقضيه[27].

أقول: لم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۲. . . . . ابن عباس نے اس شخص کے بارے میں جس نے ماہ رمضان کا استقبال اس حالت میں کیا کہ اس پر گذشتہ ماہ رمضان کی قضا باقی ہے فرمایا: اس رمضان کے روزے رکھے گا اور گذشتہ رمضان کی قضا کرے گا، نیز ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے گا۔

جو شخص دوسرا ماہ رمضان آنے تک قضا رکھنے سے معذور رہو اس پر صرف اطعام واجب ہے قضا نہیں۔

روایت اہلبیتؑ:

۱ ــ وعنه ــ الحسين بن سعيد، عن القاسم بن محمد، عن علي، عن أبي بصير، عن أبي عبدالله (ع) قال: إذا مرض الرجل من رمضان الى رمضان ثم صحّ فإنما عليه لكل يوم أفطره فدية طعام وهومد لكل مسكين. (الحديث)[28].

۱. . . . . ابو بصیر امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں : اگر کوئی شخص ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک بیمار رہے اس کے بعد شفایاب ہو تو وہ ہر روزہ کے بدلہ میں کھانے کا فدیہ دے گا اور وہ فدیہ ہر مسکین کے لئے ایک مد طعام ہے.

روایت اہل سنت:

١ ــ قال البيهقي: وروينا عن ابن عمر وأبي هريرة في الذي لم يصح حتى أدركه رمضان آخر، يطعم ولاقضاء عليه[٢٩].

۱. . . . . ابن عمر و ابو ہریرہ نے اس شخص کے بارے میں جو رمضان تک شفایاب نہ ہو سکے کہا ہے : وہ صرف کھانا کھلائے گا ۔ اس پر قضا واجب نہیں ہے ۔

مردے کی قضا اس کے ورثہ پر ہے

روایات اہلبیتؑ:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن محمد بن الحسين، عن علي بن الحكم، عن العلاء بن رزين، عن محمد بن مسلم، عن أحدهما (ع)، قال: سألته عن رجل ادركه رمضان وهو مريض فتوفي قبل أن يبرأ؟ قال: ليس عليه شيء ولكن يقضى عن الذي يبرأ ثم يموت قبل ان يقضى. ونقله في الإستبصار عن الكافي[٣٠].

۱. . . . . محمد بن مسلم (امام باقرؑ و امام صادقؑ میں سے) کسی ایک سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آپ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے حالت

بیماری میں ماہ رمضان کو درک کیا اور شفایاب ہونے سے پہلے ہی فوت ہوگیا، حضرت نے فرمایا اس پر کچھ نہیں ہے لیکن اگر شفایاب ہونے کے بعد قضا روزے رکھنے سے پہلے مرا ہو تو اس کی جانب سے قضا روزے رکھے جائیں گے۔

٢ ـ محمد بن علي بن الحسين، قال: قد روي عن الصادق (ع) أنه قال: إذا مات الرجل وعليه صوم شهر رمضان فليقض عنه من شاء من أهله[٣١].

۲۔ . . . . امام صادقؑ سے روایت ہے: اگر کوئی شخص مرجائے درحالیکہ اس پر ماہ رمضان کا روزہ ہو تو اس کے ورثہ میں سے جو چاہے اس کی جانب سے روزے رکھے گا۔

روایات اہل سنت:

١ ـ أخبرنا أبوعبد الله الحافظ، أنبأ أبوالفضل بن ابراهيم، حدثنا احمد بن سلمة، حدثنا اسحاق بن ابراهيم، أنبأ عيسى بن يونس، حدثنا الأعمش، عن مسلم البطين، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس، ان امرأة أتت النبي (ص) فقالت: إن أمي ماتت وعليها صوم شهر فقال: أرأيت لوكان عليها دين أكنت تقضينه؟ فقالت: نعم. فقال: دين الله أحق بالقضاء[٣٢]. ونحوه ما أخرجه الترمذي، عن أبي سعيد الأشج، عن أبي خالد الأحمر، عن الأعمش، عن سلمة بن كهين ومسلم البطين، عن سعيد وعطاء ومجاهد، عن ابن عباس نحوه، بل الظاهر أن الإختلاف في العبارة إنما هو تصحيف، فرواية الترمذي (أختي) بدل (أمي). ورواه أيضاً عن أبي كريب، عن أبي خالد بالإسناد المتقدم نحوه[٣٣]. ورواه مسلم، عن اسحاق بن ابراهيم مثله، وأخرج نحوه بأسانيد متعددة[٣٤]. وأخرج ابن ماجة، عن عبدالله بن سعيد، عن الأحمر مثل الترمذي، وعن زهير بن محمد، عن عبدالرزاق، عن سفيان، عن عبدالله بن عطاء، عن ابن بريدة، عن أبيه نحوه[٣٥]. وأخرجه الدارقطني بسنده، عن أبي سعيد الأشج وابي خالد الأحمر مثل الترمذي[٣٦].

۱۔ . . . . ابن عباس ناقل ہیں کہ ایک عورت نے پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا: میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے درحالیکہ ان پر ایک ماہ کا روزہ باقی ہے، حضرتؐ نے فرمایا

اگر تمہاری ماں پر قرضہ ہوتا تو کیا تم ادا کرتیں ؟ اس نے کہا: جی ہاں! حضرت نے فرمایا: خدا کے قرض کی ادائیگی زیادہ سزاوار ہے . . . .

٢ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أخبرني أبو الوليد الفقيه، حدثنا أبو بكربن أبي داود، حدثنا هارون بن سعيد الأيلي، حدثنا ابن وهب (ح وأخبرنا) أبو عمرو محمد بن عبدالله الأديب، أنبأ أبو بكر الاسماعيلي، أخبرني أبو يعلى، حدثنا أحمد بن عيسى المصري، حدثنا ابن وهب، أخبرني عمرو بن الحارث، عن عبيدالله بن أبي جعفر، عن محمد بن جعفر بن الزبير، عن عروة، عن عائشة، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم. قال: من مات وعليه صيام صام عنه وليه[٣٧]. وأخرجه البخارى، عن محمد بن خالد، عن محمد بن موسىٰ بن أعين عن أبى، عن عمرو بن الحرث مثله ونقله عن يحيىٰ بن أيوب، عن ابن ابي جعفر، ورواه أبو داود، عن أحمد بن صالح، عن ابن وهب مثله[٣٩]. ورواه الدارقطني، عن أبي محمد بن صاعد عن محمد بن الأصبغ، عن أبي قال، وعن أحمد بن منصور، عن الأصبغ، عن ابن وهب. ورواه بأسانيد أخرى[٤٠].

. . . . عائشہ کا بیان ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا: اگر کوئی شخص مرجائے اور اس پر روزہ قضا ہو تو اس کا ولی اس کی جانب سے روزہ رکھے گا . . . . . .

ذوالحجہ کے دس دنوں میں قضا روزہ رکھنا مکروہ ہے

روایت اہلبیتؑ:

١ ــ مارواه أحمد بن محمد بن عيسى، عن محمد بن يحيى، عن غياث بن ابراهيم، عن جعفر(ع)، عن أبيه (ع) قال: قال علي(ع): في قضاء شهر رمضان إن كان لا يقدر على سرده فرقه. وقال: لايقضي في شهر رمضان في عشرة من ذى الحجة[٤١].

۱ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امام باقرؑ فرماتے ہیں حضرت علیؑ نے قضا ماہ رمضان کے سلسلہ میں فرمایا اگر پے درپے روزے رکھنا ممکن نہ ہوں تو وقفہ وقفہ سے رکھے نیز فرمایا: ذوالحجہ کے دس دنوں میں قضا رمضان کے روزے نہ رکھے۔

روایت اہل سنّت:

۱ ــ اخبرنا أبو طاهر الفقيه، أنبأ أبوعثمان البصري، أنبأ محمدبن عبدالوهاب، أنبأ يعلى بن عبيد، حدثنا سفيان، عن أبي اسحاق، قال: قال علي رضي الله عنه: لا تقضِ رمضان في ذي الحجة، ولا تصم يوم الجمعة أظنه منفرداً (الحديث)۲۲. وأخرجه عبدالرزاق بنقيصة الشطر الأخير، عن معمر والثوري مثله۲۳.

أقول: لم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۱ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابواسحاق راوی ہیں کہ علیؑ نے فرمایا: ذوالحجہ میں قضا رمضان ادا نہ کرو اور جمعہ کے دن روزہ نہ رکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قضا روزے ادا کرنے سے پہلے مستحبی روزے رکھنا منع ہیں۔

روایت اہلبیتؑ:

۱ ــ محمدبن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي قال: سألت أبا عبدالله (ع) عن الرجل عليه من شهر رمضان طائفة، أيتطوع؟ فقال: لا، حتى يقضي ما عليه من شهر رمضان. ونحوه مارواه الصدوق بإسناده عن الحلبي وبإسناده عن الكناني، جميعاً عن أبي عبدالله (ع). ونحوه مارواه محمدبن يعقوب، عن محمدبن يحيى، عن أحمدبن محمد، عن محمدبن اسماعيل، عن محمدبن الفضيل، عن أبي الصباح الكناني۲۴. ومثله بزيادة في آخره (ثم يصوم.. إلخ) مانقله في البحار، عن الدعائم مرسلاً۲۵.

۱. . . . . حلبی کہتے ہیں میں نے امام صادقؑ سے دریافت کیا؛ ایک شخص پر رمضان کے روزے باقی ہیں کیا وہ مستحب روزے رکھ سکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا: نہیں، یہاں تک کہ رمضان کے روزے ادا کر دے۔ . . . .

. . . .

روایت اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبو بكر محمد بن ابراهيم الحافظ، أنبأ أبونصر أحمد بن عمرو العراقي، حدثنا سفيان بن محمد الجوهري، حدثنا علي بن الحسن، حدثنا عبدالله بن الوليد، حدثنا سفيان، عن الأسود بن قيس، عن أبيه، أن عمر رضي الله عنه قال: ما من أيام أحب إليَّ أن أقضي شهر رمضان من أيام العشر، قال: وحدثنا سفيان حدثنا عثمان بن مهب، قال: سمعت أبا هريرة وسأله رجل، فقال: إنَّ عليَّ رمضان وأنا أريد أن أتطوع في العشر؟ قال: لا بل ابدأ بحق الله فاقضه ثم تطوع بعد ذلك ماشئت[٤٦]. وروى الشطر الأخير عبدالرزاق، عن الثوري مثله[٤٧].

أقول: ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۱. . . . . اسود بن قیس اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عمرؓ نے کہا: میرے نزدیک ذوالحجہ کے دس دنوں سے محبوب تر کوئی دن نہیں جس میں رمضان کے قضا روزے رکھوں۔ . . . . . ابوہریرہ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ میرے اوپر ماہ رمضان کے روزے باقی ہیں اور چاہتا ہوں کہ ذوالحجہ کے دس دنوں میں مستحبی روزے رکھوں؟ انہوں نے کہا: نہیں بلکہ حق اللہ کی ادائیگی شروع کرو، پہلے قضا روزے رکھو پھر جتنے چاہو مستحبی روزے رکھو۔

مضمضہ کرتے وقت پانی حلق میں پہنچ جائے تو قضا واجب ہے بشرطیکہ وضو مستحبی ہو ورنہ نہیں۔

روایت اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن أبي عبدالله(ع) في الصائم يتوضأ للصلاة فيدخل الماء حلقه، فقال إنْ كان وضوؤه لصلاة فريضة فليس عليه شيء، وإنْ كان وضوؤه لصلاة نافلة فعليه القضاء[٤٨]. وروى الصدوق نحوه بإسناده عن العلاء، عن محمد بن مسلم، وبإسناده عن سماعة بن مهران[٤٩].

١. . . . . حماد کہتے ہیں امام صادقؑ نے اس روزے دار کے بارے میں جو نماز کے لیے وضو کر رہا تھا اور پانی اس کی حلق میں پہنچ گیا فرمایا: اگر اس کا وضو واجبی نماز کے لئے ہو تو روزہ کو نقصان نہ پہنچے گا، لیکن اگر اس کا وضو مستحبی نماز کے لیے ہو تو اس پر قضا واجب ہوگی۔ . . . .

روایت اہل سنّت:

١ ــ أخبرنا عبدالرزاق، قال: أخبرنا رجل عن ابن أبي ليلى، عن عطاء، عن ابن عباس في الرجل يتمضمض وهو صائم فيدخل بطنه؟ قال: إنْ كان للمكتوبة فليس عليه شيء، وإنْ كان تطوعاً فعليه القضاء[٥٠].

أقول: ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي(ص) من طرق أهل السنة.

١. . . . . عطا کہتے ہیں ابن عباس نے اس شخص کے سلسلہ میں

جو حالت روزہ میں مضمضہ کر رہا تھا اور پانی اس کے پیٹ میں چلا گیا، کہا: اگر واجب نماز کے لئے ہو تو کوئی حرج نہیں اور اگر مستحبی نماز کے لئے ہو اس پر قضا واجب ہے۔

حواشی:

٢٤ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٤٤) والكافي (ج ٤، ص ١١٩).
٢٥ ــ الوسائل (ج ٤، ص ٢٤٥) والكافي (ج ٤، ص ١١٩).
٢٦ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٥٣). وروى البيهقي هذا الحديث بسند آخر.
٢٧ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٥٣).
٢٨ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٤٦) والإستبصار (ج ٢، ص ١١١، ح ٤).
٢٩ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٥٣).
٣٠ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٤٠) والكافي (ج ٤، ص ١٢٣) والإستبصار (ج ٢، ص ١١٠)
٣١ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٤٠).
٣٢ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٥٥).
٣٣ ــ الترمذي (ج ٣، ص ٩٥) والترمذي (ص ٩٦).
٣٤ ــ مسلم (ج ٣، ص ١٥٥ و ١٥٦ و ١٥٧).
٣٥ ــ ابن ماجة (ج ١، ص ٥٥٩) وفي الأول (سلمة بن كهيل) وفيه زيادة الحكم مع مسلم ومسلمة.
٣٦ ــ الدارقطني (ج ٢، ص ١٩٥).
٣٧ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٥٥) ورواه بإسناد آخر في نفس الصفحة.
٣٨ ــ البخاري (ج ٣، ص ٤٣ و ٤٤).
٣٩ ــ أبو داود (ج ٢، ص ٣١٥).
٤٠ ــ الدارقطني (ج ٢، ص ١٩٥).
٤١ ــ الإستبصار (ج ٢، ص ١١٩، ح ١).
٤٢ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٨٥).
٤٣ ــ مصنّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢٥٦) وفيه بدل: (نقضي) (يقضي).
٤٤ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٥٣) والكافي (ج ٤، ص ١٢٣).
٤٥ ــ البحار (ج ٩٣، ط.ج، ص ٣٣٤).
٤٦ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٨٥).
٤٧ ــ مصنّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢٥٧).
٤٨ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٤٩) والكافي (ج ٤، ص ١٠٧)
٤٩ ــ الفقيه (ج ٢، ص ٦٩).
٥٠ ــ مصنّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ١٧٥).

آیت اللہ العظمیٰ منتظری

ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفت خدا

معرفت خدا تمام علوم کی بنیاد ہے

خطبہ ۱۸۶ کے شروع میں بھی میں نے کہا تھا کہ اس خطبہ میں حضرت امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے خدا کو پہچنوانے کے لیے بڑے عمیق فلسفی مسائل بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ حسّاس و نازک موقعوں پر خدا کے پہچنوانے پر بہت اصرار فرماتے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ معرفت خدا تمام علوم و معارف و اخلاق کی بنیاد ہے جس طرح بغیر جڑ کے درخت خشک اور فنا ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کے اعمال و کردار بغیر معرفت خدا کے بے وقعت ہیں اس لئے کہ معرفت خدا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اگر ہماری نظر اس بات پر ہو کہ ہمارے تمام حرکات و سکنات اور اعمال کو خدا دیکھ رہا ہے، وہ ہماری رگ گردن سے قریب ہے وھو اقرب الیکم من حبل الورید تو ہمارے تمام حرکات و سکنات کا متاثر ہونا لازمی ہے جب تمام عقائد و معارف کی بنیاد خدا کی معرفت ہے تو جتنی توانائی بھی ہم اس راہ میں صرف کریں کم ہے۔

امیرالمؤمنینؑ کے اس خطبہ میں عمیق فلسفی مسائل کا بیان ہونا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بہت بڑا اعجاز ہے اس لئے کہ علی پروردۂ آغوش پیغمبر ہیں اور پیغمبر کی صداقت کے لئے یہ سارے علوم و معارف کافی ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں عربستان میں نہ تو کوئی مدرسہ تھا نہ ہی کوئی یونیورسٹی تھی ایسے میں حضرت علیؑ نے اصول توحید کو اپنے خطبہ

میں اس طرح بیان کیا ہے جسے ہمیشہ دانش گاہوں اور مدرسوں میں پڑھایا جانا چاہئے اب خطبہ کا بقیہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

مقدار کا تعین

مقدّرٌ لا بجول فکرة (لا بجول فکرة)
وہ ہر چیز کو معین کرنے والا ہے لیکن فکر کو بروئے کار لائے بغیر معین کرتا ہے
(فکر سے مدد طلب کئے بغیر)
خدا رزق اور عمر وغیرہ کو معین کرتا ہے۔کسی کی کتنی عمر ہو اس کو خدا ہی معین کرتا ہے وہی اپنے ارادہ سے کسی کو فقیر کسی کو غنی بناتا ہے۔غرضکہ عالم کی تمام چیزیں اسی کے علم وارادہ سے وابستہ ہیں جو اس کا ارادہ ہوتا ہے وہی ہوتا ہے لیکن اسمیں اس کو جولان فکر کی یا فکر سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے اس کو ہماری طرح، سوچنا نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے۔ محل حوادث نہیں ہے کہ فکر کے ذریعہ عیاذاً باللہ کاموں کو انجام دے۔خدا انسانوں کی طرح نہیں ہے، انسان اگر ایک عمارت بنانا چاہتا ہے تو اسمیں غور وفکر، مشورہ اور نقشہ وغیرہ کا محتاج ہوتا ہے لیکن خدا ایسا نہیں ہے۔ تمام چیزیں اس کے ارادہ سے متعلق ہیں اس نے صرف اپنے ارادہ سے دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اور جب چاہیگا فنا کردیگا۔

مقدمات ارادہ

لیکن انسان ایسا نہیں ہے انسان میں ہر آن جدید تصور جنم لیتا رہتا ہے اگر وہ ایک عمارت بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں عمارت کا تصور آتا ہے اس کے بعد پھر وہ (اپنے دل میں اس بات کی) تصدیق کرتا ہے کہ وہ عمارت مفید ہے اور اس تصدیق کے بعد اس کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ اس عمارت کے بنانے کا پکا ارادہ کرلیتا ہے۔
انسان کے حادث اور متحرک دل میں وہ تمام خیالات جنم لیتے ہیں جنہیں مبادی ارادہ کہا جاتا ہے ـــــ لیکن اس کے برخلاف خدا محل حوادث نہیں ہے اور جو کچھ بھی اس کے

پاس ہے وہ ازل سے ہے۔

علم ازلی

وہ تمام نظام وجود کا عالم ہے ۔ اس کو غور و فکر سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ فکر سے مدد لینا اور فکر کو گردش میں لانا حرکت کی علامت ہے اور حرکت مادہ میں ہوتی ہے ـــــ ہماری دعائیں جنہیں وہ قبول کرتا ـــــ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری دعا کے بعد اس کے اندر اس دعا کے مستجاب کرنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے ، بلکہ اس کو ازل ہی سے اس بات کا علم ہے کہ فلاں وقت فلاں شخص دعا کرے گا اور ازل ہی سے اس کا یہ ارادہ ہے کہ ہم اس دعا کو مستجاب کریں گے اب رہی یہ بات کہ "دعا قبولیت کی علت ہے" تو اسمیں اور گذشتہ بات میں منافات نہیں پائی جاتی اس لئے کہ بہر صورت دعا، نظام وجود کا جزء ہے اور قبولیت بھی نظام وجود کا حصہ ہے اور تمام نظام وجود ابتدا ہی سے علم و ارادہ خدا سے متعلق ہے۔

گذشتہ مثال آپ کے اذہان عالیہ میں محفوظ ہوگی ہم نے کہا تھا کہ اگر آپ زینہ کے پاس کھڑے ہوں تو آن واحد میں آپ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے زینہ سے مثلاً بیسویں زینہ تک آپ کو جانا ہے یعنی شروع ہی سے آپ کا ارادہ ہوتا ہے کہ عمارت کے بالائی حصہ تک آپکو جانا ہے ۔ اگرچہ ارادہ ابتدا ہی سے ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ آپ عمارت کے بالائی حصہ تک پہونچتے ہیں اس لئے کہ یہاں حرکت لازمی ہے اور حرکت کا لازمہ تدریج ہے ـــــ لیکن خدا کے یہاں کوئی جدید تبدیلی یا ارادہ نہیں پیدا ہوتا اس لئے کہ جدید علم و ارادہ رفتہ رفتہ کمال تک پہونچنے کی علامت ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کمال پہلے نہیں تھا اب نئے علم و ارادہ کے ذریعہ یہ نیا کمال پیدا ہوا ہے ـــــ یہ بات انسان کے لئے تو درست ہے مگر خدا کے لئے درست نہیں ہے کیونکہ وہ محل حوادث نہیں ہے۔

جول فکرۃ : جول بمعنی جولان اور حرکت دینے کے ہیں ۔ لا بجول فکرۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ غور و فکر کی زحمت میں مبتلا ہوئے بغیر چیزوں اور ان کی مقدار کو متعین کرتا ہے۔

حول فکرۃ: نہج البلاغہ کے بعض نسخہ میں حول کی جگہ کلمہ۔ حول۔ لکھا ہے حول کے بھی تقریباً وہی معنی ہیں اس لئے کہ حول مدد اور امداد طلبی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ یعنی خدا کے سوا کوئی مدد اور کوئی قوت نہیں ہے۔ لہٰذا لابحول فکرۃ کا مطلب یہ ہے کہ خدا فکر و اندیشہ سے مدد حاصل کئے بغیر اشیاء کو متعین کرتا ہے۔

غنیٌ لا باستفادۃ

خدا کسی سے استفادہ کئے بغیر غنی ہے۔

خداوند عالم غنی علی الاطلاق اور بے نیاز ہے اس لئے کہ سارا عالم اس کے ارادہ کا پابند ہے اور جو کچھ بھی عالم میں ہے وہ سب جلوۂ خدا ہے وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا سہارا لیکر بے نیاز بنے بلکہ وہ تو غنی محض ہے ہاں ہم کو بندوں سے (خدا سے نہیں) بے نیاز ہوجانے کے لئے محنت کرنی چاہئے۔ زحمتیں اور مشقتیں برداشت کرنی چاہیئے تاکہ خدا کی مہربانی سے ہم کو بھی نسبتاً بے نیازی حاصل ہوجائے۔

حرکت، زمانہ، مادہ

لا تصحبہ الاوقات

خدا ـــ عالم زمان و مکان سے بالاتر ہے اس لئے کہ وہ خالق زمان و مکان ہے ـــ زمانہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ زمین جب اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی سورج کے گرد گھومتی ہے تب زمانہ پیدا ہوتا ہے یا حرکت جوہر عالم مادہ، زمانہ پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ پتہ چلا کہ زمانہ معلول حرکت ہے (یعنی زمانہ حرکت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے زمانہ کے پیدا ہونے کی علت حرکت ہے) اور حرکت عالم مادہ کا خاصہ ہے۔ اگر عالم مادہ سے بالاتر ہوکر دیکھا جائے تو پھر زمانہ کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا ـــ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ زمانہ مقدار حرکت کا نام ہے اور حرکت مادہ کی خاصیت ہے لہٰذا عالم مجردات میں جو "عالم مادہ" سے بالاتر عالم ہے، زمانہ کا کہیں سے گذر ہی نہیں ہوسکتا۔ عالم مادہ اپنی بے پناہ وسعتوں کے باوجود دراصل عالم مجردات کا ایک ہلکا سا جلوہ ہے۔ بالکل آفتاب کی اس کمزور روشنی کی طرح جو آنگن سے گذر کر کمرہ میں اور کمرہ سے گذر کر کوٹھری میں پہونچتی ہے۔ لہٰذا

یہ عالم مادہ مراحل عالم کا پست ترین مرحلہ ہے۔

عالم مادہ (ناسوت) اتنا کمزور ہے کہ اس میں لغزندگی پائی جاتی ہے اور یہ حرکت اسی لغزندگی کا اثر ہے اور لغزندگی معلول کا نقص ہے اسی لئے عالم مادہ ارتقاء اور رفتہ رفتہ ترقی و کمال تک پہونچنے کا محتاج ہوتا ہے لیکن عالم مجردات میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی وہاں جو کچھ ہے وہ کمال ہی کمال ہے۔

لہٰذا زمانہ، عالم مادہ سے متعلق ہے اس عالم مادہ سے جسمیں حرکت پائی جاتی ہے اور خدا، خالق زمانہ و مادہ و حرکت ہے اس وجہ سے اس کی ذات اقدس میں زمانہ کا گذر ناممکن ہے

مرحوم سید حبیب اللہ خوئی شرح نہج البلاغہ کی گیارہویں جلد میں اس مناسبت سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل فرماتے ہیں۔ ہم متن روایت نقل کر رہے ہیں۔

"روی فی البحار عن التوحید والامالی عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ الصادق علیہ السلام قال: ان اللہ تبارک و تعالیٰ لا یوصف بزمان ولا مکان ولا حرکۃٍ ولا انتقال ولا سکونٍ بل ھو خالق الزمان والمکان و الحرکۃ والسکون والانتقال۔"

ابو بصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: خداوند عالم زمان و مکان و حرکت و سکون و انتقال سے متصف نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کا خالق ہے۔

زمانہ، انسان اور جسم کا خاصہ ہے۔

"لا تصحبہ الاوقات" کوئی بھی زمانہ، چاہے وہ ماضی ہو حال ہو مستقبل ہو خدا کی معیت اور مصاحبت میں نہیں ہے ۔۔ ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ "خدا ہمیشہ سے ہے" یہ صرف اس لئے کہتے ہیں کہ ہم خود زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں لھٰذا مجبوراً ہم یہ جملہ اپنی زبان پر جاری کرتے ہیں ورنہ لفظ "ہمیشہ" کا اس مقام پر کوئی زمانی معنیٰ نہیں ہے ۔۔ یہاں لفظ "ہمیشہ" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات میں فنا نہیں ہے اور زمانہ کی معیت

بھی نہیں ہے اس لئے کہ زمانہ اس عالم مادہ کا امتیاز ہے، زمانہ وجود انسان کا ایک رخ ہے انسان کی خصوصیات اور شان میں سے زمانہ ہے۔ جس طرح انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ایک طول و عرض و عمق رکھنے والا جسم ہے، جس طرح انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پوست اور رنگ رکھتا ہے اسی طرح اس کی ایک خصوصیت ایک شان اور ایک رخ زمانہ بھی ہے۔ لیکن زمانہ اس کا تدریجی پہلو ہے۔

اسی وجہ سے صدر المتألهین اسفار میں تحریر فرماتے ہیں کہ ہر جسم میں دو امتداد پائے جاتے ہیں۔

۱۔ امتداد زمانی ۲۔ امتداد مکانی

درحقیقت انسان میں چار امتداد پائے جاتے ہیں، ایک تو زمانہ ہے اور دوسرے تین امتداد، یعنی طول و عرض و عمق کو صدر المتألهین سمیٹ کر " امتداد مکانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

"ولا ترفده الادوات"

آلات اور اوزار اس کی مدد نہیں کرتے۔

خدا، اوزار یا آلہ کا محتاج نہیں ہے۔ بس اس کا ارادہ ہی چیزوں کو وجود میں لانے کیلئے کافی ہے، محض اس کے ارادہ سے ساری چیزیں زیور وجود سے آراستہ ہو جاتی ہیں۔ انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون (سورہ یٰس/۸۲)۔ چونکہ تمام اوزار اور آلات مخلوق خدا ہیں اس لئے خدا ان سے بے نیاز ہے۔

سبقت تکوینی

سبق الاوقات کونہ

وجود خدا زمانوں سے پہلے ہے

خدا کا وجود ماضی، حال، مستقبل تمام زمانوں سے پہلے ہے لیکن یہ سبقت ــــ سبقت زمانی ــــ نہیں ہے بلکہ یہ سبقت۔ سبقت تکوینی ــــ اور علت و معلولی سبقت ہے۔

سبقت زمانی : جیسے کوئی کہے کہ ہمارے آباء و اجداد کو ہم پر یا ہمارے باپ دادا اور ہماری اولاد کو فلاں پر سبقت حاصل ہے۔ یا فلاں تو اس کی اولاد اور اس کے پوتوں پر پوتوں پر سبقت حاصل ہے تو یہ سبقت، سبقت زمانی ہے خطبہ میں اس مقام پر یہ سبقت مراد نہیں ہے۔

سبقت تکوینی : ۱- آپ آئینہ میں اپنے عکس پر غور کریں۔ آپ جب تک آئینہ کے سامنے کھڑے رہیں گے آپ کا عکس اسمیں نظر آئے گا۔ یہاں آپ کی ذات آپکے عکس پر سبقت رکھتی ہے۔ اس سبقت کو "سبقت تکوینی" یا علت و معلولی سبقت کہتے ہیں یعنی جب تک آپ آئینہ کے سامنے نہ ہوں گے آپ کا عکس آئینہ میں نہیں دکھائی دے گا۔

۲- وہ قوی نور جو صحن خانہ میں ہوتا ہے اسی کا جلوہ کمروں میں نظر آتا ہے۔ وہ قوی نوران جلووں کی بہ نسبت سبقت رکھتا ہے لیکن سبقت کا مطلب سبقت زمانی نہیں ہے۔ چوں کہ یہاں سرے سے زمانہ ہی نہیں ہے، یہاں جو کچھ ہے وہ نور قوی اور اس کا کمروں میں بکھرنے والا جلوہ ہے اگر وہ نور نہ ہوتا تو کمروں میں جلوہ بھی نہ ہوتا۔

۳- آگ جلاتی ہے لہٰذا آگ حرارت پر سبقت رکھتی ہے لیکن یہاں بھی سبقت زمانی نہیں ہے بلکہ سبقت علی و معلولی ہے۔ اس لئے کہ حرارت، آگ کا معلول ہے۔ اس سبقت کو "سبقت شیئی و فیئی" بھی کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی سبقت اور اس کا سایہ۔ یہاں گویا حرارت آگ کا سایہ اور پرتو ہے۔ اسی طرح آئینہ میں جو آپ کا عکس نظر آتا ہے وہ آپکا سایہ اور جلوہ ہے یہ سایہ واقعی سایہ نہیں ہے یہ آپ کے سایہ کی طرح ہے۔ لہٰذا اس کو سبقت "شیئی و فیئی" کہتے ہیں۔

بنابرایں زمانوں پر خدا کی سبقت، سبقت علی اور معلولی ہے۔ اس لئے کہ تمام زمانے مخلوق اور معلول خدا ہیں خدا کے یہاں دراصل کوئی زمانہ ہی نہیں جس کی وجہ سے سبقت زمانی ثابت ہو سکے!

"والعدم وجودہ"

خدا کا وجود عدم پر سبقت رکھتا ہے۔

دنیا کے تمام موجودات پہلے نہیں تھے خدا نے ان کو پیدا کیا عدم سے وجود میں لایا۔

یہ اس اعتبار سے خدا سے متاخر ہیں اور تمام موجودات معلول ذات خدا ہیں لہٰذا مولاؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "خدا عدم پر سبقت رکھتا ہے" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام موجودات عالم پر سبقت رکھتا ہے۔

ابتداء زمانہ کی خصوصیت ہے۔

"والابتداء ازلہ"

خداوند عالم کی ازلیت تمام موجودات کی ابتدا پر مقدم ہے

دنیا کے تمام موجودات چونکہ زمانہ رکھتے ہیں اس لئے ان کی ابتدا بھی ہے مثلاً اگر آپ کی عمر ستر سال کی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ستر سال پہلے نہیں تھے یا آپ کے والدین مثلاً ایک سو بیس سال پہلے نہیں تھے۔ غرضکہ ہر چیز کی ایک ابتدا ہے لیکن خدا کی کوئی ابتدا متصور ہی نہیں ہے — اس لئے کہ وہ موجود ازلی ہے — ازلی یعنی وہ موجود جہاں ابتدا ہی نہیں ہے جس طرح ابدی ایسے موجود کو کہتے ہیں جس کی انتہا نہ ہو۔ سرمدی ایسے موجود کو کہتے ہیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر ہو (اسی طرح ازلی وہ موجود ہے جس کی ابتدا نہ ہو)

لہٰذا خدا جو ازلی ہے اس کو ان تمام موجودات پر سبقت حاصل ہے جن کی کوئی ابتدا ہے۔ اس کی ازلیت، موجودات حادث کی ابتدا سے مقدم ہے۔

ابتدا اور انتہا زمانہ کی خصوصیت ہے چونکہ خدا کے لئے زمانہ کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے یہاں ابتدا اور انتہا بھی نہیں ہے اور قرآن میں جو یہ ذکر آیا ہے کہ "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" تو یہاں اول اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ زمانہ کے اعتبار سے اول ہے بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ خدا ازلی ہے اور تمام موجودات اسی واجب الوجود کے معلول ہیں۔

یہاں تک اس عمیق خطبہ کے پہلے حصہ کی حتی الامکان تفسیر بیان کی گئی اب انشاءاللہ آئندہ دوسرے حصہ کی تفسیر اور توضیح پیش کی جائے گی۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترجمہ: جناب سید منظور محسن رضوی
جناب محمد تقی رحیمیان

انسان اور فطرت

فطری خواہشات سے متعلق منکرین کا نظریہ۔

مذکورہ پانچ معقولات میں ہم نے خواہشات انسانی کے سلسلہ میں جو دو طرح کی توجیہات پیش کی ہیں ان میں سے ایک توجیہہ تو یہ تھی کہ ہر خواہش کا سرچشمہ انسانی فطرت ہے۔ یعنی انسان خود ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جو روح اور بدن کا مرکب ہوتی ہے۔ عناصر طبیعی انسان کو طبیعت سے اور عناصر غیر طبیعی اسے ماوراء طبیعت سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ انسانی خواہشات میں حقیقت جوئی ایجادیت، عبادت و پرستش وغیرہ کے رجحانات انسان کی روح سے متعلق ہوتے ہیں اور بعض دوسری خواہشات کا تعلق بدن سے ہوتا ہے۔

خواہشات کے بارے میں یہ ایک توجیہ ہے جو ہم نے پیش کی ہے اس کے علاوہ دوسری توجیہات بھی ہیں، جن میں انسانی خواہشات کو فطری نہیں بتایا گیا ہے۔ اگر یہ خواہشات فطری نہ ہوں گی تو لا محالہ ہم کو ان خواہشات کے لئے بیرونی اسباب ڈھونڈھنے پڑیں گے۔ مثال کے طور پر رجحان اور اس کے تقدس کے جذبہ کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور تلاش کرنا پڑے گا۔ اس طرح کے نظریات کے حامل لوگ کہتے ہیں کہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انسان بھی حیوان کے لئے غریزہ کی بنیاد پر اپنے کام انجام دیتا ہے۔ اور جو کچھ وہ چاہتا ہے ان سب کا تعلق اس کی معیشت اور مادی و طبیعی ضروریات سے ہوتا ہے۔ انسان اپنی مادی اور اقتصادی ضروریات کے لئے دوسری چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ مثلاً انسان قانون کا محتاج اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی اجتماعی

زندگی گزارنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کے مصالح اور منافع اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ معاشرہ کے ساتھ رہے۔ اسی کے پیش نظر اس نے طے کیا کہ معاشرہ میں زندگی گزارنے کے لئے کچھ قوانین وضع کئے جائیں تاکہ قوانین کی پیروی کر کے انسان اپنے مفادات حاصل کرے اور نقصانات سے محفوظ رہے۔ معاشرہ نے اگر نظام عدل بنایا ہے تو اس لئے بنایا ہے کہ معاشرہ کا فائدہ، نظام عدل مقرر کرنے ہی میں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اجتماعی زندگی بغیر نظام عدل کے گزارنا ممکن نہیں ہے تو ہم عدالت کے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور عدالت پسند بن جاتے ہیں تاکہ ایک دوسرے پر زیادتی کا خوف جاتا رہے۔ عدالت کو بحیثیت عدالت کے پسند کرنا ان لوگوں کے نزدیک کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور بے معنی سا ہے۔

اسی طرح جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کی مادی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے بہترین ذریعہ صرف علم ہے تو وہ علم کو مقدس مان لیتا ہے اور اس کے لئے ایک قسم کا تقدس فرض کر لیتا ہے۔ ورنہ، ذاتاً علم کو مقدس نہیں مانتا۔ ان کا خیال ہے کہ علم کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کے لئے لوگ طرح طرح کی نیرنگیوں سے کام لیتے ہیں اور اپنی اطلاعات، معلومات اور اسباب کے ذریعہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں تاکہ لوگ انکی طرف متوجہ ہوں اور وہ علوم و معلومات حاصل کریں جو ان کے پاس ہیں۔ یہ لوگ زبردستی علم کو تقدس کا درجہ دیتے ہیں اور بلاوجہ بڑھ چڑھ کر علم کی تعریف کرتے ہیں۔

اسی طرح سے یہ لوگ انسان کی دوسری فطری خواہشات کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہنر و حسن پسندی، ایجاد و تخلیق اور اسی طرح عشق و پرستش کا جذبہ بنیادی طور سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ بات غلط ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات میں اس قدر گم ہو جائے کہ خود اپنے ہی کو بھول جائے یا اگر عشق میں گرفتار ہو جائے تو اپنی ساری کائنات اس پر قربان کر دے یا اپنی چیزیں دوسروں کو بلاوجہ و غرض کے دیدے کسی صورت سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

مادی مکاتب کے دو گروہ دلیر اور بزدل:۔

اسی طرح کے نظریات سے انسانی اقدار اپنی بنیاد سے ڈھے جاتی ہیں۔ اسلئے ان

لوگوں نے مجبور ہو کر انسانی اقدار کو ان لوگوں کے مفروضات اور ایجادات قرار دیدیا جو دوسروں کا استحصال کرنے کی خاطر ان کا اختراع کرتے ہیں۔ جب ان سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ پھر بتائیے کہ ایثار، احسان اور فداکاری کے کیا معنی ہیں تو ان کے پاس اس کا سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا ہے کہ یہ سب مفروضات اور ذرائع استحصال ہیں۔ یہ ہیں ان کے خیالات اور نظریات۔ ان میں سے صرف بعض مکاتب فکر ایسے ہیں جو اپنے نظریات کے نتائج کے دلیرانہ طور پر پابند رہتے ہیں۔

تمام مادی مکاتب فکر میں یہ دلیری نہیں پائی جاتی جیسا کہ فطری معلومات کے بارے میں یہ بات آچکی ہے کہ فلسفہ حسیت جب یورپ میں بہت شہرت پا گیا تو یورپ والوں کا ایک گروہ تو حسی اور اپنی فکر کا پابند رہ کر فلسفہ حسیت کے نتائج کا وفادار رہا اور کھل کر یہ بھی دیا کہ ہم صرف ان ہی چیزوں کا اعتقاد رکھتے ہیں جن کا ہم حواس کے ذریعہ ادراک کرتے ہیں۔ باقی کسی چیز کو ہم نہیں تسلیم کرتے۔ مگر اس کے باوجود غیر حسی چیزوں کا انکار بھی نہیں کرسکتے۔ اس طرح کے لوگ دو اصول کے وفادار رہے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہم جس چیز کو محسوس نہیں کرتے۔ اس کی نہ تو ہم نفی کرتے ہیں اور نہ ہی اس کا اقرار کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مسائل جن کو عام لوگ مانتے ہیں۔ چونکہ باوجود تحقیق و تلاش و جستجو کے ہم ان کو محسوس نہیں کرسکے اس لئے ہم نے ان کو نہیں مانا۔ جیسے علت و معلول کے قانون کو لوگ مانتے ہیں مگر ہم نہیں مانتے۔

قانون علیت کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ جو کچھ ہمارے مشاہدے میں ہے یہ ہے کہ چیزوں کو ہم ایک دوسرے کے بعد اور ایک دوسرے کے قریب توقع پذیر دیکھتے ہیں۔ اب رہی وہ بات جس کو علیت کا نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ 'الف' 'ب' کے وجود کے لئے علت ہوتا ہے یعنی یہ سمجھنا کہ اگر 'الف' نہ ہوتا تو 'ب' بھی نہ ہوتا یہ بات عقل کے ذریعہ ہماری سمجھ میں تو آتی ہے۔ مگر چونکہ حس اس کو ثابت نہیں کرتی اس لئے ہم اس کو نہیں مانتے کہ علیت بھی کوئی چیز ہے۔

حسی پسندوں میں یہی گروہ دلیر کہلائے گا جو اپنے مکتب حسیت کے نتائج کا دلیرانہ

پابند ہے چنانچہ اپنی اس دلیری کی وجہ سے یہ گروہ قابل تعریف بن گیا ہے۔

مکتب حسیت کا دوسرا گروہ، وہ ہے جو اپنے مکتب کے بنیادی افکار میں تو حسی ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے اپنے حسی افکار کا پابند نہیں رہتا ہے اور عقلی بن جاتا ہے۔ مادہ پرست اسی قسم کے گروہ میں سے ہیں۔ مادہ پرست شناخت کے باب میں حسیون کی طرح اظہار نظر کرتے ہیں مگر فلسفی مسائل میں عقلی بن جاتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ ان مسائل پر تکیہ کرتے ہیں جن کے متعلق حس خاموش ہے (یعنی وہ مسائل جو عقلی ہیں) اس طرح انسانی خواہشات کے باب میں بھی یہ لوگ دو نوعوں پر منقسم ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ہیں جو فریب دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اپنے مادی مکتب کے نتائج کے دلیرانہ پابند ہیں۔ دلیر مادی افراد روح کی مادیت کے لوازم کو ہر اعتبار سے تسلیم کرتے ہیں جیسے "نطشے" جو ایک مادی فلسفی ہے۔ وہ انسانی روح اور روح سے متعلق رجحانات کا قائل نہیں ہے وہ اپنی مادی فکر کی بنیاد پر جو نتیجہ نکالتا ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ بطور عموم جو کچھ ہم اخلاق کے نام سے سنتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ان کی اصل میں کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں ہے علماء جو کچھ کہتے ہیں کہ ہوا و ہوس کے پیچھے نہ دوڑو کمزوروں کی مدد کرو سب ڈھکوسلہ اور فریب ہے، میں اس کے برعکس کہتا ہوں کہ ہوا و ہوس کے تعاقب میں دوڑو اور قطعاً کمزوروں کی مدد نہ کرو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

چون بینی کہ نابینا و چاہ است　　　اگر خاموش بنشینی گناہ است

اگر دیکھو کہ اندھا ہے اور کنواں ہے۔ اگر چپ بیٹھے رہو گے اور اندھے کی مدد نہ کرو تو یہ گناہ ہے" مگر "نطشے" کہتا ہے کہ اگر تم نے اس وقت کچھ کہا اور اندھے کو کنویں میں گرنے سے بچا لیا تو یہ گناہ ہوگا۔ بلکہ ایسے موقعہ پر مناسب یہ ہوگا کہ ایک پتھر اس کو اور مار دو۔ اس لیے کہ جو کمزوری اور ناچاری کے راستہ پر ہے وہ درحقیقت ایک طبیعی راستہ پر ہے ایسے کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ زندگی کا حق تو صرف طاقتور کو ہی حاصل ہے جیسے چنگیز کو زندہ رہنے کا حق حاصل تھا کیونکہ وہ طاقتور تھا۔ ایسے موقع پر رحم کھانے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ترحم اور ایثار تو حقیقت کی نگاہ میں کمزوری کی نشانی ہے۔

"نطشے" نے اسی طرح سے تمام انسانی اقدار کی نفی کر دی ہے۔

انسان کو محض مادی موجود ماننے کا نتیجہ۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم انسان کو سو فیصدی ایک مادی موجود تصور کرلیں تو ہمارے لئے سوائے اس راستہ کے اور کوئی راستہ نہیں جو "نطشے" نے پیش کیا ہے یعنی یہی انسانیت اور انسانی اقدار موہومات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

یقیناً یہ ایک متضاد بات ہے کہ ایک طرف تو ہم انسان کو سو فیصد مادہ پرست موجود تصور کریں اور دوسری طرف ہم سو فیصد مادی انسان کو، انسانی اقدار کا حامل بھی مانیں۔

ہماری نظر میں انسانی اقدار کی صحیح توجیہ۔

ہماری نظر میں حقیقت یہ ہے کہ انسانی اقدار کا رابطہ براہ راست انسان کی فطرت سے ہوتا ہے۔ اس طرح اقدار انسانی کا مسئلہ ہمارے اس بیان سے قابل توجیہ بن جاتا ہے۔ یعنی ہم انسان کی ذات میں ایک ایسے مقدس سرمایہ کے قائل ہوجائیں جس کی وجہ سے انسان عظمت و بزرگی کا میلان رکھتا ہے۔

انسان عقل و شہوت کے دوراہے پر:

یہاں اس متفقہ حدیث کو پیش کرنا مناسب ہوگا کہ خداوند عالم نے فرشتہ کو پیدا کیا اور اسے عقل محض قرار دیا۔ پھر حیوان کو پیدا کیا اور اسے صرف شہوت کا مجسمہ بنایا۔ پھر انسان کی تخلیق کی اور اسے فرشتہ اور حیوان کی سرشت کا مرکب قرار دیا۔ چنانچہ الفاظ حدیث یہ ہیں:۔

ان اللہ تعالیٰ خلق الملائکۃ ورکب فیھم العقل
وخلق البھائم ورکب فیھم الشھوۃ وخلق الانسان
ورکب فیھم العقل والشھوۃ۔

مولانا روم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

در حدیث آمد کہ خلاق مجید — خلق عالم را سہ گونہ آفرید

حدیث میں ہے کہ خدائے بزرگ نے مخلوقات کی تین نوعیتوں پر تخلیق فرمائی ہے۔ چونکہ انسان میں دو طرح کی قوتیں یعنی بلندی اور پستی پائی جاتی ہے اس لئے وہ دو مختلف و متضاد رجحانات کا حامل بھی ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے انسان کو عقل سے نواز کر اسے بلندی اور پستی کے راستوں میں مختار بنا دیا ہے۔

انا ھدینٰہ السبیل اما شاکراً و اما کفوراً (سورہ دہر/۳)

ہم نے انسان کو (صحیح) راستہ کی نشاندہی کر دی اب (اسے اختیار ہے) چاہے وہ (صحیح راستہ ڈھونڈھ کر) شکر گزار بندہ بنے خواہ (غلط راستہ اختیار کر کے) ناشکرا بن جائے۔

انسان کے بلندی اور پستی کے متضاد واقعات جو بعد میں تاریخ کا سرچشمہ بنے انسان کی ان ہی دو قوتوں، عقل و شہوت سے وابستہ ہیں جو لوگ عقل کی بلندی اور عصمت کے راستہ پر چلے وہی لوگ حق ہیں حقیقت پسند اور اللہ والے کہلائے اور جن لوگوں نے خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہوئے حیوانیت کا راستہ اختیار کیا وہ لوگ حیوان صفت اور پست انسان کہلائے۔

چنانچہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ انسانوں کے مقابلے صرف فائدہ حاصل کرنے اور طبقاتی نظام کی بنیاد پر نہیں ہوتے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ محروم طبقہ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے اس میں بہت حصہ لیتا رہا ہے۔

اس بنیاد پر جن چیزوں کے ذریعہ انسان کو انسانیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا سرچشمہ انسان کے اندر موجود معنوی، روحی اور ملکوتی پہلو ہوتا ہے کہ مادی خواہشات متضاد پہلوؤں اور جنبوں میں سے انسان کو صرف معنوی اور روحی پہلو ہی کو اختیار کرنا چاہئے۔

ملکوتی پہلو انسانیت کا سرچشمہ۔

مولانا روم کہتے ہیں کہ انسان میں آسمانی و ملکوتی پہلو اور دوسری طرف اسی میں

یعنی اور مادی پہلو دوش بدوش موجود ہوتا ہے اور انسان ہمیشہ ان دو پہلوؤں کے درمیان مذبذب و متردد رہا ہے چنانچہ کبھی تو وہ ملکوتی پہلو اختیار کر کے بلندیوں میں پرواز کرتا ہے اور کبھی مادی پہلو کے انتخاب کے نتیجہ میں پستیوں میں گر جاتا ہے۔ انسان برابر اسی کشمکش میں گرفتار رہا ہے کہ کون پہلو اختیار کرے۔ ملکوتی اور مادی راستوں کی وضاحت کے لئے مولانا روم اس حقیقت کو ایک مثال میں بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں:

روحانیت اور مادیت کی کشمکش اور مولانا روم کی تمثیل

ایک بار کا ذکر ہے کہ مجنون ایک ایسی اونٹنی پر بیٹھا جس نے ابھی تازہ بچہ جنا تھا۔ وہ اونٹنی پر بیٹھ کر اپنے محبوب سے ملنے اس کے گھر جا رہا تھا۔ جب اس نے کچھ راستہ طے کر لیا تو محبوب کی یاد میں ایسا محو ہوا کہ ہاتھ سے اونٹ کی مہار چھوٹ گئی اور اسے پتہ نہ چلا۔ اونٹنی نے جب اپنے کو بے مہار دیکھا تو سمجھی کہ میں اب آزاد ہوں اور محسوس کیا پیٹھ پر صرف ایک بوجھ باقی رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنا نومولود بچہ زیادہ یاد آنے لگا۔ لہٰذا اس نے اپنا رخ گھر کی طرف موڑ دیا اور دھیرے دھیرے اپنے گھر پہونچ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجنون متوجہ ہوا اور اس نے دیکھا محبوب کے گھر کے بجائے اونٹنی کے تھان پر ہے۔ لہٰذا وہ دوبارہ اونٹنی پر بیٹھا اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ دیر نہ گزری تھی کہ وہ دوبارہ محبوب کی یاد میں کھو گیا اور مہار ہاتھ سے چھوڑ دی لہٰذا اونٹنی دوبارہ اپنے تھان پر لوٹ آئی چنانچہ چند بار یہی سلسلہ جاری رہا کہ اونٹنی چلی اور پھر اپنے ہی تھان پر واپس آگئی۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہمچو مجنون در تنازع با شتر   گہ شتر چربید و گہ مجنون حر

یک دم از مجنون ز خود غافل شدی   ناقہ گردیدی و واپس آمدی

کہتے ہیں کہ چند بار کے اس سلسلہ کے بعد مجنون اونٹنی پر سے نیچے اتر آیا اور کہنے لگا ؎

ای ناقہ چون ہر دو عاشقیم   ما دو ضد بد ہمرہ نا لایقیم

اے اونٹنی ہم دونوں عاشق ہیں۔ تو بھی عاشق ہے اور میں بھی چنانچہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ضد ہیں اور ایک دوسرے کے برے ساتھی ہیں۔ مجھے لیلیٰ کے پاس پہونچنا ہے اور تجھے اپنے بچے کے پاس۔

عشق مولا کے کم از لیلا ستی   بندہ بودن بہر او اولا ستی

مولا کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کم نہیں ہے اور خدا کی بندگی ہی زیادہ سزاوار ہے۔

غرض تمام مقولات و اقدار جو انسان کی خصوصیات سے ہیں۔ وہ سب کی سب قابل توجیہ و تفسیر ہیں۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ مادہ پرست ان کی توجیہ بیان کرنے سے معذور ہیں۔

اقدار انسانی کی توجیہ کے سلسلہ میں مکتب وجودی نے ایک نظریہ پیش کیا ہے۔ اور ان لوگوں نے انسان کو ایک مادی موجود جاننے کے باوجود اقدار انسانی کی تعبیر و توجیہ پر توجہ کی ہے۔ جو انشاء اللہ آیندہ زیر بحث آئے گی۔

جناب عباس علی عمید زنجانی۔

ترجمہ: جناب خادم حسین

شوریٰ — اسلامی نظام سیاست کی اساس

شوریٰ قدیم ترین رائج اصولوں، روایتی احکام و مقررات اور معاشرتی زندگی کے عاقلانہ طریقوں میں میں سے ایک ہے، پرانے سے پرانے انتظامی طریقوں اور انسانوں کی معاشرتی زندگی میں شوریٰ کی جھلک دکھائی دیتی ہے یہاں تک کہ ظالم سے ظالم حکومتوں کی بھی یہی کوشش رہی کہ شوریٰ کا سہارا لے کر ایک طرف تو عوام کو امی اور خاموش رہنے پر مجبور کرسکیں اور دوسری طرف ان غلطیوں میں کمی لاسکیں جو ان کی خود رائی و مطلق العنانی کی بنا پر واقع ہوتی تھیں۔

انسانی تاریخ میں مفکر و تجربہ کار افراد سے مشورہ اور تبادل نظر کا دائرہ سماجی زندگی سے کہیں زیادہ وسعت کا حامل رہا ہے۔ لوگ اپنی مشکلوں کا حل تلاش کرنے، صحیح تجاویز حاصل کرنے اور فردی و ذاتی زندگی میں مشکلوں سے چھٹکارا پانے کے لئے اسی طریقۂ کار کا سہارا لیتے تھے۔

انسانی زندگی کی تاریخ نے بنیادی تبدیلی اور نیا موڑ اس وقت اختیار کیا ہے جب انسان نے خود پسندی و مطلق العنانی سے نکل کر سماجی زندگی و اجتماعی فکر کا سہارا لیا ہے۔

اسلام کے طریقۂ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ وہ اقوام و ملل عالم کی ہر مثبت و تعمیری رسم و روایت کی تائید اور مفید و اصول و ضوابط کی رعایت پر تاکید کرتا ہے، کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس فطری آئین نے شوریٰ (جو عاقلانہ طریقہ اور عرف عام ہے) کی بھی تصدیق کی ہے۔

اسلامی حکومت بھی کسی خاص گروہ یا طبقے سے مخصوص نہیں ہے، وہ صالح و متقی افراد کے ہاتھ میں ایک الٰہی و عوامی امانت ہے اس کی ماہیت استبداد و خود خواہی سے ہرگز سازگار نہیں، اس اعتبار سے وہ تمام سیاسی اور مستقبل ساز فیصلوں میں عوامی مشارکت کے لئے زمین ہموار کرتی ہے اور چونکہ اسلام کے سیاسی نظام کا مقصد انسان کو درجۂ کمال تک پہنچانا اور زندگی کے تمام شعبوں میں قسط و عدل قائم کرنا ہے اور یہ مقصد سماج کے تمام افراد کی مشارکت کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا، اس بنا پر اسلامی حکومت کے لئے شوریٰ

ایک ناگزیر طریقۂ عمل ہے۔

شوریٰ کتاب و سنّت کی رو سے :

اسلامی مآخذ و مصادر (کتاب و سنّت) میں اسلام کے سیاسی معاشرے کے نظم و نسق چلانے کے لئے شوریٰ کو لازمی اور ناقابل گریز طریقۂ کار تسلیم کیا گیا ہے اور اس پر عمل کی تاکید ہوئی ہے۔

قرآن مجید ایک مقام پر مؤمنین اور مکتب اسلام کی پیروی کرنے والوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شوریٰ کو ایمان اور اسلامی معاشرے کا خاصہ قرار دیتا ہے :

والذین استجابوا لربهم واقاموا الصلاة وامرهم شورىٰ بينهم ومما رزقناهم ينفقون والذين اذا اصابهم البغي هم ينتصرون " (شوریٰ/۳۸، ۳۹)

اور جو اپنے پروردگار کا حکم مانتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور ان کے کل کام آپس کے مشورہ سے ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اور (وہ ایسے ہیں کہ) جب ان پر (کسی قسم کی) زیادتی ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے مدد لیتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر فرمان و حکم کے طور پر ارشاد ہوا ہے پیغمبرؐ کے لئے شوریٰ کو لازمی قرار دیتے ہوئے ہمرزموں اور ساتھیوں کی آراء کو قابل احترام سمجھنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کو کامیابی کے اسرار و رموز میں شمار کیا گیا ہے۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم في الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ان الله يحب المتوكلين (آل عمران/۱۵۹)

(تو اے رسول یہ بھی) خدا کی ایک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل (سردار) ان کو ملا اور تم اگر بدمزاج اور سخت دل ہوتے تب تو یہ لوگ (خدا جانے کب کے) تمہارے گرد سے تتر بتر ہو گئے ہوتے پس (اب بھی) تم ان سے درگزر کرو اور ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگو اور ان سے کام کاج میں مشورہ کر لیا کرو (مگر) اس پر بھی جب کسی کام کو ٹھان لو

تو خدا ہی پر بھروسہ رکھو (کیونکہ) جو لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں خدا ان کو ضرور دوست رکھتا ہے۔

پیغمبر اسلام کی سیرت و سنت اسی بنیاد پر استوار تھی، اس لئے کہ قرآن پیغمبر اسلامؐ کی مکمل زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے اور ان کے فضائل و خصائل کو بیان کرتا ہے، اس کے علاوہ خود پیغمبر اسلامؐ کا کردار و عمل حکم خدا اور اصول قرآن کا مفسر ہے۔

ہم یہاں پر بدر و خندق جیسے غزوات یا طائف کے لوگوں کے ساتھ معاہدے کے تذکرہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اس لئے کہ ہر آگاہ و محقق جو تاریخ اسلام اور سیرت رسولؐ سے واقف ہے اس کے لئے یہ بات مسلّم و ناقابل تردید ہے کہ شوریٰ سنت پیغمبرؐ ہے آپ نے اپنی سیاسی زندگی کے دوران بارہا مشورت کی ہے اور اس اصول پر کاربند رہے ہیں۔[1]

اسلامی روایتوں میں مختلف انداز میں مشورت کی تاکید اور خود خواہی سے ممانعت کی گئی ہے۔[2]

اس سلسلے میں نمونہ کے طور پر کچھ روایات پیش کر رہے ہیں:

"المستشار مؤتمن[3]"، جس سے مشورہ کیا جاتا ہے وہ امانت دار کے مانند ہوتا ہے۔

"اذا استشار احدکم اخاہ فلیشر علیہ[4]" تم میں سے جب بھی کوئی اپنے دینی بھائی سے مشورہ کرے اسے اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے۔

"یا علی ما حار من استخار ولا ندم من استشار[5]" اے علیؑ! حیران نہیں رہا جس نے خدا سے طلب خیر کی اور پشیمان نہ ہوا جس نے مشورت کی۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب جہاد ص۸۳۔ مسند احمد ابن حنبل ۳/ ص۲۱۹ و ص۲۵۷ و ص۲۴۳۔ صحیح بخاری باب اعتصام ص۱۳۔ اور ابن ماجہ باب اذان ص۱

[2] بحار الانوار جلد ۲۷، ص۹۷۔ غرر الحکم و درر الکلم آمدی جلد ۷ ص۱۸۳۔ مسند احمد بن حنبل ۵/ ۲۷ ۲۔ ۱۳۔ صحیح بخاری باب اعتصام ص۲۸۔۳۵۔ سنن ابی داؤد باب آداب ص۱۱۴۔ ابن ماجہ باب آداب ص۳۷ اور نسائی باب جہاد۔

[3] سنن ابی داؤد باب آداب ص۱۱۴

[4] سنن ابن ماجہ باب آداب ص۳۷

[5] بحار الانوار جلد ۲۷، ص۹۸

"انّ رسول اللّٰہ علیہ وآلہ وسلّم کان یستشیر اصحابہ ثم یعزم علیٰ ما یرید اللّٰہ۔[1]"

رسول خداؐ پہلے اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے پھر مشیت الٰہی کو عملی جامہ پہناتے تھے۔

"مشاورۃ العاقل الناصح رشد ویمن وتوفیق من اللّٰہ فاذا اشار علیک الناصح العاقل فایاک والخلاف فان فی ذلک العطب۔[2]"

عقلمند نصیحت کرنے والوں سے مشورہ کرنا ہدایت، رشد اور برکت ہے۔ نیز حقیقت سے ہمکنار ہونے کے لئے توفیق الٰہی ہے، لہٰذا جب کبھی کوئی عقلمند تمہارا خیر خواہ بنے اور تمہیں مشورہ دے تو مخالفت وانکار نہ کرنا کیونکہ اس طرح کی مخالفت میں دشواری وسختی پیش آئے گی۔

"تصدقوا علیٰ اخیکم بعلم یرشدہ ورأی یسددہ[3]"

اپنے ایمانی بھائی کو صدقہ دو اس علم کا جس سے اسے ہدایت ملے اور اس رائے کا جس سے اس کے عمل میں استحکام پیدا ہو۔

"الحزم ان تستشیر ذا الرأی[4]" عقلمندی اسی میں ہے کہ عقلمندوں کے ساتھ مشورہ کرو۔

"وامورکم شوریٰ بینکم[5]"

تمہارے کام آپسی مشورے کے ذریعہ انجام پانا چاہئے۔

یہاں تک کہ پیغمبر اسلام نے مشورہ کئے بغیر بیعت کرنے سے[6] منع کیا ہے اور حضرت علیؑ نے خدا سے خوف رکھنے والے تجربہ کار عقلمند دانشوروں کو بہترین مشیر[7] بتایا ہے نیز خود خواہی و

---

[1] محاسن برقی، ص۶۰۱ [2] محاسن برقی ص۶۰۲

[3] بحار الانوار جلد ۲، ص۱۰۵ [4] بحار الانوار جلد ۲، ص۱۰۵

[5] صحیح ترمذی، باب فتن، ص۸ [6] صحیح بخاری، باب حدود ص۳۱ ۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۱، ص۵۶

[7] غرر الحکم جلد ۳ ص۲۲۸ مطبوعہ دانشگاہ (خیر من شاورت ذوو النھی والعلم واولو التجارب والحزم)

(مطلق العنانی کو گمراہی سے توصیف کیا ہے۔[1]

شوریٰ کے جواز کو ایک طرح سے اجماع (جو معتبر دلائل و فقہی مصادر میں شمار ہوتا ہے) اور مسلمانوں کی سیرت سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح عقلی دلائل ان امور میں شوریٰ کو لازمی قرار دیتے ہیں جن کا تعلق عوامی مفادات سے ہو چنانچہ شوریٰ کا شمار مستقلات عقلیہ میں ہوتا ہے۔

اسلام میں شوریٰ کا تعلق صرف انفرادی و ذاتی مسائل سے ہی نہیں ہے بلکہ تمام معاشرتی، سیاسی اقتصادی اور حکومتی مسائل سے ہے اس لئے کہ شوریٰ کا جو معیار روایات میں بیان ہوا ہے وہ سماجی زندگی کے تمام امور پر مشتمل ہے۔

ہر شوریٰ کے لئے چونکہ ایک قسم کی آزادی و اختیار عمل لازمی ہے اور اسلام نے کچھ مسائل سے متعلق آزادی و دائرہ اختیار کو محدود کر رکھا ہے لہٰذا شوریٰ بھی اس اصول کی تابع ہے، اس لحاظ سے شوریٰ مندرجہ ذیل دو صورتوں میں محدود ہے۔

۱۔ شریعت کے واجبات اور ثابت احکام الٰہی جو شوریٰ کے ذریعہ ناقابل تغیر ہیں اور شوریٰ صرف اس کے طریقۂ نفاذ اور منصوبہ سازی کو معین کر سکتی ہے۔

۲۔ وہ احکام جو پیغمبرؐ، امامؑ، ولی فقیہ اور حاکم شرع کے ذریعۂ ثانوی و متغیر عنوان سے صادر ہوتے ہیں۔[2]

شوریٰ کی مختلف شکلیں:

شوریٰ اسلامی کے نفاذ کے دو طریقے ہیں:۔

۱۔ شوریٰ انتظامیہ کے لئے معاون کی حیثیت سے: اس کا کام انتظامیہ کو ہدایت دینا ہوتا ہے۔ اس طرح کی شوریٰ انتظامی امور کی ذمہ داری سے بری ہوتی ہے۔ آخری فیصلہ انتظامیہ کے ذمے ہوتا ہے شوریٰ انتظامیہ کی کارکردگی کی رکاوٹ نہیں بن سکتی، خلاف ورزی کی صورت میں متنبہ یا قانونی مراجع کے ذریعہ انتظامیہ سے جواب طلب کر سکتی ہے۔

۲۔ شوریٰ ذمہ دار و صاحب اختیار منصب کے عنوان سے: فردی منتظم کے بجائے تمام ذمہ داریوں کی

---

[1] غرر الحکم جلد ۵ ص ۱۶۹ (من استغنی بعقلہ ضل)   [2] علامہ طباطبائی عنوان مقالہ ولایت و زعامت، کتاب بررسیہای اسلامی ص ۱۸۰

مالک اور انتظام کی ذمہ دار قرار پائے، اس صورت میں انتظام گروہی شکل میں ہوگا اور تمام امور کا انحصار شوریٰ کی رائے پر ہوگا۔

دونوں میں سے ہر ایک شوریٰ کی کارکردگی مختلف ہے، معمولاً فوری، ضروری اور زود گذر مسائل سے متعلق پہلی قسم اور بنیادی، طویل المدت اور غیر فوری مسائل سے متعلق دوسری قسم کو اختیار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فوجی مسائل سے متعلق جس میں فوری حکم کی ضرورت ہوتی ہے دوسرے قسم کی شوریٰ بہت سے نقصانات پہنچا سکتی ہے اور قیمتی وقت برباد کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمان الٰہی "شاورھم فی الامر" کے بعد "فاذا عزمت فتوکل علی اللہ" آیا ہے تاکہ یہ حقیقت اجاگر ہوسکے کہ جب کبھی رہبر و قائد ضرورت سمجھے یا کچھ مسائل سے متعلق شوریٰ کی پہلی قسم کارآمد ہو تو شوریٰ کی دوسری قسم کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ دونوں قسم کی شوریٰ کی کارکردگی اور ان کے حدود کی تعیین کا کام شاید اسلامی حکومت میں شورائی نظام کے بنیادی مسائل میں شمار ہو۔

شوریٰ — اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی میں:

دستور اساسی میں شوریٰ کی دونوں قسموں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور حسب ضرورت دونوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اس اعتبار سے کہ نظام شوریٰ، شورای رہبری، شورائی نگہبان، خبرگان، مجلس شورای اسلامی، شورای عالی قضائی، شورای عالی دفاع اور شورای وزراء ان امور میں جو شوریٰ وزراء (کابینہ) کے ذریعہ پاس ہوتے ہیں اور ہر وزیر دوسرے وزیروں کے کام کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے،[1] میں شوریٰ کی دوسری قسم سے استفادہ کیا جاتا ہے اور دیہات، تحصیل، شہر، ضلع اور صوبہ سے متعلق شوریٰ جو قانون اساسی کے دفعہ نمبر ۱۰۰ میں مدنظر رکھی گئی ہے پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ اس طرح کی شوریٰ حکومتی ذمہ داروں کی مدد کے لئے مجلس شورای اسلامی کی جانب سے مقررہ قوانین وضوابط کے تحت اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔

شورای محلی (محلہ کمیٹی) سے متعلق قانون ۱۶ جون ۱۹۶۹ء (۲۶ تیر ۱۳۵۸ھ) کو شورای انقلاب اسلامی کے ذریعہ منظور ہوا اور شہری شوریٰ (بلدیہ کمیٹی) کا بل بھی اسی سال ۲۴ مہر (۱۶ اکتوبر) کو[2]

---

[1] دستور اساسی دفعہ ۱۳۷

[2] مجموعہ قوانین ۱۳۵۸ھ ص ۴۸

شورای انقلاب اسلامی کی جانب سے پاس ہوا۔[۲۹]

ہر وہ اسلامی شوریٰ جو قومی، صنعتی، زراعتی اور دفتری منتظمین کے دوش بدوش تشکیل پاتی ہے اس کا تعلق پہلی قسم سے ہوتا ہے اور صرف ہدایت وارشاد کے فرائض انجام دیتی ہے۔ شوریٰ کی اسی قسم کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے اپنی اس وصیت میں اشارہ فرمایا ہے جو آپؑ نے اپنے فرزند محمد حنفیہ کو کی تھی:

"اضمم آراء الرجال بعضها الی بعض ثم اختر اقربها الی الصواب وابعدها من الارتیاب" (مبانی فقہی قانون اساسی ص۱۳)

صاحب نظر افراد کی آراء کو جمع کر کے ان میں سے جسے حق وصواب سے قریب اور شک وشبہ سے دور سمجھتے ہو اسے اختیار کر لو۔

سیرت پیغمبر اسلامؐ میں بھی یہ بات ملتی ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یستشیر اصحابہ ثم یعزم ما یرید۔ (المحاسن برقی ص۶۰)

سیرت رسولؐ یہ تھی کہ وہ پہلے اپنے اصحاب کی آراء پر غور کرتے تھے پھر اپنے انتخاب کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے مشیر عبداللہ بن عباس سے فرماتے تھے۔

لک ان تشیر علیّ وأری، فان عصیتک فاطعنی۔ (کلمات قصار ص۳۲)

تم اپنی رائے ظاہر کرنے میں کوتاہی نہ کرنا لیکن اگر میں تمہاری رائے کے خلاف عمل کروں تب بھی تم میری پیروی کرو۔

شوریٰ کے اغراض ومقاصد:

اسلامی متون وروایات میں شوریٰ کے اصل اغراض ومقاصد کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ بنیادی مقصد خود محوری، خودخواہی، تنگ نظری اور اجارہ داری کے ناپسند نتائج سے بچنا نیز آزاد فکری کے ساتھ مختلف خیالات کی ہماہنگی سے افکار کا حصول اور اجتماعی طور پر کسی رائے پر اتفاق کرنا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے شوریٰ کی بنیاد " الاقرب فالاقرب" اور " الاصلح فالاصلح " اصول کے مطابق ہے۔ چونکہ عوام اسلامی نظامِ حکومت کی بنیاد ہیں اور ان کا تعاون بہترین کردار ادا کرتا ہے نیز ہمیشہ فرد کے بجائے اجتماع کی رائے حقیقت سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے لہٰذا" شوریٰ" وہ کسوٹی ہے جس پر ہر فرد اپنی رائے کو پرکھ سکتا ہے۔

پھر بھی ان بنیادی مقاصد کو مزید وضاحت کے ساتھ موقع و محل کی مناسبت سے شوریٰ کے لائحہ عمل کے طور پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی جمہوریہ ایران کے قانون اساسی میں دفعہ نمبر ۱۰۰ اور ۱۰۱ کے تحت مجلس مشاورت کے اغراض و مقاصد مجموعی طور پر ذکر کئے گئے ہیں جن کا تجزیہ و تحلیل کرنے سے درج ذیل چند عمدہ مقاصد سامنے آتے ہیں :۔

۱۔ ایک غیر مرتکز سیاست کا نفاذ ۲۔ عوامی نظم و نسق کی پالیسی ۳۔ عوام کے امور عوام کے حوالے کرنا ۴۔ کاموں کی رفتار میں تیزی لانا ۵۔ تفرقی و امتیاز کا خاتمہ ۶۔ اجتماعی نگرانی ۷۔ حکومتی اداروں کی کارکردگی میں اضافہ ۸۔ علاقائی پیمانے پر پروگراموں کی ہدایت۔ ۹۔ عوام کی تمام امور سے آگاہی ۱۰۔ حکومت کی توانائی کو فروغ دینا۔ اب ہم مذکورہ عناوین کی مختصر وضاحت کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔ ایک غیر مرتکز سیاست کا قیام (DECENTRALIZATION)

غیر مرتکز سیاست ایسے بڑے ملکوں کا جن کی حاکمیت غیر منقسم ہے بہترین سیاسی خاصہ ہے، خاص طور پر وہ ممالک جو وسیع و عریض جغرافیائی حدود کے ساتھ کثیر آبادی پر مشتمل اور مختلف رنگ و نسل کے حامل ہیں ان میں سیاسی تمرکز بہت سی مشکلیں پیدا کرسکتا ہے۔

کسی حکومت یا انتظامیہ کے اختیارات کو متمرکز کرنے سے وہی نقصانات سامنے آتے ہیں جو کسی ایک فرد کے ہاتھ میں تمام اختیارات سونپنے سے، دوسری طرف یہ طریقہ عوام کو حکومت سے علیحدہ کردیتا ہے اور بیہودہ سفارشات، ضیاع وقت، بیکاری اور سست رفتاری کے علاوہ دلالوں کے نفوذ نیز بیجا تفرقی و امتیاز اور طرح طرح کی دوسری بہت سی دشواریوں کو جنم دیتا ہے۔

ظلم و استبداد کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت تمام قدرت اختیار اور فیصلہ گیری

کا متمرکز ہونا بھی ہے عام طور پر یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔
سیاسی تمرکز کی شکل وصورت سے قطع نظر جو اصولاً بہت سے منفی اثرات کی حامل ہوتی ہے
یسے بھی یہ طریقہ کار، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اگر کسی وسیع وعریض مختلف القوم افراد پر مشتمل ملک
میں نافذ کیا جائے تو نتیجہ میں حکومت دور دراز کے علاقوں پر اپنی حاکمیت برقرار کرنے سے قاصر
رہے گی اور اس کا حال اس بیمار بدن کے مانند ہوگا جس کے بعض حصے خون نہ پہنچنے کی وجہ سے فاسد
بیکار ہو جاتے ہیں اور آخر کار ان کو بدن سے جدا کرنا پڑتا ہے۔
کسی وسیع اور غیر منقسم ملک میں غیر مرتکز سیاست مشترکہ ریاستوں کی فیڈرل حکومت کی طرح
ایک مناسب طریقہ شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں مرکزی حکومت کی اعلیٰ حاکمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے علاقائی
اور صوبائی حکومتیں مرکز کی برتری کو تسلیم کرتی ہیں اور متعلقہ علاقوں میں نظم ونسق کی خود ذمہ دار ہوتی ہیں اس
طرح مرکزی حکومت کے کچھ اختیارات اور ذمہ داریاں علاقائی حکومتوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔
ظاہر ہے حکومت واقتدار کی تقسیم جیسا کہ مشترکہ ریاستوں کے فیڈرل نظام میں کی جاتی ہے کسی
وسیع مملکت میں قائم غیر مرتکز سیاست پر ہرگز صادق نہیں آتی اور وہ اختیارات جو علاقائی
اداروں کے سپرد کئے جاتے ہیں مرکزی حکومت کی حاکمیت سے معارض نہیں ہوتے اور باوجود اس کے
کہ جو اختیارات علاقائی اداروں کے سپرد کئے جاتے ہیں، اس میں وہ مکمل طور پر اختیار وقدرت
رکھتے ہیں۔ پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ تمام علاقائی وشہری ادارے اپنے فیصلوں اور عمل میں مرکزی حکومت
کے نمائندوں کے طور پر ہی کام کرتے ہیں۔
جبکہ فیڈرلزم میں اختیارات ممبر ریاستوں اور مرکزی فیڈرل حکومت کے درمیان بٹ جاتے
ہیں اور ان میں سے ہر ایک قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے مکمل خود مختاری اور ایک قسم کی مستقل
سیاسی حیثیت کا مالک ہوتا ہے، اصولی طور پر اختیارات اور ذمہ داریوں کی تقسیم کا مسئلہ ایک
بڑے غیر متمرکز ملک اور فیڈرلزم کے درمیان قدر مشترک ضرور ہے لیکن عملی طور پر دونوں
کا طریقہ نفاذ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔
چنانچہ ایک وسیع وعریض غیر منقسم ملک میں جہاں غیر مرتکز سیاست نافذ العمل ہوتی ہے
مرکزی حکومت کے کچھ اختیارات اور ذمہ داریاں علاقائی سیاسی اداروں کے حوالے ہو جاتی ہیں

اور یہ ادارے مرکزی حکومت کے نمائندے کے طور پر قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں۔

اس کے برخلاف فیڈرل حکومت میں پہلے کچھ مستقل ریاستیں اپنی خودمختاری و استقلال کو محفوظ رکھتے ہوئے (سیاسی تمرکز کے اصول کے مطابق) ایک متحدہ حکومت قائم کرتی ہیں۔ پھر اپنے بعض اختیارات کو فیڈرل مرکزی حکومت کے سپرد کر دیتی ہیں۔

بڑے ملکوں میں غیر تمرکزی سیاست کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ وحدت سے کثرت یا مرکزیت سے تقسیم کی طرف راغب ہوتی ہے لیکن فیڈرلزم میں حکومت کثرت سے وحدت اور عدم تمرکز سے تمرکز کی جانب راغب ہوتی ہے۔

سیاسی و بین الاقوامی اصول کے مطابق "خودمختاری" کی اصطلاح فیڈرل حکومت کے ساتھ اختصاص رکھتی ہے اور بڑے ملکوں میں مرکز کی تابع علاقائی و شہری اداروں پر یہ اصطلاح صادق نہیں آتی۔ خودمختاری کی سیاست پر عمل درآمد ایک بڑے ملک کی حکومت کے لئے زمینوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے، نیز قومی حاکمیت کو پاش پاش کرکے مستقل حکومتوں کے وجود میں آنے اور بکھرنے کا رخ دوسری سمت میں تمرکز اور فیڈرل مرکزی حکومت کے قیام کی طرف ہوتا ہے اور یہ عمل حکومت کے بکھر جانے، قومی حاکمیت کے ختم ہوجانے اور زمین کے منقسم ہوجانے کے مترادف ہے۔ بڑے ملکوں میں قائم غیر متمرکز سیاست اور فیڈرل طریقہ حکومت کے درمیان اصولی اختلاف ہونے کے باوجود دونوں کے عمل میں کچھ مماثلت بھی پائی جاتی ہے جو قابل توجہ ہوسکتی ہے۔

فیڈرل طریقہ حکومت میں عام طور سے تینوں قوا (انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ) کے قوانین کے علاوہ فیڈرل حکومتیں یا اس سے وابستہ ممبر ریاستیں اپنے ذاتی بنیادی قوانین کی بھی حامل ہوتی ہیں، اسی طرح بڑے ملکوں میں بھی غیر متمرکز سیاست پر عمل درآمد کے نتیجہ میں مختلف علاقائی یا شہری ادارہ مرکزی حکومت اور اس کے قوانین و تشکیلات سے وابستگی کے باوجود فرائض و اختیارات کے اعتبار سے مشخص قانون کے تحت متعدد ذیلی مستقل قوانین و ضوابط کے بھی مالک ہوتے ہیں۔ ان کی مثال بجلی کے ٹرانسفارمر جیسی ہے جو بجلی کو دور دراز کے علاقوں تک پہنچانے کا کام کرتا ہے۔

علاقائی مشاورتی کمیٹیاں صوبے، ضلع، تحصیل یا موضعات کی سطح پر اپنے علاقے میں مجلس

شورای اسلامی کے امور پر عمل درآمد کرتی ہیں اور علاقے کے مقتضیات و حالات کے پیش نظر مجلس شوریٰ اسلامی کی جانب سے پاس شدہ قوانین کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ اور منصوبہ سازی کرتی ہے۔

درحقیقت جس طرح سے پورے ملک کے نمائندے مجلس شورای اسلامی میں قانون اساسی کا لحاظ رکھتے ہوئے منصوبہ سازی کرتے ہیں اور تبادل آراء و افکار کے بعد قوانین اکثریت کی رائے سے منظور ہوتے ہیں اسی طرح تحصیل، شہر اور صوبے کی نمائندہ شاورتی کمیٹیاں مجلس شورائے اسلامی میں پاس شدہ قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے یا دوسرے لفظوں میں مرکزی حکومت کی قانونی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں کی ضروریات اور تقاضوں کے تحت تبادل افکار و نظر کے بعد کوئی لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔ یعنی مخصوص حالات و شرائط کے اعتبار سے جس طریقہ کو اپنی نظر میں مناسب اور بہتر تصور کرتے ہیں اسی سے کام لے کر حکومت کی حاکمیت کا اجراء و نفاذ کرتے ہیں، اسی طرح کا انداز حکومت جب ہم عہدنامہ مالک اشتر کا مطالعہ کرتے ہیں تو بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے جس میں امیر المومنین علیہ السلام کی جانب سے جناب مالک اشتر خود مصری عوام سے سیاسی و علاقائی مسائل پر مشورہ کرنے اور مصر میں امام کی حاکمیت برقرار کرنے پر مامور کئے گئے ہیں۔

ب: عوامی نظم و نسق کی پالیسی:

عوامی نظم و نسق اور مدیریت نیز خودمختاری کے درمیان اکثر و بیشتر لوگ شبہ کا شکار ہوجاتے ہیں، عوامی نظم و نسق کی پالیسی، سیاسی مدیریت و ذمہ داری کا ایک خاص طریقہ ہے جس کی بنیاد پر حکومت کچھ ذمہ داریاں اور اختیارات عوام کے حوالے کر دیتی ہے تاکہ عوام کی مدد سے معاشرہ کی تمام سنگین ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

حکومت کو عوام کے لئے قانون نافذ کرنے کا اختیار و اقتدار خود عوام کی آراء سے حاصل ہوتا ہے وہ عوام کی طرف سے ہی عمومی اقتدار نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، اس اعتبار سے اقتدار کے اصلی مالک خود عوام ہوتے ہیں جو نظم و ضبط برقرار رکھنے، حاکمیت اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے ایک مضبوط و مستحکم ادارے (حکومت) کے کام کو ترجیح دیتے ہیں۔

اب حکومت درحقیقت عوام کی نمائندگی کرتی ہے ، ایسے حالات میں جب کہ دور دراز کے علاقوں میں مختلف قوموں کے درمیان نفاذ حاکمیت کے مسئلہ میں کمزوری محسوس کرتی ہے تو اس وقت نظم و نسق، امن و امان اور حاکمیت قانون کو برقرار رکھنے کی غرض سے اقتدار کا کچھ حصہ یا کچھ ذمہ داریاں عوام کے سپرد کر دیتی ہے تاکہ خود عوام حکومت کے کاموں میں حصہ لیں اور اس کی مدد کریں۔

عوامی نظم و نسق کی پالیسی ایک واضح ذمہ دار ادارہ کے طور پر غیر مرتکز سیاست کے ساتھ طریقہ کار کے اعتبار سے فرق یہ رکھتی ہے کہ غیر متمرکز سیاست میں مرکزی حکومت کے ادارے کے ساتھ ساتھ ایک علاقائی ادارہ مثلاً صوبائی شوریٰ کے وجود میں آنے سے ملک کے سیاسی ڈھانچے میں تبدیلی آجاتی ہے، لیکن عوامی نظم و نسق کی پالیسی کے تحت مشاورتی کمیٹی کے وجود میں آنے سے عوام ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں، یعنی اقتدار کے اصلی حقدار اپنے نمائندہ (حکومت) کے ساتھ شریک ہو کر ذمہ داریاں نبھانے میں مدد کرتے ہیں، اسی طرح سے عوام اور حکومت کے مل جل کر کام کرنے سے سیاسی امکانات مزید بڑھ جاتے ہیں اور قوت عمل بڑھ جاتی ہے۔

عوامی انتظام پالیسی کا اصلی مقصد لوگوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانی طاقت و امکانات کو کام میں لایا جا سکے ، اس طریقہ کی بنیاد اسلامی اصول "تعاون" پر مبنی ہے اور اس کے متعلق قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے۔

ج: عوام کا کام عوام کے حوالے کرنا :

اگر حکومت قانونی امکانات کے ذریعہ ان تمام وعدوں کو پورا کر سکتی ہو جو اس نے عوام سے کئے ہیں تو ایسی صورت میں عوام کو اپنے حال پر چھوڑ دینا کہ وہ سیاسی فرائض انجام دینے کے بجائے اپنا کام کریں، مناسب ہے، لیکن اگر جغرافیائی اعتبار سے مملکت وسیع ہو اور مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ہو نیز حکومت عوام سے کئے گئے وعدے پورے نہ کر سکے اس کے علاوہ مسائل بھی عوام ہی سے متعلق ہوں اور حکومت کا کام محض ایک خدمت گزار کے طور پر اسباب مہیا کرنا ہو تو عوام کا کام عوام ہی کے حوالے کر دینا زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔

دستور اساسی میں مشاورتی کمیٹیوں کو قانونی حیثیت اسی بنیاد پر دی گئی ہے کہ عوام کا کام

خود عوام کے حوالے کر دیا جائے اور عوام ہی باہمی مشاورت یا اپنے نمائندوں کے ذریعہ اپنے کاموں کو انجام دیں۔

اس سلسلہ میں دراصل اہم چیز کام کی وہ نوعیت ہے جو حکومت مشاورتی کمیٹیوں کے ذریعہ عوام کے سپرد کرتی ہے، سیاسی نظام یا انتظام کی کوئی بات نہیں، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جو کام عوام سے متعلق ہیں، عوام ہی ان کے بارے میں مشورہ یا فیصلہ کرنے کے مستحق ہیں۔

غرض یہ کہ حکومت مختلف کاموں اور ذمہ داریوں کا جائزہ لیتی ہے جو امور عوام سے متعلق ہوتے ہیں اور خود عوام ہی کے ہاتھوں بہتر طور پر انجام پا سکتے ہیں ان ہی کو انتخاب کرتی ہے اور شوریٰ کے ذریعہ لوگوں کے سپرد کرتی ہے۔

د۔ کاموں کی رفتار میں تیزی لانا:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف علاقوں اور دور دراز کے صوبوں میں سماجی، اقتصادی، تعمیری، صحتی، ثقافتی، تعلیمی نیز دیگر رفاہی پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وسائل ایک جیسے نہیں ہیں، رکاوٹیں دور کرنے اور ان پروگراموں کے نفاذ کی راہ ہموار کرنے کے لئے علاقائی تقاضوں اور زندگی کے احوال کا جائزہ لینا ضروری ہے، "شورائی" طریقہ کار رکاوٹیں دور اور مذکورہ پروگراموں کے نفاذ کی راہ ہموار کر سکتا ہے، مختلف صوبوں اور علاقوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کر کے حکومتی کاموں کی رفتار میں تیزی لا سکتا ہے اور حکومت کے مختلف پروگراموں کو ملک کے گوشہ گوشہ میں یکساں طور پر نافذ کرنے میں مدد کر سکتا ہے اور حکومت کو اپنے اصلی مقصد میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

ھ: ناانصافیوں کا خاتمہ:

عام طور پر محروم علاقے وہی کہلاتے ہیں جو مرکز سے دور ہوتے ہیں اور حکومت وسائل و امکانات کے فقدان کی وجہ سے اپنی منصفانہ خدمت پیش کرنے سے معذور ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر دور دراز کے علاقوں کی آمدنی وہاں کے باشندے کم ہی بہرہ ور ہوتے، اسی طرح

حکومت کے ذرائع آمدنی مختلف صوبوں میں یکساں طور پر علاقوں کے سپرد نہیں کئے جاتے، ملک کی وسعت مزید مشکلیں پیدا کرتی ہے اور عام طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں صنعت، زراعت اور اقتصاد کو فروغ دینے والے تعمیری و رفاہی پروگراموں اور منصوبوں میں توازن و اعتدال کو نقصان پہنچاتی ہے۔

مختلف علاقوں خاص طور پر متعدد قوموں پر مشتمل بڑے ممالک میں امکانات، قدرتی ذخائر اور دوسرے رفاہی امور کی منصفانہ تقسیم اور پورے ملک میں منصوبوں کا ایک ساتھ حکومت کی نظارت کے تحت انجام پانا تب ہی ممکن ہے جب عوام کی طاقت اور تمام امکانات کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے اور یہ کام شوریٰ اور اس کی صحیح منصوبہ سازی کے ذریعہ ممکن ہے۔

و۔ اجتماعی نظارت:

شوریٰ کے دیگر مقاصد میں ملک کے امور اور حکومتی منصوبوں اور احکام نفاذ کی نگرانی ہے تاکہ حکومتی اداروں میں انحراف و قانون شکنی کا سدباب کیا جاسکے اور انتظامی اداروں سے اونچ نیچ، تنگ نظری، غبن، رشوت، اسراف، تبذیر، بے حضوری اور انقلاب مخالفین کی رخنہ اندازی کو ختم کیا جاسکے۔

شوریٰ عوام کے بیدار ضمیر اور تیز بیں آنکھوں کے مانند ملک کے دور دراز علاقوں میں انتظامیہ کی نگرانی کرتی رہتی ہے اور نظارت کے ذریعہ حکومت کو کنٹرول کرتی ہے۔

ز: حکومت سے وابستہ کاموں کی تکمیل:

شوریٰ، حکومت اور اس سے وابستہ اداروں کے ساتھ تعاون کرکے درحقیقت حکومت کے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ شوریٰ حکومتی اداروں کے مقابلے میں ایک محاذ یا رقیب وحریف قرار نہیں پاتی نہ حکومتی اداروں کے لئے زحمت کی باعث بنتی ہے بلکہ اس کا کام نوعیت کے اعتبار سے عوامی اور حکومتی فیصلوں، کاموں اور نظارت کا ایک مجموعہ ہے۔ شوریٰ جب حکومت کو مختلف وجوہات کی بنا پر فرائض کی انجام دہی میں کمزور پاتی ہے، تب ولولہ تیز طاقت اور جوش وخروش کے ساتھ میدان عمل میں

آکریکیوں کو پورا کرکے حکومت کی مدد کرتی ہے۔

ح۔ علاقائی پروگراموں کی ہدایت :

شوریٰ تمام سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی میدانوں میں کلیدی رول کی حامل ہے، وہ مذکورہ میدانوں میں حکومت کے تمام منصوبوں کی ہدایت کرسکتی ہے اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ضروری اقدامات اور نفاذ کے اسباب فراہم کرسکتی ہے۔

شوریٰ میں عوامی نمائندے اپنے اپنے علاقوں کے حالات و تقاضوں سے آگاہ ہونے کے نتیجہ میں مرکزی حکومت کے نمائندوں اور ذمہ داروں سے بہتر طریقے علاقے کے امور کو سنبھال سکتے ہیں اور رکاوٹوں کو دور کرکے مثمر نتائج حاصل کرنے کے لئے حکومتی پروگراموں اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

ط : عوام کو مختلف امور سے آگاہ کرنا :

روزمرہ زندگی کے مشکلات اور دوسرے مختلف اسباب عام طور پر لوگوں کو بہت سے امور کی نسبت غفلت، عدم آگاہی اور تشویش و پیچ کا شکار بنا دیتے ہیں اور یہ قوموں کے لئے (خواہ وہ جو اسارت کی زنجیروں میں قید ہیں یا وہ جو آزادی حاصل کرچکی ہیں یا آزادی کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں) ایک اہم مسئلہ محسوب ہوتا ہے۔
بھول، غفلت، عدم آگاہی اور تساہلی خاص طور پر نازک اور بحرانی مواقع میں نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے اور موجودہ سازشوں نیز برے نتائج سے دوچار ہونے

کی باعث بن سکتی ہے۔
ممکن ہے یہی چیزیں حکومتی اداروں کو طاقت وامکانات سے ناجائز فائدہ اٹھانے پر مجبور کردیں اور حکومت کو عوام سے علیحدہ کردیں ۔

جناب محمد باقر ناصری (عراق)
ترجمہ: جناب خادم حسین

ایران کی اسلامی حکومت

«إنا أنزلنا إليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما أراك الله ولا تكن للخائنين خصيما». (النساء: ١٠٥)

(اے رسولؐ) ہم نے تم پر حق کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تم کو ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کی طرفداری نہ کرو۔

«وما أنزلنا عليك الكتاب إلاّ لتبيّن لهم الذي اختلفوا فيه وهدىً ورحمةً لقومٍ يؤمنون». (النحل: ٦٤)

اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) اسی لئے نازل کی کہ جن باتوں میں یہ لوگ باہم جھگڑا کئے ہوتے ہیں ان کو تم صاف صاف بیان کر دو اور یہ کتاب ایمان داروں کے لئے تو سرتا پا ہدایت اور رحمت ہے۔

«لقد أرسلنا رسلنا بالبيّنات وأنزلنا معهم الكتاب و الميزان ليقوم الناس بالقسط» (الحديد: ٢٥)

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح و روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو بھی نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اسلامی انقلاب کے نمایاں ترین کارناموں میں اسلامی فکر کی بنیادوں کی از سر نو تعمیر اور اس کو مستحکم و استوار کرنے پر خاص توجہ صرف کرنا نیز مستحکم الٰہی بنیادوں پر بھروسہ کرتے ہوئے اسلامی ثقافت اور شناخت و معرفت کی سطح بلند کرنا ہے تاکہ روئے زمین پر حکومت عدل الٰہی قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر سکے اور اس بات کا بہترین ثبوت یہی اس کے سالانہ اجتماعات، اسلامی کانفرنس اور علمی تحقیقی سیمینار ہیں جن کے انعقاد کی نسبت خاص اہتمام و رعایت سے کام لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ان علمی و تحقیقی اجتماعات کا مقصد اسلام کے اجتماعی و نظریاتی مسائل کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ بحث و تحقیق کرنا ہے۔ تحقیقی و نظریاتی مسائل چونکہ اسلامی حکومت کو پائیداری اور ثبات بخشتے ہیں، اسلامی مفکرین علماء اور دانشوروں کے لئے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی زمین ہموار کرتے ہیں، انھیں پوری دقت نظر اور کامل تحقیق کے بعد اسلامی افکار کی روشنی میں تلاش و جستجو کے مواقع فراہم کرتے ہیں لہٰذا انقلاب کی راہ ہموار کرنے اور مختلف حوادث و واقعات اور ان کے نتائج و اثرات پر نظر ڈالنے کے لئے حکومت کے زیر اہتمام یہ اجتماعات بہترین ذریعہ ہیں۔

کیونکہ انقلاب کا اصلی مقصد و محور اسلامی حکومت قائم کرنا ہے، ایک ایسی حکومت جو الٰہی عدل پر مبنی نظام قائم کرنے اور تمام انبیاء و رسل کی دیرینہ تمنا پوری کرنے کا واحد ذریعہ ہے نیز ایک ایسی حکومت جو روئے زمین پر الٰہی عدل و انصاف کی بنیادوں کو استوار کرتی ہے۔ چنانچہ انقلاب اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے مفکرین نیز اس کے منصوبے مرتب کرنے والے علماء و دانشوروں کے لئے یہ بات نہایت مناسب ہوگی کہ وہ اس حکومت و نظام کے تمام پہلوؤں کا ہر رخ سے جائزہ لیں اور یہ کام نہ فقط اسلامی سطح پر بلکہ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر انجام دیں، وہ تمام منصوبے اور ردعمل جو اس سلسلہ میں ظاہر ہو چکے ہیں یا آئندہ جن کے ظاہر ہونے کی امید ہے ان تمام اثرات کا جائزہ لیں۔ اس قسم کے پیدا ہونے والے سوالات کا مثبت جواب دینے کی غرض سے میں نے اپنی بحث کو تین

اہم حصوں پر مرکوز رکھا ہے۔

۱۔ ایران میں اسلامی حکومت، امت مسلمہ اور عالم اسلام سے اس کے روابط اور اسلام کے سیاسی طرز فکر کو فروغ دینے میں اس کا کردار۔

۲۔ دنیا کے محروم و کمزور افراد کی حمایت میں حکومت اسلامی کے اقدامات۔

۳۔ عالمی سامراج نیز اس کی سازشوں اور منصوبوں کے خلاف حکومت اسلامی کا جہاد و مقابلہ۔

ان تینوں جملوں میں جو مضبوط و مستحکم تعلق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، چونکہ یہ تینوں رخ اسلامی انقلاب کے اہم ترین اور واضح ترین محور قرار دئے جاسکتے ہیں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان موضوعات کو صحیح اعداد و شمار اور زندہ شواہد کی بنیاد پر پیش کیا جائے۔ اگرچہ اسلامی حکومت کا وجود اسلامی نظریات کے اہم ترین اور مسلم حقائق میں سے ہے لیکن صدیوں سے اس کا معطل پڑا رہنا اور اس تعطلی کے اسباب نیز دشمنان اسلام کی سازشیں یہ سب وہ عوامل ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو بہت سے اسلامی حقائق سے دور اور نا آشنا بنا دیا ہے۔ دشمنان اسلام کی منافع پرستی و خود خواہی نے ان اسلامی حقائق و معارف کے چہرہ پر غلط بیانی اور شک و شبہ کی تہ بہ تہ موٹی نقاب ڈال دی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ان اسلامی مفکرین و علماء کی ذمہ داری مزید سنگین ہو جاتی ہے جو اسلامی منابع اور ماخذوں پر دسترس رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کے اصل سرچشموں سے متعارف کرائیں۔ اب ہم اپنی بحث کے ابتدائی حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

۱۔ ایران میں اسلامی حکومت، اس کے ایرانی عوام نیز دیگر مسلمان ملتوں سے تعلقات اور اسلام کے سیاسی طرز فکر کے فروغ میں اس کا کردار۔

اس ذیل میں بہت سے ایسے سوالات ہیں جن سے متعلق اشتباہات کی وضاحت کئے بغیر اس موضوع کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی حکومت سے مراد کیا ہے؟ نیز یہ کہ اس کا تشریعی و اجرائی ڈھانچہ کس نوعیت پر ہے؟ کیا اسلامی حکومت ان نظری افکار و تصورات کا مجموعہ ہے جنھیں امام خمینی (مدظلہ) اور ان کے ساتھ دوسرے مجاہد علماء نے نظریاتی و اعتقادی مرحلے سے نکال کر

عملی تطبیق کے مرحلے تک منتقل کیا ہے اور ایران نے آرزو و امید کے مراحل سے گزر کر عمل و حقیقت کے مرحلوں میں قدم رکھدیا ہے؟
یا اسلامی حکومت بہرجہت ان اسلامی تصورات و افکار کا مجموعہ ہے جو پیغمبروں نبیوں، رسولوں اور معصوم رہنماؤں نیز گذشتہ و موجودہ ادوار کے مسلم قائدین کی سیرت و روش سے اخذ کیا گیا ہے یا وہ راہ جو ایسے حقائق و معارف کا مجموعہ ہے جو عام زمانی و جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے مذکورہ قسم کی حدبندیوں میں اس کو مقید نہیں کیا جاسکتا؟ کیا یہ ایسے حقائق نہیں ہیں جس کے مقابلہ میں باقاعدہ طور پر نظریاتی جنگیں لڑی گئی ہیں اور اس کا خودساختہ فلسفوں میں مذاق اڑانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ آئے دن اس کی اہمیت اور دائرۂ کار کو کم سے کم کرکے دکھانے کی جستجو ہوتی رہی ہے؟ اسی طرح کے بہت سے ادھر ادھر کے سوالوں سے بچنے کی غرض سے صراحت کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ سوالات یا اسی طرح کے دیگر سوالات ایران میں اسلامی حکومت کے آثار کا ایک بہترین نمونہ ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اسلامی حکومت ان سوالوں کی نسبت کہیں زیادہ وسعت اور بلندی کی حامل ہے۔

اسلامی حکومت اور اس کا دوسری حکومتوں سے امتیاز:

اسلامی حکومت اپنے معنی کی وسعت و عمومیت کے اعتبار سے دوسری حکومتوں اور سلطنتوں سے اشتراک رکھتی ہے، اس لئے کہ ہر حکومت عوام کے معاملات کی نگرانی اور ایک ذمہ دار نظام کی حامل ہوتی ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ حکومت (خواہ وہ کسی بھی طرح کی ہو) انسانی معاشرے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ معاشرے کے عام مفادات ضروریات اور مطالبات اسی کے ذریعہ پورے ہوتے ہیں، پھر بھی اسلامی حکومت اور دوسری غیر اسلامی حکومتوں کے درمیان کچھ بنیادی فرق اور واضح تضاد پائے جاتے ہیں سب سے پہلا فرق بنیادی و اساسی ہے جس کا ربط اصولی حقائق اور مقاصد سے ہے۔ دوسرا فرق اس کے ظاہری ڈھانچے، عملے اور مقدمات میں ہے اور تیسرا بنیادی نمایاں اختلاف

مقصد ہدف کا ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں میں پایا جاتا ہے جس سے نہ چشم پوشی کی جا سکتی ہے اور نہ سمجھوتہ اور مفاہمت۔ چونکہ عام اسلامی حکومت و سلطنت کا مفہوم اس واقعی مفہوم و معانی سے جو خداوند عالم کا اصل مقصود ہے ہر اعتبار سے قطعی مختلف ہے، اسی فرق سے غفلت کی بنا پر نہ صرف کچھ قدیم مصلحین بلکہ بعض اصلاح کے طالب جدید مفکرین بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں جنھوں نے واقعی الٰہی اسلامی حکومت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اپنی عمر بھی برباد کی اور لوگوں کو حقیقت تک پہونچنے سے باز بھی رکھا اور ان ہی لوگوں کے پیدا کردہ توہمات کا نتیجہ ہے کہ ایک خود ساختہ، دوسروں کے تھوپے ہوئے اندھے اور غیر اسلامی افکار و خیالات سے معمور ڈھانچہ سامنے آگیا جو ایک عرصۂ دراز تک امت اسلامیہ کو ان گمراہ کن فاسد خیالات میں الجھائے رہا۔ مذکورہ فرق سے غفلت (خواہ عمداً ہو یا سہواً) اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ لوگ حقیقی معنوں میں ایک الٰہی اسلامی حکومت اور ایک غیر اسلامی دنیوی حکومت کے درمیان بنیادی اختلاف و فرق کو محض ظاہری و لفظی ہیرا پھیری پر محمول کرنے لگے ہیں اور جو صرف ناموں اور عنوانوں کے محور پر گردش کرتا ہے یعنی اگر دنیوی اصطلاحات کو اسلامی اصطلاحات سے بدل دیا جائے تو یہ چیز ایک حکومت کے اسلامی ہونے کے لئے کافی ہے اس کو اسلامی حکومت میں شامل ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے یعنی کسی بھی حکومت کے آگے لفظ اسلامی لگا دیجئے حرمت اسلامی کے تحفظ کے لئے کافی ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر بادشاہ و صدر مملکت کو خلیفہ و امام گورنر کو والی یا کچہری کو شرعی عدالت کا نام دے دینے سے ایک حکومت کو اسلامی تصور کر لیتے ہیں آخر کتنا احمقانہ خیال ہے۔

لیکن در حقیقت ایک صحیح الٰہی اسلامی حکومت اور ان تمام تصورات و توہمات اور عام اسلامی نعروں کے درمیان (جو ہر پہلو سے اپنے مقاصد و نتائج کے پیش نظر غیر اسلامی بنیادوں پر استوار ہیں) بہت زیادہ اور بہت بڑا فرق ہے اور میرا خیال ہے کہ آج ان منصوبوں اور سازشوں کا بے نقاب ہو جانا بھی امت اسلامیہ کی بیداری و آگاہی کا رہین منت ہے، گذشتہ چند برسوں میں اسلامی بیداری نے مسلمان عوام کو خواب

غفلت سے بیدار کرنے کے سلسلہ میں مسلمان مفکرین کے لئے دلائل فراہم کرنے کی راہ کو ہموار و آسان کر دیا ہے، اور فاسد مقاصد پر مبنی ایسی تمام دعوتوں کو بے نقاب کر دیا جو امت اسلامیہ کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر بیداری سے محروم رکھنا چاہتی تھیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ان اسلامی حقائق و معارف سے باخبر روشن فکر علماء و دانشور حضرات کو جزائے خیر عنایت کرے، جن لوگوں نے صدر اسلام سے لیکر آج تک بے پناہ قربانیاں دی ہیں، تکلیفیں اٹھائی ہیں اور مصیبتیں برداشت کی ہیں، مسلمانوں کو حقائق سے آگاہ کرنے اور اسلام کے بنیادی مفاہیم و حقائق میں غلط اور الٹی سیدھی باتوں کی آمیزش کو روکنے کی غرض سے جن کو بڑی بڑی قیمتیں چکانی پڑی ہیں، ان لوگوں نے اسلامی حقائق و معارف کے قبول و تسلیم کرنے کی قیمت قید و بند اور دار و رسن کی صورت میں بڑے ہی صبر و تحمل اور بردباری کے ساتھ ادا کی ہے اور اس طرح مسلمانوں میں اسلامی افکار و نظریات کے تئیں اطمینان و اعتماد پیدا کرنے اس کے حدود اور انسانی زندگی میں اس کی ضرورت و افادیت اجاگر کرنے نیز ان افکار کے عمل میں لائے جانے کے امکانات کے بارے میں عملی طور پر تعلیم دی ہے، انہوں نے ظاہری شان و شوکت، سازشانہ سرگرمی و پریشاں خیالی نیز فاسد منصوبوں اور تھوپے ہوئے افکار و خیالات عموماً جن سے طاغوتی افراد یا درباری ملا اپنا چہرہ ڈھانکتے ہیں ان سب کو قبول نہ کر کے دنیا والوں پر یہ ثابت کر دیا (اور اس سے بڑا طریقہ استدلال کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا) کہ دنیا کی تمام موجودہ حکومتیں اور نظام جاہلیت کی بنیادوں پر استوار ہیں خواہ یہ حکومتیں اسلامی دنیا سے تعلق رکھتی ہوں یا ان کے علاوہ ہوں، یہ ساری موجودہ حکومتیں انسانیت کے لئے ایک بلاد مصیبت ہیں جو پوری بشریت خاص طور پر کمزور و بے بس افراد کے لئے اس پوری دردناک تاریخ میں فلاکت و بدحالی اور بدبختی و گرفتاری کی باعث رہی ہیں۔ پروردگار عالم نے قرآن میں اس کی کتنی بھرپور عکاسی کی ہے:-

"ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکاً ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ" (طٰہٰ/۱۲۴)

اور جس شخص نے بھی میری یاد سے منہ پھیر لیا اس کی زندگی بہت تنگی میں بسر ہو گی

اور ہم اس کو قیامت کے دن اندھا (بناکے) اٹھائیں گے۔

یہ مصیبتوں میں گھرا ہوا انسان اگر واقعی طور پر دنیا کی مصیبت و بلا سے چھٹکارا حاصل کرکے خوشحالی و سعادت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور واقعاً اس کی خواہش ہے کہ کھوئی ہوئی انسانی شرافت واپس مل جائے تو اسے بہرحال ہر طرح کی قید و بند سے رہائی حاصل کرنا پڑے گی اور اپنی زندگی کو ایک منصفانہ الٰہی نظام حکومت کی بنیاد پر استوار کرنی ہوگی، اور اس الٰہی حکومت کی پہلی اور مشخص خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام احکام و قوانین اس کائنات اور اس میں زندگی بسر کرنے والے تمام انسانوں کے خالق خداوند متعال کی جانب سے ہے وہ خدا جو ان کی ظاہری و باطنی مصلحتوں سے آگاہ ہے اور اس کی فطری و نفسانی خواہشات سے واقفیت رکھتا ہے۔ جبھی تو اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے:

ان الحکم الا للہ (انعام/۵۷ سورہ یوسف/۴۰ و ۶۷)

حکومت تو بس خدا کے لیے مخصوص ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (مائدہ/۴۴)

اور جو شخص بھی فرمان خدا کے خلاف حکم دے اس کا شمار کافروں میں ہے۔

لہٰذا ہم اپنی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ روئے زمین پر حکومت دو صورتوں سے خالی نہیں (یعنی کوئی تیسری صورت ممکن نظر نہیں آتی) یا تو الٰہی حکم ہے جو زمین پر اس کے انبیاء و مرسلین اور حاملان وحی کے ذریعہ پورے صفات و خصوصیات اور حدود کے ساتھ بروئے عمل لایا گیا ہے، یا پھر جاہلی حکم ہے جسے خود انسان نے تمام تر خواہش و مزاج اور طبیعت کے اختلافات کے ساتھ (جو اس کے اندر پایا جاتا ہے) بدعت کے طور پر قائم کر لیا ہے اور آج تک اس کی بھنور میں پھنسا ہوا ہے اور ایک کے بعد دوسری کمزوری اسے جھٹکے پہ جھٹکے دیتی رہتی ہے اور یہ دونوں کیفیتیں قرآن کریم میں خداوند عالم نے خود بیان کر دی ہیں:۔

وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم واحذرھم

ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک فان تولوا فاعلم انما یرید اللہ
ان یصیبھم ببعض ذنوبھم وان کثیراً من الناس لفاسقون۔ (مائدہ/۴۹)
اور (اے رسول) ہم پھر کہتے ہیں کہ جو احکام خدا نے نازل کئے ہیں تم اس کے مطابق
فیصلہ کرو اور ان کی بے جا خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو بلکہ تم ان سے بچے رہو
ایسا نہ ہو کہ کسی حکم کے خلاف جو خدا نے تم پر نازل کیا ہے، تم کو یہ لوگ ورغلا
دیں اور اگر یہ لوگ تمھارے حکم سے منہ موڑیں تو سمجھ لو کہ (گویا) خدا
کی ہی مرضی ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انھیں مصیبت میں مبتلا کرے
اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ بہتیرے لوگ بدچلن ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم
یوقنون (مائدہ/۵۰)
کیا یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے احکام کی (تم سے بھی) امید رکھتے ہیں حالانکہ
صاحبان ایمان و ایقان کے لئے خدا سے بہتر کون حکم کر سکتا ہے؟

اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"الحکم حکمان حکم اللہ وحکم الجاھلیۃ فمن اخطاء حکم اللہ فقد
حکم بحکم الجاھلیۃ"
حکم دو قسم کے ہیں، حکم خدا اور حکم جاہلیت۔ جو شخص حکم خدا سے منحرف ہوا اس نے
حکم جاہلیت کے تحت فیصلہ کیا ہے۔

گویا پیغمبر اسلامؐ نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنا قطعی فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ زمین پر دو طرح کے حکم کے سوا کوئی تیسرا حکم نہیں پایا جاتا یا تو حکومت کی قانونی مشینری اور اس کے عمال خود ساختہ اور انسانی وضع کردہ نظام سے استفادہ کرتے ہیں (جسے قرآن و سنت نے حکم جاہلیت کے نام سے یاد کیا ہے) یا پھر ملک پر حاکم نظام اپنے

ں اور قانونی و عملی سرگرمیوں سے متعلق تمام احکام اسلامی شریعت سے دریافت
، جو حکم خدا کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔[۱]

ی حکومت کی شکل و ہیئت :

اصل حکومت" پر ایک نظر ڈالنے کے بعد مسئلہ یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں
ی کی شکل و ہیئت کیا ہونی چاہیئے؟ اسلامی مملکت میں حکومت کا اصلی مقصد یہ ہے
کے تمام امور اسلامی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے انجام پائیں، اسی اعتبار
ر بیشتر موارد میں اسلامی حاکم کو "راعی" اور "چوپان" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔
ی حکومت کو پیغمبر اسلام یا دیگر انبیاء اور ائمہ سے نسبت کی بنیاد پر پیغمبر اور امام کی
ت بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ چیز ان آیتوں کی روشنی میں ثابت ہے، جن میں کہا گیا ہے

یوم ندعوا کل اناس بامامہم (سورۂ بنی اسرائیل/۷۱)
اس دن (کو یاد کرو) جب ہم تمام لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔
ری آیت میں ارشاد ہے :-

وجعلنٰہم ائمۃ یہدون بأمرنا... (سورہ انبیاء/۷۳)
اور ہم نے ان سب کو (لوگوں کا) پیشوا بنایا ہے جو ہمارے حکم سے (ان کی) ہدایت
ں۔

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :
ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلہم
ائمۃ ونجعلہم الوارثین
اور ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ روئے زمین پر کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان

ب ورسالتہ الخالدۃ" تالیف محمد ابو المجد ص ۳۵

کریں اور ان ہی کو (لوگوں کا) پیشوا اور اس (سرزمین) کا مالک بنائیں۔
ایک اور مقام پر خدا فرماتا ہے:

وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا (سجدہ/۲۴)

اور ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے ہم نے کچھ لوگوں کو امام و پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے۔

مذکورہ آیتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی دوسری آیتیں موجود ہیں جن میں رہبر و پیشوا کو لفظ "امام" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ دسیوں احادیث میں لفظ "امام" پیغمبر، پیشوا، ولی اور حاکم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ ہمارے اسلاف صالحین نے اسلامی تاریخ میں خلیفہ، رئیس اور رہبر کو "امام" اور متعلقہ منصب کو امامت کے نام سے یاد کیا ہے۔

امام کس طرح معین ہوتا ہے؟

جہاں تک امام کے تعین کا مسئلہ ہے وہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے، دوسرے لوگوں نے اس موضوع پر تحقیقی بحثیں پیش کی ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں اہل بیت علیہم السلام کے نقطۂ نظر کو محض اشارہ کے طور پر بیان کرتے ہوئے گزر جائیں گے چونکہ امامت، رسالت و نبوت کی ایک کڑی ہے اور ان ہی منصوبوں پر کارفرما ہوتی ہے، لہٰذا یہ ایک الٰھی حق ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت و امامت کہاں اور کس شخص کو سپرد کرے۔ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

الله اعلم حيث يجعل رسالته (انعام/۱۲۴)

اور خدا جہاں (جس دل میں) اپنی پیغمبری قرار دیتا ہے اس کے بارہ میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

لیکن موجودہ امامت سے متعلق جو مطلب اخذ ہوتا ہے اس سے مراد جامع الشرائط حاکم شرع کا حکم ہے جو "ولایت فقیہ" کے عنوان سے معروف ہے جس کے مفہوم و حدود

واضح کرنے کے سلسلے میں متعدد کانفرنسیں اور اجلاس منعقد ہو چکے ہیں اور اس موضوع پر حسب ضرورت کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

لیکن الٰہی حکومت سے متعلق ایک دوسرا تصور اس کا انتخابی ہونا ہے جس میں عوام کو حاکم انتخاب کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ان تمام اختلافات کے پیش نظر جو اس طرز حکومت کے سلسلہ میں وارد ہیں اور وہ تمام اعتراضات جو اس نظریہ کے ماخذ و بنیاد نیز اصل مسئلہ انتخاب یا حاکم کے تعین سے متعلق شرائط و صلاحیت کے سلسلہ میں پائے جاتے ہیں اس طریقۂ کار کو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں۔ البتہ یہ صورت اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کے تحت امام منصوص کی غیبت کے زمانہ میں حکومت سے متعلق درپیش مشکل دفع کرنے میں ملت اسلام کی بہترین انداز میں مدد کرتی ہے اور اس طرح وہ خلا پُر ہو جاتا ہے جو امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی غیبت کے نتیجہ میں ظاہر ہوا ہے۔ ورنہ امام کے سلسلہ میں انتخاب کا طریقہ خود کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ائمہ علیہم السلام کی جانب سے مخصوص احکام اور تصریحات اس کے حدود اور دائرہ عمل کو مشخص و معین کرتے ہیں اور یہ ائمہ معصومین علیہم السلام ہی ہیں جنھوں نے اس کی بنیاد ڈالی ہے اور ملت اسلام کے لئے حدود اور دائرۂ عمل کو مشخص کر دیا ہے، اس موضوع کے ذیل میں بحث کی گنجائش بہت ہے، جو موقعہ و محل کی مناسبت سے پیش کی جائے گی۔

اور شاید اسلامی جمہوریہ کا وہ طریقۂ کار جو "شورائے رہبری" کے نام سے مشہور ہے، اور جس کو عوامی رائے کے ساتھ ہی ساتھ امام امت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی حفظہ اللہ تعالیٰ کی تائید و تصدیق حاصل ہے وہ بھی اسی طرز فکر کا نتیجہ اور اثر ہے، لیکن اس صورت میں بھی دراصل رہبر و قائد انتخاب کرنے کا حق ملت کے خاص افراد کو حاصل ہوتا ہے اور ممکن ہے اس میں اہل حل و عقد سے مسلمان فقہا کو تعبیر کیا گیا ہو اور انتخاب کا مطلب اپنے عام "عوامی حکومت" کے مفہوم و معنی میں نہ ہو اور شاید مجلس خبرگان کا آخری اجلاس جو انقلاب اور عوام کی آئندہ رہبری و قیادت مشخص کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا اور جس میں فقیہ عالی قدر آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ حسین علی منتظری دام ظلہ کو آئندہ رہبر و قائد کے طور پر قبول کر لیا گیا اسی مبارک طریقۂ کار کی ابتدا تھی اور یہ اسلامی انقلاب کا ایک بہترین ثمرہ ہی نہیں بلکہ انقلاب کو محفوظ رکھنے اور اس کے

پھلنے پھولنے کا ایک بہترین طریقہ اور ضمانت بھی ہے۔

اسلامی حکومت کب اور کس طرح ؟

ایک حکومت کو اسلامی حکومت اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا، چاہے وہ کوئی حکومت بھی ہو جب تک مندرجہ ذیل دو اہم رکن اس میں نہ پائے جاتے ہوں۔

۱۔ تمام تر اغراض و مقاصد اور اسباب و وسائل کا سو فی صدی اسلامی ہونا نیز ایسے مصادر و منابع پر تکیہ کرنا جن پر تمام مسلمان متفق ہیں۔

۲۔ اسلامی اصول و حقائق کو اپنے صحیح معنوں میں تمام تر جزئیات کے ساتھ خواہ حکومت کے مسائل سے ان کا ربط ہو خواہ شرائط حاکمیت اور اسلامی اغراض و مقاصد کے تئیں حاکم کی پابندی اور لازمی حدود کا سوال ہو اس طرح مرحلۂ عمل میں جاری و ساری کرنا کہ یہ چیز صرف زبانی نعروں اور منصوبہ بندیوں تک محدود نہ رہ جائے یا محض کچھ احکام پر عمل کر کے باقی کو چھوڑ نہ دیا جائے، یہ حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام مسائل و مشکلات کا حل اسلامی قوانین سے دریافت کرے۔ چونکہ راہ حل کے تعین میں اسلامی قوانین ایک دوسرے سے بہت زیادہ مربوط اور ہم آہنگ ہیں اس لئے کسی ایک مسئلہ میں بھی لاپرواہی یا سہل انگاری سے کام لینے یا ان میں جوڑ توڑ کرنے کی وجہ سے قوانین کے دوسرے اجزاء پر اثر پڑتا ہے حکومت و قانون کے تمام اجزاء کو ایک شستہ تقریر کے مانند ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مربوط ہونا چاہئے کسی طرح کی جوڑ توڑ یا پیوند کاری کرنا بالکل ویسے ہی ہے جیسے کسی مشین میں اس کے اپنے پرزوں کے بجائے کوئی دوسرا پرزہ لگا دیا جائے، وہ پرزہ ممکن ہے اپنی جگہ بہترین خصوصیات کا حامل ہو لیکن مشین کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کچھ احکام پر عمل درآمد کرنے اور کچھ پر نہ کرنے سے سختی کے ساتھ روکا ہے اور بنی اسرائیل کو اسی عمل کی بنا پر سخت مذمت کا نشانہ بنایا گیا ہے اس لئے کہ وہ لوگ خدا کے کچھ احکام کو مانتے اور ان پر عمل کرتے تھے اور کچھ کو چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہوا:۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذلک

منکم الا خزی فی الحیوٰۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعملون ۔ (بقرہ / ۸۵)

کیا تم لوگ (کتاب خدا کی) بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس دنیوی زندگی میں بھی رسوائی دامن گیر رہے گی اور جب قیامت کے دن (پلٹ کر آئیں گے) تو بڑے سخت عذاب میں مبتلا کر دیے جائیں گے اور جو کچھ بھی تم لوگ کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

ہم اس سے قبل قرآنی آیات اور حدیث کی روشنی میں ثابت کر چکے ہیں کہ حکومت دو صورتوں سے خالی نہیں ہو سکتی یا الٰہی حکومت ہو گی یا جاہلی حکومت اپنی خواہش کے تحت کچھ اسلامی احکام پر عمل درآمد اور باقی کو چھوڑ دینا کسی بھی حکومت کو جاہلی حکومت کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتا۔[۱]

بہرحال الٰہی حکومت کی صفات و خصوصیات انبیاء علیہم السلام کے زبردست ہاتھوں سے معین ہو چکی ہیں۔ خود خداوند متعال نے حکومت اسلامی کی اصولی بنیادوں کو وضع کر کے مسئلہ آسان بنا دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلہ میں تمام پیغمبروںؑ نے یکے بعد دیگرے مسلسل طور پر اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ جس کے لئے جناب داؤدؑ و جناب سلیمان کی واضح مثال موجود ہے۔ ان کے علاوہ حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ جیسے بہت سے انبیا نے اپنی پوری زندگی اس کام پر صرف کر دی اور پیغمبر اسلامؐ نے تو گذشتہ تمام الٰہی نمایندوں کی کوششوں کو مزید جلا بخش کر اسلامی حکومت کے خدوخال اور بھی پاک و صاف اور کامل انداز میں پیش کر دیئے ۔۔۔ آپؐ نے انسانی تاریخ کو ایک ایسی مثالی حکومت سے آشنا کرایا جو اس کے لئے آخری معیاری نقطہ ہے اور ایک صالح حکومت کے بنیادی اصولوں کی کڑی

---

[۱] "الحل الاسلامی" یوسف قرضاوی ص۱۰۰

ہی خوبصورت اور دلکش تصویر پیش کرتی ہے۔ اگرچہ یہ الٰہی حکومت سرور کائنات پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد کچھ ایسے رہبروں اور قائدوں کی تولیت اور نگرانی میں آگئی جو رسالت الٰہی کے بنیادی اغراض و مقاصد اور اس کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن آسمانی نمایندگی کے حقیقی وارث اہل بیت اطہار علیہم السلام کی امامت و رہبری نے ہر حال اور ہر منزل میں ان حکومتوں کی اصلاح و ہدایت اور دوبارہ پیغمبر اسلامؐ کی صحیح راہ پر اس کو لگانے کی کون کون سی کوششیں نہیں کیں۔ چنانچہ ان معصوم پیشواؤں نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے بارگاہ احدیت میں بے پناہ قربانیاں پیش کی ہیں جن میں سرفہرست روز عاشور سید الشہداء حضرت اباعبداللہ الحسین علیہ السلام اور ان کے عزیز و اقارب اور اعوان و انصار کی شہادت ہے۔

امام عصرؑ کی غیبت کے زمانہ میں ملت اسلام کی قیادت و رہبری مرجعیت کے سپرد ہوئی اور یہ ویسے ہی ہے جیسے امامت نے نبوت و رسالت کو تداوم و تحفظ عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرجعیت نے اب تک اس عظیم رسالت کی ذمہ داریوں اور مشقتوں کو اپنے دوش پر اٹھایا ہے اور تاریخ کے اس طویل عرصے میں مختلف طریقوں سے اس راہ میں قیام و استقامت کا ثبوت پیش کیا ہے یا کم سے کم اس کے لئے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی ہے[1]۔

اور جو کچھ جامع الشرائط حاکم شرع کے حکم کے بارے میں اسلامی منابع سے علمی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ "ولایت فقیہ" کا تصور ہے اور یہ وہی فکر ہے جس سے متعلق بحث و مباحثہ کے لئے متعدد تحقیقی جلسے منعقد ہو چکے ہیں چنانچہ ہر پہلو پر غور و فکر کے بعد پوری وضاحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ولایت فقیہ" یا مسلمانوں کی سرپرستی کے لئے ایک فرد میں جو صفات و خصوصیات ہونی چاہئے ان میں سب سے نمایاں چیزیں فقاہت و عدالت اور فراست و تدبر نیز شریعت کی پابندی اور امامت و رہبری کی ذمہ داریوں اور مشکلوں

---

[1] "الاسلام یقود الحیاۃ" (آیتہ ا... شہید محمد باقر الصدر) ص۔ تھوڑے تصرف کے ساتھ۔

کو تحمل و برداشت کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ہی ساتھ اس کے لئے آمادہ اور مستعد رہنا بھی ہے اور یہ تمام چیزیں خدا کے فضل و کرم سے حامی دین و شریعت امام امت حضرت امام خمینی مدظلہ کی شخصیت مبارکہ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، خداوند انھیں طول عمر عطا فرمائے۔

اسلامی حکومت عقل کا تقاضا ہے:

جب ہم یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ تمام مسائل کا ایک قطعی اور آخری حل دریافت کرنا ضروری ہے اور انسانیت کو ایک عادلانہ نظام حکومت کی سخت ضرورت ہے تو اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ باقی نہیں رہتا کہ ہم دامن اسلام میں پناہ حاصل کریں اور جب اسلام کی نظر میں تنہا راہ حل یہی ہے کہ ایک ایسا خالص اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے جس میں تمام اسلامی معاشرتی خصوصیات اور قدریں موجود ہوں تو اس کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ اس روئے زمین پر ایک خالص اسلامی حکومت موجود ہو ایک ایسی حکومت جسے لوگ نہایت ہی واضح اور روشن طور پر اسلامی عظمتوں اور کرامتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور محسوس کریں، لھذا ایک ایسی حکومت و سلطنت کا قیام بہرحال ضروری ہے تاکہ ایک معیاری اسلامی معاشرہ قائم کیا جا سکے جو نہ صرف فکری اور روحانی اعتبار سے بلکہ عملی طور پر بھی دوسروں کی غیر اسلامی روش اور اثرات سے معاشرہ کو پاک کردے اور ہر طرح کی گندگی اور بیماریوں سے خصوصاً بے دینی، نسل پرستی اور انسانی اقدار کی پامالی سے لوگوں کو نجات دے سکے۔[1]

دراصل جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بغیر اسلامی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے وہ یقیناً دو بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہے۔

اولاً: اس نے خود اسلامی افکار و اصول کو سمجھنے میں غلطی کی ہے کیونکہ اسلام حکومت کو دینی ضرورتوں میں سے اہم ترین ضرورت شمار کرتا ہے اور دین و سیاست کے باہمی ارتباط

---

[1] "الحل الاسلامی" یوسف القرضاوی ـ ص ۸۸۔

کو اسلام کی اعلیٰ خصو صیتو ں میں سے ایک خصوصیت سمجھتا ہے۔
ثانیا یہ کہ وہ اس اشتباہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی معاشرہ لامذہب خاندانی، قومی، اشتراکی یا لبرل حکومتوں کے زیر سایہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے، جبکہ عملی طور پر یہ بات ممکن ہی نہیں ہے۔

جناب احمد آذری قمی
ترجمہ: جناب احتشام عباس زیدی

انقلابات!!

انقلاب مہدیؑ سے پہلے

(۱)

بعض افراد، ولی فقیہ کی قیادت میں کامیاب ہونے والے ایران کے مقدس اسلامی انقلاب کی شرعی حیثیت اور اس کی حفاظت و بقا کی ضرورت پر اعتراض کرتے ہوئے اس سلسلہ میں چند روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ باتیں کم پڑھے لکھے افراد کے لئے شک و شبہ کا باعث ہوں اور ان کو انقلاب سے لاتعلق یا بدظن کر دیں لہٰذا ضروری ہے کہ ان روایات کا تجزیہ کیا جائے تاکہ ان وسوسوں کی حقیقت روشن ہو سکے۔

بحث شروع کرنے سے پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ مذہب جو انسانی معاشرہ کی دنیا و آخرت کو سنوارنا چاہتا ہے کیا ممکن ہے کہ اس کے پاس حکومت، حکومتی قوانین اور باخبر، آگاہ، امین اور قاطعیت کے ساتھ قوانین کا جاری کرنے والا نہ ہو؟!

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جامع اور مکمل اسلام صرف عہد رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ، امیرالمومنین علی علیہ السلام اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام تک محدود تھا اور اس کے بعد حضرت امام زمانہؑ کے ظہور تک انسان گھر کے گوشہ میں بیٹھا ہوا تمام کج رویوں اور غلطیوں کو خاموشی سے دیکھتا رہے؟!

کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ حکومت اسلامی کا قائم کرنا اور قوانین اسلامی کو نافذ کرنا کسی زمانہ میں بھی ناروا اور گناہ ہو؟ اور لوگ اپنا فریضہ یہ سمجھیں کہ اپنی لاتعلقی اور سہل انگاری کے ذریعہ طاغوتیوں، جھوٹوں، تباہ کاروں اور ظالم طاقتوں کی حاکمیت کا موقع فراہم کریں اور

اسے دوام بخشیں ؟

کیا ممکن ہے اسلام یہ چاہتا ہو کہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے — تمام مقدسات و نوامیس الٰہی کی توہین کو دیکھتے رہیں اور سانس تک نہ لیں کیا فکر سلیم ایسی باتوں کو قبول کرتی ہے ؟

جو شخص بھی قرآن سے سروکار رکھتا ہے، اگر اپنی طبع سلیم کی طرف رجوع کرے تو بخوبی جان لے گا کہ اسلامی منطق اور خداوند عالم کا منشاء ظالم سے ساز باز، اس کے ظلم کے مقابلہ میں لاتعلقی اور چپ سادھنا نہیں ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم یہ دیکھیں کہ بعض روایتیں ایسے ناقابل قبول مفہوم کی حامل ہوں۔ اور وہ از لحاظ سند قابل اعتماد ہوں، تو ان کی درست توجیہ کرنی چاہئے اور اگر وہ روایتیں توجیہ کے قابل بھی نہ ہوں تو ائمۂ معصومین علیہم السلام کے حکم کے مطابق ان کے مفاہیم کے ادراک کو خود ان کے حوالہ کر دینا چاہئے۔

یہ تو اس طرح کی روایتوں کا اجمالی جواب تھا اب تفصیلی جواب سنئے۔

اس موضوع کے متعلق وہ روایتیں جن سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے مرحوم شیخ حر عاملی کی کتاب "وسائل الشیعہ" اور مرحوم حاجی نوری کی "مستدرک الوسائل" کتاب جہاد باب "حکم خروج السیف قبل قیام القائم" سے — اور ایک روایت مقدمۂ صحیفۂ سجادیہ سے بھی نقل کی گئی ہیں۔

ان روایتوں کی کیفیت کو واضح کرنے کے لئے بہتر ہے کہ ان کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ پہلے یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کتنی روایتیں اس طرح کا دعویٰ کرنے والوں سے ربط رکھتی ہیں اور وہ روایتیں بھی سند و دلالت اور قابل توجیہ ہونے کی حیثیت سے کیسی ہیں۔

ان روایتوں کی چند قسمیں ہیں؛

الف : وہ روایتیں جن کا مطلب — مسلحانہ اقدام کی حرمت ہے یعنی ظہور امام زمانہؑ سے پہلے تلوار لے کر — خروج و تحریک، خود تحریک کے بانیوں کو طاغوت ثابت کرتی ہیں۔ مثلاً — یہ روایتیں :—

۱۔ عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال: کل رایۃ ترفع او قال

تخرج قبل رایۃ القائم علیہ السلام فصاحبہا طاغوت![1]

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ ہر وہ پرچم جو امام قائم علیہ السلام کے پرچم سے پہلے بلند کیا جائے (یا ظاہر کیا جائے گا) اس کا بلند کرنے والا طاغوت ہوگا!

۲۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال: کل رایۃ ترفع قبل قیام القائم فصاحبہا طاغوت یعبد من دون اللہ عزّ وجل۔[2]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ہر وہ پرچم جو قائمؑ کے ظہور کے پہلے بلند کیا جائے گا اس کا اٹھانے والا طاغوت اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والا ہوگا۔

گویا اس طرح کی روایتیں امام زمانہؑ سے پہلے کی ہر تحریک و اقدام کو رد کرتی ہیں۔

ان روایات سے متعلق پہلا جواب :

ان روایتوں میں قائم علیہ السلام کے قیام و ظہور سے پہلے بلند کئے جانے والے پرچم سے مراد (اس قرینہ کے ساتھ کہ اس کا بلند کرنے والا طاغوت یعنی خدا کے مقابلے میں بہت زیادہ طغیان کرنے والا ہے) وہ پرچم ہے، جو خدا و رسول و امام کے مقابلہ میں بلند کیا گیا ہو اور اس پرچم کا مالک لوگوں کو اپنی طرف بلائے۔ بنا بر ایں ایسے فقیہ کو جو امام زمانہؑ علیہ السلام کی نیابت میں، ان ہی کی عطا کردہ ولایت و اختیارات کے سہارے اقدام کرتے ہوئے اس امام برحقؑ کے پرچم کو بلند کرے، اسے نہ ان حدیثوں کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے طاغوت کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی روایات حق پرست تحریکوں پر اثر انداز نہیں ہوتیں اور اس کی بہترین گواہ زید شہید فرزند امام زین العابدینؑ کے لئے امام صادق و امام رضا علیہما السلام کی تائیدات ہیں۔ جبکہ جناب زید شہید نے ظہور قائمؑ سے پہلے اپنی تحریک شروع کی تھی۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں (ہر اقدام کو زید کے اقدام پر قیاس نہ کرو) زید مرد عالم، دانشمند اور راستگو تھے۔ انہوں نے کبھی لوگوں کو اپنی طرف نہیں بلایا

[1] مستدرک الوسائل ۲/۲۴۸ نقل از غیبت نعمانی [2] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۷ نقل از روضہ کافی

بلکہ امام وقت اور آل رسول صلی اللہ علیہم کی جانب دعوت دی اور اگر وہ کامیاب ہو گئے ہوتے تو اپنا عہد پورا کرتے ۔ انہوں نے بنی امیہ جیسی مستحکم، طاغوتی اور غیر خدائی طاقت کو توڑنے کے لئے جہاد کیا تھا۔[1]

نیز امام صادق علیہ السلام نے جناب زید کے ایک ناصر کو انکی نصرت اور مدد کے ترک کرنے پر توبیخ فرمائی اور اسے جہاد اسلامی سے بھاگ گئے والوں میں شمار کرتے ہوئے فرمایا" زید شہید ہیں، قیامت کے دن وہ اور ان کے ناصر لوگوں کے کاندھوں پر سوار جنت کی طرف لے جائے جائیں گے" پھر امام علیہ السلام نے کچھ رقم زید کے ہمراہ شہید ہونے والوں کے خاندانوں میں اور ان کے ناصرین میں تقسیم فرمائی۔[2]

آٹھویں امام حضرت رضا علیہ السلام نے فرمایا: خدا میرے چچا زید پر رحمت نازل فرمائے، وہ لوگوں کو رضاء آل محمد علیہم السلام کی جانب دعوت دیتے تھے ۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے، تو اپنے عہد و پیمان کو پورا کرتے ۔ وہ صاحب تقویٰ اور اسلام کے عظیم شہیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔[3]

اس سلسلہ میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی پیشین گوئی سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے، آپ نے فرمایا:-

لیقوم عند ذلک رجل منا اهل البیت فانصروه فانه داع الی الحق[4]

.... ہم اہل بیت میں سے ایک شخص قیام کرے گا، پس لوگو! اس کی نصرت کرو کیونکہ وہ حق کی طرف بلانے والا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۶ بہ نقل از روضۂ کافی۔

[2] بحار الانوار ج ۴۶ ص ۱۹۴ ح ۶۶۔

[3] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۷ نقل از عیون اخبار الرضا۔

[4] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید خطبہ ۳۵۔

شیخ مفید فرماتے ہیں کہ:

یدعو الی الرضا من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ فظنوہ یرید بذلک نفسہ ولم یکن یریدھا۔[1]

حضرت زید لوگوں کو مرضی آل محمدؐ کی جانب دعوت دیتے تھے اس لئے لوگوں نے گمان کیا کہ وہ خود اپنی جانب دعوت دے رہے ہیں حالانکہ ان کا مقصد یہ نہ تھا۔

علامہ مجلسی فرماتے ہیں:

کان یدعو الی الرضا من آل محمد انہ کان عازما علی انہ ان غلب علی الامر فوضہ الی افضلھم واعلمھم والیہ ذھب اکثر اصحابنا ولم ار فی کلامھم غیرہ[2]

جناب زید لوگوں کو مرضی آل محمد کی جانب دعوت دیتے تھے، ان کا پختہ ارادہ یہ تھا کہ کامیابی کے بعد اقتدار، آل محمد کی اعلم و افضل فرد کے سپرد کر دیں گے ہمارے اکثر علماء کا بھی نظریہ ہے، ان کی تحریروں میں اس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

جناب یحییٰ فرزند جناب زید نے بھی فرمایا ہے کہ میرے پدر بزرگوار نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے قیام فرمایا تھا۔ ریاست و سلطنت کے لئے نہیں۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات اور معتقد علماء شیعہ کے ان بیانات کے ہوتے ہوئے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب زید کا اقدام غلط تھا؟ اور وہ بھی حدیث "کل رایۃ" میں شامل ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا واضح ہے کہ ان روایات سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ امام معصوم پر تکیہ اور بھروسہ کیا نہ امر بہ معروف اور نہی از منکر کے لئے جنگ کی اور نہ طاغوتی طاقتوں کو توڑنے اور فنا کرنے کے لئے اقدام کیا بلکہ مستقل طور پر لوگوں کو اپنی ذات کی طرف دعوت

---

[1] ارشاد مفید ص ۲۵۱

[2] مرآۃ العقول ۱/۲۶۱

دینے کے لئے خروج کیا اور علم بغاوت بلند کیا لیکن وہ فقیہ جس نے امام زمانہ عج کی نیابت میں خود امام علیہ السلام کی طرف لوگوں کو دعوت دی ـــ اور امر بہ معروف و نہی از منکر کے لیے انقلاب کیا ہو وہ اس حدیث میں شامل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا انقلاب خود امام زمانہ عج کا انقلاب شمار ہوگا اور ہرگز اس پر طاغوت کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا۔ کیا (معاذ اللہ) حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے انقلاب کو طاغوتی انقلاب کہا جاسکتا ہے؟ کیا حضرت زید بن علی علیہ السلام کی تحریک طاغوتی تحریک ہوسکتی ہے؟ اگر نہیں تو ایک فقیہ جامع الشرائط کا انقلاب بھی ان ہی انقلابات کی مانند ہے۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ جب بھی اسلامی سرزمین خطرہ میں ہو تو اس کا دفاع تمام مسلمانوں پر واجب ہے؟ پھر کیا ایک فقیہ کا لوگوں کو اس دفاع اور جہاد مقدس میں شرکت کے لیے دعوت دینا دعوت طاغوت ہے؟ یہ تو ایسی باتیں ہیں جن کی صحت پر کوئی تقین نہیں کرسکتا۔

یہاں تک تو اس نظریہ کے تحت جواب دیا گیا کہ روایت (کل رایۃ) سے مراد خدا، رسول اور امام کے مقابلے میں اور ان کی مرضی کے خلاف کئے جانے والے اقدامات ہیں نہ کہ حفاظت اسلام اور اس کے قوانین کو عملی جامہ پہنانے کے نیز ظلم و ستم، گناہ و فساد سے محفوظ رکھنے کے لئے امام علیہ السلام کی نیابت میں چلائی جانے والی تحریک۔

اسی بات پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے مرحوم کلینی نے امام باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے:۔

لیس من احد یدعوا الی ان یخرج الدجال الا سیجد من یبایعہ
ومن رفع رایۃ ضلالۃ فصاحبہا طاغوت[1]

روایت مذکورہ میں ـــ ضلالت و گمراہی کا پرچم بلند کرنے کو غلط جانا گیا ہے نہ کہ ہر پرچم کو چاہے وہ کلمہ حق کی سربلندی کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا جواب:

چونکہ بہت سے افراد مہدی موعود (ع) ہونے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں اور مسلمانوں

[1] روضۂ کافی ص۲۹۷

خصوصاً شیعوں کے اس عقیدہ سے غلط فائدہ اٹھاتے رہے ہیں (جبکہ حضرت مہدی موعود عج پوری دنیا میں عدل انصاف اور حکومت الٰہی کو قائم کرنے والے ایک معین شخص اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند ہیں، مخصوص علامات اور خصوصیات کے مالک ہیں یہاں تک کہ ان کے نام، القاب، ماں، باپ اور زمانہ ولادت کے سلسلہ میں بھی اشارہ بلکہ صراحت موجود ہے)

چنانچہ "مہدویت" سے حضرت امام باقر و حضرت امام صادق علیہما السلام کے زمانہ میں بھی بہت غلط استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ "مختار" کے والد مسعود بھی جناب محمد بن حنفیہ کے مہدی ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہ فرقہ کیسانیہ کا عقیدہ ہے اور پیشنگوئی بھی کی جا چکی ہے کہ حضرت حجت (ع) کی ولادت کے پہلے یا انکی غیبت کے زمانہ میں اس طرح کے غلط دعوے کئے جائیں گے۔ روایات میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ ائمہ علیہم السلام کے بعض اصحاب نے خود ان سے مہدویت کے عنوان سے ظہور کرتے اور مسلحانہ جنگی اقدام کی پیشکش کی، لیکن ان حضرات نے شدت کے ساتھ اس خیال کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

> وہ امام جو قیام کرے گا اور عالمی حکومت تشکیل دے گا وہ ہم نہیں ہیں بلکہ ہمارے فرزندوں میں سے ہے اور ابھی پیدا بھی نہیں ہوا ہے۔[1]

لہٰذا ان روایات میں طاغوت سے مراد وہ شخص ہے جو ناحق از راہ باطل مہدویت کا لباس پہن کر خود کو ان حضرت کے بجائے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

اب اگر کوئی فقیہ غیبت امام زمانہ میں انقلاب کرے، عدل و داد کا پرچم لہرائے اور دعویٰ مہدویت بھی نہ کرے بلکہ امام کی نیابت کے عنوان سے ان کے ظہور کے لئے راستہ

---

[1] عن المعلی بن خنیس قال ذهبت بکتاب عبد السلام بن نعیم و سدیر و کتب غیر واحد الی ابی عبد الله علیه السلام حین ظهر المسودة قبل ان یظهر ولد العباس بانا قد قدرنا ان یؤول هذا الامر الیک فما تری؟ قال فضرب بالکتب الارض قال: اف اف ما انا لهؤلاء بامام، اما یعلمون انه انما یقتل السفیانی۔

وسائل ۱۱/۳۸ نقل از روضہ کافی۔

ہموار کرے، مقدمات فراہم کرے اور دنیا کو ان کے ظہور کے لئے آمادہ کرے تو کیا ذاتاً بالذات اسے طاغوت اور سرکش کہا جا سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں ۔

تیسرا جواب :

زر بن حبیش کا بیان ہے کہ : امیرالمومنین علی علیہ السلام نہروان میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا : یا امیرالمومنین ! ہمیں فتنوں سے باخبر فرمائیے ۔ آپ نے فرمایا کہ جب فتنہ ظاہر ہوتا ہے تو شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں (یعنی حقیقت گم ہو جاتی ہے) اس کے بعد آپ اپنے بعد کے فتنوں کا تذکرہ فرمانے لگے تو درمیان سے ایک شخص پھر کھڑا ہوا اور عرض کی ، اے امیرالمومنین ! ایسے زمانہ میں ہمارا کیا فریضہ ہے ؟ آپ نے فرمایا : اہل بیت پیغمبرؐ کی سیرت کو دیکھو ۔ اگر ان لوگوں نے قیام کیا تو تم بھی ان کا ساتھ دو اور اگر انہوں نے تم سے مدد اور نصرت چاہی تو ان کی نصرت کرو تمہیں بہترین جزا ملے گی اور دیکھو اس معاملہ میں ان پر سبقت نہ لے جانا ، ورنہ بلاؤں میں گرفتار ہو جاؤ گے ۔ اس کے بعد آپ نے بشریت کے امن و سکون کی آخری و حقیقی منزل کو امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور سے وابستہ بتایا ۔[1]

اس حدیث میں امام علیہ السلام نے لوگوں کو اہلبیت علیہم السلام کی پیروی کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اہل بیت اگر تم سے نصرت طلب کریں تو ان کی مدد کرو جیسے سید الشہداء علیہ السلام اور اگر سکوت اختیار کرنے کا حکم دیں تو خاموشی سے بیٹھ رہو ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت قائم علیہ السلام کے ظہور اور ان کے ذریعہ امن عالم اور آخری فتح کے حصول سے پہلے بھی ائمہ علیہم السلام اور ان کے نائبین کی طرف سے قیام اور تحریکیں ممکن ہیں اور شرعی نقطہ نگاہ سے اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے ۔ ہاں حقیقی اور دائمی امن عالم ۔ ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ بھی حاصل نہ ہوگا ۔ وہ تو حضرت قائم علیہ السلام کے قیام اور ان کے ظہور کے ساتھ ہی میسر ہو سکے گا ۔ اس لئے ان روایات میں "قبل قیام القائم" سے مراد امام علیہ السلام کے ظہور و قیام سے پہلے نہیں ہے بلکہ اس سے مراد

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۴۱ نقل از کتاب الغارات ثقفی

حکمِ امام سے قبل اور امام کی اجازت کے بغیر اقدام کرنا۔

ب: اس حصہ میں وہ روایتیں نقل کی گئی ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور سے پہلے کی تمام تحریکیں شکست کا منہ دیکھیں گی اور ائمہ و مومنین کے لئے بہت زیادہ زحمتوں اور مصائب و آلام کا باعث بنیں گی ۔ مثلاً:

(۱) عن ابی الجارود عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت لہ: اوصنی فقال اوصیک بتقوی اللہ وان تلزم بیتک . . . . وایاک والخوارج منا فانہم لیسوا علی شئ ولا الی شئ . . . واعلم انہ لاتقوم عصابۃ تدفع ضیما او تعز دینا الا صرعتہم البلیۃ حتی تقوم عصابۃ شہدوا بدرا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ[۱]

ابی جارود کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا آپ مجھے نصیحت کیجئے تو آپ نے فرمایا کہ تقوائے پروردگار اختیار کرو اور خانہ نشین رہو . . . . . اور ہم میں سے خروج کرنے والوں سے بچو اس لئے کہ نہ ان کی کوئی بنیاد ہے اور نہ کوئی مقصد اور جان لو کہ مظالم کو دفع کرنے اور دین کی عزت و شرف کے لئے کوئی جماعت نہ اٹھے گی مگر یہ کہ وہ بلاؤں اور ظلم و ستم کا شکار ہو جائے ۔ یہاں تک کہ ایک ایسی جماعت قیام کرے جو بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ موجود تھی۔

(۲) عن ابی الجارود قال سمعت اباجعفر یقول لیس منا اہل البیت احد یدفع ضیما ولا یدعوا الی الحق الا صرعتہ البلیۃ حتی تقوم عصابۃ شہدت بدرا . . . .[۲]

ابی جارود کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا، آپ نے فرمایا کہ ہم اہلبیت میں سے ظلم کو دفع کرنے اور حق کی طرف بلانے کے لئے جو بھی قیام کرے گا بلائیں اسے زیر کر دیں گی یہاں تک کہ وہ جماعت قیام کرے جو بدر میں تھی۔ . . .

---

[۱] مستدرک ۲/۲۴۸ نقل از غیبت نعمانی [۲] مستدرک ۲/۲۴۸ نقل از غیبت نعمانی

۳. عن ابی جعفرؑ مثل من خرج منا اهل البیت قبل قیام القائم علیہ السلام مثل فرخ طار ووقع من وکرہ فتلاعب بہ الصبیان[1]

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ قائم علیہ السلام کے قیام کے پہلے ہم میں سے خروج کرنے والے کی مثال چڑیا کے اس بچے جیسی ہے جو اڑنے کے چکر میں اپنے گھونسلے سے گر پڑے اور بچے اسے تماشہ بنالیں۔

۴. عن علی بن الحسین ؑ قال: واللہ لا یخرج احد منا قبل خروج القائم الا کان مثلہ کمثل فرخ طار من وکرہ قبل ان یستوی جناحاہ فاخذہ الصبیان فعبثوا بہ[2]۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کی قسم قائم ؑ کے قیام سے پہلے ہم میں سے کوئی خروج نہیں کرے گا مگر وہ جس کی مثال ایسے پرندہ کے بچے کی مانند ہوگی جو پروں کی مضبوطی کے بغیر اپنے گھونسلے سے پرواز کرے اور بچے اسے پکڑ کر کھلونا بنالیں۔

(۵) روایت صحیفہ سجادیہ قال ابوعبداللہ: ما خرج ولا یخرج منا اهل البیت الی قیام قائمنا احد لیدفع ظلما او ینعش حقا الا اصطلمتہ البلیۃ وکان قیامہ زیادۃ فی مکروهنا وشیعتنا[3]

صحیفہ سجادیہ میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: ظلم کو مٹانے اور حق کو بچانے کے لئے ہم اہل بیتؑ میں سے جب بھی کوئی میدان میں آیا اسے بلاؤں اور مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا اور قیام قائمؑ سے پہلے آئندہ بھی ہم میں سے جو شخص اقدام کرے گا بلاؤں میں گرفتار ہوگا، اس طرح کی تحریکیں ہمارے اور ہمارے شیعوں کے مصائب میں اضافہ کا سبب ہوئی ہیں۔

---

[1] مستدرک، ۲/۲۴۸ نقل از غیبت نعمانی۔

[2] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۶ نقل از روضۂ کافی۔

[3] مقدمہ صحیفۂ سجادیہ ص۱۷

مذکورہ روایتوں کا جواب:۔

واضح ہے کہ اس طرح کی روایتیں تحریکوں کی نفی نہیں کرتیں اس لئے کہ امام حسین علیہ السلام بھی جانتے تھے کہ میری تحریک ظاہری شکست پر تمام ہوگی لیکن اس کے باوجود آپ اس پر کمربستہ تھے اور لوگوں پر بھی ان کی نصرت واجب تھی چنانچہ آپ خود فرماتے تھے کہ جس نے بھی میری آوازِ ھل من ناصر سنی اور مدد نہ کی خداوند متعال اسے منہ کے بل جہنم میں ڈالے گا درحقیقت اخبار پیغمبر اور اقوال حضرت علیؑ کی طرح یہ خبر بھی غیبی خبروں میں سے ہے کہ ظاہری طور پر امام حسین علیہ السلام اپنے اقدام میں کامیاب نہیں ہوں گے اور شہید ہو جائیں گے۔

البتہ اگر مقصد صرف ظاہری کامیابی ہو تو شکست اور ناکامی کا علم رکھتے ہوئے قیام واقدام ناجائز اور غلط ہوگا۔ کیونکہ اوّل تو یہ کام عبث اور لغو ہے دوسرے اس طرح کا اقدام ہلاکت کا موجب اور حرام ہے لیکن کبھی حقیقی کامیابی اور رضاء پروردگار، میدان کارزار میں قتل ہو جانے سے بھی حاصل ہوتی ہے جب کہ آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور "تلوار پر خون کی فتح" کے معنی بھی یہی ہیں۔

اور اگر ہم ان باتوں کو قبول نہ کریں اور یہ کہیں کہ ممکن ہے معصومین علیہم السلام سے اس طرح کی روایتوں کے صادر ہونے کا مطلب شکست اور ناکامی سے آگاہ کرنا اور لوگوں کو یہ بتانا ہو کہ غیبت امام زمانہؑ میں مسلحانہ اقدام وقیام واجب نہیں اور اسے ترک کرنا جائز ہے۔ ایسی صورت میں بھی قیام واقدام کا جواز ختم نہیں ہوتا اور اگر کچھ افراد نے خدا کے لئے تلوار اٹھائی، شکست کھائی اور دشمن پر غالب آنے کے بجائے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خود شہید ہو گئے تو وہ خدا کی راہ میں اس کے دین پر فدا ہونے والے اور شہید شمار کئے جائیں گے، جیسے زید بن علی اور شہید فخ وغیرہ جو شہیدان راہ خدا ہونے کی حیثیت سے ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی بارگاہ میں مورد تکریم وتجلیل اور لائق احترام قرار پائے اور بہشت کی طرف پہلے جانے والوں میں شمار ہوئے اور جنہوں نے قیام واقدام کو ترک کرکے صرف ثقافتی وفکری جہاد پر اکتفا کیا وہ بھی معذور قرار دیئے جائیں گے۔ اس کی مثال جناب عمار اور ان کے شہید والدین کے واقعے سے ملتی ہے۔ تقیہ کی روایات میں ہے کہ امام علیہ السلام

نے فرمایا: عمار کے ماں باپ نے تقیہ نہیں کیا، اذیتیں برداشت کیں اور درجہ شہادت پر فائز ہو کر داخل بہشت ہوئے لیکن عمار نے بھی اپنے اسلامی فریضہ پر عمل کیا اور ان پر کوئی آنچ نہیں آئی جیسا کہ سورۂ نحل کی آیہ شریفہ (۱۰۵) میں اشارہ سے واضح ہے: ومن کفر باللّٰہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللّٰہ ولھم عذاب عظیم ـــ اور جو شخص ایمان لانے کے بعد مجبوراً کافر ہو گیا جبکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو (جیسے عمار یاسر) لیکن جس نے ہواۓ نفس کے ساتھ بارضا و رغبت اپنے دل میں کفر کی ظلمت بھر لی ان پر خدا کا غضب ہے اور ان ہی کے لئے دوزخ کا سخت عذاب ہے۔

ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا روایات جو قتل و غارت، مصائب و آلام اور ناکامی و تلمز دائی پر دلالت کرتی ہیں ـــ ان سے مراد بنی امیہ و بنی عباس کے عہد میں پرچم آزادی بلند کرنے والے سادات یا خود ائمہ معصومین علیہم السلام ہوں اور ہمارا یا حضرت بقیۃ اللّٰہ الاعظم عجل اللّٰہ فرجہ الشریف کے عام تابعین کا عصر ان کے زمرہ میں شامل نہ ہو۔ جیسا کہ ایران کے اسلامی انقلاب میں اسلام کی کامیابی اور حکومت اسلامی کی تشکیل روز روشن کی طرح عیاں ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اگر حدیث کو عصر ائمہ اور بنی امیہ و بنی عباس کے خلاف سادات کی تحریکوں سے مخصوص نہ مانیں تو حدیث، خلاف واقع اور جھوٹی ثابت ہو جائے گی۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مذکورہ حدیثیں سادات و غیر سادات میں سے ان افراد سے متعلق ہوں جنھوں نے مہدیؑ موعود کی حیثیت سے ایک عالمی حکومت قائم کرنے کے لئے خروج کیا جن کا خروج و اقدام ناکام بھی ہوا اور خلاف شرع و حرام و ناجائز بھی تھا۔ لہٰذا جو فقہا دعواۓ مہدویت کے بجاۓ حضرت ولی اللّٰہ الاعظم عجل اللّٰہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی نیابت اور خدمت گزاری کے عنوان سے اقدام و انقلاب کرتے ہیں وہ ان احادیث میں شامل نہیں ہیں۔

ممکن ہے ان روایات یا ان سے ملتی جلتی دوسری روایات سے مراد صرف مسلحانہ قیام ہو۔ لیکن اگر مقابلہ سیاسی ہو اور دشمن علاوہ سیاسی مقابلے کے مسلمانوں کے قتل کا

اقدام بھی کرے تو اس کا دفاع اس طرح کی کسی حدیث میں شامل نہ ہوگا۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس قسم کی روایت، زمانۂ غیبت امام زمانہ عجل اللہ فرجہ میں عادل فقہا و مومنین کے مسلحانہ اقدام کی کراہت پر ہرگز دلالت نہیں کرتیں خصوصاً جبکہ عالم اسلامی کے ایک حصہ میں ہی سہی فتح و کامیابی کی فضا ہموار ہو جاتے۔ لیکن اگر مسلح کامیابی کے مواقع بہت کم اور ثقافتی جہاد کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہوں تو اس مسلح قیام کے بجائے ثقافتی سرگرمیوں پر زور دینا زیادہ مناسب ہے جس کا فوری نتیجہ اسلامی حکومت کے بنیادگذاروں کی جان و مال و آبرو کی بربادی ہو۔

جناب سید احمد فہری زنجانی

ترجمہ: جناب سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

اساتذہ کیسے ہوں؟

معلم اخلاق، فقیہ عظیم الشان اسلام شہید ثانی علیہ الرحمہ نے اپنی بیش قیمت کتاب "منیۃ المرید" میں صرف مدرسین حضرات کے لئے مخصوص طور سے بیس[20] آداب کا تذکرہ فرمایا ہے اور تیس عدد وہ آداب ذکر کئے ہیں جو استاد و شاگرد دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔

اگرچہ سبھی کردار ساز و سبق آموز ہیں لیکن میں نے اہمیت کے پیش نظر صرف دو[2] ادب کو اس رسالہ کے لئے منتخب کیا ہے۔

۱۔ اگر طالب علم استاد سے کوئی سوال کرے جس کا جواب اسے معلوم نہ ہو، یا دوران درس کوئی ایسا رخ سامنے آجائے جسے وہ نہیں جانتا ہو تو اسے چاہیئے بلا جھجک بغیر کسی حیلہ و حوالہ کے کہدے کہ "نہیں جانتا" یا کہدے فی الحال اس نکتہ کی طرف متوجہ نہیں ہوں یا مثلاً یہ کہے۔ فی الحال اسے رہنے دو غور کرکے بتاؤں گا۔ اس طرح صاف صاف کہنے میں قطعاً پس و پیش نہ کرے، یہ خود علم ہے کہ جس وقت انسان کسی چیز کو نہیں جانتا صاف صاف کہدے کہ میں نہیں جانتا، علیم و بصیر تو صرف خدا ہے۔

حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اذا سئلتم عمّا لا تعلمون فاھربوا قالوا کیف الھرب ؟

قال: تقولون اللہ اعلم۔

جس وقت تم سے کسی ایسی چیز سے متعلق سوال کیا جائے جسے تم نہیں جانتے تو جلد از جلد بھاگ جاؤ، لوگوں نے حضرتؑ سے عرض کی کیسے بھاگیں؟ تو حضرتؑ نے فرمایا — کہو: خدا بہتر جانتا ہے۔

اسی مضمون کو امام محمد باقر علیہ السلام نے اس طرح فرمایا ہے:

ما علمتم فقولوا وما لا تعلمون فقولوا اللہ اعلم۔ ان الرجل لینتزع بالآیۃ من القرآن یخرّ فیھا ابعدَ ما بین السماء والارض۔ (منیۃ المرید ص۱۹)

جسے جانتے ہو اسے تو بتادو اور جسے نہیں جانتے کہدو کہ نہیں جانتے، خدا دانا تر ہے۔ کیونکہ جو شخص قرآن کی کسی آیت کو سوچے سمجھے بغیر پڑھتا ہے وہ ایسی کھائی میں گرتا ہے جس کی گہرائی زمین و آسمان کے فاصلے سے زیادہ ہے۔

جناب زرارہ بن اعین نے امام باقر علیہ السلام سے سوال کیا۔

ماحق اللہ علی العباد ؟

انسانوں پر خدا کا حق کیا ہے؟

حضرتؑ نے جواب میں فرمایا:۔

ان یقولوا ما یعلمون و یقفوا عند ما لا یعلمون

انسان جسے جانتا ہے بتادے اور جسے نہیں جانتا وہاں خاموش رہے۔

اسی مفہوم کو امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

انّ اللہ خصّ عبادہ بآیتین من کتابہ ان لا یقولوا حتّی یعلموا قال اللہ عزّ وجل الم یوخذ علیھم میثاق الکتاب ان لا یقولوا علی اللہ الا الحق و قالَ: بل کذّبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یأتھم تاویلہ۔

پروردگار عالم نے اپنے بندوں کو قرآن کی دو آیتوں سے امتیاز عطا فرمایا ہے وہ امتیاز یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کو معلوم نہ کرلیں، بیان نہ کریں، اور جس کو نہیں جانتے رد نہ کریں۔

۱۔ کیا ان سے خدا کی کتاب کا عہد و پیمان نہیں لیا گیا تھا کہ خدا پر سچے کے علاوہ جھوٹ کبھی نہیں کہیں گے۔

۲۔ بلکہ جس چیز کو نہیں جانتے تھے اس کی تکذیب کردی حالانکہ ابھی تک ان کے ذہن میں اس کے معانی نہیں آئے۔

جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا:۔

اذا ترك العالم لا ادری اصيبت مقاتله

جس وقت اہل علم لفظ "نہیں جانتا" کو چھوڑ دیتے ہیں خطرات سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس جگہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرادوں، وہ نکتہ یہ ہے کہ جس وقت انسان اپنے مخاطب سے کہے نہیں جانتا ممکن ہے اسی وقت اس کا نفس اسے مخاطب کرتے ہوئے کہے۔

" اگر تم سے عوام نے کچھ سوال کیا اور تم نے ان کے جواب میں کہدیا کہ نہیں جانتا اس وقت تمہارا وقار ان کی نظروں سے گرجائیگا، اور حیثیت مجروح ہوجائے گی کیونکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ تم صاحب علم و فضل ہو، لہٰذا اس وقت جس طرح بن پڑے جواب دیدو یہ نہ کہو کہ نہیں جانتے۔"

اگر نفس اس طرح سے ورغلا رہا ہو تو آپ اس وقت اس کی تلقین و تنبیہ کریں کہ اے نفس، اگر میں نے کہدیا کہ نہیں جانتا" اس سے میرے وقار میں کمی نہیں آتی بلکہ لوگوں کے دلوں میں میری عزت و عظمت اور بڑھ جاتی ہے۔

اے نفس چونکہ تو نے اپنے لئے ضروری قرار دے لیا ہے کہ ہمیشہ حق بات کہے گا اور حق سے وابستہ رہے گا لہٰذا اس کے صلہ میں خدا نے عوام کی نگاہ میں تیرا مرتبہ بلند کردیا۔

اگر تجھے میری باتوں پر بھروسہ نہیں تو خود کسی سے سوال کر کے دیکھ لے، اگر تیرے جواب میں اس نے کہا کہ نہیں جانتا، غور و فکر کی ضرورت ہے تو تجھے اس کے اِس جواب سے اس کے تقویٰ و دقت نظر کا مزید معترف ہوتا پڑتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے بات نہیں کہتا۔ لہٰذا اے میرے باطن تو بھی جس چیز کو نہیں جانتا بھرپور اخلاقی جرأت و ہمت کے ساتھ کہدے کہ نہیں جانتا، اور اگر کہیں یہ خیال غالب آگیا کہ لاعلمی کے اظہار سے عوام کی نظروں میں گر جائے گا تو اس تصور سے تو نہ صرف جہالت و نادانستگی کا شکار ہوا بلکہ غلط جواب دیکر گناہ کبیرہ کا بھی مرتکب ہوا، پروردگار عالم تیری اسی جاہلانہ جرأت مندی پر عوام میں تیری علمی حیثیت کو بے نقاب کرتے ہوئے رسوا فرماتے گا۔ اسی حقیقت کی طرف حدیث قدسی میں ارشاد الٰہی ہے: من افسد جوانیه افسد الله برانیه

جس کسی نے اپنے باطن کو فاسد کیا خدا اس کے ظاہر کو بھی فاسد کرتا ہے۔

۲۔ مدرسین کے آداب میں دوسرا ادب یہ ہے کہ اگر کبھی مجلسوں اور سیمناروں میں تقریر و جواب کا موقع مل جائے اور تقریر میں کوئی ایسی بات کہی ہو جو اس وقت تک اس کے علم میں صحیح تھی لیکن بعد میں اس کی غلطی کی طرف متوجہ ہوا ہے تو شرمندگی کا احساس کئے بغیر عوام سے اس کا تذکرہ کر کے ان کی اصلاح کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس امارہ اسے فوری اعتراف خطا سے روکنے کے لئے ذہن میں یہ خیال پیدا کرے کہ جب غیروں کا مجمع چھٹ جائے گا اس وقت اعلان کروں گا، ان تصورات پر اعتنا نہ کرے کیونکہ یہ بھی نفس کی بازی گری اور ابلیس کی حیلہ سازی ہے۔ ابلیس یہی چاہتا ہے کہ انسان کو اس طرح کے بھیانک خطرات سے دوچار کرتا رہے۔ انسان اگر اپنی غلطی کا فوری اعتراف نہ کرے تو اسے بہت سے خطرات و نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

الف: اس کی غلط بات لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر گھر کر لیتی ہے اور جب گھر کر چکے تو اس کا دلوں سے نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

ب: اعتراف خطا میں ٹال مٹول کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ حق بات جس کے بیان کی ضرورت بھی بروقت سامنے نہیں آپاتی ــــ یا مثلاً یہ خطرہ رہتا ہے کہ اگر بروقت غلطی کا اعتراف نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ جس وقت انسان اپنی غلطی کا اعتراف کرے

حاضرین مجلس میں سے کچھ موجود نہ رہیں اور اس طرح ناقص و ناتمام بیان ان کے ذہنوں میں رہ جا بسا رہ جائے۔

ج ۔ غلطی کر کے اس پر باقی رہنا یہ ایک طرح سے شیطان کی اتباع و پیروی ہے۔ اس عمل سے شیطان کی تمنائیں بڑھتی رہتی ہیں اور وہ اسی راہ سے بار بار اس کو بہکاتا رہتا ہے۔

لیکن اگر مدرسین اعتراف خطا میں ٹال مٹول کے بجائے فوری غلطی تسلیم کر لیں تو ان کے اس عمل سے ان کے شاگردوں میں بھی عمدہ خصلتیں اور اچھی عادتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح استاد و شاگرد دونوں خیر کثیر سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔

غلطی کے تسلیم کر لینے سے مدرسین حضرات کے نامہ اعمال میں اجر و ثواب تو لکھے ہی جاتے ہیں مزید برآں معبود انہیں عوام کی نظروں میں مکرم و محترم بھی قرار دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے "رسالہ حقوق" سے امام چہارم علی بن حسین علیہما السلام کے ارشاد پر اس باب کو ختم کر رہا ہوں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں :۔

قال علیہ السلام : وحق سائسک بالتعلم التعظیم لہ والتوقیر لمجلسہ وحسن الاستماع الیہ والاقبال علیہ وان لا ترفع علیہ صوتک ولا تجیب احداً یسألہ عن شیءٍ حتی یکون ھو الذی یجیب ولا تحدث فی مجلسہ احداً ولا تغتاب عندہ احداً وان تدفع عنہ اذا ذکر عندک بسوء وان تستر عیوبہ وتظھر مناقبہ ولا تجالس عدوہ وتعادی لہ ولیہ فاذا فعلت ذالک شھدت لک ملائکۃ اللہ بانک قصدتہ وتعلمت علمہ للہ عز وجل لا للناس۔

جو شخص تمہاری تعلیم و تربیت کا کفیل رہا ہو تم پر لازم ہے کہ اس کی تعلیم و توقیر کرو، اس کی بزم کا احترام کرو، اس کی باتوں پر گوش بر آواز رہو، جب تک وہاں رہو ہمہ تن اس کی طرف متوجہ رہو، اپنی آواز کو اس کی آواز پر بلند

نہ ہونے دو اور اگر کسی نے اس سے کچھ پوچھا تو تم جواب میں پہل نہ کرو۔ استاد کی بزم میں دوسرے سے گفت و شنید نہ کرو، نہ اس کے سامنے کسی کی غیبت کرو اور اگر تمہارے سامنے تمہارے استاد کی کوئی غیبت کرے تو حتی الامکان اس کا دفاع کرو۔ استاد کی خوبیوں کو نشر کرو اور اس کی برائیوں کی پردہ پوشی کرو، نہ اس کے مخالفین کے ساتھ نشست و برخاست رکھو اور نہ اس کے چاہنے والوں سے کدورت و کبیدگی۔ اگر شاگرد نے ان باتوں کی رعایت کی تو پھر یہیں جا کر فرشتے خدا کے سامنے اس کے حق میں گواہی دیں گے کہ طالب علم کا مقصد تحصیل علم سے صرف اور صرف خدا کی رضا و خوشنودی تھا۔

بحث و گفتگو کے آداب:

عزیزان گرامی! ہماری روزمرہ کی زندگی میں بحث و گفتگو (مناظرہ) خواہ علمی و سماجی موضوعات میں ہو یا سیاسی و اخلاقی، لہو بن کر رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ کچھ ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس کے اسیر نہ ہوں۔ حضرات مدرسین و طلاب کرام کو تو بحث و گفتگو سے بچنے کا کوئی چارہ ہی نہیں۔ بہر حال ان سب کے باوجود بحث و گفتگو بھی ابلیس کے پھندوں میں سے ایک پھندہ ہے اور انسان کی لغزش کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر لطف الٰہی شامل حال نہ ہو تو انسان کا اس پھندہ سے نجات حاصل کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے اعلام نے اس خطرہ سے بچنے کے لئے ہماری رہنمائی کی ہے۔ میں اس جگہ فقیہ عظیم الشان اسلام جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ کے افادات کو نہایت اختصار اور لفظی ترجمہ کی رعایت کئے بغیر نذر ناظرین کر رہا ہوں۔

جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے بحث و مناظرہ سے متعلق آٹھ شرطوں اور بارہ مشکلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میں اس جگہ پہلے مناظرہ کے شرائط و آداب کا تذکرہ کر رہا ہوں، آئندہ شمارے میں مناظرہ کی مشکلات کا ذکر کروں گا۔

احکام دین میں مناظرہ (بحث و گفتگو) کرنا مذہب کے اہم فرائض میں سے ہے لیکن اس کے لئے

ایک خاص وقت اور مخصوص جگہ کی شرط ہے۔ اگر کسی نے ان شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے مناظرہ کا آغاز کیا تو یقیناً بزرگ علماء کی اتباع و تاسی کی، چونکہ ان کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ احکام دین میں بحث و گفتگو کرتے رہتے تھے۔ لیکن مناظرہ کرتے وقت ان کا مطمح نظر خدا کی خوشنودی اور حقیقت تک رسائی رہا ہے۔ میں نے شرائط مناظرہ کے ذیل میں ان علامتوں پر روشنی ڈال دی ہے جس سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ کون سا مناظرہ رضائے خدا کے لئے انجام دیا جاتا ہے۔

شرطِ اوّل :-

مدرسین و طلاب کا مقصد بحث و گفتگو سے یہ ہو کہ حقیقی و واقعی مطلب کو درک کریں و جس طرح سے ممکن ہو حقیقت مطلب کو روشن و آشکار کریں۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ مناظر بحث و گفتگو کے ذریعہ حقیقت تک پہنچنے کے بجائے خود اپنے قول کی حقانیت و صداقت کے اثبات پر چوٹی کا زور صرف کر دے تاکہ دیکھنے والے اس کے اس انداز سے اسے پڑھا لکھا تصور کریں اگر خدانخواستہ وقتِ مناظرہ یہ خیال رہا تو پھر مناظرہ صرف اور صرف خدا کے لئے نہ رہا، روایات کی روشنی اور رہبر انقلاب امام خمینی کے بیان کے مطابق ایسے مناظرے عذاب جہنم کا باعث ہوتے ہیں اور اس جذبہ کیساتھ مناظرہ کرنے والا شخص ان آیات و روایات کا مصداق قرار پاتا ہے جسمیں ریاکار کی مذمت کی گئی ہے۔

میں نے ریا کے نقصانات و خطرات اور اس کی علامتوں کو مفصل طور سے اپنے رسالہ "بحثی پیرامون ریا" میں ذکر کر دیا ہے۔ اس جگہ صرف ایک علامت تحریر کر رہا ہوں جس کی طرف جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے متنبہ فرمایا ہے ــــ وہ کہتے ہیں ــــ

مناظر کو چاہیئے کہ بحث و گفتگو کے ذریعہ صرف حق بات کو آشکار کرنا چاہتا ہو، مناظرہ کے ذریعہ اپنی علمی بالاتری، و صائب نظری کے اظہار کا قصد نہ رکھتا ہو، اور اس کا بھی لحاظ رکھے کہ مناظرہ اس وقت چھیڑے جب اس کے مفید اثرات مرتب ہونے کے امکانات ہوں۔ یہ احتمال ہو کہ اگر حقیقت واضح ہو گئی تو مد مقابل اپنے اشتباہ کو تسلیم کرتے ہوئے اسے مان لے گا، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ مد مقابل کسی قیمت پر اپنے نظریہ سے منصرف نہ ہوگا

تو پھر مناظرہ کے لئے پہل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ کوئی شخص اس تعین کے بعد مناظرہ کی ٹھان لے تو اس کا مطلب ہے کہ مناظرہ سے اثبات حق و حقیقت مقصود نہیں تھا بلکہ اپنی علمی جلالت و بالاتری کو تسلیم کرانا تھا۔ یہ جذبۂ ریا کے ان نازک مرحلوں کی نشاندہی کرتا ہے جسے حدیث میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"ریا انسانی عمل میں اس طرح غیر محسوس وجود رکھتی ہے جس طرح اندھیری رات میں چیونٹی کی حرکت محسوس نہیں کی جا سکتی۔"

کسی کتاب میں میں نے پڑھا تھا کہ ایک بزرگ کو ان کی رحلت کے بعد ایک شخص نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا مرنے کے بعد انجام کیا رہا؟ عالم دین نے جواب دیا۔ مرنے کے بعد مجھ سے سوال ہوا کہ ــــ آخرت کے لئے کیا ذخیرہ کیا ہے؟ میں نے جواب میں کہا: دین اسلام کی ترویج و تبلیغ کی اور فروغ مذہب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ــــ جب میں نے اپنے مذہبی خدمات کا حوالہ دیا تو فرشتوں نے میرا جواب دیا ــــ

یہ صحیح ہے کہ تم نے دین کی ترویج و تبلیغ کی لیکن کیا اس ترویج کا یہ مقصد تھا کہ اسلام کی تبلیغ اور مذہب کو فروغ حاصل ہو یا اس تبلیغ کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ لوگ تمہیں دین کا مروج و مبلغ کہیں ــــ؟

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط اس سے قطع نظر مضمون کے اعتبار سے سبق آموز و قابل عبرت ہے۔ اسی ریا کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی طرف شہید ثانی علیہ الرحمہ نے متوجہ فرمایا ہے۔

ریا کی ان پرخطر راہوں کو خدا رسیدہ معلمین، فریضہ شناس طلاب اور خاصان خدا کے علاوہ کوئی دوسرا محسوس نہیں کر سکتا۔ توفیق الٰہی کا آرزومند ہوں۔

شرطِ دوّم

خوشنودی خدا کی خاطر انجام دیئے جانے والے مناظرہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ جس زمانہ میں مناظرہ کی پہل کی جا رہی ہو اس وقت مناظرہ سے اہم مسئلہ درپیش نہ ہو، کیونکہ بالفرض

اگر مناظرہ اپنے صحیح شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے تو بھی واجب کفائی ہے اور واجب عینی کی موجودگی میں واجب کفائی کا انجام جائز نہیں، یا اسی طرح دو واجب کفائی ہوں ایک دوسرے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو تو اس جگہ بھی اس واجب کفائی کو انجام دیا جائیگا جو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً ـــ عصر حاضر میں واجباتِ الٰہی میں ایک ایسا واجب ہے جس کی تبلیغ و ترویج کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کا نام ہے ـــ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ـــ ممکن ہے کوئی شخص کسی جگہ مناظرہ کے لئے ماحول سازگار کر رہا ہو اور اسی جگہ کچھ ایسی غیر شرعی باتیں ہوں جن کی روک تھام ضروری ہے۔ ایسی جگہوں پر مناظرہ سے زیادہ اہتمام ان غیر شرعی امور کی روک تھام کے لئے کرنا چاہیئے۔

ممکن ہے کسی وقت مناظرہ کا عنوان ایک دقیق علمی موضوع قرار پائے جس سے عموماً معاشرہ دوچار نہیں ہوتا ایسی جگہوں پر مناظر کے لئے لازم ہے کہ ان باتوں کو مناظرہ پر مقدم کرے جس کا اظہار و اثبات اس وقت مناظرہ پر اہمیت رکھتا ہے۔

مزید برآں مناظر کا فریضہ ہے کہ آغاز مناظرہ سے پہلے از راہ اخوت و بھائی چارگی مدمقابل کو متوجہ کرے کہ درمیان گفتگو کوئی رکیک و غیر مہذب فقرہ زبان سے نکلنے پائے جو طرفین کی اذیت و اہانت اور ارتکاب گناہ کا سبب ہو۔

افسوس! کہاں ان باتوں کی رعایت ہوتی ہے ان ساری باتوں کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی مناظر خیال کرتا ہے کہ مناظرہ خدا کی خوشنودی کے لئے کر رہا ہے۔

شرطِ سوم

خوشنودی خدا کی خاطر انجام پانے والی بحث و گفتگو کا ایک معیار یہ ہے کہ اگر اس کا عنوان "فقہی موضوع" ہو تو مناظر کے لئے مجتہد یا کم از کم عربی طالب علم ہونا ضروری ہے تاکہ مناظرہ نتیجہ خیز ہو سکے۔ مجتہد کی شرط اس لئے ضروری ہے کہ اگر مدمقابل کی دلیلیں حق و صحیح ہوں گی تو مجتہد اسے تسلیم کرتے ہوئے اپنے فتویٰ میں تبدیلی لائے گا۔ اکثر مجتہدین کے لئے ایسے حالات درپیش ہوتے رہتے ہیں ـــ اور اگر عربی طالب علم ہے تو مناظرہ اس کی قوت

استنباط کی ترقی اور حق و باطل کے درمیان تشخیص کی استعداد کو بڑھاتا ہے۔ لیکن اگر کہیں مناظر عامی و مقلد ہے تو مناظرہ عمر و وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ــــ اس جگہ کیا عمدہ ہوگا کہ مناظرہ کے بجائے دیگر دوسری مفید باتوں کو اختیار کیا جائے۔

شرط چہارم

مناظرہ کا موضوع وہ چیزیں قرار پائیں جس کے اثبات کی ناگہانی طور سے ضرورت ہو یا مستقبل قریب میں اس کے وقوع کا امکان ہو۔ مناظرہ کے لئے ان موضوعات کو منتخب نہیں کرنا چاہئے جو کسی زمانہ میں مفید و کارآمد نہ ہوں۔

مناظر کو ہمیشہ اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ بحث و گفتگو اسی وقت تک کرتا رہے جب تک بات واضح نہ ہو رہی ہو جس وقت بات واضح ہو جائے مناظرہ ختم کردے، مزید گفتگو بڑھانے کی ضرورت نہیں اور نہ وسوسہ نفسانی کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے ہی موقعوں پر نفس ورغلاتا ہے کہ مزید بحث کرتے رہو جس قدر بحث طولانی ہوگی قدرت استدلال میں اسی قدر اضافہ ہوگا اور فکر کے دریچہ باز ہوں گے۔ ممکن ہے کبھی ایسا بھی ہو کہ مناظرہ کو طول دینے کے مفید پہلو ہوں لیکن نہایت دقت نظر کی ضرورت ہے کہیں ایسا نہ ہو استدلال و استنباط کی تقویت کے بہانے نفس اپنے فریب اور ابلیس اپنی گرفت میں لے رہا ہو۔

شرط پنجم

مناظرہ کی پانچویں شرط یہ ہے کہ حتی الامکان مناظرہ تنہائی میں منعقد کیا جائے تاکہ سکون و اطمینان کے سبب حقائق و مطالب کے درک کرنے میں سہولت ہو سکے کیونکہ تماشائی کی کثرت سے بسا اوقات مناظر کا ذہن الجھ جاتا ہے اور کبھی کبھی ریا و ظاہر داری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور مناظر باوجودیکہ مد مقابل حق و صحیح کہتا ہے لیکن اسے مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا مقصد مناظرہ سے اپنی خود نمائی ہوا

کرتا۔ وہ تنہائی میں جواب دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمہ تن کوشش یہی ہوتی ہے عوامی پلیٹ فارم پر مناظرہ کا اہتمام و انعقاد عمل میں آئے۔

شرط ششم

مناظر کو جستجوئے حق میں اس انسان کی طرح ہونا چاہیئے جو اپنی کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں سرگرداں ہو اور جب کسی جگہ اور جس کسی کے ہاتھوں میں اسے دیکھتا ہے باغ باغ ہوتا ہے۔ لہٰذا مناظر اپنے مدمقابل کو دوران مناظرہ ناصر و مددگار اور ہم سفر تصور کرتا رہے نہ کہ حریف و مخالف چنانچہ جب مدمقابل نے اس کی غلطی کو آشکار کر دیا اور خود مناظر بھی اپنی غلطی کی طرف متوجہ ہو گیا تو چاہیئے کہ شکریہ کے ساتھ قبول کرلے، جس طرح کسی کھوئی ہوئی شی کی تلاش میں سرگرداں انسان کو اگر کوئی اس کا دوست مل جاتا ہے اور کہتا ہے تمہاری کھوئی ہوئی شئ فلاں جگہ ہے، اس کا راستہ یہ نہیں وہ ہے، تو خوش حال ہو جاتا ہے۔

چونکہ حق بھی مومن کے لئے متاع گمشدہ کی حیثیت رکھتا ہے وہ ہمیشہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لہٰذا مناظر کو بھی چاہیئے کہ جیسے ہی حق بات اس پر آشکار ہو جائے، مدمقابل کی اہانت و توہین کئے بغیر حق بات کو خندہ پیشانی سے قبول کرلے۔

شرط ہفتم

درمیان بحث و گفتگو اگر مناظر کا مدمقابل اپنے مدعا کے اثبات کے لئے کسی نئی دلیل کا سہارا لے یا کوئی نیا سوال کرے تو جواب سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسے اس کی دلیل میں سہارا دیتا رہے تاکہ حق تک رسائی میں آسانی ہو سکے۔ بلکہ اگر درمیان گفتگو مقابل نے کوئی ایسا جملہ استعمال کیا جو مدعا کو ثابت کرتا ہے، یا اس کا نتیجہ مقصود و مدعا سے قریب کرتا ہو، اگرچہ خود مدمقابل اس نکتہ کی طرف متوجہ نہ بھی ہو تب بھی اسے متوجہ کرتے ہوئے اسے قبول کرے کیونکہ مناظرہ کا مقصد یہی تھا کہ حق تک رسائی ہو جائے خواہ وہ نامربوط و غیر مرتب جملوں کے ذریعہ سے کیوں نہ ہو۔

لہٰذا دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ اثناء مناظرہ اپنے مقابل سے کہتے ہیں کہ ـــ کچھ دیر پہلے تو تم یہ کہہ رہے تھے، اس وقت بات بدل دی ـ چونکہ تم اپنی بات پر قائم نہیں لہٰذا میں تمہاری باتوں کا جواب نہیں دونگا ـ اس جیسی نامناسبت و بے ہودہ باتیں مناظرہ کے لئے قطعاً مناسب نہیں ایسا انداز اختیار کرنے والے کو حق سے برسرپیکار اور جادہ حقیقی سے منحرف تصور کیا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر بحث و گفتگو کی نشستیں باہمی خصومت و دشمنی پر ختم ہوتی ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک دوسرے سے دلیل طلب کرتا ہے لیکن مقابل باوجودیکہ دلیل رکھتا ہوتا ہے پھر بھی پیش نہیں کرتا اور باہمی انکار و اصرار کا سلسلہ چلتا رہتا ہے ـ یہ انداز سو فیصد فساد و اختلاف کا سبب ہے اور شرع مطہر مرسل اعظمؐ سے خیانت کا مترادف ہے، اور ایسے افراد ان احادیث کا مصداق ہیں جن میں کتمانِ علم (علمی بخل) کرنے والے کی شدید مذمت و نفرین کی گئی ہے۔

شرط ہشتم

مناظرہ کی آخری شرط یہ ہے کہ ہمیشہ بحث و گفتگو ان لوگوں سے کرے جو صاحبان فکر و نظر ہیں تاکہ ان کے خیالات و افکار سے بہرہ مند ہوسکے۔ صاحبان نظر کا بحث و گفتگو کے لئے انتخاب اس بات کی نشاندہی ہے کہ بحث و مباحثہ کا مقصد تلاش حق ہے لیکن مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ عموماً بحث و مباحثہ ان لوگوں سے نہیں کیا جاتا جو میدان فکر و دانش کے مرد میدان ہیں ـ کیونکہ ان لوگوں سے مناظرہ و مباحثہ کرنے میں اپنی شکست کا قوی امکان رہتا ہے لہٰذا ہمیشہ جذبہ یہی رہتا ہے کہ ان لوگوں سے بحث و گفتگو چھیڑیں جو علمی و فکری طور سے بودے اور بے خبر ہیں تاکہ ان پر غلبہ پاکر اپنے باطل نظریہ کو فروغ دے سکیں۔

ان آٹھ شرطوں کے علاوہ بھی کچھ شرطیں اور دقیق نکات ہیں میں نے طول تحریر کی وجہ سے ان ہی آٹھ شرطوں پر اکتفا کی، امید ہے ان ہی شرطوں کے ذریعہ تمیز و تشخیص دی جاسکتی ہے کہ کون مناظرہ خدا کے لئے ہے اور کون اپنے علم کے اظہار کے لئے۔

جناب سید محمد جواد ہادی

نہج البلاغہ منارۂ ہدایت

قرآن و اہلبیت ؑ

قرآن و اہلبیت دو عظیم امانت اور ثقل ہیں جنھیں رسول ؐ اسلام مسلمان معاشرے کے رشد و ہدایت کے لئے چھوڑ کر گئے ہیں اور یہ اعلان کر گئے ہیں کہ اگر مسلمان اس گرانقدر سرمایہ سے متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔

قرآن مسلمانوں کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات و آئین زندگی ہے اور اہلبیت ؑ اس آئین کے مفسر و ذمہ دار نفاذ ہیں جن کو قرآن ناطق کہا گیا ہے۔

احترام کی حد تک تو مسلمان قرآن و اہلبیت دونوں کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں لیکن جہاں تک عملی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عملی زندگی میں مسلمان کی توجہ قرآن کی تعلیمات اور اہلبیت ؑ کے ارشادات پر کم ہی رہتی ہے آج قرآن ثواب کے لئے تو تلاوت کیا جاتا ہے، قبروں پر یا مجلس فاتحہ میں قرآن کی تلاوت تو کیجاتی ہے اسی طرح اہلبیت ؑ کے فضائل بڑھ چڑھ کر بیان تو کئے جاتے ہیں ان کا تذکرہ بھی کم و بیش مسلمان معاشرے میں ہر جگہ ہوتا رہتا ہے لیکن نظام زندگی کی بنیاد اہلبیت ؑ کی تعلیمات پر استوار نہیں ہے۔

قرآن و اہلبیت ؑ کی عظمت کا صحیح اندازہ اور ان دو عظیم ثقل کا مکمل تعارف اور ان کے مختلف پہلو کی شناخت اور تعارف کے لئے مناسب سمجھا کہ خود قرآن ناطق

اور ابو الائمہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کے کلمات کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ مولا قرآن و اہلبیت کا کس طرح سے تعارف فرماتے ہیں؟ حضرت کی نظر میں قرآن و اہلبیتؑ کا کیا مقام ہے؟ اور مسلمانوں کو ان کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟

قرآن علیؑ کی نظر میں

مولا امیرالمؤمنینؑ خطبہ ۱۹۶ میں قرآن کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم انزل علیہ الکتاب نوراً لا تطفأ مصابیحہ وسراجاً لا یخبو توقدہ وبحراً لا یدرک قعرہ ومنهاجاً لا یضل نهجه وشعاعاً لا یظلم ضوؤہ وفرقاناً لا یخمد برهانه وتبیاناً لا تهدم ارکانه وشفاءً لا تخشى اسقامه وعزاً لا تهزم انصارہ وحقاً لا تخذل اعوانه فهو معدن الایمان وبحبوحته وینابیع العلم وبحورہ ورياض العدل وغدرانه واثافی الاسلام وبنیانه واودیة الحق وغیطانه وبحر لا ینزفه المستنزفون وعیون لا ینضبها الماتحون ومناهل لا یغیضها الواردون ومنازل لا یضل نهجها المسافرون واعلام لا یعمى عنها السائرون وآکام لا یجوز عنها القاصدون جعله الله ریاً لعطش العلماء وربیعاً لقلوب الفقهاء ومحاج لطرق الصلحاء ودواءً لیس بعدہ داء ونوراً لیس معه ظلمة وحبلاً وثیقاً عروته ومعقلاً منیعاً ذروته وعزاً لمن تولاہ وسلماً لمن دخله وهدى لمن ائتم به وعذراً لمن انتحله وبرهاناً لمن تکلم به وشاهداً لمن خاصم به وفلجاً لمن حاج به وحاملاً لمن حمله

ومطیةً لمن اعمله وآیة لمن توسم وجنة لمن استلأم وعلماً لمن وعی وحدیثاً لمن روی وحکماً لمن قضی

پھر آپ پر ایک ایسی کتاب نازل فرمائی جو (سراپا) نور ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں ایسا چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی ایسا دریا ہے جس کی تھاہ نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی شاہراہ ہے جس میں راہ پیمائی بے راہ نہیں کرتی ایسی کرن ہے جس کی چھوٹ مدھم نہیں پڑتی وہ ایسا (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والا ہے جس کی دلیل کمزور نہیں پڑتی ایسا کھول کر بیان کرنے والا ہے جس کے ستون منہدم نہیں کئے جا سکتے وہ سراسر شفا ہے (کہ جس کے ہوتے ہوئے روحانی) بیماریوں کا کھٹکا نہیں وہ سرتاسر عزت و غلبہ ہے جس کے یار و مددگار شکست نہیں کھاتے وہ (سراپا) حق ہے جس کے معین و معاون بے مدد چھوڑے نہیں جاتے وہ ایمان کا معدن اور مرکز ہے اس سے علم کے چشمے پھوٹتے اور دریا بہتے ہیں۔ اس میں عدل کے چمن اور انصاف کے حوض ہیں وہ اسلام کا سنگ بنیاد اور اس کی اساس ہے حق کی وادی اور اس کا ہموار میدان ہے وہ ایسا دریا ہے کہ جسے پانی بھرنے والے ختم نہیں کر سکتے وہ ایسا چشمہ ہے کہ پانی الچنے والے اسے خشک نہیں کر سکتے وہ ایسا گھاٹ ہے کہ اس پر اترنے والوں سے اس کا پانی گھٹ نہیں سکتا وہ ایسی منزل ہے کہ جس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں وہ ایسا نشان ہے کہ چلنے والے کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا وہ ایسا ٹیلہ ہے کہ حق کا قصد کرنے والے اس سے آگے گزر نہیں سکتے۔ اللہ نے اسے عالموں کی تشنگی کے لئے سیرابی فقیہوں کے دلوں کے لئے بہار اور نیکوں کی راہ گزر کے لئے شاہراہ قرار دیا ہے۔ یہ ایسی دوا ہے کہ جس سے کوئی مرض نہیں رہتا ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا گزر نہیں ایسی رسی ہے کہ جس کے حلقے مضبوط ہیں ایسی چوٹی ہے کہ جس کی پناہ گاہ

محفوظ ہے جو اس سے وابستہ ہو اس کے لئے سرمایۂ عزت ہے جو اس کی حدود میں داخل ہو اس کے لئے پیغام صلح وامن ہے ۔ جو اس کی پیروی کرے اس کے لئے ہدایت ہے جو اسے اپنی طرف نسبت دے اس کے لئے حجت ہے جو اس کی رو سے بات کرے اس کے لئے دلیل و برہان ہے جو اس کی بنیاد پر بحث ومناظرہ کرے اس کے لئے گواہ ہے جو اسے حجت بنا کر پیش کرے اس کے لئے فتح وکامرانی ہے، جو اس کا بار اٹھائے یہ اس کا بوجھ بٹانے والا ہے جو اسے اپنا دستور العمل بنائے اس کے لئے مرکب (تیز گام) ہے یہ حقیقت شناس کے لئے ایک واضح نشان ہے (جو ضلالت سے ٹکرانے کے لئے) سلاح بند ہو اس کے لئے سپر ہے، جو اس کی ہدایت کو گرہ میں باندھے اس کے لئے علم ودانش ہے۔ بیان کرنے والے کے لئے بہترین کلام اور فیصلہ کرنے والے کے لئے قطعی حکم ہے۔

قرآن ہادی بشر

مولا امیر المؤمنین علیہ السلام فضائل قرآن بیان کرتے ہوئے خطبہ ۱۷۴ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

واعلموا انّ هٰذا القرآن هو الناصح الذی لا یغش والهادی الذی لا یضلّ ، والمحدّث الذی لا یکذب وما جالس هٰذا القرآن احد الّا قام عنه بزیادة او نقصان : زیادة فی هدی ، او نقصان عمی . واعلموا انه لیس علی احدٍ بعد القرآن من فاقة ، ولا لاحد قبل القرآن من غنی فاستشفوه من ادوائکم واستعینوا به علی لأوائکم فانّ فیه شفاءً من اکبر الدّاءِ وهو الکفر والنفاق والغیّ والضلال فاسألوا الله به ، وتوجّهوا الیه بحبّه ، ولا تسألوا به خلقه انه ما توجّه العباد الی الله بمثله . واعلموا انه شافع

ومشفع وقائل، ومصدق وانہ من شفع لہ القرآن یوم القیامۃ شفع فیہ، ومن محل بہ القرآن یوم القیامۃ صدق علیہ فانہ ینادی مناد یوم القیامۃ الا ان کل حارث مبتلی فی حرثہ وعاقبۃ عملہ غیر حرثۃ القرآن۔ فکونوا من حرثتہ واتباعہ واستدلوہ علی ربکم واستنصحوہ علی انفسکم واتہموا علیہ اراءکم واستغشوا فیہ اھواءکم

یاد رکھو! کہ یہ قرآن ایسا نصیحت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو فریب نہیں دیتا اور ایسا ہدایت کرنے والا ہے جو گمراہ نہیں کرتا اور ایسا بیان کرنے والا ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ جو بھی اس قرآن کا ہم نشیں ہوا وہ ہدایت کو بڑھا کر اور گمراہی وضلالت کو گھٹا کر اس سے الگ ہوا۔ جان لو کہ کسی کو قرآن (کے تعلیمات) کے بعد کسی اور لائحہ عمل کی احتیاج نہیں رہتی اور نہ کوئی قرآن سے (کچھ سیکھنے) سے پہلے اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اس سے اپنی بیماریوں کی شفا چاہو اور اپنی مصیبتوں پر اس سے مدد مانگو اس میں کفر ونفاق اور ہلاکت وگمراہی جیسی بڑی بڑی مرضوں کی شفا پائی جاتی ہے۔ اس کے وسیلے اللہ سے مانگو اور اس کی دوستی کو لئے ہوئے اس کا رخ کرو اور اسے لوگوں سے مانگنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یقیناً بندوں کے لئے اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا اس جیسا کوئی ذریعہ نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت مقبول اور ایسا کلام کرنے والا ہے (جس کی ہر بات) تصدیق شدہ ہے۔ قیامت کے دن جس کی یہ شفاعت کرے گا، وہ اس کے حق میں مانی جائیں گی اور اس روز جس کے عیوب بتلائے گا تو اس کے بارے میں بھی اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا دیکھو قرآن کی کھیتی بونے والوں کے علاوہ ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجہ میں مبتلا ہے۔ لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اس کے پیروکار بنو، اور اپنے پروردگار

تک پہنچنے کے لئے اسے دلیل راہ بناؤ اور اپنے نفسوں کے لئے اس سے پند و نصیحت چاہو اور اس کے مقابلہ میں اپنی خواہشوں کو غلط و فریب خوردہ سمجھو۔

اسی خطبہ کے آخری حصہ میں فرماتے ہیں :۔

وان اللہ سبحانہ لم یعظ احداً بمثل ھذا القرآن فانہ حبل اللہ المتین وسببہ الامین وفیہ ربیع القلب وینابیع العلم وما للقلب جلاء غیرہ مع انہ قد ذھب المتذکرون وبقی الناسون او المتناسون

قرآن سے بہتر کوئی وعظ نہیں اس لئے کہ قرآن خدا کی مضبوط رسی ہے اور امانتدار وسیلہ ہے جو دلوں کی بہار اور سرچشمہ ہے، دل اور آنکھوں کی رونق و روشنی ہے خصوصاً ایسے ماحول میں جبکہ جاننے والے جا چکے ہیں اور بھولنے اور تغافل کرنے والے باقی ہیں۔

خطبہ ۱۸۳ میں مولا قرآن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔

فالقرآن آمر زاجر وصامت ناطق حجۃ اللہ علیٰ خلقہ اخذ علیہ میثاقھم وارتھن علیھم انفسھم اتم نورہ واکمل بہ دینہ وقبض نبیہ (ص) وقد فرغ الی الخلق من احکام الھدیٰ بہ

قرآن امر اور نہی کرنے والا ہے قرآن خاموش ہے جبکہ وہ اسی حالت میں بولتا بھی ہے قرآن خدا کی حجت ہے اس کی مخلوق پر اور خدا نے اپنے بندوں سے اس کتاب پر عمل کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے اور ان کو قرآنی احکام کا پابند بنایا ہے قرآن مکمل نور ہے خدا نے اس کے ذریعہ اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے اپنے نبیؐ کو اس وقت اس جہان سے اٹھایا جب وہ تبلیغ احکام اور قرآن کے ذریعہ رشد و ہدایت کی تعلیمات کی ترویج سے فارغ ہو چکے تھے۔

خطبہ ۱۳۳ میں فرماتے ہیں :۔

وكتاب الله بين اظهركم ناطق لا يعيا لسانه وبيت لا تهدم اركانه وعز لا تهزم اعوانه

قرآن تمہارے درمیان ایسا ترجمان ہے جس کی زبان حق گوئی سے تھکتی نہیں اور ایسا گھر ہے جس کی بنیادیں منہدم نہیں ہوتیں اور ایسی عزت و قدرت ہے جس کے دوست کبھی شکست نہیں کھاتے۔

اسی خطبے کے آخری حصہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

كتاب الله تبصرون به وتنطقون به وتسمعون به وينطق بعضه ببعض ويشهد بعضه على بعض ولا يختلف في الله ولا يخالف بصاحبه عن الله

یہ اللہ کی کتاب ہے جس کی مدد سے تم حقائق کو دیکھ سکتے ہو اور اس کی مدد سے (حق) کہہ اور سن سکتے ہو، جس کی مدد سے بعض دوسرے بعض کے بارے میں اظہار خیال کر سکتے ہیں اور بعض دوسرے بعض پر گواہی دے سکتے ہیں قرآن نے خدا کے بارے میں خلاف واقع کوئی بھی بات نہیں کی اور جو قرآن کی مصاحبت اپنائے اس کو کبھی خدا سے جدا نہیں کرتا۔

آخری زمانہ میں قرآن مہجور ہو گا۔

خطبہ ۱۴۷ میں حضرتؑ آخری زمانے کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے قرآن کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وانه سيأتي عليكم من بعدي زمان ليس فى شئ اخفى من الحق ولا اظهر من الباطل ولا اكثر من الكذب على الله و رسوله وليس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الكتاب اذا تلى حق تلاوته ولا انفق منه اذا حرف عن مواضعه ولا فى البلاد شئ انكر من المعروف ولا اعرف

المنکر فقد نبذ الکتاب حملتہ وتناساہ حفظتہ فالکتاب یومئذٍ واھلہ طریدان منفیّانِ وصاحبان مصطحبانِ فی طریق واحد لا یؤویھما مؤوٍ فالکتاب واھلہ فی ذالک الزّمان فی الناس ولیسا فیھم ومعھم ولیسا معھم لانّ الضلالۃ لا توافق الھدیٰ وان اجتمعا فاجتمع القوم علی الفرقۃ وافترقوا علی الجماعۃ کانّھم ائمۃ الکتاب ولیس الکتاب امامھم فلم یبق عندھم منہ الاّ اسمہ ولا یعرفون الاّ خطّہ وزبرہ۔

میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بہت پوشیدہ اور باطل بہت نمایاں ہوگا اور اللہ و رسولؐ پر افترا پردازی کا زور ہوگا اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی اس وقت جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے اور نہ (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی ہوگی۔ چنانچہ قرآن کا بار اٹھانے والے اسے پھینک کر الگ کریں گے اور حفظ کرنے والے اس کی (تعلیم) بھلا بیٹھیں گے اور قرآن اور قرآن والے (اہلبیتؑ) بے گھر اور بے در ہوں گے اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا۔ وہ (بظاہر) لوگوں میں ہوں گے مگر ان سے الگ تھلگ ——— ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق اس لئے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ یکجا ہوں۔ لوگوں نے تفرقہ پردازی پر تو اتفاق کر لیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں۔ ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور اور صرف اس کے خطوط و نقوش کو پہچان سکتے ہیں۔

قرآن سے تمسک کی نصیحت

خطبہ ۱۵۶ میں قرآن سے تمسک کے بارے میں نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

وعلیکم بکتاب فانه الحبل المتین والنور المبین والشفاء النافع والری النافع والعصمة للمتمسک والنجاة للمتعلق لا یعوج فیقام ولا یزیغ فیستعتب ولا تخلقه کثرة الرد وولوج السمع من قال به صدق ومن عمل به سبق۔

میں تمہیں قرآن سے متمسک رہنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ قرآن اللہ کی محکم رسی اور واضح و آشکار نور ہے قرآن نفع بخش شفا ہے پیاس بجھانے والی سیرابی ہے۔ جو اس سے متمسک ہو وہ نجات پائے گا اور جو اس کے دامن کو تھام لے وہ محفوظ رہے گا اس میں کوئی کجی نہیں ہے جس کو درست کرنے کی ضرورت ہو اور نہ تو مسیر حق سے منحرف ہوتا اور نہ ہی خطا کرتا ہے۔ اس کی تکرار سے انسان کی سماعت پر گراں نہیں گزرتا جو قرآن کے مطابق باتیں کرے وہ سچا ہے جو اس پر عمل کرے وہ کامیاب ہے۔

خطبہ ۱۷ میں ارشاد فرماتے ہیں:-

الی اللہ اشکو من معشر یعیشون جهالاً ویموتون ضلالاً لیس فیهم سلعة ابور من الکتاب اذا تلی حق تلاوته ولا سلعة انفق بیعا ولا اغلی ثمنا من الکتاب اذا حرف عن مواضعه۔

میں ان لوگوں کی شکایت اللہ سے کروں گا جو جہل و گمراہی میں زندگی بسر کرتے ہیں اور گمراہی میں مرتے ہیں ان کے درمیان قرآن کی کوئی قیمت نہیں ہے جب کہ اس طرح سے تلاوت کی جائے جو حق تلاوت ہے اور کوئی متاع قرآن کی مانند ان کے درمیان بیش قیمت نہیں جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل

استعمال کیا جائے۔

قرآن کا ظاہر و باطن

حضرت امیر علیہ السلام قرآن کے ظاہر و باطن کے بارے میں خطبہ ۱۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وانّ القرآن ظاھرہ انیق و باطنہ عمیق لا تفنیٰ عجائبہ ولا تنقضی غرائبہ ولا تکشف الظلمات الا بہ۔

قرآن کا ظاہر بڑا خوبصورت اور باطن بہت گہرا اور عمیق ہے قرآن کے تعجب انگیز نکتے کبھی فانی ہونے والے نہیں اور اس کے اندر عجائب و اسرار کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں ہے جہل کی ظلمت و تاریکی قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے ختم نہیں ہو سکتی۔

قرآن سے گفتگو کی تاکید

خطبہ ۱۵۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

ذلک القرآن فاستنطقوہ ولن ینطق ولکن اخبرکم عنہ الا ان فیہ علم ما یأتی والحدیث عن الماضی ودواء دائکم ونظم ما بینکم۔

یہ قرآن (نور خدا) ہے اس کو گفتگو کرنے پر آمادہ کر لیکن یہ (عام زبان میں) ہرگز باتیں نہیں کرتا البتہ میں تمہیں قرآن سے متعارف کرتا ہوں کہ اس میں مستقبل کے تمام علوم اور معلومات موجود ہیں اور گذشتہ کی باتیں بھی ہیں یہ قرآن تمہاری بیماریوں کا علاج اور اجتماعی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن میں علم اوّلین و آخرین

کلمات قصار ۳۱۳ میں حضرت ؑ، قرآن میں پائے جانے والے علوم اوّلین و آخرین کے بارے میں

ارشاد فرماتے ہیں :۔

فی القرآن نباء ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم مابینکم۔

قرآن میں گذشتگان کے تاریخ اور آئندہ حوادث کی پیشنگوئی اور موجودہ زمانے میں تمہارے لئے دستور العمل موجود ہے۔

قرآن اور متقین

خطبہ ۱۹۲ معروف بہ خطبہ ہمام میں حضرت امیر علیہ السلام متقین کے اوصاف بیان فرماتے ہوئے انکی تلاوت اور اس سے مستفید ہونے کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :۔

تالین لاجزاء القرآن یرتلونها ترتیلا یحزنون به انفسهم ویستثیرون به دواء دائهم فاذا مرّوا بآیة فیها تشویق رکنوا الیها طمعا وتطلعت نفوسهم الیها شوقا وظنوا انها نصب اعینهم واذا مرّوا بآیة فیها تخویف اصغوا الیها مسامع قلوبهم وظنّوا انّ زفیر جهنّم وشهیقها فی اصول آذانهم۔

قرآن کی آیتوں کی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتے ہیں جس سے اپنے دلوں میں غم و اندوہ تازہ کرتے ہیں اور اپنے مرض کا چارہ ڈھونڈھتے ہیں جب کسی ایسی آیت پر ان کی نگاہ پڑتی ہے جس میں جنت کی ترغیب دلائی گئی ہو تو اس کی طمع میں ادھر جھک پڑتے ہیں اور اس کے اشتیاق میں ان کے دل بے تابانہ کھنچتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (پرکیف) منظر ان کی نظروں کے سامنے ہے اور جب کسی ایسی آیت پر ان کی نظر پڑتی ہے کہ جس میں (دوزخ سے) ڈرایا گیا ہو تو اس کی جانب دل کے کانوں کو جھکا دیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ جہنم کے شعلوں کی آواز اور وہاں کی چیخ پکار ان کے کانوں کے اندر پہنچ

رہی ہے۔

قرآن کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم

قرآن مولا امیرالمومنینؑ کی نظر میں گنجینہ اسرار و علوم الٰہی ہے جو سرچشمہ سعادت و خوشبختی ہے جس میں خیر دنیا و آخرت اور علوم اوّلین و آخرین سمایا ہوا ہے جو تمام امراض جسمانی و روحانی کا علاج مکمل ضابطہ حیات اور آئین زندگی ہے اس عظیم سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اس سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ قرآن کے سیکھنے اور سکھانے میں کوشاں رہیں خطبہ ۱۱۰ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وتعلموا القرآن فانہ احسن الحدیث وتفقھوا فیہ فانہ ربیع القلوب واستشفوا بنورہ فانہ شفاء الصدور واحسنوا تلاوتہ فانہ انفع القصص۔

قرآن کو سیکھو کہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور و فکر کرو اس لئے کہ دلوں کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفاء حاصل کرنے کی کوشش کرو اس لئے کہ دلوں کے امراض کے لئے بہترین علاج ہے اور اس کی بہترین طریقے (قرائت، تجوید غور و فکر) سے تلاوت کرو اس لئے کہ قرآن بہترین اور عبرت خیز و سبق آموز داستانوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

کلمات قصار ۳۹۹ میں والدین اور اولاد کے ایک دوسرے پر حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وحق الولد علی الوالد ان یحسن اسمہ ویحسن ادبہ ویعلمہ القرآن۔

باپ پر اولاد کا حق یہ ہے کہ اس کے لئے بہترین نام انتخاب کرے اس کی اچھی تربیت کرے اور اس کو قرآن کی تعلیم دے۔

قرآن پر عمل کرنے کی تاکید

مولا امیرالمومنین مسلمانوں کو قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی نصیحت کرتے ہوئے اپنی معروف وصیت میں جو شہادت سے پہلے اپنے فرزند حضرت امام حسنؑ و حضرت امام حسینؑ کو فرمائی ہے اس میں ارشاد فرماتے ہیں :-

اللہ اللہ فی القرآن لا یسبقکم بالعمل بہ غیرکم

خدارا خدارا قرآن کو نہ بھولنا کہیں غیر (کفار) تم سے قرآن پر عمل کرنے میں سبقت نہ لے جائیں ۔

گویا مولا امیرالمومنینؑ اس وقت کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کے بیش بہا خزانے سے غافل ہو جائیں گے مسلمان قرآن کی حیات بخش تعلیمات کو نظر انداز کر دیں گے جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر میدان میں انحطاط و پستی کے شکار ہوں گے لیکن دوسری اقوام و ملل قرآن کے بتائے ہوئے اصول کو سرمشق بنائیں گی اور زندگی کے ہر شعبے میں پیش رفت و ترقی کریں گی لہٰذا مسلمانوں کو قرآن پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے ہیں ۔ آج نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولا کو جس چیز کا خوف تھا وہی ہو چکا ہے ۔ پروردگار مسلمانوں کو قرآن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عنایت فرمائے ۔

عترتؑ و اہلبیتؑ ، علیؑ کی نظر میں ۔

قرآن کے بعد ذرا "ثقل دوم" یعنی عترت کے بارے میں نہج البلاغہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مولا امیرالمومنینؑ اہلبیت نبوت کا کس طرح سے تعارف فرماتے ہیں اور انکی شخصیت اور کمالات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں ۔

خطبہ ۸۷ میں حضرت امیر مسلمانوں کو گمراہی و ضلالت سے بچانے کی خاطر ہادیان دین اور راہنمایان شریعت محمدی علمبرداران حق و حقیقت کا تعارف کرتے ہوئے لوگوں کو راہ حق کی جانب ہدایت کرنے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں :-

"فاین تذھبون؟ وانّی توفکون" والاعلام قائمۃ والآیات واضحۃ والمنار منصوبۃ فاین یتاہ بکم وکیف تعمھون وبینکم عترۃ نبیکم وھم ازمّۃ الحق واعلام الدین والسنۃ الصدق فانزلوھم باحسن منازل القرآن وردوھم ورود الیھم العطاش ایھا الناس خذوھا عن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " انہ یموت من مات منّا ولیس بمیت ویبلیٰ من بلی منّا ولیس ببالٍ" فلا تقولوا بما لا تعرفون فانّ اکثر الحق فیما تنکرون واعذروا من لاحجّۃ لکم علیہ وھو انا الم اعمل فیکم بالثقل الاکبر واترک فیکم الثقل الاصغر قد رکزت فیکم رایۃ الایمان ووقفتکم علیٰ حدود الحلال والحرام والبستکم العافیۃ من عدلی وفرشتکم المعروف من قولی وفعلی واریتکم کرائم الاخلاق من نفسی فلا تستعلموا الرای فیما لا یدرک قعرہ البصر ولا تتغلغل الیہ الفکر۔

اب تم کہاں جا رہے ہو اور تمھیں کدھر موڑا جا رہا ہے؟ حالانکہ ہدایت کے جھنڈے بلند، نشانات ظاہر و روشن اور حق کے مینار نصب ہیں، اور تمہیں کہاں بہکایا جا رہا ہے اور کیوں ادھر ادھر بھٹک رہے ہو؟ جبکہ تمہارے نبیؐ کی عترت تمہارے اندر موجود ہے، جو حق کی باگیں، دین کے پرچم اور سچائی کی زبانیں ہیں۔ جو قرآن کی بہتر سے بہتر منزل سمجھ سکو، وہیں انہیں بھی جگہ دو اور پیاسے اونٹوں کی طرح ان کے سرچشمہ ہدایت پر اترو۔

اے لوگو! خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سنو کہ (انہوں نے فرمایا) ہم میں سے جو مر جاتا ہے، وہ مردہ نہیں ہے۔ اور ہم میں سے (جو بظاہر

مرکب، بوسیدہ ہوجاتا ہے، وہ حقیقت میں کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا۔ جو باتیں تم نہیں جانتے ان کے متعلق زبان سے کچھ نہ نکالو۔ اس لیے کہ حق بیشتر انہی چیزوں میں ہوتا ہے کہ جن سے تم بیگانہ و ناآشنا ہو۔ (جس شخص کی تم پر حجت تمام ہو) اور تمہاری کوئی حجت اس پر تمام نہ ہو اسے معذور سمجھو اور وہ میں ہوں، کیا میں نے تمہارے سامنے ثقلِ اکبر (قرآن) پر عمل نہیں کیا، اور ثقلِ اصغر (اہلبیتؑ) کو تم میں نہیں رکھا۔ میں نے تمہارے درمیان ایمان کا جھنڈا گاڑا، حلال و حرام کی حدیں بتائیں اور اپنے عدل سے تمہیں عافیت کے جامے پہنائے اور اپنے قول و عمل سے حسن سلوک کا فرش تمہارے لئے بچھادیا۔ اور تم سے ہمیشہ پاکیزہ اخلاق کے ساتھ پیش آیا، جس چیز کی گہرائیوں تک نگاہ نہ پہنچ سکے اور فکر کی جولانیاں عاجز رہیں، اس میں اپنی رائے کو کارفرما نہ کرو۔

آلِ محمدؐ۔ ہدایت کے ستارے

خطبہ نمبر ۱۰۰ میں حضرت امیرؑ آلِ محمدؐ کو آسمان کے تاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

الا ان آل محمد کمثل نجوم السماء اذا خوی نجم طلع نجم کانھم قد تکاملت من اللہ فیکم الصنائع واراکم ما کنتم تاملون۔

جان لو کہ آلِ محمدؐ آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں جب ان میں سے ایک ستارہ غروب کرتا ہے تو دوسرا ستارہ اس کی جگہ نکل آتا ہے۔ آلِ محمدؐ کے صدقے اللہ کی نعمتیں تم پر نازل ہوئی ہیں اور جس چیز کی تم لوگ آرزو کرتے تھے وہ مل چکی ہے۔

اہلبیتؑ سرچشمہ علم و حکمت

خطبہ نمبر ۱۰۹ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

نحن شجرۃ النبوۃ ومحط الرسالۃ ومختلف الملائکۃ ومعادن العلم وینابیع الحکم ناصرنا ومحبنا ینتظر الرحمۃ وعدونا ومبغضنا ینتظر السطوۃ۔

ہم شجرہ نبوت ہیں ملائکہ کی رفت و آمد اور رسالت کا مرکز ہیں ہم علم کا خزانہ اور حکمت کا سرچشمہ ہیں ہمارے محب اور دوست اللہ کی رحمت اور ہمارے دشمن اللہ کی غضب کے منتظر ہیں۔

خطبہ ع۱۲۰ میں فرماتے ہیں :۔

وعندنا اھل البیت ابواب الحکم وضیاء الامر

علم کے دروازے اور مسائل کی روشنی حل، ہم اہلبیتؑ ہی کے پاس ہے۔

خطبہ ع۱۴۴ میں فضائل اہلبیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔

این الذین زعموا انھم الراسخون فی العلم دوننا کذبا وبغیا علینا۔ ان رفعنا اللہ ووضعھم واعطانا وحرمھم وادخلنا واخرجھم بنا یستعطی الھدی ویستجلی العمی ان الائمۃ من قریش غرسوا فی ھذا البطن من ھاشم لاتصلح علی سواھم ولا تصلح الولاۃ من غیرھم۔

کہاں ہیں وہ جو راسخان فی العلم ہونے کے مدعی تھے جو جھوٹ اور مکر سے ہماری دشمنی میں اس قسم کے جھوٹے دعوے کرتے تھے۔ (کہاں ہیں یہ لوگ تاکہ دیکھ لیں) کہ خدا نے ہمیں عظمت عطا کی اور انھیں ذلیل کیا ہمیں سب کچھ عنایت فرمایا اور انھیں محروم کیا ہمیں پروردگار نے اپنے حریم نعمت میں داخل اور انھیں خارج کر دیا ہمارے صدقے سے ہدایت کی درخواست کی جاتی ہے ہمارے ہی صدقے سے اندھے بینا ہو جاتے ہیں ائمہ سب قریش میں سے ہیں جن کا شجرہ نسل ہاشم میں کاشت کیا گیا ہے یہ مقام کسی اور کو زیب نہیں دیتا اور دوسرے اس مقام کے لائق نہیں ہیں۔

اہلبیتؑ کنوز الرحمٰن

خطبہ ۱۵۴ میں حضرت امیرؑ اہلبیتؑ کا تعارف یوں فرماتے ہیں :-

نحن الشعار والاصحاب والخزنة والابواب ولا تؤتی البیوت الا من ابوابها فمن اتاها من غیر ابوابها سمی سارقا فیهم کرائم القرآن وهم کنوز الرحمان ان نطقوا صدقوا وان صمتوا لم یسبقوا فلیصدق رائد اهله ولیحضر عقله

ہم اسرار الٰہی کے محرم اور پیامبر اسلام کے حقیقی اصحاب اور ان کے علوم کے خزانے اور دروازے ہیں کبھی کوئی شخص کسی گھر میں دروازے کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا اگر دروازے کے بغیر کسی اور راستے سے داخل ہو جائے تو وہ چور کہلاتا ہے اہلبیت کے بارے میں قرآن کی آیات نازل ہوئی ہیں وہ خدا کے علوم کے خزانہ ہیں جب وہ بولتے ہیں تو سچ بولتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تب بھی کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا معاشرے کے راہنما کو چاہیئے کہ وہ راستگو ہو اور رعیت کو حقائق سے آگاہ رکھے اور اپنی عقل کو بروئے کار لائے۔

خطبہ ۲۳۹ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

هم عیش العلم وموت الجهل یخبرکم حلمهم عن علمهم وظاهرهم عن باطنهم وصمتهم عن حکم منطقهم لا یخالفون الحق ولا یختلفون فیه وهم دعائم الاسلام وولائج الاعتصام بهم عاد الحق الی نصابه وانزاح الباطل عن مقامه وانقطع لسانه عن منبته۔

آل محمدؐ باعث حیات علم وسبب موت جہل ہیں ان کا حلم تمہیں ان کی علمی عظمت سے آگاہ کر دیتا ہے اور ان کا ظاہر تمہیں ان کے باطن سے آگاہ

کرتا ہے ان کی خاموشی تمہیں ان کی حکمت و منطق سے آگاہ کرتی ہے کبھی حق کی مخالفت نہیں کرتے اور اس میں اختلاف نہیں رکھتے وہ اسلام کے ارکان اور لوگوں کے لئے پناہ گاہ ہیں ان کے ذریعے سے حق اپنے نصاب کو پہنچتا ہے باطل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی زبان قطع ہو جاتی ہے۔

خطبہ ۲۳۳ میں فرماتے ہیں :۔

وانا لامراء الکلام وفینا تنشبت عروقہ وعلینا تہدلت غصونہ

ہم خطابت کے بادشاہ ہیں خطابت کی جڑیں ہمارے ہاں محفوظ اور اس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے۔

پیروی اہلبیت ؑ

خطبہ ۹۷ میں اہلبیت اطہارؑ کی پیروی کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

انظروا اھل بیت نبیکم فالزموا سمتھم واتبعوا اثرھم فلن یخرجوکم من ھدیٰ ولن یعیدوکم فی ردیٰ فان لبدوا فالبدوا وان نھضوا فانھضوا و لاتسبقوھم فتضلوا ولا تتاخروا عنھم فتھلکوا۔

اپنے پیغمبر کے اہلبیت کو دیکھو اور انہی کی سمت اور راہ کو اپناؤ اور ان کے نقش قدم پر چلو وہ کبھی تمہیں جادہ حق سے منحرف نہیں کریں گے اور ہلاکت و گمراہی کی طرف نہیں لے جائیں گے اگر وہ سکوت اختیار کریں تو تم بھی خاموش رہو اور اگر وہ قیام کریں تو تم بھی قیام کرو ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

معرفت اہلبیتؑ

خطبہ ۱۵۲ میں ائمہ اہلبیت کی معرفت کو ضروری قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

وانما الائمۃ قوام اللہ علی خلقہ وعرفاؤہ علی عبادہ ولایدخل الجنۃ الا من عرفھم وعرفوہ ولایدخل النار الا من انکرھم وانکروہ۔

ائمہ (دین) معاشرے کی بنیادیں ہیں اور بندگان خدا کے رہنما ہیں کوئی بھی بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا مگر وہ جو ائمہ علیہم السلام کو پہچان لے اور جن کو ائمہ پہچان لیں جو ان کا منکر ہو اور ائمہ اس کا انکار کریں وہ جہنم میں جائے گا۔

خطبہ ۲ میں عظمت عترت اہلبیتؑ کا تذکرہ یوں ہوتا ہے:۔

ھم موضع سرہ ولجاء امرہ وعیبۃ علمہ وموئل حکمہ وکھوف کتبہ وجبال دینہ بھم اقام انحناء ظھرہ واذھب ارتعاد فرائصہ ....

لایقاس بآل محمدؐ من ھذہ الامۃ احد ولا یسوی بھم من جرت نعمتھم علیہ ابداً ھم اساس الدین وعماد الیقین الیھم یفیئ الغالی وبھم یلحق التالی ولھم خصائص حق الولایۃ وفیھم الوصیۃ والوراثۃ الان اذ رجع الحق الی اھلہ ونقل الی منتقلہ۔

وہ سر خدا کے امین اور اس کے دین کی پناہ گاہ ہیں۔ علم الٰہی کے مخزن اور حکمتوں کے مرجع ہیں۔ کتب (آسمانی) کی گھاٹیاں اور دین کے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ نے اس کی پشت کا خم سیدھا کیا اور اس کے پہلوؤں سے ضعف کی کپکپی دور کی (اسی خطبہ کا ایک حصہ جو دوسروں سے متعلق ہے) انہوں نے فسق و فجور کی کاشت کی غفلت و فریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے

ہلاکت کی جنس حاصل کی۔ اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کے خصوصیات ان ہی کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبر کی وصیت اور انہی کے لئے (نبی کی) وراثت ہے اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہو گیا۔

اہلبیتؑ منجی بشریت

خطبہ ۴ میں طلحہ و زبیر کے قتل کے بعد اہل بصرہ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

بنا اهتديتم في الظلماء تسنمتم ذروة العلياء وبنا افجرتم عن السرار۔

(اے اہل بصرہ) تم لوگ ہماری وجہ سے ہدایت یافتہ ہوئے اور ہماری ہی وجہ سے بام ترقی تک پہنچے تمہاری قسمت کا طالع ہماری برکت سے نمودار ہوا۔

جناب محمد مومن
ترجمہ جناب سید ولی الحسن رضوی

حکومت اسلامی میں قانون سازی کا طریقہ

آغاز بحث سے پہلے ضروری ہے کہ ایک نگاہ، ولو بطور اختصار سہی، قانون کی حقیقت و ماہیت اور حکومت اسلامی میں اس کے مفروض الطاعۃ ہونے کی وجوہات پر ڈال لی جائے تاکہ اس کی روشنی میں اصل مطالب کے سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

قانون کی حقیقت :-

اگرچہ لفظ قانون کا اطلاق لغوی اعتبار سے تمام کلی قاعدوں پر ہوتا ہے چاہے یہ سو فی صدی علمی ہی کیوں نہ ہوں لیکن ہماری بحث ان کلی قوانین و ضوابط اور دستور العمل سے ہے جو اس واسطے وضع کئے گئے ہوں کہ ان پر عمل کیا جائے اور ان کے آئینہ میں زندگی ڈھالی جائے۔ ممکن ہے یہ قاعدہ یا دستور العمل تمام انسانوں کے لئے ہو یا کچھ مخصوص افراد اور جماعت سے اختصاص رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا بلا استثناء تمام لوگوں پر واجب و لازم ہے لیکن حج بیت اللہ صرف صاحبان استطاعت پر فرض کیا گیا ہے اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے دونوں قسمیں قانون کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہے جو اپنے موقع و محل کے اعتبار سے نافذ ہوتے ہیں اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

قانون کی اطاعت کیوں ضروری ہے؟

ہر عاقل و دانا کی عقل و فطرت اس بات کا ادراک کرتی ہے کہ انسان فطرتاً آزاد پیدا

ہوا ہے اور انسانوں میں سے کسی فرد یا جماعت کا دوسروں پر حکومت کرنا کوئی مطلب نہیں رکھتا۔ اگر کہیں اس طرح کی صورت پیدا ہوتی ہے تو یہ چیز نہایت ہی کھوکھلی اور انسانی فطرت کے منافی ہوگی در حقیقت یہ طریقہ حاکم کی طرف سے محکوم افراد پر زبردست ظلم ہے ہاں اگر کوئی قانون خود عوام کی خواہش پر ترتیب دیا جائے کہ کسی پر ظلم بھی نہ ہو تو اس کی مناسب اور صحیح صورت یہ ہے کہ چونکہ انسان معاشرت پسند واقع ہوا ہے اور اجتماعی زندگی گزارنے کا عادی ہے لھذا اس چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ لوگوں کے اختیار کی حدیں محفوظ رہیں قوانین کا ایک ایک جزء بحث و مباحثہ کے بعد ایک دوسرے کے باہم مشورہ سے طے کیا جائے۔ تاکہ ہر ایک کے حقوق کی حدیں معین رہیں اور کوئی اپنے دائرۂ اختیار سے تجاوز نہ کر سکے اس طرح باہم توافق سے مرتب شدہ قوانین وقعت و اہمیت کے حامل ہوں گے نیز کھوکھلے پن اور ظلم سے خالی ہوں گے۔

اس طرح کے قوانین کا دائرہ صرف دین تک ہے جہاں تک لوگ اس سے اتفاق کرتے ہوں اگرچہ ان قوانین کے بعض حصے فطرت سے ہم آہنگ ہیں لیکن ان کے اکثر حصے انسانی غور و خوض فکر و تدبر کے نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں قانون کی بہترین قسم وہ سمجھی جاتی ہے جو خود عوام کی منتخب کردہ عوامی حکومت کی نگرانی میں عوام کے لئے خود عوام کے ذریعہ بنائے گئے ہوں اور اسی بنیاد پر اس کی پیروی کے لازمی ہونے کی دلیل میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس قسم کے قوانین تمام انسانوں سے اپنے قابل اعتبار ہونے کا عہد پہلے ہی سے لیتے ہیں کہ وہ اسی نہج پر اپنی زندگی گذاریں گے نیز دوسرے انسانوں کے ساتھ اسی بنیاد پر روابط استوار کریں گے۔

لیکن اسلام اور اسلامی حکومت میں قوانین و دستور کی پیروی کے لازم ہونے کا معیار اس دلیل و میزان سے قطعی مختلف ہے۔

اسلام کی نظر میں قانون بنانے کا حق بنیادی طور پر صرف اور صرف خدا کو حاصل ہے اور کس طرح کا حکم دنیا اسی ذات اقدس سے مخصوص ہے خدا کے علاوہ کسی کو بھی اپنی خواہش کے تحت کوئی حکم مسلط کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اس بنیاد پر اس کے سوا کسی کی اطاعت و پیروی بھی لازم نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات عقل و نقل دونوں کے نزدیک مسلم ہے کیونکہ تمام مسلمہ عقلی دلائل ہمیں اسی نتیجہ تک پہونچاتے ہیں کہ تمام مخلوقات عالم کا وجود اور نقطۂ آغاز

ذات واجب الوجود ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اپنے وجود میں ہر جہت سے اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔ مخلوق کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی جانب سے ہے دنیا کی کوئی مخلوق، دراصل اپنے وجود و کمالات میں یا ان کے حدوث و بقا میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کر سکتی جو کچھ ہے خدا کا عطیہ اور اسی کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے، تمام مخلوقات چاہے ان کا تعلق جمادات سے ہو یا نباتات سے، حیوان سے ہو یا انسان سے جن ہو یا ملک پیغمبر ہو یا امام عالم ہو یا سائنس داں ہر ایک اپنے پورے وجود کے ساتھ اسی کی مخلوق اور اسی کی ——— دعایا ہے اور اسی سے وابستہ ہے نیز حقیقی معنوں میں اسی کی ملکیت و اختیار میں ہے۔

چونکہ وہ تمام انسانوں کا مالک ہے اور اس کے لئے ملکیت کے حقیقی معنی صادق آتے ہیں لہذا ہر عاقل و دانا، اگر اپنی عقل و دانش سے کام لے تو، یہی فیصلہ کرے گا کہ خدا کو اس بات کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کے لیے حکم صادر کرے اور ان سے جو کچھ بھی چاہے طلب کرے جس چیز کو چاہے حلال و مباح قرار دے اور جس چیز کو چاہے حرام و مکروہ یا مستحب قرار دے اور چونکہ خدا کے سوا کسی کو بھی اس طرح کا اختیار وجودی اور حق مالکیت حاصل نہیں ہے لہذا کسی دوسرے کو حق خود مختاری بھی نہیں دیا گیا ہے مگر یہ کہ خود پروردگار عالم نے کسی کو اپنی جانب سے یہ حق ودیعت کر دیا ہو اس صورت میں اس شخص کی اطاعت بھی لازمی ہو گی بلکہ دراصل اس کی اطاعت بھی بالواسطہ خدا کی ہی اطاعت کے ضمن میں ہو گی۔ چونکہ دوسرے تمام افراد خداوند عالم کی مخلوق اور اس کی ملکیت ہیں لہذا ان پر لازم ہو گا کہ اس کے منتخب نمایندوں کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیں چنانچہ خود سری دکھانے کی صورت میں مستحق سزا و عقاب بھی ہوں گے۔

قرآن کریم اور ارشادات معصومین علیہم السلام میں مذکورہ بالا مطالب کو بار بار بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہم یہاں صرف چند آیات قرآنی پر ہی اکتفا کریں گے۔

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے: بدیع السمٰوات والارض انّی یکون لہ ولدٌ ولم تکن لّہ صاحبۃٌ وخلق کلّ شیئٍ وھو بکل شیٍ علیم ذالکم اللہ ربّکم لا الہ الّا ھو خالق کلّ شیئٍ فاعبدوہ وھو علیٰ کل شیئٍ

وکیل (آیت/۱۰۱ و ۱۰۲)

(خدا) آسمان و زمین کا موجد ہے اس کے لئے کسی اولاد کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے جبکہ اس کے لئے کسی زوج کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ چیز سے خوب واقف ہے۔ (لوگو!) وہی اللہ تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے وہی سب کچھ پیدا کرنے والا ہے پس اسی کی عبادت کیا کرو، اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔

سورۂ رعد میں خدا حکم دیتا ہے: قل اللہ خالق کل شیئ وھو الواحد القھار (آیت/

کہدو کہ خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی یکتا اور سب پر غالب ہے۔

سورہ زمر میں اعلان کرتا ہے:۔

اللہ خالق کل شیئ وھو علی کل شیئ وکیل (آیت/۶۲)

اللہ نے ہی ہر شیئ خلق کی ہے اور وہی ہر شیئ کا نگہبان ہے۔

سورۂ انعام میں ہی دوسرے مقام پر فرماتا ہے:۔

قل اغیر اللہ ابغی ربا و ھو رب کل شیئ... (آیت/۱۶۴)

(اے رسول) ذرا پوچھو تو کیا میں خدا کے سوا کسی اور پروردگار کی تلاش کروں جبکہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا مذکورہ بالا چاروں آیتوں میں خداوند عالم کو ہی ہر شیئ کا خالق و باعث قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کا وجود اسی کا مرہون منت ہے اور ساری چیز اسی کی ذات اقدس سے وابستہ ہیں: "وھو علی کل شیئ وکیل" سے صاف پتہ چ ہے کہ تمام امور اسی کے اختیار و قدرت میں ہیں، اپنے وجود و بقا میں ہر چیز ذات اقدس الٰہی کی ہی محتاج ہے ا وھو رب کل شیئ سے صریحی طور پر واضح ہے کہ خدا ہی عالم کا پروردگار ہے اور وہی دنیا کی ہر شیئ کا پالنے والا

اب خدا کی مخلوق ہونے اور اسی کی دی ہوئی روزی روٹی پر زندگی گزارنے لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس کو اپنا مالک و مختار بھی سمجھیں چنانچہ اس کی جانب مختلف آیات متوجہ بھی کیا گیا ہے۔ سورۂ نمل میں ارشاد ہوتا ہے:

انما امرت ان اعبد رب ھذہ البلدۃ الذی حرمھا

ولہ کل شیئ . . . . . (آیت/۹۱)

(اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ) مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو عزت و حرمت دی ہے اور ہر چیز اسی کی ہے۔

سورۂ آل عمران میں فرماتا ہے:

وللہ ما فی السموات وما فی الارض والی اللہ ترجع الامور

(آیت/۱۰۹)

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) خدا ہی کا ہے اور (آخر) تمام امور کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

سورہ روم میں اعلان ہوتا ہے:

ولہ من فی السموات والارض کل لہ قانتون (آیت/۲۶)

اور جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کے ہیں اور سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

مذکورہ آیات نیز دیگر آیات قرآنی کی روشنی میں بھی خداوند عالم ہی پوری کائنات کا خالق اور پالنے والا ہے وہ ہر شخص اور ہر شیٔ کا مالک ہے سب کچھ اسی کی جانب سے ہے اور جب طے ہو گیا کہ پوری کائنات اسی کی خلق کردہ اور اسی کی ملکیت ہے تو اب اس کے علاوہ کوئی بھی کسی چیز کے مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور چونکہ انسان بھی اسی کائنات کا جزء ہے لھذا اس کا بدرجۂ اولیٰ کوئی مالک نہیں بن سکتا۔ انسان خدا کی مخلوق و مملوک ہے اور کسی دوسرے کو اس کا مالک بننے کا حق حاصل نہیں ہے لھذا صرف خدا کو ہی اس پر حکومت کرنے کا بھی حق حاصل ہے اور اسی کے بنائے ہوئے قانون و دستور کی اطاعت و پیروی لازم ہو سکتی ہے۔ اسی بات کا سورۂ اعراف میں یوں اعلان کیا گیا ہے:۔

الا لہ الخلق والامر (آیت/۵۴)

جان لو پیدا کرنا اور حکومت کرنا بس خاص اسی کے لئے ہے۔ یہاں "خلق" آفرینش

و تخلیق کے معنی میں ہے اور کار تخلیق خداوند عالم سے مخصوص قرار دیا گیا ہے جیسا کہ دوسری آیات سے بھی پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح "امر" کے لغوی اور عرفی معنی حکم و دستور کے ہیں اور قرآن عرف عام میں نازل ہوا ہے لہٰذا اس آیت کی روشنی میں فرمان و دستور جاری کرنا بھی خداوند عالم سے مخصوص ہے۔ ظاہر ہے فرمان، قانون کو ہی کہتے ہیں پتہ چلا کہ فرمان جاری کرنا یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم دینا یا کسی شئی سے منع کرنا خدا کی ذات میں منحصر ہے۔

سورۂ یوسف کی چالیسویں آیت میں اعلان ہوتا ہے :۔

ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ

یعنی حکم کرنا فقط اللہ کے اختیار میں ہے اور "حکم" اس محکم نظریہ کو کہتے ہیں جو نظریات میں اختلاف اور رایوں میں پراگندگی پیدا ہو جانے کی صورت میں صادر کیا جاتا ہے چنانچہ مجموعی طور پر تمام قوانین پر لفظ حکم صادق آتا ہے کیونکہ تقریباً ہر مسئلہ میں لوگوں کے درمیان نظر و رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے اور ظاہر ہے صرف "حکم" کے ذریعہ ہی اس فکری و نظری اختلافات کو ختم کیا جا سکتا ہے دوسرے لفظوں میں ایک قانون نافذ کرکے مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے اور یہ حکم و قانون صرف اور صرف اللہ کے اختیار میں ہے جس کی بنیاد اسی آیت "ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ" پر ہے۔

اب جبکہ فرمان جاری کرنا اور حکم نافذ کرنا خدا کی ذات میں منحصر ہو گیا تو کسی غیر کو حکم دینے یا مسلط کرنے کا حق حاصل نہیں رہ گیا اور نہ ہی اس طرح کے بحث و مباحثہ کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ آیا اس کی اتباع لازم ہے یا نہیں۔

"فلا خالق ولا رب ولا مالک ولا آمر ولا حاکم الا اللہ فلا الٰہ الا اللہ"

کیونکہ خدا کے سوا نہ تو کوئی دوسرا خالق و رب ہے نہ ہی کوئی دوسرا مالک، آمر اور حاکم ہے۔ کوئی خدا نہیں ہے سوائے اس خدائے واحد کے۔

البتہ اگر خود خداوند عالم حکم دے دے کہ فلاں شخص کے احکام کی سب لوگ اطاعت و پیروی کریں تو اس حد تک جتنی خدا نے اجازت دی ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ خدا نے

اطاعت کا حکم دیا ہے اس شخص کے احکام کی بھی تابی داطاعت کرنی ہوگی اور حقیقتاً یہ اطاعت بھی بواسطہ خدا کی ہی اطاعت ہوگی چنانچہ اس شخص کی اطاعت کے لازمی ہونے کے سلسلہ میں بھی وہی دلیل کام کرے گی جو خود خدا کی اطاعت کے لازمی ہونے کے ذیل میں پیش کی گئی ہے۔

لہٰذا جن موارد میں پروردگار عالم نے ولی امر مسلمین کو اختیارات ودیعت کر دیئے ہیں اسی دلیل کے تحت جس کی رو سے خدا کی اطاعت واجب و لازم ہے ولی امر کے احکام پر بھی کان دھرنا پڑے گا۔

مختصر یہ کہ اسلام اور حکومت اسلامی میں قانون کی اطاعت و پیروی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ انسان کا خداوند عالم کی رعایا اور مملوک ہونا مسلم ہے اور یہ دلیل غیر اسلامی یا غیر الٰہی معاشروں میں قوانین کی اطاعت و پیروی کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی دلیلوں سے قطعی مختلف ہے۔

ناقابل تغییر قوانین:

آیات و روایات کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہے کہ اسلام کے تمام قوانین ابدی اور تغییر و تبدل سے ماوراء ہیں۔ حکومت اسلامی کا کام صرف ان مسلمہ قوانین کا اجراء کرنا ہے۔ ہاں اگر خود ان قوانین کے نفاذ و حفاظت کے سلسلہ میں مزید قوانین کی ضرورت پڑتی ہے تو مناسب قوانین حسب حال وضع کئے جا سکتے ہیں جن میں وقت اور حالات کے تحت تبدیل کا بھی امکان پایا جاتا ہے۔

ہم اپنے اس مطلب کو دو مقدمات قائم کر کے مزید واضح کر دینا چاہتے ہیں:۔

مقدمہ اوّل: دستور اسلام میں تمام موضوعات سے متعلق خدا کی جانب سے معین حکم موجود ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ دعوا آیات و روایات دونوں سے ثابت ہے۔ جہاں تک قرآنی آیات کا سوال ہے تو ہم مثال کے طور پر ان آیات کو پیش کر سکتے ہیں جن میں مشرکین کی طرف سے بعض حیوانوں کو حرام قرار دیئے جانے کا ذکر کرنے کے بعد اس کو ان کا افترا

قرار دیا گیا ہے اور اس کی رد کرتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ:۔

قل لا اجد فیما اوحی الی محرّماً علیٰ طاعمٍ یّطعمه الّا ان یکون میتةً او دماً مّسفوحا او لحم خنزیرٍ فانه رجس او فسقا اهلّ لغیر الله به فمن اضطرّ غیر باغٍ وّلا عادٍ فانّ ربّك غفورٌ رّحیمٌ (سورہ انعام/۱۴۵)

اے رسول: آپ کہہ دیجئے کہ میں تو جو کچھ میرے پاس وحی کے ذریعہ (قرآن) آیا ہے اس میں کوئی چیز کسی کھانے والے پر حرام نہیں پاتا مگر جبکہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا یہ کہ سور کا گوشت ہو پس اسے شک یہ چیزیں ناپاک (و حرام) ہیں، یا (وہ جانور) نافرمانی (کا باعث) ہو یعنی وقت ذبح خدا کے بجائے کسی اور کا نام لیا گیا ہو، ہاں اگر کوئی شخص بے بس و مضطر ہو اور نافرمان و سرکش نہ ہو (اور اس طرح کا جانور کھائے) تو بے شک تمہارا رب بڑا بخشنے والا ہے۔

اس آیت سے بخوبی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی چیز خدا نے حرام نہیں کی ہے تو اس کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ حرام وہ ہے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہو اور وحی کے ذریعہ پیغمبر کو حرام کرنے کا حکم دیا ہو یعنی کسی چیز کو حکم پر محمول نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ خدا کی وحی کے ذریعہ اس کی وضاحت نہ کر دی گئی ہو اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ تمام چیزوں کا حکم وحی کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔

اس بات کو معصومین علیہم السلام کے آثار و روایات میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے چنانچہ:

(۱) کتاب شریف کافی میں صحیح اسناد کے ساتھ داؤد بن فرقد سے حضرت ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ذیل میں سعد بن عبادہ سے فرمایا:۔

ان الله عزّ وجلّ قد جعل لکل شیءٍ حدّاً وجعل لمن تعدّی ذلك الحدّ حدّاً۔ (کافی: کتاب الحدود باب اول حدیث ۱۲ و الوسائل باب دوم من مقدمات الحدود حدیث ۱)

یعنی پروردگار عالم نے ہر شئی کے لئے ایک حد معین کی ہے اور جو اس حد سے تجاوز کرے اس کے لئے بھی حد (یعنی سزا) معین کر دی ہے۔

اس عبارت سے ملتی جلتی حدیث خود امام جعفر صادق علیہ السلام سے موثق سماعہ میں منقول ہے امامؑ نے فرمایا:

ان لکل شیٔ حداً ومن تعدی ذلک الحد کان لہ حداً

(کافی: کتاب الحدود باب اول حدیث ۲، الوسائل باب دوم من مقدمات الحدود ص ۲)

پیغمبر اسلامؐ کی حدیث کا پوری توجہ اور دقیق نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم نے ہر چیز کے لئے ایک حد قرار دی ہے۔

لفظ "شیٔ" ہر ترک و فعل کو شامل ہے پس معلوم ہوا کہ اسلام میں خداوند عالم نے ہر فعل کے بجالانے یا اس کے ترک کرنے کے سلسلہ میں حدیں قائم کر دی ہیں اور ان حدوں کو عبور کرنا جائز نہیں ہے۔

ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون (بقرہ/۲۲۹)

اور جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی لوگ تو ظالم ہیں۔

اور اسی ظلم کی بنیاد پر یہ بات کہی گئی ہے کہ:-

"جعل لمن تعدی ذلک الحد حداً"

بہرحال حضور صلعم کی حدیث اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خداوند عالم نے ہر مسئلہ میں جواز و عدم جواز کی حدیں خود ہی مقرر فرما دی ہیں جس سے تجاوز کرنا ظلم ہے اور موجب عذاب و عقاب ہے۔ اگرچہ اس روایت کا مفہوم بخوبی واضح ہے پھر بھی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود معصومین علیہم السلام کی عبارت سے اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔ کتاب شریف کافی میں ہی عمرو بن قیس سے روایت ہے کہ صادق آل محمد علیہم السلام فرماتے ہیں:-

یاعمرو بن قیس اشعرت ان اللہ عزوجل ارسل رسولاً وانزل علیہ کتاباً وانزل فی الکتاب کل ما یحتاج الیہ وجعل لہ دلیلاً یدل علیہ وجعل لکل شیٔ حداً ولمن جاوز الحد حداً؟ قال:

قلت: ارسل رسولاً وانزل علیہ کتاباً وانزل فی الکتاب کل مایحتاج الیہ وجعل علیہ دلیلاً وجعل لکل شیٔ حدّا ؟! قال: نعم قلت: وکیف جعل لمن جاوز الحدّ حدّا قال قال: ان اللّٰہ عزّ وجلّ حدّ فی الاموال ان لا تؤخذ الّا من حلّھا فمن اخذھا من غیر حلّھا قطعت یدہ حدّ المجاوزۃ الحدّ وان اللّٰہ عزّ وجلّ حدّ ان لا ینکح النکاح الّا من حلّہ ومن فعل غیر ذالک ان کان عزبا حدّ وان کان محصنا رجم لمجاوزتہ الحدّ۔[1]

اے عمرو بن قیس! کیا تمہیں معلوم ہے کہ خداوند عالم نے پیغمبر بھیجے، ان پر کتاب نازل کی اور کتاب میں تمام ضروری چیزوں کو بیان کر دیا ہے اور اس کیلئے ہادی معین کئے ہیں جو اس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ خداوند عالم نے ہر چیز کی حد معین کی ہے اور اس حد سے آگے بڑھنے والے کے لئے بھی حد (سزا) معین کی ہے ؟ قیس کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: کیا خداوند عالم نے رسول بھیجے ہیں اور ان پر کتاب نازل کی ہے اور کتاب میں تمام ضروری چیزوں کو نازل کیا ہے اور اس پر رہنما بھی قرار دیا ہے نیز تمام چیزوں کی حد معین کر دی ہے ؟ حضرتؑ نے فرمایا ہاں ——— میں نے عرض کیا: حد سے آگے بڑھنے والوں کے لئے اس نے کیسی حد (سزا) معین کی ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: خدا نے اموال میں یوں حد معین کی ہے کہ صرف اسی مال سے استفادہ کیا جا سکتا ہے جس کو خداوند عالم نے حلال قرار دیا ہے، اگر غیر حلال سے استفادہ کرتا ہے تو بطور حد (سزا) اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، کیونکہ وہ حد سے آگے بڑھا ہے۔ خداوند عالم نے نکاح کے لئے یہ حد معین کی ہے کہ صرف ان عورتوں سے ہمبستری کی جائے جن سے خداوند عالم نے حلال قرار دیا ہے اب اگر کوئی دوسری عورتوں سے بھی ہمبستری کرتا ہے تو اس پر حد جاری ہوگی (کوڑے لگیں گے) اگر غیر شادی شدہ ہو، اور سنگسار کیا جائے گا اگر شادی شدہ ہو کیونکہ وہ حد سے آگے بڑھا ہے۔

---

[1] کافی: باب اول کتاب الحدود حدیث ۷ (جلد ہفتم ص۱۷۵)

امام کی اس توضیح سے بخوبی آشکار ہے کہ "جعل حدا" کے معنی تمام موارد میں وہ دائرہ اور بندی ہے جو احکام کی صورت میں خداوند عالم نے معین کر دیا ہے چنانچہ تمام اشیاء و اعمال اس ار بندی میں داخل ہیں اور ظاہر ہے کسی شئ کا حلال یا حرام ہونا بھی اسی میں شامل ہے۔

۲۔ اسی طرح کافی میں معتبر اسناد کے ساتھ سماعہ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت موسیٰ جعفر علیہما السلام سے عرض کیا "اکل شئ فی کتاب اللہ وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ الہ او تقولون فیہ؟ قال، بل کل شئ فی کتاب اللہ و سنۃ یہ صلی اللہ علیہ و آلہ" جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں سماعہ نے سوال کیا کہ آیا ممکن ہے کسی لہ میں جبکہ خدا اور اس کے رسولؐ نے کچھ بھی فرمایا ہو اپنی نظر اور رائے آپ صادر فرمائیں؟ امام سلام جواب دیتے ہیں کہ تمام چیزیں قرآن اور پیغمبر اسلام کی حدیث میں بیان کر دی گئی ہیں، رائے یا قیاس کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کہ ہم اس کے دامن میں پناہ لیں۔[1]

۳۔ صاحب بحار الانوار نے بصائر الدرجات سے ایک معتبر روایت نقل کی ہے کہ محمد بن مسلم معصوم علیہ السلام سے دریافت فرماتے ہیں: سألتہ عن میراث العلم ما بلغ جوامع من العلم ام یفسّر کل شئ من ھٰذہ الامور التی یتکلم یھا الناس من الطلاق والفرائض فقال علیہ السلام کتب العلم کلہ والفرائض فلو ظھر امرنا لم یکن من شئ الا وفیہ سنۃ یمضیھا۔[2]

ملاحظہ فرمایا محمد بن مسلم سوال کرتے ہیں کیا آپ کو صرف کلیات کا علم حاصل ہے یا یہ کہ پ کو تمام موارد کے لئے تفصیلی حکم دیا گیا ہے؟ امام جواب میں فرماتے ہیں: اگر حکومت ہارے ہاتھوں میں ہوتی تو ہر مسئلہ میں ایک مخصوص حدیث کے تحت حکم صادر کرتا۔

یہ چند حدیثیں نمونہ کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں ورنہ ایسی حدیثیں کثرت سے موجود ہیں

---

[1] اصول کافی جلد ۱ ص ۶۲

[2] بحار الانوار جلد ۲ باب ۲۲ کتاب العلم ص ۱۶۹ حدیث ۲

جو ثابت کرتی ہیں کہ خدا و رسول کی جانب سے تمام موضوعات پر خواہ احکامات صادر کئے جا چکے ہیں جس کے کچھ حصوں کو کافی، وافی اور بحار کی کتاب العلم" میں جمع کردیا گیا ہے۔

مقدمہ دوم

یہ کہ اسلام کے تمام احکامات ابدی ہیں، یہ کسی مخصوص زمانہ اور وقت سے مخصوص نہیں ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حکومت اسلامی میں ان کو بنیادی و اساسی حیثیت حاصل ہو۔ ہمارا مدعا بہت ہی واضح ہے کیوں کہ:

اولاً چاہے وہ کوئی بھی مذہب یا دین ہو اس کے مخصوص احکام ہوتے ہیں اور بظاہر یہ احکام خود اس بات کا اقتضا کرتے ہیں کہ جب تک وہ دین باقی ہے اس کے احکام بھی حکم دینی کی حیثیت سے جاری و ساری رہیں گے۔ چنانچہ اگر کوئی حکم کسی مخصوص زمانہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی وضاحت ضروری ہوتی ہے۔ بلاشبہ ہر شخص اس کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ دلائل جو یہود و نصاریٰ (عیسائی) یا دیگر مذاہب کے افراد اپنے دینی احکام کے ذیل میں پیش کرتے ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں بھی تمام دینی احکام دین کی نظر میں حکم دائمی کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی خاص زمانہ یا وقت سے مخصوص نہیں ہیں۔ اس بنیاد پر یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ جب تک اسلام اس صفحۂ ہستی پر موجود ہے اس کے ظواہر ادلہ بھی اس بات کا تقاضہ کرتے رہیں گے کہ حکم اسلام وہی ہے جس کا ان ادلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ معصومین علیہم السلام سے اس سلسلہ میں مخصوص طور پر حدیثیں بھی وارد ہوئی ہیں جو دین اسلام کے ابدی ہونے نیز تا قیام قیامت اس کے تمام احکامات کے ناقابل تغییر ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر سلام بن مستنیر امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں امامؑ نے فرمایا: قال جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایہا الناس: حلالی حلال الی یوم القیامۃ وحرامی حرام الی یوم القیامۃ الا وقد بینہما اللہ عزوجل فی الکتاب وبینتہما فی سیرتی وسنتی" میرے جد پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ میرا حلال، حلال ہے روز قیامت تک کے لئے اور میرا حرام، حرام ہے روز قیامت تک کے لئے اور ان کی خداوند عالم کی کتاب (قرآن) میں نشان دہی کردی گئی۔

یہ میری سیرت و سنت میں بھی روشن ہیں ۔ اسی طرح کی عبارت نہج البلاغہ میں بھی مذکور ہے
مسلمانوں کے نزدیک یہ بات واضحات میں شمار کی جاتی ہے ۔

ان دونوں مقدمات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند عالم نے رسول
اسلام کے ذریعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، جب تک کہ اسلام موجود ہے، تمام موضوعات کے بارہ میں
احکام بیان کر دئے ہیں ۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر اب حکومت اسلامی کے لئے کسی قسم
کے کلی یا بنیادی حکم اور قانون کے وضع کرنے اور مسلمانوں کو اپنے بنائے قانون پر عمل کی دعوت
دینے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ اسلام کی نظر میں ولی امر یا ذمہ داران مملکت اسلامی کا کام محض
احکام اسلامی کی نگہبانی اور اس کا اجرا ہے ۔ چنانچہ اسلام کے تمام کلی و بنیادی احکام، جو ہمہ گیر
رکھتا ہیں، مسلم اور ناقابل تغییر ہیں ۔

ان مسلمہ قوانین میں، جو مختلف جہتوں اور شکلوں کے حامل ہیں، ابتدائے امر میں ہی ایک
طرف تو انسان کے فرائض معین کر دئے گئے ہیں مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، اسلامی معاشرہ
کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے مال سے واجبی حقوق کی ادائیگی کرنا، حدود شرع میں رہتے
ہوئے اپنی نیز واجب النفقہ (اہل خاندان) کی زندگی کے لوازمات مہیا کرنا، شرعی طریقوں پر
ازدواجی زندگی کے فرائض انجام دینا، وغیرہ نیز دوسری طرف احکام شرعی سے روگردانی اختیار
کرنے کی صورت میں حدود و سزا کی بھی تعین و تشریح کر دی گئی ہے ۔

ایسی صورت میں حکومت اسلامی ان قوانین کے صحیح طور پر اجراء کرنے اور اجراء ہونے
کی ذمہ دار و نگراں ہے اس کا کام قانون وضع کرنا نہیں ہے اور یہ بات اس چیز سے قطع نظر
کہ تمام احکامات اسلامی دائمی اور ہمہ گیر ہیں خود حکومت اسلامی کی تشکیل اور ولایت امر کی
تشریح سے بالکل واضح اور روشن ہو جاتی ہے ۔ اصولی طور پر ولایت (فقیہ) اور ولی امر
کی تعبیر بھی "سرپرستی" کے معنی میں کی گئی ہے جو اس بات کو روشن کر دیتی ہے کہ ولی امر کی
ذمہ داری محض امت مسلمہ کی سرپرستی اور نگرانی کرنا ہے تاکہ معینہ حدود سے کوئی تجاوز
نہ کر سکے ۔ بلکہ ہر شخص اپنی حد میں رہتے ہوئے امور انجام دے نیز قانون شکنی کرنے والا سزا
پا کر اپنی جگہ بیٹھ رہے (یعنی سر نہ اٹھا سکے) ۔

اس کے علاوہ بہت سی آیات و روایات بھی جن میں حکومت اسلامی کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں اسی مفہوم کی تائید و وضاحت کرتی ہیں ۔چنانچہ سورۂ حدید کی ۲۵ ویں آیت میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے :۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ۔ یعنی روشن دلیلوں اور نشانیوں نیز قانون کی کتابوں اور مخصوص فکروں کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ لوگ راہ عدل پر گامزن رہیں کوئی اپنے معینہ حقوق اور طے شدہ دائرے سے پاؤں باہر نہ نکالے۔ اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ الٰہی قوانین کی بنیاد، فطرت پر رکھی گئی ہے اور دستور و شریعت میں ہر شخص کے لئے اس کی احتیاج کے مطابق پورے انصاف کے ساتھ اس کا حق معین کر دیا گیا ہے ۔نیز یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء و مرسلین کی ولایت جو ان کے منصب کا بہت ہی اہم جزو ہے ، اسی مقصد کے تحت ہے کہ عوام خدا کی جانب سے معین شدہ حدود میں قائم رہیں اور اس سے سرمو انحراف و تجاوز نہ کریں ۔

روایت صحیحہ میں زرارۃ حضرت ابی جعفر امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : بنی الاسلام علی خمسة اشیاء علی الصلوٰة والزکوٰة والحج والصوم والولایة قال زرارة : فقلت : ای شئ من ذلک افضل ؟ فقال: الولایة افضل لانها مفتاحهن والوالی هو الدلیل علیهن (اصول کافی ، باب دعائم الاسلام حدیث ۵ جلد ۲ ص۱۸)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ولایت و حکومت زرارۃ نے سوال کیا ان میں افضل ترین کیا ہے ؟ تو امام نے فرمایا : ولایت و حکومت افضل ہے کیونکہ یہ ان سب کی کنجی ہے اور والی و حاکم ان سب کے اوپر دلیل ہے ۔آپ نے ملاحظہ فرمایا، کہ امام علیہ السلام کی نظر میں تمام ارکان اسلام پر ولایت کا مسئلہ برتری و فضیلت رکھتا ہے ۔اس لئے کہ ولایت مسلمین اور حکومت اسلامی مسلمانوں کے درمیان الٰہی احکام کا دروازہ کھولنے کی کنجی ہے اور ولی امر یعنی حکومت اسلامی کا سربراہ صرف احکام

ن اسلام کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے لھذا اسلام میں حکومت کا مقصد صرف اسلامی
رہ میں احکام اسلام کو رواج دینا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے اس طرح
ام کے ہاتھوں میں وہ کنجی موجود رہے جس کے ذریعہ وہ احکام اسلام پر عمل کرنے کی راہیں
ار کرسکیں۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نہج البلاغہ کے ۱۰۵ ویں خطبہ میں ارشاد
تے ہیں: انہ لیس علی الامام الا ما حمّل من امر ربہ الابلاغ
لموعظۃ والاجتہاد فی النصیحۃ والاحیاء للسنۃ واقامۃ
حدود علی مستحقیھا واصدار السھمان علی اھلھا۔

یعنی وہ چیز جو مسلمانوں کے امام وحاکم کے فرائض میں داخل ہے یہ ہے کہ وہ خداوند
کے احکام کا اجراء کرے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں کو احکام شرعی سے باخبر
ے، نصیحت سے کام لے، چاہے وہ افراد ہوں یا معاشرہ دونوں کی ترقی وبہبودی
ری کوشش کرتا رہے، پیغمبر اسلام کی سنتوں کو ان کے درمیان زندہ کرے اور تخلف
رشی کرنے والوں کو سزا دے۔ بیت المال کو اس کے مستحقین تک پہنچانے کی کوشش
، اور صحیح موارد میں ان کا استعمال کرے۔

ان تفاصیل کے دیکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ولی امر، امام یا حاکم کی ذمہ داری
ام الہی کا اجراء اس کی نگرانی اور مسلمانوں میں ان کے نفوذ کی کوشش کے علاوہ کچھ نہیں ہے
اس تشریح کی بنیاد پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام میں حکومت وولایت کی اہمیت و
ورت محض احکام اسلامی کی نگرانی وحدبندی اور معاشرہ میں اس کے صحیح طور پر
ائج ونفاذ کی کوشش کے لئے ہے لہٰذا ضروری ہے کہ احکام اسلام تمام افراد اور
اشرہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے سبھی مسائل کے سلسلہ میں انکی ضرورتوں
فرائض پر حاوی ہوں اور اس میں تمام اقتصادی، فوجی، سیاسی، علمی اور عبادی نیز دیگر
ائل ضروریہ کی مکمل طور پر رعایت کرتے ہوئے مناسب اور لائق عمل قوانین ودستور
جود ہوں۔

اب جبکہ یہ مسلم ہے کہ اسلام میں مختلف قسم کے احکام، اقتصادی قرار دادیں نیز ہر طرح کے معاملات مستقل اور ناقابل تغییر قوانین کی شکل میں بیان کر دیئے گئے ہیں تو حکومت اسلامی کو بھی ان ہی دستور وضوابط کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے معاملات انجام دینے ہوتے ہیں، وہ امت مسلمہ کے لئے ان قوانین کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے ان کے صحیح طور پر اجراء کئے جانے کی ذمہ دار ہے۔ چونکہ اسلام کے ان مسلمہ قوانین میں قدرتی پیداوار کی آمدنی کے سلسلہ میں خصوصی اور عمومی ملکیت کی تشریح کر دی گئی ہے نیز ٹیکس کی مختلف شکلیں اور ان کے موارد استعمال معین کر دیئے گئے ہیں لہٰذا یہ قوانین اسلامی حکومت میں مستقل اور دائمی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اور حکومت کو بہرحال ان کے اجراء اور حفاظت کے فرائض انجام دینے ہوں گے۔ اسی طرح اسلامی قوانین میں شخصی ملکیت اور اس کی جہتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس کی منتقلی یا تصرف کے طریقوں کو مشخص کر دیا گیا ہے، غصب یا چوری کے سلسلہ میں سزائیں معین ہیں لہٰذا اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ ان قوانین کے صحیح طور پر اجراء کرنے یا اجراء ہونے کی نگرانی کرے ــ اسلام نے مسلمانوں کے وقار اور شخصیت کی حفاظت کے لئے مستقل دستور وضع کئے ہیں کسی کی غیبت کرنا، تہمت لگانا، اہانت یا بے عزتی کرنا، گالی بکنا یا ناروا انداز اپنانا اسلام کی نظر میں ناجائز اور سزا و تعزیر کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اب ان قوانین کا اجراء اور تحفظ حکومت اسلامی کے فرائض میں داخل ہے۔

اسلام نے جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی مستقل قانون و دستور معین کر دیئے ہیں اور ان سے روگردانی کرنے والوں کے لئے مختلف انداز کی سخت سزائیں مقرر کی ہیں حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ ان قوانین کو اسلامی معاشرہ کی اساس و بنیاد قرار دے اور اس کے اجراء و نفوذ کی کوشش کرے۔

کسی بھی تغیر و تبدل سے ماوراء ان اسلامی قوانین میں انسانی جان کو بڑی اہمیت و قیمت حاصل ہے اور اس کو معرض خطر میں لانے والوں کے لئے حدود

ت کی کتابوں میں تفصیلی احکام موجود ہیں۔ مسلمانوں کو ان قوانین کا احترام کرتے
ئے ان کو اپنے عمل کی بنیاد قرار دینا چاہئے۔ حکومت اسلامی بہرحال اس کے اجراء
ذمہ دار ہے۔

اسلام کے ان ہی ناقابل تغییر مستقل قوانین میں حالات و عوارض کے تحت
ثانوی کے نام سے اصل قوانین سے تخلف کی بھی اجازت دی گئی ہے بلکہ بعض حالات میں
اولیٰ" کے خلاف عمل کرنا واجب و لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ قوانین و احکام بھی فقہی کتابوں
مختلف قسم کے اسباب و عوارض کے پیدا ہونے کے اعتبار سے "اسلام کے احکام ثانوی"
نوان سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ثانوی احکام بھی اسلام
مستقل اور ناقابل تغییر قوانین کا ہی جزء ہیں اور ان کا پاس و لحاظ رکھنا اور اپنے
ل کی بنیاد و اساس قرار دینا تمام مسلمانوں نیز حکومت اسلامی کے ذمہ داروں
فریضہ ہے۔

اسلامی معاشرہ کے دیگر معاشروں کے ساتھ تعلق و رابطے کا کیا معیار ہونا چاہئے
سکی تشریح بھی اسلام کے مستقل قوانین میں موجود ہے جو دیگر ممالک سے روابط و
تقات استوار و برقرار کرنے کے سلسلے میں ذمہ داران مملکت اسلامی کے فرائض کو مشخص
عین کر دیتے ہیں لہٰذا ارباب حکومت کا طریقہ کار بہرحال اسلامی ہونا چاہئے۔
مختصر یہ کہ اسلام کے بنیادی قوانین اتنے ہمہ گیر ہیں کہ اس نے ہر چھوٹے سے چھوٹے
ر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل ابدی قانون و دستور کی صورت میں بیان کر کے
کومت اسلامی کو اس کے عمل میں لانے اور صحیح طور پر اس کے اجراء کرنے کی ذمہ داری
ونپ دی ہے۔ چنانچہ اسلامی حکومت میں قوانین وضع کرنے کی ذمہ داری ارباب
ملکت کے دوش سے اٹھالی گئی ہے۔ حکومت اسلامی صرف احکام الٰہی کے اجراء
و نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ چونکہ یہ قوانین اپنی جگہ پر خود ہمہ گیر و مستقل ہیں اور ان کا
نباع واجب و لازم ہے لہٰذا حکومت کے ذمہ داروں کو اپنی طرف سے قانون
انے کا قطعی حق حاصل نہیں ہے ان کو چاہئے کہ فقط ان اسلامی قوانین

کے صحیح طور پر اجراء ہونے کی نگرانی کریں اور خود بھی محض اجراء کے فرائض انجام دیں -

اب مصطفیٰ محقق
جناب سید احتشام عباس

مصادر فقہ

سنت قولی :

"سنت قولی" کو اصطلاحاً روایت، خبر یا حدیث کہتے ہیں۔ احادیث و اخبار کی تاریخ، ان کی تدوین اور ان سے متعلق رائج اصطلاحات کی مختصر معرفت کے لیے مناسب ہے کہ ہم ذیل میں چند باتیں بطور اجمال ذکر کریں۔

دور اوّل کے حفّاظ و ناقلین حدیث:

پہلے طبقہ میں حدیث کے حفظ یا نقل کرنے والے پیغمبر کے اصحاب، اہل خاندان، دوست اور ہمنشین تھے، جو حضرت ؐ کی وفات کے بعد مدینہ میں مقیم تھے ان میں حضرت علیؑ اور اہلبیتؑ اطہار نمایاں حیثیت رکھتے ہیں محدثین نے عبد اللہ بن عامر، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر[1]، زید بن ثابت، عمر بن خطاب، عائشہ بنت ابی بکر اور ابو ہریرہ وغیرہ کے نام بھی ذکر کئے ہیں آنحضرتؐ کے کچھ دوسرے اصحاب بھی اسی زمرہ میں ہیں۔

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جو مذکورہ بالا افراد کے شاگرد یا پھر شاگردوں کے شاگرد ہیں اور تابعین کے نام سے مشہور ہیں منجملہ ان میں عامر بن شراحیل الشعبی (متوفی ۱۰۵ ہجری) عروہ بن زبیر (متوفی ۹۶ ہجری) محمد الزہری (متوفی ۱۲۵ ہجری) وہب بن منبہ (متوفی ۱۱۴)

---

[1] عبد اللہ بن عمر متوفی ۷۴ ہجری رجال وحدیث کے اہل سنت علماء کی نظر میں غیر موثق اور ناقابل اعتماد ہیں (الغدیر ج ۱۰/۴)

موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۰ ہجری)

ان افراد نے اپنی تمام زندگی، احادیث نبوی کی جمع آوری میں صرف کی اور جیسا کہ مشہور ہے شعبی نے ۵۰۰ اصحاب پیغمبرؐ سے حدیثیں جمع کی ہیں۔

حدیثیں پہلے زبانی جمع کی جاتی تھیں بعد میں انھیں کھال پر لکھ کر ان کے مجموعے بنائے جاتے تھے۔ حدیثوں کے جمع کرنے والوں کو محدث کہا جاتا ہے۔

احادیث کے قدیم ترین مجموعے :۔

حدیث کے قدیم ترین مجموعوں میں حروف تہجی کی ترتیب سے اصحاب پیغمبرؐ کے نام لکھ کر ان سے منقول حدیثوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح کے مجموعوں کو "مسند" کہتے ہیں۔

احادیث کے مشہور ترین مجموعے :

الموطأ فی الحدیث : مؤلف مالک بن انس، جو مذہب مالکی کے بانی ہیں۔ وفات ۱۷۹ ہجری

اس کتاب میں ۱۷۰۰ حدیثیں نقل ہوئی ہیں اور خود مؤلف نے ان کی صحت اور ان کے معتبر ہونے کی تصدیق کی ہے۔

احمد بن حنبل، مذہب حنبلی کے بانی ہیں (وفات ۲۴۱ ہجری) انکا مجموعہ مسند احمد بن حنبل کے نام سے مشہور ہے جسمیں ۳۰۰۰۰ ہزار سے زیادہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔

ان کے بعد کے مجموعے جو مصنف کے نام سے جانے جاتے ہیں وہ زیادہ مقبولیت و شہرت کے حامل ہیں۔ یہ مجموعے ناقلین کے نام کے بجائے موضوعات و ابواب کی بنیاد پر منظم کئے گئے ہیں۔ ان مجموعوں میں سب سے زیادہ معتبر چھ کتابیں ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے کتب ستہ یا صحاح ستہ کے نام سے شہرت پائی۔ یہ چھ کتابیں جو اہل سنت حضرات کے درمیان بہت زیادہ مقبول ہیں اور ان ہی پر ان کی فقہ کی بنیاد ہے، حسب ذیل ہیں :۔

۱) الجامع الصحیح جس کا مخفف "الصحیح" ہے اس کے مصنف ابوعبداللہ محمد البخاری (۱۹۵ ـــ ۲۵۷ھ) ہیں۔ یہ کتاب ماقبل کی کتابوں سے زیادہ بہتر طریقہ سے تدوین کی گئی ہے۔

مؤلف، انہوں نے چھ لاکھ سے زائد حدیثیں جمع کیں، لیکن ان میں سے صرف ۷۲۵۰ حدیثوں
ہو جاتا ہے۔
۲) الصحیح ۔ اس کے مصنف مسلم بن حجاج نیشاپوری (۲۰۲ ۔ ۲۶۲ھ) ہیں۔ یہ کتاب بھی
کتابوں میں سے ہے۔ اس کے مؤلف فرماتے ہیں کہ میں نے ۳ لاکھ حدیثوں کی چھان بین کی اور
سے ۱۲ ہزار حدیثیں یعنی ۴٪ فیصد کو معتبر پایا۔
۳) سنن، مصنف ابن ماجہ قزوینی، متوفی ۲۷۳ھ۔
۴) سنن مصنف ابوداؤد سجستانی (متوفی ۲۷۵ھ)۔
۵) الجامع الکبیر، مصنف ترمذی، وفات ۲۷۹ھ۔
۶) سنن، مصنف نسائی، وفات ۳۰۳ھ، آپ ابوداؤد کے شاگرد اور شہر "نسا"
رہنے والے تھے۔

شیعوں میں حدیث کی تدوین (اصول اربعمأۃ)

سب سے پہلے حدیث کی تدوین کرنے والے ائمہ معصومینؑ کے اصحاب اور تابعین تھے۔
امام سے قربت کے سبب عوام ان سے رجوع کرتے تھے۔ جب ان کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش
تھا تو وہ خود اسے ائمہؑ یا قابل اعتماد اصحاب ائمہ کی خدمت میں پیش کرتے اور ان کے جوابات
سنت کے طور پر لکھ لیا کرتے تھے۔
چونکہ یہ حضرات بلا کسی خاص نظم و ترتیب کے اپنے نوشتوں میں وہ جوابات لکھ لیا کرتے تھے
اس سے فقہ، عبادات، معاملات و عقائد کے مختلف مسائل ایک ساتھ جمع ہو جاتے تھے اور اکثر
نے کشکول کی صورت اختیار کر جاتے تھے۔ یہی نوشتے بعد میں "اصل" کے نام سے مشہور ہوئے اور
ان کی تعداد ۴۰۰ تھی لہٰذا انکا نام (اصول اربعمأۃ) پڑ گیا۔
یہ طریقہ غیبت صغریٰ کے بعد تک جاری رہا۔ چنانچہ بہت سے صاحبان اصول ایسے ہیں جنھوں نے
اصول خود امام زمانہؑ کے نوابین اربعہ کے ذریعہ مرتب کئے ہیں۔

ب اربعہ ۔ وہ حضرات ہیں جو غیبت صغریٰ کے زمانہ میں شیعوں اور امام کے درمیان رابطہ کے فرائض انجام

مرحوم شیخ طوسی نے بعض صاحبان "اصول" کے اسماء گرامی اپنی کتاب "فہرست" میں ذکر کئے ہیں ہم نمونہ کے طور پر ان میں سے چند افراد کے اسماء تحریر کرتے ہیں۔

اسماعیل بن محمد۔
جابر بن یزید الجعفی۔
اسحاق بن عمار الساباطی۔
سلیم بن قیس الهلالی۔
جمیل بن درّاج۔
داؤد بن فرقد۔
علی بن رئاب۔
ابان بن تغلب۔
ابی نصر البزنطی۔
سعید بن یسار۔
بشار بن یسار۔
اسباط بن سالم۔
علی بن مہزیار اہوازی۔
عمر بن آذینہ[1]۔

۔ دیتے تھے۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: (۱) ابو عمر عثمان بن سعید سمّان (۲) ابو جعفر محمد بن عثمان عمروی آپ عثمان بن سعید کے بیٹے تھے متوفی ۳۰۴ یا ۳۰۵ ہجری۔ (۳) ابوالقاسم حسین بن روح نوبختی متوفی ۳۲۶ھ (۴) ابوالحسن علی بن محمد سیمری متوفی ۳۲۹ ہجری (آپ کی وفات کے فوراً بعد سے غیبت کبری شروع ہوجاتی ہے)

[1] فہرست شیخ طوسی، معالم العلماء ابن شہر آشوب رجال نجاشی۔

یہ اصول مستند اور معتبر ہونے کی وجہ سے، محدثین و فقہائے امامیہ کی نظر میں بڑی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔

کتب احادیث کی تدوین:

اس دور کے بعد فقہا و محدثین کے ایک گروہ نے فقہ و حدیث کے موضوعات پر تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ "اصول" اور ان تصنیفات میں فرق یہ ہے کہ ان کتابوں میں موضوعات کے ذیل میں مسائل فقہی کی باب بندی کی گئی ہے اور روایات میں باہمی ربط پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح سے پراگندگی کی کیفیت باقی نہیں رہی۔ ہاں غیر مرتبط روایات کو نوادر کے عنوان سے جمع کر دیا گیا ہے۔ جن افراد نے فقہ و حدیث کی کتابوں کی اس طرح تدوین کی ان میں سے بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں: —

حمدان بن سلیمان نیشاپوری۔

حماد بن عیسٰی۔ بندار بن عاصم الذھلی۔

حسن بن محبوب السّراد۔

حسن بن جہم بن بکیر۔

کتب اربعہ: غیبت صغریٰ کے آخری دور، عہد سیمری یعنی امام زمانہؑ کے چوتھے نائب کے زمانہ سے، علم فقہ نے وسعت پائی چند علماء و محدثین نے اس کا بیڑا اٹھایا کہ اہل بیتؑ سے مروی حدیثوں کو مجموعوں کی شکل میں مدوّن کر کے فقہی فروع سے متعلق احادیث کی باب بندی اور تدوین کی جائے۔ اس طرح ایک صدی میں حدیث کے کئی عظیم مجموعے عالم وجود میں آئے، ان میں سے چار کتابوں نے قبول عام و شہرت دوام حاصل کی اور فقہا کے فتووں کا مصدر قرار پائیں۔ یہی کتابیں کتب اربعہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ جو تالیف کی ترتیب کے لحاظ سے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **کافی:** یہ کتاب، ابوجعفر محمد بن یعقوب اسحاق کلینی رازی کی تالیف ہے۔ مصنف نے اپنی زندگی کے بیس سال اس گرانقدر کتاب کے لکھنے میں صرف کئے۔ کافی ۳۰ فصلوں یا ۳۰ کتابوں پر مشتمل ہے

جو کتاب العقل و الجہل سے شروع ہو کر کتاب الوصایا پر ختم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں کل ۱۶۱۹۹ احادیث نقل ہیں۔ ان احادیث کی تفصیل یہ ہے۔
۵۰۷۲ حدیث صحیح، ۱۱۱۸ حدیث موثق، ۳۰۲ حدیث قوی، ۹۴۸۵ حدیث ضعیف اور ۲۲ حدیثیں نوادر و متفرقات میں سے ہیں۔ کلینی نے ۳۲۹ھ ہجری میں وفات پائی اور بغداد کے محلہ باب الکوفہ میں دفن ہوئے۔

۲۔ من لایحضرہ الفقیہ۔ یہ کتاب ابو جعفر ثانی محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ قمی معروف بہ شیخ صدوق کی تالیف ہے، جو ۹۰۴۴ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ آپ نے شہر ری میں زندگی گذاری اور اپنے عہد میں ری اور خراسان کے شیعوں کے مرجع خلائق اور بزرگ ترین علمی شخصیت تھے۔
آپ ۳۵۵ ہجری میں "ری" سے بغداد تشریف لے گئے وہاں گروہ امامیہ کے بزرگوں نے آپ سے حدیثیں سنیں اور اخذ کیں۔ آپ نے مختلف موضوعات مثلاً فقہ، حدیث، رجال، اعتقاد وغیرہ پر قریب ۳۰۰ کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ سن ۳۸۱ ہجری میں آپ نے وفات پائی اور مرقد حضرت عبدالعظیمؑ کے جوار میں شہر ری میں دفن ہوئے۔

۳۔ تہذیب الاحکام۔ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی معروف بہ شیخ طوسی کی تالیف ہے۔ آپ کو شیخ الطائفہ بھی کہتے ہیں۔ آپ نے ۴۶۰ ہجری میں وفات پائی۔ تہذیب الاحکام ۱۳۵۹۰ حدیثوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ استبصار۔ یہ کتاب شیخ طوسی کی تالیف ہے دراصل اس کتاب کا عنوان "الاستبصار فیما اختلف من الاخبار" ہے اس کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں خصوصیت سے یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ ابوالحسن ہروی جو گروہ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے اکثر مخالف اور ایک دوسرے کی ضد حدیثوں کو دیکھ کر مذہب حقہ سے پھر گئے۔ یہ بات جب شیخ طوسی کو معلوم ہوئی تو آپ نے اپنے شاگرد کو حکم دیا کہ کتاب المقنعہ کی شرح تحریر کریں۔ اسی مذکورہ کتاب کی شرح کے ذریعہ کتاب "تہذیب" وجود میں آئی جو مخالف اور موافق حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد کتاب "استبصار" کتاب "تہذیب" میں مذکور مخالف حدیثوں کی توجیہ کے لئے تحریر کی گئی۔ کتاب استبصار میں کل ۵۵۱۱ حدیثیں نقل ہیں۔

تب اربعہ کی شرحیں اور جامعے :

طویل زمانے سے فقہا کے اجتہاد و تحقیقات کا محور و مرکز ہونے کے سبب کتب اربعہ کی
ت سی شرحیں لکھی گئیں اور جامعے ترتیب دیئے گئے جو حسب ذیل ہیں :-

۱۔ **کتاب وافی** : یہ مرحوم ملا محسن فیض کاشانی کی تالیف ہے۔ مصنف نے فقہ کے الگ الگ
معین کر کے اس میں کتب اربعہ کی تمام حدیثیں جمع کر دی ہیں۔
اس کے علاوہ جگہ جگہ مشکل روایات و احادیث کی شرح بھی کی ہے۔

۲۔ **وسائل الشیعہ** ۔ یہ کتاب محمد بن حسن بن علی معروف بہ شیخ حر عاملی کی گرانقدر
ف ہے۔ ابتداء میں اس کتاب کی فقط چھ جلدیں تھیں لیکن اب طبع جدید بیس جلدوں پر مشتمل
، ۔ اس میں کتب اربعہ کے علاوہ ۷۰ کتابوں کی جملہ روایات فقہی ابواب کی ترتیب کے
ت جمع کی گئی ہیں۔ مؤلف نے ظاہری طور سے ایک دوسرے کی مخالف اور ضد روایتوں کی
یہ بھی کی ہے۔

شیخ حر عاملی قدس سرہ، ۸ رجب ۱۰۳۲ ہجری کو شب جمعہ قریہ مشغر میں پیدا ہوئے
یہ جبل عامل میں واقع ہے۔ ۴۰ سال آپ نے جبل عامل میں زندگی گذاری۔ اس کے بعد مشہد
دس کا سفر کیا اور ۲۴ سال تک اس شہر میں اقامت پذیر رہے پھر آپ نے اصفہان کا سفر
نیار کیا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد آپ نے ۱۱۰۴ھ میں مشہد میں وفات پائی[1] ۔ آپ کا مقبرہ
درسہ ملا جعفر سے متصل ہے اور آج بھی ارباب فضل و کمال کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔

۳۔ **بحار الانوار** : یہ عظیم کتاب ملا محمد باقر مجلسی کی تالیف ہے۔ آپ نے ۱۱۱۰ھ میں
فات پائی۔ اس کتاب کی پہلے ۲۵ جلدیں تھیں لیکن اس کا طبع جدید ایک سو سے زیادہ
لدوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کتاب میں مسلک امامیہ کی تمام حدیثیں جمع کی گئی ہیں، قابل توضیح
حادیث کے ذیل میں ان کی ضروری وضاحت بھی ہے اور متعارض و متناقض حدیثیں بھی بیان
ی گئی ہیں۔

[1] روضۃ الجنات ص ۶۴۴

طبقات محدثین:

ابن حجر کے مطابق علماء عامہ نے محدثین عامہ کو بارہ گروہوں میں تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی کی ہے، جو حسب ذیل ہے۔

١ صحابۂ رسول اکرمؐ ان کے مراتب کے اختلاف کے ساتھ۔
٢ بزرگان تابعین مثلاً: سعید بن مسیب۔
٣ درمیانی طبقہ یعنی بزرگان تابعین کے بعد کے افراد مثلاً: حسن بصری و ابن سیرین۔
٤ وہ افراد جو بزرگان تابعین کے بعد آتے ہیں اور اپنی زیادہ تر روایات بزرگان تابعین سے نقل کرتے ہیں مثلاً زہری و قتادہ۔
٥ گروہ چہارم سے نیچے کا طبقہ مثلاً: اعمش۔
٦ ابن جریح اور ان کے جیسے افراد۔
٧ بزرگان تابعین کے پیرو افراد مثلاً: مالک و ثوری۔
٨ طبقۂ ہفتم کے بعد والا طبقہ: ابن عیینہ و ابن عنبسہ۔
٩ تابعین کے پیروؤں کا تیسرا گروہ مثلاً: شافعی، ابو داؤد طیالسی۔
١٠ وہ افراد جنہوں نے تابعین کے پیروں سے حدیث اخذ کی ہے مثلاً: احمد بن حنبل۔
١١۔ طبقۂ دہم کے بعد والا طبقہ، مثلاً ذہلی و بخاری۔ ١٢۔ طبقہ یازدہم کے بعد والا طبقہ مثلاً ترمذی۔

بعض علماء شیعہ نے بھی گویا حضرات اہل سنت کی پیروی میں گروہ محدثین کو بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے لیکن یہ طبقہ بندی عامہ کی طبقہ بندی کے بالکل برعکس ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

طبقۂ اوّل: شیخ طوسی و نجاشی اور ان کے ہمعصر۔
طبقہ دوم: شیخ مفید و ابن الغضائری وغیرہ۔
طبقہ سوم: شیخ صدوق اور ان کے ہمعصر۔
طبقہ چہارم: شیخ کلینی اور ان کے ہمعصر
طبقۂ پنجم: شیخ محمد یحییٰ و احمد بن ادریس اور ان کے ہمعصر

طبقہ ششم : محمد بن عیسٰی و احمد بن محمد بن خالد البرقی اور ان کے ہمعصر۔
طبقہ ہفتم : حسن بن علی الوشّاء۔
طبقہ ہشتم : محمد بن ابی عمیر و صفوان اور جملہ اصحاب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام۔
طبقہ نہم : اصحاب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام۔
طبقہ دہم :۔ اصحاب حضرت امام محمد باقر علیہ السلام۔
طبقہ یازدہم : اصحاب علی بن الحسین امام زین العابدین علیہ السلام۔
طبقہ دوازدہم : اصحاب حضرت امام حسن و حضرت امیر المومنین علیہما السلام[1]۔

حدیث کی اصطلاح میں اصحاب اجماع : یعنی راویوں کا وہ گروہ جن کو اصحاب اجماع کہتے ہیں۔ اگرچہ کتب رجال میں اس اصطلاح کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن مختصر طور پر ان سے مراد وہ افراد ہیں جن کی تمام روایات پر فقہا کا اجماع ہو، چاہے انہوں نے کسی سے بھی روایت نقل کی ہو اور نقل روایت میں اگرچہ ان سے پہلے کے افراد راوی کی حیثیت سے کوئی با وثوق قدر و قیمت بھی نہ رکھتے ہوں یا ضعیف ہوں۔ اس لئے کہ فقہا ان پر اس قدر اطمینان اور وثوق رکھتے ہیں کہ یہ افراد کسی بھی غیر معتبر سے حدیث اخذ نہیں کرتے بنا بر ایں جب کسی روایت کے سلسلہ میں اس گروہ کے کسی شخص کا نام آتا ہے تو فقہا ان کے پہلے کے راویوں کو ان کی بدولت قابل اعتماد مان کر کوئی جانچ پڑتال نہیں کرتے ہاں ان کے بعد کے راویوں سے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔

رجال "کشی" کے مطابق اس گروہ کی تعداد اٹھارہ ہے۔ اپنی قدر و منزلت، اعتبار اور شرف کے لحاظ سے یہ افراد چھ چھ کی تعداد میں تین طبقوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ پہلے طبقہ میں بھی شروع کے چار افراد زھد و کمال کے اعتبار سے بقیہ دو افراد سے بلند تر ہیں۔ ان تینوں طبقوں کے افراد کے اسماء حسب ذیل ہیں :۔

طبقۂ اوّل : (۱) زرارہ بن اعین (۲) بُرَید (۳) محمد بن مسلم (۴) ابو بصیر (۵) فُضَیل بن یسار (۶) معروف بن خربوذ۔

---

[1] روضات خوانساری ص ۵۳۸

طبقۂ دوم: (۷) جمیل بن دراج (۸) ابان بن عثمان (۹) عبداللہ بن مسکان (۱۰) عبداللہ بن بکیر (۱۱) حماد بن عیسیٰ (۱۲) حماد بن عثمان۔

طبقہ سوم (۱۳) صفوان بن یحییٰ (۱۴) یونس بن عبدالرحمٰن (۱۵) حسن بن محبوب (۱۶) محمد بن ابی عمیر (۱۷) عبداللہ بن مغیرہ (۱۸) احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی۔

طبقۂ اول کے چھ افراد نے صادقین یعنی (حضرت امام باقر علیہ السلام وحضرت امام صادق علیہ السلام سے کسب فیض کیا ہے اور ان دونوں بزرگواروں کے اصحاب شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کے چھ افراد کو حضرت امام صادق علیہ السلام کی شاگردی کا شرف حاصل ہے اور آخر کے چھ افراد امام موسیٰ کاظم اور امام علی رضا علیہما السلام کے اصحاب ہیں۔

جناب ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی
ترجمہ: جناب خادم حسین

اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی کی مختصر تاریخ

استصواب رائے کے مراحل

مسئلہ کی نوعیت:

دوسرا مرحلہ جو مدنظر رہا اور جسے انجام پانا چاہئے تھا، دستور اساسی سے متعلق ریفرنڈم تھا۔ ایرانی عوام کو آخری فیصلہ کرنا تھا اور براہ راست اپنی رائے ظاہر کرنی تھی۔ یہ ایک متفق علیہ بات ہے کہ دستور اساسی ایک قوم کی امیدوں اور تمناؤں کا آئینہ دار، حکومت کی شکل و ساخت معین کرنے والا، لوگوں کے حقوق و آزادی کی حدیں مقرر کرنے والا اور درحقیقت عوام و حکومت کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے عوام کا فیصلہ ضروری ہے۔ لہٰذا وہ تمام ممالک جو اپنے عوام سے خطرہ محسوس نہیں کرتے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دستور اساسی وضع کرنے کے مرحلوں میں ریفرنڈم بھی شامل رہے۔ ایران میں دستور اساسی سے متعلق ریفرنڈم نہ کبھی انجام پایا تھا اور نہ اس سلسلے میں کوئی تجربہ تھا، لیکن استصواب رائے کے سلسلہ میں دوسرے ملکوں کا تجربہ کافی تھا جس سے ہم بھی بہرہ مند ہو سکتے تھے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی سے متعلق، تین مرحلوں میں عوام کی رائے لی گئی ہے:

پہلے ۱۲ فروردین ۱۳۵۸ھ کو حکومت کی نوعیت معین کرنے کے لئے جو "اسلامی جمہوریہ" کے نام سے عوام کے ذریعہ منظور ہوئی۔ اس مرحلے میں درحقیقت دستور اساسی کا بیشتر حصہ منظور اور اس کا اسلامی پہلو تسلیم کیا جا چکا تھا۔

دوسرے مرداد ۱۳۵۸ میں مجلس خبرگان کے انتخابات کے دوران جس میں براہ راست عوام نے دستور اساسی مرتب کرنے والوں کو انتخاب کر کے اختیارات سونپے۔ اس وقت عارضی حکومت اور اس کے ہم خیال لوگوں کا نظریہ تھا کہ مجلس خبرگان صرف دستور اساسی کے مسودہ کی چھان بین کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ بھی صرف ایک ماہ کی مدت کے اندر اس کے برعکس عمل اصول "وکالت" کے خلاف محسوب ہوگا۔ اس کے مد مقابل امام خمینی کی رائے تھی، جو انتخاب شدہ افراد کی صلاحیت و اختیارات کو اسلامی اصول ضوابط اور ان کی رعایت میں محدود گردانتی تھی اور استدلال یہ تھا کہ اراکین اس لئے چنے گئے ہیں کہ "اسلامی جمہوریہ" کے لئے دستور اساسی وضع کریں نہ کہ کسی بھی جمہوری نظام کے لئے، لہٰذا انہیں چاہئے کہ وہ اسلام کے دائرے سے خارج نہ ہوں، یہ بات امام امت نے نہایت صراحت کے ساتھ اراکین مجلس خبرگان سے افتتاحی پیغام میں اور پہلی ملاقات کے دوران کہی کہ اراکین کی "وکالت" "نمائندگی" مشروط و محدود ہے، غیر محدود نہیں، اگر وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں تو گویا نمائندگی کے دائرے سے خارج ہو گئے۔

مجلس خبرگان کو توڑنے کا منصوبہ

دستور اساسی کی تدوین کی پوری مدت میں اسلام اور اس کے احکام، بنیادی محور تھے، اگرچہ دوسرے مذاہب کے ممبران نیز سیاسی جماعتوں کے نمائندے اسلامی لبادہ اوڑھے مجلس میں موجود تھے اور بعض نے بیرونی تعلقات کی بنا پر مجلس خبرگان کی عام اسلامی روش بدلنے کی کوششیں بھی کیں لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ مسئلہ اس حد تک پہنچ گیا کہ مجلس خبرگان منحل کرنے کا منصوبہ تیار ہو گیا اور عبوری حکومت کے بعض وزیروں نے اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ لیکن یہ منصوبہ امام خمینی کی پرجوش تقریر کے نتیجہ میں عملی جامہ اختیار نہ کر سکا، بعد میں جب امریکی سفارت خانہ امام خمینی کے پیروکار طالب علموں کے قبضہ میں آ گیا اور عارضی حکومت کے ایک رکن کو گرفتار کیا گیا اور ثبوت فراہم ہوا تو یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ مجلس خبرگان کو توڑنے کا منصوبہ امریکی سازشوں کا نتیجہ تھا اور اسی سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سوئیڈن میں تعینات ایرانی

سفیر نے ایران کا سفر کیا تھا۔ مجلس خبرگان کے ایک رکن جو آگے چل کر پہلے صدر جمہوریہ مقرر ہوئے خفیہ طور پر براہ راست امریکیوں سے تعلقات رکھتے تھے اور ان ہی کے بھائی نے مجلس خبرگان توڑنے کا اعلامیہ اپنے قلم سے تیار کیا تھا، چونکہ یہ لوگ جانتے تھے کہ امام اس منصوبہ کی مخالفت کریں گے، لہٰذا ان کا ارادہ یہ تھا کہ کابینہ سے منظوری لینے اور بیان شائع کرانے کے بعد امام خمینی، مجلس خبرگان اور عوام کو باخبر کریں گے لیکن اس منصوبہ میں وہ لوگ کامیاب نہ ہوسکے۔[1]

بہر حال مجلس خبرگان نے باوجودیکہ اس پر مختلف الزامات لگائے گئے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے اپنے کام کو جاری رکھا۔[2]

مجلس خبرگان کے اکثر افراد اپنی نمائندگی و وکالت اس بات میں جانتے تھے کہ دستور اساسی کو اسلامی احکام و اصول کی بنیاد پر استوار کریں اور جیسا کہ ہم نے دیکھا انہوں نے خود اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کیا، روش تحقیق معین کی اور پہلے سے معین شدہ مدت میں بھی مزید اضافہ کیا۔ اس مجلس کے اراکین نے دستور اساسی میں ایسے اصولوں کو شامل کیا جو دنیا کے کسی بھی دستور اساسی میں نہیں پائے جاتے۔ عارضی حکومت کے پیش کردہ مسودے میں بھی اس طرح کے اصول نہیں تھے۔ البتہ دستور اساسی سے متعلق ریفرنڈم کی کامیابی کے بعد اس سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ مجلس خبرگان کی وکالت و نمائندگی کی حدیں کون سی تھیں، اس لئے کہ مخالف افراد کے پروپیگنڈوں کے باوجود عوام نے مجلس خبرگان ہی کے تیار کردہ دستور اساسی کی حمایت کی تھی۔ یہ بات ممکن ہے کہی جائے (جیسا کہ کہی گئی) کہ ریفرنڈم میں شاید حکومت کی درخواست پر عوام نے مثبت جواب دیا ہے اور عام طور پر سوال ہی اس طرح پیش کیا جاتا ہے

---

[1] امام نے ان لوگوں کے مقابلہ میں پائیداری و ثبات قدم کا مظاہرہ کیا، جنہوں نے بارہا مجلس خبرگان کے کام کو معطل کرنا اور اسے توڑنا چاہا، منجملہ پہلی آبان ۱۳۵۸ء کو عوام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:
(بحوالہ جمہوری اسلامی، شمارہ ۱۲۱، مورخہ ۳ آبان ۱۳۵۸ء)
"تقریریں جاری ہیں، مضامین لکھے جارہے ہیں، قلم چل رہے ہیں اور جس کے دل میں جو کچھ آتا ہے وہ لکھ رہا ہے اور ۲ کروڑ سے زائد عوام پر اپنی رائے تھوپنا چاہتا ہے۔ جو لوگ آزادی اور ←

کہ عوام مثبت جواب دیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہر حال عوام کی رائے لینا ضروری ہے اور ہر حالت میں عوام کو اپنی رائے ظاہر کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ یہ کچھ لوگ اعتراض کریں اور عوام پر نادانی و جہالت کی تہمت لگائیں۔ یہ باتیں اوّل تو عوام کے اتفاق قول و رائے کی حقیقت کو نہیں بدل سکیں دوسرے یہ کہ اگرچہ ریفرنڈم کے نتائج حکومت کی رائے سے اکثر و بیشتر قریب و موافق ہوتے ہیں، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس ریفرنڈم کی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جس میں عوام نے حکومت کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فرانس کے چوتھے دستور اساسی کا مسودہ ۱۹۴۶ء میں پہلے ریفرنڈم کے دوران عوام کی جانب سے منسوخ قرار پایا اور حکومت نے نیا دستور اساسی مرتب کرنے کی غرض سے دوسری مجلس تشکیل دی تب کہیں جا کر دوسرے ریفرنڈم میں دستور اساسی منظور ہوا۔ تیسرے یہ کہ اکثر مواقع میں دستور اساسی منظور کرانے کے لئے صرف ریفرنڈم پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے، نہ مجلس خبرگان تشکیل دی جاتی ہے نہ مجلس مؤسسین کا نام و نشان ہوتا ہے۔ مجلس خبرگان اور اس کے اختیارات پر انگلیاں اٹھانے والے لوگ اس مجلس کے وجود سے قطع نظر صرف رائے عامہ ہی کو تسلیم کریں۔ یہی وجوہات تھیں جن کی بنا پر اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی نے تین مرحلوں میں عوام کی رائے حاصل کی تاکہ اگر کچھ لوگ کسی ایک مرحلہ پر اعتراض کریں تو باقی دو مرحلوں کے سامنے نہتے ہو جائیں اور ہر حال میں عوامی ماہیت باقی رہے اور عوام ہی کے ہاتھوں آخری فیصلہ ہو۔

آذر ۱۳۵۸ء کا ریفرنڈم

تیسرا ریفرنڈم ۱۲، آذر ۱۳۵۸ء کو انجام پایا جس میں مجلس خبرگان کے تیار کردہ دستور

← ڈیموکریسی کا نعرہ بلند کرتے ہیں، وہی چند لوگ جمع ہو کر کچھ طے کرتے ہیں اور اسے عوام پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ آج جب کہ مجلس خبرگان اکثریت آرا کے ساتھ معروف عمل ہے، میں دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ مجلس خبرگان کو توڑ دینا چاہیئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ کون ہیں ان کا کام کیا ہے اور مجلس خبرگان کیوں توڑی جائے؟ کیا اس لئے کہ یہ لوگ (اراکین مجلس خبرگان) عالم دین ہیں، اس لئے کہ یہ لوگ اسلام پر عقیدہ رکھتے اور احکام اسلام کو تدوین کر رہے ہیں، کیا

اساسی کو عوام نے منظور کیا، یہاں پر ہم اسی ریفرنڈم کے طریقۂ کار کا جائزہ لیں گے۔

مجلس خبرگان کا کام ختم ہونے کے بعد عوام کی اطلاع کے لئے سب سے پہلے دستور اساسی کو اتنی تعداد میں شائع کیا گیا کہ ہر فرد کم سے کم ایک نسخہ حاصل کر سکے، دوسرے یہ کہ بڑے اخبارات میں، ریفرنڈم سے پہلے دستور اساسی کا مکمل متن شائع کیا گیا، تیسرے یہ کہ دستور اساسی سے اچھی طرح واقف ہونے کے لئے مختلف جلسے اور سمینار منعقد ہوئے جن میں مجلس خبرگان کے بعض اراکین نے بھی بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔

ان سمیناروں میں سے ایک سمینار جو آذر ۱۳۵۸ کی تیسری تاریخ کو یونیورسٹی میں شروع ہوا، اس میں مجلس خبرگان کے صدر نے کہا:-

"یہ دستور، سو فیصد مثالی نہیں، لیکن مختلف افکار و خیالات کے تعاون سے یہ دستور مرتب ہوا ہے۔ کتاب خدا کے سوا دوسری ہر چیز میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔ دستور میں جزئی خامیوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کے حق میں رائے نہ دیں . . . . میں اپنے طور پر گواہی دیتا ہوں کہ مرتب شدہ دستور اساسی میں خلاف اسلام کسی چیز کا وجود نہیں۔"

ظاہر ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں سے کوئی بھی قانون سو فیصدی معیاری و مثالی نہیں ہو سکتا ہمیشہ ظاہر و آشکار یا ڈھکی چھپی خامیاں موجود ہوتی ہیں، اسی طرح

اس لئے کہ یہ لوگ ولایت فقیہ اور نظارت فقیہ کے قائل ہیں (یہ لوگ مجلس خبرگان توڑے جانے کے طرفدار) فقیہ کی نگرانی سے ڈرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فقیہ اقتدار کا مالک بن جائے گا، جب اقتدار ہوگا تو خلفشار پیدا ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے کہ مثلاً اقتدار وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہو، اقتدار صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں ہو۔ صرف عالم دین کے ہاتھ میں نہ ہونا چاہئے مغربی سامراج کا غلام ہو خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، کوئی حرج نہیں، منطق درحقیقت یہی ہے۔ لیکن اس کی صورت دوسری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تم دس، سو، ہزار افراد پر مشتمل ایک اقلیت ہو تمہیں یہ کہنے کا کیا حق پہنچتا ہے کہ عوام نے اسلامی جمہوریہ کو منظور تو کرلیا ہے لیکن نظام صرف جمہوری ہونا چاہئے اسلامی نہیں۔ یہ سو یا ہزار افراد پر مشتمل لوگ ایسی

دستور اساسی بھی اس فطری حالت سے خارج نہیں ہو سکتا تھا۔ وزارت داخلہ کا فریضہ تھا کہ وہ مجلس خبرگان کے تیار کردہ دستور اساسی پر ریفرنڈم کرلے۔ مختصر سی مدت میں دستور اساسی سے متعلق ریفرنڈم کا قانون منظور ہوا۔ اس قانون نے ریفرنڈم میں حصہ لینے کی شرطوں (ایرانی قومیت، حداقل سولہ سال کی عمر، اجتماعی حقوق سے عدم محرومیت) کو معین کیا۔ تہران میں تقریباً دو ہزار پولنگ اسٹیشن قائم ہوئے۔ پولنگ کے ایام اتوار اور پیر مورخہ ۱۲، ۱۳ محرم ۱۴۰۰ھ (۱۱ - ۱۲ آذر ۱۳۵۸ھ ش) مقرر ہوئے۔

ریفرنڈم دو سوال کے ذریعہ انجام پانا تھا "۱۔ مجلس خبرگان کے ——— دستور اساسی کی دفعات منظور ہیں؟ ہاں۔ ۲۔ مجلس خبرگان کے دستور اساسی کی دفعات منظور ہیں؟ نہیں۔" پہلا سوال سبز رنگ کے حروف اور دوسرا سوال سرخ رنگ کے حروف سے چھپا ہوا تھا اور یہ اس لئے مرتب کیا گیا تھا کہ شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے خواہ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ ہوں، وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں اور ان پڑھ افراد کو پڑھے لکھے افراد کی مدد لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ سب ملا کر تقریباً اٹھارہ ہزار پولنگ اسٹیشن ملک بھر میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ریفرنڈم کی مرکزی کمیٹی وزارت داخلہ میں تشکیل ہوئی۔ ریفرنڈم کی منتظمہ کمیٹی ہر شہر میں مجسٹریٹ کی صدارت اور علاقے کے سربراہ عدلیہ، ڈائرکٹر تعلیم و تربیت ڈائرکٹر رجسٹریشن آفس، علاقے کے پانچ مجاہد افراد جن میں ایک عالم دین، ایک مزدور یا کسان

کونسی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک ملت کے مقابلے میں اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں؟ مجلس خبرگان کو عوام نے مقرر کیا ہے، اراکین نے اکثریت کی حمایت حاصل کی ہے، جبکہ دوسرے لوگ اقلیت میں تھے۔ اب جبکہ یہ روشن فکر اور ڈیموکریسی کے دعویدار افراد اقلیت میں شمار کئے جاتے ہیں کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکثریت کی بات منظور نہیں مجلس کو توڑ دینا چاہئے۔؟ یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم جو آزادی کا دعویٰ کرتے ہو۔ اب تم ہی یہ کہہ رہے ہو کہ عوام نے آزادی کے ساتھ رائے نہیں دی ہے، عوام اپنے نمائندے انتخاب کرنے میں آزاد نہ تھے۔ تم لوگوں نے یہ بات انتخابات کے موقعہ پر تو نہیں کہی تھی، عوام خود اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے آزادی کے ساتھ رائے دی ہے۔ یہ لوگ

ایک کسی تعلیمی ادارہ یا یونیورسٹی سے وابستہ، ایک ٹریڈ یونین کا نمائندہ اور ایک خانہ دار خاتون کی رکنیت کے ذریعہ تشکیل پاتی تھی۔

ریفرنڈم کی منتظر کمیٹی ابتدائی جلسے میں صوبے کے ایسے پچیس افراد کو جنتی جو ووٹ دینے کی شرطوں پر پورے اترتے تھے اور مجسٹریٹ کی طرف سے انہیں دعوت دی جاتی۔ یہ پچیس افراد سات افراد کو مرکزی نگران کمیٹی کے اصلی ارکان کے طور پر اور سات کو متبادل کی حیثیت سے انتخاب کرتے، اصلی نمائندے اپنے درمیان سے ایک صدر، ایک نائب صدر اور تین سکریٹریوں کو انتخاب کرتے۔

اس ریفرنڈم کی نوعیت بالکل اسی طرح کی تھی جو فروردین میں حکومت کی نوعیت معین کرنے کے لئے ہوا تھا اس اعتبار سے تھوڑا بہت تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ ریفرنڈم سے متعلق یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ اگر کچھ لوگوں کو ایک دفعہ یا کچھ دفعات منظور نہ ہوں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ کیا ووٹ نہ دیں؟ کیا کوئی ایسا دستور اساسی مرتب کیا جا سکتا ہے جسے سب منظور کریں؟ کیا بے عیب و نقص دستور اساسی مرتب کرنا ممکن ہے؟ اگر یہی طے پائے کہ ہر ایک کسی نہ کسی ایک دفعہ کی وجہ سے ووٹ نہ دے تو کوئی بھی ریفرنڈم کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کو دستور اساسی کا مجموعی اعتبار سے جائزہ لینا چاہئے۔ اگر کلیات منظور ہوں، ووٹ دیں۔ جیسا کہ مجلس خبرگان میں سبھی ممبران تمام دفعات کے موافق نہ تھے یا

سوچتے ہیں کہ اگر مجلس توڑ دی ہو جائے گی تو دوبارہ انتخابات ہوں گے۔ اگر سو مرتبہ بھی انتخابات ہوں گے تو لوگ اپنے علماء ہی کو انتخاب کریں گے۔ اگر مجلس توڑ بھی دی جائے تب بھی لوگ ان ہی افراد کو انتخاب کریں گے جو مغرب زدہ نہیں بلکہ متدین و اسلام شناس ہیں۔

یقین مان لو جس طرح تم لوگ سوچتے ہو اس طرح نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ مجلس توڑی نہیں جائے گی اور نہ عوام کے سوا اسے توڑنے کا کسی کو حق ہے، دوسرے یہ کہ اگر مجلس توڑی جائے تو ایک موقع اب بھی آسکتا ہے کہ تم لوگ یہ کہنے پر آمادہ ہو جاؤ کہ ہمیں قانون نہیں چاہئے جبکہ یہ بات کہنے کا تمھیں حق نہیں۔ کبھی یہ کہو گے کہ قانون چاہئے، قانون عوام وضع کریں گے

کچھ لوگ ایسی دفعات کو منظور کرانا چاہتے تھے جن پر بحد کافی ووٹ نہیں پڑے، لیکن مجموعی اعتبار سے یہ لوگ آراء اکثریت کے سامنے تسلیم ہوئے۔ اگرچہ مجلس خبرگان اور ریفرنڈم کی درمیانی مدت میں لوگوں کے لئے وضاحت دی جاچکی تھی لیکن پھر بھی کوئی بیس فیصد لوگ جو ووٹ دے سکتے تھے، انتخابات میں شریک نہ ہوئے۔ البتہ سو فیصد شرکت کی توقع بھی نہیں تھی، لیکن ممکن ہے کہ انھیں قسم کے سوالوں نے کچھ لوگوں کی عدم شرکت کے اسباب فراہم کئے ہوں، جیساکہ بعض گروہوں نے لوگوں کے شریک نہ ہونے کے لئے کوششیں بھی کیں اور جن دفعات کے بارے میں انہیں ذرّہ برابر علم ہوا کہ لوگ پسند نہیں کریں گے، بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر قیادت و رہبری سے متعلق دفعات کو ڈکٹیٹرشپ کے عنوان سے یاد کیا گیا، اسلامی استحکام کو رجعت پسند سیاست کی بنیاد کا نام دیا گیا اور اہل سنت ایرانی حضرات کو ووٹ دینے سے روکنے کے لئے تشیعوں سے متعلق عبارتوں کو ابھار کر پیش کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔" جن گروہوں نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا ان کے نام مورخہ ۱۳ آذر ۱۳۵۸ء کے جرائد و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔"

ریفرنڈم کی تائید میں قائد انقلاب کا پیغام:

امام خمینی نے ایک پیغام کے ذریعہ عوام کو ریفرنڈم میں حصہ لینے کی دعوت دی اور

مجلس مؤسسین ہونی چاہئے، عوام اپنے دین دار علماء انتخاب کریں گے، پھر بھی تمھیں غم منانا پڑیگا اس لئے کہ تمہارا وجود نہ اس مجلس میں ہے اور نہ مجلس مؤسسین میں ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس ملت و عوام نے یہ نعرہ بلند کیا ہو کہ ہم اسلام چاہتے ہیں اور وہ اسے حاصل کرنے کے لئے طے کر چکے ہوں، جب فیصلہ یہی ہو تو سو بار بھی اگر تم لوگ درہم برہم کرنا چاہو۔ جو نہیں کر سکتے، پھر بھی عوام اسلام ہی کو چاہیں گے، ہاں یہ بات اور ہے کہ تم اتنا پروپیگنڈہ کر لو کہ تمام لوگ اسلام سے منحرف ہو جائیں تب کہیں جا کر بازی تمہارے ہاتھ آسکتی ہے۔ لیکن جب تک یہ عوام اسلام اور اسلامی جمہوریہ کا دم بھرتے ہیں اس وقت تک یہ بات بے معنی نظر آتی ہے کہ اقلیت

چونکہ یہ پیغام مؤثر واقع ہوا لہٰذا ہم اس کا مکمل متن قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بھائیو اور بہنو! محرم ایک ایسا مہینہ ہے جس میں اسلام نے مجاہدوں اور مظلوموں کے خون کے ذریعہ نئی زندگی پائی اور بنی امیہ جیسے فاسد و مفسد عناصر کی سازشوں سے چھٹکارا پایا، جنہوں نے اسلام کو تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا۔ شروع سے اسلام کی بقاء و پائیداری شہیدوں اور مجاہدوں کے خون کی رہین منت رہی ہے۔ ہمارے ملک میں اسلام تباہی و بربادی کی لپیٹ میں آرہا تھا کہ ہمارے شہیدوں کے خون نے اسے نئی زندگی بخشی اس وقت جبکہ بحمد اللہ دستور اساسی مرتب ہو کر علماء و روشن فکر افراد کی منظوری حاصل کر چکا ہے، وہ سازشی عناصر جو اپنے قلم و عمل کے ذریعہ یہ چاہتے تھے کہ "اسلامی جمہوریہ" عوام کی منظوری حاصل نہ کر سکے آج اسے بار آور ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے۔ دستور اساسی اسلامی جمہوریہ ایران کا عظیم ترین ثمرہ ہے، اس کے حق میں ووٹ نہ دینے کا مطلب شہیدوں کا خون رائیگاں کرنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کے کہنے میں آکر ووٹ دینے نہ جائیں۔ اسلام اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ کسی ایک قابل حل مسئلہ کی خاطر اسے اساس ہی سے بھلا دیا جائے۔ اگر کوئی خامی رہ بھی جاتی ہے تو ممکن ہے کہ تکملہ

اکثریت پر اپنے نظریات تھوپے۔ یہ بات ڈیموکریسی کے خلاف ہے جس کا تم ڈنکا بجاتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ آزادی وانسانیت کے خلاف ہے کہ کچھ لوگ اکثریت پر اپنی رائے تھوپیں۔ یہ بات عین اسی طرح ہے جس طرح سے رضاخان کے دور میں کچھ لوگ طاقت کے بل بوتے پر عوام پر حکومت کیا کرتے تھے۔

جو لوگ ملک و عوام کی نسبت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، انھیں یہ بات جان لینا چاہئے کہ جس سمت میں یہ سیل خروشاں رواں ہے اسی سمت میں انھیں بھی چلنا پڑے گا ورنہ مخالف سمت میں چلنے کی کوشش کریں گے تو چکنا چور ہو جائیں گے۔ یہ لوگ یہ سوچیں کہ عوام

یں (جو مدنظر رکھا گیا ہے) درست کر دی جائے۔ کرد، عرب، بلوچ اور ترکمن بھائیوں اور عوام کے طبقہ کو یہ جاننا چاہیئے کہ اسلام ہم سب کا ہے اور سب کے لئے مفید ہے۔ انشاء اللہ اسلامی جمہوریہ تمام خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گی وہ عناصر جو ادھر اُدھر اور خاص طور پر کردستان و برادران اہل سنت کے علاقوں میں ریفرنڈم کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں وہ آپ کے دوست نہیں، آپ سے اور آپ کے ملک سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ آپ حضرات کو اس شرعی ذمہ داری سے باز نہ رکھنے پائیں، دوبارہ آپ کو آپ کے بھائی کا دشمن نہ بنانے پائیں۔
میں استصواب رائے کے موقع پر مثبت رائے دوں گا اور اپنے تمام بھائی بہنوں سے خواہ وہ کسی بھی طبقے یا مسلک سے تعلق رکھتے ہوں درخواست کرتا ہوں کہ اس سرنوشت ساز دستور کے حق میں مثبت رائے دیں عزیزان من! آج جب کہ ہمارا مقابلہ ایک شیطانی قوت سے ہے جو ہمارے ملک کو تباہ کرنا چاہتی ہے آپ کو چاہیئے کہ اسلامی جمہوریہ کی بنیاد کے کمزور ہونے اور دشمن کو ہنسنے کا موقع نہ دیں۔ خداوند متعال سے عظمت اسلام و مسلمین اور آپ سب حضرات کی توفیق کا طالب ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ،

۱۰ آذر ۱۳۵۸ روح اللہ الموسوی الخمینی

پیغام امام خمینی، محتاج تفسیر نہیں ہے۔ ہمیشہ کی طرح فیصلہ کن، مستحکم، نتیجہ خیز اور اس کا فوری اثر، پولنگ اسٹیشنوں کی طرف لاکھوں ایرانیوں کا ہجوم تھا۔

کچھ نہیں جانتے' وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں .... آج عوام میں سے ہر فرد جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اگر اسی ولایت فقیہ پر جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم نے جملہ امور پر نظارت کے لئے جامع الشرائط ولی فقیہ کو مقرر کیا ہے ریفرنڈم کرایا جائے تو اتنے ہی ووٹ ڈالے جائیں گے جتنے پہلے پڑے ہیں عوام کی چاہتیں ہیں بلاوجہ ہاتھ پیر مارنے کی کوئی ضرورت نہیں .... یہ بات کبھی نہ سوچیں کہ اسلام میں جبر ہے یا علماء دین جابر ہیں یا ڈکٹیٹر ہیں ان چیزوں میں سے ۔ یہ باتیں قطعی نہیں، ڈکٹیٹر شپ وغیرہ کا شائبہ و گمان بھی نہیں ۔ تم لوگ زبردستی نہ کرو، ہمارے عوام ڈکٹیٹر ہیں نہ ہمارے علماء دین۔"
۲۔ مولف کے کچھ طبقوں کو مجلس کے خلاف تیار کرنا، مخالفوں کی سازشوں کی ایک کڑی تھی جس میں خواتین کو اس بنیاد پر

وزارت داخلہ کے اعداد و شمار کے مطابق، کل ۲ کروڑ افراد ووٹ دینے کے قابل تھے جس میں سے ایک کروڑ ستاون لاکھ، اٹھاون ہزار نو سو چھپن (۱۵,۷۵۸,۹۵۶) افراد نے دستور اساسی سے متعلق ریفرنڈم میں شرکت کی، یعنی ۷۹ فیصد افراد نے ریفرنڈم میں حصہ لیا۔ مثبت آراء کی کل تعداد ایک کروڑ چھپن لاکھ اسی ہزار تین سو انتیس (۱۵۶۸۰۳۲۹) اور مسترد ووٹوں کی کل تعداد ایک سو گیارہ (۱۱۱) تھی۔ اس اعتبار سے ساڑھے ننانوے فی صد ووٹ مثبت اور نصف فیصد منفی تھے۔

اس طرح ایران ایک ایسے دستور اساسی کا مالک ہوا جسے عوام نے منظور کیا تھا، یہ دستور عوام وحکومت کے داخلی وخارجی تعلقات و روابط کی بنیاد قرار پایا۔ یہ وہی دستور ہے جس کے مختلف پہلوؤں کا ہم جائزہ لیں گے۔

مجلس خبرگان کی تشکیل کے دلائل

قائد انقلاب نے مجلس خبرگان کی تشکیل پر کیوں اتنا اصرار کیا، جبکہ "مجلس مؤسسین" کا نام عارضی حکومت کے فرائض میں شامل تھا؟ درج ذیل دلائل مسئلہ کو واضح کر سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ "مجلس مؤسسین" وہ مجلس ہے جس کے اراکین عوام کے ذریعے منتخب ہوئے ہوں۔ مجلس خبرگان بھی عوامی انتخابات کے ذریعہ تشکیل پائی، لهٰذا عوامی

کران کے حقوق قانون نے ضائع کئے ہیں، بھڑکانا بھی شامل تھا، اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے مجلس خبرگان نے ایک اعلان جاری کیا اور خود امام نے اپنے فتوے کو بیان کیا ہے، ہم دونوں کو اہمیت کے پیش نظر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ۸ آبان ۱۳۵۸ کو صادر شدہ مجلس خبرگان کا بیان حاضر خدمت ہے:

"بسمہ تعالیٰ ــــ ایک نامعلوم گروہ کی جانب سے نشر ہونے والے بیان کے مطابق مجلس خبرگان پر الزام لگایا گیا ہے کہ شادی بیاہ طلاق اور حقوق زن و مرد کے سلسلے میں خواتین کے خلاف قانون منظور ہوا ہے۔ تمام انقلابی و آگاہ خواتین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ بھی انہی پروپیگنڈوں کی ایک قسم ہے جسے آجکل انقلاب مخالف عناصر عوام میں اضطراب و بے چینی

نمائندگی کی حیثیت سے مجلس مؤسسین سے کوئی مختلف چیز نہیں۔

دوسرے "مجلس مؤسسین" تشکیل پانے کا مقصد بنیادی اصول و قوانین وضع کرنا ہے، اور مجلس خبرگان کے سلسلے میں یہ بات سو فیصد نہیں کہی جا سکتی۔ مجلس خبرگان کو کوئی چیز ایجاد و ابداع نہیں کرنا تھی، کیونکہ عوام نے اسلامی جمہوریہ کو منظور کر لیا تھا لہٰذا اسلامی اصول و قوانین ہی کو نافذ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا مجلس خبرگان کا فریضہ صرف یہ مشخص کرنا تھا کہ کون سے اصول، اسلام کے مطابق ہیں، کون سے مخالف اسلام ہیں اور کون سے قوانین، اسلامی اصول و ضوابط کے منافی نہیں۔ نتیجۃً اس کا کام ایجاد و ابداع نہ تھا بلکہ اکٹھا کرنا، تحقیق کرنا اور قوانین کو منظم و مرتب کرنا تھا۔

تیسرے یہ کہ ایسا کوئی ضابطہ و قانون نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مجلس مؤسسین یا مجلس خبرگان کے اراکین کی تعداد اس قدر یا اس قدر ہونا چاہئے یا فلاں مقدار سے کم یا زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ لہٰذا اراکین کی تعداد کے لحاظ سے مجلس مؤسسین و مجلس خبرگان کے درمیان کسی فرق کے قائل نہیں ہو سکتے۔

چوتھے، جیسا کہ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے تھے اور اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ مجلس مؤسسین کے اراکین کا انتخاب تمام گروہوں کے درمیان سے ہونا چاہئے اور چونکہ مجلس

پیدا کرنے کے لئے پھیلا رہے ہیں۔ جو لوگ ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ مجلس خبرگان کی کارروائی سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس طرح کے موضوعات مجلس خبرگان کے زیر بحث نہیں آئے ہیں اور بنیادی طور پر مجلس خبرگان کا کام دستور اساسی کی تدوین ہے نہ کہ شہری قوانین وضع کرنا، یہ کام پارلیمنٹ کے فرائض میں شمار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے تمام ہوشیار و بیدار بہنوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے سیاسی و اسلامی شعور کے سہارے ہر طرح کی سازشوں کو ناکام بنائیں اور اتحاد و یکجہتی کے ساتھ اسلامی انقلاب کو

برگان کے اراکین تمام گروہوں سے تعلق نہیں رکھتے لہٰذا یہ مجلس سب کی نمایندگی نہیں کرتی اور
س اعتبار سے وہ مجلس مؤسسین سے مختلف ہے۔ یہ ایک بے بنیاد دلیل تھی، اس لئے کہ ہر طرح
کے انتخابات میں عوام کی رائے بنیاد ہوتی ہے نہ کہ گروہ وجماعت کی موجودگی۔ عوام سے
ہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ہر گروہ وجماعت کے حق میں ووٹ دیں۔ جس پارٹی، گروہ یا جماعت
و زیادہ ووٹ ملیں گے اس کے نمائندے سے منتخب ہوں گے، لیکن ممکن ہے کہ عوام کسی بھی پارٹی
کو ووٹ نہ دیں اور ایسے افراد کو چنیں جو کسی پارٹی سے وابستہ نہ ہوں اس صورت میں بھی
عوام پر کوئی شخص انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ معترضین کو یہ گمان تھا کہ اگر مجلس مؤسسین کے اراکین
میں اضافہ ہوگا تو کچھ سیٹیں انہیں بھی مل جائیں گی لیکن یہ تصور بھی غیر معقول ہے، اس لئے
کہ ایسی صورت میں ان سے بھی چھوٹی جماعتیں یہ دعویٰ کرنے لگتیں کہ اگر اراکین کی تعداد مزید
زیادہ ہوتی تو وہ بھی کچھ حصہ لے سکتی تھیں، اس طرح اراکین مجلس مؤسسین کی تعداد کسی بھی
حد تک پہنچ کر محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے کہ فرضاً اگر کوئی مجلس دس ہزار نمائندوں کے
ذریعہ بھی تشکیل پاتی، تب بھی ان گروہوں کے وجود کا تصور باقی رہتا جو رکنیت سے محروم رہے۔
پانچویں مہارت وصلاحیت کی تشخیص عوام کے ذمے تھی۔ وہ ماہر یا غیر ماہر افراد کو انتخاب
کرنے کا حق رکھتے تھے۔ امام خمینی کی خواہش یہ تھی کہ عوام اسلام شناس افراد کو انتخاب کریں تاکہ
وہ اسلامی جمہوریہ کے اصول و دستور تدوین کریں۔ یہ شرط نہیں عائد کی گئی تھی کہ صرف

پائیدار و مستحکم بنانے کی کوشش کریں —— "مجلس خبرگان"
حقوق خواتین کی پامالی سے متعلق پروپیگنڈہ امام خمینی سے استفتاء کا سبب بنا کہ طلاق کا اختیار
مرد کے ہاتھ میں ہونے سے ایران کی مجاہد خواتین میں بے چینی واضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور
اس بات نے ان کے احساسات کو مجروح کیا ہے، وہ یہ سوچتی ہیں کہ انہیں کسی بھی قیمت پر طلاق کا حق نہیں
جبکہ کچھ لوگوں نے اس مسئلے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں، اس مسئلہ کی نسبت جناب کی رائے
کیا ہے؟ امام خمینی نے درج ذیل جواب مرقوم فرمایا:۔
"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ شارع مقدس نے محترم خواتین کے لئے نہایت آسان طریقہ معین کیا ہے

علمائے دین ہی کو انتخاب کریں، انتخاب کرنا عوام کے اختیار میں تھا۔ وہ اگر چاہتے تو کسی بھی عالم دین کو انتخاب نہ کرتے اور تمام نمائندے غیر عالم ہوتے جیسا کہ بعض ایسے افراد بھی انتخاب ہوئے جو عالم دین نہ تھے۔ لہٰذا اگر عوام نے امام کی خواہش کا احترام کیا تو اس بھروسے و اعتماد کے تحت کیا جو انھیں اپنے مرجع تقلید پر تھا۔ ورنہ وہ ہر طرح سے آزاد تھے انھیں کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔

کس نوعیت کی مجلس خبرگان درکار تھی۔

دستور اساسی کی تدوین میں اسلامی نظریات کا بہت خیال رکھا گیا اور بنیادی طور پر اسلام محور قرار پایا۔ اکثر و بیشتر ایرانی عوام کا یہ عقیدہ ہے کہ ملکی سیاست کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر استوار ہونی چاہئے۔ یہ عقیدہ دن بدن لوگوں میں راسخ ہوتا گیا کہ جو ملک اپنا تشخص حاصل نہ کرے گا وہ خواہ نخواہ کسی نہ کسی بڑی طاقت کی گود میں جا پڑے گا۔

جب کوئی ملک مغربی ڈیموکریسی کا دلدادہ ہوتا ہے تو لاشعوری طور پر سب سے طاقتور مغربی قوت کا پٹھو بن جاتا ہے، اور اگر مشرقی حکومتوں کی جانب رجحان ہوتا ہے تب بھی وہ اپنا استقلال محفوظ رکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایسا ملک آخر کار خاص شرائط کے تحت وابستہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا "نہ شرقی نہ غربی" نعرے کی قوت میں اضافہ ہوا۔ استدلال پیش کیا جاتا تھا کہ اگر

تاکہ وہ طلاق کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ سکیں اور وہ اس طرح سے کہ عقد و نکاح کے موقعہ پر بطور مطلق یہ شرط رکھیں کہ وہ شوہر کی طرف سے وکیل ہیں کہ جب چاہیں طلاق دے دیں یا پھر بطور مشروط وکالت لیں کہ مثلاً اگر مرد بد سلوکی کرے یا دوسری شادی کر لے اس وقت وہ خود کو طلاق دے سکتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی مشکل خواتین کے لئے پیش نہیں آئے گی اور وہ خود کو طلاق دے سکیں گی۔ خداوند متعال سے دعا کرتا ہوں کہ محترم خواتین کو توفیق عنایت فرمائے۔ امید ہے کہ وہ اسلام و انقلاب مخالفین کے افکار و خیالات سے محفوظ رہیں گی۔ اسلام سب کے لئے فائدہ مند ہے۔ ۷ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ / ۷ آبان ۱۳۵۸ ش
روح اللہ الموسوی الخمینی"

ں کے ماسوا کوئی اور بات کی جاتی تو اصلی مقصد فراموشی کے سپرد ہو جاتا، جیسا کہ بعض انقلابی
ممالک کو اس طرح کی سرنوشت سے دوچار ہونا پڑا اور کسی نہ کسی طاقت سے وابستہ ہو گئے۔
ڈا ہوچیا اتنی مجاہدت و کوششوں کے باوجود چین کے زیر اثر آگیا اور ویٹنام کئی سال جدوجہد کرنے
کے بعد روس کی گود میں جا پڑا، اس طرح کی مثالیں ہمارے سامنے بے شمار ہیں۔

اسلامی جمہوریہ کے دستور اساسی کی تدوین سے متعلق یہ استدلال پیش کیا جاتا تھا کہ
سوشلسٹ، اسلامیات کا ماہر نہیں ہو سکتا، نیشنلسٹ اور قوم پرست عقیدت و احترام کے
ساتھ اسلامی اصولوں کی تدوین میں حصہ نہیں لے سکتا جو خدا پر یقین نہیں رکھتے وہ کس طرح
اسلامی جمہوریہ کے قوانین مرتب کر سکتے ہیں؟ کیا جن ملکوں میں کمیونزم نافذ کیا گیا ہے ان میں
اسلامیات کے ماہرین پر بھروسہ کیا جاتا ہے؟ دستور اساسی کا تعلق اس اکثریت سے ہے
جس نے انقلاب برپا کیا ہے، وہ اکثریت جسے اپنے تعلقات اسی کے دائرے میں رہتے
ہوئے قائم کرنا چاہیئے۔

گذارش :

بفضلہ تعالیٰ مجلہ توحید نے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ قارئین کرام توحید کی خدمتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا سالانہ زرِ اشتراک جلد از جلد روانہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ نیز حقیقت حال سے مطلع کرنے کیلئے ایک خط سے ضرور نوازیں۔ بہت سے لوگوں کے نام اور پتہ میں اصلاح کی ضرورت ہے لہٰذا خط لکھتے وقت اپنا پورا نام اور پتہ صاف صاف ضرور تحریر فرمائیں۔

ادارہ

اسلامی، علمی، فکری، دو ماہی رسالہ

توحید

[illegible]

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

- قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل تلاش کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب کو ثابت پر گفتگو۔

ارباب فکر و صاحبان قلم سے تعاون کی التماس ہے

بدل اشتراک

ملک	زر سالانہ	
ایران	۱۵۰	ریال
پاکستان	۱۵	روپے
ہندوستان	۱۵	روپے
بنگلہ دیش	۱۵	ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸	درہم
سعودی عرب	۸	ریال
قطر	۸	ریال
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	۴	[illegible]
برطانیہ	۲	[illegible]
امریکہ	۴	ڈالر
کینیڈا	۴	ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۰۰۰۲۸۵۰
سازمان تبلیغات اسلامی [illegible]
[illegible]
[illegible]

توحید

اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد (۴) شمارہ (۲)

ترتیب



مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

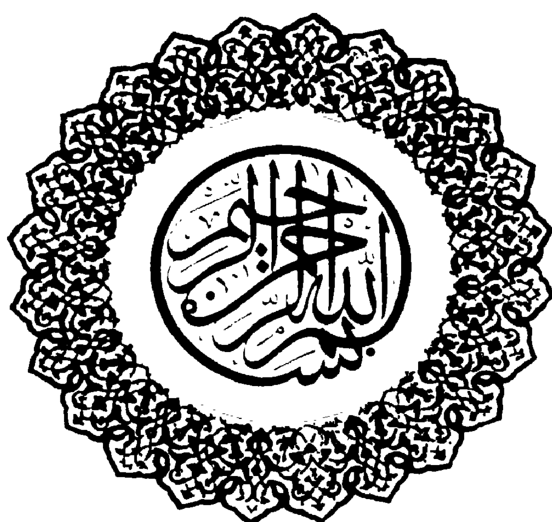


فون : ۲۴۵۸۴

رجب، شعبان ۱۴۰۷ھ / مارچ، اپریل ۱۹۸۷ء

فکر و فلسفہ :

فقہ و قانون :



شذرہ

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

مجاہدین اسلام کے پے در پے کامیاب حملوں نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے، خاص طور سے کربلا ۵ آپریشن نے۔ بصرہ، شلمچہ محاذ پر دشمن کو اپنے استحکامات پر بڑا ناز تھا، بارودی سرنگیں، صف در صف خاردار تاروں کی باڑھیں، لمبی چوڑی آہنی دیواریں، ہزاروں میٹر چوڑی آبی خندقیں... خدا سے غافل دشمن کو یقین دلا رہی تھیں کہ یہ ایسے ناقابل تسخیر قلعے ہیں جن میں دنیا کی کوئی طاقت شگاف نہیں ڈال سکتی۔

حقیقت بھی یہی ہے، بعثیوں نے اسلامی فوج کے قدم روکنے کے لئے، مشرقی و مغربی طاقتوں کے تعاون سے جو استحکامات ایجاد کئے تھے، تاریخ جنگ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ سامراجی پروپیگنڈا مشینری نے بھی اس کی خوب پبلسٹی کی تھی، مقصد مجاہدین فی سبیل اللہ کے حوصلے پست کرنا تھا، لیکن:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اس قسم کے استحکامات دیکھ کر مادی وسائل کے بھروسے لڑنے والی فوج کے قدم ضرور لڑکھڑا سکتے ہیں، ان کے لئے یہ قلعے ناقابل تسخیر ہو سکتے ہیں، لیکن حکم الٰہی کی خاطر لڑنے والے مجاہدوں، خدائی طاقت پر بھروسہ کرنے والے سپاہیوں اور حیدری جاں بازوں کے سامنے، یہودی ہاتھوں کے بنائے یہ خیبری قلعے بچوں کا کھیل ہیں، اگر کل، یہودیوں کو قلعہ خیبر نے دست علیؑ سے بچا لیا ہوتا تو آج یہودی نوازوں کو بھی یہ قلعے علیؑ والوں کے ہاتھوں سے بچا لیتے۔ جو انجام کل ہوا تھا وہی آج بھی ہو گا۔

اگر یہودیوں کے دست پروردہ مسلمان نما بعثیوں نے قرآن مجید کا سطحی نگاہوں سے بھی جائزہ لیا

ہوتا تو وہ ان مجاہدین فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں ان قلعوں کو ناقابل تسخیر تصور نہ کرتے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (بقرہ / ۲۴۹)

کتنے ہی چھوٹے گروہ بڑے گروہوں پر غالب آگئے، کتنے ہی کمزور و ناتواں لوگ طاقتوروں پر کامیاب ہوگئے اور قرآن مجید اس فتح و غلبہ کا سبب صبر و ایمان بتاتا ہے:

ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مأتین (انفال / ۶۵)

بیس، صابر و ثابت قدم مومن، دو سو پر غالب آسکتے ہیں۔ یہ سنت الٰہیہ ہے۔ ابدی قانون ہے، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے، ایک ثابت قدم مومن، دس دشمنوں کو شکست دے سکتا ہے، یعنی خون شمشیر پر غالب آسکتا ہے، مٹھی، گولی کا جواب بن سکتی ہے، بندوق، ٹینک کا مقابلہ کر سکتی ہے، معمولی اسلحہ رکھنے والے مجاہدین، جدید ترین اسلحوں سے لیس فوج کو شکست دے سکتے ہیں۔ شرط صرف ایمان و ثبات قدم کی ہے۔ ایران و لبنان کے صابر (ثابت قدم) و مومن عوام اس کی زندہ مثال ہیں۔

ایرانی مجاہدوں کا وہ امتیاز جس کے دوست و دشمن سبھی قائل ہیں وہ ان کا صبر و ایمان ہے جسے اپنے اور پرائے مختلف زبانوں میں بیان کرتے ہیں۔ دوست صبر و ایمان سے تعبیر کرتے ہیں اور دشمن "جنون و بنیاد پرستی" سے۔

ایران و لبنان کے صابر و مومن عوام، دنیا کے لئے دعوت فکر اور حقانیت قرآن کی دلیل ہیں، دشمنوں کیلئے عبرت اور دوستوں کے لئے نصیحت ہیں، عالمی استکبار کو اب یقین کر لینا چاہئے کہ ان کے جدید ترین بھیانک اسلحوں کو ناکام بنا دینے والی بھی ایک چیز موجود ہے۔ سامراجیوں کے پنجۂ ظلم میں اسیر مستضعفین کو بھی یہ باور کر لینا چاہئے کہ یہ طاقتیں ناقابل شکست نہیں ہیں۔ اللہ کا نام لے کر اٹھیں، کامیابی ان کے قدم چومے گی، صبر و ایمان کے اسلحہ سے لیس ہوں، یہ تمام اسلحے تار عنکبوت ثابت ہوں گے۔

وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت (عنکبوت / ۴۱)



گذشتہ ماہ تاریخ میں شرمناک ترین باب کا اضافہ ہوا، شرمناک صرف اس لئے نہیں کہ بعثی وحشیوں نے علی الاعلان شہری آبادیوں پر حملہ کیا، اسکولوں، ہسپتالوں، مسجدوں اور مقدس مقامات پر وحشیانہ بمباری کی، ہزاروں بے گناہوں کو شہید، زخمی، بے گھر کر دیا، بلکہ شرمناک اس لئے کہ مدرسوں پر بمباری

ہوتی رہی اور دنیا دیکھتی رہی، ہسپتال تباہ ہوگئے اور دنیا نے کچھ نہیں کہا، مسجدیں منہدم ہوئیں اور دنیا خاموش رہی، ہزاروں بچے، بوڑھے، عورتیں بے دردی سے شہید ہوئیں اور دنیا کچھ نہ بولی، اقوام متحدہ خاموش تماشا دیکھتی رہی، سلامتی کونسل نے اپنی بے جا خاموشی سے مجرم کو شاباشی دی، انسانی حقوق کے علمبرداروں نے اپنے کان آنکھ بند کرلئے، "خادم الحرمین" مسجدوں کا انہدام دیکھا کئے اور چپ رہے، بلکہ اس کے انہدام میں مدد بھی دی۔ نظام مصطفیٰ[ص] کے دعویدار بھی کچھ نہ بولے، اہنسا کے پرچارک بھی منہ پر تالا لگائے بیٹھے رہے۔ ان میں تو اتنی بھی شرم و حیا نہیں جتنی ان عراقی پائلٹوں میں تھی جن کا جہاز مار گرایا گیا اور انھیں اسیر کرکے وہ مقامات دکھائے گئے جو ان کی بمباری سے تباہ ہوئے تھے تو وہ شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ جب شہر میانہ کے اس سکول کو دکھایا گیا جس میں بعثیوں کی بمباری سے اسّی معصوم طالبات شہید ہوئی تھیں تو عراقی پائلٹ نے کہا "اے کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں دفن ہوجاتا یہ نہایت شرمناک منظر ہے۔"

لیکن اسی کے مقابلہ میں تاریخ میں ایک قابل فخر باب کا بھی اضافہ ہوا ہے کہ ایک قوم کا سر جھکانے کیلئے اس پر شدید ترین مظالم کئے گئے، بدترین اذیتیں دی گئیں مگر اس نے سر کٹانا منظور کرلیا، سر جھکانا گوارا نہ کیا، بمباری کے بعد ملبہ کے نیچے سے جب کوئی نیم جان زخمی نکلتا تھا تو مسکرا کر یہی کہتا تھا "جنگ جنگ تا پیروزی" آخری فتح تک جنگ جاری رہنی چاہئے، نہ اپنے گھر کی ویرانی کی پرواہ، نہ اعزہ و اقربا کی شہادت کا غم، جس شہر پر جتنی شدید بمباری ہوئی وہاں سے "انتقام ثاربین" کی شکل میں اتنے ہی زیادہ مجاہدین محاذ پر گئے۔ بعثی سفاک، اس درندگی سے ایک لاکھ مجاہدوں پر مشتمل "سپاہ مہدی[عج]" کی روانگی روکنا چاہتے تھے، لیکن اس کی تمام کوششوں کے باوجود صرف دس دنوں میں ایک لاکھ تیس ہزار مجاہدین محاذ پر گئے، یعنی منصوبہ سے تیس ہزار زائد۔

۲۲ بہمن (۱۱ فروری) یوم انقلاب کو یوم حمایت جنگ قرار دیا گیا تھا، عوام اس مظاہرے میں شریک ہونے کے لئے بڑے پیمانے پر تیاری کر رہے تھے، بعثی فوج اپنی وحشیانہ بمباری کے ذریعہ عوامی مظاہرہ کو روکنا چاہتی تھی لیکن قابل فخر و تقلید مسلمانوں نے اس کی دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر مظاہرے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اتنا عظیم مجمع جس کی مثال نہیں ملتی، وہ بھی ہر شہر و دیہات میں۔ مظاہرہ اس وقت اوج پر پہنچا جب عراقی بمبار طیارے نمودار ہوئے، طیارہ شکن توپوں اور عراقی جہازوں کی بمباری سے زمین ہل رہی تھی، لیکن ایسے میں پُر جوش و باولولہ عوام کے نعرۂ شہادت کی آواز ہر آواز پر غالب آگئی، مرد و زن،

بچے بوڑھے، پیرو برنا، نہ خوف نہ ہراس نہ بھگدڑ نہ فرار، ہر طرف بھنچی ہوئی مٹھیاں تھیں اور یہ نعرہ:۔

حسین حسین شعار ما ⁂ شہادت افتخار ما!



جھوٹ، بری چیز ہی نہیں، ضعف و ناتوانی کی علامت بھی ہے۔ کذب بیانی ہر شخص کے لئے ننگ و عار ہے خاص کر طاقتوروں اور حکمرانوں کے لئے۔

مثل مشہور ہے "دروغگو را حافظہ نباشد" آج اس ضرب المثل کے حقیقی مصداق امریکہ کے ضعیف و ناتواں صدر ریگن معلوم ہوتے ہیں۔ گرینیڈا پر قبضہ اور لیبیا پر بمباری کر کے اپنے کو طاقتور ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف امریکی صدر آج ایران سے رابطہ برقرار کرنے کے سلسلہ میں جھوٹ، دروغگوئی کذب بیانی اور افترا پردازی میں مشغول ہیں۔

امریکی صدر اہل ایمان سے مکر و فریب کرنے کے نتیجہ میں دامن گیر رسوائی سے بچنے کے لئے ہر روز ایک نیا بیان داغ رہے ہیں، جلدی میں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کل انھوں نے کیا کہا ہے۔

- اسلامی جمہوریہ ایران کی ناکہ بندی اور معاشی و سیاسی بائیکاٹ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے دہشت گردی و تخریب کاری کا شاخسانہ کھڑا کیا۔
- ایران سے خفیہ طور پر تعلق استوار کرنے کی کوششوں کے فاش ہو جانے کے بعد رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لئے اعتراف حقیقت پر مجبور ہوئے کہ "ہماری تحقیقات کے بموجب ایران کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں انقلاب ایران ایک عظیم انقلاب ہے، اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"
- تین ہی مہینہ کے بعد "ٹاور کمیشن" رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے چند روز قبل ایک بیان کے ذریعہ دوبارہ وہی پرانا راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ایران بین الاقوامی دہشت گردی کو ہوا دے رہا ہے۔
- امریکی صدر کو بھی اب تعین ہو چکا ہے کہ اسرائیل و امریکہ سے دوستی، سب سے بڑی گالی ہے، لہٰذا اسلامی ایران کو بدنام کرنے کے لئے اسرائیل کے توسط سے ایران کو امریکی اسلحہ کی سپلائی کا شوشہ چھوڑا لیکن چاند پر تھوکنے والا خود ہی آلودہ ہوتا ہے۔ اسلامی ایران کا تو کچھ نہ بگڑا، خود امریکہ ہی میں بحران پیدا ہو گیا اور "واٹر گیٹ" کے بعد اب "ایران گیٹ" سنائی دینے لگا۔

کہاں تو ایران کو اسلحہ سپلائی کرنے کی بات ہو رہی تھی اور کہاں اب وزیر خارجہ شلز اور معاون وزیر خارجہ درودینسکی کو دنیا کے دورے پر روانہ کیا جارہا ہے کہ کہیں سے ایران کو اسلحہ نہ ملنے پائے تاکہ ایران "امریکہ پسند" مذاکرہ وجنگ بندی" پر آمادہ ہو جائے۔

بیوقوفو! عقل کے ناخن لو۔ زبان کھولنے سے پہلے کم از کم اپنے دو تین ماہ قبل کے بیان پر ایک نظر ڈال لیا کرو تاکہ تمہارے بیانات میں اتنا تضاد نہ پایا جائے۔ آخر تمہاری کس بات پر یقین کیا جائے ایران کو اسلحہ سپلائی کئے جانے پر یا اس کی روک تھام پر؟ ایران دہشت گرد ہے یا نہیں؟ امریکہ جیسے "طاقتور"! "ترقی یافتہ" اور "بڑے" ملک! کے لئے عیب ہے کہ اس کا صدر اتنی تیزی سے جھوٹ بولے جھوٹ کی ناؤ پار نہیں لگتی، نجات، صداقت و راستی ہی میں ہے۔

تفسیر

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

= مرتضیٰ حسین =

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ
اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ
عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ
هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ
رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا
الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ
تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ
اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ
وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ
وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ
اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ:

ایمان لانے والے لوگو! جب معین مدت کے لیے قرض کی لین دین کرو تو اس کی لکھا پڑھی کرلیا کرو اور تمہارے درمیان لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا انکار نہ کرے، جس طرح اللہ نے اسے سکھایا ہے اسی طرح اسے لکھنا چاہئے اور بتلائے وہ جس پر قرض ہو، وہ اپنے رب، اللہ سے ڈرتا رہے اور (قرض دینے والے کے) حق میں کمی نہ کرے۔ پھر اگر وہ قرض لینے والا، نادان یا کمزور ہو، یا عبارت خود نہ لکھوا سکے، تو اس کا ولی (مختار و مجاز) ٹھیک ٹھیک بتا دے (لکھوا دے) اور اپنے آدمیوں میں سے دو مرد گواہ بنالو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں جن (دو) پر تم سب رضامند ہو۔ تاکہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے اور گواہ انکار نہ کریں جب انہیں بلایا جائے اور تم کسی چھوٹے یا بڑے قرض کے لکھنے میں سستی نہ کرنا اس کی میعاد تک۔ یہ (لکھا پڑھی) اللہ کے نزدیک بہت منصفانہ (بات) ہے اور گواہی کے لیے بہت مضبوطی ہے اور نزدیک ہے کہ تم شک میں نہ پڑو۔ مگر جب سودا نقد ہو، جو تم لوگ آپس میں لین دین کرتے رہتے ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم نہ لکھو اور جب تم سودا کرو تو گواہ بنالیا کرو اور کاتب کو اور گواہ کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہاری طرف سے اللہ کی نافرمانی ہوگی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (۲۸۲)

تفسیر:

کاروباری دستاویزات:

جس طرح سورۃ البقرہ سب سے بڑا سورہ ہے اسی طرح یہ آیت قرآن کی سب سے بڑی آیت ہے۔ آیت میں کاروبار و اقتصادیات اور سماج سے متعلق تحفظات کے لئے اخلاقی ضابطے اور قانونی نکات واضح کیے گئے ہیں اور یہی قرآن کی عظمت ہے۔

انفاق کی تعریف و حوصلہ افزائی، سود کی مذمت و حرمت بیان ہو چکی۔ روپے کا دوسرا استعمال، لین دین کے دوسرے طریقے ہیں۔ مثلاً قرض، رہن، بیع یا دوسرے معاملات، جن میں بایع مشتری، قرض دار و قرض خواہ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچا جا سکتا ہے۔ اس لیے حکم ہے:

یاایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین ..... دَین: معاملہ۔ لین دین، قرض، صلح، کرایہ پر لین دین۔ خرید فروخت۔ سلف۔ نسیہ۔

۱۔ قرض ہو یا معاملہ (لین دین) ہو، تو غلط فہمی یا دھوکا اور بھول چوک کا علاج یہ ہے کہ ایک باقاعدہ کاغذ لکھ لیا کرو۔

۲۔ دستاویز لکھنے والا ایک تیسرا شخص ہو تاکہ طرفین کی مداخلت کا امکان کمزور ہو جائے۔

۳۔ کاتب جو کاغذ لکھے وہ ایمان داری سے لکھے۔

۴۔ کاتب کو ایسی تحریر لکھنے میں انکار نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے رب اکرم نے قلم کے ذریعے انسان کو وہ سکھایا جس سے وہ بے خبر تھا (العلق ۴/۵)

ولیملل الذی علیہ الحق ......

۵۔ قرض لینے، کرایہ پر لینے ... والا کاغذ لکھوائے۔

۶۔ دستاویز لکھواتے وقت اللہ کو حاضر ناظر جانے، غلط یا فریق ثانی کو نقصان دینے کا پہلو سامنے نہ رکھے۔

۷۔ دین دار، نا سمجھ ہو، اپنے حساب کتاب کو نہیں سمجھتا یا دیوانہ ہے یا عبارت نہیں لکھوا سکتا۔ تو اس کا "ولی" (مختار یا نمائندہ) دستاویز لکھوائے۔

۸۔ ولی، ذمہ دار ہے کہ جو کچھ لکھوائے وہ بالکل ٹھیک ہو، واقعہ و معاملہ میں انحراف نہ آنے دے۔

واستشھدوا شھیدین من رجالکم .....

۹۔ کاغذ لکھوانے کے ساتھ دو گواہ بھی رکھو۔

۱۰۔ دونوں گواہ تمہارے آدمی ہوں "رجالکم" سے بالغ مسلمان، مرد مراد ہیں، جن کو

دونوں فریق متفق ہوں۔

۱۱۔ دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور ایسی دو عورتیں گواہ ہوسکتی ہیں جن پر فریقین متفق ہوں "ان تضل احدٰھما فتذکر۔۔۔" دو عورتوں میں سے اگر ایک اپنے نفسیاتی وجذباتی معاملات کی بنا پر کوئی گمراہ کن بیان دینے لگے تو دوسری اسے اصل بات یاد دلاسکے۔ قرآن نے "تضلّ" کہا ہے۔ "تنسیٰ" نہیں ہے۔ چونکہ کاروبار اور دستاویزات عموماً مردوں کا روزمرہ ہے۔ عورتیں عموماً یہ کام نہیں کرتیں اس لیے ان کا بیان گمراہ کن نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ اس خدشے کو دور کرنے کیلئے اس کی دوسری ساتھن روک ٹوک کرکے بات کو درست کہنے میں مدد دے گی۔

۱۲۔ گواہوں پر فریقین کو متفق ہونا چاہیے۔ "ممن ترضون من الشھداء"

۔ ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا ۔

۱۳۔ قاضی یا ثالث، یا کوئی فریق گواہ کو بلائے تو اسے حاضری سے انکار کرنے کا حق نہیں ہے۔

ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا او کبیرا۔۔۔

۱۴۔ چھوٹا معاملہ یا بڑا معاملہ تھوڑی مدت کی بات ہو یا زیادہ دنوں کی، تحریر لکھنے والے کو سستی اور جزئیات لکھنے میں غفلت نہ کرنا چاہیئے اس کے بہت فائدے ہیں۔ منصفانہ کارروائی ہے۔ گواہی اور مقدمے میں پختگی ہے۔ شک شبہے سے بچت کا ذریعہ ہے۔

۔ الا ان تکون تجارۃ حاضرۃ۔۔۔۔۔

۱۵۔ حاضر سودا اور نقد ادائیگی اور روزمرہ کی لین دین میں کوئی حرج نہیں۔ لکھا پڑھی نہ کرو۔

۱۶۔ خرید و فروخت میں گواہ بنالیا کرو۔

۔ ولا یضار کاتب ولا شھید ۔

۱۷۔ کاتب اور گواہ کو پریشان کرنے اور نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں۔ بعض لوگوں نے "یضار" کو فعل معروف مانا ہے یعنی کاتب اور گواہ نقصان نہ پہنچائیں۔ غلط ہے کیوں کہ آغاز آیت میں کاتب اور گواہ کو عادل و عدل کا پابند کیا جاچکا ہے۔

۱۸۔ کاتب و گواہ کو تکلیف دینے والا قانون شکنی کا مرتکب ہوگا۔

اس بارے میں مزید تفصیل کے لئے کتب فقہ سے رجوع کیجئے۔

واتقوا اللہ ۔ اللہ سے تقویٰ ہر مرحلے میں مدد کرتا ہے ۔ اس سماجی عمل میں بھی تقوے کا پھیلاؤ ہونا چاہئے اور اسی صفت کمال سے نفسیاتی کمزوریاں دور کرنا چاہئیں۔

۔ ویعلمکم اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ عالم غیب وشہادت ہے ہی وہ اپنے فضل وکرم سے تمھیں بھی علم ودانش عطا کرتا رہتا ہے ۔ یہ سب علم ودانش کی باتیں تھیں جو تم مسلمانوں کو بتائی ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ
تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ
بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا
تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

ترجمہ:

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا دستیاب نہ ہو تو با قبضہ رہن رکھ لو ۔ پھر اگر ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو تو اس کے بعد جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے امانت (لی ہوئی چیز) واپس کرنا چاہئے اور اپنے رب سے ڈرتے رہو اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ جو گواہی چھپائے یقیناً اس کا دل گنہ گار ہے اور اللہ تمہارے ہر عمل کو اچھی طرح جانتا ہے ﴿۲۸۳﴾

تفسیر:

۔ وان کنتم علیٰ سفر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۱۔ لین دین کے وقت کاتب نہ ملے جیسے سفر میں ہوں، تو دین دار کوئی چیز دہندہ کو رہن

بالقبضہ کے طور پر دے دے تاکہ اسے اطمینان بھی رہے اور بعد میں بھول چوک بھی نہ ہو۔
ظاہری نظر میں "قانونِ رہن" کی تشریع سفر سے مخصوص معلوم ہوتی ہے مگر "ولم تجدوا کاتبا" ۔ اور اگر تمہیں لکھنے والا نہ ملے ۔۔۔ پر توجہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ رہن، ہر اس صورت میں ہے جب کاتب دستیاب نہ ہو۔ سفر بطور مثال ہے ۔ احادیث سے یہی ثابت ہے ۔

۲۔ رہن میں قبضہ ضروری ہے ۔ امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے " لا رھن الا مقبوضۃ " قبضہ کے بغیر رہن ہے ہی نہیں۔

۔ فان امن بعضکم بعضا . . . . .

۳ ۔ لکھت پڑھت، گواہی و رہن سب اس صورت میں ہے کہ فریقین آپس میں اطمینان کامل نہ رکھتے ہوں ۔ اطمینان کی صورت میں اس کی ضرورت ہی نہیں ۔ اب دین دار کو دہندہ کے اطمینان کی قدر کرنا چاہئے اور اصولِ تقوٰے کے مطابق جو لے اسے واپس کرے۔ یہ کلیہ ہر امانت پر بھی جاری ہوتا ہے ۔

۔ ولا تکتموا الشھادۃ . . . . .

۴۔ لین دین کی بات ہو، یا کسی اور قسم کا معاملہ گواہوں کو حقیقت واقعہ چھپانے کا حق نہیں ہے۔

۔ ومن یکتمھا فانہ اٰثم قلبہ . . . . .

۵ ۔ گواہی چھپانا، دل کا گناہ ہے ۔ حقیقت پوشی انسان کے ضمیر کو چور بناتی ہے ! اسی سورت کی دسویں آیت میں منافقوں کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد ہوا : " فی قلوبھم مرض.... " ان کے دلوں میں مرض ہے اللہ نے ان کے مرض اور بڑھا دیے اور ان کے لیے تکلیف دہ عذاب ہے۔

۔ واللہ بما تعملون خبیر ۔

حق چھپانے اور گواہی نہ دینے سے حق و حقیقت چھپ نہیں سکتی ۔ اللہ تم سب کے ہر عمل سے کماحقہ باخبر ہے ۔

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا

فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ
بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ:

اللہ کی ملکیت جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو تمہاری ضمیر میں ہے اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے معاف اور جس پر چاہے عذاب کرے گا اور اللہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے (۲۸۴)

تفسیر:

مسلمان ہرگز یہ بات نہ بھولیں کہ زمین و آسمان، ملک و ملکوت سب کچھ اللہ کی ملکیت میں ہے وہ دلوں کا بھید جانتا ہے، لہٰذا ہمیشہ اچھی بات سوچو، غلط گواہی اور باطل عقائد کو ضمیر میں راہ نہ دو۔ کیوں کہ ایک دن اسے جواب دینا ہے اور اس وقت سزا اور درگزر اللہ کے قبضے میں ہوگی وہ قادرِ مطلق ہے۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ

رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝

ترجمہ :

ایمان لائے رسول، جو بھی ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا اور مومنین بھی، سب کے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر (اور کہتے ہیں) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے تیرا حکم مانا: تیری مغفرت اے ہمارے رب! اور تیری طرف لوٹنا ہے (۲۸۵)

تفسیر:

عقائد و افکار اسلامی میں رسول اور دوسرے مومنوں میں دوئی نہیں۔ اللہ کی جو وحی بھی ان پر آئی ان کا اس پر ایمان مستحکم رہا۔ اسی طرح سب مومن توحید۔ ملائکہ۔ تمام نازل شدہ کتابوں اور سب پیغمبروں پر اعتقادِ کامل رکھتے ہیں۔ رسولوں کی رسالت میں کوئی فرق نہیں مانتے اور سب اللہ کے فرماں بردار رہتے ہیں، وہ دل و جان، عقیدہ و عمل کی زبان سے کہتے ہیں۔ ہم نے تیرا ہر حکم سنا، ہم تیرے ہر حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔

عقیدہ و عمل میں استواری مومن کی شان ہے۔ اس کے باوجود، رسول اور امت ہر ایک اللہ کے حضور میں مغفرت کی دعا اور اس کے حضور حاضری کا اقرار کرتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا

إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ
عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ وَٱعْفُ عَنَّا
وَٱغْفِرْ لَنَا وَٱرْحَمْنَآ أَنتَ مَوْلَىٰنَا فَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

ترجمہ :

اللہ کسی کو اس کی گنجائش (وسعت) سے بڑھ کر فقے داری نہیں دیتا۔ جو کام اچھا کیا اس کا نفع اسی کو ملے گا اور جو برا کام کیا اس کا نقصان اسی کو پہنچے گا۔ ہمارے رب! ہماری گرفت نہ فرمانا۔ اگر ہم بھول کریں یا غلطی۔ ہمارے رب! اور ہم پر نہ ڈالنا ایسا بوجھ جیسا بوجھ ہم سے پہلے والوں پر ڈالا (تھا)۔ ہمارے رب! اور ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوانا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر دے اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا مولیٰ ہے۔ پھر ہمیں کافروں کے گروہ پر فتح دے (۲۸۶)

تفسیر :

سورے میں بہت سے احکام بیان ہوئے۔ قوموں کی بداعمالیاں اور ان کی تباہیوں کا تذکرہ ہوا۔ آخر میں اللہ نے تین اہم نکتے بیان فرما کر اپنے مومن بندوں کو رحمت سے نوازا ہے۔

۱۔ اللہ کسی بندے پر ایسی ذمہ داری (واجب و حرام سنت و مکروہ و مباح تکالیف خمسہ) عائد نہیں کرتا جو اس کی گنجائش و برداشت سے باہر ہو۔

۲۔ لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت۔

انسان جیسا کرے گا ویسا پائے گا، عدلِ خدا سے بعید ہے کہ گنہ گار انعام پائے اور نکوکار جہنم جائے۔

اس تعین دہائی کے نتیجے میں بندۂ مومن کا فکری تقاضہ یہ ہے کہ وہ اعتراف عاجزی و تقصیر
ے اور چونکہ شروع میں اسے حاکم کل ــ مولیٰ ــ مان چکا، اس کی رحمت کا علم حاصل کر چکا
ا لیے "رب" کہہ کر بار بار پکارے اور بھول چوک پر معافی مانگے ۔گذشتہ امتوں کی سزاؤں
ے پناہ طلب کرے اور اپنی ناطاقتی کا اظہار اور حکم میں درگزر کا طلب گار ہو۔ رحم و مغفرت کی
عا کرے اور توانائی اسلام اور سربلندی مسلمانان عالم کی فکر و سعی کے لئے کمربستہ ہو کر اللہ سے
فرین اسلام پر فتحیاب ہونے کی درخواست اس کا منتہائے نظر ہو۔ اسی لئے احادیث میں
ت کو بطور دعا پڑھنے پر زور دیا گیا ہے۔

والحمد للہ رب العالمین۔

صادر:

- نور الثقلین: عبدعلی بن جمعۃ العروسی الحویزی م ۱۱۱۲ھ
  ناشر: دارالکتب العلمیہ۔ قم۔ ایران - ۱۳۸۴ھ۔ بیعہ
  مستعار از کتب خانۂ مدرسۃ الواعظین ۔ لاہور۔
- المیزان: سید محمد حسین طباطبائی م
  طبع تہران ۔ ایران مختلف طبعات۔ مختلف مقامات سے مستعار۔
- کلام اللہ مترجمہ سید محمد صادق لکھنوی م ۱۴۰۴ھ ۔ مجاہد بکڈپو۔ لکھنؤ۔ ہند۔ ۱۹۶۶ از کتب خانہ ذاتی۔
- کلام اللہ مترجم: مولانا سید فرمان علی م
  طبع، ہند و پاکستان۔ مختلف طبعات، کتب خانہ ذاتی۔
- تفسیر المتقین: سید امداد حسین کاظمی لاہور
- نمونہ بینات در شان نزول آیات: دکتر محمد باقر محقق۔
  تہران، ایران۔ چاپ دوم ۱۳۵۹ش (کتب خانۂ ذاتی)
- گفتار فلسفی، آیت الکرسی، پیام آسمانی توحید: محمد تقی فلسفی۔
  تہران، ایران ۱۳۵۱ش (از مولانا سید علی موسوی لاہور)

- تفہیم القرآن: سید ابوالاعلیٰ مودودی
مکتبۂ تعمیر انسانیت۔ لاہور۔ متعدد طباعات (کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لاہور)
- THE HOLY QUR'AN WITH ENGLISH TRANSLATION OF THE ARABIC TEST AND COMMENTARY ACCORDING VERSION OF HOLY AHLULBAIT, BY, MIR AHMAD ALI AND MIRZA MAHDI POOYA KARACHI – PAKISTAN – 1964
(کتب خانہ ذاتی)
- البیان فی غریب اعراب القرآن: ابوالبرکات بن الانباری م ۵۷۷ ھ
ناشر: انتشارات الہجرۃ۔ قم۔ ایران۔ ۱۴۰۳ھ (کتب خانہ ذاتی)
- فقہ القرآن: قطب الدین الراوندی م ۵۷۳ ھ
ناشر: مطبعۃ الخیام۔ قم۔ ایران ۱۳۹۹ھ (کتب خانہ ذاتی)
- اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: باہتمام دانشگاہ پنجاب، لاہور۔ پاکستان
- قصص قرآن با فرہنگ قصص قرآن: صدرالدین بلاغی۔
موسسۂ انتشارات امیرکبیر۔ تہران۔ چاپ نہم ۔ ۱۳۵۴ ش
- تلخیص البیان فی مجازات القرآن: سید رضی، ابوالحسن محمد بن حسین۔
طبع مجلس شوریٰ، تہران، ۱۳۷۲ھ۔

جناب محمد تقی مصباح یزدی

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

معارفِ قرآن

مقدمہ :-

قرآن مجید کا ایک سطحی نظر سے جائزہ لینے کے بعد ہر سمجھدار انسان اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے معانی و مفاہیم کو درک کرنے کی کوشش کرے چاہے ابھی دین کے بنیادی اصولوں پر اس کے اعتقاد ابھی محکم و استوار نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ پہلی ہی نظر میں قرآن کا یہ دعویٰ اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے کہ "یہ کتاب خالق کائنات کی طرف سے، خوش بختی و سعادت کی آخری ترین منزلوں تک پہونچنے کے سلسلے میں، انسانوں کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے۔"

اگر ہم فرض کریں کہ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والا ابھی اصول دین — توحید، نبوت اور معاد (قیامت) وغیرہ پر ایمان نہیں لایا ہے پھر بھی اس کی فطرت اس کتاب کے معانی و مطالب کے سمجھنے پر اسے مایل کرتی ہے اس لئے کہ غور و تجسس کا مادہ نیز منفعت طلبی اور نقصانات سے گریز کی حس خود اس کے اندر موجود ہوتی ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

کیا یہ ان ہی فطری عوامل کا نتیجہ نہیں ہے کہ غور و فکر اور تجسس و تفحص سے کام لینے والے انسانوں کی چند نسلیں اس بات کے لئے کوشاں رہیں کہ خط میخی[1] کی ابتدائی صورت و کیفیت دریافت کر لیں یا تاریخ کے اس طویل سفر میں مختلف دانشوروں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ قدرتی توانائیوں پر اپنا کنٹرول قائم کر کے حیرت انگیز ایجادات پیش کریں اور ستاروں کو تسخیر کر لیں؟ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ ابتدائی مراحل

---

[1] قدیم ایرانی تمدن کی ابتدائی تحریریں جنکی شکلیں کیل کے مانند ہونے کے سبب انکو خط میخی کہا گیا ہے جو بظاہر سومریاں کی اختراع بتائی جاتی ہیں۔ (مترجم)

میں سوائے امید و بیم کی ایک ہلکی سی کرن کے کامیابی کا دور دور تک نام و نشان بھی نہ پایا جاتا تھا۔

لہٰذا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی کتاب کے سلسلہ میں جو چودہ سو سال سے دنیا کے سامنے اپنا دعویٰ دہرا رہی ہو اور اہل شک کو اپنی ایک سطر کا ہی جواب لانے کا چیلنج کر رہی ہو نیز منکرین کلام الٰہی کو ابدی عذاب سے بھی ڈرا رہی ہو ایک بیدار مغز، سمجھدار انسان، اتنی آسانی سے نظر انداز کر دے اور بھرپور طور پر اس کا مطالعہ نہ کرے نیز اس پر غور و فکر سے کام لینے سے گریز اختیار کرے! آیا کوئی عاقل و ذی شعور انسان اس احتمال کی طرف سے آنکھیں موڑ سکتا ہے کہ شاید اس کتاب کو سمجھنے اور اسکی معین کردہ راہوں اور اصولوں پر چلنے سے اس کو کوئی قابل توجہ فائدہ حاصل ہو جائے؟ کیا اس کے ذہن میں یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ ممکن ہے یہ کتاب، واقعی، خدا کی طرف سے ہو اور اگر وہ اس کے بارے میں تحقیق سے کام نہیں لیتا اور اس کے قوانین و دستور پر عمل نہیں کرتا تو وہ نقصانات جو اس کتاب میں غفلت و مخالفت کرنے والوں کے سلسلہ میں ذکر ہوئے ہیں ان میں مبتلا ہو جائے؟

لہٰذا تعجب کا مقام ہے کہ جن لوگوں کو اس کتاب کے بارے میں اطلاع ہے وہ اس کے معانی و مطالب کے سمجھنے کی طرف مائل کیوں نہیں ہوتے؟

اس سے زیادہ تعجب ان لوگوں کے سلسلہ میں ہے جو خود کو اس کتاب کا پیرو کہتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ تمام علوم و معارف اسلامی کا سرچشمہ یہی کتاب ہے پھر بھی مفاہیم و حقائق قرآنی کو سمجھنے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ تعجب تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خود کو عالم دین اور معارف اسلامی کا ماہر شمار کرتے ہیں لیکن معارف و حقائق کے استخراج کے سلسلہ میں کما حقہ اس کتاب سے استفادہ کی کوشش نہیں کرتے!!

یقیناً کم و بیش، ہر دور میں ایسے علماء و دانشور موجود رہے ہیں جنھوں نے معانی و معارف قرآنی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے قابل فخر کوشش و جانفشانی سے کام لیا ہے اور نتیجہ کے طور پر اپنی محنتوں کا ثمرہ بیش بہا کتابوں کی صورت میں آنے والی نسلوں کے سپرد کیا ہے پھر بھی تمام انسانوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً نیز علمائے اسلام پر ان سب سے زیادہ قرآن کا حق ہے کہ وہ اس تلاش و جستجو کو جاری رکھیں اور حق تو یہ ہے کہ ہر عصر میں اپنے اسلاف کی زحمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآنی معارف کی بلندیوں

ب پہونچنے کے لئے ہمیں ایک اور زینہ طے کر کے مزید آگے بڑھتے رہنا چاہئے اس راہ میں کسی طرح کی تھکن کا مظاہرہ
ے بغیر بلند ہمتی کے ساتھ قدم بڑھانا ہمارا فریضہ ہے نہ یہ کہ اس کو طے شدہ راہ تصور کر کے علوم قرآنی کے اتھاہ
انوں کو اختتام پذیر شمار کرنے لگیں اور نتیجہ کے طور پر درس تفسیر اور درس معارف قرآن کو دینی مدرسوں
ں فرعی درس کی حیثیت دیدی جائے۔ حتیٰ کہ فقہ و اصول کے تحقیقی دروس میں مربوط آیتوں کے سلسلہ میں کماحقہ
حق سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ صرف کبھی کبھی تبرک کے طور پر دو چار آتیں تلاوت کر دی جائیں۔

یقیناً ہمیں ان جلیل القدر فقہائے عظام کی بیش بہا خدمتوں اور زحمتوں سے انکار نہیں ہے جنہوں
آیات احکام" کی تفسیریں قلم بند کی ہیں لیکن ہمارا نظریہ ہے کہ قرآن کریم (جیسا کہ خود قرآن ناطق کا ارشاد ہے)
ب ایسا بے کراں سمندر ہے جس کی آخری تہوں تک پہونچ جانا ممکن نہیں ہے اس کے حیرت انگیز خزانے کبھی
ی ختم نہیں ہو سکتے۔

قرآن حکیم کی تفسیر کے سلسلہ میں ضروری اہتمامات میں کمی کی ایک بڑی وجہ یہ خیال رہا ہے کہ تفسیر قرآن کا حق
ہ معصومین علیہم السلام سے مخصوص ہے یا یہ کہ لوگوں کو اس بات کا خوف دامنگیر رہا ہے کہ اگر اس مقدس
ادی میں قدم رکھا اور اس کا حق ادا نہیں کر سکے تو تفسیر بالرائے کے مرتکب قرار پائیں گے جس کی احادیث
ں بڑی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا انتہا پسند گروہ اور بھی ہے جو
حقیق و تدقیق اور غور و فکر کے سلسلہ میں کسی طرح کی بھی زحمت و مشقت برداشت کرنا نہیں چاہتا چنانچہ
ہ کہتا ہے کہ قرآن کسی بھی تفسیر کا محتاج نہیں ہے جو بھی عربی زبان سے آشنائی رکھتا ہو اس کے مطالب و
عانی اور معارف و حقائق بخوبی درک کر سکتا ہے۔

ہم ان شبہات نیز اسی کے مانند دیگر خیالات و افکار کا اس تحقیقی بحث کے دوران جائزہ لیں گے
ور انشاء اللہ ان کے جوابات بھی بھرپور وضاحت و صراحت کے ساتھ خود قرآن کی روشنی میں پیش کرنے
ی کوشش کریں گے چنانچہ خود کو ایک ایسا طالبعلم تصور کرتے ہیں جس کے سامنے ان مسائل میں سے کوئی ایک
سئلہ حتیٰ کہ اصول دین بھی اچھی طرح واضح نہ ہوں جو ابھی تازہ تازہ اس کتاب سے واقف ہوا ہے اور پہلی
رتبہ اسلام اور قرآن کا نام سنا ہے صرف اتنا جانتا ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے جس کا دعویٰ ہے کہ خدا کی طرف
ے بشریت کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اس کی پیروی انسان کے لئے ابدی سعادت اور اس سے
دوری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شقاوت و گمراہی کا باعث ہے جس نے محض اپنے ذوق تجسس کی تسکین اور قرآن

سے اعراض کے نتیجہ میں رونما ہونے والے خطرات سے بچنے نیز اس کے فوائد سے بہرہ مند ہونے کی امید پر اس کتاب کے مطالعہ اور تحقیق کا کام شروع کیا ہو۔ ہم حتی کہ خود قرآن کی معرفی و شناخت نیز اس کے دعووں کی دلیلیں اسی قرآن سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح اس کے صحیح مفاہیم و مطالب کو سمجھنے اور اس کے اندر پوشیدہ معارف و حقائق سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے بھی خود قرآن کا ہی سہارا لیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں دوسرے طریقے ہماری تحقیقات کا محور رہے ہیں اور ان سے حاصل شدہ نتائج پر ہمارا ایمان بھی ہے پھر بھی شیطانی وسوسے جن میں روز بروز اضافہ اور رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے بہت سے قطعی حتی کہ بدیہی و ضروری مسائل میں بھی شک و شبہ پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہیں بلکہ ان سے انکار تک کی نوبت پہونچ چکی ہے اسی چیز نے ہم کو اس بات پر مجبور کیا کہ ہم اپنی باتوں کو ایک محکم و استوار نیز یقینی و ناقابل انکار بنیاد پر قائم کرتے ہوئے ایک ایسے نقطہ سے شروع کریں جو مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں کسی دوسری چیز کی محتاج نہ ہو۔ تاکہ زینہ بزینہ اس روشن و تابندہ مقدس کتاب کی برکت سے دین کے تمام معارف و حقائق صحیح صورتوں کے ساتھ ثابت و آشکار کر کے اس سلسلہ میں پیدا کئے جانے والے شک و شبہات نیز کج فہموں اور بیمار دلوں کے شیطانی وسوسوں کے خلاف ایک ناقابل شکست فیصل قائم کردیں ۔ شاید اس طرح قرآن کے بے کراں حقوق میں سے کچھ حق ادا ہو جائے اور یہ مقالہ مومنین کے لئے حفظ ایمان و صداقت نیز طالبان حق کے لئے رہنمائے ہدایت قرار پا سکے۔ ومن اللہ التوفیق وعلیہ التکلان۔

معرفت قرآن

جیسا کہ ہم مقدمہ میں عرض کر چکے ہیں ایک غیر جانبدار طالب علم کی حیثیت سے خود آیات قرآنی کی بنیاد پر ہم اپنی بحث و تحقیق کو آگے بڑھائیں گے حتی کہ خود قرآن کی خصوصیات و مشخصات بھی قرآن میں ہی ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن میں اس کتاب کے اوصاف و عنوانات نیز اس کے مقاصد و خصوصیات کے بارے میں بھی ذکر موجود ہے چنانچہ سب سے پہلے ہم ان لفظوں کا جائزہ لیتے ہیں جو قرآن کے سلسلہ میں مستقل عنوان کی حیثیت سے یا محض اوصاف کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ عنوانات و اوصاف

اس کتاب کی شناخت میں کس طور پر مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ کتاب

قرآن مجید میں ۴۵ مقامات پر لفظ "الکتاب" قرآن کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں اعلان ہوتا ہے: ذالک الکتاب لاریب فیہ، ھدی للمتقین اس کے علاوہ دیگر مقامات اس طرح ہیں: سورہ بقرہ، آیت/۱۷۶، ۲۳۱، آل عمران/۲، ۷، نساء/۱۰۵، ۱۱۳، ۱۲۷، ۱۳۶، ۱۴۰، مائدہ/۴۸، انعام/۱۱۴، اعراف/۱۹۶، یونس/۱، ۳۷، یوسف/۱، رعد/۱، حجر/۱، نحل/۶۴، ۸۹، کہف/۱، مریم/۱۶، ۴۱، ۵۱، ۵۴، ۵۶، شعراء/۲، قصص/۲، ۸۶، عنکبوت/۴۵، ۴۷، ۵۱، لقمان/۲، سجدہ/۲، فاطر/۳۱، ۳۲، زمر/۱، ۲، ۴۱، مومن/۲، شوریٰ/۱۷، زخرف/۲، دخان/۲، جاثیہ/۲ اور احقاف آیت/۲۔

آٹھ اور مقامات پر بھی ظاہراً یا احتمالاً "الکتاب" سے مراد قرآن ہی ہے مثلاً "ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم" (بقرہ/۱۲۹)

دیگر سات مقامات: بقرہ/۱۵۱، ۱۷۷، آل عمران/۱۱۹، ۱۶۴، اعراف/۱۷۰، مومن/۷۰ اور سورۂ جمعہ/۲۔ اسی طرح چار مقامات پر قرآن کے لئے لفظ "کتاب اللہ" استعمال ہوا ہے: —

"..... واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ ان اللہ بکل شیء علیم" (انفال/۷۵)

دیگر مقامات: سورۂ توبہ/۳۶، احزاب/۶ اور فاطر/۲۹

سورۂ کہف میں ایک مقام پر "کتاب ربک" سے مراد قرآن مجید ہے: —

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماتہ ولن تجد من دونہ ملتحداً (آیت/۲۷)

سولہ مقامات پر لفظ "کتاب" کا نکرہ کے طور پر قرآن کے سلسلہ میں اطلاق ہوا ہے: —

وھذا کتاب انزلناہ مبارک فاتبعوہ واتقوا لعلکم ترحمون (انعام/۱۵۵)

دیگر مقامات : بقرہ/ ۸۹ ، مائدہ/ ۱۵ ، انعام/ ۹۲ ، اعراف/ ۲، ۵۲ ، ہود/ ۱ ، ابراہیم/ ۱ ، نمل/ ۱ ، ص/ ۲۹ ، فصلت/ ۳، ۴۱ ، احقاف/ ۱۲، ۳۰ ، انبیاء/ ۱۰ ، نصر/ ۲۳ ۔

ایک مقام "پر کتابٌ عزیزٌ" ان الذین کفروا بالذکر لما جاءھم وانہ لکتاب عزیز (سورۂ فصلت/ ۴۱) اور دو مقامات پر "کتاب مبین" کے ذریعہ قرآن کی توصیف کیگئی ہے :

"۔۔۔ قد جاءکم من اللہ نورٌ وکتابٌ مبین" (سورۂ مائدہ/ ۱۵) ۔ مقام دیگر : نمل/ ۱ ۔

معنیِ کتاب ۔

"کتاب" مصدر ہے جس کے معنی لکھنے کے ہیں یہ لفظ اسم مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی "لکھا ہوا"۔ یہاں کتاب کا یہی دوسرا معنیٰ مراد ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر کتاب خصوصاً قرآن مجید کو کس مناسبت کے تحت کتاب یعنی لکھا ہوا کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لفظ کتاب کا اطلاق ایسے الفاظ ومفاہیم پر جو ابھی قلم بند کئے گئے ہوں صحیح بھی ہے یا نہیں ؟

عام طور جو اس کا جواب دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے موارد میں کتاب کا اطلاق مجاز کے طور پر علاقہ "اَوْل" کے تحت ہوتا ہے لیکن یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں "کتاب" کا معنیٰ "مکتوب ثانی" ہے۔ کتاب یعنی لائق تحریر (ما من شانہ ان یکتب) یہ ویسے ہی ہے جیسے "قرآن" بمعنی پڑھے جانے کے قابل چیز (ما من شانہ ان یقرأ) اور اللہ بمعنی مستحق عبادت وپرستش (ما من شانہ ان یعبد) آتا ہے۔

اس تفسیر کی روشنی میں اس طرح کے اعتراض، خصوصا لفظ اللہ کے سلسلہ میں کیا جانے والا اعتراض کہ اللہ سے معبود حقیقی مراد ہے یا مطلقاً معبود مراد ہے، اس کا جواب بآسانی دیا جاسکتا ہے ۔

قرآن کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ اس کو "لکھا ہوا" کہے جانے سے مراد "لوح محفوظ" میں اس کا قلم بند ہونا ہے چنانچہ اسی لئے اس کو "کتاب مکنون" بھی کہتے ہیں۔ البتہ اس کی کیفیت کا اندازہ لگانے کیلئے "لوح محفوظ" سے واقفیت ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ کس قسم کی تحریر اس سے مناسبت رکھتی ہے ۔

۲ و ۳ حدیث واحسن الحدیث ۔

قرآن میں چار موارد ایسے ہیں جہاں کلمہ "الحدیث" کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے ۔ مثلاً :

فلعلک باخع نفسک علیٰ اثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفاً (کہف/۶)
دیگر مقامات: سورہ نجم/۵۹، واقعہ/۸۱ اور سورۂ قلم/۴۴۔
سورۂ زمر میں ایک مقام پر قرآن کے لئے "احسن الحدیث" بھی استعمال ہوا ہے:۔
"اللہ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابھاً مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم" (آیت: ۲۳)
لفظ حدیث لغت میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو تازہ اور جدید کے معنوں میں دوسرے گفتگو اور کلام کے معنی میں۔ اگرچہ یہ لفظ بنیادی طور پر تازگی کے ہی معنوں میں ہے پھر بھی شاید اس کو کلام کے معنی میں اس رعایت کے پیش نظر استعمال کرتے رہے ہوں کہ کلام کے اجزا بھی ایک دوسرے کے بعد تازہ بہ تازہ وجود میں آتے ہیں لیکن اب اس کے استعمال میں مجموعۂ کلام یا مضامین کلام کا تازہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کے سلسلہ میں لفظ حدیث کا استعمال گفتگو اور "بات" کے معنوں میں ہوا ہے اور احسن الحدیث کا مطلب "اچھی بات" یا "اچھا کلام" ہے۔

۴۔ قول۔

سورۂ مومنون میں خدا فرماتا ہے:۔
افلم یدبروا القول ام جاءھم مالم یات آباءھم الاولین (آیت/۶۸)
اور یہاں "القول" سے مراد قرآن ہے۔ اسی طرح بظاہر سورۂ قصص کی درج ذیل آیت میں بھی "القول" کو قرآن سے مخصوص قرار دیا گیا ہے:۔
ولقد وصلنا لھم القول لعلھم یتذکرون (آیت/۵۱)
اور شاید سورۂ زمر میں بھی "القول" سے مراد قرآن ہی ہے:۔
الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ (آیت: ۱۸)
یہاں اس چیز سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہاں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اس کے بہترین کی پیروی کرتے ہیں جبکہ پورے قرآن کی پیروی لازم ہے چنانچہ اسی سورہ میں آگے بڑھ کر خدا فرماتا ہے:۔
واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم۔ یعنی جو چیز تم پر خدا کی طرف سے نازل

کی گئی ہے اس کے بہترین کی اتباع کرو۔ لہٰذا ممکن ہے کہ احسنہ سے مراد محکمات قرآن ہوں جس کے مقابلہ میں متشابہات قرآن ہیں جن پر بیمار دل افراد عمل کرتے ہیں جب ہی تو قرآن آواز دیتا ہے :۔

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ (آل عمران/ ۷)۔ شاید ذکر احسن بعض احکام کی افضلیت و اہمیت کے تحت ہوا ہو۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں قرآن میں حکم قصاص اور حکم عفو دونوں کا ذکر ہوا ہے اور دونوں کا اتباع اور عمل جائز ہے لیکن حکم عفو پر عمل، احسن و افضل ہے۔ سورۂ اعراف میں جناب موسیٰؑ سے خطاب فرما کر قرآن کہتا ہے : وأمر قومك يأخذوا باحسنها (آیت/۱۴۵) جبکہ بنی اسرائیل کے لئے پوری توراۃ کا اخذ کرنا لازم و ضروری رہا ہے۔ مفسرین نے اس کے علاوہ بھی وجوہات بیان کی ہیں۔

لفظ "قول" کا نکرہ کے طور پر بھی چند موارد میں قرآن پر اطلاق ہوا ہے۔ سورۂ مزمل میں ارشاد ہوتا ہے : انا سنلقی علیك قولاً ثقیلاً (آیت/۵) چنانچہ یہاں بظاہر "قولاً" سے کچھ قرآنی آیات ہی مراد ہیں۔ اسی طرح سورۂ الطارق میں ارشاد ہے : انہ لقول فصل (آیت/۱۳) اور سورۂ الحاقہ کی چالیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے : "انہ لقول رسول کریم"۔ اور یہاں "رسول" سے مراد پیغمبر اکرمؐ یا جبرئیل امین ہیں۔ یہی عبارت سورۂ تکویر کی ۱۹ ویں آیت میں بھی موجود ہے البتہ وہاں بعد کی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ "رسول" سے مراد جبرئیل امین ہی ہیں۔

۵. کلام اللہ

قرآن مجید میں یہ تعبیر تین موقعوں پر وارد ہوئی ہے :۔

(۱) سورۂ بقرہ میں : وقد کان فریق منھم یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون (آیت/۷۵) اس میں کلام اللہ کا مصداق توراۃ ہے۔

(۲) سورہ توبہ میں : "وان احد من المشرکین استجارك فاجرہ حتیٰ یسمع کلام اللہ" (آیت ۶)، یہاں مصداق قرآن مجید ہے۔

(۳) سورہ فتح میں : "یریدون ان یبدلوا کلام اللہ" (آیت/۱۵)، یہاں ایک مخصوص کلام مراد ہے جو پروردگار عالم نے مشرکین کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

جہاں تک معنائی کلام" کا سوال ہے واضح و روشن ہے البتہ کلام خدا کے سلسلہ میں ایک تفصیلی بحث "صفات و افعال الٰہی" کے ذیل میں انشاء اللہ پیش کی جائے گی۔

۶۔ قرآن۔

قرآن کریم میں پچاس مقامات پر لفظ "القرآن" استعمال ہوا ہے اور سبھی مقامات پر اس سے مراد یہی مقدس کتاب ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں نزول قرآن کا یوں ذکر ہے:۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (آیت/۱۸۵)

دیگر مقامات: سورۂ نساء/۸۲، مائدہ/۱۰۱، انعام/۱۹، اعراف/۲۰۴، توبہ/۱۱۱، ونس/۳۷، یوسف/۳، حجر/۸۷، ۹۱، نحل/۹۸، اسراء/۹، ۴۱، ۴۵، ۴۶، ۶۰، ۸۲، ۸۸، ۸۰، کہف/۵۴، طہ/۲، ۱۱۴، فرقان/۳۰، ۳۲، نمل/۱، ۶، ۷۶، ۹۲، قصص/۸۵، روم/۵۸، سباء/۳۱، یس/۲، ص/۱، زمر/۲۷، فصلت/۲۶، زخرف/۳۱، احقاف/۲۹، محمد/۲۴ ن/۱، ۴۵، قمر/۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰، الرحمٰن/۲، حشر/۲۱، مزمل/۴، ۲۰، دھر/۲۳ اور سورۂ نشقاق/۲۱۔

اسی طرح بغیر الف و لام کے لفظ قرآن ۱۳ مقامات پر اس کتاب میں آیا ہے۔

سورۂ یوسف/۲، حجر/۱، اسراء/۱۰۶، طہ/۱۱۳، یس/۶۹، زمر/۲۸، فصلت/۳، ۴۴ شوریٰ/۷، زخرف/۳، واقعہ/۷۷، جن/۱ اور سورۂ بروج/۲۱۔

لفظ قرآن ان کے علاوہ اور سات موارد میں بھی استعمال ہوا ہے جن میں سے تین موقعوں پر پڑھی جانے والی شئے مراد ہے: واذا تتلیٰ علیھم آیاتنا بیّنات قال الذین لا یرجون لقائنا ائت بقرآن غیر ھٰذا او بدّلہ (سورہ یونس/۱۵)

دیگر مقامات: سورۂ یونس/۶۱ و سورۂ رعد/۳۱۔

چار مقامات پر معنائے مصدری میں استعمال ہوا ہے مثلاً:۔

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھوداً (سورۂ اسراء/۷۸) اس آیت میں دو مرتبہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

دیگر مقامات: سورۂ قیامت /۱۷ و ۱۸۔

معنائے قرآن:۔

قرآن لغت میں پڑھنے یا پڑھی جانے والی شئے کے معنوں میں آتا ہے۔ شروع میں یہ لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے وصف کے طور پر استعمال ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے نام کی حیثیت حاصل کر لی۔ لیکن یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ قرآن کا اصل مادہ "قرن" ہے اور "ہمزہ" ہمزۂ زائدہ ہے، یہ بات قبول نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس طرح کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا یہ لفظ خود قرآن میں بھی بعض مقامات پر پڑھنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

بظاہر اس کتاب پر لفظ قرآن کے اطلاق میں کسی دوسری رعایت کا پایا جانا سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس کے کہ یہ ایسے الفاظ کا مجموعہ ہے جو کثرت سے پڑھے جانے کے قابل ہیں جس طرح کہ لفظ کتاب کا اطلاق لکھی جانے کے لائق یا "لوح محفوظ پر لکھی ہوئی" کے علاوہ کسی دوسرے معنی پر کرنا درست نہیں ہوگا۔ پھر بھی قرآن کریم کو قرآن کہے جانے کے سلسلے میں چند دوسری دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ مادہ "قرأ" اصل میں جمع کرنے یا اکٹھا کرنے کے معنوں میں آیا ہے اور قُرء (بضمہ قاف) ان ایام کو کہتے ہیں جب خون حیض رحم میں اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ قرآن جامع یا مجموع فیہ (جسمیں چیز جمع کی جائے) کے معنوں میں ہے اور اس کی تائید سورۂ قیامت کی اس آیت سے ہوتی ہے جسمیں لفظ جمع کے بعد لفظ قرآن اسی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے: ان علینا جمعہ و قرآنہ (آیت: ۷۵/۱۷) اور یہاں اس کتاب کو قرآن کے نام سے موسوم کئے جانے کا نکتہ یہ ہے کہ اس کتاب میں وہ تمام مطالب جمع کر دئے گئے ہیں جن کی انسان کو ضرورت و احتیاج ہے۔

۲۔ اس کتاب کے لئے یہ نام اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے کہ لوگ اس کی تلاوت کو اپنا شعار بنا لیں، اس کی طرف سے غفلت اور لاپرواہی نہ برتیں۔

۳۔ یہ کتاب کلام خداوندی بلکہ علم الٰہی کا ایک درجہ ہے اور اس کا حقیقی مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ اس کو الفاظ کا جامہ پہنایا جا سکے۔ یہ تو خداوند عالم کا کرم ہے کہ اس نے اس کو اصل منزل سے گھٹا کر ہلکا اور آسان بنا کر الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا تاکہ لوگ اس کو پڑھ سکیں چنانچہ یہ نام اسی مطلب کی

طرف نشان دہی کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے : انا جعلناہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون (زخرف/۴۳/۳)

۴۔ قرآن کو قرآن اس لئے بھی کہتے ہیں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو خداوند عالم نے اپنے حبیب پیغمبر اسلام کے لئے خود پڑھا ہے۔ جیسا کہ سورۂ قیامت میں خداوند عالم فرماتا ہے : فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ (آیت /۱۸) اور سورۂ اعلیٰ میں فرماتا ہے : سنقرئك فلا تنسیٰ (آیت : /۶) بعض دوسرے مقامات پر اسی چیز کا لفظ تلاوت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے : تلك آیات اللّٰہ نتلوھا علیك بالحق (آیت/۲۵۲) اور اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کتاب ان ہی مخصوص لفظوں میں پیغمبر اسلام پر نازل کی گئی ہے نہ یہ کہ صرف ان کے مفاہیم کا حضورؐ کے قلب مبارک پر القاء کر دیا گیا ہو اور خود پیغمبر اسلامؐ نے ان کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہو۔

میری نظر میں ان تمام دلیلوں سے بعد کی دو دلیلیں حقیقت سے زیادہ قریب تر نظر آتی ہیں۔

۷۔ تنزیل

قرآن میں پانچ موارد ایسے ہیں جہاں لفظ "تنزیل" کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً : تنزیل من الرحمٰن الرحیم" (فصلت/۲)۔ یہاں تنزیل سے قرآن مراد ہے۔

دیگر مقامات : شعراء/۱۹۲، فصلت/۴۲، واقعہ/۸۰ اور سورہ الحاقۃ/۴۳۔ پانچ موقعوں پر "تنزیل الکتاب" استعمال ہوا ہے۔ تنزیل الکتاب من اللّٰہ العزیز الحکیم (زمر/۱)

دیگر موارد : سجدہ/۲، غافر/۲، جاثیہ/۲ اور سورۂ احقاف/۲۔

اور سورۂ طٰہٰ کی چوتھی آیت میں ارشاد ہوتا ہے : تنزیلا ممن خلق الارض والسمٰوات العلیٰ نیز سورۂ یٰس کی پانچویں آیت میں فرماتا ہے : تنزیل العزیز الرحیم۔ دو دوسرے موارد میں بھی یہ لفظ مفعول مطلق کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ دہر کی ۲۳ ویں آیت (انا نحن نزّلنا علیك الکتاب تنزیلا") اور سورہ اسراء کی آیت نمبر ۱۰۶۔

ظاہر ہے کہ اولین پانچ موارد میں جہاں "تنزیل" کا مصداق خود قرآن مجید ہے۔ اس سے معنائی اسم مفعول مراد لئے گئے ہیں۔

معنائے تنزیل۔

تنزیل کا مادہ "نزول" ہے جس کے معنی نازل ہونے یا اترنے کے ہیں۔ باب تفعیل کی ہیئت کثرت پر بھی دلالت کرتی ہے اور کثرت نزول قرآن یا تو تعداد آیات کے لحاظ سے ہے یا مدارج نزول کی کثرت کی بنا پر ہے۔ دوسری بات زیادہ واضح اور مناسب نظر آتی ہے چنانچہ اس کی توضیح ہم بعد میں کریں گے۔ لفظ "نزول" صعود و عروج یعنی چڑھنے اور بلند ہونے کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی ان کا استعمال محسوسات کے سلسلہ میں ہوتا ہے یعنی جب کوئی جسم رکھنے والی شئے کسی بلند مقام سے پستی کی طرف آتی ہے تو اس کے لئے لفظ نزول استعمال کرتے ہیں اور کبھی اس کا استعمال محض اعتباری طور پر کیا جاتا ہے یعنی جب کسی کا کسی بلند عہدے سے پست تر عہدہ کی طرف زوال ہوتا ہے: جیسا کہ کہا جاتا ہے: "نزل الملك عن عرشه" اور اس سے مراد بادشاہ کا حکومت سے کنارہ کش یا محروم کردیا جانا لیا جاتا ہے اور کبھی اس لفظ کا استعمال امور حقیقی غیر حسی میں کیا جاتا ہے جیسے کہ قرآن جو خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر اکرمؐ کے قلب مبارک پر نازل کیا گیا ہے اور حقیقت میں مقام علم الٰہی سے مقام الفاظ اور مفاہیم بشری کی طرف منتقل کردیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نزول کا مطلب کسی جسم رکھنے والی شئے کا اپنے مبدء مادی سے حرکت کرنا ہرگز نہیں ہے۔

۸۔ آیات۔

"لفظ آیات" کا مختلف انداز سے قرآن کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے: "ذلك نتلوه عليك من الآيات" (آیت/۵۸)۔ اس کے علاوہ بھی دیگر ۲۵ مقامات پر بظاہر اس سے قرآن مجید کو ہی مراد لیا گیا ہے:۔

سورۂ بقرہ/۲۱۹، ۲۲۶، آل عمران/۱۱۸، مائدہ/۷۵، انعام/۴۶، ۵۵، ۶۵، ۹۷، ۹۸، ۱۰۵، ۱۲۶، ۱۵۷، اعراف/۳۲، ۵۸، ۱۲۶، ۱۷۴، توبہ/۱۱، یونس/۵، ۲۴، رعد/۲، نور/۱، ۵۸، ۶۱، روم/۲۸، حدید/۱۷۔

سات موقعوں پر کلمۂ "آیات اللہ" کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے:۔

سورۂ بقرہ/۲۵۲، آل عمران/۱۰۱، ۱۰۸، قصص/۸۷، احزاب/۳۴ اور جاثیہ/۶، ۸ اور دیگر ستره موارد میں بھی بظاہر اس سے قرآن ہی مراد ہے:-

بقرہ/۶۱، آل عمران/۷۰، ۹۸، ۱۹۹، نساء/۱۴۰، انعام/۳۳، اعراف/۲۶، توبہ/۹، یونس/۹۵ نحل/۱۰۴، ۱۰۵، زمر/۶۳ اور سورۂ مومن/۴، ۳۵، ۵۶، ۶۳ و ۶۹ تین مقامات پر بظاہر قرآن کے لئے ہی لفظ "آیاتی" استعمال ہوا ہے: بقرہ/۴۱، مائدہ/۴۴ اور اعراف/۱۴۶۔

اسی طرح ۱۳ مقامات پر ظاہراً "آیاتہ" کا مصداق قرآن ہے: بقرہ/۱۸۷، ۲۲۱، ۲۴۲، آل عمران/۱۰۳، مائدہ/۸۹، انعام/۲۱، ۱۱۸، انفال/۲، توبہ/۶۵، یونس/۱۷، نور/۵۹، جاثیہ/۶، جمعہ/۲۔

چوبیس ۲۴ مقامات پر لفظ "آیاتنا" قرآن کے سلسلہ میں آیا ہے:-

بقرہ/۱۵۱، نساء/۵۶، انعام/۵۴، ۶۸، ۱۵۰، ۱۵۷، اعراف/۱۸۲، انفال/۳۱، حج/۵۱، ۷۲، نمل/۸۱، قصص/۴۵، عنکبوت/۴۷، ۴۹، روم/۵۳، لقمان/۷، سباء/۵، ۳۸، فصلت/۲۸، ۴۰، شوریٰ/۳۵، قلم/۱۵، مدثر/۱۶ اور سورہ مطففین/۱۳ — ان کے علاوہ بھی دیگر گیارہ مقامات پر بظاہر "آیاتنا" سے مراد قرآن ہی ہے: مائدہ/۱۰، ۸۶، انعام/۳۹، مریم/۷۷، حج/۵۷، نمل/۸۲، لقمان/۳۲، سجدہ/۱۵، جاثیہ/۹، حدید/۱۹ اور سورۂ بلد/۱۹۔

اس کے علاوہ دیگر مقامات پر لفظ "آیات" اپنے عام معنوں میں استعمال ہوا ہے جن میں قرآن بھی شامل ہے۔

پانچ مقامات ایسے ہیں جہاں قرآن کی "آیات بینات" سے تعبیر کی گئی ہے۔ بقرہ/۹۹، حج/۱۶، عنکبوت/۴۹، حدید/۹ اور سورۂ مجادلہ/۵۔ اسی طرح چھ ۶ دیگر موارد میں "آیاتنا بینات" آیا ہے: یونس/۱۵، مریم/۷۳، حج/۷۲، سبا/۴۳، جاثیہ/۲۵ اور احقاف/۷۔ دو جگہوں پر "آیات مبینات" بھی وارد ہوا ہے: سورہ نور/۳۴ و ۴۶۔

اس کے علاوہ سورۂ طلاق میں ارشاد ہوتا ہے: "رسولاً یتلوا علیکم آیات اللّٰہ مبینات" (آیت/۱۱) اور سورۂ رعد و سورۂ حجر کی پہلی آیت میں ہے: "تلک آیات الکتاب"۔ جبکہ سورۂ نمل کی پہلی آیت میں "تلک آیات القرآن" وارد ہوا ہے۔ سورۂ یونس کی پہلی اور سورۂ لقمان کی دوسری

آیت ان الفاظ میں ہے "تلک آیات الکتاب الحکیم" لیکن سورہ یوسف کی پہلی اور سورۂ شعراء نیز سورۂ قصص کی دوسری آیت ان الفاظ میں ہے : "تلک آیات الکتاب المبین"۔

"آیت" کسے کہتے ہیں؟

"آیت" کے معنی بولتی ہوئی روشن و واضح علامت و نشانی کے ہیں۔ اس کا اطلاق بلند و بالا عمارتوں اور میناروں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں خدا فرماتا ہے: "اتبنون بکل ریع آیۃ تعبثون" (آیت/ ۱۲۸)۔ اسی طرح عبرت و نصیحت کی چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ یونس میں خدا فرماتا ہے: "فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیۃ (آیت / ۹۲)

"آیات الٰہی" ایسے امور کو کہتے ہیں جو وجود پروردگار عالم، اس کی قدرت و حکمت اور عظمت و بزرگی نیز اس کی تمام صفات عالیہ کی گواہی دیتے ہیں چنانچہ اس جہت سے تمام مخلوقات عالم پر یہ لفظ صادق آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بہت سے ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں اشیائے کائنات کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن آواز دیتا ہے: "ان فی ذلک لآیات..." اور خصوصی طور پر عام انسانی طاقت سے ماوراء غیر معمولی امور مثلاً معجزات انبیاء وغیرہ کو "آیات" سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ خلاق عالم کی عظمت و قدرت کی نشاندہی کرتے ہیں دوسری طرف انبیاء کرام کی صداقت بھی ثابت کرتے ہیں چنانچہ سورۂ مومنون میں خدا فرماتا ہے: "وجعلنا ابن مریم وامہ آیۃ" (آیت/ ۵۰) اور سورۂ اسراء میں ارشاد ہوتا ہے : ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات " (آیت/ ۱۰۱) اور کبھی دشمنوں کی طرف سے ایسی نشانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس کو دیکھ کر سر آنکھ رکھنے والا خدا کی عظمت قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن ایسے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ان نشأ ننزل علیھم من السماء آیۃ فظلت اعناقھم لھا خاضعین" (شعراء /۴)

"حکمت الٰہی" اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ لوگوں کو اپنے سلسلہ میں خودمختاری دیدی جائے جو شخص چاہے صحیح راہ اختیار کرے اور جو چاہے گمراہی و ضلالت کا راستہ اپنا لے۔ ورنہ خدا کیلئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی قدرت سے ایسا عظیم و مہیب معجزہ ظاہر کر دے کہ خداوند عالم کے آگے سپر انداختہ ہو جانے کے علاوہ کوئی چارہ ہی باقی نہ رہے۔

ان مجملہ موارد میں سے جن میں لفظ "آیت" کا استعمال ہوا ہے قرآن شریف بھی ہے چنانچہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا، ایسے موارد کثرت سے پائے جاتے ہیں جہاں اس کتاب پر اس کے جملوں اور ٹکروں کے لحاظ سے کلمہ "آیات اللہ" کا اطلاق ہوا ہے۔

ان توضیحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آیات الٰہی کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تشریعی و تکوینی۔ آیات تشریعی سے قرآن کریم کو تعبیر کیا گیا ہے۔ البتہ آیات تکوینی کو پھر دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ (۱) عادی (۲) غیر عادی یا (۱) آیات عمومی (۲) آیات خصوصی آیات عمومی میں تمام مخلوقات عالم کا شمار ہوتا ہے لیکن آیات خصوصی میں غیر عادی امور اور انبیاء کے معجزات آتے ہیں۔

۹۔ حق۔

سینتیس[۳۷] مقامات ایسے ہیں جہاں لفظ "الحق" کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے :۔

البقرہ/ ۲۶، ۹۱، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۴۹، آل عمران/ ۶۰، نساء/ ۱۷۰، مائدہ/ ۸۴، انعام/ ۵، ۶۶، یونس/ ۷۶، ۹۴، ۱۰۸، ہود/ ۱۷، ۱۲۰، رعد/ ۱، ۱۹، کہف/ ۲۹، حج/ ۵۴، مومنون/ ۷۰، ۹۰، قصص/ ۴۸، ۵۳، عنکبوت/ ۶۸، سجدہ/ ۳، سبا/ ۶، ۴۳، فاطر/ ۳۱، الصافات/ ۳۷، زخرف/ ۲۹، ۳۰، احقاف/ ۷، محمدؐ/ ۲، ۳، ق/ ۵، حدید/ ۱۶ اور ممتحنہ/ ۱۔

نیز دیگر آٹھ موارد میں بھی ظاہراً یا احتمالاً "الحق" سے مراد قرآن ہی ہے : مائدہ/ ۴۸، ۸۳، انعام/ ۵۷، ۷۳، اسراء/ ۸۱، سبا/ ۴۹، فصلت/ ۵۳، زخرف/ ۷۸

سورۂ "الحاقۃ" میں قرآن کے لئے "حق الیقین" کا لفظ استعمال ہوا ہے : وانہ لحق الیقین آیت/ ۵۱) اور سورۂ واقعہ میں بھی شاید یہ لفظ قرآن کے سلسلے میں ہی استعمال ہوئی ہے :۔ انَّ ھٰذا لھو حق الیقین " (آیت/ ۹۵)

معنائے حق :۔

حق مصدر ہے اور ثبوت کے معنی میں آتا ہے اس کو معنائے وصفی (ثابت) میں بھی استعمال

کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر وہ چیز جو حد ثبوت کو پہو نچ جائے حق ہے اور کبھی ہمیشہ ثابت و دائم رہنے والی چیز کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں فنا ہو جانے والی چیزوں کو باطل شمار کرتے ہیں اور کبھی اس کو "ثابت بالذات" یعنی فقط ذات خداوند عالم کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح حق " کلام، اعتقاد اور مطابق واقعہ دعوے کے (تقریباً صداقت کے مرادف) معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جب کوئی کلام مطابق واقعہ ہوتا ہے تو اس کو صدق کہتے ہیں لیکن جب کوئی واقعہ مطابق کلام و عقائد ہوتا ہے تو اس کے لئے لفظ حق استعمال ہوتا ہے۔

کبھی لفظ حق کا استعمال ایسے اعمال کے سلسلہ میں بھی کیا جاتا ہے جو مصالح واقعی کے حامل ہوتے ہیں اور اسی طرح ایسے اعتباری امور میں بھی اس کا استعمال کرتے ہیں جو پایہ ثبوت کو پہو نچ جاتے ہیں۔

قرآن مجید کے سلسلہ میں لفظ حق کا استعمال یا تو اس کے اندر بیان کئے جانے والے حقائق کے پیش نظر ہے یا اس کے اس دعوے کے صحیح ثابت ہونے کی بنا پر ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

۱۰۔ صدق۔

سورۂ زمر کی ۳۲ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "فمن اظلم ممن کذب علی اللہ وکذب بالصدق اذجاءہ " اور اس آیت میں "الصدق" کا مصداق قرآن مجید ہی ہے۔

۱۱۔ علم۔

قرآن میں چار موارد ایسے ہیں جہاں پیغمبر اسلام سے ان الفاظ میں خطاب ہوا ہے:۔

"..... جاءک من العلم" (سورہ بقرہ/ ۱۲۰، ۱۴۵، آل عمران/ ۶۱ اور سورہ رعد/ ۳۷ اور مصداق "العلم" یا کم از کم حصول علم کا سبب قرآن کو کہا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ برھان۔

سورۂ نساء میں اعلان ہوتا ہے: قد جاءکم برھان من ربکم' (آیت/۱۷۴) اور

اس آیت میں "برہان" سے مراد قرآن مجید ہے۔ اس کے معنی روشن دلیل کے ہیں یعنی ایسی دلیل جسمیں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔

۱۳ و ۱۴ بیان و تبیان۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے: هٰذا بیان للناس (آیت/۱۳۸) اور سورہ نحل میں ہے: ونزلنا علیك الکتاب تبیاناً لکل شیٔ (آیت ۸۹)

توضیح:

"بیان" مصدر فعل لازم، روشن و واضح ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ معنائے مصدری یعنی روشن کرنے نیز اسم فاعل متعدی یعنی روشن کرنے والا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

"تبیان" فعل متعدی کا مصدر سماعی ہے اس کے معنی "روشن کرتے" کے ہیں۔

اسی طرح لفظ "مبین" جس کا بعد میں، قرآن کے اوصاف تبعی کے ذیل میں ذکر کیا جائے گا، اسی مادہ سے ہے۔ یعنی یہ ابان کا اسم فاعل ہے جو لازم و متعدی (روشن و روشن کرنے والا) دونوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بیان و تبیان کا قرآن پر اسی مناسبت سے اطلاق ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان تمام حقائق و مطالب کو واضح و روشن کر دیتی ہے جس کا جاننا انسان کے لئے ضروری و لازم ہے اور جن کی معلومات حاصل کئے بغیر وہ خوش بختی و سعادت کی منزلیں طے نہیں کر سکتا اور بظاہر "تبیاناً لکل شیٔ" سے بھی ایسے امور کو روشن کرنا مراد ہے جن کا بیان کرنا قرآن کی شان ہے اور اصطلاحاً کلمۂ شیٔ ایسی قید سے مقید ہے جو موجودہ قرآنِ مقامی اور حکم و موضوع کی مناسبت سے سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ نمل کی آیت "واوتیت من کل شیٔ" (آیت/۲۳) سے مراد تمام سلطنتی امور ہیں نہ کہ کائنات میں پائی جانے والی تمام اشیاء کو اس سے مراد لے لیا جائے۔

۱۵ و ۱۶ - بینة و بینات -

سورۂ انعام میں خدا فرماتا ہے: "فقد جاءکم بینة من ربکم" آیت/۱۵۷)

یہاں بینہ سے مراد قرآن مجید ہے اور غالباً سورۂ انعام / ۵۷، سورہ ھود / ۱۷، سورہ طٰہٰ / ۱۳۳، سورۂ محمدؐ / ۱۴ میں "بینۃ" اور اسی طرح "بینۃ" کی پہلی اور چوتھی آیت میں "البینۃ" سے مراد قرآن ہی ہے۔

سورۂ بقرہ میں قرآن کی توصیف کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وبینات من الھدیٰ (آیت/۱۸۵) اور بظاہر سورہ بقرہ / ۲۰۹، ۲۵۳، آل عمران / ۸۶، مومن / ۶۶ اور سورہ صف / ۶ کی آیتوں میں بھی "البینات" سے مراد قرآن کریم ہی ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ آیات قرآنی کی توصیف میں بینات و مبینات جیسے الفاظ بعض موارد میں استعمال ہوئے ہیں۔

توضیح: "بینۃ" "بیان" کی صفت مشبہ ہے جس کے معنی روشن اور روشن کرنے والے کے ہیں۔

۱۷۔ بلاغ۔

سورۂ ابراہیمؑ میں قرآن کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ "ھٰذا بلاغ للناس" (آیت/۵۲) اور غالباً سورہ احقاف کی ۳۵ ویں آیت میں بھی "بلاغ" سے مراد قرآن ہی ہے۔

توضیح: لفظ "بلاغ" ابلاغ و کفایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس جگہ دونوں معنی محتمل ہیں لیکن شاید دوسرا معنی زیادہ مناسب ہو۔

جناب شیخ محمود قانصوه

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

فصل ہفتم

روزہ کے بقیہ احکام

زیرِ ابواب :

ا۔ یوم شک، روزہ رکھنا منع ہے۔
ب۔ شعبان کی نیت سے روزہ رکھنا جائز ہے۔
ج۔ عید و بقر عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔
د۔ وقوف "منیٰ" کے دوران روزہ رکھنا منع ہے۔
ھ۔ روزہ وصال (بغیر افطار، روزہ پر روزہ رکھنا) حرام ہے۔
و۔ یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) روزہ رکھنا مستحب ہے۔
ز۔ ماہ محرم میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔
ح۔ ماہ شعبان میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔
ط۔ ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا مستحب ہے۔
ی۔ ایام بیض (۱۳، ۱۴، ۱۵) میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔

ث۔ روزہ داوٗد مستحب ہے۔
ل۔ قوت شہوانی کے غلبہ کے وقت روزہ مستحب ہے۔
م۔ سردیوں میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔

یوم شک روزہ رکھنا منع ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ باسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن علي بن الحسن بن فضال، عن الحسين بن نصر، عن أبيه، عن أبي خالد الواسطي عن أبي جعفر(ع) (في حديث) قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: من ألحق في رمضان يوما من غيره فليس بمؤمن بالله ولابي١. وينفع في هذا الباب حديث الزهري، عن السجاد الذي ذكرناه بمواضع متفرقة.

١۔ . . . . ابو خالد واسطی امام محمد باقرؑ سے ناقل ہیں کہ: پیغمبرؐ اسلام کا ارشاد ہے: جو شخص ماہ رمضان سے دوسرے ماہ کے دن کو ملحق کر دے وہ نہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور نہ میرا پیرو ہے . . . .

٢ ــ وعنه ب محمد بن الحسن ــ عن محمد بن عبدالحميد، عن محمد بن الفضل. قال: سالت أبا الحسن الرضا(ع) عن اليوم الذي يشك فيه ولايدرى أهو من شهر رمضان أو من شعبان. فقال: شهر رمضان شهر من الشهور ما يصيب الشهور يصيبه من التمام والنقصان فصوموا للرؤية وأفطروا للرؤية ولا يعجبني أن يتقدمه أحد بصيام يوم. (الحديث)٢. أقول وهذا الحديث ينفع في الأبواب الاولى من الفصل الثالث.

٢۔ . . . . محمد بن فضل کا بیان ہے کہ میں نے امام رضاؑ سے اس دن کے متعلق دریافت کیا جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ اس کا تعلق ماہ شعبان سے ہے یا ماہ رمضان سے۔ حضرتؑ نے فرمایا: ماہ رمضان بھی دوسرے مہینوں کے مانند ہے کبھی ٢٩ دن کا ہوتا ہے اور کبھی

تیس دن کا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ترک کرو اور اگر کوئی شخص ماہ رمضان میں ایک روزہ کا اضافہ کرے تو مجھے خوشی نہ ہوگی . . . .

٣ ــ وعنه ــ محمد بن الحسن ــ عن محمد بن أبي عمير، عن جعفر الأزدي، عن قتيبة الأعشى قال أبو عبدالله(ع): نهى رسول الله(ص) عن صوم ستة أيام، العيدين وأيام التشريق واليوم الذي يشك فيه من شهر رمضان. ونحوه مانقله في البحار عن الأمالي في مناهي النبي(ص)٣. أقول وهذا الحديث ينفع في ما سيأتي.

٣. . . . . قتیبہ اعشی ناقل ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: رسول خدا نے چھ دنوں کے روزہ سے منع کیا ہے، عید، بقر عید، ایام تشریق اور جس دن کے بارے میں شک ہو کہ اس کا تعلق رمضان سے ہے یا نہیں . . . .

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا عبدالله الحافظ، أنبأنا أبو بكر محمد بن أحمد بن بالويه، حدثنا عبدالله بن أحمد بن حنبل، حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة، حدثنا أبو خالد الأحمر، عن عمرو بن قيس الملائي، عن أبي اسحاق، عن صلة، عن زفر. قال: كنا عند عمار بن ياسر فأتي بشاة مصلية فقال: كلوا فتنحى بعض القوم [قال] أني صائم. فقال عمار: من صام يوم الشك فقد عصى أبا القاسم صلى الله عليه وسلم[٤]. ورواه الترمذي، عن أبي سعيد، عن أبي خالد مثله[٥]. وروى نحوه عبدالرزاق، عن معمر عن يحيى بن أبي كثير، عن أبي سلمة الا أنه ذكر أن الرجل المتنحي (وماهو الا صوم كنت أصومه) وأجابه عمار (لا. ما أنت تؤمن بالله واليوم الآخر)٤. وأخرج ابن ماجة نحوه، عن أبي بكر بن أبي شيبة، عن حفص بن غياث، عن عبدالله بن سعيد، عن جده، عن أبي هريرة٧. وأخرجه النسائي، عن عبدالله بن سعيد الأشج، عن أبي خالد مثله٨. ولكن فيه (صلة عن عمار) وليس فيه (عن زفر) وأخرجه الحاكم، عن عبدالله مثله٩. و رواه أبو داود، عن محمد بن عبدالله بن نمير، عن أبي خالد الأحمر مثله١٠. و رواه الدارقطني، عن أحمد بن اسحاق بن

بهلول، عن أبي سعيد أشبح، عن أبي خالد عن عمرو، عن صلة، عن عمار[11]. ونقله الدارمي كالنسائي[12].

۱. . . . . زفر کا بیان ہے: ہم لوگ عمار یاسر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ہم لوگوں کے سامنے بھنی ہوئی بکری پیش کی اور کہا: نوش کیجیے۔ لیکن ہم میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ کر کہ ہم روزے سے ہیں، کھانے سے اجتناب کیا۔ عمار نے کہا: جس نے یوم شک روزہ رکھا اس نے رسول خدا کی مخالفت کی . . . .

٢ ــ وأخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أنبأنا أبو عبدالله محمد بن يعقوب الشيباني، حدثنا محمد بن عبدالوهاب الفراء، أنبأنا محاضر بن المورع، حدثنا هشام بن حسان، عن قيس بن طلق، عن أبيه طلق. قال: سمعت رجلا سأل النبي (ص) عن اليوم الذي يشك فيه فيقول بعضهم هذا من شعبان وبعضهم هذا من رمضان. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تصوموا حتى تروا الهلال. الحديث[13].

۲. . . . . طلق کہتے ہیں: میں نے سنا کہ ایک شخص یوم شک کے بارے میں پیغمبر اسلام سے سوال کر رہا تھا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ شعبان کی آخری تاریخ ہے اور بعض لوگ اسے رمضان کی پہلی تاریخ قرار دیتے ہیں، حضرت نے فرمایا: چاند دیکھے بغیر روزہ مت رکھو۔

٣ ــ أخبرنا أبو نصر محمد بن أحمد بن اسماعيل البزار الطوسي، حدثنا عبدالله بن أحمد بن منصور الطوسي، حدثنا محمد بن اسماعيل الصائغ، حدثنا روح بن عبادة، حدثنا الثوري، عن أبي عباد عن أبيه، عن أبي هريرة أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن صيام قبل رمضان بيوم، والأضحى والفطر وأيام التشريق ثلاثة أيام بعد يوم النحر[14]. ورواه عبدالرزاق، عن الثوري مثله[15]. وذكر الدارقطني نحوه، عن محمد بن عمرو، عن أحمد بن الخليل، عن الواقدي، عن داود بن خالد، عن محمد بن مسلم، عن المقبري، عن أبي هريرة[16]. وأخرجه البزار، عن محمد بن المثنى، عن صفوان بن عيسى، عن عبدالله بن سعيد، عن جده، عن أبي هريرة[17]. أقول وهذا الحديث ينفع في ماسيأتي من الصوم المحرم.

۳. . . . . ابوہریرہ راوی ہیں کہ پیغمبر اسلام نے چند دنوں کے روزوں

سے منع کیا ہے (۱) رمضان سے ایک دن قبل (۲) عید قربان (۳) عید فطر (۴) ایام تشریق یعنی قربان کے بعد کے تین دن . . . .

شعبان کی نیت سے یوم شک روزہ رکھنا جائز ہے۔

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ علي بن ابراهيم، عن ابيه، عن القاسم بن محمد الجوهري، عن سليمان بن داود، عن سفيان بن عيينة، عن الزهري، عن علي بن الحسين (ع). قال (في حديث): وأما الصوم الحرام فصوم يوم الفطر ويوم الأضحى وثلاثة أيام من أيام التشريق صوم يوم الشك أمرنا به ونهينا عنه أمرنا به أن نصومه مع صيام شعبان ونهينا عنه أن ينفرد الرجل لصيامه في اليوم الذي يشك فيه الناس. فقلت له: جعلت فداك فان لم يكن صام من شعبان شيئا كيف يصنع؟ قال: ينوي ليلة الشك أنه صائم من شعبان فان كان من شهر رمضان أجزأ عنه وان كان من شعبان لم يضره. (الحديث)[۱۸]. أقول: وهذا الحديث ينفع في الباب السابق. ورواه الاستبصار باختلاف يسير، عن أبي الحسن أحمد بن محمد بن الحسن بن الوليد، عن أبيه، عن الصفار، عن علي بن محمد القاشاني، عن القاسم بن محمد كاسولا، عن سليمان بن داود الشاذكوني، عن عبدالرزاق، عن معمر، عن محمد بن شهاب الزهري[۱۹]. ونقله في البحار، عن تفسير القمي، عن أبي، عن الاصبهاني، عن المنقري، عن سفيان بن عيينة، عن الزهري، عن علي بن الحسين (ع). وساق الحديث بطوله[۲۰].

۱۔ . . . . زہری ناقل ہیں کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا: حرام روزے چند ہیں: عید فطر کا روزہ، عید قربان کا روزہ اور ایام تشریق کے تین دنوں کا روزہ لیکن یوم شک کا روزہ حرام بھی ہے اور جائز بھی، اگر شعبان کے روزے کے ہمراہ رکھے تو جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص

صرف اس دن کا روزہ رکھے جس کے بارے میں لوگوں کو شک ہو تو حرام ہے، میں نے عرض کیا، آپ پر قربان جاؤں، اگر کسی نے شعبان میں روزہ رکھا ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ حضرتؑ نے فرمایا: شب تک، شعبان کے روزہ کی نیت کرے، اگر وہ دن رمضان سے متعلق ہوگا تو رمضان کا روزہ شمار ہوگا اور اگر شعبان سے متعلق ہوگا تو بھی اسے کوئی نقصان نہ ہوگا . . . .

. . . .

٢ ــ وفيه ــ المقنع ــ عن عبدالله بن سنان أنه سأل أبا عبدالله(ع) عن رجل صام شعبان فلما كان شهر رمضان أضمر يوما من شهر رمضان فبان أنه من شعبان لأنه وقع فيه الشك. فقال: يعيد ذلك اليوم وان أضمر من شعبان فبان أنه من رمضان فلا شئ عليه[٢١]. أقول ولعل المراد يعيده ان بان من رمضان. أو المراد أنه ليس محسوبا من جملة الثلاثين عند الشك في هلال شوال ورمضان. وبالجملة فالمراد ان صيامه كان كـ: لاصيام.

٢ـ . . . . عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ سے اس کے شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے ماہ شعبان میں روزہ رکھا یہاں تک کہ ماہ رمضان آپہنچا۔ چنانچہ اس نے رمضان کی نیت سے روزہ رکھ لیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شعبان کی آخری تاریخ تھی کیونکہ پہلے اس کے بارے میں شک تھا، حضرتؑ فرمایا: اس دن کا اعادہ کرے گا ہاں اگر اس نے شعبان کی نیت سے روزہ رکھا ہو اور بعد میں ثابت ہو جائے کہ وہ رمضان کی پہلی تھی تو کوئی حرج نہیں ہے . . . .

روایات اہل سنّت:

١ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، حدثنا أبوبكر أحمدبن اسحاق بن أيوب الفقيه املاء، أنبأنا بشربن موسى، حدثنا يحيى بن بشر الحريري، حدثنا معاوية بن سلام، عن يحيى بن أبي كثير، عن أبي سلمة أن أبا هريرة حدثه أنه رسول الله صلى الله عليه وسلم. قال: لا تقدموا قبل رمضان بيوم أو يومين الا أن يكون رجلا كان يصوم صياما

فيصومه۲۲. ورواه الترمذي، عن هناد، عن وكيع، عن علي بن المبارك ، عن يحيى بن أبي كثير. مثله۲۳. ورواه مسلم، عن أبي بكر بن أبي شيبة وأبي كريب، عن وكيع، عن علي بن المبارك ، عن يحيى بن أبي كثير مثله. ورواه أيضا، عن يحيى بن بشر كما في البيهقي وأيضا عن ابن المثنى، عن أبي عامر، عن هشام، عن يحيى بن أبي كثير ثنا زهير بن حرب، عن حسين بن محمد، عن شيبان، عن يحيى بن أبي كثير وأيضا عن ابن المثنى وابن أبي عمر، عن عبدالوهاب، عن أيوب، عن يحيى بن أبي كثير۲۴. ورواه عبدالرزاق، عن معمر، عن يحيى بن أبي كثير غير أن لفظه مختلف۲۵. وأخرجه البخاري، عن مسلم بن ابراهيم، عن هشام، عن يحيى بن كثير مثله۲۶. وأخرجه ابن ماجة، عن هشام بن عمار، عن عبدالحميد بن حبيب والوليد بن مسلم، عن الاوزاعي، عن يحيى مثله۲۷. وأخرجه النسائي، عن اسحاق بن ابراهيم، عن الوليد مثل ابن ماجة وعن عمران بن يزيد، عن محمد بن شعيب الاوزاعي مثله أيضا وأخرجه بسنده عن ابن عباس وأخرجه عن شعيب بن اسحاق، عن الاوزاعي وابن أبي عروبة، عن يحيى مثله۲۸. ورواه أبوداود، عن مسلم بن ابراهيم، عن هشام، عن يحيى بن أبي كثير۲۹. وأخرجه أبوداود الطيالسي، عن هشام، عن يحيى ۳۰. وأخرجه الدارمي، عن وهب بن جرير، عن هشام۳۱.

۱۔ . . . . . . ابوہریرہ ناقل ہیں کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے : رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ مت رکھو ہاں اگر کوئی شخص پہلے سے روزہ رکھ رہا ہو تو وہ (ای استحبابی نیت سے) روزہ رکھ سکتا ہے۔ . . . .

. . . .

۲ ــ أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد بن محمد بن داود الرزاز قراءة عليه من أصل كتابه ببغداد، حدثنا أبو عمرو عثمان بن أحمد الدقاق املاء، حدثنا يحيى بن أبي طالب، أنبأنا عبدالوهاب بن عطاء، أنبأنا محمد بن عمرو، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم. قال: لا تقدموا الشهر باليوم واليومين الا أن يوافق ذلك صوما كان يصومه أحدكم صوموا لرؤيته فان غم عليكم فعدوا ثلاثين ثم أفطروا۳۲. ورواه الترمذي عن أبي كريب، عن عبدة بن سليمان، عن محمد بن عمرو . مثله۳۳. ونحوه روى أبوداود، عن الحسن بن علي، عن حسين، عن زائدة، عن سماك ، عن عكرمة، عن ابن عباس۳۴. ورواه الدارقطني، عن

أبي محمد بن صاعد، عن محمد بن زنبور، عن اسماعيل بن جعفر، عن محمد بن عمرو مثله.
وأيضا عن ابن صاعد وابن غيلان، عن أبي هشام، عن أبي بكر بن عياش، عن محمد بن
عمرو، وأيضاً عن ابن صاعد وابي بكر النيشابوري عن الربيع، عن ابن وهب عن اسامة بن زيد
عن محمد بن عمرو [۲۵]

۲۔ . . . . ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول خدا[ص] نے فرمایا: رمضان سے ایک دو دن پہلے (رمضان کی نیت سے) روزہ رکھو، مگر یہ کہ روزہ ان روزوں سے مصادف ہو جائے جیسے وہ پہلے سے رکھ رہا تھا۔ رمضان کا روزہ چاند دیکھ کر رکھو اور اگر ابر چھایا ہوا ہو تو تیس دن شمار کرنے کے بعد افطار کرو (یعنی اس کے بعد روزہ واجب نہیں)...

. . . .

عید اور بقر عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے

روایت اہل بیت[ع]:

١ ــ باسناده ــ محمد بن علي بن الحسين الصدوق ــ عن حماد بن عمرو وأنس بن محمد، عن أبيه جميعا، عن الصادق (ع)، عن آبائه (ع) (وفي وصية النبي (ص) لعلي (ع)).
قال: يا علي صوم الفطر حرام وصوم يوم الأضحى حرام [۲۶].

۱۔ . . . . محمد، امام صادق علیہ السلام سے اور وہ اپنے اب[ع] وجد[ع] سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے حضرت علی[ع] سے وصیت کرتے وقت فرمایا: اے علی[ع] عید فطر اور عید اضحیٰ کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔

روایت اہل سنت:

١ ــ وأخبرنا أبو علي الروذباري، أنبأنا أبو بكر بن داسة، حدثنا أبو داود، حدثنا

قتيبة بن سعيد وزهير بن حرب وهذا حديثه قالا: حدثنا سفيان، عن الزهري، عن أبي عبيد. قال: شهدت العيد مع عمر رضي الله عنه فبدأ بالصلاة قبل الخطبة ثم قال: ان رسول الله (ص) نهى عن صيام هذين اليومين أمايوم الأضحى فتأكلون من نسككم وأما يوم الفطر ففطركم من صيامكم۳۷. ورواه الترمذي باختلاف عن محمد بن عبدالملك، عن يزيد بن زريع، عن معمر، عن الزهري، عن أبي عبيد۳۸. ورواه مسلم باختلاف يسير، عن ابن يحيى، عن مالك، عن ابن شهاب، عن أبي عبيد مثله. ورواه بأسانيد متعددة، عن أبي هريرة وأبي سعيد وعائشة۳۹. وأخرجه البخارى، عن عبدالله بن يوسف، عن مالك مثل مسلم۴۰. وأخرجه ابن ماجة، عن سهل بن أبي سهل، عن سفيان مثله۴۱.

۱ . . . . ابوعبید کا بیان ہے کہ عید کے دن میں عمر کے ہمراہ تھا، انہوں نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھی اس کے بعد کہا: پیغمبر خدا نے ان دو دنوں (عید بقرعید) کے روزہ سے منع فرمایا ہے، عید قربان کے دن اپنی قربانی کا گوشت تناول کروگے اور عید فطر کے دن اپنے روزہ کا افطار کروگے . . . .

"وقوف منیٰ" کے دوران روزہ رکھنا منع ہے۔

روایت اہل بیتؑ:

۱ ـ عبدالله بن جعفر في (قرب الاسناد)، عن محمد بن عيسى والحسن بن ظريف وعلي بن اسماعيل كلهم، عن حماد بن عيسى. قال: سمعت أبا عبدالله (ع). يقول: قال أبي قال علي بعث رسول الله (ص) بديل بن ورقاء الخزاعي على جمل أورق أيام منى. فقال: تنادى في الناس ألا لا تصوموا فانها أيام أكل وشرب. ونقله في البحار، عن قرب الاسناد، عن حماد بن عيسى بدون واسطة۴۲. أقول وفي تحريم صيام أيام التشريق أحاديث كثيرة وفي أحاديث الأبواب السابقة ما تضمن ذلك كحديث الزهري، عن السجاد (ع) الذي نقلناه في مواضع متفرقة.

۱۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حماد بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: میرے پدر بزرگوار نا قل ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: رسول خداؐ نے بدیل بن ورقاء خزاعی کو توقف منیٰ کے دوران، خاکستری اونٹ پر روانہ کیا اور انہیں حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اعلان کردیں کہ ان دنوں روزہ نہ رکھیں کیونکہ یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

روایت اہل سنّت:

۱ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا محمدبن اسحاق الصغاني، (ح وأخبرنا) أبوالحسن محمدبن يعقوب الفقيه بالطابران، أنبأنا أبوعلي محمدبن أحمدبن الحسن الصواف، حدثنا ساحاق بن الحسن. قال حدثنا محمدبن سابق، حدثنا ابراهيم بن طهمان، عن أبي الزبير، عن ابن كعب بن مالك، عن أبيه أنه حدثه أن رسول الله (ص) بعثه وأوس بن الحدثان أيام التشريق فنادى أنه لن يدخل الجنة الا مؤمن وأيام منىٰ أيام أكل وشرب. ونحوه مارواه البيهقي باسناده، عن بشرين سحيم أنه بعثه النبي (ص) لينادي كذلك[۴۳]. ورواه مسلم، عن أبي بكربن أبي شيبة، عن محمدبن سابق مثله وعن عبدبن حميد، عن أبي عامر، عن ابراهيم مثله[۴۴]. وروى ابن ماجة، عن ابن أبي شيبة، عن عبدالرحمن بن سليمان، عن محمدبن عمرو، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة، نحوه وكذا نحوه عن ابن أبي شيبة وعلي بن محمدمعاً، عن وكيع، عن سفيان، عن حبيب بن أبي ثابت، عن نافع بن جبير، عن بشربن سحيم نحوه[۴۵]. ورواه الدارمي، عن أبي النعمان، عن حمادبن زيد، عن عمروبن دينار، عن نافع عن بشر[۴۶].

۱۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کعب بن مالک اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ایام تشریق میں "اوس بن الحدثان" کو بھیجا، چنانچہ انھوں نے یہ اعلان کیا کہ جنت میں صرف مومن ہی جائیں گے اور توقف منیٰ کے ایام کھانے پینے کے دن ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

روزہ وصال منع ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ قال الصدوق(ره): نهى رسول الله(ص) عن الوصال في الصيام وكان يواصل فقيل له في ذلك. فقال: اني لست كأحدكم أني أظل عند ربي فيطعمني و يسقيني٤٧.

١۔ جناب صدوق کہتے ہیں: رسول خداؐ نے روزہ وصال (بغیر افطار، روزہ پر روزہ رکھنا) سے منع کیا ہے، حالانکہ خود آنحضرتؐ پے درپے روزے رکھتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں آپ سے استفسار کیا گیا، حضرتؐ نے فرمایا: میں، تم جیسا نہیں ہوں، میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں رہتا ہوں چنانچہ وہی مجھے سیر و سیراب کرتا ہے۔

٢ ــ محمد بن يعقوب عنهم ــ عدة من أصحابنا ــ عن أحمد بن محمد، عن علي بن الحكم، عن سيف بن عميرة، عن حسان بن مختار. قال: قلت لأبي عبدالله(ع) ما الوصال في صيام. قال فقال: ان رسول الله(ص) قال: لاوصال في صيام. (الحديث)٤٨. ونقله في البحار في حديث عن الأمالي، عن ابن الوليد، عن أبن أبان عن الحسين بن سعيد، عن ابن أبي عمير ومحمد بن اسماعيل، عن منصور بن يونس، عن منصور بن حازم وعلي بن اسماعيل الميثمي عن منصور بن حازم، عن الصادق(ع). ونقله في البحار، عن نوادر الراوندي في حديثين عن علي(ع) ورسول الله(ص)٤٩. و روايات النهي عن الوصال كثيرة فنها رواية الزهري، عن علي بن الحسين(ع) في وجوه الصوم. ومنها رواية الصدوق باسناده، عن زرارة، عن الصادق(ع) ومنها رواية الصدوق باسناده، عن منصور بن حازم، عن الصادق(ع) وأيضا باسناده، عن حماد بن عمرو وأنس بن محمد، عن أبيه جميعا، عن الصادق(ع)٥٠.

٢۔ . . . . حسان بن مختار کا بیان ہے: میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں

عرض کیا: روزہ میں وصال (بغیر افطار پے در پے روزہ رکھنا) کا کیا حکم ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ارشاد رسولؐ خدا ہے: روزہ میں وصال جائز نہیں ہے........................

روایت اہل سنّت:

١ ــ حدثنا أبوالحسن محمد بن الحسين بن داود العلوي رحمه الله املاء، حدثنا عبيدالله بن ابراهيم بن بالويه، حدثنا أحمد بن يوسف السلمي، حدثنا عبدالرزاق، أنبأنا معمر، عن همام بن منبة. قال: هذا ما حدثني أبوهريرة. قال قال رسول الله (ص): اياكم والوصال قالوا فانك تواصل يا رسول الله (ص). قال اني لست في ذلكم مثلكم إني ابيت يطعمني ربي ويسقيني فاكلفوا من العمل مالكم به طاقة[٥١]. وروى الترمذي نحوه، عن نصر بن علي، عن بشر بن المفضل وخالد بن الحارث، عن سعيد، عن قتادة، عن أنس[٥٢]. ورواه مسلم باختلاف يسير في اللفظ، عن زهير بن حرب واسحاق، عن جرير، عن عمارة، عن زرعة، عن أبي هريرة. ورواه أيضا عن قتيبة بن سعيد، عن المغيرة، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة[٥٣]. وأخرج البخاري مثله عن يحيى، عن عبدالرزاق باختلاف في بيان المعنى وأخرج نحوه باسانيد عديدة فراجع[٥٤]. وأخرج أبوداود نحوه، عن عبدالله القعنبي، عن مالك، عن نافع، عن ابن عمر[٥٥]. وأخرج مالك نحوه كأبي داود وأخرج الحديث عن أبي الزناد كمسلم[٥٦]. ونقل الهيثمي نحوه، عن ابن عمر نقلا عن الطبراني في الكبير[٥٧]. وروى الحميدى نحوه عن أبي الزناد كمسلم[٥٨]. وروى أبوداود الطيالسي نحوه، عن شعبة، عن عاصم مولى قريبة، عن قريبة، عن عائشة. وروى عن خارجة بن مصعب، عن حرام بن عثمان، عن أبي عتيق، عن جابر، عن النبي (ص) أنه قال: لاوصال في الصوم. ونقله بسنده آخر أيضا[٥٩]. وأخرجه الدارمي، عن خالد بن مخلد، عن مالك، عن أبي الزناد كمسلم[٦٠].

١...................... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے: (روزے میں) وصال سے اجتناب کرو، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ خود روزہ وصال رکھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: میں اس سلسلہ میں تم لوگوں جیسا نہیں ہوں، مجھے میرا پروردگار سیر و سیراب کرتا ہے۔ پس اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جتنی تم میں طاقت ہے...

....

یوم عرفہ، روزہ رکھنا مستحب ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن محمد بن الحسين، عن صفوان بن يحيى وعلي بن الحكم جميعا عن العلاء بن رزين، عن محمد بن مسلم، عن أحدهما (ع) أنه سئل عن صوم يوم عرفة. فقال: أنا أصومه اليوم فهو يوم دعاء ومسألة ١. أقول وقد اختلف نسخ الحديث في الكافي ففي (ما أصومه اليوم) كما هو المكتوب في الكافي الطبعة الجديدة.

١۔ . . . . محمد بن مسلم ناقل ہیں کہ امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے یوم عرفہ کے روزہ کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا: میں اس دن روزہ رکھتا ہوں، یہ دن دعاء و مسئلت کا دن ہے۔

اقول: "کافی" کے بعض نسخوں میں ہے (ما اصومه اليوم) یعنی میں اس دن روزہ نہیں رکھتا۔

٢ ــ قال الصدوق محمد بن علي بن الحسين: قال الصادق (ع): صوم يوم للتروية كفارة سنة ويوم عرفة كفارة سنتين ٢. ورواه في (ثواب الأعمال) عن محمد بن موسى بن المتوكل، عن علي بن الحسين السعدآبادي، عن أحمد بن أبي عبدالله، عن أبيه محمد بن أبي عمير، عن بعض أصحابه، عن أبي عبدالله (ع) ٣.

٢۔ صدوق کی روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: روزہ یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) ایک سال کا کفارہ ہے اور روزہ یوم عرفہ (۹ ذوالحجہ) دو سال کا کفارہ ہے۔ . . . . .
. . . .

روایت اہل سنت :

۱ ــ أخبرنا أبوالحسين محمدبن الحسين بن محمد الفضل القطان ببغداد، حدثنا أبوعلي اسماعيل بن محمد الصفار، حدثنا عبدالله بن ايوب المخرمي، حدثنا سفيان بن عيينة، عن داودبن شابور، عن أبي قزعة، عن أبي الخليل، عن أبي حرملة، عن أبي قتادة يبلغ به النبي (ص) صوم يوم عرفة كفارة سنة والتي تليها صوم يوم عاشوراء كفارة سنة (ورواه مجاهد)، عن حرملة بن اياس الشيباني، عن أبي قتادة. قال: سئل رسول الله (ص) عن صيام يوم عاشوراء فقال: يكفر السنة وسئل عن صيام يوم عرفة. فقال: يكفر سنتين سنة ماضية وسنة مستقبلة وف رواية أخرى أن عمر(رض) سأل النبي (ص) عن صيام يوم عرفة فأجابه النبي (ص) بنحو مامضى ۴ء. وروى الترمذي نحوه، عن قتيبة وأحمد بن عبدة الضبي جميعاً عن حمادبن زيد، عن غيلان بن جرير، عن عبدالله بن معبد الزماني عن أبي قتادة ۵ء. وأخرج نحوه دون ذيلة عن الثوري، ع منصور، عن مجاهد، عن حرملة بن أياس الشيباني عن أبي قتادة ۶ء. وأخرج ابن ماجة، عن أحمدبن عبدة مثل الترمذي أولا ۵۷. وروى ابوداود نحوه، عن سليمان بن حرب ومسدد، عن حمادبن زيد مثل الترمذي أولا ۸ء.

ا۔ . . . . ابوقتادہ ناقل ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا: روزہ یوم عرفہ اس سال اور بعد میں آنے والے سال کا کفارہ ہے اور روزہ یوم عاشور ایک سال کا کفارہ ہے۔

ابوقتادہ ہی سے دوسری روایت ہے کہ رسول خداؐ روزہ یوم عاشور کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: یہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے اور جب روزہ یوم عرفہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ ہے، گذشتہ سال اور آئندہ سال۔

. . . .

حواشی :

۱ ــ الوسائل ج ۷ ص ۱۷.

۲ ــ الوسائل ج ۷ ص ۱۹۰.

۳ ــ الوسائل ج ۷ ص ۱۸ وفي الاستبصار ج ۲ ص ۷۹ ولكن رواه عن الحسين بن سعيد، عن محمد بن أبي عمير مثله. والبحار ج ۱۳ ط ج، ص ۲٦٤.

٤ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠٨.
٥ ــ الترمذي ج ٣ ص ٧٠.
٦ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ١٥٩.
٧ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٢٧.
٨ ــ النسائي ج ٤ ص ١٥٣.
٩ ــ المستدرك ج ١ ص ٤٢٣. فيه صلة بن زفر، عن عمار. مما يشهد ببطلان ما في النسائي.
١٠ ــ أبو داود ج ٢ ص ٣٠٠.
١١ ــ الدارقطني ج ٢ ص ١٥٧.
١٢ ــ الدارمي ج ٢ ص ٢.
١٣ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠٨.
١٤ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠٨.
١٥ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ١٦٠. وليس فيه ثلاثة أيام بعد يوم النحر.
١٦ ــ الدارقطني ج ٢ ص ١٥٧.
١٧ ــ كشف الأستار ج ١ ص ٤٩٨. وفيه (اليوم الذي يشك فيه من رمضان)
١٨ ــ الكافي ج ٤ ص ٨٥ والفقيه ج ١ ص ٤٦.
١٩ ــ الاستبصار ج ٢ ص ٨٠.
٢٠ ــ البحار ج ٩٣ ط.ج، ص ٢٥٩.
٢١ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٤.
٢٢ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠٧.
٢٣ ــ الترمذي ج ٣ ص ٦٩.
٢٤ ــ مسلم ج ٣ ص ١٢٥.
٢٥ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ١٥٨.
٢٦ ــ البخاري ج ٣ ص ٣٤.
٢٧ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٢٨ واختلافه في اللفظ يسير.
٢٨ ــ النسائي ج ٤ ص ١٤٩.
٢٩ ــ أبو داود ج ٢ ص ٣٠٠.
٣٠ ــ منحة المعبود ج ١ ص ١٨٢.
٣١ ــ الدارمي ج ٢ ص ٤.
٣٢ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠٧.
٣٣ ــ الترمذي ج ٣ ص ٦٨.
٣٤ ــ أبو داود ج ٢ ص ٢٩٨. وفيه زيادة الشهر تسع وعشرون.
٣٥ ــ الدارقطني ج ٢ ص ١٥٦ و ١٦٠
٣٦ ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٨٢.
٣٧ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٦٠. ورواه البيهقي أيضاً بسند آخر عن ابن شهاب، عن أبي عبيد ونحوه في البيهقي أيضاً ج ٤ ص ٢٩٧ وأبو داود ج ٢ ص ٣١٩.
٣٨ ــ الترمذي ج ٣ ص ١٤١.
٣٩ ــ مسلم ج ٣ ص ١٥٢ و ١٥٣.

٤٠ ـــ البخاري ج ٣ ص ٥٢.

٤١ ـــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٤٩ وفيه اختلاف بالتقديم والتأخير.

٤٢ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٨٦. ونقله في البحار ج ٩٣ ط ج ص ٢٦٣. عن معاني الأخبار، عن الوراق، عن الأسدي، عن النخعي، عن النوفلي، عن عمرو بن جميع، عن جعفر بن محمد (ع). وفيه اختلاف يسير. والبحار أيضا ص ٢٦٤. وقرب الاسناد ص ١١. وفيه (عنه) لاعنهم ولعل المراد به محمد بن عيسى فقط.

٤٣ ـــ البيهقي ج ٤ ص ٢٦٠. والبيهقي أيضا ص ٢٩٨.

٤٤ ـــ مسلم ج ٣ ص ١٥٣.

٤٥ ـــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٤٨. وفي الأول أن النبي(ص) قال العجز الأخير من الحديث اي (أيام منى... الخ) وفي الثاني أن النبي (ص) خطب كذلك و بدل (مؤمن) (نفس مسلمة) و بدل (ايام منى...) (ان هذه الأيام).

٤٦ ـــ الدارمي ج ٢ ص ٢٣.

٤٧ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٨٨.

٤٨ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٨٩ و ٣٨٨ و ٣٨٧. الكافي ج ٤ ص ٩٥.

٤٩ ـــ البحار ج ٩٣ ط ج ص ٢٦٢. ونقل عن النصايري، عن الصدوق مثله. والبحار أيضا ص ٢٦٧.

٥٠ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٨٩ و ٣٨٨ و ٣٨٧. الكافي ج ٤ ص ٩٥.

٥١ ـــ البيهقي ج ٤ ص ٢٨٢ وقد روى البيهقي هذا الحديث باسانيد متعددة عن نافع بن عمرو وأنس بن مالك وعائشة وابي سعيد الخدري مع اختلاف في بعض ألفاظه بل وفي بعضها بعض الزيادات، وفي مصنف عبد الرزاق ج ٤ ص ٢٦٧ اختلاف يسير في اللفظ. وأخرج نحوه أيضا عن أبي هريرة وعن أبي سعيد الخدري ج ٤ ص ٢٦٨.

٥٢ ـــ الترمذي ج ٣ ص ١٤٨.

٥٣ ـــ مسند ج ٣ ص ١٣٣ و ١٣٤.

٥٤ ـــ البخاري ج ٣ ص ٤٦ و ٤٧.

٥٥ ـــ أبو داود ج ٢ ص ٣٠٦.

٥٦ ـــ موطأ مالك بشرح تنوير الحوالك ج ١ ص ٢٨٠.

٥٧ ـــ مجمع الزوائد ج ٣ ص ١٥٨.

٥٨ ـــ الحميدي ج ٢ ص ٤٤١.

٥٩ ـــ منحة المعبود ج ١ ص ١٨٩.

٦٠ ـــ الدارمي ج ١ ص ٧.

٦١ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٤٣. والكافي ج ٤ ص ١٤٥.

٦٢ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٤٥.

٦٣ ـــ الوسائل ج ٧ ص ٣٣٤.

٦٤ ـــ البيهقي ج ٤ ص ٢٨٣. والبيهقي ج ٤ ص ٢٨٦.

٦٥ ـــ الترمذي ج ٣ ص ١٢٤. وروى مسلم نحوه ج ٣ ص ١٦٨.

٦٦ ـــ مصنف عبد الرزاق ج ٤ ص ٢٨٤.

٦٧ ـــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٥١.

۱۳ رجب، مطلع نور

تیرہ رجب ۳۰ عام الفیل میں[1]، ہجرت سے تیئس سال پہلے، ولایت و امامت کے آفتاب عالم تاب نے افق کعبہ سے طلوع ہو کر ساری دنیا کو روشن و منور کر دیا۔

یہ وہ تاریخ ہے جس دن مظہر حق و عدالت، جامع کمالات بشری، فخر دہر، یگانۂ روزگار علیؑ ابن ابی طالبؑ متولد ہوئے وہ کہ بعد پیغمبرؐ جس سے بہتر کسی اور ذات پر نہ آفتاب طلوع ہوا، نہ عالم کی نگاہوں نے اس جیسا عظیم انسان دیکھا اور نہ مادر گیتی نے ایسا کوئی فرزند کائنات کے حوالے کیا۔

وہ نور جسے خداوند عالم نے کائنات کی آفرینش سے پہلے وجود بخشا تھا اس ذات کی ولادت کے بعد اپنے منتہا کے کمال کو پہنچا۔ نصف نور تو آج سے تیس سال پہلے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کے وجود سے متجلی ہو چکا تھا، آج سید الاوصیاء علیہ السلام کی ولادت کے ساتھ دوسرا نصف نور بھی عالم فطرت کو جگمگانے لگا۔ گویا امامت رسالت کی مکمل بن گئی۔

آج ہی کے مبارک دن، جناب ابو طالب کی زوجہ جناب فاطمہ بنت اسد نے خانہ کعبہ کے پاس آکر خاصان خدا اور خود مولود کے واسطے سے خداوند متعال کی بارگاہ میں دعا کی، خدایا ولادت کی اس مشکل کو مجھ پر آسان کر دے" راوی کا بیان ہے: "میں نے دیکھا کہ اچانک کعبہ کی دیوار شگافتہ ہوئی اور وہ معظمہ خانہ کعبہ میں داخل ہو گئیں آپ کے داخل ہوتے ہی دیوار خود بخود اپنی جگہ پر ہموار ہو گئی۔ تین روز کے بعد آپ پھر اسی شگافتہ دیوار کی راہ سے ایک ایسے فرزند کو آغوش میں لئے باہر تشریف لائیں جو ماہ تاباں کی مانند نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہا تھا۔ ان تین دنوں میں ہم نے در خانہ کعبہ کو کھولنے کی بہت کوشش کی لیکن در نہ کھلنا تھا

---

[1] عام الفیل۔ وہ سال جس میں ابرہہ ہاتھیوں کا لشکر لیکر کعبہ کو ڈھانے آیا اور پرندوں کی سنگ ریزوں سے عذاب الٰہی کا شکار ہو کر واصل جہنم ہوا۔

نہ کھلا۔ کہتے ہیں کہ آپؑ نے خانۂ خدا کی اس مہمان نوازی پر اس کا شکریہ یوں ادا فرمایا کہ کعبہ کی مقدس فضا کو پتھر کے خداؤں کے وجود سے ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا۔

ولادت کا واقعہ۔

خانۂ کعبہ میں آپ کی ولادت کے واقعہ کو شیعہ و سنی دونوں علماء و مورخین نے نہ صرف نقل کیا ہے بلکہ اس کی تاکید و تائید بھی کی ہے۔ علامۂ امینی رحمۃ اللہ علیہ[1] نے عامہ و خاصہ کے تاریخی مآخذ سے اس سلسلہ میں بہت اہم نکات نقل فرماتے ہیں۔

اہل سنت کے ایک بزرگ عالم، حاکم نیشاپوری نے اپنی مستدرک میں تحریر فرمایا ہے "اس بارہ میں اخبار و احادیث تواتر[2] کی حیثیت رکھتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو خانۂ کعبہ کے اندر تولد بخشا"۔

حافظ گنجی شافعی نے بھی اس واقعہ کی حکایت یوں فرمائی ہے۔" امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام عام الفیل کے تیس سال بعد مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے اندر رجب کی تیرھویں تاریخ کو شب جمعہ پیدا ہوئے اور کوئی مولود، خانۂ کعبہ میں نہ آپ کے پہلے پیدا ہوا نہ آپ کے بعد یہ مخصوص فضیلت آپ کی بزرگی و عظمت کی بہترین دلیل ہے۔"

احمد بن عبدالرحیم دھلوی نے بھی لکھا ہے کہ اس موضوع سے متعلق اخبار و احادیث "متواتر" ہیں۔

مشہور و معروف مفسر قرآن شہاب الدین آلوسی فرماتے ہیں:" امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ کی خانۂ کعبہ میں ولادت کا واقعہ ساری دنیا میں اس قدر شہرت رکھتا ہے کہ شیعہ و سنی دونوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے"

علامۂ امینی رحمۃ اللہ نے اس واقعہ کو عامہ کی ۱٦ اور خاصہ کی پچاس کتابوں سے نقل فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اس موضوع پر خاص کتابیں لکھی ہیں۔ شیعہ اور سنی شعراء بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے اس موضوع پر عربی و فارسی اور دوسری زبانوں میں خوب خوب اشعار

---

[1] کتاب "الغدیر" ج ٦ ص ۲۲ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] متواتر۔ اس حدیث یا خبر کو کہتے ہیں جس کے ناقلین اس قدر زیادہ ہوں کہ انسان اس کی صداقت کا اس طرح یقین کرے کہ اتنے راویوں کا اس

کہتے ہیں۔ میرزا اسماعیل شیرازی اپنے ایک طولانی قصیدہ کے ذیل میں فرماتے ہیں :۔

ان یکن یجعل اللہ البنون   وتعالیٰ اللہ عما یصفون
فولید البیت احریٰ ان یکون   لولیٰ البیت حقاً ولدا
لاعزیر لاولاابن مریم

اگر ہم خدا کے کسی فرزند کے قائل ہو جائیں جبکہ خدا ان صفات سے بلند و برتر ہے تو جناب عزیر اور جناب عیسیٰ جنھیں یہود و نصاریٰ خدا کا بیٹا کہتے ہیں کسی بھی طرح خدا کے بیٹے نہیں ہو سکتے بلکہ اس صورت میں خدا کا فرزند ہونے کا سب سے بڑا حقدار وہ ہے جو اس کے گھر میں پیدا ہوا۔"

یقیناً یہ اعجاز آمیز اور حیرت انگیز فضیلت آپ کی بزرگی و عظمت کی بہترین دلیل ہے۔ خدائے متعال سے ایک بندے کے اس خاص ارتباط کو اکتسابی کمال ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ یہ شرف تو صرف اسی ولی خدا کو زیب دیتا ہے۔

پیغمبرؐ۔ علیؑ کے مربّی!

آپؑ کی تربیت اور نشو نما بھی بے مثل خصوصیت کی حامل ہے۔ بچپن ہی سے آپؑ کی تربیت کی ذمہ داری پیغمبرؐ نے اپنے کاندھوں پر اٹھالی تھی جبکہ لطف یہ ہے کہ خود آپؑ کے مہربان ماں باپ، پیغمبرؐ کی کمسنی میں آن کے مربی تھے۔ بعض احادیث میں ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالبؑ سے درخواست کی کہ اپنا ایک فرزند میرے حوالہ کر دیجئے۔ اس طرح میں کچھ آپ کی مدد بھی کر سکوں گا اور اپنے سلسلہ میں آپ کی زحمتوں اور احسانات کا عوض بھی ادا کر سکوں گا۔ چنانچہ حضرت ابو طالبؑ نے اس امر میں آنحضرتؐ کو اختیار دے دیا تو آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی تربیت اپنے ذمہ لے لی۔

تاریخ میں جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے مربی تھے۔ خود

حدیث کے جعل اور دروغ پر مبنی ہونا عقل کی نظر میں بعید اور غیر ممکن معلوم ہو۔

آپ نے نہج البلاغہ میں اس کا اظہار یوں فرمایا ہے :۔

وضعني في حجره و انا ولد يضمني الى صدره و يكنفني في فراشه ويمسني جسده و يشمني عرفه وكان يمضغ الشئ ثم يلقمنيه ۔ [1]

"یعنی پیغمبرؐ نے مجھے اپنے دامن میں اس وقت جگہ دی جب میں بچپنے کی منزل میں تھا۔ مجھے اپنے سینے لگائے رکھتے تھے اور سوتے وقت مجھے اس طرح اپنی آغوش میں لیتے تھے کہ میں آن حضرتؐ کے بدن مبارک کو لمس کرتا اور ان کی خوشبو سونگھتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ لقمہ اپنے دہن میں چبا کر نرم کر کے میرے دہن میں رکھتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔"

اگرچہ یہ بات روشن نہیں ہے کہ جب آپ حضرت رسول اکرمؐ کے زیر تربیت آئے تو آپ کا سن کیا تھا لیکن مندرجہ بالا ارشاد کے آخری جملہ سے جو بات واضح ہوتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت آپ اس قدر کمسن تھے کہ اکثر لقموں کا چبانا آپ کے لئے مشکل تھا لیکن سوال تو یہ ہے کہ آن حضرتؐ نے آپ کی تربیت کی ذمہ داری اپنے ذمہ کیوں لی اور کیونکر آپ کے ماں باپ سے آپ کو جدا کیا ؟

اس سلسلہ میں ایک واقعہ مشہور ہے ۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں زبردست قحط پڑا ، لوگ سخت تنگ دستی کا شکار ہوئے جناب ابوطالب علیہ السلام کثیر العیال بھی تھے اور تنگ دست بھی ۔ چنانچہ حضرت رسول اکرمؐ نے اپنے چچا جناب حمزہ علیہ السلام اور جناب عباس سے گذارش کی کہ ہم میں سے ہر ایک حضرت ابوطالب کے بچوں کا کفیل ہو جائے تاکہ ان کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے ۔ ان لوگوں نے حضرت ابوطالب سے اپنا مطلب بیان کیا چونکہ جناب ابوطالب عقیل کو بہت چاہتے تھے ۔ لہٰذا عقیل کو اپنے ہی پاس رکھا اور فرمایا دوسروں کا اختیار آپ لوگوں کو ہے ۔ !! اس طرح جناب عباس طالب کے کفیل ہو گئے ۔ جناب حمزہ نے جعفر کی کفالت اپنے ذمہ لے لی اور علیؑ رسول خداؐ کے زیر سایہ آگئے ۔

اس روایت کا منبع و مصدر مورخین عامہ ہیں اور یہیں سے یہ روایت شیعہ حدیث کی کتابوں میں منتقل ہوئی ہے اور اس کا جعلی بھی اسی حدیث پر غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے ۔ علامہ شہید استاد مطہریؒ نے اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے جس سے اس حدیث کا جعلی ہونا روشن و واضح

---

[1] خطبہ قاصعہ (۱۹۲) ، نہج البلاغہ ۔

ہو جاتا ہے۔ جو بات اس میں سب سے زیادہ واضح ہے اور جسے اس حدیث کے گڑھنے والے اور دروغ گو کے کم حافظہ ہونے کی بہترین دلیل قرار دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ میں یہ بات قطعی طور سے ثابت ہے کہ جناب ابوطالب کے فرزند علی الترتیب طالب، عقیل، جعفر، علیؑ سب ایک دوسرے سے دس سال بزرگ تھے۔ چنانچہ اگر مثال کے طور پر حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کا سن اس وقت پانچ سال کا تھا (جیسا کہ خود حضرت کے مندرجہ بالا ارشاد سے گمان ہوتا ہے) تو اس اعتبار سے طالب کا سن پینتیس[۲۵] سال اور عقیل کا سن پچیس[۲۵] سال ہوتا ہے، ایسے میں وہ خود بال بچوں والے اور اپنے خانوادہ کے کفیل ہوں گے نہ کہ انھیں کسی بزرگ کی سرپرستی کی ضرورت ہوگی۔

لطف یہ ہے کہ اسی روایت کے ذیل میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: طالب جنگ بدر تک جناب عباس کی کفالت میں رہے۔ بدر میں عباس کے اسیر ہو جانے کے بعد پھر تاریخ میں طالب کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے جنگ بدر میں طالب کی عمر پچاس سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی، کیا اس وقت بھی انھیں سرپرست کی ضرورت تھی؟

بہرحال اس روایت کا جعلی ہونا تو طے ہے۔ دراصل روایت گڑھنے والے چونکہ رسول اکرمؐ کے اس عمل کی کوئی توجیہ نہ کر پائے اور نہ چاہتے تھے کہ حضورؐ کے اقدام کو حکم الٰہی مان کر ان دونوں بزرگواروں کے درمیان ایک مخصوص غیبی رابطہ تصور کریں۔ لہٰذا انہوں نے ایک مضحکہ خیز داستان گڑھ ڈالی۔

لیکن حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے متعلق پیغمبر اکرمؐ کے جو اقوال ملتے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان عام لوگوں جیسا رابطہ نہیں تھا۔ پیغمبرؐ نے بارہا حضرت علیؑ سے فرمایا: "یا علی میری اور تمہاری خلقت ایک اصل سے ہوئی ہے اور بقیہ انسان مختلف اصلوں سے خلق کئے گئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس اصل سے آنحضرتؐ کا اپنے نسلی و نسبی امتیاز کی طرف اشارہ مقصود نہیں ہے کیونکہ اس طرح اور بہت سے افراد بھی آپ کے شریک نظر آتے ہیں۔ جبکہ اس سلسلہ میں تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی بے شمار احادیث موجود ہیں جن میں آپ نے ارشاد فرمایا: "یا علی میں اور تم دونوں ایک نور سے خلق کئے گئے ہیں۔ ہماری خلقت آسمانوں اور زمینوں سے پہلے وجود میں آئی، جب سے یہ نور ایک ہی تھا یہاں تک کہ پاکیزہ اصلاب اور طیب و طاہر ارحام سے گزرتا ہوا جناب عبدالمطلب کی صلب تک پہنچا پھر اس نور کے

دو حصے ہوئے۔ ایک حصہ عبداللہ کی صلب میں اور دوسرا حصہ ابوطالب کی صلب میں منتقل ہوا۔"

شاید یہی سبب تھا کہ آنحضرت ہمیشہ آپ کو اپنا بھائی بلکہ خود اپنا نفس فرمایا کرتے تھے اور قرآن کریم بھی آیت مباہلہ کے ذیل میں اسی مفہوم کو بیان فرماتا ہے۔

شیعہ اور اہل سنت دونوں مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ مباہلہ کے وقت حضرت رسولؐ خدا کے ہمراہ فقط علیؑ، فاطمہؑ اور حسنین علیہم السلام موجود تھے۔ لہٰذا "انفسنا" سے امیرالمومنین کی ذات کے علاوہ کوئی اور مراد نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت حضرت کی ذات اپنے جملہ صفات و کمالات کے آئینہ میں ہر اعتبار سے حیرت انگیز، معجز نما اور مظہر عجائب ہے۔" فسلام علیہ یوم ولد و یوم مات و یوم یبعث حیاً"

ہزاروں درود و سلام آپ کی ذات پر جب آپ پیدا ہوئے اور جب آپ نے شہادت پائی اور جب آپ دوبارہ جامۂ حیات میں مبعوث کئے جائیں گے۔

لاکھوں درود آپ پر اور آپ کے سچے جانثاروں پر اور خصوصیت سے ملت ایران کو آپکی پیروی مبارک ہو جس کے ثمر اثرات ابھی بار آور ہو رہے ہیں اور زمانہ حیرت سے انگشت بدنداں ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

بتشعیرہ المشاعر عرف ان لا مشعر لہ

اس نے احساس و شعور کے مرکزوں کو ایجاد کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود احساس و آلاتِ شعور نہیں رکھتا۔

میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہے میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ درس لوگوں کی فہم کے مطابق اور آسان ہو لیکن چونکہ اصل مسئلہ ہی مشکل ہے اس لئے خود آپ حضرات کو بھی غور و فکر سے کام لینا چاہئے اگر اس سلسلہ میں آپ تھکن محسوس کریں تو میں معذرت کا طالب ہوں۔

ادراک کے مراکز

روح و نفسِ انسان ایسا موجود ہے جو مادی نہیں ہے (جیسا کہ گذشتہ بحثوں میں ثابت کر چکے ہیں) مادہ سے مجرد ہے۔ اگر نفس و روح عالم مادہ سے رابطہ پیدا کرنا اور عالم مادہ کی اطلاعات حاصل کرنا چاہیں تو یہ رابطہ مخصوص حواس کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے — جیسے باصرہ — قوت باصرہ کا مرکز آنکھ ہے۔ چیزوں کا عکس پہلے آنکھ کی پتلی پر پڑتا ہے اور پھر اعصاب چشم کے ذریعہ انسان کے دماغ تک منتقل ہو جاتا ہے۔ منتقل ہونے کا یہ منظم عمل مقدمہ بنتا ہے تاکہ نفس انسان دیکھی جانے والی چیزوں کو دیکھ سکے۔

اسی طرح سنی جانیوالی آوازیں لہروں کی شکل میں ہوا میں بکھرتی ہیں اور قوت سامعہ کے ذریعہ، جس کا مرکز کان ہے، دماغ تک منتقل ہو جاتی ہیں اور انسان ان آوازوں کو سن لیتا ہے (درک کر لیتا ہے) چیزوں کی خوشبو، بدبو، قوت شامہ کے ذریعہ۔ لذتیں قوت ذائقہ کے سہارے۔ نرمی، سختی، حرارت، برودت اس قوتِ لامسہ کے

سبب جو تمام بدن میں موجود ہے، منتقل ہو کر دماغ میں پہونچتی ہے اور مذکورہ بالا چیزوں کا ادراک ہو جاتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حواس (لامسہ، باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ) خود درک نہیں کرتے بلکہ یہ ادراک کا مقدمہ ہیں جس طرح کیمرہ ادراک نہیں رکھتا اسی طرح آنکھوں کی قوت بصارت بھی ادراک نہیں رکھتی ادراک اس وقت ہوتا ہے جب چیزوں کا عکس آنکھوں پر پڑنے کے بعد منتقل ہو کر دماغ تک پہونچ جائے۔ دراصل دماغ (مغز) بھی ادراک نہیں کرتا اس لئے کہ وہ جسم ہے ادراک کرنے والا تو انسان کا "نفس مجرّد" ہے جو اس کے پس پشت موجود ہے۔ لیکن یہ "نفس مجرد" "عالم مادہ" سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے حواس خمسۂ ظاہری کا محتاج ہے۔ یہ حواس خمسہ خبر رساں آلات ہیں، نفس ان ہی کے سہارے عالم مادہ سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ البتہ مرحوم صدرالمتألهین ملاصدرا کا اس سلسلہ میں یہ نظریہ ہے کہ ابتدائی مرحلوں کو انجام دینے کے بعد قوت باصرہ کا کیمرہ اس تصویر کو دماغ تک منتقل کر دیتا ہے۔ اس وقت انسان کا نفس اپنے اندر اپنی تخلیقی قوت کے سہارے باہر سے آنیوالی صورت جیسی ایک صورت تخلیق کرتا ہے اور اسی صورت کا نفس ادراک کرتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے۔ باہر کے سارے آلات نفس کی تصویر کشی کے لئے مقدمہ بن جاتے ہیں تاکہ نفس اپنی دنیا میں باہر کی تصویر کے مشابہ تصویر بناتا ہے اور وہی تصویر براہ راست قابل توجہ ہوتی ہے جو نفس میں بنتی ہے۔ اس تصویر کو مُدرَک بالذات اور خارج میں پائی جانیوالی تصویر کو مدرک بالعرض کہتے ہیں۔ مدرک بالذات وہ ہے جس کی ذات کو ہم براہ راست درک کرتے ہیں اور اس ذات کے درک کے نتیجہ میں خارج میں پائی جانیوالی چیز درک ہوتی ہے۔

بہرحال ان پانچوں (آنکھ، کان، ناک، زبان اور تمام بدن) حواس ظاہری کو جو انسان کے اعضاء و جوارح میں پائے جاتے ہیں مشاعر خمسہ کہتے ہیں۔ مشعر اسم مکان ہے۔ یعنی یہ حواس محل شعور ہیں یا یوں کہا جائے کہ یہ حواس موا صلاتی وسائل ہیں جن کے ذریعہ سے نفس انسان عالم خارج کا شعور و ادراک حاصل کرتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ انسان براہ راست بغیر حواس کی مدد کے عالم خارج کو کیوں نہیں درک کر سکتا؟ — تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان چونکہ ایک کمزور وجود ہے، اگرچہ نفس انسان مجرد ہے، مگر ایسا ضعیف مجرد ہے جو حواس اور درک کرنیوالے آلات کا محتاج ہے وہ ان ہی آلات کے سہارے باہر کی دنیا سے رابطہ پیدا کرتا ہے کیمرہ کے بغیر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی یہ انسان کی مجبوری اور کمزوری ہے

حواس کی خاصیتیں

یہ حواس چار خاصیتوں کے حامل ہیں:

۱۔ آپ چیزوں کے ادراک کے لئے حواس کے محتاج ہیں۔

۲۔ حواس میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے یعنی جو عکس آنکھوں کے سامنے آتا ہے آنکھیں انہیں قبول کر کے محفوظ رکھتی ہیں۔

۳۔ چونکہ ان حواس کے مختلف شعبے ہیں اس لئے آپ کا علم کثرت کا حامل ہے۔

۴۔ مرکز شعور اجسام ہیں۔ قوت باصرہ خود بخود کسی چیز کو نہیں دیکھتی بلکہ آنکھوں کی مدد سے دیکھتی ہے۔ اسی طرح قوت سامعہ سننے میں کانوں کی محتاج ہے اور یہ سب جسم ہیں ـــــ اسی طرح دوسری قوتیں بھی ہیں۔

یہ چاروں خاصیتیں نقص پر دلالت کرتی ہیں اور خداوند عالم نقص سے دور ہے لہٰذا حضرتؑ کے جملہ کا مفہوم واضح ہوگیا اور وہ اس طرح کہ خدا نے ہمارے لئے مراکز شعور پیدا کئے ہیں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا یعنی خدا کا ادراک ایسا نہیں ہے کہ وہ آنکھ، کان، قوت ذائقہ، قوت شامہ یا قوت لامسہ رکھتا ہو۔ اس جملہ سے، کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہماری طرح کا شعور نہیں رکھتا؟ چونکہ خدا نے پانچ مراکز شعور ہم کو عطا کئے ہیں۔ ان حواس خمسہ میں غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان میں چار حالتیں پائی جاتی ہیں اور ہر حالت نقص پر دلالت کرتی ہے اور خدا میں کسی قسم کا نقص نہیں پایا جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم خدا کو سمیع و بصیر کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سماعت اور بصارت عین ذات ہے۔ ان میں سے کوئی چیز زائد بر ذات نہیں ہے۔ خدا سمیع و بصیر ہے مگر آنکھوں اور کانوں کی مدد سے نہیں بلکہ خدا تمام دیکھی اور سنی جانیوالی چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ وہ ہماری طرح محتاج نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کان رکھتا ہو اور ہوا کی لہریں آواز کو اس کے کانوں تک پہونچائیں۔ یہ تمام ذرائع ادراک دراصل جسم ہیں اور خدا جسم نہیں رکھتا۔ اگر معاذ اللہ وہ بھی مواصلاتی آلات کے ذریعہ اطلاعات حاصل کرتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ اس کی ذات محتاج اور مرکب ہوتی اور اس میں متاثر و منفعل ہونے کی حالت پیدا ہوتی اور وہ جسم والا ہوتا۔ لیکن یہ چاروں صفتیں خدا کی ذات میں نہیں پائی جاتیں۔

بہرحال یہ بحث بہت ہی عمیق ہے جو حضرات مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ بزرگوں کی بیان کردہ توضیحات کا بغور مطالعہ فرمائیں ـــــ مرحوم صدر المتالہین نے بھی اصول کافی کی شرح کی ہے اور کافی کے "باب جوامع التوحید" میں آپ نے اس خطبہ کی بڑی تفصیلی شرح فرمائی ہے، شائقین حضرات وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر خدا مرکز حواس کا حامل ہوتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ وہ جسم ہوتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ جسم بھی ہو اور خالق جسم بھی۔ ہم اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ذیل میں دو دلیلیں قائم کر رہے ہیں۔

جسم کی فاعلیت، فاعلیت حرکت ہے

دلیل اوّل: جسم کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا اس لئے کہ جسم کی فاعلیت صرف فاعلیت حرکت ہے۔ اس لئے کہ جسم مؤثر ہونے میں ایک مخصوص وضع ومحاذات کا محتاج ہے۔ جب وہ خاص وضع ومحاذات حاصل کر لیتا ہے تب مؤثر ہوتا ہے جیسے آگ اگر کسی چیز کو جلانا چاہئے تو اس کو اس شئے سے نزدیک ہونا پڑے گا۔ تب اس شئے کو آگ جلا سکتی ہے۔

وضع اور محاذات

جسم اگر کسی چیز پر اپنا اثر ڈالنا چاہے تو اس کو مخصوص وضع ومحاذات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب جسم دوسرے جسم سے قریب ہوگا تب اس میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے جیسے آگ کا کسی چیز کو جلانا یہ اس جسم میں حرکت پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے کہ آگ اس شئے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتی ہے۔

اگر اس معنی کو خدا کے بارے میں فرض کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خلقت عالم سے پہلے اگر خدا جسم تھا اور اس نے عالم کو پیدا کرنا چاہا تو چونکہ کوئی چیز موجود نہ تھی، عدم ہی عدم تھا اور عدم محض میں وضع ومحاذات کی گنجائش نہیں اور جسم کے اثر کے لئے وضع ومحاذات ضروری ہے ـــ بفرض محال اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ خدا جسم ہے تو وہ عالم کا خالق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ معدوم عالم کے ساتھ وضع ومحاذات کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا پھر وہ اسے خلق کیسے کر سکتا ہے، اسے لباس وجود کیسے عطا کر سکتا ہے؟ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اجسام، اجسام ہی میں اثر ڈالتے ہیں۔ البتہ وہ ان کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتے بلکہ صرف اجسام کی صورت بدل دیتے ہیں۔ جو حضرات لوہے کو پہیئے کی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ لوہے کو اپنے قریب کر کے ہتھوڑے یا دوسرے وسائل کو کام میں لاتے ہیں اس عمل سے لوہا پہیئے کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔

لہذا معلوم ہوا کہ جسم کی فاعلیت وضع ومحاذات کی محتاج ہے اس لئے محال ہے کہ خدا جسم ہو۔

ائمہؑ سے بہت سی روایتیں اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں کہ خدا جسم نہیں ہے۔ اس کا جسم ہونا محال ہے۔ چونکہ ائمہؑ کے زمانہ میں بہت سے ظاہر بین افراد خصوصاً اہل سنت سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ ایسے تھے جو آیہ "الرحمٰن علی العرش استویٰ" کے سلسلہ میں یہ خیال رکھتے تھے کہ خدا جسم ہے اور عرش پر بیٹھا ہے !! یا یہ کہتے تھے کہ خدا آسمان اوّل پر آتا ہے اور سب کو دیکھتا ہے وغیرہ، اس لئے ہمارے ائمہؑ سے ایسی روایتیں وارد ہوئی ہیں، انہوں نے چاہا کہ ایسے افراد کو سمجھا دیا جائے کہ تم خدا کے بارے میں غلط خیال رکھتے ہو خدا جسم نہیں ہو سکتا۔

جسم، جسم کی علت نہیں ہے۔

دوسری دلیل ۔ یہ دلیل صدرالمتالہین نے بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "کوئی طبیعت خود اس طبیعت کی علت نہیں ہو سکتی"۔ لہٰذا جسموں کا خلق کرنے والا "جسم" نہیں ہو سکتا ورنہ جسم، جسم کی علت ہو جائیگی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جسم، جسم کی علت ہو۔ کوئی آگ آگ کی علت نہیں ہو سکتی۔ کوئی آگ، آگ کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتی۔ بہرحال علت و معلول ایک نہیں ہو سکتے ان کو الگ الگ ہونا چاہیئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت ہے! تو میں پوچھونگا کہ یہ آگ اس آگ کے لئے علت کیوں ہے؟ اس آگ کی وجہ علیت اور موثریت کیا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس آگ کا آگ ہونا علت ہے۔ تو میں کہوں گا کہ اس دوسری آگ میں بھی جلانے کی قوت ہے لہٰذا اس (دوسری) آگ کو بھی علت ہونا چاہیئے اگر آگ ہونا (ناریت) آگ کے لئے موثر اور مبدٔ فاعلیت ہے تو معلول (جو آگ ہے) کو بھی مبدٔ فاعلیت ہونا چاہیئے۔ اس طرح دونوں علت ہوں گے۔ لہٰذا اگر یہ نظر آئے کہ ایک آگ دوسری آگ کے لئے علت بنی ہے تو پھر واضح ہے کہ آگ ہونا (ناریت) منشأ علیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کوئی دوسری ہی جہت ہے جو اس چیز میں اثر انداز ہو رہی ہے اور وہی دوسری جہت "منشأ علیت" ہے (یہ مرحوم صدرالمتالہین کی دلیل کا خلاصہ ہے)

"وبمضادته بین الامور عرف ان لاضد له"

اس نے چیزوں کو متضاد پیدا کیا اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ضد نہیں رکھتا۔

ضد کے دو معنی ہیں ایک ضد اصطلاحی ہے جو فلسفہ میں آتا ہے دوسرا ضد عرفی ہے جو اعم ہے۔

تضادِ فلسفی

فلسفیوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے " الضدان امران وجودیان یتواردان علی موضوع واحدٍ ویشترکان فی جنس قریب وبینہما غایۃ الخلاف" ضدّین دو صفت اور دو امر وجودی ہیں جو ایک جسم پر دوسرے کے بعد وارد ہوتے ہیں اور ان میں آپس میں بہت اختلاف ہے۔ مثلاً ایک سفید چیز اگر سیاہ ہو جائے یا ایک شجاع اور بہادر انسان اگر بزدل ہو جائے تو سفیدی اور سیاہی یا شجاعت اور بزدلی دو حالت وجودی ہیں جو ایک ہی شئے پر ایک دوسرے کے بعد وارد ہو رہی ہیں۔ ایک ختم ہوتی ہے تو دوسری آتی ہے ۔ مثلاً کسی انسان کا رنگ اگر سرخ و سفید ہے تو خوف کے موقع پر اچانک اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ جبکہ سرخی اور زردی کے درمیان بہت ہی تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر دونوں رنگ ہی ہیں۔ جنس کے (رنگ ہونے) اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح شجاعت اور بزدلی دونوں انسانی کیفیتیں ہیں دونوں جنس میں ایک دوسرے سے قریب ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اس کو ضدّین کہتے ہیں۔

تضادِ عرفی

عرف میں تضاد ایک عام معنی کا حامل ہے۔ چاہے دو امر وجودی آپس میں اختلاف رکھتے ہوں یا ایک امر وجودی ہو اور دوسرا عدمی ہو۔ عرف عام میں ان کو ضدین کہا جاتا ہے ۔ جیسے کسی شئے کا "ہونا" اور "نہ ہونا" آج کا فلسفہ ان دونوں کو ضدین کہتا ہے اس میں ایک وجود ہے اور دوسرا عدم ۔ درآنحالیکہ فلسفہ قدیم میں ضدّین ان دو وجودی چیزوں کو کہا جاتا تھا جن میں آپس میں اختلاف پایا جائے مثال کے لئے آپ نور و ظلمت کو لے لیں یہ عرف عام میں ضدّین کہے جاتے ہیں درآں حالیکہ نور اور روشنی امر وجودی اور ظلمت اور تاریکی امر عدمی ہیں مگر تاریکی وہ امر عدمی ہے جس میں روشن ہونے کی صلاحیت تو پائی جاتی ہے لیکن فی الحال روشن نہیں بلکہ تاریک ہے ۔ " الظلمۃ عدم النور فیما من شانہ ان یکونہ منوّراً " نور رکھنے والی چیز کا نور نہ رکھنا ظلمت ہے ۔ یہ امر عدمی تو ہے مگر عدم محض نہیں ہے بلکہ اس میں منور ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ فلسفیوں کی اصطلاح میں ضدّین دو امر وجودی ہیں اور عوارض میں سے ہیں ــــ لیکن عرف عام میں ضد، ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک ساتھ جمع ہونے کے قابل نہ ہوں، چاہے یہ دونوں چیزیں وجودی ہوں یا ایک وجودی اور دوسری چیز عدمی ہو۔ یہاں تک کہ اگر دو مستقل چیزیں ہوں اور آپس میں مشترک نہ ہوں جمع ہونے کے قابل نہ ہوں ان میں آپس میں بیر ہو تو عرف ان دونوں کو ضدّین کہتا ہے جیسے پانی اور آگ۔

اب چاہے ضد کے عرفی معنی لئے جائیں یا فلسفی دونوں صورتوں میں حضرت کے جملہ کی تفسیر اس طرح ہوگی کہ ــــ خدا نے پانی اور آگ، سرخی اور زردی، شجاعت اور بزدلی کو پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اشیاء کے درمیان ضد قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ضد نہیں ہو سکتی ــــ چاہے وہ "تضاد فلسفی" ہو یا "تضاد عرفی" اس لئے کہ زائد بر ذات دو خاصیتوں کا نام ضدّین ہے۔ یہ دو "عرض" ہیں اگر یہ کسی چیز پر عارض ہوں گی تو اس کے لئے ایک معروض کا ہونا لازمی ہے اور خدا پر کوئی چیز عارض نہیں ہوتی۔ ممکن ہے عیاذاً باللہ کوئی کہے کہ "خدا خود عرض ہے" تو ایسی صورت میں وہ معروض کا محتاج ہوگا اور اس کا محتاج ہونا محال ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ صفات خدا زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں۔

دو ضد کا موازنہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ عرض کی قسم میں سے نہیں ہو سکتی اس لئے کہ خدا کا کوئی "دوسرا" فرض نہیں کیا جا سکتا جو وہ باہم مخالفت اور عناد رکھتے ہوں ــ اس لئے کہ خداوند عالم حقیقت غیر متناہی ہے اور غیر متناہی دو نہیں ہو سکتا اگر دو ہو جائے تو دونوں محدود ہوں گے (ایک اپنی مخصوص حد میں ہوگا اور دوسرا اپنی مخصوص حد میں) اور محدود ہونے کے بعد دونوں متناہی ہو جائیں گے، لیکن ذات باری تعالیٰ ہستی غیر متناہی ہے جس کے لئے کسی قسم کی نیستی اور دوئی نہیں ہے۔

اگر ہم خدا کے لئے ضد و معاند فرض کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے دو مستقل حقیقتیں فرض کر لیں ایسی صورت میں دونوں محدود اور محتاج ہو جائیں گے۔ لیکن خدا نہ محدود ہے اور نہ محتاج بلکہ وہ بے نیاز ہے۔

اس مختصر گفتگو میں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شئے خدا کی ضد ہو اس لئے کہ جمع نہ ہونا ضد کی خاصیت ہے اور جمع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضدین ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہیں اور نفی کرنے کا لازمہ

محدودیت ہے اور خدا محدود نہیں ہے۔ اگر "تضاد فلسفی" فرض کیا جائے تو تضاد فلسفی از قبیل اعراض ہے اس طرح خدا "عرض" ہونے کے بعد محل کا محتاج ہو جائیگا۔ مگر خدا کو کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے در اصل سارا عالم خدا کے وجود کا پرتو اور جلوہ ہے اور کسی چیز کا جلوہ اس سے جدا نہیں ہوتا جس کی بنا پر تضاد لازم آئے۔

توضیح:

وضع ـــ نو مقولات عرضی میں سے ایک مقولہ ہے ـ یعنی اجزاء جسم کی ایک دوسرے سے نسبت اور پھر تمام اجزاء کی خارج سے نسبت کو وضع کہتے ہیں ۔

خواجہ فرماتے ہیں کہ وضع اس چیز کو کہتے ہیں جو بالقوۃ یا بالفعل اشارۂ حسیہ کے قابل ہو ۔ قیام و قعود جس چیز کے اجزا ہوں اور ان اجزاء میں آپس میں اور مختلف جہت میں نسبت ہو اور اس نسبت کے سبب ان سب کے لئے ایک ہیئت لازم ہوتی ہے، اسی ہیئت کو وضع کہتے ہیں ۔

محاذات ـــ دو چیزوں کا دو مکان میں اس طرح ہونا کہ وہ دونوں مختلف جہت میں نہ ہوں ۔

جناب ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

اسلامی سیاست اور کتاب وسنّت میں اس کی بنیادیں

استعماری طاقتیں دین اور سیاست کے اتحاد اور ان دونوں قوتوں کے باہم اجتماع کے تصوّر سے ہمیشہ وحشت زدہ رہی ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ دین کو سیاست سے جدا کرنے کی کوشش میں مشغول رہی ہیں ۔ البتہ دین وسیاست کے اتحاد کی مخالف صرف یہی طاقتیں نہیں ہیں بلکہ بہت سے دوسرے گروہ بھی اس خیال کے طرفدار نظر آتے ہیں ۔ مثال کے طور پر چند گروہوں کی تصویریں حسب ذیل پیش کی جاتی ہیں ۔

پہلا گروہ ــــ وہ لوگ جو دین کو صرف "پند و نصائح" اور اخلاقی احکام کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ دین و مذہب فقط اخلاق وعقائد کی دنیا تک محدود ہے اور صرف انسان کے قلبی احساسات سے سروکار رکھتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں صرف آخرت کے لئے کار آمد ہے اور اگر دنیا سے کوئی سروکار رکھتا بھی ہے تو صرف امور خیریہ یا یتیموں، تائب قیدیوں، معذوروں اور بوڑھوں کی مدد کرنا سکھاتا ہے اور بس ۔

یہ گروہ موجودہ عیسائیت کو اپنا نمونہ عمل اور آئیڈیل تصور کرتا ہے ۔ وہی عیسائیت جس نے ایک زمانے میں یورپ میں عظیم ترین حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تھی ۔ وہ عیسائیت جو نہ صرف لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتی تھی بلکہ ان کی فکروں پر بھی قابض تھی ۔ عوام ارباب کلیسا کے افکار کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ان کے فیصلوں کے خلاف کوئی فیصلہ کر سکتے تھے ۔

قرون وسطیٰ یعنی عہد "رنسانس" میں مادی ومعنوی دونوں اعتبار سے کلیسا واہل کلیسا کی زبردست ودردناک شکست نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ پورے طور سے سمٹ کر اپنی حکومت کو ایک مختصر سے علاقے "واٹیکان" میں محدود کرلیں جو نہ صرف ایک مربع کیلومیٹر سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک ملک کے بجائے کسی شہر کے ایک محلہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان ارباب کلیسا نے اپنی مذہبی تعلیمات کو چند ایسے مسائل تک محدود کر رکھا ہے جو ایک دم بے آزار ہیں اور ان کا مذہب چند اخلاقی نصائح مختصر عبادات اور مذہبی نمائشات کے سوا کچھ نہیں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو سماج میں مادی افکار کے تحت مذہب کو بشری افکار کی پیداوار مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسانوں کی متغیر زندگی مذہب کے ثابت وجامد قوانین سے ہماھنگ نہیں ہوسکتی چونکہ انہوں نے مذہب کو غلط سمجھا ہے۔ لہٰذا ان سے تعجب نہیں کہ ایسا غلط نتیجہ اخذ کریں۔ ہم انشاءا... آیندہ اس سلسلہ میں گفتگو کریں گے۔

تیسرا گروہ ان افراد کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سیاست اکثر مجبور ہوجاتی ہے کہ ان اخلاقی مسائل کو بھی پیروں تلے روندڈالے جسکا مذہب سختی سے پابند رہتا ہے۔

اہل سیاست اپنے مقصد کے حصول کے لئے بے گناہوں کا خون بہانے، عہد وپیمان توڑنے، جھوٹ، فریب، دغابازی سے بھی گریز نہیں کرتے، یہاں تک کہ مہر ومحبت اور عقل واحساس تمام پاکیزہ اصولوں کو بھول جاتے ہیں۔

ارباب سیاست کی تاریخ بہت سے ایسے چہروں کو اپنے دامن میں محفوظ کئے ہوئے ہے جنھوں نے اپنے بھائی کا خون بہایا اپنے بیٹے کو اندھا بناڈالا یا اقتدار حاصل کرلینے کے بعد اپنے قریب ترین دوستوں کو جن سے آئندہ کوئی خطرہ ہوسکتا تھا یا نہ بھی ہوسکتا تھا، صفحہ ہستی سے محو کرڈالا۔ ایسے صفات واصول کی حامل سیاست اخلاقی اصول واقدار کے حامل دین سے کیونکر علاحدہ نہ ہو۔ بھلا ایک میان میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں؟

درحقیقت اس گروہ نے بھی سیاست کے علمی وفلسفی مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ کیا اور موجودہ دھدمیں رائج مفھوم کو حقیقی مفہوم سمجھ کر اس غلط نظریہ کا شکار ہوئے ہیں ۔ ع

چون ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

بہر حال مختلف دلائل کے تحت دین کو سیاست سے علاحدہ کرنے کی رسم جن میں سب سے اہم وجہ ان دونوں کے اتحاد کی بدولت قرون وسطیٰ میں ارباب کلیسا کی رسوائی بھی شامل ہے۔ اہل یورپ کی فکری تہذیب کا جزو بن گئی ہے مغرب زدہ افراد جو نہ تو اسلام سے کوئی واقفیت رکھتے تھے اور عیسائیت اور اس کی تاریخ سے ہی آشنا تھے، ان افکار کو ہو بہو مغرب سے مشرق کی اسلامی دنیا میں کھینچ لائے اور چونکہ فکر مشرق کی کٹھ تپلی حکومتوں کی من پسند تھی اور انھیں اس خطرے سے نجات دلاتی تھی جس سے وہ خوف زدہ رہتے تھے لہٰذا وہ اس فکر سے مکمل طور پر وابستہ ہوگئیں اور انھوں نے اس نشر و اشاعت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

"دین" اور "سیاست" کو ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہئے یا یکجا رہنا چاہئے؟ اس مسئلہ کی حقیقت واقعیت کو سمجھنے اور اس سوال کا جواب دریافت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم دین اور سیاست کی صحیح اور جامع تعریف سے آشنا ہوں۔ یہی ایک راہ ہے جس کے ذریعہ ہم اس اہم سوال کا جواب دے سکتے اور صحیح فیصلہ کرسکتے ہیں۔

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ "سیاست" "حکمت عملی" کا ایک حصہ ہے جسے فلاسفہ نے "مدن" کے لفظ سے مرکب کرکے "سیاست مدن" کا نام دیا ہے۔ اس سے انکا مقصد اجتماعی نظام کی درستگی و بہتری ہے۔ "یہ سیاست مدن" "تدبیر منزل" کے پہلو بہ پہلو ہے جو فردی زندگی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

اس سے روشن الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ انسان کی روح میں دو پہلو پائے جاتے ہیں اس وجہ سے وہ دو طرح کی زندگی گزارتا ہے "فردی زندگی" اور "اجتماعی زندگی"

فردی اور خصوصی زندگی میں انسان اپنے گھر کے ماحول اور اس کی چہار دیواری کے اندر حاکم ہوا کرتا ہے اور مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے لیکن اجتماعی و عمومی زندگی میں اگر ہر شخص یہ چاہے کہ نظام معاشرہ میرے منشاء کے مطابق معین ہو تو یہ نظام بہر حال درہم برہم ہوجائے گا۔ لہٰذا جب سے انسان نے اپنے آپ کو پہچانا ہے پورے سماج میں ایک ہماہنگ نظام کو قبول کرنے پر مجبور رہا ہے۔ اور اس کے نفاذ کے لئے ایک مرکز کا قائل ہوا ہے اور نظام کی اسی صحیح گردش کو سیاست کہتے ہیں۔ بنا برایں ایک آسان اور سادہ سی تعریف کے طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ "سماج پر حاکم نظام کے رو براہ کرنے اور اجتماعی حیثیت سے لوگوں کے روابط میں نظم و ضبط پیدا کرنے کو سیاست کہتے ہیں۔"

اب ہم پھر "مذہب" کی طرف پلٹتے ہیں اور دین و مذہب کی ایک صحیح تعریف معلوم کرنے کے لئے اس کے اصل مقاصد کا جائزہ لیتے ہیں۔ کیونکہ (کسی چیز کے مقاصد ہی ہمیشہ اس کی تعریفات کے اصل عنصر کو تشکیل دیتے ہیں اور اس وقت ہمارے لئے نمونہ دین اسلام ہے)

قرآن مجید اور اسلام کے دوسرے مصادر (سنّت) میں مذہب کے کئی مقاصد بیان کئے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک مذہب کے علاوہ رخ اور جداگانہ تعریف کو بیان کرتا ہے۔

ایک جگہ قسط و عدل قائم کرنے کی بات کہی گئی ہے اور انبیاء کی بعثت کا مقصد انبیاء کی رہنمائی میں عام انسانوں کے ذریعہ قسط و عدل قائم کرنا بتایا گیا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید/۲۵)

یعنی بلا شبہ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن و واضح دلیلیں اور معجزے دیکر بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں۔

یہ نکتہ غور طلب ہے کہ یہاں صرف اجتماعی عدالت کو عام کرنا ہی مقصد نہیں ہے بلکہ یہاں بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ خود سے اجتماعی عدالت کی طرف کھنچ کر آئیں اور خود عدل و انصاف برقرار کریں۔

دوسری جگہ "تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفس" یعنی انسان کی فکری و اخلاقی ترقی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم ایک مختصر عبارت میں اپنے پرمعنی انداز میں بیان فرماتا ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (جمعہ/۲)

یعنی وہ خدا وہی تو ہے جس نے امیّوں میں ان ہی میں کا ایک رسول بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے خدا کی نشانیوں کی تلاوت کرتا ان کو پاک کرتا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس کے پہلے وہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

تیسری جگہ قرآن نے مذہب کا مقصد "قید و بند سے انسانوں کی آزادی" بتایا ہے بلکہ اسے دین کے اصلی مقصد کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اسے پیغمبر اسلامؐ کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری" شمار کیا ہے:

توحید ۴،

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (اعراف/۱۵۷)
جو پھندے اور زنجیریں ان پر پڑی ہوئی تھیں (رسول) انھیں ان پر سے ہٹا دیتا ہے۔

۴۔ ایک اور جگہ مندرجہ بالا تینوں مقاصد کو ایک مختصر سے جملہ میں خلاصہ کر کے "حیات" اور (انسانی زندگی) کے عنوان سے پیش کرتا ہے اور تمام بنی نوع انسان کو اس کی دعوت دیتا ہے کہ "اس پیغمبر کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں ایسے اصول کی طرف دعوت دے رہا ہے جس میں تمہاری حیات اور زندگی کے جلوے آشکار ہیں:

اذا دعاکم لما یحییکم (انفال/۲۴)

دین کی اس منطق اور ایسی تعبیر کو دیکھتے ہوئے کیا دین سے مندرجہ بالا تعریف کے تحت سیاست کو جدا کیا جا سکتا ہے؟ کیا حکومت کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ان مقاصد کا حصول ممکن ہے؟

بھلا کوئی شخص صرف اخلاقی نصائح کے ذریعہ "قسط و عدل" کو قائم کر سکتا ہے اور ان ظالموں ستمگروں کے ہاتھوں سے جو کسی بھی اخلاق کے پابند نہیں ہیں کمزوروں اور ستم دیدہ افراد کو نجات دلا سکتا ہے؟

بھلا کوئی شخص وعظ و نصیحت کے ذریعہ مستضعفین و مظلومین کے حقوق پر طاقت کے نشہ میں چور ظالموں کے غاصبانہ حملوں کو روک سکتا ہے؟!

کیا ہم صرف بیٹھے ہوئے ظالموں کی پرخوری اور مظلوموں کی بھوک مری کا تماشا دیکھتے رہیں اور ظلم سے مقابلہ کے لئے صرف التماس و درخواست کا راستہ اپنائیں اور کیا ہمارا فریضہ یہ ہے کہ "کظۃ الظالم وسغب المظلوم" یعنی ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک مری دیکھ کر بھی خاموش رہیں۔ کیا صرف گفت و شنید کے ذریعہ بغیر تازیانہ و شمشیر اٹھائے کسی سرکش و بے لگام گروہ کو سبق سکھایا جا سکتا ہے؟! یہ تو رہی قسط و عدل قائم کرنے کی بات۔

جہاں تک انسان کے پیروں میں پڑی زنجیروں کو توڑنے کی بات ہے تو کیا کوئی صرف دوستانہ نصیحتوں کے ذریعہ ان مظلوموں کے پیروں میں مدتوں سے پڑی ہوئی زنجیروں کو توڑ سکتا ہے جنھیں اہل ہوس اپنی جاگیر تصور کرتے ہیں بنیادی طور سے استعمار کا وجود اور اس کی ساری قوت و قدرت ان ہی زنجیروں میں پوشیدہ ہے اور وہ اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ اس کی حفاظت و بقا میں مشغول رہتا ہے۔ ہر روز ظلم و ستم کی ایک نئی زنجیر کے ذریعہ مظلوموں کو جکڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے عیب نہیں بلکہ ہنر سمجھتا ہے۔ جب تک ایک ایسی حکومت وجود میں نہ آئے جس کے صحیح افکار کی موجیں ان قید و بند میں جکڑے ہوؤں کو بیدار کر دیں اور ان میں ان زنجیروں کو توڑنے کے لئے جرأت، ہمت، قوت، تعلیم اور وحدت عمل کے جذبات پیدا نہ کر دیں تب تک ان اسیروں کی آزادی سراسر محال ہے۔

تعمیر اخلاق، تزکیہ نفس اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے تو بات بہت واضح ہے کیونکہ استعمار کا جابرانہ سیاست کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ نرسری اسکولوں سے یونیورسٹیوں تک اور عوامی سطح سے لے کر دانشوروں اور مفکروں تک لوگوں کے اذہان و افکار میں استعماریت کی اس طرح پرورش کرتے رہیں کہ استعمار کی بنیادیں محکم و استوار ہوجائیں اور معاشرہ میں اٹھنے والی کسی بھی مصلح کی آواز ان کے شور و غل میں گم ہو کر رہ جائے۔

ایک کیا ایک ہزار پیغمبر بھی بیک وقت لوگوں کے ارشاد اور تبلیغ کے لئے مبعوث کئے جائیں اگر انھیں کسی اسکول اور کالج میں جانے نہ دیا جائے اور نہ ذرائع ابلاغ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ سب سے پہلے یہ پیغمبر تبلیغی و فکری مراکز پر قابض ہوجائیں تبھی کچھ کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہو جو اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے فسق و فجور کو عام کرنے کیلئے کوشاں ہوں، اپنے مقاصد کی تکمیل کی خاطر ہوا و ہوس کا بازار گرم کر رہے ہوں تاکہ عوام ان چیزوں میں غرق ہو کر ان کے کرتوتوں سے غافل ہوجائیں، اخلاقی برائیوں کو کھیل کود اور ورزش، یہاں تک کہ تعلیم و تربیت کے پیرایہ میں پیش کر کے لوگوں کو گمراہ کریں تو مربی اخلاق کیا کر سکتا ہے؟ بنابریں ان تمام مقاصد کا حصول ایک حکومت کی تشکیل کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ حکومت و قدرت حاصل کئے بغیر صحیح تعلیم و تربیت، اخلاق حسنہ اور انسانی فضائل کو معاشرہ میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تعمیر اخلاق، تہذیب نفس، تعلیم و تربیت اور انسانی اقدار کی پرورش صرف اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ کی تہذیب و ثقافت پر تسلط حاصل ہو، ثقافتی مراکز پر قبضہ ہو اور ان تمام وسائل کو بروئے کار لایا جائے جو صرف حکومتوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

وہ لوگ جو دین کو سیاست سے جدا کرنا چاہتے ہیں، کیا ان دونوں کی صحیح اور واقعی تعریف سے بھی واقف ہیں؟ ہرگز نہیں۔

جو لوگ سماج اور معاشرہ سے کنارہ کشی کو ہی دین و تقویٰ تصور کرتے ہیں کیا قرآن کی مذکورہ آیات میں بیان شدہ مقاصد کے بارے میں بھی کبھی غور کرتے ہیں؟ شاید نہیں۔

اگر ہم دین کو سیاست سے جدا کر دیں تو کیا دین کا کوئی مفہوم باقی رہ جاتا ہے؟؟

جناب سید احمد فہری

ترجمہ: جناب سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

آفات مناظرہ

مناظرہ کے آفات اور اخلاقی اعتبار سے اس کے نقصان دہ پہلوؤں پر روشنی ڈالتے شہید ثانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

عزیزانِ گرامی، اگر مناظرہ سے تمہارا مقصد اپنے مدِمقابل کو شکست دینا اپنی تیزی و طراری کے بل بوتے پر اسے بیان و کلام سے عاجز کرنا ہے، یا مناظرہ کے ذریعہ اپنے فضل و کمال کا شہرہ مقصود ہے تو یاد رکھو ایسا مناظرہ ہر ان بری خصلتوں کا سرچشمہ ہے جو خدا کے نزدیک مذموم اور ابلیس کی نظروں میں ممدوح ہے۔

جب ایسے مناظرے کا تقابل دوسری بری خصلتوں مثلاً غرور، نخوت، ریا، حسد، خودستائی اور منصب طلبی سے کرتا ہوں تو ان برائیوں کے درمیان مناظرہ کی وہی حیثیت نظر آتی ہے جو زنا، قتل اور اتہام کے درمیان شراب نوشی کی ہے۔ کیونکہ اگر کسی کو زنا، قتل، اتہام اور شراب نوشی پر مجبور کیا جائے تو وہ مذکورہ گناہوں میں شراب کے گناہ کو خفیف تصور کرتے ہوئے ترجیح دے گا، جبکہ ایسا نہیں کیونکہ شراب نوشی کے بعد ہر گناہ کے ارتکاب کا امکان فراہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے مناظرے کے ذریعہ اپنے حریف کو ساکت و عاجز کرنا چاہا تو صرف اس جذبہ کے پیدا ہو جانے کے بعد مناظر حسد، ریا، خود فراموشی جیسی بری خصلتوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

شہید ثانی علیہ الرحمہ کے ان خیالات کو ایک بے عمل شاعر نے نظم کیا ہے۔ اس کی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے اس کا نام تو نہیں لکھ رہا ہوں لیکن ـــــ یہ دیکھو کیا کہہ رہا ہے یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے، پر عمل کرتے ہوئے، یا حکمت مومن کا کھویا ہوا سرمایہ ہے جس کسی جگہ مل جائے وہ اس کا صحیح حقدار ہے۔ کو

پیش نظر رکھتے ہوئے اشعار لکھ رہا ہوں ؎

ابلیس شبی رفت بہ بالین جوانی ⁂ آراستہ با شکل مہیبی سر و بر را
گفتا کہ منم مرگ و اگر خواہی زنہار ⁂ باید بگزینی تو یکی زین سہ خطر را
یا آن پدر پیر خودت را بکشی زار ⁂ یا بشکنی از خواہر خود سینہ و سر را
یا خود زمی ناب کشی یک دو سہ ساغر ⁂ تا آنکہ بپوشم ز ہلاک تو نظر را
لرزید ازین بیم جوان بر خود و جا داشت ⁂ کز مرگ فتد لرزہ بہ تن ضیغم نر را
گفتا پدر و خواہر من ہر دو عزیزاند ⁂ ہرگز نکنم ترک ادب این دو نفر را
لیکن چو بہ می دفع شر از خویش توان کرد ⁂ می نوشم و با دی بکنم چارۂ شر را
جامی دو بنوشید و چو شد خیرہ ز مستی ⁂ ہم خواہر خود را زد و ہم کشت پدر را

ابلیس ایک رات ایک نوجوان کے سرہانے نہایت مہیب و بھیانک شکل میں آن پہنچا، اور اس سے کہا میں موت ہوں اگر میرے پنجہ سے رہائی چاہتا ہے تو یا اپنے ضعیف باپ کو قتل کر، یا اپنی بہن کو مار و پیٹو، یا شراب کے چند جام پی لو،

موت کے تصور نے جوان کے جوڑ بند میں لرزہ پیدا کر دیا اور اس نے موت سے رہائی کے لئے اپنے تئیں فیصلہ کیا کہ باپ اور بہن تو مجھے عزیز ہیں ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا لیکن بہتر ہے شراب کے چند ساغر پی لوں تاکہ اس خطرہ سے چھٹکارا مل جائے یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس نے شراب پی لی اور جب شراب نے بدمست کیا تو پھر باپ کو قتل بھی کیا اور بہن کو مارا پیٹا بھی۔

اب ملاحظہ فرمائیں ان آفتوں کو جو عدم اخلاص کی وجہ سے سامنے آتی ہیں۔

۱۔ اگر مناظرہ خوشنودی خدا کی خاطر انجام نہیں پاتا تو اس جذبہ کی وجہ سے مناظر بے جا برتری کا شکار ہوتا ہے اور حق کو ٹھکرا دیتا ہے اور جو لوگ خدا کے لئے مناظرہ نہیں کرتے ان میں ایک ایسی کیفیت و حالت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے حق ان کی نظروں میں مکروہ ناپسندیدہ ہو جایا کرتا ہے۔

اگر مد مقابل صحیح و حق بات بھی کہتا ہے تو پوری ایڑی چوٹی کا زور اس کے انکار پر صرف کر دیتا ہے اور جس طرح بن پڑتا ہے اس کا انکار کیا کرتا ہے۔ بہ انداز رفتہ رفتہ اس کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ نتیجہ میں جب کبھی کوئی بات سنے گا خواہ حق ہی کیوں نہ ہو چاہے گا کہ اس پر اعتراض کرے تاکہ اس کے فضل و علم کا اظہار ہو سکے

میں گذشتہ قسطوں میں، بحث و تکرار اور بے جا خود نمائی کی مذمت کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ بے جا بحث و تکرار تکذیب حق کا سبب بنتی ہے، پروردگار عالم نے تکذیب حق کو اپنی ذات پر افتراء و تہمت کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

ومن اظلم ممن افتری علی اللّٰہ کذباً او کذب بالحق لما جاءہ (الزمر/۳۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھے یا جب اس کے پاس حق بات پہنچے تو جھٹلا دے۔

جس طرح بے جا برتری خدا کی ناراضگی و غضب اور اس کی تکذیب کا سبب بنتی ہیں اسی طرح کبر و نخوت بھی حق کے انکار کا باعث ہوا کرتی ہے اور جب انسان لاطائل گفتگو بے جا بحث و تکرار کیا کرتا ہے اس وقت کبر و نخوت لاشعوری طور سے اس کے وجود میں فروغ پاتی رہتی ہے۔

ابودرداء، ابوامامہ، واثلہ اور انس کا بیان ہے کہ ایک دن ہم لوگ آپس میں کسی مذہبی موضوع پر بحث و تکرار کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا، ہم لوگوں کو بے جا تکرار کرتے ہوئے دیکھ کر اس قدر شدید ناراض ہوئے کہ کبھی ہم لوگوں نے اس قدر خشمگین نہیں دیکھا تھا۔ پھر ہم لوگوں سے فرمایا:-

تمہارے پہلے والے ان ہی عادتوں کی وجہ سے ہلاک ہوئے، بے جا بحث و مباحثہ سے بچو، جو لوگ اس کے خوگر ہیں بلاشبہ گھاٹے میں ہیں۔ یہ یاد رکھو جو لوگ اس قسم کی بے جا گفتگو کرتے ہیں، میں روز قیامت ان کی شفاعت نہیں کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں جس کسی نے بے جا گفتگو سے اجتناب کیا میں اسے آخرت میں تین مکان دلاؤنگا، اس میں سے ایک باغ جنت میں ہوگا، ایک درمیان جنت اور ایک اس کے نمایاں ترین حصہ میں۔

بے جا خود نمائی و گفتگو سے بچو کیونکہ پروردگار عالم نے بت پرستی کے بعد جس چیز سے نہیں روکا ہے وہ یہی خود نمائی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:-

جو شخص خدا سے اس طرح ملاقات کرے کہ خوش اخلاق ہو، جلوت و خلوت میں خدا سے ڈرنے والا ہو اور باوجودیکہ حق اس کے ساتھ ہو لیکن بحث و تکرار سے پرہیز کرے

تو ایسا شخص روز آخرت جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو۔

انما هلك من كان قبلكم بهذا، ذروا المراء فان المؤمن لا يمارى، ذروا المراء فان المماري قد تمت خسارته ذروا المراء فان المماري لا اشفع له يوم القيامة، ذروا المراء فانا زعيم بثلاثة ابيات في الجنة، في الجنة و وسطها واعلاها لمن ترك المراء وهو صادق ذروا المراء فان اول ما نهاني عنه ربي بعد عبادة الاوثان: المراء۔

ثلاث من لقى الله عز وجل بهن دخل الجنة من اى باب شاء، من حسن خلقه وخشى الله فى الغيب والمحضر، وترك المراء وان كان محقاً۔

اسی مضمون کو امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے جد بزرگوار امیرالمومنین کے الفاظ میں اس طرح پیش فرماتے ہیں جس کا متن و مفہوم یہ ہے:۔

اياكم والمراء والخصومة فانهما يمرضان القلوب على الاخوان وينبت عليهما النفاق۔

خود نمائی و باہمی اختلاف سے بچو کیونکہ یہ دونوں عادتیں ایک دوسرے سے بدظنی اور آپس کے اختلاف کا سبب ہوا کرتی ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ جناب جبرئیل نے جناب مرسل اعظمؐ سے کہا "ایاك وملاحاة الرجال" "حبیب خدا، لوگوں سے حجت و تکرار سے بچتے رہئے"۔

۲۔ "ریا" خود نمائی

مناظرہ کے اخلاص و ثواب کو مناظر کی ریاکاری و خود نمائی تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ جب مناظرہ خدا کے لئے نہیں ہوتا اس وقت مناظر کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مد مقابل کو زک دیکر عوام کے دل کو جیت لے اور ان کی توجہ کا مرکز بن جائے، اس ریاکاری کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ

مناظر کو عوام کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے اور اس طرح فتح کا سہرا اس کے سر بندھ جاتا ہے۔
درحقیقت یہ ریاکاری وہ درد بے درمان اور مرض لا علاج ہے جسکی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے:۔
والذین یمکرون السیئات لھم عذاب شدید ومکر اولئک ھو یبور (فاطر/۱۰)
آیت کی تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصداق وہ ریاکار ہیں جو مکر وفریب کے ذریعہ ناپسندیدہ افعال انجام دیتے ہیں۔
جبکہ پروردگار عالم نے ہمیں ناپسندیدہ امور وافعال سے ان الفاظ میں روکا ہے۔
فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا (کہف/۱۱۰)
جس شخص کو خدا کی ملاقات کا اشتیاق ہے وہ پسندیدہ اعمال بجالائے اور خدا کی عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دے۔ یعنی جو کام بھی کرے خدا کی رضا وخوشنودی کے لئے انجام دے۔
عزیزو! یاد رکھو ریاکاری درپردہ شرک ہے۔ اس کی طرف مرسل اعظمؐ نے اپنے حاضرین کو متوجہ فرمایا ہے: ان اخوف ما اخاف علیکم الشرک الاصغر قالوا وما الشرک الاصغر یا رسول اللہ؟ قال: الریا یقول اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ اذا جازی العباد باعمالھم - اذھبوا الی الذین تراؤن فی الدنیا فانظروا ھل تجدون عندھم الجزاء؟ "- وقال (ص): استعیذوا باللہ من جب الحزن قیل وما ھو یا رسول اللہ؟ قال: واد فی جھنم اعد للمرائین - وقال (ص): ان المرائی ینادی یوم القیامۃ یا فاجر، یا غادر، یا مرائی، ضل عملک وبطل اجرک اذھب فخذ اجرک ممن کنت تعمل لہ۔

مجھے خوف ہے کہیں تم لوگوں میں "شرک اصغر" نہ پیدا ہو جائے۔
اصحاب نے سوال کیا: یارسول اللہ! "شرک اصغر" کیا ہے؟
حضرت نے فرمایا — ریاکاری وخودنمائی۔
پھر حضرت نے فرمایا:
"قیامت کے دن خدا جب اپنے بندوں کو ان کے اعمال کی سزا وجزا عطا کر رہا ہوگا، اس وقت ریاکاروں سے فرمائے گا۔
دنیا میں جن لوگوں کو دکھاتے ہوئے عمل کئے تھے، ان ہی سے اپنے عمل کی جزا طلب کرو۔
دیکھو! کیا وہ تمہیں تمہارے عمل کی جزا دے سکتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے آہِ سرد بھرتے ہوئے فرمایا :۔
خدا قعرِ مذلت (ذلت و رسوائی) میں گرنے سے بچالے ۔
حاضرین نے پوچھا : یہ کیا ہے ؟
آنحضرت نے فرمایا :۔
جہنم میں ایک درّہ ہے جسے پروردگار عالم نے ریاکاروں کے لئے مخصوص کیا ہے ۔
حضرت نے مزید فرمایا :۔
قیامت کے دن ریاکار کو بدکار، مکار، فریبی کہکر پکارا جائے گا اور ندا کرنے والا اس سے کہے گا، تونے جو کچھ عمل کئے تھے اکارت ہوگئے ۔ جا اس سے اپنے عمل کا تقاضا کر جسے دکھا کر کیا کرتا تھا ۔
جراح مدائنی کہتا ہے امام جعفر صادق علیہ السلام نے قرآن کی اس آیت فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً کی تفسیر میں فرمایا ۔
جو شخص اس مقصد سے کار خیر کرے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس کے کار خیر کا چرچا اور شہرہ عوام میں گشت کرے تو اسی عمل کو شرک در عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے ۔
امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :
ان الملک لیصعد بعمل العبد مبتھجا بہ ، فاذا صعد بحسناتہ یقول اللہ عزوجل اجعلوھا فی السجین ، انہ لیس ایای اراد بہا
خداوند بزرگوار کا ارشاد ہے کہ جس وقت فرشتے بندوں کے اعمال کو لیکر بشاش و بشاش پروردگار عالم کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں تو خدا فرماتا ہے ـــ ان اعمال کو مقام سجینؔ میں رکھو، کیونکہ اس نے عمل کرتے وقت میری رضا و خوشنودی کو مدنظر نہیں رکھا تھا ۔
حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے ریاکاری کو ان الفاظ میں پہچنوایا ہے : ثلاث علامات للمرائی ینشط اذا رای الناس ویکسل اذا کان وحدہ ویحب ان یحمد فی جمیع امورہ ۔
ریاکار کی تین پہچان ہے، جب تک لوگ اسے دیکھتے رہتے ہیں چاق و چوبند رہتا ہے، تنہائی میں سست و کاہل اور ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف و توصیف کرتے رہیں ۔

ؔ سجین جہنم میں ایک جگہ ہے جہاں کفار و مشرکین کے اعمال محفوظ رکھے گئے ہیں جیسی

توحید ۸۲

میں ریاکے اسباب وعلل اور اس سے بچنے کے طریقے مستقل کتابچہ کی شکل میں امام خمینی دام ظلہ کے مفید وبیش قیمت افکار ومطالب کے ساتھ تحریر کرچکا ہوں اس کا مطالعہ قارئین کے لئے بے حد مفید ہوگا۔

۳۔ غیظ وغضب

مناظرہ کی خرابیوں اور اس کے آفات میں غیظ وغضب کو نمایاں حصہ حاصل ہے۔ عموماً مناظر غیظ وغضب سے دوچار رہتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب اس کی دلیلوں کو اس کا حریف رد کردیتا ہے اور اس کے بیان کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اعتراض کرتا ہے اور بڑھی اس وقت جب عوام کا ایک حلقہ ومجمع اس کے گرداگرد ہو۔ ایسے ماحول میں وہ برہم ہوجاتا ہے اور غیظ وغضب اس کے چہرہ پر جھلکتا رہتا ہے۔ ممکن ہے کبھی اس کی برہمی حق بجانب ہو اور کبھی بے جا وبے محل۔

بہرحال خدا ورسولؐ نے ہنگام مناظرہ غیظ وغضب کی مذمت فرمائی ہے اور سختی سے مناظر کو اس سے روکا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

اذ جعل الذین کفروا فی قلوبهم الحمیة حمیة الجاهلیة فانزل الله سکینته علی رسوله (فتح/۲۶)

جب کافروں نے اپنے دلوں میں زمانہ جاہلیت کی ضد ٹھان لی تھی تو اس وقت خدا نے اپنے رسول پر تسکین نازل فرمائی۔

پروردگار عالم نے اس آیت میں کفار کی ان کے باطل عقیدہ پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے مذمت فرمائی ہے۔ انکی اس ضد اور ہٹ دھرمی کا سرچشمہ ان کا غیظ وغضب ہے اور مومنین کی تعریف وتوصیف کی اور اس مدح کا سبب غیظ وغضب سے الگ رہنے کو قرار دیا ہے۔

عکرمہ سے آیہ قرآنیہ "سیداً وحصوراً" کی تفسیر کے ذیل میں منقول ہے کہ:۔

"سید وہ شخص ہے جس پر غصہ غالب نہ ہوسکے۔"

غیظ وغضب کی مذمت میں جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ اور دوسرے محدثین نے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ میں بطور نمونہ اس جگہ چند کا تذکرہ کررہا ہوں۔ خواہشمند حضرات شہید کی "منیۃ المرید" کی طرف رجوع فرمائیں۔

- کہا جاتا ہے کہ ۔ ایک شخص نے مرسلِ اعظمؐ سے عرض کی یا رسول اللہ، مجھے مختصر نصیحت فرمائیں۔
حضرتؐ نے جواب میں فرمایا ۔ "غصّہ مت کرو۔"
اس شخص نے دو بارہ پھر بھی سوال کیا۔
حضرتؐ نے جواب میں پھر بھی فرمایا "غصّہ مت کرو"۔
- حضرت رسولؐ خدا سے کسی نے سوال کیا ۔ کون سی چیز انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے ؟
حضرتؐ نے فرمایا ۔ "غصّہ"۔
- مرسلِ اعظمؐ فرماتے ہیں : ۔
جس نے اپنے غصّہ پر قابو پالیا خدا اس کے عیب پر پردہ ڈال دیتا ہے۔
- ابو درداء کا بیان ہے میں نے آنحضرتؐ سے عرض کی کہ مجھے کوئی ایسی چیز تعلیم فرمائیں جس سے میں اہل بہشت میں شامل ہو جاؤں۔
حضرتؐ نے فرمایا : ۔
غیظ و غضب چھوڑ دو۔
- مرسلِ اعظمؐ نے فرمایا ۔ غیظ و غضب و برہمی ایمان کو اس طرح تباہ کر دیتی ہے جس طرح شہد کو ایلوا فاسد کر دیتا ہے۔
- جب انسان غیظ و غضب کرتا ہے اس وقت جہنم کے دہانے پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔

۴ ۔ کینہ ۔

چوتھی چیز جو مناظر میں نہیں ہونی چاہئے کینہ ہے۔ کینہ انسان میں غیظ و غضب کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ جب آدمی اپنے غم و غصہ کا مداوا نہیں کر پاتا اور اپنے بھرے نفس کو سکون نہیں دے پاتا اس وقت یہی غم و غصہ انسان کے باطن میں ایک اثر مرتب کرتا ہے جس کا نام "کینہ" ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ناراضگی و برہمی کے سبب انسان اپنے مدمقابل کی طرف سے احساسِ نفرت

وعداوت کرنے لگتا ہے۔

"کینہ" انسانی معاشرہ میں نہایت بھیانک خطرے کی گھنٹی ہے۔

مرسل اعظمؐ کا ارشاد ہے:۔

المومن لیس بحقود

مومن کینہ پرور نہیں ہوتا۔

"کینہ" غم و غصہ کا نتیجہ ہے اور اپنے دامن میں مختلف برائیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ مثلاً کینہ پرور اپنے مدمقابل سے ہمیشہ بے زار رہتا ہے اور مناظرہ کے سبب پیدا ہوجانے والی چشمک و شکست کو یاد کرکے اس سے قطع تعلق رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بدکلامی، غیبت، اس کے رازوں کو فاش کرنا اس کے عیبوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانا جائز سمجھتا ہے۔

کینہ پرور جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے اپنی رفتار و گفتار سے مدمقابل کو ایذاء پہنچانے کی سعی کیا کرتا ہے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "کینہ پرور" اپنے حریف کو ایذا نہ بھی پہنچائے، اس کے راز فاش نہ کرے اس کی اہانت و ذلت کا باعث نہ ہوتا ہم "کینہ پرور" اپنے دل میں اس کی طرف سے میل تو رکھتا ہی ہے جس کے سبب اخوت و ہمدردی و مواسات و مساوات کا وہ حق ادا نہیں کرپاتا جس کا مذہب نے حکم دیا ہے، اور آخر کار یہ رنج و ملال باعث ہوتا ہے کہ انسان اس فضل الٰہی سے محروم رہے جو خدا نے اخوت و مساوات کے صلہ میں قرار دیا ہے اور اس مرتبہ تک نہ پہونچ سکے جو خدا نے باہمی انس و محبت میں معین فرمایا ہے۔

جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے "موضوع کینہ" سے متعلق چند حدیثوں اور ایک نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

شہید لکھتے ہیں:۔

اگر کینہ پرور کو انتقام کا موقع مل جائے تو وہ درج ذیل تین باتوں میں سے کسی ایک کو ضرور اختیار کرتا ہے۔

۱۔ اپنے حریف سے بالکل نپا تلا بدلہ لیتا ہے نہ ذرہ برابر کم اور نہ جو برابر زیادہ۔ یہ انتقام کا انداز مطابق عدالت ہے اور صالحین و خدا رسیدہ حضرات کا شیوہ ہے۔

۲۔ مدمقابل سے انتقام لینے کے بجائے اسے بخش دیتا ہے اور اس پر مزید احسان کرتا ہے ۔ اس طرح کا برتاؤ صادقین کی شان ہے اور اسے "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔

۳۔ اس کے عمل سے زیادہ سزا دیتا ہے ۔ یہ ان لوگوں کا چلن ہے جو نہایت پست و ذلیل ہوا کرتے ہیں ۔ ان کا یہ عمل "ظلم و جور" کی نشاندہی کرتا ہے ۔

مومنین کو چاہئے اگر اپنے حریف کو معاف کر کے صادقین کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم عدل و انصاف کا بہرحال پاس و لحاظ رکھیں ۔ اگرچہ پروردگار عالم نے مرسل اعظمؐ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کو درگزر کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور اس پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے ۔ قرآن کہتا ہے :۔

خذ العفو (اعراف/۱۹۸)

اے پیغمبر! عفو و درگزر کو اپنا شیوہ قرار دے لیں ۔

یا مثلاً سورہ بقرہ میں فرماتا ہے :۔

و ان تعفوا اقرب التقویٰ (آیت/۲۳۸)

آپ کا درگزر کر دینا تقویٰ و پرہیزگاری کے لئے قریب ترین زینہ ہے ۔

مرسل اعظم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

ثلاث ۔ والذی نفسی بیدہ ان کنت حالفا علیھن ۔ ما نقصت صدقۃ من مال فتصدقوا ، ولا عفا رجل عن مظلمۃ ینبغی بھا وجہ اللہ تعالیٰ الا زاد اللہ تعالیٰ بھا عزاً یوم القیامۃ ولا فتح رجل باب مسئلۃ الا فتح اللہ علیہ باب فقر ۔

تین چیزوں کے لئے خداوند عالم کی ، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے قسم کھاتا ہوں ۔ (۱) "صدقہ" چونکہ صدقہ نکالنے سے مال میں کمی نہیں ہوتی لہٰذا تم لوگوں کو چاہئے صدقہ نکالو ۔ ۲۔ "عفو و درگزر" جو شخص خدا کی رضا و خوشنودی کیلئے اپنے ظالم کو معاف کر دے خدا قیامت کے دن اس کے درگزر کی وجہ سے اہل محشر میں اس کی عزت دوبالا کر دے گا ۔ ۳۔ "سوال" کوئی شخص نہ کسی سے سوال کرے اور نہ کسی کے در پر جائے ۔ کیونکہ جس کسی نے ایسا کیا خدا فقر و نکبت کا دروازہ

اس پر کھول دے گا۔

مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب ذیل حدیث میں بھی عفو و درگزر کی ترغیب دلائی ہے۔

خاکساری و فروتنی انسان کے لئے عزت و رفعت کا سبب ہوتی ہے۔

لوگو، تواضع کرو تاکہ خدا تمہیں سربلند کرے، عفو و درگزر کے خوگر بنو تاکہ خدا کے نزدیک معزز و مکرم ہو سکو، صدقہ زیادتی مال کا سبب ہوتا ہے لہٰذا صدقہ نکالو تاکہ خدا تم پر رحم کرے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

التواضع لایزید العبد الا رفعة فتواضعوا یرفعکم اللہ والعفو لا یزید العبد الا عزا فاعفوا یعزکم اللہ والصدقة لا تزید المال الا کثرة فتصدقوا یرحمکم اللہ۔

مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام نے معبود سے سوال کیا، میرے معبود تیری بارگاہ میں تیرے بندوں میں سب سے زیادہ کون معزز و مکرم ہے۔

جواب میں فرمایا:۔

جو انتقام لے سکنے کے باوجود معاف کر دے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

قال موسیٰ: یارب ای عبادك اعز علیك؟

قال: الذی اذا قدر عفی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ فی خطبة: الا اخبرکم بخیر خلائق الدنیا والاخرة العفو عمن ظلمك وتصل من قطعك والاحسان الی من اساء الیك، واعطاء من حرمك۔

جد بزرگوار نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: حاضرین، اگر تم کہو تو میں تمہیں دنیا و آخرت

کہ خوش بخت و سعید انسان کی نشاندہی کروں سنو، وہ شخص خدا کے نزدیک اس کے بندوں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہے جو اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو بخش دے اور اس شخص سے رشتہ قرابت استوار رکھے جو اس سے قطع کر لے اور اس پر احسان کرے جو اس کے ساتھ بدسلوکی کرے اور اس پر داد و دہش کرے جو اسے محروم رکھے۔

توحید ۸۸

جناب احمد آذری قمی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

انقلابات

انقلاب مہدیؑ سے پہلے

(۲)

ج: کچھ ایسی روایتیں ہیں جن میں شیعوں سے تاکید کی گئی ہے کہ ہر شخص کے ساتھ قیام و خروج کے لئے آمادہ نہ ہو جاؤ (اگرچہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان ہی سے کیوں نہ ہو) لیکن اگر زید بن علی علیہ السلام کی مانند کوئی شخص طاغوتی طاقت کو نیست و نابود کرنے کے لئے قیام کرے اور باطل دعویٰ بھی نہ رکھتا ہو بلکہ اس کا ارادہ یہ ہو کہ کامیابی کی صورت میں حکومت کی باگ ڈور امام برحق کے حوالہ کر دے گا تو تم اس کی مدد و نصرت کرو۔ اس کے علاوہ کسی صورت میں تحریک و قیام کا مطلب اپنا خون ضائع اور خودکشی کرنا ہے۔ مثال کے طور پر یہ روایت:

محمد بن یعقوب عن علی بن ابراهیم عن ابیه عن صفوان بن یحییٰ عن عیص بن القاسم، قال سمعت اباعبد الله علیه السلام یقول: علیکم بتقویٰ الله وحده لا شریك له وانظروا لانفسکم، فوالله ان الرجل لیکون له الغنم، فیها الراعی، فاذا وجد رجلا هو اعلم بغنمه من الذی هو فیها یخرجه ویجیٔ بذلك الرجل الذی هو اعلم بغنمه من الذی کان فیها، والله لو کانت لاحدکم نفسان یقاتل بواحدة یجرب بها ثم کانت الاخریٰ باقیة یعمل علی ماقد استبان لها، ولکن له نفس واحدة اذا ذهبت فقد

و اللہ ذھبت التوبہ فانتم احق ان تختاروا لانفسکم، ان اتاکم آت منّا فانظروا علیٰ ای شئی تخرجون، ولا تقولوا خرج زید، فان زیداً کان عالماً وکان صدوقاً ولم یدعکم الیٰ نفسہ، وانما دعاکم الیٰ الرّضا من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ولو ظھر (ظفر) لوفیٰ بما دعاکم الیہ، انّما خرج الیٰ سلطان مجتمع لینقضہ، فالخارج منّا الیوم الیٰ ایّ شیٔ یدعوکم الیٰ الرضا من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فنحن نشھد کم انا لسنا نرضیٰ بہ وھو یعصینا الیوم ولیس معہ احد، وھو اذا کانت الرایات والالویہ اجدر ان لا یسمع منّا الا من اجتمعت بنو فاطمۃ معہ، فو اللہ ما صاحبکم الا من اجتمعوا علیہ اذا کان رجب فاقبلوا علیٰ اسم اللہ، وان احببتم ان تتأخروا الی شعبان فلا ضیر، وان احببتم ان تصوموا فی اھالیکم فلعل ذالك یکون اقویٰ لکم، وکفاکم بالسفیانی علامۃ[1]۔

عیص بن قاسم کا بیان ہے کہ میں نے حضرت جعفر صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا: کہ تمہارے لئے خدائے وحدہ لاشریک کا تقویٰ ضروری ہے۔ اپنے بارے میں غور کرو۔ خدا کی قسم اگر بھیڑوں کے مالک کو پہلے چرواہے سے زیادہ کارآمد اور عقلمند چرواہا مل جائے تو وہ پہلے والے کو ہٹا کر اس کی جگہ اس چرواہے کو رکھے گا جو ان جانوروں کے حالات سے زیادہ واقف ہو۔ خدا کی قسم اگر تم میں سے کسی کے دو نفس ہوتے اور ان میں سے ایک کے ذریعہ وہ جنگ کرتا اور اس کے ذریعہ تجربہ حاصل کرتا اور دوسرا نفس باقی رہ جاتا اور اس تجربہ کی روشنی میں عمل کرتا لیکن انسان ایک سے زیادہ نفس کا مالک نہیں ہے اور اس کے فنا ہو جانے کے بعد توبہ کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے لازم ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر بہترین راہ

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۵ بہ نقل از روضہ کافی۔

کا انتخاب کرو اور خوب غور کرو کہ آخر کس سے تلوار اٹھا رہے ہو اور یہ نہ کہو کہ زید (حضرت کے چچا) نے خروج اور علم جہاد بلند کیا ہے کیونکہ زید، عالم اور صادق تھے انہوں نے اپنی سرداری اور امامت منوانے کے لئے آواز بلند نہیں کی بلکہ رضائے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اس سے مراد حضرت امام محمد باقر ہیں) کی طرف لوگوں کو بلایا تھا اور اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو اپنے عہد کو پورا کرتے۔ ان باتوں کے علاوہ انہوں نے ظالم اور ستمگر حاکم سے ٹکر لینے اور اسے نابود کرنے کے لئے اعلان جنگ کیا تھا۔

آج جو شخص خروج کر رہا ہے، کیا وہ مرضیٔ آل محمدؐ کی طرف تم لوگوں کو دعوت دے رہا ہے؟ ہم تم لوگوں کو اس بات پر گواہ قرار دیتے ہیں کہ ہم اس سے راضی نہیں ہیں اور کیونکر راضی ہوں آج جبکہ وہ تنہا ہے خود ہماری اطاعت نہیں کرتا پھر جس وقت اس کا پرچم بلند ہوجائے گا کچھ لوگ اس کے اردگرد جمع ہوجائیں گے اس وقت اس سے اطاعت کی کیا امید ہوسکتی ہے؟ ہاں اگر اولاد فاطمہ سلام اللہ علیہا کسی شخص کے پرچم تلے جمع ہوں تو ہم اس سے راضی ہیں۔ خدا کی قسم فرزند فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جس کے ساتھ ہوں اس کی اطاعت تم لوگوں پر واجب ہے۔ خدا کا نام لے کر ماہ رجب میں آؤ اور اگر چاہو تو ماہ شعبان تک ٹال سکتے ہو یا اگر چاہو تو ماہ رمضان تک ٹھہر کر روزے اپنے خاندان کے ساتھ گزارو شاید یہ عمل تمہارے لئے تقویت کا باعث بنے اور تمہارے لئے علامت کے طور پر سفیانی کا خروج کافی ہے۔

اسی روایت کا خلاصہ "علل الشرائع" سے بھی نقل ہوا ہے۔ لہٰذا ہم اسے جداگانہ روایت قرار نہیں دے سکتے۔[1]

اس طرح کی روایتوں کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ روایتیں (فتح و کامیابی کی امید اور طاغوتی طاقتوں کو مسمار کرنے کی صورت میں جس میں اپنے نفس کی طرف دعوت نہ ہو) ایسے اقدام کے واجب یا جائز ہونے پر دلالت نہ بھی کرتی ہوں، تو اس کے ناجائز ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتیں۔ بلکہ یہ روایتیں اسلامی تحریکوں کی نگہبانی اور اس کی مدد کی تاکید کرتی ہیں اور ہم سے مطالبہ کرتی ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے زمانہ کے طاغوت سے ٹکرانے اور اس سے جنگ کرنے کے لئے تم سے مدد مانگے تو بلا تامل، اس کی

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۸ نقل از علل الشرائع۔

شخصیت اور اس کے مقصد پر غور کئے بغیر آنکھیں بند کر کے اس کی مدد پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ کیوں کہ اس صورت میں تمہارا خون اور تمہاری جان ضائع ہوگی اور آخر کار تم خود اپنے ضمیر اور اپنے خدا کے سامنے جواب دہ ہوگے اور اگر اس (داعی) سے زیادہ عقلمند، لائق، آگاہ نیز با تدبیر قائد موجود ہو۔ جیسا کہ ائمہ معصومینؑ کے زمانہ کی تحریکوں میں ہمیشہ ایسا ہی تھا۔ تو اس کے مشورہ اور اس کی صلاحدید کے بغیر کوئی اقدام کر کے خود کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرو۔ چاہے تمہاری نیت خدا اور اس کے دین کے لئے نیز ظلم کے خلاف کتنی ہی خالص کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تمہارا یہ اقدام بے اثر و بے نتیجہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم اور تمہارا یہ رہبر حالات کے تمام پہلوؤں سے آگاہ نہ ہو اور اس تحریک کا سر چشمہ جاہ طلبی ہو، ایسی صورت میں انسان دنیا و آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو گا اور اگر زید کی طرح کوئی ایسا شائستہ رہبر مل جائے جو فقیہ بھی ہو اور عالم بھی اپنے عہد کے امام معصومؑ کا اطاعت گزار بھی ہو اور ان کا پیرو بھی اور امام کی مرضی حاصل کئے بغیر کوئی اقدام نہ کرے، تو ایسے رہبر کی اطاعت کرو اور اس کی مدد کرنے میں دریغ نہ کرو۔ جیسا کہ بعض روایتوں میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ زید نے مجھ سے مسلحانہ اقدام کی اجازت مانگی تو میں نے ان سے کہا: "ان تحب ان تکون المقتول بالکناسہ فاخرج اگر آپ "کناسہ کوفہ" پر پھانسی پانے کے لئے تیار ہیں تو ضرور اقدام کیجئے۔ اسی طرح کی دوسری روایت بھی ہے جس میں حضرتؑ نے آپ کو اور آپ کے ناصروں کو اسلام کے شہیدوں میں شمار کیا ہے اور جن لوگوں نے زید کی نصرت سے گریز کیا تھا ان کا شکوہ کیا ہے اور انہیں اسلامی فریضہ اور جہاد کے ترک کرنے والوں میں محسوب کیا ہے۔

چنانچہ اس روایت کے آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام رجب، شعبان یا رمضان میں سب لوگوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں اور قیام کرنے کے لئے ایک مخصوص علامت یعنی خروج سفیانی کی تعیین فرما رہے ہیں۔ اس روایت کے ذیل سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ حضرتؑ خود ان آیندہ مہینوں میں ہی کوئی اقدام فرمائیں اور ممکن ہے کہ اس میں تاخیر بھی ہو۔ (جیسا کہ بعض روایات میں اس اقدام کی تاخیر کی ایک وجہ بعض سربستہ رازوں کا آشکار ہو جانا ہے جو بذات خود ایک مفصل بحث ہے جس کی گنجائش اس مقالہ میں نہیں ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح سند اور صریح مضمون رکھنے والی یہ روایت بہت سی عام اور مطلق

روایتوں کے حکم کو مقید کرتی ہے اور قیام سے انکار کرنے والی بہت سی روایات کے ظاہری حکم کی توجیہ اور تفسیر کرتی ہے۔ ساتھ ہی مخصوص حالات و شرائط کے تحت کسی بھی متقی و پرہیزگار فقیہ کے قیام کو، چاہے یہ قیام ظہور امام مھدی علیہ السلام سے پہلے ہی کیوں نہ ہو، جائز بلکہ واجب ثابت کرتی ہے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ روایت حضرت علی علیہ السلام اور امام زین العابدینؑ و امام محمد باقرؑ اور خود امام جعفر صادق علیہم السلام سے مروی بعض دوسری روایتوں سے بعد کی روایت ہے اور اس مسئلہ پر سب سے زیادہ روشنی بھی ڈالتی ہے لہٰذا ہم اس روایت سے حسب ذیل استفادہ کرتے ہیں۔

۱۔ امام علیہ السلام کی اجازت کے بغیر غیر صالح رہبر کی مدد و نصرت کرنا حرام ہے۔

۲۔ تحریک اسلامی کے رہبر یعنی اس عالم و فقیہ کی نصرت و مدد جائز یا واجب ہے، جس نے کم از کم امام معصومؑ کی مرضی حاصل کرلی ہو اور امر بہ معروف و نہی از منکر، فریب کار غاصبوں اور مستکبروں کی قوت کو ختم کرنے اور اسلام کے حقیقی حاکم کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور سونپنے کے لئے اقدام کیا ہو۔

۳۔ خود امام صادق علیہ السلام کے قیام، علامتوں کے ظہور اور لازمی شرائط کے پورا ہونے کا امکان ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ امام زمانہ علیہ السلام کے ظہور کے مقدمات ایک شب میں طے ہو سکتے ہیں۔

۴۔ اقدام کے جائز یا واجب ہونے کے لئے تحریک کی کامیابی کا علم شرط نہیں ہے۔ (اس روایت کے پیش نظر جس میں امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: جو شخص بھی ہمارے قائمؑ کے ظہور کے پہلے قیام کرے گا وہ اس پرندہ کی مانند ہے جو اپنے پروں کی مضبوطی سے پہلے بچوں کے ہاتھوں کا کھلونہ بن جائے۔)

۵۔ امام زمانہ علیہ السلام کے عالمی قیام بلکہ ان کی ولادت سے پہلے بھی زید کی طرح ہر عالم فقیہ کو اسلامی تحریک کی ولایت اور رہبری کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے وصیت میں فرمایا کہ: پہاڑوں کا ان کی جگہ سے اکھاڑنا اس حکومت و سلطنت کے ساقط کرنے سے آسان ہے جس کی جڑ محکم ہے اور اس کے زوال کا وقت نہ آیا ہو یا حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ: ہاتھ پاؤں نہ مارو اور سکوت اختیار کرو تمہارے لئے صرف جہاد کی نیت ہی کافی ہے۔ ان روایتوں کے باوجود

جناب زید کا اقدام جہاد امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر میں مورد تائید قرار پایا ہے۔
غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسول خداؐ و حضرت علیؑ کے مکرر اقوال کے ذریعہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت یا رسول خداؐ کے اقوال کے ذریعہ امام حسنؑ و حضرت علیؑ کی بظاہر ناکامی اور امیر المومنینؑ کی شہادت کی خبروں کے باوجود ان ائمہ میں سے کسی نے بھی ان خبروں کو اپنے اقدام کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں بنایا بلکہ اقدام سے روکنے والوں کی باتوں کو خاطر میں نہ لا کر اپنے اقدام کو جاری رکھا۔

د : اس قسم کی روایتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شیعہ بس اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور امام زمانہؑ کے ظہور کے انتظار میں زندگی گذاریں اور امامؑ کے ظہور سے متعلق مخصوص علامتوں کے ظاہر ہونے کے منتظر ہیں مثلاً سفیانی و دجال کا خروج کرنا، آسمان سے چیخ کا بلند ہونا، آفتاب و ماہتاب کا گہن لگنا، نفس زکیہ اور یمانی کا قتل ہونا اور اگر کسی نے ان علامتوں کے ظاہر ہونے سے پہلے قیام کیا تو اس کی مدد نہ کریں بلکہ اپنے گھر اور گھر والوں کی حفاظت کریں اور نازل ہونے والی بلاؤں پر صبر کریں اور وقت معین سے پہلے ظہور امامؑ کی تمنا نہ کریں۔

۱۔ محمد بن یعقوب عن عدۃ من اصحابنا عن احمد بن محمد عن عثمان بن عیسیٰ عن بکر بن محمد عن سدیر قال: قال ابو عبد اللہ علیہ السلام: یا سدیر الزم بیتک وکن حلسا من احلاسہ اسکن ما سکن اللیل والنہار فاذا بلغک ان السفیانی قد خرج فارحل الینا ولو علیٰ رجلک[1]

۲۔ محمد بن یعقوب عن محمد بن یحییٰ عن محمد بن الحسین عن عبد الرحمٰن بن ابی ہاشم عن الفضیل الکاتب قال: کنت عند ابی عبد اللہ علیہ السلام فاتاہ کتاب ابی مسلم فقال: لیس لکتابک جواب، اخرج عنا ـ الی ان قال ـ ان اللہ لا یعجل لعجلۃ العباد، ولازالۃ جبل عن موضعہ، اھون من ازالۃ ملک لم ینقض اجلہ ـ الی ان قال ـ قلت: فما العلامۃ فیما بیننا وبینک جعلت فداک؟ قال لا تبرح الارض یا فضیل حتی یخرج

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۷ نقل از روضۂ کافی

السفياني، فاذا خرج السفياني فاجيبوا الينا، يقولها ثلاثا وهو من المحتوم[1]

۳۔ محمد بن يعقوب عن احمد عن علي بن الحكم عن ابي ايوب الخزاز عن عمر بن حنظلة قال: سمعت اباعبد الله عليه السلام يقول خمس علامات قبل قيام القائم: الصيحة والسفياني والخسف وقتل النفس الزكية واليماني فقلت: جعلت فداك ان خرج احد من اهل بيتك قبل هذه العلامات انخرج معه؟ قال: لا[2]۔

۴۔ محمد بن الحسن في كتاب الغيبة عن الفضل بن شاذان عن الحسن بن محبوب عن عمرو بن ابي المقدام عن جابر عن ابي جعفر عليه السلام قال: الزم الارض ولا تحرك يدا ولا رجلا حتى ترى علامات اذكرها لك وما اراك تدركها: اختلاف بني فلان ومناد ينادي من السماء ويجيئكم الصوت من ناحية دمشق الحديث۔ وفيه علامات كثيرة لخروج المهدي[3]۔

اسی طرح کی ایک روایت وسائل الشیعہ کی گیارھویں جلد صفحہ نمبر ۴۰ پر حسین بن خالد سے بھی منقول ہے۔

جواب: ظاہر ہے کہ یہ روایات بھی ان ہی معانی و مفاہیم کی حامل ہیں جن کی طرف ہم گذشتہ روایات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ کیونکہ شیعہ، پیغمبر سے منقول روایتوں کی بنیاد پر یہ جانتے تھے کہ خود رسول خدا کی نسل سے مسلمانوں کی نجات کے لئے ایک شخص ضرور بالضرور ظاہر ہوگا۔ لہٰذا یہ لوگ مختلف طریقوں اور سوالات کے ذریعہ اس الٰہی وعدہ کا اظہار اور بیان کرتے تھے۔ کبھی اعتراض کے طور پر ائمہ سے درخواست کرتے تھے، کہ آپ جہاد کے لئے قیام کیوں نہیں فرماتے اور ظالموں و ستمگروں کا قلع قمع کرکے دنیا

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۷ نقل از روضۂ کافی

[2] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۷ نقل از روضۂ کافی

[3] وسائل الشیعہ ۱۱/۴۱ نقل از غیبت شیخ طوسی۔

کو عدل و داد کا مسکن کیوں نہیں بناتے اور کبھی ان شیعوں کا بعض سادات کرام کے اقدام جہاد پر انکی نصرت و مدد اور ان کی اطاعت کرنا۔ یہاں تک کہ ان کی اطاعت و نصرت کے لئے امام کا لوگوں کو آمادہ کرنا اور پرچم جہاد بلند کرنے والوں کی تائید کرنا۔ لہٰذا اگر یہ لوگ ائمہ علیہم السلام کے قیام کے سلسلہ میں کوئی اقدام یا کسی بات کا اظہار کرتے تھے تو فقط اس مہدی موعود کے عنوان سے مطالبہ کرتے تھے جو عالمی کفر و استکبار کو دنیا سے مٹا دے گا۔ اس بنا پر ایسے انتظار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود ائمہ ان لوگوں سے فرماتے تھے کہ تمہاری یہ تمنا اور خواہش الٰہی وعدہ اور وقت سے پہلے ہے اور چونکہ یہ قیام ان حتمی اور غیر حتمی علامتوں کے ظاہر ہونے سے پہلے ہے لہٰذا ان علامات و شرائط کے ظاہر ہونے سے قبل تمہارا انتظار کرنا خام خیالی پر مبنی ہے۔ لہٰذا خصوصاً اس مقصد کے تحت اس وقت سکوت و سکون اختیار کرو اور اس بات کو دھیان میں رکھو کہ پہاڑوں کا ان کی جگہوں سے اکھاڑنا بہت آسان ہے لیکن اس ملک و سلطنت کا تختہ الٹنا بہت مشکل ہے جس کا وقت تمام نہ ہوا ہو، یعنی وہ زوال پذیر نہ ہوئی ہو۔

اکثر شیعہ اسی انتظار کے پیش نظر خود امام صادق سے چاہتے تھے کہ آپ ابومسلم خراسانی وغیرہ (جو بنی امیہ کے مقابلہ میں جنگ کر رہے تھے اور ابومسلم خراسانی بھی بہت چاہتا تھا کہ اپنے اس اقدام کو مذہبی رنگ دے سکے) کی نصرت اور ان کی تائید فرمائیں لہٰذا اس شبہ کو دور کرنے کے لئے امام نے جواب کے منتظر ابومسلم کے قاصد سے فرمایا کہ یہ خط جواب کے لائق بھی نہیں ہے۔

حضرت صادق جانتے تھے کہ میں مہدی موعود نہیں ہوں، نہ ابھی اس کے ظہور کا زمانہ آیا ہے اور نہ تو میں اس عنوان کے تحت قیام ہی کر سکتا ہوں اور نہ کسی کی تائید کر سکتا ہوں۔ لہٰذا ایسے ماحول اور حالات میں اگر امام یہ فرماتے ہیں کہ: تم لوگ خاموش رہو، کوئی اقدام نہ کرو، اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو اور مجھ سے بھی ان حالات میں کسی تحریک یا قیام کی توقع نہ رکھو۔ تو بات واضح اور روشن ہو جاتی ہے کہ امام اس سے ہرگز یہ حکم دینا نہیں چاہتے کہ مسلمان امر بہ معروف اور نہی از منکر سے بھی رک جائیں یا کسی ظالم یا طاغوتی طاقت کو مٹا دینے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کریں یا اگر کوئی جارح اسلامی ملک پر حملہ آور ہو اور اس پر قبضہ کرے تو تمام مسلمان خاموشی اور صبر کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، آنے والے تمام مصائب کو جھیلتے رہیں اور اس اسلامی ملک و حکومت کی طرف سے بے توجہ اور لاپرواہ ہو جائیں۔ یا اگر کوئی مسلمان اپنے

مسلمان بھائیوں کو مدد کے لئے پکارے تو یہ لوگ اس کی فریاد نہ سنیں اور نہ ظلم و معصیت کو اس سے دور کریں۔ کیونکہ دفاع چاہے شخصی ہو یا عمومی ایک عقلی اور فطری امر ہے اور روایتوں اور تمام فقہا کے فتووں کی روشنی میں واجب اور شرعی بھی ہے۔ لہٰذا اس سے کسی بھی صورت میں الگ نہیں ہوا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ یہ روایتیں، دنیا کے کسی بھی حصہ میں یا کسی زمانہ میں حکومت اسلامی قائم کرنے، عدل و انصاف کو رواج دینے اور احکام اسلامی کے اجراء کے سلسلہ میں فقہاء کے اقدام کو ہرگز منع نہیں کرتیں اور نہ اس مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ اس قسم کی روایتوں کا تعلق دعویٰ مہدویت کرنے والے رہبروں سے ہے۔

ھ : اس قسم کی روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن کو جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اسے امام زمانہؑ کے ظہور اور دنیا سے ظلم کے خاتمہ سے پہلے عادل حکومت قائم کرنے کی کوشش اور بلا وجہ اپنے کو زحمت میں نہ ڈالنا چاہیئے، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں اسے صرف امام برحق کے ساتھ اس کی ہمراہی میں جہاد کی نیت پر اکتفاء کرنی چاہیئے۔ اس نیت ہی پر اس کے نامۂ اعمال میں جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب لکھا جائے گا۔ اسے ہرگز امام علیہ السلام سے پیشروی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس کے حکم اور فرمان کا منتظر رہنا چاہیئے۔ مثلاً:

۱۔ محمد بن یعقوب عن عدۃ من اصحابنا عن احمد بن محمد عن خالد عن محمد بن علی عن حفص بن عاصم عن سیف التمار عن ابی المرھف، عن ابی جعفرؑ قال: الغبرۃ علیٰ من اثارھا ھلک المحاصیر قلت: جعلت فداک وما المحاصیر؟ قال: المستعجلون، اما انھم لن یردوا الامر یعرض لھم الیٰ ان قال: یا ابا المرھف اتریٰ قوما حبسوا انفسھم علی اللہ لا یجعل لھم فرجا؟ بلیٰ واللہ لیجعلن اللہ لھم فرجاً [1]

۲۔ محمد بن علی بن الحسین باسنادہ عن حماد بن عمرو وانس بن محمد عن ابیہ، عن جعفر بن محمد، عن آبائہ علیھم السلام (فی وصیۃ النبیؐ لعلیؑ) قال: یا علی ان ازالۃ الجبال الرواسی

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۶ نقل از روضۂ کافی۔

اھون من ان الــة ملك لــم تنقض ایامــہ[1]

۳- روایت زر بن حبیش جو (گذشتہ شمارہ میں) مذکور ہو چکی ہے۔[2]

۴- الــحسن بن محــمد الطوسی فی (مجالســہ) عن ابیــہ، عــن المفید عن بن قولویــہ، عــن ابیــہ، عــن سـعد عــن احــمد بن محــمد، عــن عــلی بــن اسباط، عــن عــمّــہ یــعقوب ابــن ســالــم، عــن ابی الحســن العبیــدی عن الصادق علیــہ الســلام قال: ماکان عبد یحبس نفســہ علی اللّٰہ الاّ ادخــلہ اللّٰہ الــجنة[3]

۵- حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں ایک خطبہ کے ضمن میں ارشاد فرمایا:-

الــزموا الارض، واصبروا عــلی البلاء، ولا تــحرکوا بایدیکم وسیوفکم فی ھوی السنتکم ولا تستعجلوا بــمالــم یعجل اللّٰہ بــکم، فانــہ من مات منکم عــلی فــراشــہ وھو علی معرفــة حق ربــہ وحق رسولــہ واھــل بیتہ مات شــھیدا، ووقــع اجــرہ عــلی اللّٰہ واستوجب ثواب مانوی من صالح عــملہ، وقامت الــنیة مقام اصلاتــہ بسیفــہ، فان لــکل شئ مــدة واجلا[4]

اے لوگو! اقدام جنگ نہ کرو، اپنے ہاتھوں اور شمشیروں کو اپنی خواہشات و زبان کے مطابق بلند نہ کرو۔ خدا نے جس امر کو مؤخر قرار دیا ہے تم وقت سے پہلے اس کے حصول کی تمنا نہ کرو (ان حالات میں) اگر کوئی شخص خدا و رسولؐ و اہل بیتؑ کی معرفت رکھتے ہوئے اپنے بستر پر اس دنیا سے گزر جائے تو وہ شہید ہے۔ اس کا اجر اللہ پر ہے اور اسے اس کی نیت کے مطابق اجر و ثواب حاصل ہوگا اور اس کی یہ خاموشی جہاد فی سبیل اللہ شمار کی جائے گی۔ یاد رکھو کہ ہر کام کے لئے ایک وقت معین ہے، جو فقط خدا کے علم میں ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۸ نقل از من لایحضرہ الفقیہ

[2] وسائل الشیعہ ۱۱/۴۱ نقل از غارات ثقفی

[3] وسائل الشیعہ ۱۱/۳۹ نقل از المجالس شیخ طوسی

ظاہر ہے کہ ان روایات سے مراد یہ ہے کہ آل رسول میں سے کسی شخص سے اس توقع کا سد باب کر دیا جائے کہ وہ مہدی موعود کے ظہور سے پہلے مستضعفین عالم کی نجات اور عالمی حکومت کے قیام کے عنوان سے خروج کرے، نہ یہ کہ ہر حالت میں ہر جگہ اور ہر زمانہ میں فقط جہاد کی نیت پر اکتفا کر کے بیٹھ رہا جائے اور نہ تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے کام لیا جائے نہ کسی خاص زمانہ میں کسی خطۂ ارض پر اسلامی حکومت ہی قائم کی جائے۔

جیسا کہ ظاہر ہے یہ روایتیں صرف مسلحانہ اقدام سے روکتی ہیں نہ کہ سیاسی و ثقافتی اقدام سے اور یہ تو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بطور کلی اس سے مراد اسلامی رہبروں اور ائمہ معصومین کی پیروی ہے، نہ یہ کہ ہر شخص اپنی جگہ پر فیصلہ کرے کہ یہ اقدام جہاد کا صحیح موقع ہے اور وہ اس سلسلہ میں خود رہبروں کو ان کی لاپرواہی، خوف اور جہاد کے فریضہ کے ترک کرنے پر "معاذ اللہ" خطا کار قرار دے۔ کیونکہ ان کی اس خاموشی میں مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو صرف وہی جانتے ہیں اور ایسا نہ ہو کہ اس اقدام جہاد کے عمل میں وہ ان سے آگے بڑھ جائے اور غلطی کر بیٹھے۔

چنانچہ زیادہ تر روایتیں مسلحانہ خروج و اقدام کے سلسلہ میں بعض روایتیں ان اقدامات کو بے فائدہ اور شیعوں کے لئے زحمت کا سبب قرار دیتی ہیں، بعض سد سد ان اقدامات سے منع کرتی ہیں اور بعض روایات انہیں جلد بازی اور قبل از وعدۂ الٰہی بتاتی ہیں لیکن سیاسی، ثقافتی، تبلیغی یا انتخابی اقدامات کے ذریعہ حاصل ہونے والی حکومت فقیہ کے خلاف کوئی روایت دلالت نہیں کرتی۔ یا اگر کبھی کسی شہر یا ملک میں اسلحہ کے زور پر قدرت حاصل کرلی جائے اور عوام حکومت کی باگ ڈور فقیہ کے ہاتھوں میں سونپ دیں تو یہ روایتیں اس فقیہ کے حق حکومت کے خلاف نہیں ہیں، اس طرح کی باتیں ان روایتوں سے ہرگز ظاہر نہیں ہوتیں۔

میں نے گذشتہ مذکورہ روایات میں یہ احتمال دیا تھا کہ ائمہ معصومین نے سادات کو جہاد بالسیف کے ذریعہ طاغوتی طاقتوں کا قلع قمع کرنے یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بطور مطلق نہیں روکا ہے چنانچہ اس کی تائید سرائر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جو حسب ذیل ہے:۔

محمد بن ادریس فی آخر السرائر نقلا من کتاب ابی عبد اللہ السیاری عن رجل قال: ذکر بین یدی ابی عبد اللہ علیہ السلام

من خرج من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: لا ازال انا وشیعتی بخیر ما خرج الخارجی من آل محمد (ص) ولوددت ان الخارجی من آل محمدؑ خرج وعلی نفقۃ عیالہ۔[1]

ابن ادریس نقل کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں خلفاء جور کے خلاف تلوار اٹھانے والے سادات کے سلسلہ میں گفتگو شروع ہوئی تو امامؑ نے فرمایا کہ جب تک اہل بیت پیغمبرؐ میں سے لوگ اقدام جنگ کرتے رہیں گے، میں اور میرے شیعہ امن و امان میں رہیں گے میں اسے بے انتہا پسند کرتا ہوں کہ آل محمدؐ کی کوئی فرد جہاد بالسیف کے لئے میدان میں آئے اور میں اس کے اہل و عیال کے مصارف کا بار اٹھاؤں۔

مختصر یہ ہے کہ ہم ان چند روایات کے معانی و مطالب کے مقابلے میں فقہ اسلام کے مسلمات، قرآن اور بہت سی دوسری روایات، شواہد اور قرائن کو نظر انداز نہیں کرسکتے اور نہ ان سے بے توجہی برت سکتے ہیں۔ بلکہ درست تو یہ ہے کہ ہم ان تمام روایات پر مسلّمات کی روشنی میں غور کریں اس کے بعد ہی کوئی نتیجہ اخذ کریں۔

کیا ہم قرآن اور اسلام کے دیگر احکام و مطالب کے ہوتے ہوئے مندرجہ بالا روایات کو بھی وہی معانی پہنائیں جو مخالفین انقلاب اسلامی بیان کرتے ہیں؟ اور یہی کہیں کہ غیبت امام زمانہؑ میں کسی طرح کی بھی تحریک، جہاد، دفاع، اقدام اور حکومت اسلامی کا قیام نیز اسلامی حدود کا جاری کرنا جائز نہیں ہے؟ یہاں تک کہ امر بہ معروف نہی از منکر کے لئے بھی اقدام کرنا حرام ہے؟ کیا قرآن مجید صاف لفظوں میں یہ نہیں کہتا کہ:۔

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدیٰهما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیئ الی امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینهما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین۔[2]

---

[1] وسائل الشیعہ ۱۱/ ۳۹ نقل از سرائر۔

[2] سورہ حجرات آیت/ ۹

اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں قتال اور دشمنی پر اٹھ کھڑے ہوں تو (اے ایمان والو) تم ان دونوں میں مصالحت کرا دو اور اگر ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم و ستم کرنے لگے تو اس ظالم گروہ سے قتال کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کو مان لے چنانچہ جب بھی وہ حق کی طرف پلٹ آئے تو عدالت کے ساتھ ان دونوں میں صلح قائم کرا دو اور ہمیشہ عدالت کو اپنا شیوہ بناؤ کیونکہ یقیناً خدا اہل عدل کو دوست رکھتا ہے۔

اب جبکہ بغاوت کرنے والے سے قتال کرنے کا حکم کسی زمانہ سے مخصوص نہیں ہے تو یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ زمانہ غیبت میں مسلمانوں کا ہر حالت میں ساکت و خاموش رہنا لازم ہے؟

اور ایسے خطرات میں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آثار کو مٹانے کا سبب بنیں وہ روایتیں جو اسلامی سرزمین کے دفاع کو واجب قرار دیتی ہیں (مثلاً روایت نمبر ۲ باب نمبر ۶ کتاب جہاد، وسائل الشیعہ) یا اسلامی حکومت و مملکت پر حملہ آور ہونے والے کفار کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں فقہاء رضوان اللہ علیہم کے فتاوے جو اس دفاع کو واجب کہتے ہیں، پھر بھلا ہم ان چند روایات کے عمومی اور مطلق معانی پر کیسے عمل کر سکتے ہیں؟

وہ روایتیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدود خداوندی میں رکاوٹ یا تعطل حرام ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بغیر قوت و حکومت کے حدود الٰہی کا جاری کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اقتدار و حکومت کا حاصل کرنا ہی حرام ہے جس کا ایک فائدہ حدود الٰہی کا جاری کرنا بھی ہے۔

جناب ابراھیم امینی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

اسلامی حکومت
بین الاقوامی روابط اور خارجہ پالیسی

بحث شروع کرنے سے قبل دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے :۔

پہلی بات : اسلام میں "خارجی سیاست" پر بحث اس بات پر موقوف و منحصر ہوگی کہ ہم پہلے "سیاست" میں اسلام کے عمل دخل کو قبول کرلیں اور اس بات کا اعتراف کریں کہ اسلام حکومت کی تاسیس، امور مسلمین کی نگرانی و تحفظ نیز اجتماعی قوانین و احکام کے نفاذ کے سلسلہ میں اپنا ایک مستقل نظریہ رکھتا ہے اور تمام سیاسی امور میں اس کو دخل حاصل ہے۔ یہ چیز اپنے مقام پر اتنی ثابت و مستحکم ہے کہ ہم یہاں اس بحث میں وارد ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

دوسری بات : اسلامی حکومت ایک خاص نظریہ کی حامل حکومت ہے کائنات کے بارہ میں اس کا ایک مخصوص تصور ہے اور اسی نظریہ پر یہ حکومت استوار ہوتی ہے چنانچہ فطری طور پر اسلامی حکومت الٰہی مقاصد کی پابند ہے، حاکم شرع نیز دیگر ذمہ داران مملکت کسی بنیادی پالیسی کے انتخاب کرنے اور داخلی یا خارجی سیاست کی راہیں معین کرنے میں آزاد نہیں ہیں کہ وہ اپنی خواہش و مرضی سے جس راہ پر چاہیں گامزن ہوجائیں بلکہ انھیں اپنی راہیں "وحی" کے مطابق الٰہی دستور و قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے طے کرنی ہوں گی۔

اس سے زیادہ واضح اور روشن انداز میں یہ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی حکومت کے ذمہ داروں کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ اسلام ان سے چاہتا کیا ہے اور پھر

رضاء الہٰی کو مدنظر رکھتے ہوئے راہیں تلاش کریں اور اسلامی مقاصد کی تکمیل کے لئے داخلی یا خارجی پالیسی مرتب کریں اور اس منزل میں شرع اسلامی کی رہنمائی سے فائدہ اٹھائیں ۔ البتہ یہاں اس بات کا بھی ذکر کر دینا لازم ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے راہوں کی تعیین کے سلسلہ میں بھی وہ مطلق طور پر آزاد نہیں ہیں بلکہ شرع کے کلی قوانین کے دائرے میں محدود رہنا ضروری ہے ۔ مثال کے طور پر خارجی سیاست کے ذیل میں سب سے پہلے ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ آیا دنیا کے تمام ممالک میں رہنے والے افراد کے سلسلہ میں ہماری کوئی ذمہ داری ہے یا نہیں ؟ اسلام نے اس سلسلہ میں اپنی کوئی رائے پیش کی ہے یا نہیں ؟ اگر پیش کی ہے تو وہ کیا ہے ؟ آیا ہم ایک اسلامی حکومت کے عنوان سے دنیا کے دیگر ممالک کے تئیں کسی ذمہ داری کے حامل ہیں یا نہیں ؟ اور اگر ہیں تو ان مقاصد کی تکمیل کا راستہ کیا ہے ؟ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ دیگر ممالک سے تعلق اور رابطہ کا اسلامی معیار کیا ہے ؟ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہم کس ملک سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور کس سے نہیں کر سکتے اس ذیل میں چند مطالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی آفاقی رسالت :۔

پیغمبر اسلامؐ کائنات میں پھیلی ہوئی پوری انسانی برادری کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اسلام ایک عالمی مذہب ہے اس کا دائرہ کسی مملکت، قوم، قبیلہ یا زبان میں محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ چنانچہ قرآن میں اعلان کر دیا گیا ہے :۔

یاایھاالناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السموات والارض لا الٰہ الا ھو یحیی ویمیت فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یؤمن باللہ وکلماتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون (اعراف / ۱۵۹)

اے لوگو ! میں تم سبھی انسانوں پر اللہ کی طرف سے رسول ہوں، وہ اللہ جو تمام آسمان و زمین کا مالک و حاکم ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس خدا اور اس کے رسول پیغمبر امیؐ پر

ایمان لے آؤ ـــ وہ رسول جو خدا اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے، پیغمبر کا اتباع کرو تاکہ شاید تمہاری ہدایت ہو جائے۔

دوسری جگہ رسولؐ کو مخاطب بنا کر خدا فرماتا ہے: ـــ

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً (سورۂ سبا/۲۸)

اور ہم نے تم کو (اے پیغمبرؐ) نہیں بھیجا مگر سو لئے اس کے کہ تم عالم بشریت کو (رحمت الہیٰ کی) بشارت دو اور (اس کے عذاب سے) خوف دلاؤ۔

بعض آیتوں میں اس امر کی بھی صراحت موجود ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر عالمی مذہب ہے اور ایک نہ ایک دن آخر کار تمام مذاہب عالم پر غلبہ حاصل کرے گا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ـ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (سورۂ توبہ/۳۳)

وہی ہے وہ ذات جس نے اپنے رسول (محمد مصطفیٰؐ) کو ہدایت (یعنی وہ دلیلیں اور حجتیں جو انسان کی راہ مستقیم کی طرف رہبری کرتی ہیں) اور دین حق (اسلام) کے ساتھ بھیجا تاکہ تمام مذاہب عالم پر تسلط و برتری عطا کرے چاہے کفار و مشرکین کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔

دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے: ـــ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفیٰ باللہ شھیدا (سورہ فتح/۲۸)

یعنی وہی ہے وہ (خدا) جس نے اپنے رسول (محمد ابن عبد اللہؐ) کو ہدایت (صراط مستقیم کی نشان دہی کرنے والی دلیلوں) اور دین حق کے ساتھ مبعوث کیا تاکہ تمام ادیان عالم پر غلبہ و فوقیت عطا کرے اور اس بات کی حقانیت پر خدا کی گواہی کافی ہے۔

اسی طرح بعض آیتوں میں مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ آخر کار دنیا کی حکومت اور اس کا نظام ایک نہ ایک دن ان کے ہاتھوں میں آئے گا اور دین اسلام استوار و قدرتمند ہو گا۔ چنانچہ

اعلان ہوتا ہے :۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امناً یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً (سورۂ نور/۵۵)

خداوند عالم نے وعدہ کیا ہے کہ تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور عمل صالح انجام دیا، ان کو روئے زمین پر ضرور خلافت سپرد کر دے گا جس طرح گذشتہ صالح امتوں کو اس نے نائب بنایا اور ان کے دین (اسلام) کو جسے اس نے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے، تمام ادیان پر تسلط و برتری عطا کرے گا اور تمام مومنین کو خوف و اندیشہ کی منزل سے نکال کر مکمل امن و سکون عطا کرے گا۔ (تاکہ) وہ مطمئن ہو کر میری ہی عبادت کریں اور کسی (غیر) کو میرا شریک قرار دیں۔

دوسری جگہ فرماتا ہے :۔

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلہم ائمۃ ونجعلہم الوارثین۔ (سورۂ قصص/۵)

اور ہمارا تو یہی ارادہ ہے کہ جو لوگ زمین پر کمزور و ناتواں کر دئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو ہی (لوگوں کا) پیشوا اور اس زمین کا مالک بنائیں۔

ان آیات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مستقبل میں ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب یہ دنیا تابندہ و درخشندہ ہوگی جب مومنین کرام اور اللہ کے نیک بندوں کو عالم پر قبضہ و تسلط حاصل ہوگا نیز دین اسلام کو قدرت و اقتدار اور غلبہ ملے گا لوگ بلا خوف و خطر خدا کی عبادت کریں گے اور شرک والحاد کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔

اسلام کی تبلیغ اور توسیع

ظاہر ہے دین اسلام کو یہ توسیع نہ تو اپنے آپ حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی آیندہ اس طرح کی امید رکھی جاسکتی ہے بلکہ اس کے لئے تبلیغ و جہاد کی ضرورت ہے اور ابتدائی طور پر یہ عظیم ذمہ داری پیغ

کے دوش مبارک پر رکھی گئی تھی چنانچہ آپ نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش و جانفشانی فرمائی۔ قرآن کریم میں پیغمبر اسلام کی ذمہ داری کی طرف ان لفظوں میں اشارہ ہوا ہے:۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (نحل/۱۲۵)

(اے پیغمبر!) آپ لوگوں کو حکمت و برہان نیز اچھی اچھی نصیحتوں کے ذریعہ خدا کی طرف دعوت دیجئے اور ان سے بحث و مناظرہ میں بہترین (دلنشین طریقہ اپنایئے۔

دوسری منزل میں اس طرح اعلان ہوتا ہے:۔

فلذلك فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اهوائهم (شوری/۱۵)

پس اسی لئے (اے رسول) آپ لوگوں کو اسلام اور کلمۂ توحید کی طرف) دعوت دیجئے اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے (اس راہ میں) استقامت اختیار کیجئے اور ان (لوگوں) کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

ان آیات میں رسول اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ حکمت و موعظہ کے ذریعہ حتیٰ کہ احسن طریقوں پر جدال و مناظرہ کی ضرورت بھی اگر پڑے تو لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور اپنے فرائض کی ادائگی میں استقامت و اولوالعزمی کا ثبوت پیش کریں لوگوں کی خواہشات کی پروا نہ کریں۔ ایک دوسرے مقام پر خداوند عالم رسول اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من الناس (مائدہ/۶۷)

اے رسول! جو کچھ آپ پر خدا کی جانب سے نازل کیا جا چکا ہے لوگوں تک پہونچا دیجئے اور اگر آپ نے نہ پہونچایا تو (گویا) آپ نے اس کی رسالت کا فرض ادا نہ کیا۔ اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔[1]

[1] اگرچہ مذکورہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت و ولایت کے اعلان کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے لیکن مفسرین کا خیال ہے کہ شان نزول سبب تخصیص نہیں ہوا کرتا۔ لھذا کہا جا سکتا ہے کہ آیت کی دلالت میں اصلاً جو عمومیت پائی جاتی ہے اپنی جگہ برقرار ہے۔

اسی طرح اعلان ہوتا ہے :-

یاایہا المدثر قم فانذر وربک فکبر وثیابک فطہر والرجز فاھجر (سورۂ مدثر / ۱-۵)

اے ہمارے گلیم پوش نبیؐ! اٹھئے اور (لوگوں کو خدا کے عذاب سے) ڈرائیے اور اپنے پروردگار کو عظمت سے یاد کیجئے، اپنے لباس کو پاک و پاکیزہ رکھئے اور ہر طرح کی نجاست (بت پرست و مشرکین) سے دوری اختیار کیجئے۔

دوسری جگہ خدا فرماتا ہے :-

ولا یصدنک عن آیات اللہ بعد اذ انزلت الیک وادع الی ربک (سورۂ قصص / ۸۷)

اور ایسا نہ ہو کہ آپ کو یہ لوگ (کفار و مشرکین) ان آیات کی تبلیغ و یاد دہانی سے روک دیں جو اللہ کی طرف سے آپ پر نازل کی گئی ہیں۔ آپ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے رہئے۔

اگر آپ تاریخ و سیرت کی کتابیں مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور لوگوں کی ہدایت و رہبری کرنے نیز شرک و بت پرستی کے خلاف پیغام توحید کے نشر کرنے اور خدا پرستی کی دعوت دینے کے سلسلہ میں کیا کیا زحمتیں نہیں اٹھائی ہیں آپ نے جہاں کہیں بھی موقع ملا ایک ایک فرد اور جماعت کے درمیان خطبے ارشاد فرمائے اور براہین و استدلال سے پر نصیحت و موعظت کے ذریعہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور کبھی کبھی شہروں اور قصبوں کا سفر اختیار کیا، بعض مسلمانوں کو بھی مختلف شہروں اور دیہاتوں میں تبلیغ کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے لئے روانہ کیا۔ دوسرے ممالک کے سربراہوں نیز ملتوں کو خطوط روانہ کئے اور اسلام کی دعوت دی[1]۔ اسی تبلیغ و اشاعت کا نتیجہ ہے کہ اسلام رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔ اسلام کی تبلیغ و ترویج نہ صرف پیغمبر اسلامؐ بلکہ ملت کی ہر ہر فرد کا اہم ترین فریضہ اور

---

[1] التراتیب الاداریہ، ج ۱ ص ۱۹۴

ذمہ داری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے:۔

قل هٰذه سبيلى ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعنى وسبحان الله وما انا من المشركين (یوسف/۱۰۸)

یہاں پیغمبر اسلامؐ سے خطاب ہوتا ہے کہ آپ اپنی راہ کو مشخص طور پر بتا دیجئے کہ: میرا کام ہی بصیرت و آگاہی کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینا ہے اور میرے مطیع و فرمانبردار افراد اس عمل کو جاری رکھیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے، چاہے پیغمبرؐ کے دور کی بات ہو یا آپ کے بعد کی منزل ہو ہمیشہ دین کی تبلیغ اور اسلام کی توسیع کو اپنا شرعی فریضہ اور ذمہ داری سمجھا ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں بڑی بڑی سختیاں برداشت کی ہیں قید و بند نیز قتل و شہادت کی منزلوں سے گزرے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے اتنی زحمتیں نہ برداشت کی ہوتیں تو اسلام کو ہرگز اتنی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

خیر کی طرف دعوت، عام فریضہ ہے۔

اصولی طور پر قرآن کی رو سے خیر کی طرف دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر —— امت اسلام کا ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون (آل عمران/۱۰۴)

اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر و فلاح کی طرف دعوت دے ان کو اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب و رستگار ہوں گے۔

اور اسی سورہ میں آگے چل کر اعلان ہوتا ہے:۔

"كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله..." (آل عمران/۱۱۰)

تم بہترین امت تھے جسے لوگوں کی ہدایت کے لئے انتخاب کیا گیا کیونکہ تم انھیں

اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دین اسلام کی تبلیغ و ترویج، پیغام توحید و خدا پرستی کی توسیع و اشاعت اور کفر و شرک نیز الحاد و مادہ پرستی سے مقابلہ تمام مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے۔ جس جس ملک میں بھی اسلامی حکومت قائم ہے، اس سلسلہ میں کوشش کرنا نیز ہر ممکن طریقہ کو بروئے کار لاکر تمام ممالک میں اسلام پھیلانا ان حکومتوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

یہ چیز اسلامی حکومتوں کی قانونی اور رسمی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ان کے منصوبوں میں اس کو سرفہرست مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہو یا اخبار و رسائل، اسلامی کتب و جرائد کے ارسال کے ذریعہ ہو یا علماء و مبلغین کے تبلیغی وفود کے ذریعہ علمی و ثقافتی تبادلات کی صورت میں ہو یا کسی اور طریقہ و معاملات کی صورت میں، اسلامی حکومت کے لئے اس اہم اور حساس ترین ذمہ داری کا یکسر نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہے اور ظاہر ہے حکومت اسلامی کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم حصہ اسی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے۔

ظلم و استکبار سے مقابلہ

دوسری اہم ذمہ داری جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے ظلم و استکبار اور فسق و فجور سے مقابلہ نیز محروم و ناتواں انسانیت کا دفاع ہے تاکہ انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف کا ماحول پیدا ہو سکے۔ چنانچہ خداوند عالم قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:۔

یا ایها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط ولا یجرمنکم
شنآن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی واتقوا
الله ان الله خبیر بما تعملون (المائدہ/۸)

اے ایمان والو! خدا کی راہ میں ثابت قدم رہو، انصاف اور صداقت کے گواہ بنو اور کسی گروہ یا قبیلے کی عداوت تمہیں اس بات پر نہ اکسائے کہ تم راہ انصاف

کو کھو دو، عدالت سے کام لو (کیوں) کہ انصاف کرنا (تمام دوسرے اعمال کے مقابلہ میں) تقویٰ سے قریب تر ہے۔ خدا سے ڈرتے رہو اس لئے کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز" (آیت/۲۵)

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح و روشن (دلیل و معجزے) دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل کی ترازو) نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں اور ہم ہی نے لوہا[1] نازل کیا جس میں بہت طاقت ہے اور عوام کے لئے فائدہ بخش بھی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کون خدا اور اس کے رسول کی غیبت میں (ایمان قلب کے ساتھ) ان کی مدد کرتا ہے اور خدا (تو) بہت ہی زیادہ قوی اور بے نیاز ہے۔

اسی طرح سورۂ نساء میں اعلان ہوتا ہے:۔

یاایھاالذین آمنواکونواقوامین بالقسط شھداء للہ .... (آیت ۱۳۵)

اے ایمان لانے والو! انصاف و عدالت کی راہ پر مضبوطی سے ڈٹے رہو اور اللہ کے لیے شاہد و گواہ بنو...."

ان آیات میں مومنین کو تاکید کی گئی ہے کہ راہ عدالت و انصاف کو ترک نہ کریں — حق پر ڈٹے رہیں، اس سلسلہ میں کسی بھی طاقت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کرنا بھی رہا ہے۔

---

[1] اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد تلوار (ذوالفقار) ہے جو جنگ احد میں حضرت علی علیہ السلام کے لئے نازل ہوئی تھی (مترجم)

عدالت اجتماعی جیسے عظیم مقصد کے قیام کے واسطے اگر ضرورت پڑے تو لوہے یعنی اسلحے کی مدد بھی حاصل کی جاسکتی ہے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ کمزور و ناتوان اور مظلوم و ستم رسیدہ اقوام عالم کی حمایت اور دفاع کے لئے جو اقدام بھی ممکن ہو انجام دیں، یہاں تک کہ اگر جنگ کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رہ جائے تو جہاد و قتال کے لئے میدان میں آجائیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں خدا ارشاد فرماتا ہے:۔

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیراً الذین آمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلوا اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا (سورۂ نساء / ۷۶-۷۵)

آخر تم (مسلمانوں) کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جو (ستمگروں کے دست ظلم کا نشانہ بن کر) کمزور و بےبس ہو گئے ہیں جنگ نہیں کرتے۔ ایسے (ستم دیدہ) افراد جو دعائیں مانگ رہے ہیں: خدایا! ہم کو اس بستی سے دور کر دے کہ یہاں کے لوگ ظالم و بے رحم ہیں اور اپنی جانب سے کسی کو ہمارا سرپرست قرار دے نیز اپنی طرف سے ہی ہمارا یاور و مددگار معین فرما۔ وہ جو صاحب ایمان ہیں خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور وہ جو کفر کے پرستار ہیں اہل طاغوت کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں لہٰذا تم شیطان کے ہمنواؤں سے جنگ کرو (اور ان کی ظاہری طاقت سے خوف زدہ نہ ہو) کیونکہ شیطان کی چالیں (اس کی طاقت کی طرح سے ہی) کمزور اور بودی ہیں۔

اس آیت میں کمزور اور بےبس کی حمایت میں جنگ کرنا ایک انسانی شرف و فضیلت کے عنوان سے یوں پیش کیا گیا ہے کہ بیدار مغز افراد اس کے وجوب کی گواہی دیتے ہیں۔ خدا کی راہ میں جنگ کرنا ایمان اور اہل طاغوت کی حمایت میں تلوار اٹھانا کفر کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسری جگہ قرآن میں ہی خدا ارشاد فرماتا ہے:۔

وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للّٰہ (بقرہ/۱۹۳)
ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور صرف خدا ہی کا دین (باقی) رہ جائے۔
اس آیت میں بھی مسلمانوں کو اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ جہاد و قتال کرتے رہیں یہاں تک کہ زمین ظلم و فساد سے خالی ہو جائے اور صرف دین خدا باقی رہ جائے لہٰذا جب تک زمین پر فتنہ و فساد باقی ہے مسلمانوں کو ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا قرآن نے مسلمانوں کے کندھوں پر ایک نہایت ہی دشوار اور سنگین ذمہ داری رکھ دی ہے انہیں ہر طرح کے ظلم و فساد و استعمار و استکبار کے خلاف محروم و بے بس افراد کو نجات دلانے اور حتی الامکان حکومت عدل الٰہی قائم کرنے کے لئے کوشش و جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ تبلیغی ذرائع کام میں لا کر محروم اقوام کی بیداری کے ذریعہ، نصیحت و موعظت کے ذریعہ، ظالم و جابر بڑی طاقتوں کی ظالمانہ روش کی نقاب کشائی کے ذریعہ، تہدید و تنبیہ کے ذریعہ، سیاسی طریقہ کار اور ڈپلومیسی کے ذریعہ، تحریک آزادی کی حمایت کے ذریعہ یہاں تک کہ وقت ضرورت اگر ممکن ہو تو جنگ و قتال کے ذریعہ، گویا کہ جس طرح بھی ہو سکے، دنیا سے ظلم و استکبار اور فتنہ و فساد کا جب تک خاتمہ نہ ہو جائے، مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کو ان کے خلاف نبرد آزما رہنا چاہیئے۔ چاہے مسئلہ اندرون ملک کا ہو یا بیرون ملک کا۔ اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرتے وقت، اس عظیم الٰہی مشن کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہترین طریقہ کار منتخب کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وقت اور زمانے کے حالات کے پیش نظر مختلف ممالک کے ساتھ تعلقات اور طریقہ کار میں تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن مقصد کو کسی بھی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ممالک اسلامیہ کو بہرحال وہ انداز اور طریقہ کار اپنانا چاہیئے کہ انہیں ظلم و استکبار اور کفر و مادہ پرستی کے خلاف، محروم و بے بس اقوام کی حامی و مددگار اور توحید و ہدایت کی علم بردار ــــ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف دعوت دینے والی حکومت کے عنوان سے جانا اور پہچانا جائے۔ انہیں "امت وسط" کی حیثیت سے تمام حریت پسند تحریکوں کی قیادت کے فرائض ادا کرنے چاہئیں اور ہر طرح کی مادی و معنوی عظمت و کمال میں دنیا کے لئے نمونہ عمل ہونا چاہیئے۔

ملت اسلامی کی آزادی اور کافر ممالک سے اس کا رابطہ

ہم اس حصہ کا چند عنوانات کے ذیل میں ایک جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں :۔

ملت اسلام کی اکائی :

اسلام تمام مسلمانوں کو ایک امت شمار کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے :۔

وان هٰذه امتكم امة واحدة وانا ربكم فاتقون (سورہ مومنون/۵۲)

یقیناً تمہاری یہ امت امت واحدہ ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ میرے (احکام کی) مخالفت سے پرہیز کرو۔

دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے :۔

وكذالك جعلناكم امة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيداً (سورۂ بقرہ/۱۴۳)

اسی طرح (جیسے کہ تمہارا قبلہ ایک قبلۂ وسط ہے) ہم نے تم کو بھی امت وسطا قرار دیا ہے (کہ ہر طرح کی افراط و تفریط سے بچتے ہوئے تم حد اعتدال میں رہو) تاکہ دوسروں کے لئے نمونہ و معیار بن سکو پیغمبر اسلام بھی تمہارے درمیان ایک نمونہ، شاہد کے طور پر ہیں۔

وحدت مسلمین کی بنیاد اور معیار عقیدہ و ایمان ہے۔ ان کے درمیان اسلام کے علاوہ کوئی حد بندی قائم نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے قوم و قبیلہ، ملک و زبان اور شہری و دیہاتی جیسے اختلافات مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور جدائی کا سبب نہیں قرار دئے جاسکتے اور نہ ایسا ہونا چاہئے۔

مسلمانوں کو ایک دوسرے سے منسلک رکھنے کے لئے ایک مضبوط و مستحکم اسلامی رشتہ موجود ہے اور سب کے سب ایک پیکر اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ قرآن اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے :۔

انما المومنون اخوة (سورہ حجرات/۱۰)

یقیناً مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اسلام میں "امتوں" کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ سب کے سب ایک امت اور ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔ سب کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی منزل ہے جس کی طرف سب گامزن ہیں۔ سب ایک ہی ملت سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں اپنے مشترکہ دشمن عالمی کفر و استکبار سے مقابلہ کرنا ہے۔

اسلام ایک کامل اور مستقل نظام ہے:

قانون اسلام اعتقادی، عبادی، اخلاقی، سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی غرض یہ کہ ہر جہت مجموعی طور پر ایک کامل نظام و دستور ہے۔ اسلام ایک مستقل ثقافت و تہذیب رکھتا ہے جس کا سرچشمہ براہ راست وحی الٰہی ہے۔ اس کا کائنات کے بارہ میں ایک خاص تصور ہے اور اسی پر اس کے منصوبہ اور لائحہ عمل کا دار و مدار ہے۔ انسانی فضل و کمال کو پروان چڑھانا اس کا اولین نصب العین ہے اور اس کے تمام منصوبے اور طریقہ کار اسی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔

اسلامی ثقافت اپنی جگہ اتنی مستقل اور مستغنی ہے کہ سوائے وحی الٰہی کے کسی دوسری چیز پر تکیہ نہیں کرتی اور یہی اسلامی ثقافت و تہذیب کی وہ خصوصیت ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں تمدن و ارتقا کے میدان میں دنیا کی آنکھیں خیرہ کر دکھی تھیں اسلامی ثقافت و تہذیب کا سورج آغاز میں سرزمین حجاز سے طلوع ہوا اور اس نے اپنی شعاع ایمانی سے انسانی اقدار کا احیاء کرنے کی بدولت ایک مختصر لیکن مستقل اور نہایت ہی طاقتور امت کو وجود عطا کر دیا، جو رفتہ رفتہ پھیلتی چلی گئی اور اس نے انسانی معاشروں، قوموں اور ملتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ ابھی تھوڑا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس نور کی چمک دمک سے صفحۂ گیتی کے دور ترین علاقہ بھی روشن و منور ہو گئے۔ اس کے حیات آفریں قرآنی دستور و ضوابط اور پائیدار تہذیب و تمدن اتنے درخشاں اور تابناک تھے کہ جس خطۂ ارض پر اس کی شعاعیں پہونچیں لوگوں کے دل و دماغ میں سرایت کر گئیں اور جس کسی نے بھی اس کے دامن میں پناہ حاصل کرنی چاہی اس کو اس نے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ اس خود کفیل و مستغنی انسان ساز اسلامی ثقافت نے اپنے ماننے والوں کو وہ استقلال و آزادی بخشی کہ مسلمان کئی صدیوں تک تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور ہنر و معارف کے پرچم دار بنے رہے اور ان کے بہت سے علمی و فنی آثار آج بھی

دنیا میں موجود ہیں اور اسی شان سے تابندہ و درخشاں ہیں۔

اسلامی اصول وضوابط اور اس کے منصوبے کسی بھی نظریۂ فکر کے تابع نہیں ہوتے لہٰذا ان پر عمل پیرا افراد اسلام کے سوا کسی بھی مکتب و مسلک کی اطاعت و پیروی قبول نہیں کرسکتے۔

چنانچہ ایک حکومت صرف اسی صورت میں اسلامی حکومت کہی جانے کی مستحق ہے جب وہ امت اسلام میں اتحاد و استقلال پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اپنی منصوبہ بندیوں نیز طریقۂ کار کی تعین کے وقت مکتب وحی سے الھام حاصل کرے۔ اس کی داخلی اور خارجی سیاست اس اصول پر مبنی ہو کہ پوری اسلامی برادری کو علم وصنعت اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہی ساتھ زراعتی، اقتصادی نیز فوجی میدانوں میں غیروں کی وابستگی سے رہائی عطا کردے۔ خود مسلمانوں میں فکر کا سلیقہ پیدا ہو جائے اور وہ اسلامی افکار و علوم کے آئینہ میں لائحہ عمل مرتب کریں، اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں اور اسی کے تحت عمل کریں۔ لہٰذا ملت اسلام میں استقلال و آزادی کی روح پیدا کرنا اسلامی حکومت کے منصوبوں میں سرفہرست ہے جسکی بنیاد پر اپنی داخلی اور خارجی سیاست مرتب کرنا اسلامی حکومتوں کا فریضہ ہے اور اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو یہ حکومتیں کچھ بھی ہو سکتی ہیں لیکن ان کو اسلامی حکومت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

قرآن میں دشمنوں کے منصوبوں کی نقاب کشائی:

اسلام میں ملت اسلامیہ کی آزادی و استقلال کا مکمل طور پر پاس و لحاظ رکھا گیا ہے چنانچہ اسلامی ممالک کے داخلی معاملات میں کفار و مشرکین کی دخل اندازی اور نفوذ و تسلط کی تمام راہیں اسلام نے مسدود کردی ہیں اور اس کے خلاف قرآن میں سخت قسم کے احکام صادر فرمائے گئے ہیں۔ قرآن مجید نے چند آیتوں میں کفار کے ناپاک مقاصد اور سازشوں کا ذکر پہلے سے ہی کردیا ہے تاکہ مسلمان ان کی ظاہری فریب کاریوں میں مبتلا نہ ہو پائیں اور وہ اس بات سے ہوشیار رہیں کہ ان کا کیسے افراد سے سابقہ ہے۔ مثال کے طور پر چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں:—

۱۔ مایودّ الـذین کفـروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزّل علیکم من خیر من ربکم واللّٰہ یختص برحمتہ من یشاء

واللہ ذوالفضل العظیم (بقرہ/۱۰۵)

یہ اہل کتاب، جو کفر اختیار کر چکے ہیں اور مشرکین نہیں چاہتے کہ خدا کی جانب سے تمہاری طرف رحمت و برکت کا نزول ہو (جبکہ) خدا جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر دیتا ہے اور خدا تو بڑا ہی فضل و بخشش والا ہے۔

۲۔ ان تمسسکم حسنۃ تسوءھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا ان اللہ بما یعملون محیط۔ (آل عمران/۱۲۰)

(وہ لوگ) اگر تمہارے ساتھ تھوڑی سی بھی بھلائی کی جاتی ہے تو ناخوش ہو جاتے ہیں اور اگر تم کسی ناخوشگوار حادثہ سے دوچار ہوتے ہو تو خوش ہوتے ہیں، پس اگر تم (ان کے مقابلہ میں) صبر و استقامت اور پرہیزگاری سے کام لو تو تم کو ان کی کوئی سازش نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ خداوند عالم ان کی کارستانیوں پر بھرپور نظر رکھتا ہے۔

۳۔ ود کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً حسداً من عند انفسھم من بعد ما تبین لھم الحق فاعفوا واصفحوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔

(البقرہ/۱۰۹)

بہت سے اہل کتاب اس حسد کی بنا پر جو ان کے قلوب میں گھر کر چکا ہے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو اسلام و ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف پھیر دیں جبکہ حق ان پر مکمل طور سے آشکار ہو چکا ہے۔ تم انہیں معاف اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا کی طرف سے کوئی فرمان نہ پہونچ جائے۔ بے شک خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۴۔ یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین (آل عمران/۱۰۰)

اے ایمان لانے والو اگر تم نے اہل کتاب (کہ جن کا کام ہی مومنین کے درمیان نفاق وعداوت کے شعلہ بھڑکانا ہے) کے کسی فریق کی تائی (پیروی) اختیار کی تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف ڈھکیل دے جائیں گے۔

۵۔ یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا الذین کفروا یردّوکم علیٰ اعقابکم فتنقلبوا خاسرین بل اللہ مولیٰکم وھو خیر الناصرین (آل عمران/ ۱۴۹ و ۱۵۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو اگر تم نے کفار کی پیروی کرنی شروع کر دی تو وہ تم کو دوبارہ کفر کی طرف (الٹے پاؤں) پلٹا دیں گے نتیجہ کے طور پر تم نقصان اٹھاؤ (آخر تم ان پر تکیہ ہی کیوں کرتے ہو؟) اللہ پہ تکیہ کیوں نہیں کرتے وہ تو بہترین مددگار ہے۔

۶۔ فبما نقضھم میثاقھم لعنّاھم وجعلنا قلوبھم قاسیۃ، یحرّفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظاً مما ذکّروا بہ ولا تزال تطّلع علیٰ خائنۃ منھم الّا قلیلا منھم فاعف عنھم واصفح ان اللہ یحب المحسنین (مائدہ/ ۱۳)

لیکن ہم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ان کو اپنی رحمتوں سے دور کر دیا اور ان کے دل اتنے سخت پتھر کے مانند بنا دئے کہ خدا کے کلام کو (بھی) اس کی اصل منزل سے تحریف کر کے پیش کرتے ہیں اور وہ باتیں جو انھیں بتائی گئی تھیں ان کا ایک بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے ہیں اور ان سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی تازہ خیانت ظاہر ہوتی رہتی ہے مگر یہ کہ بعض ایسے نہیں ہیں۔ پھر بھی تم ان کو صرف نظر کرو اور معاف کردو بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۷۔ ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصاریٰ حتیٰ تتّبع ملّتھم قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءک من العلم مالک من اللہ من ولیّ

ولا نصیر ۔ (سورۃ بقرہ/۱۲۰)

یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہیں رہ سکتے جب تک کہ (تم مکمل طور پر انکی بے جا خواہشوں کے سامنے سپر انداختہ اور) ان کے (تحریف شدہ) آئین و دستور کی پیروی کرنے لگو (اے رسولؐ) تم ان سے کہدو کہ خدا کی ہدایت ہی ہدایت ہونے کی مستحق ہے اور اگر تم نے علم آنے کے بعد بھی ان کی نفسانی خواہشات کی پیروی کی تو (یاد رکھنا) خدا کی طرف سے تمہارا کوئی سرپرست و یاور نہ ہو گا۔

۸۔ کیف وان یظھروا علیکم لایرقبوا فیکم الّا ولا ذمّة یرضونکم بافواھھم وتابیٰ قلوبھم واکثرھم فاسقون ۔ اشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلاً فصدّوا عن سبیلہ انھم ساء ما کانوا یعملون ۔ لایرقبون فی مؤمن الّا ولا ذمّة واولٰئک ھم المعتدون ۔ (توبہ/۸، ۹ و ۱۰)

کیسے (ان کے عہد و پیمان کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے) جبکہ ان کی حالت یہ ہے کہ اگر تم پر غلبہ حاصل ہو جائے تو نہ تمہاری قرابت و رشتہ داری کا پاس و لحاظ کریں گے اور نہ ہی عہد و پیمان کا، تم کو زبانی باتوں سے خوش کرنا چاہتے ہیں جبکہ ان کے دل منحرف ہیں اور ان میں سے اکثر تو فاسق ہیں۔ ان لوگوں نے الٰہی آیات کا بڑے ہی کم داموں (دنیوی فوائد) سودا کر لیا اور (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روک دیا۔ بے شک یہ لوگ اعمال بد کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ (نہ فقط تمہارے بارہ میں) بلکہ کسی ایک بھی باایمان فرد کے سلسلہ میں (یہ لوگ) عزیزداری یا عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے۔ یہ لوگ واقعی زیادتی پر ہیں۔

۹۔ ھا انتم اولاء تحبونھم ولا یحبونکم وتؤمنون بالکتاب کلّہ واذا لقوکم قالوا اٰمنّا واذا خلوا عضّوا علیکم الانامل من الغیظ قل موتوا بغیظکم ان اللہ علیم بذات الصّدور ۔ (آل عمران/۱۱۹)

یاد رکھو تم تو (اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے) ان کو دوست رکھتے ہو لیکن وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے۔ اگرچہ تم تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں لاتے) اور جس وقت تم سے ملاقی ہوتے ہیں (تو دروغ گوئی سے کام لیکر) کہتے ہیں ہم تو ایمان لے آئے ہیں لیکن جب (تم سے) جدا ہوتے ہیں تو تم پر غم و غصہ کے عالم میں اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹنے لگتے ہیں۔ کہدو کہ تم اپنے ہی غصہ میں جل مرو خداوند عالم تمہارے سینوں کے راز سے واقف ہے۔

۱۰۔ والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر (انفال/۷۳)

وہ لوگ جو کفر اختیار کر چکے ہیں (وہ بھی) آپس میں ایک دوسرے کے اولیا (معین و مددگار) ہیں اگر (اس دستور کو) نظر انداز کرو گے تو زمین پر عظیم فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا۔

مذکورہ آیات میں کفار کے مخصوص عادات و خصائل، دلوں میں پلنے والے اسرار اور منصوبے نیز ان کے فاسد افکار و مقاصد کی خبر دیتے ہوئے بعض موٹی موٹی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے مثلاً:۔

(الف) مسلمانوں پر کسی طرح کی خیر و برکت کا نزول کفار و مشرکین کو پسند نہیں آتا بلکہ وہ اس پر غمگین و رنجیدہ نظر آتے ہیں، اس کے برخلاف مسلمانوں پر جب کوئی بلا اور پریشانی آتی ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

(ب) کفار ہمیشہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں بھی دین سے منحرف کر دیں۔

(ج) اگر کفار کی اطاعت اختیار کی تو مسلمان اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

(د) کفار مسلمانوں کے ساتھ خیانت کے عادی ہیں لہٰذا ان کی خیانت سے پہلے مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

(ہ) یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کبھی بھی راضی نہیں رہ سکتے مگر یہ کہ مسلمان ان کے دین

کی پیروی قبول کریں (اور ان کی خواہشات کے غلام بن جائیں)

(د) ان کے عہد و پیمان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اگر انھیں ایک بار تسلط کا موقع مل گیا تو اپنے عہد و پیمان کو پاؤں تلے روند ڈالیں گے۔

(ز) کفار مسلمانوں کے کبھی بھی دوست نہیں بن سکتے چاہے مسلمان ان کے ساتھ جی بھر کے دوستی کا مظاہرہ کرتے رہیں۔

(ح) کفار تمہاری دشمنی کی بنیاد پر آپس میں دوست اور مددگار ہیں اور اس سلسلہ میں ہمیشہ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان آیات میں پروردگار عالم نے کس طرح کفار و مشرکین کی کینہ پروری اور مسلمانوں کے تئیں بغض و عناد نیز خیانت و سازش کی خبر دیتے ہوئے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے، کہ ایسے افراد تمہارے دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تمہیں ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے۔

کفار کے اقتدار و تسلط سے انکار

چونکہ خداوند عالم کو ملت اسلام کی آزادی اور استقلال منظور ہے لہٰذا اس کی حفاظت کے لئے اس نے خاص اہتمام کیا ہے، وہ کفار کے ناپاک مقاصد اور خطرناک منصوبوں سے اچھی طرح واقف ہے چنانچہ ان کی بعض بیہودہ عادات و اطوار اور افکار و خیالات کا ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس بات کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ: ایسے افراد کو اپنا واقعی دوست اور معتمد یا خیرخواہ تصور کرنا، اپنے وسائل و اختیارات ان کے سپرد نہ کرنا ان کے فیصلوں اور ارادوں کے پابند نہ بن جانا اور ان کو اپنا آقا و سرپرست یا والی و حاکم تسلیم کرتے ہوئے ان سے عہد و پیمان نہ باندھ لینا۔ مثال کے طور پر چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں:-

۱- یاایھا الذین آمنوا لا تتّخذ وا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودّ وا ما عنتّم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر قد بینا لکم الآیات ان کنتم تعقلون (آل عمران/۱۱۸)

اے وہ لوگو! جو ایمان لاچکے ہو، اپنے لئے (مومنین کے سوا) غیروں کو قابل اعتماد دوست اور راز دار قرار نہ دو (کیونکہ) یہ (کفار) تمہاری تباہی اور بربادی میں کسی طرح کی کوتاہی نہ برتیں گے۔ تم کو تکلیف و نقصان پہونچانا ہی ان کی دلی آرزو ہے۔ ان کی باتوں سے تو ان کی دشمنی ظاہر ہی ہوتی ہے لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں مضمر ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے اپنی آیات (روشن ہدایتیں) تمہارے سامنے بیان کردیں، اگر عقل سے کام لو۔

۲۔ یاایہا الذین آمنوا لاتتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء بعضہم اولیاء بعض ومن یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لا یہدی القوم الظالمین (مائدہ/۵۱)

اے ایمان لانے والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست اور ولی یا سرپرست و مختار قرار نہ دو کیونکہ یہود و نصاریٰ تمہاری دشمنی میں ایک دوسرے کے شریک و مددگار ہیں اور تم (مومنین) میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی کا معاہدہ اور پیمان باندھے گا ان ہی میں شامل ہوجائیگا اور خدا ظالموں کی ہدایت نہیں کیا کرتا۔

۳۔ یاایہا الذین آمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ہزواً ولعباً من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء واتقوا اللہ ان کنتم مومنین (مائدہ/۵۷)

اے ایمان لانے والو! وہ اہل کتاب اور کفار جو تمہارے دین کا تمسخر کرتے ہیں اور اسے بازیچہ بناتے ہیں ان کو اپنا آقا و سرپرست نہ بناؤ، اگر مومن ہو تو اس سلسلہ میں خدا سے ڈرتے رہو۔

۴۔ یاایہا الذین آمنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق (الممتحنہ/۱)

اے ایمان لانے والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا ولی و سرپرست قرار نہ دو تم ان سے محبت کا اظہار کرتے ہو حالانکہ وہ لوگ اس قرآن کا انکار کرتے ہیں جو تمہارے اوپر نازل ہوا ہے۔

۵۔ یاایہا الذین آمنوا لاتتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین اتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطاناً مبینا (النساء/۱۴۴)

اے ایمان والو! مومنین کے بجائے کفار کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے خلاف اللہ کا صریحی الزام اپنے اوپر قائم کرلو؟

۶- یاایھا الذین آمنوا لاتتولوا قوما غضب اللہ علیھم قد یئسوا من الآخرۃ کما یئس الکفار من اصحاب القبور

(الممتحنہ / ۱۳)

اے ایمان والو! اللہ کے غضب کا نشانہ بننے والوں سے دوستی کے بندھن نہ باندھو کیونکہ وہ آخرت سے مایوس ہوچکے ہیں جیساکہ کفار مُردوں سے مایوسی کا شکار ہیں۔

۷- لایتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین و من یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیئ الا ان تتقوا منھم تقاۃً و یحذرکم اللہ نفسہ و الی اللہ المصیر (آل عمران / ۲۸)

مومنین صاحبان ایمان کے بجائے کفار کو اپنا ولی و سرپرست قرار نہ دیں جو شخص بھی کفار کی ولایت وحاکمیت قبول کرتا ہے وہ اللہ کے سچا ہیوں (مومنین) میں سے نہیں ہے مگر یہ کہ (اس طرح) تم ان کے شر سے بچنا چاہو اور خدا تو تم کو ڈراتا رہتا ہے اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا بھی ہے۔

ان آیات میں کفار ومشرکین کی مذکورہ مذموم عادات ومقاصد کے علاوہ بعض اہم باتوں کی طرف وضاحت کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے:

(الف) کفار مسلمانوں کے بدخواہ ہیں اور کسی طرح کا بھی نقصان پہونچانے سے وہ گریز نہیں کرتے۔

(ب) ان کی باتوں سے مسلمانوں کے تئیں ان کی دشمنی ظاہر ہے لیکن وہ دل میں اس سے بھی زیادہ کدورت رکھتے ہیں۔

(ج) کفار مسلمانوں کا دین قبول کرنے پر تیار نہیں وہ اس کا تمسخر اور مذاق اڑاتے ہیں۔

(د) کفار نہ صرف مسلمان بلکہ خدا کے بھی دشمن ہیں اور قرآن کو بھی قبول نہیں کرتے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ پروردگار عالم نے ان آیات میں کفار کا حقیقی چہرہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرکے نہایت ہی سختی کے ساتھ مسلمانوں کو اس بات سے خبردار کردیا ہے کہ

ایسے افراد کبھی بھی تمہارے خیر خواہ اور دوست نہیں بن سکتے تم ان کو ہرگز ہرگز اپنا آقا و مربی اور ہمدرد و رازدار قرار نہ دینا وہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں تم ان سے دوستی و وفاداری کے عہد و پیمان نہ باندھنا ان کے منصوبوں اور ارادوں کی پیروی نہ کرنا بلکہ انھیں کبھی اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے نیز اپنی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے مسلمانوں کو دوسروں کا دست نگر بننے کے بجائے اپنی جگہ خود مستقل اور آزاد رہنا چاہئے۔ غیروں کی مصلحت اندیشیوں اور ظاہر سازیوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں خدا نے اتنی تاکید سے کام لیا ہے کہ آخر میں یہاں تک کہدیا کہ: جو مسلمان بھی کفار و مشرکین سے دوستی اور وفاداری کے عہد و پیمان باندھے گا گویا وہ گروہ مسلمین اور امت حزب اللہ سے خارج ہو چکا ہے۔

ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شئ۔ ومن یتولھم منکم فانہ منھم۔

بلکہ بعض آیات میں کفار کی حاکمیت و ولایت کا تسلیم کرنا عدم ایمان کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا گیا ہے:

ولو کانوا یؤمنون باللہ والنبی وما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیاء ولکن کثیرا منھم فاسقون (مائدہ/۸۱)

اگر خدا، اس کے رسولؐ اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے ان پر ایمان لائے ہوتے تو (ہرگز) ان (کفار) کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناتے لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے:۔

لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم (المجادلہ/۲۲)

(اے رسولؐ) آپ کو کوئی ایسی قوم نہیں مل سکتی جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو پھر بھی خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی رکھنے والوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے چاہے یہ دشمنان خدا و رسولؐ ان کے باپ دادا، بیٹے، بھائی یا قوم و قبیلہ کے افراد ہی کیوں نہ ہوں۔

ان آیات سے اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی، خصوصاً کافر ملکوں کے ساتھ آئ کے سیاسی روابط کی بنیادیں معین و مشخص ہو جاتی ہیں اور بھرپور تاکید سے مسلمانوں کو حکم دیتی ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی آزادی و استقلال کی حفاظت کرتے رہیں اور اپنے داخلی معاملات میں کفار و مشرکین کو دخل اندازی کی اجازت نہ دیں ان سے دوستی اور سرپرستی کے عہد و پیمان نہ باندھیں نیز ان کی فریب کارانہ مصلحت اندیشیوں اور ظاہر سازیوں سے محفوظ رہیں۔

آخری قسط

جناب محمد مومن
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

حکومتِ اسلامی میں قانون سازی کا طریقہ

قابل تغییر قوانین :-

اب چونکہ حکومت اسلامی کا کام فقط ابدی و ناقابل تغییر قوانین کی طرف عوام کی رہنمائی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح طور پر اجراء و نفاذ کے فرائض بھی انجام دینا ہیں اس کے علاوہ مملکت اسلامی کی سرحدوں کا تحفظ، نشر اسلام کے لئے جہاد، بیت المال کا صحیح تصرف، اس کی وصولی اور حفاظت، شہری نظم و نسق، سڑکوں کی تعمیر، حمل و نقل کے وسائل اور دشمنان اسلام سے بچاؤ کے لئے آتنی قوت و طاقت مہیا کرنا تاکہ دشمن خائف رہیں اور سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی طرح حقوق کی بحالی، حدود الٰہی کا اجراء نیز اسی کے مثل دیگر امور انجام دینا مسلمانوں پر حاکم "ولی امر" کی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے تمام موارد میں اس کو اسلام کے ابدی احکام کی بنیاد پر ہی کام کرنا ہے لھذا بدیہی ہے کہ ان احکام الٰہی کو پوری مملکت میں بیک وقت نافذ کرنے کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں چند دوسرے قوانین کا بھی سہارا لینا پڑے گا جس کا مقصد اسلامی احکام کو زیادہ سے زیادہ دقت نظر کے ساتھ عمل میں لانا ہو تاکہ عوام الناس بھی اپنے امور کو بہتر طور پر انجام دے سکیں اور اہل کار حضرات بھی اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ مثلاً یہی کہ کون سا کام کس وقت انجام دینا ہے؟ اس طرح حاکم (ولی امر) مصلحتوں کے پیش نظر کچھ مخصوص بنیادوں پر ایسے اصول و قوانین بھی مرتب کرتا ہے جو حالات و زمانہ کے اعتبار سے فرق کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر عدالت کی کارکردگی کے قوانین یا عوامی حقوق کی بحالی کا طریقۂ کار وغیرہ۔

اسلام کے مستقل دستور میں حدود و احکام الٰہی سے تجاوز و تخلف کرنے والوں کے لئے

سزائیں مشخص و معین کر کے متدین و صالح قاضی صاحبان کے حوالہ کر دی گئی ہیں۔ اب حکومت اسلامی اس کے اجراء اور عمل میں لانے کی ذمہ دار ہے لیکن آبادی کی کثرت، قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کی زیادتی یا مملکت اور شہر و ضلع کے حدود اربعہ کی وسعت کے پیش نظر ان احکام کے صحیح طور پر عمل و نفاذ کے لئے بعض وقت مخصوص نظم و نسق کی ضرورت ہوگی تاکہ عدالتی امور کی تقسیم بندی ہو جائے اور قاضی صاحبان نیز عدالتوں کا دائرہ کار محدود و معین ہو جائے۔ چنانچہ بعض کو محض ابتدائی سطح کے امور سپرد کئے جاتے ہیں (PUBLIC ROSECUTORS) اور پھر تمام ضلعی یا شہری عدالتوں کو صوبائی عدالت کے رئیس کی نگرانی میں دیدیا جائے (HIGH COURT) اور آخر میں پوری مملکت میں پھیلی ہوئی صوبائی عدالتوں کو ملک کی عدالت عالیہ کے رئیس و سربراہ کی نگرانی میں دیدیا جائے تاکہ قضاوت کے امور بہتر اور پسندیدہ انداز میں تیزی کے ساتھ انجام دئے جاسکیں۔

ظاہر ہے ہر سطح پر ذمہ داریوں کا الگ الگ دائرہ معین کرنے کے لئے کچھ قوانین و مقررات وضع کرنے کی ضرورت پڑے گی جن میں سے ممکن ہے کچھ اصول و مقررات ایک زمانہ میں کار آمد ہوں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ منسوخ ہو جائیں۔ یا اصلاح و تغییر کے محتاج قرار پائیں یا حالات کے تحت ان میں کمی و زیادتی کرنی پڑے۔ اس کے علاوہ چونکہ مملکت اسلامی کا حاکم (ولی امر) احکام اسلامی کے نفوذ و اجراء کا ذمہ دار اور نگراں ہوتا ہے لہٰذا ممکن ہے مصلحت و دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ان عارضی قوانین کے وضع کرنے کے لئے بھی کسی مخصوص طریقہ کار کا انتخاب کرے جیسا کہ آج جمہوریۂ اسلامی ایران میں اس کا ایک مستقل طریقہ رائج ہے۔

اسی طرح تقسیم امور مملکت کی منزل میں بھی قوانین الٰہی کے اجراء کے لئے کچھ اصول و ضوابط مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ قانون ساز اسمبلی میں منظور شدہ قوانین کی روشنی میں، مختلف وزارت خانوں کی تشکیل، وزراء اور ان کے ماتحت عملہ (سکریٹریٹ) کے انتخاب نیز حکومت کے زیر نگیں مختلف اداروں سے متعلق اصول و مقررات کا تعین ہو جائے۔

خلاصۂ بحث:

اب تک کی بحث کا مختصر طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت اسلامی میں عوام اور حکومت دونوں کے لئے خدا کی جانب سے اسلام کے عظیم المرتبت پیغمبرؐ کے ذریعہ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے ناقابل تغییر

قوانین پیش کر دیئے گئے ہیں اور جب تک خود خداوند عالم ان کو منسوخ یا تبدیل نہ کرے کسی کو ان کے اندر تغییر و تبدل کا حق حاصل نہیں ہے۔ حکومت کو قطعی طور پر قانون وضع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے، اس کی ذمہ داری محض ان امور کو انجام دینا ہے جو ان کی تحویل میں دیئے گئے ہیں ان ہی میں سے ایک اہم کام قوانین الٰہی کی نگرانی بھی ہے البتہ اگر ان ذمہ داریوں کی ادائیگی یا نظام مملکت اسلامی کی ترقی و بہبودی کے لئے کسی طرح کے دستور و ضوابط کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کے لئے احکام اسلامی کے دائرہ میں رہتے ہوئے ضروری حد تک قوانین و مقررات وضع کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے، اگرچہ اس کا مقصد صرف اور صرف احکام اسلامی کو بہتر سے بہتر طور پر نافذ کرنا نیز حکومت اسلامی کو استوار و استحکام عطا کرنا ہے۔

حکومت کے اس حق و اختیار کے ثبوت کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں کے امور کی سرپرستی ان کے ولی امر کے سپرد کر دی گئی ہے ظاہر ہے وہ اس کے لئے جس طریقہ اور انداز کو بہتر اور مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھے گا انتخاب کرے گا اور بروئے عمل لائے گا کیونکہ کسی کو کسی ذمہ داری کے سپرد کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ اس کو اس بات کا اختیار حاصل ہو کہ وہ ایک مخصوص دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ارشاد گرامی "الاجتہاد فی النصیحہ" سے اسی مفہوم کے جواز کی نشان دہی ہوتی ہے۔

اس مختصر بحث کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اصول شریعت کے آئینہ میں بہتر اور مناسب ترصورت یہ ہے کہ جید علمائے اسلام و فقہاء عالی قدر کا ایک گروہ احکام اسلامی کی روشنی میں قوانین کی ترتیب و تدوین کا ذمہ دار ہو۔ عوامی پارلیمنٹ کے سامنے جس کے اکثر نمایندے علوم اسلامی کے اعلیٰ مدارج پر فائز نہیں ہوتے ان احکام کو پیش کئے جانے سے احتراز کیا جائے تاکہ اسلامی احکام و قوانین الٰہی سے ناآشنا سطحی افکار کے حامل افراد کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے محفوظ رہیں البتہ متعلقہ موضوعات کے ماہرین کی ایک جماعت بھی علماء و فقہائے اسلامی کے پہلو بہ پہلو موجود رہے تاکہ جہاں ضرورت ہو ان سے بھی استفادہ کیا جا سکے۔ چنانچہ پارلیمنٹ کا کام ایسے قوانین و مقررات وضع کرنے تک محدود رہے جن کی احکام اسلامی کے بہتر طور پر نفاذ کے سلسلہ میں ضرورت پیش آئے۔ اسی طرح پارلیمنٹ کا کام وزراء کی کابینہ میں پاس ہونے والی ان قراردادوں کے

اچھے اور برے پہلوؤں پر نظر رکھنا ہے جس کی کابینہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ نیز اسی طرح حکومت کی کارکردگی پر نظر رکھنا پارلیمنٹ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

اسلام میں قوانین افراد و معاشرہ کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں:

آج کے ترقی پذیر معاشروں میں انسانی آزادی اور اس کی خواہشوں کی تکمیل پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ انسان کی جو بھی آرزوئیں ہیں پوری ہو سکیں اور وہ جن چیزوں سے لگاؤ رکھتا ہے وہ سب کچھ اس کو حاصل ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "آزادی" اور "آزاد زندگی" کے بہت زیادہ ہمنوا پائے جاتے ہیں لیکن اسلام کے بنیادی قوانین میں معاشرہ اور اس میں زندگی بسر کرنے والے افراد کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا پاس و لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ انسان جو ضرورتیں رکھتا ہے اور جو چیزیں اس کے مطابق حال اور مفید ہیں قوانین کے زیر سایہ اس کو حاصل رہیں اور جو چیزیں اس کے لئے مضر ہیں ان کو اس سے دور رکھا جائے۔ ہر عقل سلیم رکھنے والا اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لے تو اس بات کا اعتراف کرے گا کہ انسان کو اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں لگا رہنا چاہئے لیکن اگر کوئی خواہش انسان کے لئے مضر ہے تو اس کے پیچھے بھاگنا بے جا اور نامناسب ہوگا چنانچہ اسی لئے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قانون سازی کا معیار خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے بجائے انسانی مصلحت و ضرورت کو قرار دینا چاہئے۔

چنانچہ یہ انسانی تقاضوں اور مصلحتوں کی تکمیل کا معیار اسلام کے بنیادی و ناقابل تغییر قوانین میں بھی کارفرما ہے اور قابل تغییر دستور و مقررات میں بھی اس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں مختلف تعبیروں کے ساتھ بار بار صاف اور صریح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ:

"من اهتدى فانما يهتدى لنفسه ومن ضل فانما يضل عليها" (سورۂ یونس: ۱۰۸/ و سورہ بنی اسرائیل (اسراء) ۱۵/)

"اهتداء" یعنی راہ ہدایت حاصل کرنا جو انسان کے لئے فائدہ بخش ہے۔ ضلالت یعنی یعنی گمراہی جو انسان کے لئے ضرر و نقصان کی باعث ہے اور یہ راہ ہدایت پانا قوانین الٰہی کی

پیروی کرنے اور خدا کی معین کردہ راہ پر چلنے کے سوا کچھ اور نہیں ہے اسی طرح ضلالت بھی پیغمبر اسلامؐ کی راہ سے انحراف کے علاوہ کسی اور چیز کا نام نہیں ہے، قرآن کتاب ہدایت ہے:

لاریب فیہ ھدیً للمتّقین (سورہ بقرہ/۲)

اور گناہ، گناہ گار کے لئے نقصان کے سوا کچھ نہیں:

ومن یکسب اثماً فانما یکسبہ علیٰ نفسہ (سورۂ نساء: /۱۱۱)

مختصر یہ کہ اسلام کے وہ تمام مسلّمہ احکام جن کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے مکمل طور پر انسان کے فائدے کے لئے ہیں ان پر عمل کرنا ہدایت و اہتداء ہے نیز ان سے روگردانی کرنے کا مطلب اپنے آپ کو ضلالت اور نقصان میں مبتلا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات۔ (سورۂ والعصر/۱)

یعنی عمل صالح کی منزل میں جتنا انسان پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ نقصان میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔

جہاں تک قابل تغییر قوانین کا سوال ہے تو جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اور نہج البلاغہ میں بھی امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا ہے: "لیس علی الامام الاماحمل من امر ربہ الابلاغ فی الموعظۃ والاجتھاد فی النصیحۃ۔" حکومت اسلامی کا فریضہ ہے کہ مسلمان معاشرہ اور افراد کی فلاح و بہبودی کے لئے حتی الامکان پوری کوشش صرف کرے اور عوام الناس کی بھلائی کے پیش نظر ہی مطابق حال قابل تغییر قوانین وضع کرنے کی اجازت دی گئی ہے تا کہ بہتر سے بہتر اور جلد سے جلد مسلمانوں کی ضرورتوں کی تکمیل میں کامیابی حاصل کی جا سکے اور لوگوں کے حقوق بحال ہو سکیں۔ پتہ چلا کہ قابل تغییر قوانین میں بھی مسلمانوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنے اور اس کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہونچانے کو ہی معیار بنایا گیا ہے۔

اسلامی حکومت میں اجتہاد کی اہمیت:

جیسا کہ عرض کیا گیا اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے بنیادی و اساسی حیثیت ان ہی قوانین

واحکام کو حاصل ہے جو مستقل ہمہ گیر اور مسلّم الثبوت ہیں ان احکام وقوانین کی شناخت زمانۂ پیغمبر اسلام یا عہد امام معصوم سلام اللہ علیہم اجمعین میں سبھی کے لئے ممکن بھی ہے اور آسان بھی اس لئے کہ حضرات قوانین الٰہی کے عالم و وارث تھے اور اسی حیثیت سے عوام الناس سے قریبی رابطہ رکھتے تھے اور حکومت الٰہیہ کی سرپرستی کے فرائض انجام دیتے تھے انھوں نے ہر منزل میں ایک ایک فرد قوم نیز ذمہ داران مملکت کے فرائض بیان کردئے ہیں ظاہر ہے اس نورانی دور میں اجتہاد یعنی تفصیلی دلیلوں سے اسلام کے کلی قوانین کے استنباط کرنے کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی۔

لیکن آج امام معصوم علیہ السلام کی غیبت کے زمانہ میں اسلامی حکومت کی تشکیل فقہائے اسلام نیز اسلامی درد رکھنے والے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ ملک کو چلانے کیلئے ذمہ داران مملکت اور افراد قوم وملت کا اہم ترین فریضہ یہی ہے کہ وہ ملک میں اسلام کے ان مسلّمہ ناقابل تغییر قوانین کا اجراء کریں اور اپنی عملی دنیا میں رچائیں بسائیں جو قرآن مجید نیز پیغمبر اسلام اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سنت میں بیان کردئے گئے ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ ان قوانین کا بڑا حصہ خاص کر اس کے جزئیات ضروریات دین میں سے نہیں ہے لھذا بغیر اجتہاد کے ان قوانین کے بارہ میں مکمل آگاہی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے: یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں احکام اسلام کے استنباط واستخراج کے لئے اجتہاد کو اہم ترین حیثیت دی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ اسلام کے دائمی اور ناقابل تغییر قوانین کے زیر سایہ تمام افراد مملکت نیز ارباب حکومت کی ذمہ داری اور دائرۂ عمل کو مشخص ومقرر کیا جا سکے۔ بلکہ حکومت اسلامی کے قابل تغییر قوانین کے سلسلہ میں بھی اجتہاد بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ان قابل تغییر قوانین کے وضع کرنے کے سلسلہ میں بھی اسلام کے ان ہی مسلمہ اور ناقابل تغییر قوانین کو بنیاد بنانا ضروری ہے اور ان کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ کر لینا ہرگز درست نہیں ہے۔ چنانچہ ان قابل تغییر قوانین میں کوئی چیز اسلام کے مسلمہ قوانین کے خلاف نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان ہی کے آئینہ میں ان کو بھی مرتب کرنا ضروری ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہنا بے جا ہوگا کہ اس میدان میں بھی اجتہاد کو روح کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے جمہوریۂ اسلامی ایران کے قانون اساسی میں مستقل طور پر علوم اسلامی کے ماہرین کی ایک جماعت "شورائے نگہبان" کے طور پر مقرر کی گئی ہے تاکہ اس کے ممبران اجتہاد سے کام لیتے ہوئے اپنی گہری معلومات کی بنیاد پر مجلس شورائے اسلامی (پارلیمنٹ) میں پاس شدہ

چیزوں کو پرکھیں اور دیکھیں کہ وہ اسلام کے مسلمہ قوانین سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔

حکومت اسلامی میں فتووں کا اختلاف۔

ممکن ہے بعض اذہان میں مجتہدین کے درمیان فتووں کا اختلاف حکومت اسلامی کیلئے ایک مشکل مسئلہ سمجھ میں آتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حالات میں دشمنان اسلام، غیبت معصوم علیہ السلام کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے عقائد کمزور کرنے کیلئے اسی کو بہانہ بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن تھوڑی سی دقت نظر کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فتووں کا اختلاف حکومت اسلامی میں کسی طرح کی پریشانی یا مشکل پیدا نہیں کرتی۔ کیونکہ اجتہاد و تقلید کے سلسلہ میں، جیسا کہ ادلۂ شرعیہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں، ہر شخص کے لئے اجتہاد یا صحیح تقلید خود اس کی حد تک حجت ہوتی ہے۔ لھٰذا اسلامی حکومت میں اجتہاد و تقلید کے مسئلہ کو بہر حال احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی رو سے ہر شخص شرعی دلائل کی روشنی میں اپنے اعمال انجام دینے کے سلسلہ میں آزاد ہے اور چونکہ اسلام کے اکثر احکام وہ ہیں جن میں علماء کے درمیان اختلاف نہیں پایا جاتا لھٰذا ان کے بارہ میں کسی طرح کی پریشانی کا مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب رہا سوال اختلافی مسائل کا، پس اگر کسی مسئلہ میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے تو لوگوں کا فرض ہے کہ شرعی دلائل کو سند بنا کر چاہے مجتہد ہوں یا مقلّد اپنے ذاتی امور انجام دیں۔ ذمہ داران حکومت بھی ولایت فقیہ کے تحت رہتے ہوئے، جو کہ حکومت و رہبری کا اصل ذمہ دار ہوتا ہے، اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ انھیں ولی فقیہ کے فتووں پر ہی عمل کرنا ہوگا۔ ان کی حیثیت محض ایک کارندہ کی ہوگی جس کا کام ولی امر کے فقہی افکار و نظریات کو بروئے عمل لانا ہوتا ہے۔ ارباب حکومت کسی پر اپنے خیالات و نظریات مسلط کرنے کا اختیار نہیں رکھتے نہ ہی وہ ان لوگوں کے افکار و نظریات قبول کر سکتے ہیں جو ولی فقیہ کے شرعی دلائل سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ ایسے افراد کے سلسلہ میں اگر کوئی مسئلہ معاملات و اقتصاد سے تعلق رکھتا ہے تو مجبوراً احتیاط کے طریقہ کو عمل کی بنیاد قرار دینا پڑے گا یا کسی ایسے کی طرف معاملہ کو پلٹانا پڑے گا جو ولی امر سے اتفاق نظر رکھتا ہو۔ چنانچہ اگر قاضی کی عدالت میں کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو وہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی دلیل شرعی کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے سلسلہ میں فیصلہ کرے گا اور حدود و تعزیرات کے اجراء کرنے میں اگر کسی عمل کا ارتکاب کرنے والا اجتہاداً

یا تقلیداً اپنے عمل کا کوئی جواز رکھتا ہے تو کم سے کم "الحدود تدرء بالشبہات" کے قانون کے تحت مجرم کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے سزا سے معاف کر دیا جائیگا اور اگر اس کے برخلاف قاضی خود تو اس کو کسی جرم کا مرتکب نہیں سمجھتا لیکن مجرم خود کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے تو بھی قاضی اس کو بھی معاف کر دے گا۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح اکثر زمانوں میں بیک وقت کئی مراجع کرام ہوتے رہے ہیں اور ان کے مقلدین کی تعداد بھی کثیر رہی ہے نیز یہ کہ عوام الگ الگ گروہ کی شکل میں مختلف مراجع کی تقلید کرتے رہے ہیں اور یہ بھی طے ہے کہ ان مراجع کے فتووں میں اختلاف بھی پایا جاتا رہا ہے پھر بھی اس اختلاف سے ایک مرجع کے مقلدین اور دوسرے مراجع کے مقلدین کے درمیان روابط میں کسی طرح کا خلل پیدا نہیں ہو سکا فتووں کا اختلاف یا کسی مرجع کے مقلدین کا کوئی مخصوص عمل معاشرہ میں بدمزگی یا اس کی تعطلی کا سبب نہیں بن سکا۔ بس اسی طرح فتووں کا اختلاف نہ تو عوام اور حکومت کے درمیان روابط کو منقطع کرنے کا سبب ہو سکتا ہے نہ ہی حکومت یا عوام کے کاموں کو مفلوج یا معطل کر سکتا ہے۔ ہمیں مکمل طور پر اسلامی قوانین کی رعایت کرتے ہوئے اجتہاد اور شرعی دلیلوں کے سلسلہ میں شخصی استنباط کی آزادی کے ساتھ پاس و لحاظ رکھنا چاہئے اور اسی کو حکومتی پیمانے پر اپنے عمل کی بنیاد قرار دینا چاہئے۔

حکومت اسلامی کا مذہب۔

جیسا کہ قرآن کریم میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ:

وان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ ذالکم وصاکم بہ لعلکم تتقون (انعام/۱۵۳)

اور یہی میرا راستہ سیدھا اور مستقیم ہے اسی پر چلتے رہو دوسرے راستوں کو اختیار نہ کرو کیونکہ وہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا کر تتر بتر کر دیں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا تاکہ تم پرہیزگار ہو۔

صحیح راہ پیغمبر اسلام کی راہ ہے اس پر چلنے والا سیدھے خداوند عالم سے جا ملتا ہے اور اس سے انحراف انسانوں کو خداوند عالم سے جدا کر دیتا ہے۔ خداوند عالم نے جس راہ پر چلنے کا حکم دیا ہے وہ ایک ہی راستہ ہے اور وہ وہی پیغمبر اسلام کا سیدھا راستہ ہے جس کی پیروی اور

اتباع ہرایک پر واجب و لازم قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ مذہب اسلام ان ہی قوانین پر عمل کرنے کا نام ہے لیکن افسوس ہوتا ہے کہ صدر اسلام میں ہی کچھ ایسے نہایت ہی تلخ حوادث رونما ہوئے اور اسلام کے نام پر ہوا و ہوس اور دنیا طلبی کا وہ سیلاب آیا کہ اس صراط مستقیم کے اکثر گوشے غرق آب ہوگئے اور تمام لوگوں کے لئے راہ مشخص کرنا مشکل ہوگیا اور پھر اس کی خصوصیات کی تعیین کے سلسلہ میں عجیب و غریب تفرقہ اندازی سے کام لیا گیا۔

بہر حال کچھ بھی ہو حکومت اسلامی میں معیار فقط اسلام ہے اور بس۔ اس کے علاوہ کوئی بھی چیز مجھے ایسی نظر نہیں آتی جس کو حکومت کے رسمی مذہب کے عنوان سے پیش کیا جاسکے اور وہ اسلامی اساس بھی رکھتی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اقتصادی یا اسی کے مثل دوسرے احکام کے ذیل میں اسلام کے مختلف فرقوں کی فقہیات میں لازمی ہونے کی حیثیت سے یا ترجیحی ہونے کے اعتبار سے کچھ مخصوص خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو اپنے دائرہ میں قابل احترام بھی سمجھی جاتی ہیں لیکن یہ اختلاف اس بات کا موجب نہیں قرار دیا جاسکتا کہ یہ فرق و اختلاف دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کا مترادف قرار پائے اور اس چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو آج تقریباً پوری دنیا میں رائج ہے جس جگہ جس مذہب کے ماننے والوں کی کثرت ہوگی قہری طور پر اس ملک کا رسمی مذہب وہی مذہب قرار پائے گا۔

اسلامی حکومت میں اقلیتیں۔

اسلام اور حکومت اسلامی میں معیار صرف احکام اسلامی کی پیروی اور پیغمبر اسلام کے پرچم کے زیر سایہ زندگی گزارنے پر آمادگی قرار دیا گیا ہے، پھر بھی دیگر آسمانی مذاہب و ادیان سے تعلق رکھنے والے اگرچہ انھوں نے دین میں تحریف سے کام کیوں نہ لیا ہو اسلامی ملک میں اسلام کے وفادار رہ کر اس کی پناہ میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان کے مذہبی اصول و قوانین خود ان کے واسطے حکومت اسلامی کی نظر میں لائق احترام ہیں۔ لیکن انھیں بہر حال اسی طور پر زندگی گزارنی ہوگی کہ ان کے کسی عمل سے اسلامی احکام کی توہین نہ ہو اور چونکہ خمس و زکواۃ کے اسلامی احکام ان کے مذہبی قوانین میں شامل نہیں ہیں لہٰذا انھیں ایک خاص قسم کا ٹیکس حکومت اسلامی کو ادا کرنا پڑیگا

تاکہ اس کے ذریعہ حکومت اسلامی ان کی ضرورت و احتیاج کو رفع کر سکے۔ اصل میں اس عنوان سے حکومت اسلامی اپنے بجٹ میں ان پر خرچ کی جانے والی رقم کو اس طرح پورا کر لیتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اقلیتوں کی فہرست یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں تک محدود ہے ان کے علاوہ دوسری اقلیتیں حکومت اسلامی میں سرکاری طور پر مورد احترام نہیں قرار دی جا سکتیں دوسری اقلیتوں کا تعلق اگر اسلامی مذاہب و فرق سے ہے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے لئے ہیں اور اگر اسلام کے دائرہ سے خارج ہوں تو حکومت اسلامی کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ امور مسلمین کے ذمہ داروں کی مرضی سے کسی مصلحت کے تحت حکومت اسلامی کے سایہ میں انھیں پناہ دیدی جائے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ اس مقالہ میں تمام موضوعات خصوصی طور پر حکومت اسلامی کا مذہب اور اقلیتوں کی حیثیت سے متعلق نہایت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اگر ممکن ہوا تو اس سلسلہ میں تفصیلی بحث آیندہ کسی موقع پر پیش کی جائے گی۔

جناب سید مصطفیٰ محقق
ترجمہ جناب سید اعتصام عباس زیدی۔

مصادر فقہ

خبر کی قسمیں:-

الف) خبر متواتر ۔ ایک ایسی جماعت کی خبر جن کا کذب پر متحد ہو جانا عادتاً محال ہو۔ اس طرح کی اخبار کسی قرینہ کے شامل کئے بغیر ہی علم و یقین کا سبب بنتی ہیں۔

ب) خبر واحد ۔ وہ خبر جو تواتر کی حد تک نہ پہنچ پائی ہو، اس کے راوی چاہے کم ہوں یا زیادہ، کسی خارجی قرینہ کے بغیر اس کی صداقت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

ج) خبر صحیح ۔ وہ خبر جس کی سند معصوم سے متصل ہو اور اس کے تمام راوی پورے سلسلۂ روایت میں عادل، امین اور امامی ہوں اور ان کی عدالت سب پر واضح و روشن بھی ہو۔

د) خبر حسن ۔ وہ خبر جس کی سند معصوم سے متصل ہو اور اس کے تمام راوی امامی اور ممدوح و نیک صفات ہوں یا ان میں سے بعض ممدوح ہوں اور انکی برائی یا مذمت نہ کی گئی ہو۔ اگرچہ ان تمام یا ان میں سے چند راویوں کی عدالت واضح اور ثابت نہ ہو۔

ھ) خبر موثق ۔ ایسی خبر جو سند کی حیثیت سے معصوم سے اتصال رکھتی ہو اور اس کے راویوں میں سے ایک یا چند راوی امامی نہ ہوں لیکن روایت کے نقل کرنے میں ان کو معتبر اور ثقہ مانا گیا ہو۔

و) خبر ضعیف ۔ وہ خبر جو صحیح، حسن یا موثق خبروں کے برخلاف ہو اور راوی کے فسق و فجور یا ناپسندیدہ صفات کی بنا پر اس کی مذمت کی گئی ہو یا پھر خود راوی گمنام اور لامعلوم ہو۔

خبر واحد کی حجیّت۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ خبرِ متواتر ایسی خبر ہے جس کے راویوں کی تعداد اس قدر ہو کہ ان کا ایک غلط خبر کے

نقل کرنے کے سلسلہ میں متحد ہوجانا بعید یا ناممکن ہو اور ان کی کثرت کی بنا پر ان کے قول کی صداقت پر یقین آجائے۔ مثلاً اگر کسی مقام پر بے بنیاد خبر کو گڑھنے کے سلسلہ میں دو، تین یا چار آدمی کا گٹھ جوڑ ممکن ہو تو اس مقام پر خبر دینے والوں کی تعداد ۳۰ یا ۴۰ تک پہنچ جائے تو کسی جھوٹی خبر پر اتنے لوگوں کے ہم آواز ہوجانے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے اور یہی بات خبر کی صحت پر یقین کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی کو خبر متواتر کہتے ہیں۔ جبکہ خبر واحد ایسی خبر ہے جو تواتر کی حد تک نہ پہنچ پائی ہو یعنی اصطلاحاً خبر غیر متواتر خبر واحد کہلاتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ خبر واحد سے مراد ایک خبر دینے والا ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے راویوں کی تعداد زیادہ ہو لیکن اس قدر نہ ہو کہ تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔

چونکہ خبر واحد کے سننے والے کو یقین حاصل نہیں ہوتا لہٰذا اسے حجت و دلیل قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی دوسری دلیل بھی ہو۔ خبر واحد کی حجیت کے سلسلہ میں کافی اختلاف ہے۔ علماء کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ خبر واحد حجت نہیں، جبکہ دوسرا گروہ اس کے حجت اور دلیل ہونے کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ متقدمین میں بہت سے علماء نے اس کی حجیت سے انکار کیا ہے مثلاً: سید مرتضیٰ، ابوالمکارم ابن زہرہ، ابن براج، ابن ادریس لیکن متاخرین میں جمہور علماء نے اس کے حجت ہونے کی تائید کی ہے۔[1]

وہ لوگ جو اس کی حجیت کو مانتے ہیں فقہ کے چاروں مصادر یعنی کتاب، سنت، اجماع و عقل سے اس کی دلیل لاتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی دلیلوں کو پیش کرکے ان پر بحث کرتے ہیں۔

خبر واحد کی حجیت قرآن کی روشنی میں:

خبر واحد کی حجیت کو ماننے والے اپنی بات کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں قرآن کی چند آیتوں سے استدلال کرتے ہیں مثلاً سورۂ حجرات کی چھٹی آیت۔ اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ ولید نامی ایک شخص مدینے سے باہر کہیں سفر پر گیا ہوا تھا، واپس آکر اس نے رسول اللہؐ کی خدمت میں عرض کی کہ فلاں قبیلہ، دین سے پھر گیا ہے اور جنگ پر آمادہ ہے۔ اس خبر کی بنیاد پر پیغمبرؐ نے ایک لشکر آمادہ کرکے اس قبیلہ کی طرف روانہ کیا جب یہ لوگ اس قبیلہ کے نزدیک پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نہ صرف اہل قبیلہ لڑنے کے بجائے استقبال کو آئے ہیں بلکہ اسلام اور رسولِ اسلام کے دلدادہ بھی ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:۔

---

[1] معالم الاصول۔ چاپ تہران ص۲۱۵

ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین

یعنی اے مسلمانو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو اسکی تفتیش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی جہالت کی بنا پر ایسے لوگوں سے ٹکراؤ کہ بعد میں تمہیں اپنے کئے پر پشیمان ہونا پڑے۔

علماء علم اصول اس آیت کے "مفہوم" کے ذریعہ خبر واحد کی حجیت ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آیت میں ہے کہ اگر "فاسق" کوئی خبر لائے تو تفتیش کرو۔ چنانچہ اس کا "مفہوم مخالف" یہ ہے کہ اگر عادل خبر لائے تو تفتیش اور چھان بین کئے بغیر اسے قبول کر لو۔

مندرجہ بالا استدلال پر کتب اصول فقہ میں کافی تنقید اور اعتراضات کئے گئے ہیں اور علماء کی جانب سے انکا جواب بھی دیا گیا ہے۔ مذکورہ استدلال پر سب سے اہم اعتراض شیخ مرتضیٰ انصاری کی کتاب فرائد الاصول میں مندرج ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اس آیت سے جو مفہوم اخذ کیا گیا ہے وہ سرے سے "مفہوم شرط" ہے ہی نہیں بلکہ "مفہوم وصف" ہے۔ اس لئے کہ اس "اگر فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تفتیش کرو" جملہ کا مفہوم شرط یہ نہیں ہے کہ "اگر عادل خبر لائے تو تفتیش ضروری نہیں"۔ بلکہ مذکورہ جملۂ شرطیہ کا مفہوم "اگر فاسق خبر نہ لائے تو تفتیش نہ کرو" ہے اور فاسق کے خبر نہ لانے کا مطلب یہ کہاں سے نکلتا ہے کہ عادل خبر لائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت کریمہ مکمل ایک قضیہ شرطیہ ہے، جس کے دو جزو ہوتے ہیں: شرط و جزا یا مقدم و تالی۔ مثال کے طور پر:-

ان جاءکم فاسق بنبا
اگر فاسق تمہارے پاس خبر لائے } شرط

فتبینوا
تو اس کی تفتیش کرو } جزا

اس قضیہ شرطیہ سے مفہوم مخالف اس طرح حاصل ہوگا کہ اگر اس کا پہلا جزو یعنی شرط منفی ہو جائے تو دوسرے جزو یعنی جزا کی نفی اپنے آپ ہو جائے گی اور مفہوم کی صورت یہ ہوگی "اگر فاسق تمہارے پاس خبر نہ لائے تو تفتیش لازم نہیں ہے۔" واضح ہے کہ اس مفہوم سے مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ جملہ مفہوم وصف یا صفت کا آئینہ دار ہے نہ کہ مفہوم شرط کا۔ یعنی لفظ "فاسق" کا مفہوم مخالف "غیر فاسق" یعنی "عادل" ہے اور جملہ شرطیہ سے ایسا مفہوم حاصل نہیں ہو سکتا اور مفہوم وصف کی حجیت مسلم نہیں اور وہ مفہوم شرط کی طرح جائز اور روا بھی

ہیں ہے لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ مندرجہ بالا قضیہ شرطیہ میں خود شرط دو جزو سے مرکب ہے یعنی خبر کا پانا، خبر لانا، فاسق کا)۔ پہلا جزو یعنی "خبر لانا" ایسا ہے کہ قضیہ کی جزا یعنی "ضرورت تفتیش" عقلی طور سے اسی پر منحصر ہے، خبر لانے کی نفی ہونے کی صورت میں قضیہ منطقی نقطۂ نظر سے "سالبہ بانتفاء موضوع" ہو جائے گا۔ یعنی اگر خبر نہیں آئی تفتیش کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ تفتیش کا لازم ہونا یا ضرورت تفتیش تو دور کی بات ہے جبکہ شرط کے دوسرے جزو یعنی "فاسق" کی وہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کی نفی سے قضیہ کا موضوع ہی ختم ہو جائے اور جزاء کی نوبت ہی نہ آئے اس طرح کے قضایائے شرطی میں مفہوم مخالف فقط شرط کے دوسرے جزو "فاسق" کی نفی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

بات کو اور واضح کرنے کے لئے دوسری مثال پر غور کیجئے کہ ایک شخص اپنے نوکر سے کہے کہ "اگر میں سرخ روشنائی سے تم کو خط لکھوں تو اسمیں مندرج احکام کی تعمیل کرو"۔ اس قضیہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "اگر میں خط نہ لکھوں تو تعمیل حکم لازم نہیں ہے"۔ اس لئے کہ نہ لکھنے کی صورت میں عقلاً عمل کا وجود ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے اس قضیہ کا صحیح مفہوم مخالف تو یہ ہوگا کہ "اگر میں سرخ روشنائی کے علاوہ کسی اور روشنائی سے لکھوں تو تعمیل حکم لازم نہیں ہے"۔

علاوہ ازیں آیت کریمہ انسانوں کے درمیان رائج طریقہ کار کی طرف اشارہ کر رہی ہے یعنی راوی وغیرہ سے متعلق تحقیق یا چھان بین کئے بغیر ہر شخص سے روایت و خبریں حاصل کرنا اور اسے قبول کرنا۔ آیت نے انسانوں کے اس طریقہ کار کو دیکھتے ہوئے صرف ایک بات پر پابندی لگائی ہے اور وہ ہے فاسق سے خبر یا روایت لینا اور بلا تحقیق و تفتیش اسے قبول کرنا جس کا لازمہ یہ ہے کہ عادل اور ثقہ اشخاص کی اخبار و روایات کو قبول کیا جائے۔

خبر واحد کی حجیّت کے سلسلہ میں علماء اصول جس دوسری آیت کو اپنے دعویٰ کی دلیل میں پیش کرتے ہیں وہ سورۂ توبہ کی ۱۲۳ ویں آیت ہے:

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

ہر قوم میں سے کچھ لوگ مرکز دین کی طرف کیوں نہیں جاتے کہ علم دین میں صلاحیت پیدا کریں اور جب اپنی قوم میں واپس جائیں تو لوگوں کو ہدایت کریں اور ڈرائیں تاکہ وہ بھی برائیوں سے محفوظ رہیں۔

بقول علماء خداوند عالم کا مقصود یہ ہے کہ ہر قوم اور طائفہ سے کچھ لوگ اس کام کے لئے باہر آئیں اور جب اپنی

قوم میں واپس جائیں تو جو کچھ حاصل کیا ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں اور یہ بات بدیہی ہے کہ واپس جاکر وہ لوگ علاحدہ علاحدہ عوام تک پیغام پہنچائیں گے، تمام مبلغین ایک ساتھ کسی شخص سے گفتگو نہیں کریں گے بلکہ ہر مبلغ ایک حلقہ کو سنبھالے گا۔ اس بنا پر خدا وند عالم نے ان افراد کی الگ الگ خبر یا خبر واحد کو قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ اس صورت میں نتیجہ یہ نکلا کہ خبر واحد قابل اعتبار و حجّت ہے۔

خبر واحد کی حجیت سنّت کی روشنی میں

چونکہ ہم خبر واحد کی حجیت کو خود خبر واحد کے ذریعہ سے ثابت نہیں کر سکتے لہٰذا یہ بات غور طلب ہے کہ حدیث و خبر کی کتنی مقدار اس مقصد کے لئے کافی ہوگی اہل اصول اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ "اتنی مقدار جو اجمالی تواتر شمار کی جائے، کافی ہے"۔[1] یعنی مختلف مضامین کی حامل الگ الگ روایتوں سے خبر واحد کی حجیت اخذ کرنی چاہئے لہٰذا ضروری ہے کہ موضوع کی بیشتر وضاحت کے لئے حسب ذیل چند قسموں کی روایتوں کا جائزہ لیا جائے۔

بعض روایات میں ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہم کو ثقہ اور قابل اعتماد افراد سے متعارف کرایا ہے مثلاً عبد العزیز بن مہدی نامی ایک شخص امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے دریافت کیا کہ "...... چونکہ ہمیشہ آپ تک پہنچا نہیں جا سکتا لہٰذا اگر کوئی شرعی مشکل درپیش ہو تو اسے کیسے حل کریں؟ کیا یونس بن عبد الرحمٰن آپ کی نظر میں مورد تائید ہیں اور کیا ایسے موقعوں پر ہم ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں؟ امام نے فرمایا: "ہاں وہ قابل اعتماد ہیں۔"

بعض روایتوں میں ائمہ معصومین کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ، اگر تمہیں کوئی مشکل یا مسئلہ درپیش ہو تو ہماری احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو۔ "اما الحوادث الواقعۃ فارجعوا الی رواۃ احادیثنا"

کچھ ایسی روایات ہیں جن میں حدیثوں کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روایات و احادیث اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں دینی آثار پائے جاتے ہیں اسی لئے ان کے محفوظ کرنے کی تشویق دلائی جا رہی ہے، مثلاً: قال رسول اللہ ص: من حفظ من امتی اربعین حدیثاً

---

[1] فرائد الاصول (رسائل) شیخ مرتضیٰ انصاری، بحث حجیت خبر واحد ص ۸۵، کفایۃ الاصول، محقق خراسانی ج ۲ ص ۹۷۔

بعثہ اللّٰہ یوم القیامۃ فقیھا عالما"[1]

بعض حدیثوں میں متعارض یا ایک دوسرے سے ٹکرانے والی روایات کے سلسلہ میں قوانین وضع کئے گئے ہیں مثلاً: امامؑ کی موجودگی میں حرام و حلال سے متعلق بحث ہوتی ہے اور امامؑ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں سے جو مشہور تر ہو اسے قبول کر لو یا پھر امامؑ کسی دوسری وجہ کو ترجیح کا سبب قرار دیتے ہیں اور ہمارے فریضہ کو مشخص فرماتے ہیں اس بنیاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر خبر واحد حجت نہیں ہے تو اس کی معارض حدیث بھی حجت نہیں ہو سکتی، جب یہ ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور دونوں کے حجت ہونے کی حیثیت و وقعت کو پرکھا جاتا ہے تو خود ہی خبرِ واحد کی حجیت ثابت ہو جاتی ہے۔

بعض ایسی روایات ہیں جو جھوٹی احادیث بیان کرنے والوں یا ان کے جعل کرنے اور گڑھنے والوں کی مذمت کرتی ہیں، اخبار و روایات کے سلسلہ کی عظمت، اس کی حفاظت، اس میں جھوٹی اور غلط حدیثوں کی ملاوٹ کی روک تھام جھوٹوں اور حدیثیں جعل کرنے والوں کی اس قدر مذمت یہ سب خبر واحد کی حجیت کو ثابت کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا پانچوں قسم کی روایات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگرچہ خبر، واحد ہی کیوں نہ ہو اور اسے نقل کرنے والوں کی تعداد کثیر نہ ہو پھر بھی وہ خبر، حجت اور دلیل ہو سکتی ہے۔

حجیتِ خبرِ واحد، اجماع کی روشنی میں

ہر چند خبر واحد کی حجیت کے طرفدار یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خبر واحد کی حجیت پر اجماع متحقق ہے، لیکن اگر غیر جانبدارانہ فیصلہ کیا جائے تو اس سلسلہ میں اجماع، کامل اتفاق کی حد تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بہت سے علماء متقدمین خبر واحد کی حجیت کے سخت خلاف تھے لیکن زمانہ اہل بیتؑ سے نزدیک یا خود ان کے عصر کے امامیہ علماء کی عملی روش یہی رہی ہے کہ وہ اخبارِ آحاد کو نقل کرتے تھے اس کی تدوین و باب بندی وغیرہ کا اہتمام کرتے تھے اور راویوں کے معتبر یا ضعیف ہونے کی تفتیش و تحقیق بھی کرتے تھے۔ یہ روش بعد کے زمانوں میں بھی جاری رہی کسی نے بھی اس سے روگردانی نہیں کی اور نہ ائمہ علیہم السلام میں سے کسی نے اس پر ردک ٹوکا۔

صاحبِ معالم نے اس نکتہ کو ذکر کرتے ہوئے علامہ حلی کی کتاب "نہایہ" سے یہ بات نقل کی ہے کہ "علماء امامیہ

---

[1] اصول کافی

میں اخباریوں کے گروہ نے اصول و فروع دین میں اہل بیتؑ سے مروی اخبار آحاد کے علاوہ کسی اور چیز کا سہارا نہیں لیا اور اصولیوں میں ابوجعفر طوسی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے خبر واحد کو تسلیم کیا ہے، سید مرتضیٰ اور ان کے پیروکاروں کے علاوہ کسی اور نے خبر واحد کی مخالفت نہیں کی ہے۔"

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس مسئلہ میں علماء و فقہا کا بالاتفاق اجماع صراحت سے موجود نہیں ہے لیکن خبر واحد کو معتبر جاننے والوں کی بہ نسبت مخالفین کی تعداد بہت کم ہے۔

خبر واحد کی حجیت عقل کی روشنی میں۔

اس موقع پر ایک اصطلاح کی وضاحت ضروری ہے جسے "سیرت عقلاء" کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ عقلا کے درمیان کوئی روش عام ہو جائے اور اس پر بالعموم عمل بھی ہونے لگے اور اسی روش پر معصومین علیہم السلام کے سامنے بھی عمل ہو لیکن ان کی جانب سے اس کی نفی نہ کی گئی ہو تو منطقی طور سے ہم یہ نتیجہ حاصل کریں گے کہ یہ عمل معصومینؑ کی مرضی کے مطابق اور ان کا پسندیدہ ہے۔

اس مسئلہ میں پہلے یہ طے ہونا چاہئے کہ کوئی ایسی روش اس زمانہ کے عقلا میں جاری تھی، دوسرے یہ کہ معصومؑ نے اس روش کو دیکھ کر اسے رد کیا یا منع نہ فرمایا ہو۔ بنا بر ایں ایک منطقی قضیہ کی شکل میں کہ یہ روش عقلا کی سیرت اور انکی نگاہ میں مقبول ہے، معصوم بھی عقلاء میں شامل بلکہ رئیس عقلا ہیں اور اس روش سے متعلق کوئی رد یا نفی اس کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی نتیجہ ظاہر ہے کہ معصوم بھی اس روش کو قبول کرتے ہیں۔

اس تمہید کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ عقلا کے درمیان عمومی طور سے یہ رسم جاری ہے کہ جب بھی کوئی شخص کوئی خبر دیتا ہے، اسے قبول کر لیتے ہیں اور خبر کے قبول کرنے کو ناقلین کی کثرت پر منحصر نہیں کرتے۔ چونکہ یہ رسم عقلا میں جاری ہے نتیجتاً امام بھی اس عقلائی روش کو قبول کرتے ہیں اور شارع مقدس کی نگاہ میں بھی یہ قابل قبول ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی عام سیرت بھی یہی رہی ہے۔ مثال کے طور پر جب زرارہ امام صادق علیہ السلام کی خدمت سے آکر کوئی خبر دیتے تھے تو لوگ اسے قبول کر لیتے تھے اور کسی دوسرے طریقہ سے اس کی صحت کی تحقیق و تفتیش کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ یا جب محمد بن مسلم زرارہ سے کوئی خبر نقل کرتے تھے تو واضح ہے کہ وہ اسے قبول بھی کرتے تھے جب ہی تو نقل کیا ورنہ ایسا کیوں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خبر کو صحیح

جان کر نقل کیا۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ شرع مقدس میں دعویٰ کے ثبوت کے لئے زیادہ تر دو شاہد عادل اور بعض موقعوں پر چار گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا ممکن ہے یہ تصور پیدا ہو کہ دو گواہوں کا طلب کرنا لوگوں کی عادت و روش میں شامل ہے، لیکن ذرا غور کرنے پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ شہادت اور خبر میں فرق ہے۔ ان دونوں کا تعلق دو الگ الگ چیزوں سے ہے۔ شہادت کی ضرورت دعووٰں اور جرائم کے ثابت کرنے کے لئے پڑتی ہے اور ایسے موقعوں پر شارع مقدس نے لوگوں کی عزت و شرف کی حفاظت اور "اصل برائت" کی رعایت کرتے ہوئے، ایسے قوانین وضع کئے کہ ضرورت کے وقت ان کی پابندی کی جائے اور اسی وجہ سے دو یا چار شاہدوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ لیکن خبر میں یہ مسائل نہیں ہیں اور اصولاً راوی خبر کو نقل کرتا ہے یا مسئلہ بیان کرتا ہے۔ یہاں اثبات و نفی کی منزل میں نہیں ہے بلکہ واقعہ کی خبر اور گذارش پیش کرتا ہے جس میں صدق یا کذب کا گمان ہے لیکن چونکہ خبر دینے والا ثقہ، سمجھا بوجھا اور عادل ہے۔ لہٰذا اس کی عدالت امانت و صحت کو دیکھتے ہوئے جب تک اس خبر کے خلاف کوئی دلیل سامنے نہ آئے، خبر کو قابل قبول سمجھنا چاہئے۔

جعلی احادیث یا اسرائیلیات۔

تاریخ شاہد ہے کہ مختلف مکاتب فکر گوناگوں اسباب کے تحت آپس میں ٹکراتے رہے ہیں، یہی ٹکراؤ کبھی کبھی سیاسی و فوجی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سیاسی اور فوجی ٹکراؤ جہاں دشمن کو مادی طور سے کمزور بناتے ہیں، وہیں غنیم سے چھینے ہوئے علاقوں میں اپنی ثقافت اور آئیڈیالوجی کی نشر و اشاعت میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔

الحادی مکاتب فکر میں ثقافت و اعتقاد فرعی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ اس کے مقابلہ میں الٰہی مکاتب فکر، خصوصاً اسلام عقیدہ کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔ چنانچہ اس مکتب میں ثقافت و اعتقاد کو اولویت حاصل ہے اور اسی بنا پر اسلام نے اپنے آغاز سے ہی نہ صرف اعتقادی اور ثقافتی اقدام کو فوقیت دی ہے بلکہ سیاسی اور فوجی اقدامات کو بھی اسلامی اعتقادات و ثقافت کی نشر و اشاعت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ صدر اسلام کی حیرت انگیز کامیابیاں بھی دلوں پر اعتماد اور اعتقاد کی پختگی کی رہین منت ہیں۔ اس کے مقابلے میں آنے والی ایران اور روم کی بڑی بڑی طاقتیں جن کو نیزوں کی انیوں اور اسلحوں پر اعتماد تھا، اس بڑھتے اور پھیلتے ہوئے

سیل عظیم کو روک نہ سکیں اور شکست خوردہ ہو کر فنا سے ہمکنار ہوئیں۔

اسلام دشمنوں نے یہ بات ابتدائی دنوں میں نوٹ کر لی تھی کہ اگر اسلام کے مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو اسلام ہی سے ملتے جلتے ہتھیاروں کے ذریعہ، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے؟ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور اہل اسلام آیت کریمہ، "کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله" کے مطابق سیاسی اور جنگی میدانوں میں تعداد اور قوت کی کمی کے باوجود ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ اس طرح سیاست اور جنگ کے میدان میں بھی دشمن کو پھیلنے کا موقع نہ مل سکا تو اس نے سیاسی اور جنگی میدانوں میں کھلی اور ظاہری دشمنی کو چھوڑ کر اسلام سے لڑنے کی دوسری راہیں نکالیں، چونکہ اسلام اور اس کے مکتب فکر کی ارتقا کی بنیاد عقیدہ تھی لہٰذا دشمن نے مختلف راستے اپنائے تاکہ اسی عقیدہ کے میدان میں اپنی سیاسی اور جنگی شکست کا بدلہ لے سکے۔

دشمن کے لئے مکتب اسلام کی بنیادوں سے عملی طور پر آشکارا و روبرو ٹکراؤ ناممکن تھا اس لئے کہ یہ آسمانی مکتب اپنی افادیت کے لحاظ سے ہر میدان میں عملاً ناقابل شکست تھا اور اپنی قوی منطق کے ذریعہ ہر طرح کے عقیدتی حملوں کو پسپا اور بے اثر کرتا رہا۔ لہٰذا اسلام دشمن طاقتوں نے بظاہر اسلامی اور شرعی لباس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے نفاق کا لبادا اوڑھا، جو حق و باطل کی جنگ کی قدیمی روش ہے۔ اس طرح پوشیدہ طور سے دشمنان اسلام نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا اور داخلی دشمن کی حیثیت سے اپنے آپ کو اسلام کے رنگ میں اس طرح ڈھال لیا، کہ اس نورانی مکتب کے سالکوں کی بہترین کوششیں ۱۴۰۰ سو برس سے فقط اسے شناخت کرنے اور دفع کرنے میں صرف ہو رہی ہیں ــــ کفر والحاد نے اسلام کی نقاب پہن کر ہمیشہ اپنے آپ کو اسلام کے بدترین دشمن کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس زندہ دین کو سخت ترین دشواریوں اور ناقابل تلافی نقصانات کا نشانہ بنایا ہے۔ دشمن کی اس پر نفاق جنگ کا ایک نمونہ بے بنیاد احادیث و روایات کو جعل کرنا اور انھیں نشر کرنا ہے جنھیں کفر و نفاق کے گرگوں نے دین میں شامل کر دیا ہے تاکہ حقیقی اور جعلی کی تشخیص مشکل ہو اور بعض میدانوں میں اسلامی عقاید کی توجیہ ناممکن ہو جائے۔ اس کام میں سب سے بڑا ہاتھ ان یہودیوں کا تھا جو بظاہر تو اسلام لائے تھے لیکن ہمیشہ بے بنیاد حدیثیں جعل کر کے اسلام کی بنیادوں کو مخدوش و متزلزل بنانے میں مصروف رہے۔ اگرچہ علماء اسلام کی جوانمردی اور تندہی سے بڑے وسیع پیمانے پر اس سازش کا پردہ فاش ہو گیا لیکن اس گھس پیٹھ کے ذریعہ ہونے والے نقصانات بھی کم نہ تھے۔ یہ معرکہ آرائی آج بھی اسی شدت کے ساتھ جاری ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک مثال ملاحظہ ہو بیروت میں مفتی اعظم لبنان کے دفتر کے اعلان کے مطابق، حکومت اسرائیل نے قرآن میں چند تبدیلیاں کر کے

اس تحریف شدہ قرآن کو عالمی پیمانہ پر منتشر کیا ہے۔ دار الافتاء کے ترجمان "الفکر الاسلامی" کی تحریر کے مطابق ۱۶۰ آیتیں قرآن سے نکال دی گئیں اور چند آیتیں دوسرے سوروں میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ حذف شدہ آیتیں یہودیوں کی گذشتہ تاریخ اور ان کی نافرمانیوں سے متعلق تھیں...... اور اب تک اس قرآن کے دس لاکھ نسخے بیروت سے پوری دنیا میں منتشر کئے جا چکے ہیں ......" کیہان، تہران ۲، اکتوبر ۱۹۸۳ء - احادیث و اخبار و روایات کو گڑھنے والوں اور منتشر کرنے والوں کے ساتھ اسلام کی یہ سرد جنگ اس قدر اہم تھی کہ قدیم الایام سے ہی مختلف علوم مثلاً علم درایۃ، علم رجال اور فقہ کے دوسرے بنیادی علوم ظہور میں آئے۔ اہل حدیث کی اصطلاح میں اس طرح کی حدیثوں کو "مجعولات" و "اسرائیلیات" کہتے ہیں۔

گذشتہ تمہید کی وضاحت کے لئے ہم ذیل میں تین جھوٹے محدثین کا تعارف پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی ان کی جعل کردہ حدیثوں کے چند نمونے پیش کرتے ہوئے آخر میں راویوں کے شرائط بیان کریں گے۔

۱۔ کعب الاحبار

ابو اسحاق کعب بن ماتع معروف بہ "کعب الاحبار"[۱] یہودیوں کے مشہور عالموں میں سے ایک ہے وہ خلیفۂ دوم کے زمانہ میں مسلمان ہوا اور اپنی تیزی اور چالاکی کے ذریعہ جلد ہی حکومت کے ذمہ داروں سے قربت حاصل کرلی۔ اس نے احادیث و واقعات و اخبار کو نقل کرنے میں اپنی گہرائی اور گیرائی کا یوں اظہار کیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں محدث مشہور ہوگیا۔ باوجودیکہ ابتدا ہی سے جعل و فریب کے آثار اس سے ظاہر ہونے لگے تھے۔ چنانچہ نقل[۲] ہے کہ خلیفۂ دوم نے اسے حدیث نقل کرنے سے منع کر دیا تھا لیکن خلافت عثمان کے عہد میں اسے ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا اور وہ خلیفہ کا مقرب بن گیا۔ خلافت سے اس کا یہ تقرب اس قدر بڑھا کہ حدیث کے نقل، اس کی تفسیر اور اسلامی مسائل کی تشریح کے سلسلہ میں

۱۔ احبار جمع حبر یعنی یہودی علماء

۲۔ قال ابن کثیر: لما اسلم فی الدولۃ العمریۃ جعل یحدث عمر رضی اللہ عنہ فربما استمع لہ عمر فترخص الناس فی استماع عندہ و نقلوا ما عندہ من غث و سمین۔

ولکن کم عمران فعل لکید و تبین لہ سوء تخلقہ فنہاہ عن الحدیث و توعدہ ان لم یترک الحدیث عن الاول لیلحقنہ بارض القردۃ۔ (اضواء السنۃ المحمدیۃ ص۱۵۳ نقل از البدایۃ والنھایۃ ج۸ ص۲۰۶)

اسے ابوذر غفاری پر بھی فوقیت حاصل ہوگئی ۔ خلافت عثمان کے بعد وہ شام گیا اور وہاں معاویہ کا مشیر کار اور مصاحب بن گیا ۔

خلفاء کی نگاہوں میں کعب الاحبار کے مقرب ہونے کے باوجود ابوذر غفاری ہمیشہ اس کی مخالفت اور اس کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے ۔ مثلاً جب عبدالرحمٰن بن عوف کا انتقال ہوا اور ترکہ میں بہت سی دولت چھوڑی عثمان ان کے وارثوں میں ترکہ تقسیم کرنے بیٹھے تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ عبدالرحمن کے پاس اتنا مال کہاں سے آیا ۔ اس کی عاقبت کی خیر نہیں ہے ، چونکہ عثمان ، عبدالرحمٰن بن عوف سے لگاؤ رکھتے تھے ، لہٰذا انہوں نے اس مسئلہ کی توجیہ کے لئے کعب الاحبار کا نظریہ دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں عبدالرحمٰن کے لئے نیکیوں اور اچھائیوں کے علاوہ کوئی اور نظریہ نہیں رکھتا کیونکہ اس نے مال کو حلال ذرائع سے حاصل کیا ، خوب خیر و خیرات کی اور اتنا بچ بھی گیا ۔ ابوذر نے جب کعب کی باتیں سنیں تو اونٹ کی ہڈی اٹھائی اور کعب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ، کچھ لوگوں نے کعب کو خبردار کردیا کہ ابوذر تمہاری طرف آرہے ہیں ۔ کعب خوفزدہ ہوکر بھاگتا ہوا عثمان کے پاس پہنچا ، ابوذر بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچے تو کعب نے ڈرتے ہوئے خود کو عثمان کے پیچھے چھپالیا ۔ ابوذر نے کعب کو مخاطب کرکے کہا : اے یہودی زادے تیرا خیال ہے کہ اتنا مال جمع کرنے کے باوجود عبدالرحمٰن سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی ؟[1]

ایک روز ابوذر بیماری کی حالت میں عصا پر تکیہ کئے ہوئے عثمان کے پاس پہنچے ، دیکھا کہ ایک لاکھ درہم عثمان کے سامنے رکھے ہیں اور کچھ لوگ اس کی تقسیم کے انتظار میں بیٹھے ہیں ۔ ابوذر نے دریافت کیا کہ یہ مال کیسا ہے اور کہاں سے آیا ؟ عثمان نے جواب دیا کہ یہ درہم ایک جگہ سے آئے ہیں ، منتظر ہوں کہ کچھ اور جمع ہوجائیں تو ان کے بارے میں فیصلہ کروں ، ابوذر نے پوچھا کہ ایک لاکھ درہم زیادہ ہیں یا چار ہزار دینار ؟ عثمان نے جواب دیا یقیناً ایک لاکھ درہم زیادہ ہیں ، اس پر ابوذر نے کہا کیا تمہیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اور تم پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ، پیغمبرؐ اس قدر غمزدہ اور ملول تھے کہ انہوں نے ہمارے سلام کا جواب تک نہ دیا ۔ دوسرے روز جب ہم ان کی خدمت میں پہنچے تو ان کو خوشحال اور متبسم پایا ۔ جب ہم نے دریافت کیا کہ حضورؐ پہ ہمارے ماں باپ فدا ہوجائیں کل آپ اس قدر غمزدہ کیوں تھے اور اس وقت اس قدر خوش ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ کل شب بیت المال کے چار ہزار دینار میرے پاس تھے جنھیں میں نے تقسیم نہیں کیا تھا ۔ خوفزدہ تھا کہ کہیں میری موت آجائے اور یہ مال میرے پاس ہی رہ جائے ... لیکن چونکہ

---

[1] اعیان الشیعہ ص ۳۵۴ (جندب) بحار الانوار ج ۶ ص ۱۰۰۸ ، الغدیر ج ۸ ص

آج میں نے اسے تقسیم کر دیا اس لئے خوش ہوں کہ سبکدوش ہو گیا۔

تو عثمان نے کعب الاحبار سے دریافت کیا کہ "جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکال دی ہو کیا اس پر کچھ اور بھی واجب ہے؟ کعب نے کہا نہیں، اگر وہ سونے اور چاندی کی اینٹوں سے گھر بھی تعمیر کرے تب بھی کوئی حرج نہیں ابوذرؓ نے اپنا عصا اس کے سر پہ دے مارا اور بولے: اے یہودی کے بچے تجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل میں اپنا نظریہ پیش کرے۔ خدا کے کلام کے آگے اپنا کلام لاتا ہے؟ خدا نے فرمایا ہے۔

"...... والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔" (سورہ توبہ/۳۴)

(اے نبیؐ) وہ لوگ جو سونے اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت دیدو۔

۲) ابوہریرہ

معروف بہ شیخ المغیرہ (مغیرہ ایک کھانے کا نام ہے جو انھیں بہت پسند تھا) یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو روزی کمانے اور دولت اکٹھا کرنے کے لئے حدیث گڑھتے تھے۔ انھوں نے ساتویں ہجری میں اسلام قبول کیا اور صرف ساڑھے تین سال پیغمبرؐ کا زمانہ دیکھا، لیکن اسی مختصر سی مدت کو انھوں نے اپنی تجارت کا سرمایہ بنالیا اور صاحبان اقتدار کے فائدے کی حدیثیں جعل کر کے خوب دولت کمائی[1]۔

ابن ابی الحدید نے اپنے استاد ابوجعفر اسکافی سے نقل کیا ہے کہ "معاویہ نے ایک گروہ کو معین کیا کہ حضرت علیؑ کے خلاف نامناسب اور غلط حدیثیں جعل کریں تاکہ ایک طرف یہ حدیثیں ان کے لئے طعن و تشنیع کا باعث بنیں، دوسری طرف لوگ حضرتؑ سے بیزار ہو جائیں۔ صحابہ میں ابوہریرہ، عمر بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ اس کام میں شریک تھے[2]۔

ابن ابی الحدید کے مطابق امام حسنؑ و معاویہ کی صلح کے بعد، ابوہریرہ، معاویہ کے ہمراہ کوفہ آئے اور انہوں نے بہت سی جعلی حدیثوں کو رسول خداؐ سے منسوب کیا جن کے مطابق حضرت علی بن ابی طالب پر سب و شتم جائز تھا، معاویہ

---

[1] رسالہ المنار جزء ۱۹ ص ۹۷

[2] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۳۵۸

نے ان گڑھی ہوئی حدیثوں کو سنا تو خوش ہو کر مدینہ کی فرمانروائی انھیں سونپ دی[1]۔

۳۔ ابن ابی العوجاء

امام صادق علیہ السلام کے زمانہ کے مشہور ترین مادہ پرست افراد میں سے تھا۔ حضرتؑ اور اس کے درمیان بڑے بڑے مباحثے ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ حضرتؑ سے مغلوب ہوتا تھا لیکن جب تک زندہ رہا کفر و الحاد پر ہی جما رہا۔ وہ اصول دین سے عجیب طرح کا بغض و عناد رکھتا تھا۔ ایام حج میں مکہ جاتا اور حاجیوں سے الٹی سیدھی بحث کرتا، ان کو ورغلاتا اور ان کے عقائد کو متزلزل کرتا تھا۔ بالآخر دین سے اس کی مخالفت اتنی بڑھ گئی کہ اس پر مرتد کی حد جاری کرنے کا حکم ہوا۔ جب اس پر حد جاری کرنے کا وقت آیا تو اس نے کہا کہ اب تو تم مجھے قتل ہی کر دو گے لہٰذا میں بتائے دیتا ہوں کہ میں نے چار ہزار حدیثیں جعل کیں، ان کو تمہاری حدیثوں میں ملا دیا ہے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیا ہے[2]۔

خبر واحد کی حجیت کے شرائط۔

اخبار و احادیث میں جعلی اور گڑھی ہوئی حدیثوں کے موجود ہونے کی بنا پر فقہائے عظام نے خبر واحد کو حجت ماننے کے لئے راوی سے متعلق چند شرطیں معین کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ بالغ و مکلف ہونا۔

راوی میں شرائط تکلیف کا پایا جانا یعنی بالغ و عاقل ہونا لازم ہے۔ کیونکہ نابالغ، پاگل اور احمق کی روایت قابل قبول نہیں ہے۔ علماء عامہ نے ایسے نابالغ بچہ کی روایت کو جو نیک و بد کا امتیاز نہ رکھتا ہو، قابل قبول مانا ہے لیکن علماء امامیہ متفق القول ہیں کہ نابالغ کی خبر ناقابل اور غیر معتبر ہے۔

۲۔ **عدالت**: آیت شریفہ "نبأ" (جو قرآنی دلائل میں گزر چکی ہے) جو خبر واحد کی حجیت کی بہترین

---

[1] اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص۱۹۸

[2] اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص۱۲۱

دلیل ہے اس میں صاف لفظوں میں فاسق کی خبر کو بے اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ فقہا نے عدالت کی مختلف تعریفیں کی ہیں صاحب معالم کہتے ہیں کہ "عدالت" انسان کے نفس میں ایک ملکہ ہے جو اسے گناہان کبیرہ کا مرتکب ہونے، بار بار گناہان صغیرہ کرنے اور خلاف مروت اعمال سے روکتا اور محفوظ رکھتا ہے۔"

خلاف مروت اعمال سے مراد ناشائستہ اعمال ہیں اگرچہ انکا شمار گناہ میں نہیں ہوتا جس پر انسان سزا پائے لیکن متین، باوقار اور خلیق افراد سے ایسے اعمال کا سرزد ہونا برا اور ناپسند ہے۔ اگرچہ بعد کے فتوں میں عدالت کی تعریف میں خلاف مروت اعمال کا بجا نہ لانا، شرط نہیں ہے۔[1]

مشہور فقہا کا عقیدہ یہ ہے کہ راویان حدیث کو تقویٰ اور عدالت کے ایسے ہی درجوں پر فائز ہونا چاہیئے ورنہ فقہی اعتبار سے انکی روایتوں کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ لیکن صاحب معالم الاصول، شیخ طوسی سے نقل کرتے ہیں کہ خبر یا حدیث کے معتبر ہونے کے لئے یہ اطمینان کافی ہے کہ راوی جھوٹ نہ بولتا ہو، اگرچہ دوسرے گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہوتا ہو۔ اس کی توجیہ کے لئے یوں کہنا چاہیئے کہ راوی کے لئے عدالت کی شرط اس مقصد سے لگائی گئی ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولتا ہو اور جب یہ بات طے ہو جائے کہ راوی جھوٹ نہیں بولتا تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ کامل و مطلق عدالت کی شرط لازم نہیں ہے۔

پھر صاحب معالم شیخ طوسی کے اس کلام کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عادل و فاسق (عدل و فسق) کے درمیان کوئی تیسرا گوشہ نہیں ہے یعنی انسان یا عادل ہوگا، یا فاسق، تیسری صورت نہیں ہوسکتی اور آیت شریفہ "فتبینوا" کی نص موجود ہے کہ راوی سے روایت قبول کرنے سے پہلے اس کی عدالت دریافت کی جائے اور اگر عدالت معلوم نہ ہوسکے تو ہمارا فریضہ ہے کہ اس کی تحقیق کریں۔[2]

جب راوی کے لئے عدالت شرط ہے اور فاسق کی خبر قابل اعتبار نہیں ہے، تو کافر اور باطل مذاہب کے ماننے والوں سے ملنے والی خبر یا حدیث کی کیفیت واضح ہے، انکا کوئی اعتبار نہیں۔

۳۔ قوت حافظہ۔

اس سے مراد یہ ہے کہ راوی میں حفظ کرنے کی قوت و صلاحیت ہونی چاہیئے، وہ حدیث کے الفاظ اور

[1] تحریر الوسیلہ، حضرت امام خمینی ج ۲ ص ۴۴۲ کتاب شہادات

[2] معالم الاصول چاپ تہران ص ۲۳۴

جملوں کو بلا کسی تصرف و اضافہ کے بے کم و کاست بیان کرے، کیونکہ کبھی ایک لفظ کی تبدیلی بھی حدیث کے پورے مفہوم کو بدل دیتی ہے اور معصوم جو کہنا چاہتا ہے بات ایک دم اس کی الٹی ہو جاتی ہے۔

کتاب خدا اور احادیث کا باہمی ربط

پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے ذریعے ملنے والی حدیثوں پر غور کرنے اور قرآن سے ان کے باہمی رابطہ کی بنیاد پر ہم حدیثوں کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

الف) وہ حدیثیں جو پورے طور سے قرآن کے مضمون کی تائید و تاکید کرتی ہیں مثلاً وہ روایتیں جن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، امر بہ معروف و نہی از منکر کا حکم دیا گیا ہے۔ یا وہ حدیثیں جو حرام چیزوں سے روکتی ہیں مثلاً شراب پینا، سود کھانا، قتل یا دوسرے حرام کام۔

ب) وہ روایتیں و حدیثیں جو قرآنی آیات کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں، مثلاً نماز، روزہ و حج کی تشریح کرنے والی حدیثیں یا ان کے اجزاء، شرائط اور مبطلات کی وضاحت کرنے والی حدیثیں۔

ج) وہ حدیثیں اور روایتیں جن میں ایسے احکام بیان کئے گئے ہیں جن کے بارے میں بظاہر قرآن خاموش ہے اور ان احکام سے متعرض نہیں ہوا ہے۔ برنبائے مثال چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ وارث اگر اپنے مورث کو قتل کر دے تو میراث سے محروم ہو جائے گا۔ یہ حکم قرآن میں نہیں ہے فقہا نے یہ فتوا حدیث کے مطابق دیا ہے۔

۲۔ پھوپھی اور اس کے بھائی کی لڑکی یا خالہ اور اس کی بہن کی لڑکی دونوں کے ہمراہ نکاح کرنا حرام اور باطل ہے۔ اس فتوے کی سند بھی روایات اور احادیث سے حاصل کی گئی ہے۔

۳۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا حرام ہے۔ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے بلکہ حدیث نے یہ حکم بیان کیا ہے۔

۴۔ شُفعہ (زمین یا مکان میں شرکت و ہمسائگی کی وجہ سے خرید کا حق) یہ حکم قرآن میں بیان نہیں ہوا ہے اس کا حکم صرف حدیث کے ذریعہ ملتا ہے۔

مندرجہ بالا احکام کے علاوہ بھی بہت سے واجبات و محرمات ہیں جو صرف حدیثوں کے ذریعہ بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن اس سلسلہ میں خاموش ہے۔ بعض علماء نے ایسے احکام کو جمع کیا ہے[۱]۔

[۱] اس سلسلہ میں کتاب "السنۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ" مصنفہ آقای سید محمد تقی حکیم ملاحظہ ہو۔

حدیث کے ذریعہ قرآن کی تقیید و تخصیص۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے موقعوں پر حدیث، کلام خدا کی تشریح و تفسیر کرتی ہے۔ لہٰذا کبھی
ن شرح و تفسیر بذریعہ حدیث، قرآن کے عموم کو تخصیص (مخصوص) بھی کر دیتی ہے یا قرآن کے کسی مطلق حکم کو مقید
(محدود) بھی کرتی ہے۔ کیونکہ یہ بھی کتاب کی تفسیر و وضاحت کی ایک قسم ہے اور مقید و مخصص، مقصود و حکم
کے لئے قرینہ کاشفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

"سنت قطعیہ" مثلاً خبر متواتر کے ذریعہ قرآن کی تقیید و تخصیص تو مسلم ہے اور اس پر علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بہت سے ایسے مواقع
ہیں جہاں سنت قطعیہ قرآن کے عام و مطلق حکم کی مخصص بنی ہے۔ البتہ خبر واحد کے سلسلہ میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا وہ حکم قرآن کی مخصص یا مقید بن سکتی ہے یا نہیں۔
شاید ابتدائی مراحل میں لوگ یہ بات قبول نہ کریں کہ خبر واحد کتاب خدا کے حکم کو مخصوص یا مقید کر سکتی ہے لیکن تقریباً بھی
علماء کا اتفاق ہے کہ خبر واحد اپنے جملہ شرائط حجیت کے، ساتھ حکم قرآن کی تقیید و تخصیص کر سکتی ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی
نہیں ہے۔ زمانہ قدیم سے علماء کی عملی روش بھی یہی رہی ہے اور شاید کم ہی ایسی حدیثیں ہوں جن کا تعلق قرآن کے عمومی
احکام سے نہ ہو مثلاً حرام چیزوں سے تعلق رکھنے والی تمام حدیثیں قرآن کے حلیت کے حکم عام سے تخصیص و تقیید
کا رابطہ رکھتی ہیں اور کسی فقیہ نے بھی ایسی اخبار و احادیث کو رد نہیں کیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ قرآن مجید سند کے اعتبار سے قطعی ہے اور دلالت کے اعتبار سے ظنی۔
کیونکہ قرآن میں محکم اور متشابہ آیتیں پائی جاتی ہیں اور قرآن کی محکم آیتیں "نص" اور "ظاہر" دو حصوں میں تقسیم ہوتی
ہیں۔ چنانچہ قرآن کا بڑا حصہ ظواہر کی شکل میں ہے جس میں عام اور مطلق آیتیں بھی شامل ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ پیغمبر
اکرمؐ و ائمہ اطہارؑ کے اقوال میں ایسے جملے ہیں جو قرآن سے تخصیص یا تقیید کا رابطہ رکھتے ہیں اور قرآن کے ظاہری
مفہوم کو کسی خصوصی مفہوم کی طرف موڑتے ہیں۔ لہٰذا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں سنت قطعیہ یعنی خبر متواتر کے سلسلہ
میں تو کوئی شک نہیں۔ ہاں شبہ خبر واحد میں اس کے ظنی ہونے کی وجہ سے ہے لیکن یہ شبہ بھی اس کی حجیت کے دلائل
کی بنا پر ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ اخبار احاد کا ہم تک پہنچنا ظنی ہے لیکن ان کی حجیت پر قطعی دلائل کا قائم ہونا اور
شرعی حجت کی حیثیت سے ان کا مان لیا جانا، ان کو قطعی مصادر کے مانند معتبر قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ظواہر قرآن بھی
دلالت کی حیثیت سے قطعی نہیں بلکہ ظنی ہیں اور دلائل حجیت کی بنا پر معتبر ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دونوں ظنی اور دونوں
معتبر ہیں۔ (خبر واحد اور ظاہر کتاب) اب ان دونوں ہی سے کسی ایک ہی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

جبکہ دونوں حجیت کے دلائل کے سبب معتبر ہیں۔ اصول لفظیہ یعنی اصل عموم و اصل اطلاق ظواہر قرآن کے لئے دلیل ہیں اور خبر واحد کی حجیت کی دلیلیں خبر واحد کو معتبر قرار دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کسے چنا جائے۔ اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم ظواہر قرآن کو منتخب نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اخبار تو ظواہر قرآن کی وضاحت کر سکتی ہیں لیکن ظواہر قرآن، حدیث کو ٹھکرا دینے کا باعث نہیں بن سکتے کیونکہ اخبار کو ٹھکرا دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ خبر واحد کے ذریعہ قرآن کی عام اور مطلق آیتوں کی تقیید و تخصیص کے مخالفین صرف ایک ہی چیز کا سہارا لے سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ معصومینؑ سے مروی روایتیں اور اخبار ہمیں بتاتی ہیں کہ ہماری حدیثوں کو کتاب خدا پر پرکھو، جو کتاب خدا سے ٹکراتی ہیں وہ مردود ہیں اور جو کتاب خدا سے موافقت رکھتی ہیں، وہ مقبول ہیں۔ واضح ہے کہ اس مخالفت سے مراد ٹکراؤ اور تضاد ہے نہ کہ تفسیر و توجیہ اور حدیث کے ذریعہ کسی آیت کی تخصیص و تقیید، اس آیت کے لئے قرینہ کاشفہ ہے یعنی اس کی وضاحت کرتی ہے، نہ کہ ٹکراؤ یا مخالفت کو ظاہر کرتی ہے اور عرف علماء میں بھی تخصیص و تقیید کا قانون ٹکراؤ یا تضاد شمار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان روایات میں ٹکراؤ سے مراد نص قرآن کی مخالفت ہے نہ کہ ظواہر کتاب کی، مثلاً قرآن کی ایک نص کسی چیز کو حرام کہتی ہے اور حدیث اسی چیز کو حلال کہتی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ حدیث مردود ہے۔ لیکن اگر کوئی خبر واحد، کتاب کے احکام کو عموم سے خارج کرنے کا حکم رکھتی ہو اور اس سلسلہ میں خصوصی حکم رکھتی ہو، تو ہم خبر واحد پر عمل کریں گے اور عموم کتاب کو ترک کر دیں گے۔

مثال کے طور پر، قرآن مجید سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۱ میں فرماتا ہے "یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین" یعنی خدا تمہاری اولاد کے حق میں تم سے وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ عورت کا دوگنا ہے۔" اس آیت سے ظاہر ہے کہ ہر بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوگا لیکن اس حکم سے متعلق حدیث یہ کہتی ہے کہ، اگر وارث اپنے مورث کو قتل کر دے، تو وہ میراث نہیں پا سکتا، چنانچہ یہ حدیث قہری طور سے اس آیت کے عمومی حکم کو مخصوص کر دے گی اور اس کی مخصص کہلائے گی۔

جناب ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی

ترجمہ: جناب خادم حسین

دستور اساسی کی مختصر تاریخ

دوسرے ممالک میں دستور اساسی کی تدوین

جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں، تمام ملکوں میں دستور اساسی کی حیثیت ایک جیسی نہیں ہے۔ اسلامی جمہوریہ کے دستور اساسی کی حیثیت و اہمیت معلوم کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کے دستور اساسی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے پہلا مسئلہ دستور اساسی کے مدوّن و غیر مدوّن ہونے کا ہے۔ مدوّن اس معنی میں کہ دستور اساسی کی ترتیب و تنظیم عمل میں آچکی ہو اور ہر مسئلہ کے بارے میں اس کی طرف رجوع کیا جا سکے، گویا قوانین کا ایک ایسا مجموعہ ہو جس نے تمام دفعات کو اپنے میں سمو لیا ہو۔

اسلامی جمہوریہ ایران کا دستور اساسی مدوّن ہے۔ جو چیزیں ضروری تھیں انھیں ایک بنیادی قوانین کی شکل دے کر ملک کے عام قوانین کی اساس قرار دے دیا گیا ہے۔ تقریباً ہر ملک میں مدوّن دستور اساسی موجود ہے۔ تقریباً اس لئے کہا ہے کہ استثناء بھی موجود ہے۔ انگلینڈ، حکومتی امور میں اتنا وسیع تجربہ رکھتے ہوئے بھی تدوین شدہ دستور اساسی سے محروم ہے، گویا انگلستان کے عوام نے ایک مدوّن دستور اساسی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ نو صدیوں کا تنظیمی تجربہ رکھتے ہوئے بھی اس قدیمی سامراجی ملک نے ایسے بنیادی قوانین مرتب نہ کئے جو ملک کے عام قوانین کی اساس قرار پا سکیں۔ اس ملک میں مختلف سرکاری اداروں کے تعلقات عرف عام اور تجربہ کی بنیادوں پر استوار ہیں۔

---

[1] عظیم برطانیہ، انگلینڈ، اسکاٹلینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ یا السٹر پر مشتمل ہے۔ جس کا کوئی مدوّن دستور اساسی نہیں۔ اس سیاسی یونٹ کے جملہ امور مختلف فرامین، آداب و رسوم اور بعض عمومی قوانین کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ منجملہ ←

اسلامی جمہوریہ کے دستور اساسی کی تدوین کا جائزہ لینے کے لئے دوسرے ملکوں کے دستور اساسی کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تقابلی مطالعہ کی کوشش بھی کریں گے۔ البتہ نہ یہ ممکن ہے نہ ضروری کہ ہم سبھی ملکوں کے دستور اساسی کا جائزہ لیں۔ لہٰذا صرف نمونہ کے طور پر چند ملکوں کے دستور اساسی کی کیفیت کا جائزہ لیں گے۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ دستور اساسی ملک کے عمومی قوانین پر حاکم ہوتا ہے اور چونکہ اسے ملک کے داخلی معاشرتی اور سیاسی تعلقات کے سلسلے میں ایک طویل مدت تک جاری و ساری رہنا ہے لہٰذا اسے خاص ڈھنگ سے منظور ہونا چاہیئے اور منظور کرنے والوں کو بھی خاص صلاحیت و لیاقت کا مالک ہونا ضروری ہے تاکہ منظور شدہ دستور با وزن و مستحکم ہو اور تمام امور کا احاطہ کر سکے۔

اکثر و بیشتر ممالک نے دستور اساسی منظور کرانے کے لئے عمدہ سے عمدہ طریقے اپنائے۔ اس کے باوجود ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جن میں دستور اساسی کو وہ قوت و حیثیت میسر نہ ہو سکی کہ لوگ بے چون و چرا اسے قبول کر لیتے۔ فی الحال یہاں بعض ملکوں کے دستور اساسی کی تدوین و تصویب کا طریقۂ کار ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ اٹلی :

دوسری جنگ عظیم اور موسولینی کی فاشسٹ حکومت کے خاتمہ کے بعد حکومت کی جانب سے دو سو بائیس ارکان پر مشتمل ایک مجلس تشکیل دی گئی جو مشاورتی طور پر قانون سازی میں حکومت کی مدد کرتی تھی۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں اٹلی حکومت کی نوعیت، ریفرنڈم کے ذریعہ معین ہوئی اور بادشاہی نظام کی جگہ جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ حکومت کی نوعیت کی تبدیلی کے بعد مجلس مؤسسین کا قیام عمل میں آیا، جو ڈیڑھ سال کے عرصہ یعنی دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء تک دستور اساسی مرتب کرنے میں مصروف رہی۔ اس دوران عام قوانین بنانے کی ذمہ داری حکومت کے ذمے تھی۔ اس عرصہ میں صرف دو مرتبہ مجلس مؤسسین (دستور ساز اسمبلی) نے عام قوانین وضع کئے: ایک تو انتخابات سے متعلق قوانین اور دوسرے غیر ملکی قرارداد و معاہدوں سے

سنہ ۱۱۰۰ عیسوی کا فرمان جس کی بنا پر ہنری اوّل (HENRY - 1) یہ عہد کرتا ہے کہ اوّلاً تو وہ کیتھولیک فرقے سے وابستہ پادریوں اور اسقفوں کے لئے بعض امتیازات کا قائل رہے گا ثانیاً وہ حکومت سے وابستہ افراد کو خلاف قانون عمل سے روکے گا۔

←

متعلق قوانین جو خاص اہمیت کے حامل تھے۔ مجلس مؤسسین کا تیار کردہ دستور اساسی اس کے دو تہائی اراکین کی آراء کے ذریعہ منظور ہوا اور پہلی جنوری ۱۹۴۸ء سے اس پر عمل درآمد شروع ہوا۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی نے مذکورہ بالا مراحل کے علاوہ ریفرنڈم کے ذریعہ عوامی منظوری بھی حاصل کی ہے۔

۲- یونان

"کارامانلیس" جنہیں عوام پسند کرتے تھے، ۱۹۷۴ء میں فوجی حکومت کے خاتمہ کے بعد فرانس سے آئے اور اس وقت کے صدر کے سامنے (جو خود ایک فوجی تھا) حلف اٹھایا اور یہ طے پایا کہ شاہی مسائل سے مربوط قوانین کو چھوڑ کر وقتی طور پر نئے دستور اساسی کے آنے تک گذشتہ حکومت کے ۱۹۵۲ء کے دستور اساسی پر ہی عمل درآمد کیا جائے۔ اس کے بعد کارامانلیس کی عارضی حکومت نے دستور ساز کونسل قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ دستور ساز کونسل کے افتتاح سے پہلے حکومت نے عوام سے ریفرنڈم میں شریک ہو کر حکومت کی نوعیت معین کرنے کی درخواست کی۔ اس کے بعد تین سو نمائندے مختلف پارٹیوں سے انتخاب ہوئے۔ اس طرح دستور ساز کونسل قائم ہو گئی۔ اس کونسل نے دستور اساسی مرتب کرنے کا کام شروع کیا اور اس مرحلہ سے فارغ ہونے کے بعد ہی مجلس عام قانون ساز اسمبلی کی صورت اختیار کر گئی۔ یونان کی دستور ساز کونسل نے دستور اساسی مرتب کرنے میں سات مہینے لگائے تھے۔

۳- ہندوستان :

مہاتما گاندھی ۱۹۳۲ء سے دستور اساسی مرتب کروانے کی غرض سے دستور ساز کونسل قائم کرنے کی فکر میں تھے اور اسے ہندوستانی عوام کی امنگوں کا آئینہ دار کہتے تھے، لیکن ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا جب

فرمانِ عظیم (GREAT CHARTER OF LIBERTIES)
مورخہ ۱۵ جون ۱۲۱۵ عیسوی، جان اول (JOHN I) نے مذکورہ فرمان کے تحت بعض حقوق و اختیارات

ان کی یہ فکر باقاعدہ نیشنل کانگریس کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ جواہر لال نہرو نے جنوری ۱۹۳۸ء میں اس بات پر زور دیا کہ نیشنل کانگریس آزادی کے حصول اور ایک ڈیموکریٹک حکومت کے قیام کے حق میں ہے اور اسی جلسہ میں ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ دستور اساسی کو ایک کونسل کے ذریعہ مرتب ہونا چاہئے۔ اصولی طور پر دستور ساز کونسل کو تمام ہندوستانی عوام کی نمائندگی کرنا چاہئے تھی۔ دوسری جنگ عظیم تک برطانوی حکومت دستور ساز کونسل کی تشکیل میں رکاوٹ ڈالتی رہی، لیکن جنگ کے نتائج نے برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کے نظریہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا، نتیجتہً ۱۹۴۶ء میں دستور ساز کونسل قائم ہوئی، لیکن مکمل آزادی سے بہرہ مند نہ ہو سکی بلکہ اس کے سامنے کچھ رکاوٹیں بھی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس دستور ساز کونسل میں شامل ہو گئی، لیکن مسلم لیگ نے اس سے احتراز کیا۔ مسلم لیگ سے وابستہ لوگوں کا کہنا تھا کہ پاکستان کی دستور ساز کونسل کو علیحدہ ہونا چاہئے۔ ۱۹۴۷ء کے قانون آزادی (جس نے ہندوستان و پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا) نے کونسل کی مستقل خصوصیت کو مورد تائید قرار دیا۔ آخر کار ہندوستان کا دستور اساسی نومبر ۱۹۴۹ء میں دستور ساز کونسل کے ذریعہ منظور ہوا اور جنوری ۱۹۵۰ء سے اس کا اجرا عمل میں آیا۔

۴۔ امریکہ :

دستور اساسی کا مسودہ تیار کرنے کے لئے بارہ صوبوں سے پچپن افراد پر مشتمل ایک کمیٹی نے فیلاڈلفیا میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس زمانے میں جارج واشنگٹن امریکی عوام کے درمیان ایک خاص محبوبیت کے حامل تھے، اس لئے کہ انھوں نے انقلاب کی قیادت و سربراہی کرتے ہوئے اس سرزمین پر آزادی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وقت امریکہ کا شمار سامراجی طاقتوں میں نہیں ہوتا تھا اور وہ ابھی تازہ تازہ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔ سب سے پہلا جلسہ جو مذاکرات و ضروری تدابیر اختیار کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا اس

علاقائی امراء و عوام کے لئے تسلیم کرے۔ مذکورہ فرمان کا اکثر و بیشتر مواد برطانوی حکومت کی اساس ہے۔ اس فرمان کا سب سے اہم حصہ دفعہ نمبر ۳۹ ہے جس نے شخصی آزادی کا اعلان کیا ہے اور بادشاہ کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ کسی بھی آزاد فرد کو گرفتار، قید یا جلاوطن نہیں کر سکتا مگر یہ کہ باصلاحیت عدالت اس کا حکم دے۔ انگلینڈ کی پارلیمنٹ کے اکثر و بیشتر فیصلے اور بادشاہ ہو

جارج واشنگٹن صدر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ اس جلسہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ دستور کی منظوری کے لیے ہر نمائندہ کے ایک ووٹ کے بجائے ہر صوبے کا ایک ووٹ مانا جائے گا۔ شرکت کرنے والے صوبوں کی آبادی اور وسعت و مساحت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

جلسوں کو قانونی حیثیت دینے کے لئے بارہ صوبوں میں سے سات صوبوں کے نمائندوں کی حاضری کو ضروری قرار دیا گیا۔ یعنی مطلق اکثریت اور ووٹنگ کے لئے حاضرین کی اکثریت کو کافی تسلیم کیا گیا۔ اس اعتبار سے سات صوبوں کے نمائندوں کی موجودگی جلسہ کو قانونی حیثیت دیتی تھی اور دستور اساسی کی دفعات منظور کرنے کے لئے صرف چار نمائندوں کی منظوری پر اکتفا کی جاتی تھی۔ نمائندوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جلسہ کی کاروائی خفیہ طور پر انجام پائے اور کام ختم ہوتے تک کوئی چیز شائع نہ ہونے پائے۔

شروع میں فیلادلفیا کے اجلاس کے دوران دو تجویزیں پیش ہوئیں۔ ایک کو ویرجینیا کے وفد نے اور دوسرے کو نیوجرسی کے نمائندوں نے پیش کیا۔ یہ دونوں تجویزیں ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف تھیں۔ پہلی تجویز مرکزیت کے اصول پر استوار تھی اور دوسری تجویز صوبوں کے درمیان ایک طرح کے اتحاد کے پیش نظر تھی۔ اس جلسہ میں اور دوسری تجویزیں بھی پیش کی گئیں لیکن نہ مذکورہ دو تجویزیں اور نہ ہی بعد والی تجویزوں میں سے کوئی ایک تجویز مستقل طور پر منظور کی گئی، حالانکہ وسیع پیمانے پر مذاکرات عمل میں آئے۔

دستور اساسی کا مسوّدہ آخر کار مختلف آراء و تجاویز کو پیش نظر رکھتے ہوئے منظور ہوا اور اس وقت کی کانگریس کے سامنے پیش کیا گیا، کانگریس نے اس میں کوئی تبدیلی کئے بغیر اسے صوبائی اسمبلیوں کے پاس روانہ کر دیا۔ اس زمانے کے بارہ صوبوں نے ایک قانون منظور کیا تاکہ اس کے مطابق لوگ مرتب شدہ دستور کی موافقت یا مخالفت کے لئے اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں

احکام اسی فرمان کی بنیاد پر استوار ہیں۔

ایڈورڈ اول (1 — EDWARD) کے فرامین، پہلے کے بادشاہوں کی جانب سے عوام کو دئے جانے والے حقوق و اختیارات کی نہ صرف تائید کرتے ہیں بلکہ عوام کو بعض نئے حقوق و امتیازات بھی عطا کرتے ہیں۔

انتخابات عمل میں آئے، لیکن تحقیق کے دوران منتخب نمائندے اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ دستور اساسی کے مسودے میں فردی حقوق و آزادی کے بارے میں کوئی بھی دفعہ موجود نہیں ہے اور مخالفین اس بات پر شدت سے ساتھ تنقید کر رہے ہیں۔ نتیجۃً عوامی نمائندوں اور دستور اساسی کے حامیوں نے عوام سے یہ وعدہ کیا کہ آخری تحقیق و نظر ثانی کے دوران اس نقص کو دور کر دیں گے۔ اس طرح امریکہ کا دستور اساسی دوسو سال پہلے ۱۷۸۹ء میں منظور ہو کر نافذ کیا گیا اور اس میں فردی آزادی سے متعلق دس دفعات کا اضافہ بھی کیا گیا۔

۵۔ روس:

جیسا کہ آپ جانتے ہیں روسی انقلاب نے ۱۹۱۷ء میں تزار خاندان کی شاہی حکومت کا خاتمہ کیا۔ یہ کام اس وقت انجام پایا جب کہ پہلی جنگ عظیم جاری تھی نئی حکومت کو اعلان کردہ پروگرام اور منصوبے کے تحت دستور اساسی منظم کرنا تھا۔ پہلا دستور اساسی ۱۹۱۸ء میں مرتب ہوا اور "فیڈرل سوویت سوشلسٹ ریاستوں" (RUSSIAN SOVIET FEDERATIVE SOCIALIST REPUBLIC) کے دستور اساسی کے نام سے پانچویں مشاورتی کانگریس کے ذریعہ منظور ہوا۔ اس دستور اساسی نے درحقیقت ان ہی چیزوں کو جمع کر کے سرکاری دفعات کا نام دیا اور ان کے مابین تعلق کو معین کیا جو واقع وظاہر ہوئی تھیں۔ البتہ یہاں پر ہمیں صرف دستور اساسی کی تشکیل کی نوعیت و طریقہ تدوین و ترتیب سے سروکار ہے، جہاں تک اس کے مندرجات کی بات ہے، ہم موقعہ و محل کے لحاظ سے اس کا موازنہ بعد میں پیش کریں گے۔

۱۹۲۲ء میں روسی حکومت نے نئے دستور اساسی کے نفاذ کی ضرورت محسوس کی۔ اسی وجہ سے سنٹرل اجرائی کمیٹی (جس کے اراکین روس کی مشاورتی کانگریس کے ذریعہ منتخب ہوئے تھے)

انگلینڈ پارلیمنٹ کی چارلز اوّل استوارٹ (CHARLES I STUART) کو مورخہ ۱۶۲۵ء کی اس تجویز کو دکہ بادشاہ اس بات کا حکم صادر کرے، کہ غیر قانونی ٹیکس نہ لیا جائے، ہنگامی عدالتیں ختم کی جائیں اور فوجداری عدالتیں معمولی عدالتوں میں ضم کر دی جائیں) تین سال تک مخالفت کے بعد آخر کار بادشاہ نے منظور کر لیا۔

نیا دستور اساسی مرتب کرنے کے لئے مامور ہوئی۔ اس کمیٹی نے یہ ذمہ داری ایک کمیشن کو سونپی اور آخر کار دستور اساسی مرتب ہو کر ۱۹۲۴ء میں دوسری کانگریس کے ذریعہ منظور ہوا۔ اس دستور اساسی میں حکومت کے ڈھانچے میں نمایاں تبدیلیوں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ ۱۹۲۶ء کے شروع میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی تمام اراکین کی موجودگی میں قائم ہوئی اور اس نے ۱۹۲۴ء کے دستور اساسی کو ناقص قرار دے دیا۔ کمیٹی نے "مولوتوف" کو مامور کیا کہ وہ ساتویں کانگریس کے دوران دستور اساسی کیلئے اصلاحی تجاویز پیش کرے ۔ ۱۹۳۶ء میں مولوتوف کی تجویز کانگریس کے ذریعہ منظور ہوئی اور مرکزی اجرائی کمیٹی نے اسٹالین کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کر کے اسے نیا دستور اساسی مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں کانگریس کا ہنگامی جلسہ منعقد ہوا اور متفقہ طور پر اس نئے دستور اساسی کو منظور کر لیا۔

اسٹالین اس بات کا معتقد تھا کہ نیا دستور اساسی بین الاقوامی تعلقات کے لئے موثر ثابت ہوگا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ روس کو ہٹلر اور اس کے خطرات سے نمٹنے کے لئے دوسرے مغربی ملکوں سے اتحاد و رابطہ قائم کرنے کا موقع مل سکے گا جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس طرح کا اتحاد عمل میں بھی آیا اور اس کی کامیابی کا باعث بنا۔

روس کے آخری دستور اساسی کا متن ۱۹۷۷ء (یعنی اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی کی منظوری سے دو سال پہلے) سے متعلق ہے، جو روس کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کے نویں اجلاس کے ساتویں ہنگامی جلسے میں منظور ہوا۔ آثار و قرائن اس بات کی نشاندھی کرتے ہیں کہ روس کے چاروں کے چاروں دستور اساسی کی تدوین کانگریس اور اعلیٰ حکومتی اداروں کے ذریعہ انجام پائی اس میں عوام کو براہ راست کوئی دخل نہ تھا۔

۶- مغربی جرمنی:

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی شکست کے بعد جرمنی کی قلمرو اس اعداد و شمار و وسعت

پارلیمنٹ کا فردی آزادی سے متعلق ۱۶۷۹ء کا قانون جو حکومت سے وابستہ افراد کو لوگوں کو غیر قانونی طور سے قید یا نظر بند کرنے پر ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور نظر بند یا قیدی افراد کو یہ حق دیتا تھا کہ ان افراد کے خلاف عدالتوں میں مقدمہ دائر کر کے ان سے اپنا حق یا معاوضہ وصول کریں۔

کے مطابق نہ رہی جسے پہلی جنگ عظیم کے بعد ورشو معاہدہ کے تحت معین کیا گیا تھا۔ "الزاس" اور "لرین" فرانس سے ملحق ہوئے۔ "آسٹریا" کو دوبارہ آزادی حاصل ہوگئی۔ "چکسلواکیہ" جس کا ایک حصہ جرمنی کا جزء بن گیا تھا واپس ہوا یہاں تک کہ خود جرمنی کے کچھ حصے "روس" اور "پولینڈ" سے ملحق ہوگئے۔ اس کے علاوہ مشرقی جرمنی اپنی اصلی سرزمین سے علیحدہ ہوکر ایک مستقل ملک کی صورت اختیار کر گیا۔ ۱۹۴۶ء میں شکست خوردہ جرمنی سے متعلق اتحادیوں کی سیاست اس حد تک ناروا تھی کہ اس ملک کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے انہوں نے جرمنی کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کو ۱۹۳۸ء کی پیداوار کا نصف معین و مقرر کر دیا۔ امریکہ جس کی قوت میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا جرمنی کی مکمل تباہی کو اپنے لئے مضر سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ضمنی طور پر اسے مغربی قوت سے وابستہ تسلیم کرتا تھا اور اسی نے جرمنی کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ دوبارہ اپنی صنعتی زندگی کو نئے سرے سے مرتب و منظم کرے، مارشل پلان کے بعد تعمیر یورپ منصوبہ (EUROPEAN RECOVERY) کا مقصد جرمنی کو از سر نو زندہ کرنا تھا۔ امریکہ، انگلینڈ اور فرانس کے تینوں مقبوضہ علاقے ایک ہوگئے اس طرح مغربی جرمنی حکومت قائم کرنے کے مقدمات فراہم ہوئے ۔ ۱۹۴۸ء میں روسی اتحادیوں کی ناظر کمیٹی سے خارج ہوگیا اور جرمنی کے لئے دستور اساسی مرتب کرنے کی زمین ہموار ہوگئی۔ دستور اساسی تدوین کرنے کے لئے "بون" میں دستور ساز کونسل قائم ہوئی۔ اس کونسل میں مشرقی اور مرکزی جرمنی (جو روس کے زیر نگیں تھا) کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجلس شوریٰ کا نام اختیار کیا اور جو چیز منظور کی اسے دستور اساسی کے بجائے بنیادی قانون کا نام دیا۔ یہ بات طے پائی کہ جب تک جرمنی کے تمام عوام کے ذریعہ منتخب کونسل قائم نہیں ہوتی اس وقت تک عارضی طور پر اسی بنیادی قانون سے کام لیا جائے۔ عملی طور پر اس عارضی بنیادی قانون کو دستور اساسی کی حیثیت حاصل تھی اور گیارہ ریاستوں میں سے اکثر اسمبلیوں نے اسے تسلیم کیا تھا۔ فیڈرل جرمنی حکومت قائم ہونے کے فوراً بعد روسی مقبوضہ علاقے

۱۶۸۹ء کے بیان نے ہر قانون کے لئے مجلس عوام اور لارڈوں کی منظوری کو لازمی قرار دیا ہے۔ ۱۷۰۱ء اور ۱۷۰۵ء کے قوانین جو ولیعہد کے حقوق و اختیارات معین کرتے ہیں۔ ۱۷۰۷ء کا انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ کا معاہدہ جس نے دونوں علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑا ہے۔

میں جرمن ڈیموکریٹک حکومت قائم ہوئی لیکن فیڈرل جرمنی اور مغربی اتحادیوں نے اسے سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا۔

فیڈرل جرمنی حکومت کا اقتدار ۱۹۵۵ء (یعنی پیرس معاہدہ منعقد ہونے) تک سخت پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مغربی اتحادی، جرمنی کے لئے بہت سی پابندیوں کے قائل تھے۔ ۱۹۵۵ء میں اسے اپنی قومی فوج رکھنے کی اجازت تو مل گئی، لیکن جرمنی ابھی تک بھاری فوجی ساز و سامان ایٹمی اور کیمیاوی ہتھیاروں سے محروم ہے۔

اس طرح فیڈرل جرمنی کا عارضی دستور اساسی مغربی متحدین کی اجازت و نگرانی اور ایک مجلس شوریٰ نیز صوبائی اسمبلیوں کے ذریعہ قابل نفاذ قرار پایا۔

۷۔ فرانس :

فرانس کا موجودہ دستور اساسی پانچویں جمہوریہ کے دستور اساسی کے نام سے مشہور ہے۔ فرانس کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جنھوں نے دستور اساسی کے سلسلے میں اب تک متعدد تجربے کئے ہیں۔ ۱۷۸۹ء سے (جس میں فرانس کے عظیم انقلاب نے بادشاہوں کے ظلم و استبداد سے نجات حاصل کی تھی) اب تک دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس پوری مدت کے دوران ہمیشہ دستور اساسی کی اصلاح و تبدیلی پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ فرانس کے ۱۷۹۱ء کے دستور اساسی نے مطلق العنانی حکومت کو آئینی بادشاہت میں بدل دیا (CONSTITUTIONAL GOVTT.) ۱۷۹۳ء کے دستور اساسی نے فرانس کی بادشاہی حکومت کو منسوخ قرار دے کر جمہوری حکومت قائم کی۔ ۱۷۹۵ء کا دستور اساسی مجلس سنا اور پانچ سو افراد پر مشتمل ایوان زیریں و ایوان بالا نے تدوین کیا۔ ۱۷۹۹ء کے دستور اساسی نے حکومت کے اقتدار کو چار کونسلوں میں تقسیم کر دیا۔

۱۸۰۰ء کا معاہدہ جس کی رو سے انگلینڈ اور آئرلینڈ ایک دوسرے سے جڑ گئے۔

انتخابات سے متعلق قوانین :

جن قوانین نے رفتہ رفتہ لارڈوں کی مجلس کے اختیارات کو کم کیا ہے، منجملہ ان میں ۱۹۱۱ء کا قانون ہے جس نے کا

۱۸۰۰ء کے دستور اساسی نے نپولین کو زندگی بھر کے لئے اجرائی قوت کے جملہ اختیارات سونپ دیے۔ ۱۸۰۲ء کے دستور اساسی نے جمہوری حکومت کو منسوخ اور شہنشاہیت کا نظام تسلیم کر کے نپولین کو شہنشاہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ ۱۸۱۴ء کے دستور اساسی نے قوہ مقننہ کی حیثیت سے ایوان زیریں، ایوان بالا اور بادشاہت کو تسلیم کیا۔ ۱۸۱۵ء کا دستور اساسی بطور تکملہ پیش کیا گیا اور نپولین کی سو دنوں پر مشتمل نئی شہنشاہیت قائم ہوئی۔ ۱۸۳۰ء میں ایک نئے دستور اساسی کا اعلان ہوا جس کے تحت بادشاہ عوامی نمائندے کی حیثیت سے راج کرتا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں ایک اور انقلاب رونما ہوا اور جمہوری حکومت قائم ہونے کے ساتھ ساتھ دستور ساز اسمبلی کے نوسو نمائندوں کے ذریعہ نیا دستور اساسی مرتب ہوا جو ۱۸۵۱ء تک جاری رہا۔ اسی سال لوئی نپولین، صدر جمہوریہ نے ایک دوسرا دستور اساسی پیش کیا اور خود کو دس سال کے لئے صدر جمہوریہ کے عنوان سے مقرر کر لیا اور اگلے سال فرانس کا شہنشاہ بن بیٹھا۔ اس کی حکومت ۱۸۷۰ء تک باقی رہی۔ اس سال فرانس میں دوبارہ جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸۷۵ء میں نئی جمہوری حکومت کا دستور اساسی چھ سو پچاس افراد پر مشتمل اسمبلی کے ذریعہ منظور ہوا۔ یہ فرانس کی قومی اسمبلی تھی جو آگے چل کر دستور ساز اسمبلی کے قالب میں ڈھل گئی ورنہ اس سلسلے میں کسی قسم کے انتخابات عمل میں نہیں آئے تھے۔

فرانس کا سب سے پائیدار دستور اساسی ۱۸۷۵ء کا دستور اساسی تھا۔ یہ دستور اساسی دوسری جنگ عظیم (۱۹۴۰ء) یعنی تقریباً ۶۵ سال تک نافذ رہا۔ ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ "مارشل پتین" کا دور کہلاتا ہے۔ "مارشل پتین" کو دستور اساسی کی دفعات میں تبدیلی لانے کا حق حاصل تھا اور اس کی مرضی حکم فرما تھی۔ اس نے ایسے فرمان جاری کئے جو خود دستور اساسی کی حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں فرانس سے جرمن فوج کے نکلنے کے بعد، ڈیگول نے ریفرنڈم کے ذریعہ فرانسیسی عوام سے سوال کیا کہ لوگ ۱۸۷۵ء کے دستور اساسی کو محفوظ رکھنا پسند کرتے ہیں یا نیا دستور اساسی چاہتے

حد تک لارڈوں سے قانون سازی کے اختیارات سلب کر لئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ تقریباً نوسو سال کے عرصے میں مختلف قوانین، فرامین اور طریقوں نے حکومت برطانیہ اور اس کے عوام کے لئے اس طرح کے اصول درج کئے ہیں جو تدوین ہوئے بغیر دستور اساسی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہیں۔ فرانسیسی عوام نے نئے دستوراساسی کا مطالبہ کیا۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دستور ساز اسمبلی قائم ہوئی اوراس نے فرانس کی چوتھی جمہوریہ کے دستوراساسی کو منظور کیا۔ لیکن اس دستوراساسی کو مورخہ ۵ مئی ۱۹۴۶ء کے ریفرنڈم میں فرانسیسی عوام کی موافقت حاصل نہ ہوسکی۔

نتیجۃً دوسری اسمبلی منتخب ہوئی اور نیا دستوراساسی مرتب کیا گیا، جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے ریفرنڈم میں ۳۵ فی صد موافق اور ۳۱ فیصد مخالف آراء کے ذریعہ ایک طرح سے فرانسیسی عوام کے لئے ناقابل قبول واقع ہوا، یہ دستور بارہ سال کی مدت تک فرانس کی حکومت کی اساس قرار پایا اور آخرکار اس نے ۱۹۵۸ء میں اپنی جگہ پانچویں جمہوریہ کے دستوراساسی کو دیدی۔ اسی سال فرانس کی قومی اسمبلی نے ۵/۲ اراکین کی اکثریت کی منظوری پر حکومت کے لازمی اختیارات جنرل ڈیگول کے حوالے کئے موصوف کے نظریہ کے مطابق کچھ ماہرین و وزراء پر مشتمل ایک اسمبلی میشیل ڈوبرا کی صدارت میں قائم ہوئی جس نے دوماہ کے عرصے میں نئے دستوراساسی کا مسودہ تیار کرنے کا کام پورا کیا۔ اس کے بعد ۳۹ افراد پر مشتمل ایک کمیشن (جسمیں دو تہائی کو پارلیمنٹ نے اور ایک تہائی کو صدر جمہوریہ نے انتخاب کیا تھا) نے جزوی تبدیلیوں کے ساتھ اسے منظور کیا۔ اس دستوراساسی سے متعلق ۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کو ریفرنڈم ہوا جس نے ۲۵ء ۷۹ فیصد اکثریت آراء کے ساتھ (یعنی ۳۶ ملین میں سے ۳۱ ملین کی) قومی منظوری حاصل کی۔ اس دستور کے ذریعہ صدر جمہوریہ کو بہت زیادہ قانونی اختیارات سونپے گئے ہیں۔

اس تقابلی بحث کا نتیجہ:

مذکورہ نمونوں سے دستوراساسی کی تدوین کے دو طریقے سامنے آئے۔ ایک طریقہ حکومت کی تشکیل کے ہمراہ تھا (حکومت سے مراد صرف وزراء کابینہ نہیں بلکہ وسیع معنوں میں عوام اور سرکاری ادارے) مثال کے طور پر امریکہ نے متحدہ ریاستوں کی تشکیل اور ان کی آزادی کے ساتھ ساتھ دستوراساسی مرتب کرنے کا کام انجام دیا اور ریاستوں کے نمائندے اس لئے جمع ہوئے تھے کہ اتحاد و اتفاق کے عہدنامہ پر دستخط کریں۔ درحقیقت اس طبقہ کے لئے دستور اساسی حکومت کی ایک ایسی سند کی حیثیت رکھتا ہے جس پر تمام مؤسسین نے دستخط کئے ہوں۔ حال میں وجود میں آنے والے افریقی و ایشیائی ملکوں کی حالت اکثر و بیشتر یہی ہے۔ الجزائر کا دستور

ں ایک ایسا مسودہ تھا جسے الجزائر کی انقلابی کونسل اور قومی محاذ آزادی نے منظور کیا تھا اور آخری
ے کے لئے ریفرنڈم کے ذریعہ عوامی منظوری حاصل کی گئی تھی، یہ وہی دستور اساسی ہے جس کی بنیاد
زائر ایک ملک کی حیثیت سے پہچانا گیا۔ یعنی اس نے فرانس سے علیحدہ ہو کر ایک مستقل آزاد ملک
کل اختیار کی۔

کچھ ایسے ممالک بھی ہیں جو پہلے سے موجود تھے اور دستور اساسی پر عمل بھی کیا کرتے تھے لیکن
ں وجوہ کی بنا پر اپنا پرانا دستور اساسی چھوڑ کر دوسرا دستور اساسی اختیار کر لیا ہے۔ جیسا کہ آپ
ظ فرما چکے ہیں، فرانس ان ملکوں میں سر فہرست ہے، جنھوں نے بار ہا نئے نئے دستور اساسی
یئے ہیں لیکن ہر بار کوئی نیا ملک وجود میں نہیں آیا، بلکہ حکومت کی نوعیت اور بنیادی طریقۂ کار
تے رہے ہیں۔ دستور اساسی بدلنے کی وجہ ممکن ہے سیاسی اعتراضات یا انقلاب کے مانند بنیادی تبدیلی
ا ہو۔

دستور اساسی مرتب کرنے میں تمام انسانی تہذیبیں دخیل رہی ہیں۔ اسلامی اصول و حقوق
ستحکم بنیادوں کے ساتھ ان الٰہی اصول و اسلام کا تذکرہ کئے بغیر دنیا کے ہر دستور اساسی کے متن
پائے جاتے ہیں۔ اور ہم بلا وجہ اس شبہ کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں کہ دنیا کے تمام قانونی اصول
مغرب کی دین ہیں۔

اسلامی تہذیب و تمدن کا دائرہ اتنا وسیع ہونے کے باوجود ایک عرصے تک اس کا نام و نشان
دنیا کے صفحات سے غائب رہا ہے۔ قرآنی آیات جن کا شمار بنیادی حقوق کے عظیم ترین مآخذ
ں ہوتا ہے اور جسے کم سے کم چالیس سے زیادہ اسلامی ملکوں کے دستور اساسی کی بنیاد ہونا
یئے ہے سود تصور کی جاتی رہی ہیں۔ ہم نے دستور اساسی کی منظوری سے متعلق بعض ملکوں کے
یقۂ کار کو نمونہ کے طور پر پیش کیا۔ خاص طور سے ان ملکوں کا نمونہ پیش کیا جو دستور اساسی کی
ت کے قائل ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ عوام کی رائے پورے طور پر لی گئی ہے۔ آپ
ظہ کریں گے کہ ان میں سے بعض ملکوں نے صرف ریفرنڈم پر اکتفا کی ہے، بعض نے مہارت کو
یار قرار دیا ہے۔ بعض نے دستور ساز اسمبلی سے استفادہ کیا ہے اور بعض نے اسمبلی اور
رنڈم دونوں سے کام لیا ہے، لیکن ایسی مثال کم ہی ملتی جس میں دستور اساسی کے لئے تین مرحلو

میں براہ راست عوام کی رائے لی گئی ہو جبکہ یہ کام اسلامی جمہوریہ ایران میں انقلاب کی کامیابی کے پہلے ہی سال انجام پاگیا۔ حکومت کی نوعیت، ریفرنڈم و رائے عامہ کے ذریعہ معین ہوئی۔ مجلس خبرگان یا دستور ساز اسمبلی نے جو عوام کے چنے ہوئے ۷۳ اراکین سے تشکیل ہوئی تھی، اعلانیہ طور پر دستور اساسی کی تدوین و تحقیق کا کام انجام دیا اور اس اسمبلی کے تیار کردہ دستور کے سلسلہ میں آخر میں ریفرنڈم کے ذریعہ عوام سے منظوری حاصل کی گئی۔ دستور اساسی کی منظوری کے مراحل کی رو سے وہ ممالک جو ان مقدمات کو بہت اہمیت دیتے ہیں ان سے کہیں زیادہ ایران میں اس بات کا خیال رکھا گیا۔

دستور اساسی کے نفاذ کے لئے اور بھی تجربے دنیا بھر کے ملکوں نے کئے ہیں، جن کی جانب محض ایک اشارہ کافی ہے اور یہ اشارہ بھی اس بات کے پیش نظر کہ ہم ہر ملک کے دستور اساسی کا تاریخی مطالعہ کرنے کے خواہاں نہیں، بلکہ ہمارے تقابلی مطالعہ کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ کسی حکومت نے جو فوجی بغاوت کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کرکے دستور اساسی کے نام پر کچھ ایسے فرمان جاری کئے اور ان پر لوگوں سے عمل پیرا ہونے کے لئے کہا گیا ہے جن کے بارے میں عوام کی رائے تک نہ لی گئی۔

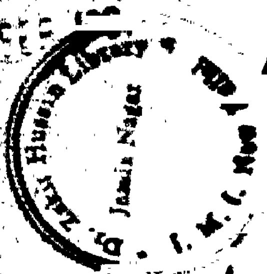
بعض ملکوں میں دستور اساسی حکمراں گروہ کی جانب سے مدوّن ہوکر عام اسمبلی کے ذریعہ منظور ہوا ہے۔ بعض ملکوں نے (ظاہری) آزادی حاصل کرکے کسی نہ کسی سامراجی ملک سے ملتا جلتا دستور اساسی کو اپنا لیا ہے۔ بعض ملکوں میں قانون ساز اداروں (ایوان بالا وایوان زیریں) نے گٹھ جوڑ کرکے کسی نہ کسی ایک متن کو دستور اساسی کی حیثیت سے منظور کر لیا ہے۔ اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ کسی پارلیمنٹ کے لئے انتخابات عمل میں آئے ہیں جس کے فرائض میں عام پارلیمنٹ کے فرائض کے علاوہ دستور اساسی مرتب کرنے کا کام بھی شامل رہا ہے اور بعض اوقات ایک ملک نے دستور اساسی مرتب کرنے کی غرض سے دوسرے ملکوں کے ماہرین کا سہارا لیا ہے۔

بعض ممالک مدتوں دستور اساسی سے محروم رہے ہیں، ہنگامی حالات کے نام

پر اعلیٰ عہدیداروں کے احکام کی بنیاد پر ملک کا نظم نسق چلا یا ہے ، اس کے بعد دستور اساسی کی تدوین کے وقت بحران کے شکار ہوئے ہیں۔

اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

توحید



جلد ۴، شمارہ ۳، رمضان ۔ شوال ۱۴۰۷ھ / مئی ۔ جون ۱۹۸۷ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

- قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفہ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

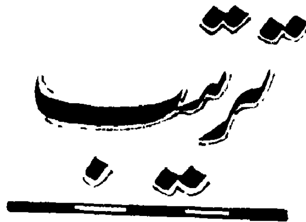
ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی، تقاطع فرصت
تہران ۔ جمہوری اسلامی ایران



اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد (۴)، شمارہ (۳)



مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

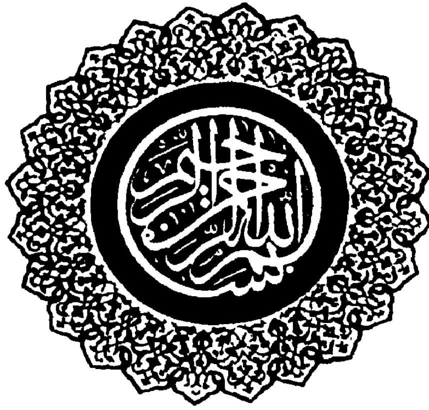
فون : ۲۴۵۸۴



رمضان، شوال ۱۴۰۷ھ / مئی - جون ۱۹۸۷ء

فکر و فلسفہ

فقہ و قانون



نوٹ :۔

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

روزہ
تعمیر انسان

اسلامی تعلیمات کا یہ امتیاز ہے کہ اس کی نظر میں دین و دنیا کے اعمال ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، جس طرح سے دنیوی و شخصی اعمال کا اثر انسان کی آخرت پر پڑتا ہے اسی طرح اخروی و عبادی عمل کا اثر بھی اس کی دنیوی زندگی پر پڑتا ہے۔ اسلامی عبادتیں، انسان کی تعمیر میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

روزہ، ان عبادتوں میں سے ایک عبادت اور مذکورہ بالا تمام خصوصیات کا حامل ہے، روزہ روزہ دار کی فکر و روح کو جلا بخشنے میں انتہائی مؤثر اور تعمیری کردار ادا کرتا ہے، اس کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

افضل الجهاد، الصوم فی الحر (سفینۃ البحار ج ۲ ص ۶۴)

بہترین جہاد موسم گرما میں روزہ رکھنا ہے۔

روزہ، انسان کے ایمان اور اس کی روحانیت کو تقویت بخشتا ہے، گناہ سے بچنے کے لئے ارادے کو مستحکم کرتا ہے، مشکلات و مصائب برداشت کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے۔ روزہ، انسان کو ہلاکت و تباہی سے نجات دلاتا ہے، مشکلوں کو آسان بناتا ہے۔

پیغمبر اسلام نے ایک حدیث کے ضمن میں روزہ دار کو اتنی عظمت کا حامل بتایا ہے کہ قیامت کے دن، اسے گناہ گاروں کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا:۔

من صام شهر رمضان وحفظ فرجه ولسانه وكف اذاه عن الناس

غفر اللہ لہ ذنوبہ ما تقدم منها وما تأخر۔ واعتقہ من النار واحلہ دار القرار، وقبل شفاعتہ بعدد رمل عالج من مذنبي اھل التوحید (وسائل الشیعہ۔ جلد ۷ ص ۱۴۷)

جو شخص ماہ رمضان میں روزے رکھے، اپنی زبان اور جنسی خواہشات کو گناہ سے آلودہ نہ ہونے دے، لوگوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائے، خداوند عالم اس کے گذشتہ و آیندہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ اسے جہنم سے آزاد کر کے اپنی بہشت جاودان میں جگہ عطا کرے گا اور گناہ گار مسلمانوں کے سلسلہ میں اس کی شفاعت کو قبول کرے گا۔

روزہ کا ایک اہم فائدہ جو انسان کی دنیا و آخرت، دونوں کو سنوارتا ہے، یہ ہے کہ روزہ انسان کی روح کو لطافت، اس کے ارادہ کو قوت اور خواہشات کو توازن و اعتدال عطا کرتا ہے۔ روزہ انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ بھوک پیاس کے باوجود، آب و دانہ کو ہاتھ نہیں لگاتا، مختصر یہ کہ روزہ انسان کو حیوانیت کی گہری کھائی سے نکال کر ایسی معراج عطا کرتا ہے کہ وہ صف ملائکہ سے بھی آگے نظر آتا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ سے سوال کیا گیا، شیطان سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا:-

الصوم یسود وجہہ، والصدقۃ تکسر ظہرہ والحب فی اللہ تعالیٰ والمواظبۃ علی العمل الصالح یقطع دابرہ۔ والاستغفار یقطع وتینہ (بحار الانوار۔ ج ۹۶۔ ص ۲۵۵)

روزہ، شیطان کو روسیاہ کر دیتا ہے، راہ خدا میں صدقہ، اس کی کمر توڑ دیتا ہے، راہ خدا میں محبت اور عمل صالح کی بجا آوری اسے دم بریدہ بنا دیتی ہے اور استغفار اس کی رگ گردن کو کاٹ دیتا ہے۔

بارگاہ الٰہی سے جب شیطان کو نکالا گیا تو اس نے عہد کیا کہ بنی آدم کو عبادت خدا سے منحرف کر کے غیر خدا کی بندگی پر مجبور کر دے گا، لیکن روزہ شیطان کو اس ناپاک مقصد میں ناکام بنا دیتا ہے اور انسان کو ضلالت و گمراہی، نیز شیطانی غلبہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

●

سماجی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی روزہ، بے شمار فوائد کا حامل ہے، روزہ، معاشرہ میں مساوات و برابری کا بہترین سبق ہے۔ اس عبادت کے ذریعہ مال دار و خوش حال افراد، معاشرے کے غریب و نادار طبقہ کے دکھ درد سے بھی واقف ہوتے ہیں اور اپنے کھانے پینے میں کمی کر کے محروم و بے نوا افراد کی مدد بھی کر سکتے ہیں، ہشام بن حکم نے امام جعفر صادقؑ سے روزہ کے فلسفہ سے متعلق سوال کیا، حضرتؑ نے فرمایا:۔

انما فرض الله الصیام لیستوی به الغنی والفقیر، و ذالك ان الغنی لم یکن لیجد مس الجوع فیرحم الفقیر، لان الغنی کلما اراد شیئاً قدر علیه فاراد الله تعالیٰ ان یسوی بین خلقه، وان یذیق الغنی مس الجوع والالم لیرق علی الضعیف ویرحم الجائع (وسائل الشیعہ ج ۷، ص ۳)

خداوند عالم نے روزہ، اس لئے واجب کیا ہے کہ فقیر و غنی کے درمیان مساوات برقرار ہو جائے اور یہ اس لئے ہے کہ صاحب ثروت، بھوک کا مزہ چکھ لے اور غریبوں کا حق ادا کرے، کیونکہ صاحبان مال و دولت جو کچھ چاہتے ہیں ان کے لئے فراہم ہو جاتا ہے لیکن خدا، اپنے بندوں کے درمیان مساوات برقرار کرنا اور مالداروں کو بھوک پیاس نیز درد والم سے آشنا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ بھوکوں اور کمزوروں پر رحم کریں۔

سچ بتایئے، اگر دنیا کے مالدار ممالک سال میں چند دن روزہ رکھیں، بھوک اور پیاس سے آشنا ہوں۔ تو کیا پھر بھی دنیا میں اتنے بھوکے نظر آئیں گے؟ کیا پھر بھی ایک ایک لقمہ کو ترستے ہوئے انسانوں کو نظر انداز کر کے صرف قیمت میں اضافہ کی خاطر لاکھوں ٹن گیہوں سمندر میں پھینکا جائے گا؟

●

جہاں تک حفظان صحت کا تعلق ہے، قدیم و جدید اطباء بھی روزہ کے معترف ہیں۔ ان کی نگاہ میں روزہ، جسم انسانی کی صحت و سلامتی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ بہت سی بیماریوں کا سبب پُرخوری ہے۔ اضافی مواد، ہضم ہوئے بغیر، چربی کی صورت میں، خون اور بدن کے مختلف حصوں میں باقی رہ جاتا ہے، اور جراثیم کی نشو و نما کے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتا ہے۔ ان جراثیم کو ختم کرنے کے لئے، ان کی پناہ گاہوں کو مسمار کرنا ضروری ہے۔ روزہ، اس عمل کو بنحو احسن انجام دیتا ہے روزہ، بدن کے اندر موجود کوڑے کرکٹ اور ہضم نشدہ، اضافی مواد کو جلا کر جسم کو صاف و شفاف

اور بے عیب بنا دیتا ہے۔

"الیکسی سوفورین" روسی دانشور، اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

"روزہ بہت سی بیماریوں کا بہترین علاج ہے، بطور مثال، چند امراض جن کے علاج میں روزہ اہم کردار ادا کرتا ہے، حسب ذیل ہیں:۔

آنتوں کی بیماری، کم خونی، ٹی بی، گٹھیا، عرق النساء، آنکھوں کے امراض، ذیابیطس، جلدی امراض، گردہ اور جگر کی خرابی، طاعون، کینسر، استسقاء اور نقرس وغیرہ۔"

(روزہ، روشن نوین برائے درمان بیماریہا ص۶۵)

پیغمبر اسلام ایک مشہور و معروف حدیث میں فرماتے ہیں:۔

"صوموا تصحوا"

روزہ رکھو صحتمند رہو۔ (بحار الانوار ج۹۶ ص۲۵۵)

ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں:۔

المعدة بيت كل داء والحمية رأس كل دواء

"معدہ، تمام بیماریوں کا گھر ہے اور کھانے پینے سے اجتناب (روزہ) بہترین دوا ہے"



- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان ۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب ۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی ۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی ۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط ۔

مرتضیٰ حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

سورۂ آل عمران

چند نکات :

نام: سورت کا نام "آلِ عمران" ہے۔
کلمۂ "آل عمران" آیت نمبر تینتیس میں آیا ہے۔
محل وقوع : تیسرا سورہ، ربع پارۂ سوم کے بعد سے ثلث پارۂ چہارم کے بعد تک۔
آیات : دو سو۔ حروف، پانچ ہزار دو سو چھبیس۔
کلمات: تین ہزار۔ پانچ سو بیالیس۔
رکوع : بیس۔
محل نزول : مجموعی طور پر مدینہ۔
زمانۂ نزول : غزوۂ احد (۳ھ) اور اس کے بعد۔

مسائل:

• سورۂ آلِ عمران مدینے کی سیاسی صورتِ حال، اقتصادی، نفسیاتی اور سب سے زیادہ عوام کے اعتقادات اور عیسائی رجحانات کا پیش منظر واضح کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مہاجرین و اہل مدینہ کے درمیان جن سماجی مسائل اور داخلی و خارجی سیاست سے دوچار ہوئے اور حضورؐ نے مشکلات کیوں کر حل کئے۔ یعنی مسلمانوں کے لئے ان سے ملتے جلتے مسائل میں رہنما اشارے ہیں۔

• مدینے کے اندر جنگ کا امکان، یہود و نصاریٰ، مشرک اور منافق گروہوں کی اسلام دشمنی سرگرمیوں کا تذکرہ، جنگِ احد کی پیش آمد، قبل جنگ، وقت جنگ اور بعد از جنگ اہل

اور بے گانوں کا کردار۔ جنگ۔ شہداء اور مجاہدین کا خلوص۔ اس کے مقابلے میں بھاگنے والوں، ذہنی خلفشار میں مبتلا اور اعتقادی کمزوریوں کے شکار مسلمانوں کی تصویر۔ منافقوں کی ریشہ دوانیاں اور ان کے مقابلے میں تحفظ۔ دفاع اور صبر و اصلاح احوال پر زور۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کو داخلی و خارجی دوستوں اور دشمنوں کی شناخت اور ان کے ساتھ میل جول میں دین کی بنیاد پر قربت یا دوری کی ہدایت۔

- "ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتٰب۔۔۔ کونوا عبادا لی" آیت نمبر ۹ اور آیت ۱۶۴ لقد من اللہ علی المؤمنین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تربیت" کی توضیح۔ اسلام، احساسات کی پاکیزگی، نفس کی طہارت کو علم و دانائی کے حصول کا منتہا سمجھتا ہے اور طالب علم جو بھی پڑھے اس کے نتیجے میں "ربانی" بننے اور تعلیم دینے والا کسی کو اپنا بندہ بنانے کا درس نہ دے۔ معلمین بشریت، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ نے اسی فلسفے اور عمل کو سمجھایا اور ذکر و فکر کو ایک کر کے دکھایا ہے، کیونکہ توحید و عدل و قدرت و مالکیت و جزا و سزا ۔۔ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

- انبیا کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے خیالات و تعلیمات کی تصحیح، خصوصاً، زکریاؑ، یحییٰؑ، مریمؑ اور حضرتِ عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہم السلام کے بارے میں تاریخی اور سوانحی حقائق کا بیان۔

سورۂ بقرہ میں یہود و نصاریٰ کے حوالوں کی حقیقت بیان ہو چکی، کاروبار اور عہد و پیمان کی لکھت پڑھت تحریر میں ردوبدل اور گواہ۔ لین دین اور قرض و امداد کے مسائل میں تورات کے تعلیمات اور قرآن مجید کے احکام بیان ہوئے۔

اس سورے میں، عیسائیوں کے افکار و عقائد کا تجزیہ اور حقائق کا انکشاف ہے تثلیث پرستی کی تردید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے ابن اللہ نہ ہونے پر دلائل ہیں۔ ان بحثوں کے پس منظر میں نجران کے رہنماؤں کی بے چینی اور ان کی مدینے آمد نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بحث، مناظرہ و مباہلہ اور آخر میں شکست کا تذکرہ کر کے قیامت تک مسلمانوں کو عیسائی، عقائد اور کردار سے باخبر کر کے ہدایت کے ضابطے اور علمی و عملی، سیاسی اور سماجی

قانون قاعدے سے تعلیم دیئے ہیں۔

بعثت سے ہجرت تک حربی اور سیاسی طاقتیں دو تھیں، روم اور فارس دونوں، عرب علاقہ پر قبضے اور تسلط کے لئے برسرپیکار تھیں۔ مذہبی طور پر اس علاقے میں یہودیت وعیسائیت میں میں تصادم تھا اور دونوں معرکوں میں، کعبہ سب کے سامنے تھا۔ مگر وہاں کے سیاسی و مذہبی حالات معاشرتی اور معاشی معاملات ایسے تھے کہ دونوں میں سے کوئی بھی فتح کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا، کعبہ کے مذہبی اہمیت اور تقدس اس قدر اہم تھا کہ سب اس سے ڈرتے اور سب اس کو مانتے تھے۔

جنوبی عرب میں یمن، حبشہ سے قریب تھا، اور حبشہ عیسائیوں کا مرکز، یمن کے فرماں روا یہودی تھے، حبشہ نے یمن فتح کیا تو وہاں عیسائیت کا زور ہوا، اور تھوڑی ہی مدت میں "نجران" میں ایک بڑا چرچ بن گیا اور مذہبی قیادت وجود میں آگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ کے لئے یمن کو چھوڑ کر حبشہ کو نشانہ بنایا اور وہاں حضرت جعفرؓ کی قیادت میں مہاجرین نے جاکر تبلیغ کی اور سورۂ مریم کا درس سنا کر نجاشی کو ہم خیال بنایا۔ حضورؐ نے دوسری ہجرت کے لئے یثرب کو منزل بنایا۔

یثرب، فدک، خیبر، تیما، دومۃ الجندل اور تبوک، یروشلم اور شام سے قریب تھے دمشق اور فلسطین میں عیسائیوں کو مذہبی اور سیاسی برتری حاصل تھی اس لئے یثرب کے یہودی طاقت ور تھے۔ مگر عیسائی ان کے دشمن تھے ــــ اور عیسائی قبائل کی آبادیاں بھی کم نہ تھیں بہرحال یہودی مدینے اور مسلمانوں کے لئے بہت خطرہ تھے۔

مدینہ میں آسمانی کتابوں، مذہبی تعلیم و تربیت اور کسی قدر اصول عقائد و احکام اور پڑھنے لکھنے کی بات چیت ہوتی تھی، یہاں کے آسمانی نظام کے مدعی اور پیغمبروں کے حوالے سے نام نہاد قانون کو جانتے تھے۔

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغمبرانہ، صبر، عفو و درگذر، شجاعت اور میدان میں بے مثال استقامت، زخم بدن اور زخم دل کے باوجود، دشمن کو پسپا کرنا اور دوستوں کی قدر دانی۔

• حضرت علی علیہ السلام اور ائمہ کا علم، آل رسولؐ کی برتری ۔ مباہلہ ۔ ایک عجیب جنگ ، معصوم افراد اور ان کی فتح ۔

• احکام میں آیت نمبر ۳۲ و ۱۳۲ میں "اطیعو اللہ والرسول" کے حکم میں اطاعتِ رسول کو جزوِ اطاعت اللہ قرار دیا ہے ۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵۹ میں اس کی توثیق اور "اولوالامر" کی اطاعت کو جزوِ اطاعت رسول بتایا ہے ۔

• قبلہ ۔ مقام ابراہیم ۔ حج ، تقیہ ۔ جہاد ۔ مذمت فرار ۔ حیات شہدا ۔ انفاق کی تاکید ۔ بخل کی مذمت ۔ سود کی حرمت ۔ مشورہ ۔ ذکر و فکر کی یکجائی ۔ توبہ ۔ قیامت کے تذکرے ۔ عمل اور عوض میں مرد و زن کی یکسانیت ۔

سورة آل عمران



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

الٓمٓ ۝ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَىٰةَ وَالْإِنجِيلَ ۝ مِن
قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِـَٔايَٰتِ
اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ
فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ:

اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو بڑا مہربان، رحم والا ہے ۔ الف ۔ لام ۔ میم (۱)
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ دائمی حیات کا مالک ہے، کائنات کو سنبھالنے والا ہے (۲)
اس نے برحق کتاب تم پر نازل کی وہ موجود کتابوں (تورات و انجیل) کی تصدیق کرتی
ہے اور اسی نے تورات و انجیل اتاری (۳) اس (قرآن) سے پہلے وہ لوگوں
کے لیے ہدایت تھی اور فرقان کو اس نے نازل کیا، یقیناً جو لوگ آیاتِ الٰہی کے منکر
ہوئے ان کے واسطے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب، بدلہ لینے والا ہے (۴)
بلاشبہ، اللہ پر زمین و آسمان میں کوئی چیز مخفی نہیں ہے (۵) وہی رحموں میں
تمہاری شکل، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غالب اور

زبردست حکمت والا ہے (۶)

تفسیر:

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ آلٓمٓ ۔

بسملہ ، ادب قرآن میں ہر سورہ کا سرنامہ ہے ۔ "اللہ" وہ نام ہے جو مظہر جمال و جلال ہے، اللہ نے اس نام کو "رحمٰن و رحیم" کے ساتھ ملا کر اپنی صفتِ "رحمت" کو نمایاں فرمایا ہے ۔

رحمٰن : اسماء حسنیٰ میں ہے اور غیر اللہ کی صفت واقع نہیں ہوتا۔ قرآن میں بسم اللہ کے اندر ایک سو چودہ مرتبہ اور اثنائے آیات میں پچپن جگہ استعمال ہوا ہے ۔

اکثر اہل لغت کے نزدیک "رحمت" سے مشتق ہے اور معنی ہیں" احسان کرنے " اور نعمت دینے والا، بڑا مہربان ۔

رحیم : یہ نام بھی اسماء حسنیٰ میں ہے۔

الٓمٓ ۔ مقطعات قرآن میں ہے ، یہ مقطعات عموماً مکی سورتوں میں آئے ہیں ، البقرۃ اور اور آل عمران بھی ہجرت کے ابتدائی دور کی سورتیں ہیں ۔ ان حرفوں کی الگ الگ صوتی کشش اور آہنگ ہر حرف کی آواز کا دوسرے حرف کی صدا سے جوڑ، نفسیاتی توجہ کو موڑتا ہے اور مؤثر خطاب کا فائدہ دیتا ہے ۔ معجزے کی بات ہے، مکی ادیب اس سے پہلے ایسے خطاب سے آشنا نہ تھے وہ اسے سن کر دنگ ہوتے تھے کہ حروف معنی دیتے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے اعتراض نہیں کیا اکثر حروف مقطعات کے بعد قرآن کی صفتیں بیان ہوئی ہیں ۔ اس سورے میں پہلے اللہ کی حمد ہے پھر قرآن کا ذکر آیا ہے ۔

۲۔ اللہ لا الٰہ الا ھو الحیّ القیوم ....

اللہ ، کو صرف پرستش ہی کے قابل نہ سمجھ بیٹھنا ، وہ حیات و حیات آفرین ہے ۔ نظام کائنات کو گردش دینے اور قائم رکھنے والا بھی ہے ، حاکم و سربراہی اسی کی ہے ۔

شان نزول : مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں سے (۸۰) اسی آیتیں وفد نجران سے خطاب کرتی ہیں اور سورے کا انداز بتاتا ہے جیسے انجیل کا متبادل ہے ۔

۳۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ . . . .

۴۔ من قبل ھدی للناس . . . . .

اللہ نے ہدایتِ بشر کے لیے قرآن نازل کیا، قرآن کتب وصحف سابق کی تائید کرتا ہے، مگر وہ تورات وانجیل وصحف جو تحریف سے پاک اللہ کی نازل کردہ کتابیں تھیں، اب نئی تعلیم کی ضرورت کے لئے اور تحریفات میں حق و باطل کو جدا کرنے کی خاطر قرآن نازل کیا گیا ہے۔

تورات پر بڑے بڑے ظلم ڈھلائے گئے نتیجے میں یہ آسمانی کتاب کچھ سے کچھ ہو گئی۔ موجودہ دور میں تورات بائبل کا ایک حصہ ہے اور اسے "عہد قدیم" کہاجاتا ہے۔ اس کے تین جزو ہیں (الف) تورات، قانون یا شریعت - (ب) صحف انبیاء (ج) صحائفِ مقدسہ یا تحریریں - پھر تورات کے چار باب ہیں :-

۱) تکوین : قبل از موسیٰؑ سے ولادتِ کلیم اللہ تک اس میں تاریخ وثقافت کی عجیب عجیب داستانیں ہیں۔

۲) خروج ، ولادتِ حضرت کلیم سے طور اور مقدس میثاق اور وضع قوانین کا بیان۔

۳) لاویین : قوانین وشریعت کا بیان۔

۴) تثنیہ : قوانین وتاریخ تا وفات حضرت موسیٰؑ - مزید اطلاعات آگے لکھے جائیں گے انشاء اللہ۔

انجیل : حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب، جو اب بدلی جا چکی ہے۔ قرآن نے آکر ان کتابوں کی تحریف کو اجاگر کیا۔

سورۂ حمد کا خاتمہ، مغضوب علیہم اور ضالین کے الفاظ پر ہوا تھا، اس کے بعد "بقرہ" ہے جس میں یہود اور پھر تیسرا سورہ آل عمران جس میں نصاریٰ کا تذکرہ اور ان دونوں کے کرتوتوں کی نشاندہی ہے۔

۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ . . . . . تورات وانجیل وفرقان کے بعد اللہ کی حجت تمام ہو چکی، اب جو بھی آیتوں کا انکار کرے اور حقائق کو جھٹلائے گا وہ سزا پائے گا اور اللہ چونکہ قادر و توانا ہے لہٰذا بدلہ دے گا۔

احکام و عقائد میں یہود و نصاریٰ کا اختلاف بلا جواز ہے اور قرآن آنے کے بعد تو بالکل حجت تمام کی جا چکی ہے۔

۵. ان اللہ لا یخفیٰ علیہ شیٔ ....

۶. ھو الذی یصوّرکم فی الارحام ....

اللہ، عزیز و غالب ہے، حکیم و بصیر ہے اسی وجہ سے زمین و آسمان کی ہر چیز اس پر عیاں ہے رحم مادر میں بچہ کی آمد اور اس کے مختلف مراحل، کبھی سائنس کی آنکھ سے دیکھو اور انکشافات کی بات سنو پھر سوچو کہ اللہ کی قدرت و حکمت و رحمت کتنی وسیع ہے۔

موسیٰ اور عیسیٰ کے علم و قدرت کا اللہ سے کیا مقابلہ، آخر اللہ، اللہ اور بندہ بندہ ہے۔ رہی بات خلق عیسیٰؑ کی؟ تو آدم و مریم و عیسیٰؑ کا معاملہ ایک سا ہے، آدم بے ماں باپ کے خلق ہوئے، مریم، زکریا نبی کی دعا پسر کے جواب میں خلق ہوئیں۔ عیسیٰؑ کی تخلیق میں باپ کی ضرورت پیش نہ آئی، خلق و امر کا مالک اللہ ہے۔ وہ جسے جس طرح اور جس صورت میں پیدا کرے اس میں بحث کا حق کسے ہے؟

تلمیح و کنایہ و تنکیر و عموم کا انداز دیکھیے بات سوال و جواب کی تھی بیان میں معجزے کی لطافتیں رکھ کر افادیت میں لامحدود اضافہ کر دیا۔

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا

وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝

ترجمہ:

اللہ نے تم پر قرآن نازل کیا، اس میں کچھ "آیات محکمات" اساس کتاب ہیں اور کچھ "متشابہات" ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ "متشابہات" کی ادھیڑ بن میں رہتے ہیں، تاکہ خلفشار پیدا کریں اور نئے معنیٰ نکالیں، حالانکہ ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان لوگوں کے جو علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب (محکم و متشابہ) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جو عقلمند ہیں (۷) اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ہدایت کرنے کے بعد ڈانواں ڈول نہ ہونے دے اور اپنی بارگاہ سے ہمیں رحمت عطا کر، اس میں تو شک ہے ہی نہیں کہ تو بڑا عطا کرنے والا ہے (۸) ہمارے رب! بے شک تو ایک دن، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ سب لوگوں کو اکٹھا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا (۹)

تفسیر:

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

حی ابن اخطب اپنے بھائی کے ساتھ حاضر خدمت نبی خاتم ہوئے اور "الٓمٓ" پر گفتگو کرتے ہوئے ابجدی حساب لگا کر کہا کہ آپ کی امت اکہتر برس سے زیادہ نہ رہے گی۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر سوچنے کا یہی انداز ہے تو "الٓمٓصٓ" و "الٓر"

۔۔۔۔۔ کو چھوڑنے کا سبب کیا ہے؟ (ان مقطعات سے مراد یہ حساب ہے ہی نہیں) اس وقت یہ آیت اتری۔ (اکمال الدین واتمام النعمت ، تفسیر نور الثقلین)

البیان میں ہے کہ وفد نجران کی گفتگو سے آیت کا تعلق ہے۔ ان لوگوں نے پوچھا: آپ عیسیٰ کو "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" نہیں کہتے؟ رسول اللہؐ نے فرمایا کیوں نہیں، پھر ان لوگوں کی زباں بندی میں یہ آیت اور آیۂ "انّ مثل عیسیٰ عند اللہ" نازل ہوئی۔

۷۔ هوالذی نزّل علیک الکتاب منه ۔۔۔

محکم : وہ آیت جس کے معنی ہر شخص سمجھ لے۔

متشابہ : وہ آیت جس کے الفاظ سے معین معنی تو نکلتے ہوں مگر اس کے مصداق و مطالب اور بھی نکالے جا سکتے ہوں، جن میں سے ایک صحیح اور باقی غلط ہوں۔

متشابہ آیات کیوں؟

قرآن مجید میں متشابہ آیات کی حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ بعض فکری مفاہیم ایسے ہوتے ہیں جن کی سمائی یا تو الفاظ میں ممکن نہیں، یا ان پر غور کرنے کے لئے خاص ذہن اور مخصوص افراد اور الٰہی دبستان کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن آئین و دستور ہے، اس میں عقل و فکر کو غور و تدبر کی دعوت دی گئی ہے۔ ہر شخص اگر اپنی آزاد فکر سے قرآن کو موضوع بحث بنا سکتا تو اس کے تعلیمات و فکری اساس میں انحرافات آجاتے، اس لئے ایسے آیات مخصوص مزاج اور دبستان فکر رکھنے والوں کو خصوصی مرکزیت دینے کے لیے نازل ہو۔

متشابہ آیات سے اسلام کے بنیادی تعلیمات میں اختلاف نہ ہونے کا سبب ایک تو محکم آیات ہیں، دوسرے راسخ فی العلم حضرات، رسولؐ و آل رسول علیہم السلام کا وجود ہے۔

فکری خلل میں مبتلا اور بدنیت لوگ متشابہ آیات کا سہارا لے کر من مانی تفسیریں کرتے اور فکری انتشار پھیلانے کی راہ نکالتے ہیں۔ قرآن کے محکم آیات ان هوالا عبد انعمنا علیه ۔۔۔۔۔ انّ مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقه من تراب ۔۔۔۔۔ ذالک عیسیٰ بن مریم قول الحق الذی فیه یمترون ما کان للّٰہ ان یتخذ من ولد ۔۔۔۔۔

موجود ہونے کے باوجود "کلمتہ القاھا الی مریم و روح منہ" کو من مانے عقیدے سے ہم آہنگ کرنے کی سعیِ ناکام کرتے ہیں۔

راسخین فی العلم کون؟

- وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم - متشابہ آیات لاینحل نہیں ہیں۔ قرآن مجید آئین ہے تو اس کے عبارات بے معنی نہیں ہو سکتے۔ یہ معجزہ ہے کہ متشابہ آیتیں مع رکھنے کے باوجود اللہ کی طرف رجوع چاہتی ہیں کہ ذہن بشر غلط راہ پر نہ چل نکلے اور "راسخ فی العلم" رسول ا آل رسول سے پوچھے کہ وہی قرآن کے حقیقی مفسر و عالم ہیں اور صراط مستقیم کے رہنما اور متقین کے امام ہیں اسی حقیقت کو سورۂ فاطر میں بیان فرمایا ہے۔" اور ہم نے وحی کے ذریعے جو کتاب بھیجی وہ حق ہے او موجود حقائق (تورات وانجیل) کی تصدیق کرنے والی ہے۔ یقیناً، اللہ اپنے بندوں کے بارے پر خبیر وبصیر ہے (۳۱) اس کے بعد ہم نے الکتاب (قرآن) کا وارث اپنے بندوں میں سے چند منتخب لوگوا کو بنایا (کیونکہ ان بندوں میں سے کچھ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔ کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ نیکیوں میں پیش ہیں اور یہی اللہ کا بڑا احسان ہے (۳۲) منتخب وسابق بالخیرات کو ایک مرتبہ وارث کتاب اور دوسری مر راسخ فی العلم کہا ہے تاکہ ہر شخص قرآن کا داعی نہ بن بیٹھے - امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث ہے۔ رسول ا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" راسخون فی العلم" میں سب سے بلند مرتبہ ہیں۔ حضورؐ پر جو وحی نازل ہوئی اس تاویل و تنزیل سے کما حقہ باخبر تھے۔ اللہ کوئی ایسی بات نازل نہیں کرتا تھا جس کی تاویل کا علم نہ دیتا ہو پہلے آنحضرتؐ اور آپ کے بعد آپ کے اوصیا تمام علم رکھتے تھے (مجمع البیان)

ترکیب نحوی کے اعتبار سے "والراسخون" کی حالت رفع "علی اللہ" پر عطف کی وجہ سے ہے۔

- یقولون آمنا بہ کل من عند ربنا - علم میں رسوخ اور مضبوطی رکھنے والے حضرات، سراپا ایمان ہیں یہ لوگ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی بات پر کمال علم "عین یقین" کا اظ کرتے ہیں اور یہ بات اہل دانش وعقل خوب سمجھتے ہیں۔

۸۔ "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا"۔ اہل ایمان کی دو دعائیں ہیں۔ اور قرآنی دعاؤں میں سورۂ حمد کی بات ذہن میں رہے "رب العالمین" اکثر دعاؤں میں "رب" سے ابتدا ملتی ہے۔

جب صراط مستقیم پر ہم آگئے تو اب رفتار کے ساتھ گفتار اور فکر و عزیمت میں کجی نہ آنے پائے۔ پروردگارا! تجھ سے یہی دعا ہے۔ تیرا کرم تو بہت وسیع ہے۔ اس دعا کی ایک مناسبت آیات متشابہات سے نافہمی کے وقت پیدا ہونے والا امکانی انحراف اور راسخون فی العلم سے رجوع نہ کرنے کی حالت ہے۔

۹۔ ربنا انک جامع الناس.....

پروردگارا! حشر کا دن ضرور آئے گا اور تیرے سب وعدے ضرور پورے ہوں گے۔ دونوں دعاؤں میں اوّل توجہ الی اللہ اور آخر خوف محشر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ "تقویٰ" اور یہی منزلِ اوّل ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ﴿﴾ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ ؕ وَاللّٰہُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿﴾ قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِھَادُ ﴿﴾ قَدْ کَانَ لَکُمْ اٰیَۃٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ یَّرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿﴾

ترجمہ:

بلاشبہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، انھیں، اللہ (کے عذاب) سے نہ ان کی دولتیں اور نہ ان کی اولاد بچا سکے گی اور وہ لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے (۱۰) ان کا رویہ آلِ فرعون اور ان سے پہلے والوں کا ہے۔ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو گرفت میں لے لیا۔ اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (۱۱) آپ کفر اختیار کرنے والوں سے کہہ دیں، تم لوگ جلد ہی مغلوب ہوگے اور جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور برا ٹھکانا ہے (جہنم) (۱۲) تمہارے لیے دو ٹکر لینے والے گروہوں میں ایک نشان تھا۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا، اور دوسری جمعیت کافروں کی۔ جن کو مسلمان دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ، اپنی فتح سے جس کی چاہتا ہے کمک فرماتا ہے۔ آنکھ والوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے (۱۳)

تفسیر:

۱۰۔ ان الـذین کفـروا لن تغنی عنہم . . . .

مسلمانوں کو اپنے عقیدے پر استوار اور تعلیمات اسلامی پر ثابت قدم رہنا چاہیے۔ اسلام دشمن اپنی فکری کجی اور غلط روی کی بنا پر اقتصادی اور افرادی قوت کے باوجود اللہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے آئندہ مسلمانوں کے ایمان اور جذبے سے شکست کھائیں گے اور قیامت کے دن جہنم کا ایندھن ہوں گے یہ نصاریٰ بدر کے معرکے ہی سے سبق سیکھ لیں۔

۱۱۔ کـدأب آل فرعـون والـذین من قبـلہم . . . .

فرعون اور اس کی نسل، اس قبیلے کے لوگ اور ان سے پہلے کے آمر و جابر، دولت و قوت میں مست ہو کر اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے اور دین داروں کو ٹھکرانے لگے۔ آخر اللہ نے انھیں گرفت میں جکڑا اور سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا۔ تو کسی کو دولت، خاندان، نسل اور کثرت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے اور باعقیدہ افراد کو ان سے نہ ڈرنا چاہیئے۔

۱۲۔ قـل للـذین کفـروا ستغلبون . . . .

قرآن، منکرین اسلام کو تنبیہ کرتا ہے کہ مسلمانوں سے ٹکر لینے کا برا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ دنیا میں شکست اور آخرت میں جہنم ان کا مقدر ہے اور مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ غالب ہو کے رہیں گے

مفسرین کہتے ہیں کہ بعد جنگ بدر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قینقاع کے یہودیوں کو جمع کر کے دعوت اسلام دی۔ انہوں نے کہا: ہم قریش نہیں جو اتنی آسانی سے ہار مان لیں وقت آئے تو دیکھ لینا۔ اس پر آیت اتری۔

غزوۂ بدر کا حوالہ

۱۳۔ قد کان لکم آیۃ فی فئتین . . .

بے سروسامان مہاجر گنتی میں ستتر اور دو سو چھتیس انصار۔ ان کے پاس ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں۔ آٹھ تلواریں، محاذ کی سربراہی حضرت رسالت مآبؐ خود فرما رہے تھے، ان کے ساتھ مہاجرین کی رجمنٹ کا پرچم حضرت علیؑ کے ہاتھ میں اور انصار کی رجمنٹ سعد بن عبادہ کے ماتحت۔ خدا کا معجزہ کہ نہ رسول اللہؐ کبھی لڑے تھے نہ علیؑ کی عمر اور ایسا کوئی تجربہ تھا، نہ مسلمانوں کی تعداد و فوجی حالت مضبوط تھی، مگر ان کی جنگی تکنیک یہ رہی کہ ایک مسلمان دو مشرکوں کے برابر مانا جائے اور خدا و رسول پر مکمل اعتماد و توکل رہے۔ نتیجہ میں فتح ہوئی۔

ابوسفیان، ایک ہزار فوجی، سو گھوڑے سوار۔ اس کے علاوہ بہت سے اونٹ اور بہت سا اسلحہ اور مکمل رسد کا سامان لے کر آیا۔ عالم ہی کچھ اور تھا۔ مسلمان ان کی نفری، سرداروں کی شہرت و تجربہ کاری اور سیاسی و اقتصادی مضبوطی کو نظر انداز کر کے، اللہ پر بھروسہ کیے ہوئے آگے بڑھے اور یادگار شکست دے کر پلٹے۔ قرآن نے اس جنگ اور فتح کو "معجزہ" اور آئندہ کے لیے "سمبل" قرار دے کر اللہ کی مدد اور فتح و نصرت کی نوید دی۔ شرط ہے۔ ایمان میں پختگی اور نتائج پر نظر۔

زُيِّنَ

لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ

وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ
الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ: لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے فریفتہ کر لیا، (جیسے) عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے جمع کیے ہوئے ذخیرے، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی۔ یہ تو زندگانی دنیا کا (وقتی) فائدہ ہے۔ جبکہ اچھی منزل تو اللہ کے یہاں ہے (۱۴) (آپ ان سرمایہ پرستوں سے) کہیئے، کیا میں تم کو ان چیزوں سے بہتر چیز بتا دوں؟ تقویٰ رکھنے والے لوگوں کے لیے، اللہ کی بارگاہ میں باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اللہ کی خوشنودی ہوگی اور اللہ بندوں پر نظر رکھتا ہے۔ (۱۵)

تفسیر:

۱۴۔ زین للناس حب الشہوات ....

اللہ نے انسانی فطرت میں عواطف اور آرام طلبی کے احساس و میلانات ودیعت کئے ہیں، وہ عورت، اولاد، سواری، مویشی، زمین، باغ اور دولت سے محبت کرتا ہے انھیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسلام نے اس رجحان کو معتدل رکھنے کا انتظام کیا۔ جو اللہ کو نہیں مانتے اور دین پر ایمان نہیں رکھتے، ان پر شیطان غالب آجاتا ہے اور چند روز کی آسائشوں کو آخرت کی آسودگی و راحت جاوداں پر ترجیح دلا کر گمراہ کر دیتا ہے یہ لوگ معاشرے کو تباہ کر دیتے ہیں۔

۱۵۔ قل اؤنبئکم بخیر من ذالکم ....

عیش پرستی اور سرمایہ داری سے بہتر آخرت کے انعامات اور رضائے باری تعالیٰ سے دل لگانا ہے۔ متقی لوگ جو عقل دنیا اور عقل دین دونوں رکھتے ہیں۔ صرف دنیا کے نہیں ہو جاتے۔ انھیں یقین ہے کہ اللہ، اپنے بندوں کے معاملات پر نظر رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو راستے سے زیادہ اہمیت نہ دینا چاہیے۔ اصل منزل آخرت ہے اور اللہ دلوں کا حال، نیتوں کا خلوص خوب جانتا ہے۔ اس لئے فطرت بلند رکھو اور فکری اور عملی لغزشوں سے بچتے رہو۔

اَلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ۝

ترجمہ:

جو کہتے ہیں — اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا (۱۶) وہ صبر (وتحمل) کرنے والے ہیں اور سچے اور اطاعت گذار اور خرچ کرنے والے اور رات کے پچھلے پہروں میں استغفار کرنے والے ہیں۔ (۱۷)

تفسیر:

۱۶۔ الذین یقولون ربنا اننا امنا ....

چند روزہ متاعِ دنیا پر گرویدہ ہونے والوں کے مقابلے میں ایسے مومن بھی ہیں جو تقویٰ اور اصلاحِ ذات کو بنیادی مرتبہ دیتے ہیں وہ لوگ اپنی مغفرت و نجاتِ عذاب کے بارے میں سوچتے اور خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔

۱۷۔ الصّٰبِرِينَ وَالصّٰدِقِينَ ....

یہ لوگ ایمان کی راہ میں پیش آنے والے فکری و عملی معرکوں میں ثابت قدم، متحمل اور راست باز رہتے ہیں۔ اللہ کی بات مانتے، غلط خواہشات کو ٹھکراتے، دولت سے محبت کو دور رکھ کر اسے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ یہ لوگ پچھلے پہر جب سب میٹھی نیند سوتے ہیں، اللہ کو پکارتے اور اس سے توبہ کرتے ہیں۔

کتنی ہمت آفریں تعریف ہے بندے کی، اللہ کی زبانی اور کس قدر اعزاز ہے مومن کا جو اللہ عزاسمہ اپنی رحمت و پسند سے نواز رہا ہے۔

جنّت کے خزانے

قال علی علیہ السلام:

من کنوز الجنۃ البر و اخفاء العمل و الصبر علی الرزایا وکتمان المصائب۔ {تحف العقول ص ۲۱۸}

نیکیاں کرنا، اپنے عمل خیر کو چھپانا، بلاؤں پر صبر کرنا اور مصائب و آلام کو زبان پر نہ لانا، دراصل جنت کے خزانے ہیں۔

جناب محمد تقی مصباح
ترجمہ جناب سید علی الحسن رضوی

معارف قرآن
ایک تعارف

(۲)

۱۸۔ فرقان :

سورۂ فرقان کی پہلی آیت میں قرآن، صاحب قرآن اور خالق قرآن کا ان الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے۔
تبارك الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیراً اس کے علاوہ سورۂ بقرہ کی آیت: ۱۸۵ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۳ میں بھی بظاہر الفرقان سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔

۱۹۔ ۲۰۔ تفصیل و مفصل

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے :
"... وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلاً" (آیت /۱۱۴)
سورہ یونس میں فرماتا ہے :
"... ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب ..." (آیت/۳۷)
اسی طرح سورۂ یوسف میں ارشاد ہے :
"... ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شئی ..." (آیت/۱۱۱)
توضیح : فرقان کا مادہ "فرق" اور "تفصیل و مفصل" کا مادہ "فصل" ہے اور یہ دونوں مادہ "جدا کرنے" یا

"تمیز پیدا کرنے" کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ "فرقان" مصدر یا اسم مصدر ہے اور اس معنی پر بھر پور دلالت کرتا ہے چنانچہ "تفصیل" باب تفعیل سے ہونے کی بنا پر کثرت پر دلالت کرتا ہے۔

"جدا کرنا" کبھی امور حسی سے تعلق رکھتا ہے اور دو چیزوں کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے پر دلالت کرتا ہے کبھی امور اعتباری سے اس کا تعلق ہوتا ہے جیسے عدالت و قضاوت کا مسئلہ اور کبھی امور معنوی میں بولا جاتا ہے جیسے حق کا باطل سے جدا کرنا۔

سورۂ اسراء میں لفظ فرق کی تعبیر اس کے معنائے حسی میں قرآن کے متعلق یوں وارد ہوئی ہے:۔

وقرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علیٰ مکث ونزلناہ تنزیلا (آیت/۱۰۶)

یہاں قرآن کے تدریجی نزول یعنی اس کی آیتوں کے درمیان زمانہ نزول میں فاصلہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

لفظ "فرقان" بھی اگرچہ ممکن ہے اسم مفعول کے طور پر آیات کے تفرق و تدرج کی مناسبت سے قرآن کے سلسلہ میں وارد ہوا ہو پھر بھی بظاہر جہاں جہاں بھی قرآن (یا تورات) کے سلسلہ میں اس کا استعمال ہوا ہے اسم فاعل کے طور پر حق و باطل میں تمیز پیدا کرنے کے لحاظ سے ہوا ہے اور اسی طرح لفظ "فصل" کا بھی سورہ طارق میں استعمال ہوا ہے:

"انہ لقول فصل" (آیت/۱۳) اس کا بعد میں قرآن کے ذیلی اوصاف کے عنوان کے تحت ذکر کیا جائیگا۔

"تفصیل" "مفصل" کا قرآن پر اطلاق گرہ کشائی کرنے یا مطالب کی وضاحت کرنے کے معنوں میں ہوا ہے اور یہ تقریباً لفظ تبیین کا مرادف و ہم معنی ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ مختلف آیات کے ذیل میں کبھی لفظ تبیین اور کبھی لفظ تفصیل کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"... قد بینا الآیات لقوم یوقنون" (آیت/۱۱۸)

جبکہ سورۂ انعام میں خدا فرماتا ہے:

"... قد فصلنا الآیات لقوم یعلمون" اس کی بنیاد پر تفصیل کل شئی بھی "تبیاناً لکل شئی" کے مانند قرار پائے گا۔

۲۱۔ نور

سورہ نساء میں ارشاد ہے:

وانزلنا الیکم نوراً مبیناً (آیت/ ۱۷۴)

اور سورۂ مائدہ میں اعلان ہوتا ہے :۔

... قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین (آیت/ ۱۵)

اور سورۂ اعراف میں خدا حکم دیتا ہے :۔

" .... واتبعوا النور الذی انزل معہ .... (آیت/ ۱۵۷)

اسی طرح سورہ تغابن میں قرآن کہتا ہے ، فآمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا... (آیت ۸)

اور ان تمام موارد میں "نور" سے مراد قرآن ہے۔

اس کے علاوہ بھی چند اور موارد ہیں جہاں "نور" سے مراد غالباً قرآن کو ہی لیا گیا ہے مثال کے طور پر سورۂ توبہ کی ۳۲ ویں آیت ، سورہ صف کی ۸ ویں آیت اور سورۂ نور کی ۳۵ ویں آیت ملاحظہ فرمائیں

بظاہر قرآن پر لفظ نور کا اطلاق اس مناسبت کے تحت ہے کہ یہ انسان کے لئے خوش بختی وسعادت کی راہ روشن کرتا ہے اور حقائق عالم سے باخبر بنا دیتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کو اس کی حقیقت متعالیہ کے تحت نور کہا گیا ہو کیونکہ اس کا سرچشمہ ایک ناپیدا کنار نور حقیقت یعنی خداوند وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے چنانچہ اگر سورۂ نور کی آیت : مثل نورہ ..... " میں نور سے مراد قرآن کو ہی تسلیم کر لیا جائے تو دوسری توجیہ شاید زیادہ مناسب قرار پائے۔

۲۲۔ بصائر۔

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے :۔

قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا (آیت/ ۱۰۴)

سورۂ اعراف میں خدا فرماتا ہے :۔

"ھذا بصائر من ربکم ..." (آیت/ ۲۰۳)

سورۂ جاثیہ میں اعلان ہوتا ہے : "ھذا بصائر للناس ..." (آیت/ ۲۰)

توضیح :-

"بصائر" بصیرت کی جمع ہے جس کے معنی عقل و دانائی اور زیرکی کے ہیں نیز ایسی چیزیں جو دل و دماغ کی بیداری کی باعث بنتی ہیں جیسے دلیل و حجت یا نصیحت و عبرت وغیرہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے قرآنی آیات انسان کے لئے یہ ممکن بنا دیتی ہیں کہ وہ راہ مستقیم کو دیکھ سکے اور خطرناک گذرگاہوں سے بھی خبردار ہو جائے، یہ آیات چشم دل کو بینائی عطا کرتی ہیں تاکہ انسان حقائق کا نور باطنی کے ذریعہ مشاہدہ کر سکے۔ پھر بھی اگر کوئی اپنی آنکھوں پر بغض و عناد کی پٹیاں باندھ کر خود کو اندھا بنالے اور ان سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو اس کا نتیجہ بھی الٹا ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ انعام کی اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

" فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها"

"ابصار" (جمع بصر بہ معنی آنکھ) اور "بصائر" میں جو مناسبت پائی جاتی ہے روشن ہے۔ اسکی وضاحت سورہ فصلت کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے : ... والذین لا یومنون فی اٰذانهم وقر وهو علیهم عمیً ... (آیت/۴۴)

۲۳۔ هدیٰ۔

سورۂ جاثیہ کی گیارہویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے :-

" هٰذا هدیً ... "

سورۂ بقرہ میں اعلان ہوتا ہے :-

" هدیً للناس ... " (آیت/۱۸۵)

سورۂ انعام میں خدا فرماتا ہے :-

.. فقد جاءکم بینة من ربکم وهدی ... " (آیت/۱۵۷)

سورہ انعام میں دوسری جگہ اعلان ہے :-

" ذلك هدی الله یهدی به من یشاء من عباده ... " (آیت/۸۸)

یہی الفاظ سورہ زمر میں بھی وارد ہوتے ہیں : (آیت/۲۳)

سورۂ جن میں ارشاد ہے:

"وانا لما سمعنا الھدیٰ اٰمنا بہ" (آیت/۱۳)

قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیتیں پائی جاتی ہیں جن میں قرآن کو لفظ ہدیٰ سے توصیف کرتے ہوئے ایسے مخصوص افراد اور گروہ کی نشان دہی کی گئی ہے جو قرآنی ہدایات سے فیضیاب ہوتے ہیں اور اس کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ:۔

(الف) "متقین" کا سورۂ بقرہ/۲، آل عمران/۱۳۸ اور مائدہ/۴۶ میں ذکر ہے۔

(ب) "اھل ایمان" کا سورۂ بقرہ/۹۷، یونس/۵۷، نمل/۲ و ۷۷، فصلت/۴۴، اعراف/۵۲ و ۲۰۳، یوسف/۱۱۱ اور سورہ نحل/۶۴ میں ذکر ملتا ہے۔

(ج) "اھل یقین" کی لفظ سورۂ جاثیہ میں وارد ہوئی ہے (آیت/۲۰)

(د) "محسنین" کی لفظ سورۂ لقمان میں آئی ہے۔ (آیت/۳)

(ہ) "مسلمین" کی لفظ سورہ نحل میں دو مقامات پر استعمال ہوتی ہے (آیت/۸۹ و ۱۰۲)

مندرجہ ذیل موارد میں بھی اس بات کا احتمال پایا جاتا ہے کہ "الھدیٰ" سے مراد قرآن مجید ہی ہو سورہ نساء/۱۱۵، اعراف/۱۹۳، ۱۹۸، توبہ/۳۳، فتح/۲۸، صف/۹، کہف/۵۵، قصص/۵۷، سبا/۳۲، محمدؐ/۲۵، ۳۲ اور سورہ نجم/۲۳۔

توضیح:

قرآن کریم کی یہ خصوصیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان ایک مخصوص ہدف و مقصد کی طرف گامزن ہے اور اس راہ کو مشخص و معین کرنے کے لئے جو اسے اس کے مقصد تک پہونچا سکے ایک رہنما کا محتاج ہے اور یہ کام قرآن کے سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کا سوال ہے کہ انسان کا منتہائے مقصد کیا ہے؟ اور اس کے لئے کون سی راہ صحیح ہے؟ نیز یہ کہ قرآن کس طرح بشریت کی رہنمائی کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر آیندہ مقالات میں انشاء اللہ۔۔۔ بحث کی جائیگی۔

۲۴۔ ذکر

آٹھ مقامات پر کلمۂ "الذکر" قرآن کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے:۔

سورۂ حجر ۶/ و ۹، نحل /۴۴، یٰس /۱۱، ص /۸، فصلت /۴۱، قمر /۲۵ اور سورۂ قلم /۵۱ اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے :-

ذالك نتلوه عليك من الآيات والذكر الحكيم (آیت/۵۸)

تین دیگر مقامات پر بھی لفظ "الذکر" سے مراد غالباً قرآن ہی ہے۔ سورۂ فرقان /۱۸ و ۲۹ اور سورہ زخرف کی آیت /۵ ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح چار مقامات پر لفظ "ذکر" بغیر الف و لام کے، قرآن کے سلسلہ میں آیا ہے :-

سورۂ یٰس /۶۹، ص /۴۹، طٰہٰ /۹۹ اور سورۂ طلاق /۱۰۔ غالباً سورہ صافات کی تیسری اور سورۂ مرسلات کی پانچویں آیت میں بھی ذکر سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے :-

"وهٰذا ذكر مبارك انزلناه ..." (آیت/۵۰)

سورۂ یوسفؑ میں خدا فرماتا ہے :-

"ان هو الا ذكر للعالمين" (آیت/۱۰۴)

اور یہی الفاظ سورۂ تکویر میں بھی وارد ہوئے ہیں: آیت /۲۷

اور سورۂ قلم میں ارشاد ہے :

"وما هو الا ذكر للعالمين" (آیت/۵۲)

اسی طرح سورۂ زخرف میں اعلان ہوتا ہے :-

"وانه لذكر لك ولقومك ..." (آیت /۴۴)

سورہ انبیاء میں یہ الفاظ ہیں :-

هٰذا ذكر من معي و ذكر من قبلي ... (آیت/۲۴)

اور سورۂ ص میں یوں وارد ہوا ہے :-

بل هم في شك من ذكري ..." (آیت/۸)

اور غالباً سورہ کہف کی آیت ۱۰۱، طٰہٰ کی آیت /۱۲۴ اور مومنون کی آیت /۱۱۰ میں بھی لفظ ذکری قرآن کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اسی طرح سورۂ انبیاء میں "ذکر ربھم" (آیت /۴۲)، سورۂ زخرف میں

"ذکر الرحمٰن" (آیت/۳۶)، سورۂ کہف میں (آیت/۲۸) اور سورۂ نجم (آیت/۲۹) میں "ذکرنا" نیز سورۂ مومنون میں مکرر طور پر "ذکرھم" سے مراد بھی شاید قرآن ہی ہے۔ سورۂ انبیاء میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"لقد انزلنا الیکم کتاباً فیہ ذکرکم .... (آیت/۱۰)

اور سورہ ص کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:-

"ص والقرآن ذی الذکر"

۲۵- ذکریٰ

سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:-

"ان ھو الا ذکریٰ للعالمین" (آیت/۹۰)

سورۂ اعراف میں اعلان ہوتا ہے:-

"وذکریٰ للمؤمنین" (آیت/۲)

سورۂ ھود میں ارشاد ہے:-

"وجاءک فی ھٰذہ الحق وموعظۃ وذکریٰ للمومنین" (آیت/۱۲۰)

اور عنکبوت میں خدا فرماتا ہے:-

ان فی ذلک لرحمۃ وذکریٰ لقوم یومنون" (آیت/۵۱)

۲۶- تذکرۃ

سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:-

"الا تذکرۃ لمن یخشیٰ" (آیت/۳)

سورہ الحاقۃ میں اعلان ہوتا ہے:-

"وانہ لتذکرۃ للمتقین" (آیت/۴۸)

سورۂ مزمل کی ۱۹ویں اور سورۂ دہر کی ۲۹ویں آیت کے یہ الفاظ ہیں:-

ان ھٰذہٖ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلاً۔

سورہ مدثر میں قرآن کہتا ہے:۔
"کلا انہ تذکرۃ" (آیت/۵۴)
جبکہ سورۂ عبس میں یوں ارشاد ہوتا ہے:۔
"کلا انھا تذکرۃ" (آیت/۱۱)

توضیح:

ذکر "یاد کرنے" اور یاد رکھنے کے معنی میں آیا ہے۔ کسی کا نام زبان پر جاری کرنے یا اس کے بارہ میں کوئی بات کہنے کو بھی ذکر کہتے ہیں (کیونکہ کسی کی یاد میں شدت پیدا ہو جانا ہی دوسروں کے یاد کرنے کا سبب ہوتا ہے) شہرت و عزت کے معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور اسی طرح کوئی چیز جو یاد آوری کا سبب بنے یا جس سے عبرت و نصیحت حاصل کی جائے اس کے لئے بھی اس کو استعمال کرتے ہیں۔ ذکریٰ اور تذکرہ بھی اسی مادہ سے ہے جس کے معنی یادگار اور یاد آوری کے ہیں۔

قرآن پر لفظ ذکر کا اطلاق یا تو اس مناسبت کے تحت ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی یاد دلاتا ہے یا یہ کہ یاد رکھی جانے والی سبھی چیزوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یا اس کے اندر نقل کی جانے والی گذشتہ داستانوں، عبرت آمیز نصیحتوں اور حکایتوں کی یاد آوری کی بنا پر ہے اور اگر اس کو غفلت کے بالمقابل تصور کریں اور ان آیتوں پر نظر ڈالیں جن میں تمام لاپرواہی اور شقاوت کا سبب غفلت کو قرار دیا گیا ہے مثال کے طور پر یہ آیت جس میں خدا فرماتا ہے:۔

اولئٰک کالانعام بل ھم اضل اولئٰک ھم الغافلون (اعراف: ۷/۱۷۹) تو قرآن کریم کو اس خصوصیت سے متصف کئے جانے کی اہمیت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔

مزید یہ کہ انسان اپنی ابتدائی زندگی میں حیوانات کی طرح نفسانی خواہشات و میلانات کا تابع ہوتا ہے اور اپنی تمام تر کوششیں ان ہی کے حصول پر صرف کرتا ہے چنانچہ عام افراد اپنی پیدائش کے راز اور زندگی

کے آخری مقصد پر غور نہیں کرتے فطری ادراکات بھی مبہم ہوتے ہیں۔ اس طرح کی حالت و کیفیت کی تعبیر لفظ غفلت سے کی جاتی ہے۔ پیغمبروں کی آمد اور آسمانی کتابوں کے نزول کا اولیں مقصد انسانوں کو اسی حالت و کیفیت سے باہر نکال کر غور و فکر کے دریچے کھولنا نیز عقل و شعور سے مالامال کر کے انھیں آگاہ و بیدار بنانا ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں :-

لیستأدوھم میثاق فطرتہ ویذکرھم منسی نعمتہ۔

یعنی خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ وہ الٰہی عہدو پیمان جو ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے ان سے طلب کریں اور وہ نعمت (توحید) جس کو وہ فراموش کر چکے ہیں انھیں یاد دلائیں (نہج البلاغہ فیض خطبہ نمبر۱)

دوسرے لفظوں میں انبیاء انسان کو دائرہ حیوانیت سے نکال کر عالم بشریت میں داخل کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرآن کو اسی مناسبت کے تحت "ذکر" قرار دیا گیا ہے :-

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر (سورۂ قمر ۵۴/۱۷)

ہم نے تو قرآن عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

۲۷۔ موعظ

سورۂ آل عمران کی ۱۳۸ ویں آیت، سورہ مائدہ کی ۴۶ ویں آیت اور سورۂ نور کی ۳۴ ویں آیت میں قرآن کریم کا ان الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے :-

"۔۔۔۔ وموعظۃ للمتقین "

سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے :-

یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم ۔۔۔" (آیت/۵۷)

اور سورۂ ہود میں اعلان ہوا :-

وجاءک فی ھذہ الحق وموعظۃ وذکری للمومنین (آیت/۱۲۰)

توضیح :

"موعظۃ" وعظ کا اسم مصدر ہے اس کے معنی پند و نصیحت کے ہیں قابل عبرت واقعہ پر بھی اس کا

اطلاق ہوتا ہے مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے :۔

فجعلناها نكالاً لما بين يديها وما خلفها وموعظة للمتقين (آیت/٦٦)

موعظ اصل میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے دل کو رقیق و نرم بنا دے اور اپنی طرف مایل کر کے حق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دے بغاوت و سرکشی اور کبر و گناہ سے نجات دلا دے چنانچہ نہ صرف اپنے مطلب و مقصد کو سمجھا دینے بلکہ مخاطب کے دل کو نرم اور رام کر دینے کا نام موعظ ہے گویا دوسرے لفظوں میں اسکا تعلق عقل سے کم دل سے زیادہ ہوتا ہے۔

۲۸، ۲۹ و ۳۰ بشیر و بشریٰ و نذیر۔

سورہ فصلت کی چوتھی آیت میں خدا فرماتا ہے :۔

بشيراً ونذيراً فاعرض اكثرهم فهم لا يسمعون۔

اور غالباً سورۂ فرقان کی پہلی سورہ نجم کی ۵۶ ویں اور سورۂ مدثر کی ۳۶ ویں آیتوں میں بھی "نذیر" سے مراد قرآن کریم ہی ہے۔ سورۂ بقرہ/ ۹۷، سورہ نحل ۸۹ و ۱۰۲ اور سورہ احقاف/ ۱۲ میں قرآن کریم کی لفظ "بشریٰ" سے توصیف کی گئی ہے۔ جبکہ سورہ مرسلات میں ارشاد ہوتا ہے :۔

فالملقيات ذكراً عذراً اونذراً (آیت/٦)

توضیح :

"بشریٰ" بھی بشارت کی طرح مژدہ و خوش خبری یا خبر مسرت کے معنوں میں آتا ہے۔ اس طرح کی خبر پہونچانے والے کو "بشیر" کہتے ہیں۔

"انذار" ڈرانے یا ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس کے خوف سے انسان اس عمل سے پرہیز اختیار کرتا ہے۔

"نذیر" بھی "انذار" کا ہم معنی ہے منذر اور خوف دلانے والے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق متعلق انذار پر بھی ہوتا ہے۔

قرآن پر بشیر و نذیر کا اطلاق اسی مناسبت کے تحت کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر صاحبان ایمان

اور خدا کے مطیع و فرمانبردار بندوں کو شادمانی عطا کرنے نیز اہل کفر و نفاق اور گناہ گار افراد کو خوف میں مبتلا کر دینے والی خبریں بیان کی گئی ہیں۔ قرآن کریم کو ان اوصاف سے متصف کئے جانے کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کی تمام ترفعالیت کا دارومدار خوف اور امید پر ہی ہوا کرتا ہے، حق و باطل کے درمیان امتیاز کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا ہی اس کی عملی تحریک کو بیدار کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ البتہ خوف کی بنیاد کبھی محض مادی دنیا کے وقتی رنج و آلام ہوتے ہیں اور کبھی دائمی عذاب اور ابدی گرفتاری کے پیش نظر خوف طاری ہوتا ہے۔ نیز کبھی محبوب حقیقی کے وصال سے محرومی بھی اس کا باعث قرار پاتی ہے۔ اسی طرح امید کی آماجگاہ کبھی دنیوی آسائش و منفعت، کبھی آخرت کی جاودانی نعمتیں اور کبھی قرب الٰہی کا لذت بخش تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ افراد جو آخرت اور ابدی دنیا پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کا خوف مادی محرومیوں اور انکی امید دنیوی فوائد تک محدود ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں ایک طرف وہ کمزور اور متوسط درجہ کے مومنین ہیں جو عذاب جہنم سے خوف زدہ اور بہشت بریں کی نعمتوں سے اپنی ساری امیدیں وابستہ رکھتے ہیں لیکن دوسری طرف کچھ ایسے اعلیٰ اور کامل الایمان مومنین بھی ہیں جو محض خدا سے دوری کے خیال سے خوف زدہ رہتے ہیں اور خوشنودی و قرب الٰہی کے شوق میں اسی سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان میں سے ہر طبقہ کے اعتبار سے ہر عنوان کی بشارت و انذار موجود ہے اس لحاظ سے قرآن انسانی تربیت کیلئے ایک جامع اور مکمل ترین دستور حیات کا حامل ہے جسمیں مختلف معیار و فکر اور استعداد و صلاحیت کے افراد کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ ہر ایک کو اس کی استعداد اور سمجھ کے مطابق بیانات کے ذریعہ راہ کمال و سعادت کی طرف کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۱۳۔ شفاء

قرآن مجید کے سلسلہ میں کلمۂ "شفاء" تین مقامات پر نکرہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

سورہ یونس میں خدا فرماتا ہے:۔

" قد جاءتك موعظة من ربكم وشفاء لما في الصدور ..." (آیت/۵۷)

سورۂ اسراء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين ...." (آیت/۸۲)

سورۂ فصلت میں اعلان ہوتا ہے :-

"..... قل ھو للذین آمنوا ھدیً وشفاء ..." (آیت/۴۴)

توضیح :

"شفاء" (بکسر شین) مصدر ہے جس کے معنی بیماری سے "نجات عطا کرنے" اور "علاج کرنے" کے ہیں۔ یہ بطور اسم مصدر یعنی علاج اور بہبودی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے نیز دواؤں یا صحت عطا کرنے والی دوسری چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

قرآن کریم پر لفظ شفا کا اطلاق اسی تیسرے مفہوم میں، یعنی انسان کو معنوی بیماریوں سے نجات دینے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ یونس کی مذکورہ آیت/۵۷ میں تصریح کی گئی ہے البتہ بعد کی دونوں آیتوں میں مومنین سے اس کی تخصیص قرآن کی تاثیر فعلی کے تحت ہے گویا یہ ویسے ہی ہے جیسے قرآن کی بعض آیتوں میں قرآنی ہدایات کو "متقین" "محسنین" وغیرہ سے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے قرآن کریم کا انسان کو معنوی امراض سے شفا عطا کرنے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ قرآنی آیات کے ذریعہ انسان کے جسمانی امراض سے صحت یاب ہونے کے ہم منکر ہیں۔ چنانچہ اگر روایات صحیحہ سے قرآن کے اندر جسمانی صحت عطا کرنے کی تاثیر کا پتہ چلتا ہے تو ان روایات کی بنیاد مذکورہ آیت کے ظاہر معنی میں عمومیت (یعنی جسمانی و معنوی ہر دو) ثابت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ممکن ہے جسمانی صحت کے ثبوت کے لئے ائمہ نے آیت کے بطن معنی یا کسی دوسرے طریقہ کا استعمال کیا ہو۔

ضروری گذارش :-

مذکورہ بالا تعبیرات کے علاوہ بھی قرآن کے سلسلہ میں دوسری تعبیریں موجود ہیں جن کا اس عظیم کتاب پر انطباق کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ان کا اس پر صریحی طور پر اطلاق نہیں ہوتا لہٰذا ہم نے ان کو اس فہرست میں مستقل عنوان کی حیثیت سے پیش کرنے سے گریز کیا ہے مثال کے طور پر :-

لفظ "خیر" سورۂ بقرہ میں :

ما یودّ الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزّل علیکم
من خیر من ربکم - (آیت/۱۰۵)

اور سورۂ نحل میں :-

وقیل للذین اتقوا ماذا انزل ربکم قالوا خیراً . . . . " (آیت/۳۰)

لفظ "روح" سورۂ شوریٰ میں :-

وکذالك اوحینا الیك روحاً من امرنا . . . " (آیت : ۵۲)

کلمہ "حبل اللہ" سورہ آل عمران میں :-

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا . . . " (آیت / ۱۰۳)

اور کلمہ "امر اللہ" سورہ طلاق میں :-

ذٰلك امر اللہ انزلہ الیکم . . . (آیت/۵) استعمال ہوا ہے۔

تبعی اوصاف

(۱) علیّ :

یہ تعبیر قرآن کے سلسلہ میں صرف ایک مقام پر استعمال کی گئی ہے۔ سورۂ زخرف میں ارشاد ہوتا ہے :-

"وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلیّ حکیم" (آیت/۴)

توضیح :

"علیّ" علوّ کی صفت مشبہ ہے جس کے معنی بلندی و عظمت کے ہیں اس کا استعمال امور حسّی، اعتباری اور معنوی تینوں میں ہوتا ہے ممکن ہے قرآن کے سلسلہ میں اس کا استعمال اس کے معنائے اعتباری یعنی "بلند مرتبہ" و "شریف" کے طور پر ہوا ہو۔ پھر بھی مذکورہ آیت کے الفاظ اور اس کی شان ظرفیت : "فی ام الکتاب لدینا" کے پیش نظر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ قرآن کے مقام معنوی کے اعتبار سے ہے یعنی اسی آیت میں قرآن کی اصل منزل۔ خدا کے نزدیک لوح محفوظ میں ہونا مراد ہے نہ یہ کہ قرآن کا موجودہ کاغذی صورت میں ہمارے درمیان ہونا مراد لے لیا جائے۔

(۲) حکیم:

لفظ "الحکیم" قرآن مجید کی چار آیتوں میں اس کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے:۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ذالک نتلوہ علیک من الآیات والذکر الحکیم (آیت/۵۸)

سورۂ یونس کی ابتدا:۔

"الر تلک آیات الکتاب الحکیم"

سورۂ لقمان کی ابتداء:۔

"الم تلک آیات الکتاب الحکیم"

سورۂ یٰس کی ابتداء۔

"یٰس والقرآن الحکیم" سے ہوئی ہے۔ جبکہ سورۂ زخرف میں "حکیم" نکرہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم (آیت/۴)

توضیح:

"حکیم" "صاحب حکمت" کے معنی میں ہے اور اس کتاب پر اس لفظ حکیم کا صفت کے طور پر اطلاق کیا جانا، ممکن ہے اس کتاب میں پائے جانے والے معارف یقینیہ (حکمت نظری) کی وجہ سے ہو یا اس کے حکیمانہ دستور و قوانین (حکمت عملی) کی مناسبت سے ہو یا ممکن ہے اس کے دونوں رخ پیش نظر رکھے گئے ہوں۔
اور بعض آیتوں میں "الکتاب" پر عطف کرتے ہوئے جو کلمہ "الحکمۃ" استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد بظاہر اسی کتاب میں ذکر شدہ حکمت آمیز باتیں ہیں ان کو ذکر عام کے بعد ذکر خاص کی نوعیت حاصل ہے بلکہ اس کی تعبیر زیادہ دقیق تر انداز میں ذکر جز بعد از کل کے طور پر کی جا سکتی ہے۔ (اور اگر یہ بات کہی جائے کہ ان آیتوں میں "الکتاب" سے مخصوص قوانین یا حکمت کی باتوں کے علاوہ دیگر تمام اجزائے کتاب مراد ہیں تو اس صورت میں عطف بین متباینین لازم آئے گا۔

پیغمبر اکرمؐ کے سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی ۱۲۹ ویں آیت سورۂ آل عمران کی ۱۶۴ ویں آیت اور

سورۂ جمعہ کی دوسری آیت میں اعلان ہوتا ہے :-

"... ویعلمهم الکتاب والحکمة ..."

سورۂ بقرہ میں ہی دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے :-

"..... ویعلمکم الکتاب والحکمة ... " (آیت/۱۵۱)

اور سورۂ بقرہ میں ہی مسلمانوں سے اس طرح خطاب ہوتا ہے :-

"... . وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة ..." (آیت/۲۳۱)

سورۂ احزاب میں ازواج پیغمبر اسلامؐ سے ان الفاظ میں خطاب کیا گیا ہے :-

"واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمة ..." (آیت/۳۴)

اور سورہ قمر میں یوں اعلان ہوتا ہے :-

"ولقد جاءهم من الانباء ما فیه مزدجر - حکمة بالغة فما تغن النذر" (آیت/۵)

جناب عیسیٰؑ کے بارہ میں سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے :-

"ویعلمه الکتاب والحکمة والتوریة والانجیل -" (آیت/۴۸)

سورہ مائدہ میں خدا فرماتا ہے :-

واذ علمتك الکتاب الحکمة ... ." (آیت/۱۱۰)

ان آیات میں حکمت سے مراد خود اس کتاب کے ہی اجزاء ہیں اس کی تائید سورۂ اسراء کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں پروردگار عالم چند حکیمانہ دستور نافذ کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے :-

"ذالك مما اوحی الیك ربك من الحکمة" (آیت/۳۹)

ساتھ ہی ساتھ اسی آیت سے یہ احتمال بھی ضعیف ہوتا نظر آتا ہے کہ "حکمة" سے مراد مخصوص طور پر "حکمت نظری" کو لیا گیا ہے۔

"حکمت" کے ایک اور معنی بھی محتمل ہیں وہ یہ کہ اس کے معنی "محکم" یعنی یقینی اور ناقابل تردید و نقض مراد لے لیا جائے جیسا کہ سورۂ ہود کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے :... کتاب احکمت آیاته"

یہاں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ممکن ہے آخری آیت سے قرآن کے اس دنیا میں نازل ہونے سے قبل اس کا وجود بسیط مراد ہو۔

چنانچہ لفظ حکیم کے سلسلہ میں تمام احتمالات تین احتمال پر منتج ہوتے ہیں۔
(۱) حکیم یعنی صاحب حکمت (۲) حکیم یعنی محکم و تعینی (۳) حکیم یعنی قرآن کی حقیقت بسیطہ کی طرف ایک اشارہ۔ اور یہ آخری احتمال سورۂ زخرف کی چوتھی آیت میں اس کی شان ظرفیت (فی ام الکتاب) اور (لدینا) کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ روشن و واضح ہے۔
چند دیگر احتمالات بھی اس سلسلہ میں پیش کئے گئے ہیں لیکن وہ کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہیں من جملہ ان کے یہ کہا جاتا ہے کہ لفظ حکیم سے ـــ حق و باطل، حلال و حرام یا بہشت و دوزخ کے درمیان مطیع و عاصی کے لئے حاکم ہونا مراد ہے۔
قرآن کریم پر لفظ حکیم کا اطلاق محکم اور یقینی کے معنوں میں کئے جانے کی وجہ اس کتاب کا اختلاف و تناقض سے خالی ہونا یا ناقابل نسخ ہونا یا تغییر و تحریف سے محفوظ ہونا بنایا جاتا ہے۔

(۳) عظیم

یہ لفظ قرآن مجید کی صفت کے عنوان سے صرف ایک مقام پر استعمال ہوا ہے:-
"ولقد آتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم" (سورہ حجرات/۸۷)

توضیح:

"عظیم" صفت مشبہ، بزرگ کے معنی میں ہے۔ اس کا مادہ شاید "عظم" بہ معنائے ہڈی ہو ـــ شروع میں قابل محسوس اشیاء کے لئے لیکن بعد میں اعتباری اور معنوی امور میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے قرآن کی صفت کے طور پر اس لفظ کا استعمال قرآن کی حقیقت کے لحاظ سے جو علم الٰہی کا ایک درجہ ہے۔ واضح ہے اور انسانی ارتقا میں قرآن کی اہمیت کے پیش نظر بھی اسے اس صفت سے متصف کرنا مناسب ہے۔

(۴) "ثقیل"

سنگین اور وزنی کے معنی میں بولا جاتا ہے اور صرف ایک جگہ سورۂ مزمل میں قرآن کی صفت کے

طور پر آیا ہے :-

انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً (آیت/۵)

یہاں بظاہر قرآن کے اس بڑے حصہ کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا اور اس کا سنگین ہونا پیغمبر اسلامؐ کو اس کے پہونچانے کے سلسلہ میں پیش آنے والی سنگینیوں کے تحت ہے ۔

(۵) کریم -

یہ فقرہ بھی قرآن مجید کی صفت کے طور پر صرف ایک جگہ سورۂ واقعہ میں وارد ہوا ہے :-

"انہ لقرآن کریم" (آیت/۷۷)

توضیح :

"کریم" ذی قدر و ذی شرف و ذی وقار کے معنی میں ہے ۔ اس کا محل استعمال بڑی وسعتوں کا حامل ہے ۔ جماد و نبات سے لیکر حیوان و انسان حتی کہ ذات اقدس الٰہی کی صفت کے طور پر بھی بولا جاتا ہے ۔ اس لفظ سے قرآن مجید کی توصیف خدا کی نظر میں اس کی قدر و منزلت نیز انسانوں کے حق میں اس کی بے پناہ خیر و برکت کا پتہ دیتی ہے ۔

(۶) مجید -

دو موقعوں پر یہ لفظ قرآن کی صفت کے طور پر آیا ہے :-

(۱) سورۂ "ق" کی پہلی آیت :-

"ق والقرآن المجید" اور

(۲) سورۂ بروج کی اکیسویں آیت :-

"بل هو قرآن مجید"

غالباً اس کے اصل معنی وسعت کے ہیں خدا کے سلسلہ میں اس کا استعمال اس کی وسیع رحمتوں اور عنایتوں کے تحت ہوتا ہے ۔ اسی طرح قرآن کے سلسلہ میں اس صفت کا استعمال اس کی برکتوں کی وسعت

کے پیشِ نظر ہے۔

(۷) مبارک۔

یہ کلمہ ۴ مقامات پر قرآن کی توصیف میں آیا ہے :۔

۱ و ۲ ۔ سورۂ انعام کی آیت ۹۲ و ۱۵۵ :۔

"وھٰذا کتاب انزلناہ مبارک"

۳. سورۂ ص کی آیت/ ۲۹ :۔

"کتاب انزلناہ الیک مبارک" اور

۴۔ سورۂ انبیاء کی آیت/ ۵۰

"وھٰذا ذکر مبارک انزلناہ"

توضیح :

"مبارک" "بارک" کا اسم مفعول ہے جو فی نفسہ بھی متعدی استعمال ہوا اور "فی" و "علیٰ" کے ذریعہ بھی۔ یہ اشخاص و اشیاء نیز زمان و مکان کے وصف کے طور پر بولا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں آیا ہے۔

وجعلنی مبارکاً (مریم/ ۳۱)

شجرۃ مبارکۃ (نور/ ۳۵)

لیلۃ مبارکۃ (دخان/ ۳)

فی البقعۃ المبارکۃ (قصص/ ۳۰)

اس کے معنی بابرکت کے ہیں اور غالباً برکت کے اصل معنی ثبوت یا ٹھہراؤ کے ہیں۔ چنانچہ "برکہ" ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جاکر جمع ہو جاتا ہے (روانی ٹوٹ کر پانی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے) گویا برکت کے معنی "خیر ثابت" یعنی قائم رہنے والی برکت کے ہیں۔ قرآن کے سلسلہ میں اس لفظ کا استعمال اسی مناسبت کے تحت ہوا ہے کیونکہ قرآن بے شمار خیر و برکت کا مجموعہ و سرچشمہ ہے۔

(۸) عزیز۔

قرآن کی توصیف میں یہ کلمہ صرف ایک جگہ سورۂ فصلت کی اکتالیسویں آیت میں ملتا ہے :۔

"وانہ لکتاب عزیز ۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ"

اور غالبًا یہ لفظ "ارض عزاز" سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی سخت زمین کے ہیں اور یہ لفظ دشوار، طاقتور، غالب اور ناقابل شکست کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں بظاہر یہی آخری معنی مراد ہیں جس کی تائید آیت کے اس ٹکرے لایاتیہ الباطل ... "سے ہوتی ہے۔

۹-۱۰ "قیم و غیر ذی عوج

یہ دونوں صفتیں بھی صرف ایک ایک مقام پر ذکر ہوئی ہیں۔

سورہ کہف میں ارشاد ہوتا ہے :۔۔

ولم یجعل لہ عوجاً ۔ قیماً (آیت/۲) اور

سورۂ زمر میں اعلان ہوتا ہے :۔

قرآناً عربیاً غیر ذی عوج (آیت/۲۸)

اس کے علاوہ سورہ بینۃ کی تیسری آیت میں یہ الفاظ ہیں :۔

فیھا کتب قیمۃ

"قیم" کا مادہ قیام ہے جس کے معنی سیدھے کھڑے ہونا ہیں اور جب کبھی یہ حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو اس کے معنی حفاظت و مراقبت اور برپا کرنے کے ہوتے ہیں۔ کسی بچہ کا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اس کے امور انجام دیتا ہے اور اس کے مفادات کا خیال رکھتا ہے۔ بعض وقت لفظ "قیم" "قیمت" سے اخذ کرتے ہیں اور اس کے معنی "قیمتی" کے آتے ہیں۔ سورۂ کہف کی آیت میں بظاہر اس کے معنی مستقیم اور غیر منحرف کے ہیں اور "اعوجاج" تقریبًا "غیر ذی عوج" کا ہم معنی ہے جس کی ولم یجعل لہ عوجا" سے تائید ہوتی ہے۔

۱۱-۱۲ تصدیق و مصدق

سورۂ یونس کی ۳۸ ویں اور سورۂ یوسف کی ۱۱۱ ویں آیتوں میں اعلان ہوتا ہے :۔

"ولکن تصدیق الذی بین یدیہ ..."

اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے :-

"... مصدق لما معہم (آیت ۸۹)

اور اسی طرح سورۂ انعام میں ہے :-

"مصدق الذی بین یدیہ ..." (آیت/۹۲)

سورۂ احقاف میں خدا فرماتا ہے :-

"وھذا کتاب مصدق" (آیت/۱۱۲)

سورۂ بقرہ کی اکتالیسویں اور سورۂ نساء کی سینتالیسویں آیت میں ہے :-

"مصدقاً لما معکم"

جبکہ سورۂ بقرہ میں ہی ایک جگہ :-

"مصدقاً لما معہم" (آیت/۹۱)

اور ایک جگہ : "مصدقاً لما بین یدیہ" (آیت/۹۷) بھی آیا ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ آل عمران/۳، سورۂ مائدہ/۴۸، سورۂ فاطر/۳۱ اور سورہ احقاف/۳۰ میں بھی مذکورہ آخری آیت کے الفاظ دہرائے گئے ہیں۔

ان تمام موارد میں مقصود یہ ہے کہ قرآن شریف تصدیق کرتا ہے کہ گذشتہ آسمانی کتابیں (توریت و انجیل) خداوند عالم کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ البتہ یہ نکتہ واضح ہے کہ اس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ آج توریت و انجیل کے نام سے جو کتاب موسوم و مرسوم ہے اس کے تمام اندراجات کی بھی تصدیق کرتا ہے

(۱۳) مہیمن

یہ کلمہ قرآن میں صرف ایک جگہ سورۂ مائدہ میں قرآن کی توصیف کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے :-

مصدقاً لما بین یدیہ من الکتاب ومہیمناً علیہ ..." (آیت/۴۸)

یعنی یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں پر تسلط رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب ان کے بعض احکام کو نسخ اور

بعض دوسرے احکام کی تصدیق و تشریح کر سکتی ہے۔

۱۴۔ فصل۔

قرآن کی اس صفت کا صرف سورۂ طارق میں ذکر ملتا ہے:۔

انہ لقول فصل ۔ وما ھو بالھزل (آیت/۱۳) یعنی قرآن ایک ایسا قطعی اور محکم کلام ہے جو حق کو باطل سے جدا کر دیتا ہے اور شک و اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا۔

۱۵۔ مبین۔

یہ کلمہ نکرہ کے طور پر (الف و لام کے بغیر) پانچ مقامات پر قرآن کی توصیف میں استعمال ہوا ہے:

(۱) سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"..... وانزلنا الیکم نوراً مبیناً" (آیت/۱۷۴)

(۲) سورۂ مائدہ میں اعلان ہوتا ہے:۔

"..... قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین" (آیت/۱۵)

(۳) سورۂ حجر میں ارشاد ہوا:۔

"الر تلک آیات الکتاب و قرآن مبین" (آیت/۱)

(۴) سورۂ نمل میں اعلان ہوا:۔

"طس تلک آیات القرآن و کتاب مبین" (آیت/۱)

(۵) سورہ یٰس میں خدا نے فرمایا:

"ان ھو الا ذکر و قرآن مبین" (آیت/۶۹)

اسی طرح پانچ مقامات پر یہ کلمہ معرفہ کے طور پر (الف و لام کے ساتھ) بھی آیا ہے:۔

(۱) سورۂ یوسف: "... تلک آیات الکتاب المبین" (آیت/۱)

(۲) و (۳) یہی الفاظ سورہ شعراء اور سورہ قصص کی دوسری آیت میں بھی وارد ہوئے ہیں۔

(۴) و (۵) سورۂ زخرف اور سورۂ دخان کی دوسری آیت کے الفاظ یوں ہیں:۔

"حٰم و الکتاب المبین"
لفظ "مبین" کی توضیح اور اس کے معانی لفظ "بیان" و "تبیان" کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۶۔ متشابہ۔

یہ کلمہ ایک جگہ پورے قرآن کی تعریف میں آیا ہے :-

"اللہ نزّل احسن الحدیث کتاباً متشابھاً..." (سورہ زمر / ۲۳)

اور ایک جگہ قرآن کے ایک مخصوص حصہ کی تعریف میں اس کے دوسرے حصہ "محکمات" کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے :-

"... منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات... (آل عمران / ۷)

توضیح :

"متشابہ" کا مادہ "شبہ" مثل و مانند کے معنی میں ہے اور چونکہ باب تفاعل میں دو چیزیں ایک دوسرے کے ہم مثل ہونے پر دلالت کرتی ہیں لہٰذا جب بھی کوئی شئی واحد اس سے متصف ہوتی ہے یا تو اس کے اجزاء کی مناسبت سے ایسا ہوتا ہے یا کسی دوسری شئی کو اس کے مقابل مراد لیکر ایسا کرتے ہیں، چنانچہ "متشابہات" (محکمات کے مقابل) ان آیات کو کہتے ہیں جن میں سے ہر ایک آیت ایسے متعدد معانی و مفہوم کی حامل ہوتی ہے جو ان کو ایک دوسرے کے سلسلہ میں مشتبہ بنا دیتے ہیں۔

اس بنیاد پر پورے قرآن کا "متشابہ" قرار دیا جانا تمام آیات قرآنی کا ایک دوسرے کے ہم مثل ہونا ظاہر کرتا ہے البتہ یہ مماثلت یا تو ظاہری اعتبار سے ہے یا معنوی اعتبار سے ظاہری مماثلت تمام آیات کے اندر پائی جانے والی اعجاز کی حد تک بلاغت کی بنا پر ہے اور معنوی مماثلت کی بنیاد پورے قرآن میں مفاہیم کے اعتبار سے کسی طرح کا تضاد اور اختلاف کا نہ پایا جانا بلکہ تمام آیات کا ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مربوط ہونا اور ایک ہی مقصد کی ترجمانی کرنا قرار دیا جا سکتا ہے اور جہاں تک قرآن کی آیات متشابہات کا سوال ہے اس کی تفصیلی بحث انشاء اللہ آیندہ مقالوں میں پیش کی جائے گی۔

۱۷۔ مثانی

سورۂ زمر میں خدا ارشاد فرماتا ہے :-

"... کتاباً متشابہا مثانی ...." (آیت/۲۳) اور

سورۂ حجر میں اعلان ہوتا ہے :-

"ولقد آتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم" (آیت/۸۷)

مفسرین نے اس کلمہ کی وضاحت میں مختلف نظریات پیش کئے ہیں جن میں سے بعض اہم افکار ہم یہاں پیش کر رہے ہیں :-

۱- تثنیہ کے اسم مفعول مُثنّٰی کی جمع (غیر قیاسی) ہے - جو مکرر کے معنی میں آتا ہے اور قرآن کی یہ صفت اس مناسبت کے تحت ہے کہ اس میں نہ صرف مطالب بلکہ بعض آیتیں بھی مکرر طور پر پیش کی گئی ہیں اور دوسری وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بار بار تلاوت کئے جانے کے باوجود اس کے اندر کہنگی اور پرانا پن پیدا نہیں ہوتا -

۲- "مَثْنَی" (میم و نون پر فتحہ کے ساتھ) کی جمع ہے جس کے معنی دو، دو اور جفت کے ہیں اور اس نام میں یہ نکتہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ قرآن میں احکام اور معارف، بشارت اور انذار نیز اس کے موضوعوں اور قصوں کو ایک دوسرے کے ہمراہ پیش کیا گیا ہے۔

۳- یہ "مثناۃ" کی جمع ہے جس کا مادہ "ثنا" یعنی تعریف ہے - اس طرح نام کی دو جہتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس لئے کہ اس کی آیتیں ثنائے الٰہی سے مملو ہیں یا یہ کہ اس کی اعجاز نما بلاغت سنانے اور پڑھنے والے کو ثنا پر مجبور کر دیتی ہے۔

۴- "مثنیہ" کی جمع ہے جس کا مادہ "ثنی" اور جس کے معنی مایل ہوتے، مایل کرنے نیز دو چیز یا دو جانب کو ایک دوسرے کے نزدیک کرنے اور ایک دوسرے کی طرف پلٹا دینے (رد کرنے) کے ہیں - آیات قرآنی چونکہ مجموعی طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ و مربوط ہیں ان میں ایک دوسرے سے وابستگی اور پیوند پایا جاتا ہے اور ان میں سے بعض، بعض دوسری آیتوں کی توضیح و تشریح کرتی ہیں لہذا ان کو "مثانی" کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "مثنیہ" کا مادہ بھی "ثنا" کو قرار دیتے ہوئے دیگر توجیہات پیش کی ہیں جو کسی خاص توجہ کی مستحق نہیں سمجھ میں آتیں -

اس کی ایک وجہ اور بھی بیان کی جا سکتی ہے جو شاید ان تمام توجیہات سے بہتر اور روشن ہو اور وہ یہ کہ: قرآن ایک ایسا کلام ہے جو اپنے خاص اسلوب کے لحاظ سے ایسے "مشخص و معین مقطعات" یعنی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے جو خود بخود ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے کلام اور تحریر کی طرح یہ نہیں ہیں جنھیں ان کے معانی و مطالب پر غور کرنے کے بعد ایک سلسلہ سے جدا کرنا ممکن ہو پاتا ہے۔

اس مفہوم کے پیش نظر مثانی کا مادہ "ثنی" قرار پاتا ہے جس کے معنی عطف و مربوط کرنے اور ایک دوسرے کو باہم تہ کرنے کے ہیں۔ اہل لغت نے اس کی یوں تعریف کی ہے "مثانی الوادی، معاطفہ" اور درحقیقت کلمہ "مثانی" ان ہی آیات کے معانی پر بھرپور صادق آتا ہے کیونکہ یہ خود بخود ایک دوسرے سے جدا نظر آتی ہیں ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست ہونے کے باوجود بآسانی جدا کیا جا سکتا ہے جیسے کہ ایک کاغذ جس کو متعدد تہوں میں لپیٹ دیا گیا ہو۔

۱۸۔ عربی

قرآن میں چھ مقامات ایسے ہیں جہاں "قرآناً عربیاً" سے تعبیر کی گئی ہے:۔

سورہ یوسف/۲، طٰہٰ/۱۱۳، زمر/۲۸، فصلت/۳، شوریٰ/۷ اور سورہ زخرف/۲

سورۂ رعد کی ۳۷ ویں آیت میں یہ الفاظ ہیں: "حکماً عربیاً"

سورۂ احقاف میں ہے: وھٰذا کتاب مصدق لساناً عربیاً (آیت/۱۲)

اور سورۂ نحل میں ہے: "... وھٰذا لسان عربی مبین (آیت/۱۰۳)

جبکہ سورۂ شعراء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربیٍ مبین۔

(آیت/۱۹۳ تا ۱۹۵)

چونکہ قرآن کے عربی ہونے کے سلسلہ میں آیندہ مقالات میں بحث کی جائے گی لھٰذا فی الحال ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے بعض دیگر تبعی صفات بھی ندرت کے طور پر ذکر ہوئے ہیں جن پر بحث کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر سورۂ جن کی پہلی آیت میں لفظ "عجب" استعمال ہوا ہے:۔

"انا سمعنا قرآناً عجباً"

خلاصہ بحث :-

یہ تمام عنوانات وصفات جن کی تعداد پچاس تعبیروں سے بھی زائد ہے ۔چند حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں ۔

۱۔ وہ کل تعبیرات جو "عنوان مشیر" یا معانئے جنسی کی حیثیت رکھی ہیں اور اس کے امتیازات یا اس کے نزول کے مقصد پر دلالت نہیں کرتیں ۔ مثال کے طور پر کتاب ، حدیث ، قول یا قرآن وغیرہ ۔

۲۔ وہ اوصاف جو قرآن کے امتیازات واضح کرتے ہیں جیسے عربی ، مبین ، متشابہ ، مثانی ، تفصیل ، ومفصل وغیرہ ۔

۳۔ مدح آمیز کلمات جو اجمالی طور پر اس کے فیوض و برکات اور اہمیت کو پیش کرتے ہیں مثلاً ۱۔ عظیم ، ثقیل ، کریم ، مجید ، مبارک اور احسن الحدیث وغیرہ ۔

علی ، حکیم اور عزیز جیسی صفتیں بھی اسی قسم میں شامل کی جاسکتی ہیں اور اگر دل چاہے تو ان کے اندر مضمر نکات کے پیش نظر ان کو ایک الگ قسم میں شمار کرسکتے ہیں ۔

۴۔ وہ اوصاف جو اس کتاب کی دوسری آسمانی کتب کے مقابلہ میں اہمیت بیان کرتے ہیں جیسے : تصدیق مصدق اور مہیمن ۔

۵۔ وہ تعبیریں جو اس کے خدا کی جانب سے نازل ہونے پر دلالت کرتی ہیں : جیسے کلام اللہ ، آیات اللہ تنزیل رمن ... ۱

حق ، حق الیقین اور صدق کو بھی اسی زمرے میں شامل کرسکتے ہیں لیکن ایک دوسرے احتمال کے تحت (کہ شاید ان سے صحت مطالب مراد ہو) یہ اس کے بعد والے حصہ میں ملحق ہوں گے ۔

۶۔ وہ عنوانات جو قرآنی مطالب کی صحت ، مضامین کے استحکام اور مفاہیم کے واضح ہونے پر دلالت کرتے ہیں ۔ ایسے مفاہیم جو انسانی فکر اور عقل کو جلا عطا کرتے ہیں اور حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کردیتے ہیں ۔ مثلاً : علم ، برہان ، بیان ، تبیان ، بینات ، فرقان ، فصل ، قیم اور غیر ذی عوج ۔

۷۔ وہ عنوانات جو قرآن سے حاصل ہونے والی ایمانی قوت و طاقت پر دلالت کرتے ہیں ایک ایسی طاقت جو انسان کو ارتقاء کی منزلیں طے کرنے اور تحریک کی قوت بیدار کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جیسے : بشریٰ ، بشیر اور نذیر ۔

۸۔ وہ عنوانات جو قرآن کی اس خصوصیت پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ دل کو بیدار کرتا ہے اور غفلت ونادانی کی دنیا سے نکال کر حق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جیسے : ذکر، ذی الذکر، تذکرہ اور موعظہ وغیرہ۔

۹۔ وہ عنوان جو موانع دور کر کے امراض قلبی سے نجات دلانے پر دلالت کرتا ہے جیسے شفاء۔

۱۰۔ وہ عنوانات جو قرآن کریم کا مجموعی طور پر زندگی کے ہر ہر مرحلہ کے لئے "چراغ ہدایت" ہونا یعنی منزل معرفت میں عقل و فکر کی رہنمائی کر کے انسان کو صحیح اور یقینی انداز فکر عطا کرنا، قلب انسانی کو ایمان و آگہی کی روشنی سے معمور کر کے حق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا نیز راہ تقرب میں روح کی ہر ہر قدم پر اس طرح معیت و رہنمائی کرنا کہ انسان یکے بعد دیگرے کمال کی اعلیٰ منازل کو طے کر سکے اور اپنے آخری مقصد کو پا سکے:۔

"یهدی به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ...." (مائدہ /۱۶) اور

"یهدیهم الیه صراطاً مستقیماً" (نساء /۱۷۵)

چنانچہ اس کی طرف یہ عنوانات اشارہ کرتے ہیں : نور، بصائر، ھدی اور رحمت۔

اس سلسلہ کی آخری چھ قسمیں اپنی اہمیت کے اعتبار سے زیادہ بحث و تحقیق کی مستحق ہیں لہٰذا ہم خدا سے مدد کی امید کرتے ہوئے انشاء اللہ آیندہ مقالوں میں ان عنوانات سے متعلق جو آیتیں موجود ہیں ان کا تحقیقی جائزہ پیش کریں گے۔

جناب شیخ محمود قانصوہ

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

ماہ محرم کا روزہ مستحب ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ وعن النبي (ص) قال: ان أفضل الصلاة بعد الصلاة الفريضة الصلاة في جوف الليل وان أفضل الصيام من بعد شهر رمضان صوم شهر الله الذي يدعونه المحرم ٦٩.

١۔ ارشاد پیغمبرؐ ہے: نماز واجب کے بعد بہترین نماز، نماز شب ہے اور ماہ رمضان کے روزہ کے بعد بہترین روزہ اس ماہِ خدا کا روزہ ہے جسے محرم کہتے ہو۔

٢ ــ محمد بن محمد في (المقنعة)، عن النعمان بن سعد، عن علي (ع) انه قال: قال رسول الله (ص) لرجل: ان كنت صائما بعد شهر رمضان فصم المحرم فإنه شهر تاب الله فيه على قوم ويتوب الله تعالى فيه على آخرين ٧٠.

٢۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیغمبر اسلامؐ نے ایک شخص سے فرمایا: اگر تم رمضان کے بعد روزہ رکھنا چاہتے ہو تو محرم میں رکھو کیونکہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں خدا نے ایک قوم کی توبہ قبول کی اور دوسری قوم کی توبہ قبول کرے گا۔

روایات اہل سنّت:

۱ ــ وأخبرنا أبونصر الفامي، حدثنا أبوعبدالله محمدبن يعقوب، حدثنا يحيى بن محمدبن يحيى، حدثنا الحجبي ومسدد قالا: حدثنا أبوعوانة (ح وأخبرنا) أبوالحسن علي بن أحمد عبدان، أنبأنا أحمدبن عبيد الصفار، حدثنا زيادبن الخليل، حدثنا مسدد، حدثنا أبوعوانة، عن عبدالملك بن عمير، عن محمدبن المنتشر، عن حميدبن عبدالرحمن الحميري، عن أبي هريرة. قال: قال رسول الله(ص): افضل الصيام بعد شهر رمضان شهر الله الذي تدعونه المحرم وأفضل الصلاة بعد المفروضة الصلاة فى جوف الليل[71]. وروى الترمذي نحوه، عن قتيبة، عن أبي عوانة، عن ابي بشر، عن حميد، عن أبي هريرة[72]. ورواه مسلم، عن زهير، عن جرير، عن عبدالملك مثله[73]. وأخرج نحوه ابن ماجة، عن ابي شيبة، عن الحسين بن علي عن زائدة، عن عبدالملك[74]. وروى ابوداود نحوه، عن مسدد وقتيبة مثل مسلم فى الشافى[75]. ورواه الدارمى، عن زيد بن عوف، عن ابى عوانة[76].

۱۔ . . . . ابوہریرہ کا بیان ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ماہ رمضان کے بعد بہترین روزہ، اس ماہ خدا کا ہے جسے محرم کہتے ہو۔ اور نماز واجب کے بعد بہترین نماز، نماز شب ہے . . . .

۲ ــ حدثنا محمدبن سعيد، حدثنا محمدبن فضيل، عن عبدالرحمن بن اسحاق، عن النعمان بن سعد قال جاء رجل الى علي فسأله عن شهر بعد شهر رمضان يصومه. فقال له علي: ما سألني أحد عن هذا بعد اذ سمعت رجلا سأل النبي(ص) أيّ شهر يصومه من السنة بعد شهر رمضان فأمر بصيام المحرم. وقال ان فيه يوما تاب الله على قوم ويتوب فيه على قوم[77].

۲۔ . . . . نعمان بن سعد ناقل ہیں کہ ایک شخص نے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوکر ماہ رمضان کے بعد ایسے مہینہ کے متعلق سوال کیا جس میں روزہ رکھا جائے؟ حضرت نے فرمایا: میں نے پیغمبر اسلامؐ سے ایک شخص کو یہ سوال کرتے ہوئے سنا کہ ماہ رمضان کے بعد سال کا کون سا مہینہ ہے جس میں

روزہ رکھا جائے؟ حضرتؑ نے محرم میں روزہ رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا: محرم میں ایک ایسا دن ہے جس میں خدا نے ایک قوم کی توبہ کو قبول کیا اور ایک قوم کی توبہ قبول کرے گا۔

ماہ شعبان کا روزہ مستحب ہے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمد بن الحسن باسناده، عن علي بن الحسن بن فضال، عن محسن بن أحمد ومحمد بن الوليد وعمرو بن عثمان وسندي بن محمد جميعهم عن يونس بن يعقوب، عن أبي عبدالله (ع) قال سألته عن صوم شعبان فقلت له جعلت فداك كان أحد من آبائك يصوم شعبان؟ فقال: كان خير آبائي رسول الله (ص) أكثر صيامه في شعبان. ونحوه بأسانيد متعددة عن عائشة ۷۸. ونحوه مارواه الكافي، عن أبي علي الأشعري، عن محمد بن عبدالجبار ومحمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان جميعاً عن صفوان، عن ابن مسكان، عن الحلبي. قال سألت أبا عبدالله. وساق نحوه ولكن ليس فيه (أكثر صيامه في شعبان) ۷۹.

۱۔ . . . . یونس بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ سے ماہ شعبان کے روزہ کے متعلق دریافت کیا اور عرض کیا میں آپ پر سے قربان جاؤں، کیا آپ کے آباء واجداد ماہ شعبان میں روزہ رکھتے تھے؟ آپ نے فرمایا ہمارے آباء و اجداد میں سب سے بہتر رسول خداؐ تھے، آپ بیشتر روزہ ماہ شعبان میں رکھتے تھے۔ . . . .

۲ ــ محمد بن يعقوب عنه ــ علي بن ابراهيم ــ عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حفص بن البختري، عن أبي عبدالله (ع). قال: كنَّ نساء النبي (ص) اذا كان عليهن صيام أخرن ذلك الى شعبان كراهة أن يمنعن رسول الله (ص) حاجته فاذا كان شعبان صمن وصام (معهن) وكان رسول الله (ص) يقول: شعبان شهري. ورواه الصدوق في

(ثواب الأعمال) عن محمد بن علي ماجيلويه، عن عمه محمد بن أبي القاسم، عن أحمد بن أبي عبدالله، عن الحسين بن سعيد، عن ابن أبي عمير.٨٠

۲- . . . . حفص بن بختری ناقل ہیں کہ امام صادقؑ نے فرمایا: ازواج پیغمبرؐ اپنے قضا روزوں میں ماہ شعبان تک تاخیر کرتی تھیں تاکہ رسول خداؐ کی خواہشات میں خلل نہ پڑے۔ چنانچہ جب ماہ شعبان آجاتا تھا تو وہ روزے رکھتی تھیں اور رسول خداؐ بھی ان کے ہمراہ روزہ رکھتے تھے حضرتؐ فرماتے تھے: شعبان میرا مہینہ ہے . . . .

٣ ـ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد وعن علي بن ابراهيم، عن أبيه جميعا، عن ابن أبي عمير، عن سلمة صاحب الصابري، عن أبي الصباح الكناني. قال: سمعت أبا عبدالله يقول: صوم شعبان وشهر رمضان متتابعين توبة من الله والله. ورواه في ثواب الأعمال عن أبيه، عن سعد، عن أحمد بن عيسى، عن الحسين بن سعيد، عن ابن أبي عمير. وعن علي بن ابراهيم، عن محمد بن عيسى بن عبيد، عن يونس، عن عمر بن أبان، عن المفضل بن عمر، عن أبي عبدالله (ع) مثله٨١. وأرسل الصدوق نحوه٨٢.

۳- . . . . صباح کنانی کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے آپ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ: خدا کی قسم ماہ شعبان اور ماہ رمضان کا پیہم روزہ خدا کی بارگاہ میں قبول توبہ کی دلیل ہے . . . .

روایات اہل سنت:

١ ـ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أخبرني أبو الوليد، حدثنا الحسن بن سفيان، حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة، حدثنا سفيان، عن ابن أبي لبيد، عن أبي سلمة. قال: سألت عائشة عن صيام رسول الله (ص). فقالت: كان يصوم حتى نقول قد صام ويفطر حتى نقول قد أفطر ولم أره صائما من شهر قط أكثر من صيامه من شعبان كان يصوم

شعبان كله. كان يصوم شعبان الا قليلاً. ونحوه ما رواه البيهقي. بسند آخر عن عائشة مع زيادة أنه لم يستكمل صيام شهر سوى شهر رمضان[۸۳]. ورواه الترمذي بنقيصة أوله عن هناد، عن عبدة، عن محمد بن عمرو، عن أبي سلمة، عن عائشة مثله[۸۴]. ورواه مسلم، عن ابن أبي شيبة مثله وعن عمرو الناقد، عن سفيان مثله. وروي نحوه عن ابن يحيى، عن مالك، عن أبي النضر، عن أبي سلمة، عن عائشة[۸۵]. وروى عبدالرزاق نحوه عن مالك بن أنس، عن أبي النضر عن أبي سلمة[۸۶]. وأخرج البخاري نحوه، عن عبدالله بن يوسف، عن مالك مثل عبدالرزاق ومسلم[۸۷]. وأخرج النسائي، عن اسحاق بن ابراهيم، عن النضر، عن شعبة، عن توبة العنبري عن محمد بن ابراهيم (ح) وعن الربيع بن سليمان، عن ابن وهب، عن اسامة بن زيد، عن ابن ابراهيم (ح) وعن أحمد بن سعد، عن عمي، عن نافع بن يزيد، عن ابن الهاد، عن محمد بن ابراهيم، عن أبي سلمة مثله[۸۸]. وأخرج الحديث البيهقي، عن محمد بن عبدالله، عن سفيان مثله وأخرجه بلفظ آخر عن اسحاق بن ابراهيم، عن معاذ، عن أبي، عن يحيى[۸۹].

۱۔ . . . . ابوسلمہ کہتے ہیں، میں نے عائشہ سے رسول خدا کے روزوں کے متعلق دریافت کیا، انہوں نے کہا، رسول خدا روزہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہم لوگ کہنے لگتے تھے، آپ روزہ رکھ رہے ہیں اور افطار کرتے تھے یہاں تک کہ ہم لوگ کہتے تھے کہ آپ نے افطار فرمایا، میں نے شعبان کے مہینہ سے زیادہ کسی مہینہ میں آپ کو روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا، آپ شعبان میں پورا مہینہ روزہ رکھتے تھے کچھ دن کے سوا پورا مہینہ روزہ رکھتے تھے . . . .

۲ ـــ حدثنا أبو محمد عبدالله بن يوسف املاء بنيسابور وأبوالحسين بن بشران قراءة عليه ببغداد قالا: أنبأنا عبدالله بن محمد بن اسحاق الفاكهي بمكة، حدثنا أبو يحيى بن أبي مسرة، حدثنا يحيى بن محمد الجاري، حدثنا عبدالعزيز بن محمد، عن يزيد بن الهاد، عن محمد بن ابراهيم، عن ابي سلمة، عن عائشة (رض) أنها قالت: ان كانت احدانا لتفطر في زمان رسول الله (ص) فما تقدر على أن تقضيه مع رسول الله (ص) حتى يأتي شعبان، ما كان رسول الله (ص) يصوم من شهر ما كان يصوم من شعبان كان يصومه كله الا قليلا بل كان يصومه كله. وروى مسلم نحوه باسانيد متعددة[۹۰]. ورواه عبدالرزاق، عن ابن جريج، عن يحيى بن سعيد، عن أبي سلمة، عن عائشة مثله بنقيصة

ذيله واختلاف في الألفاظ مع وحدة المعنى والذيل قرينة على ذلك مفقودة في حديثه[91]. وروى البخاري نحوه بنقيصة ذيله، عن أحمد بن يونس، عن زهير، عن يحيى، عن أبي سلمة[92].

۲. . . . . ابوسلمہ، عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول خداؐ کے زمانہ میں ہم لوگوں کا روزہ چھوٹتا تھا تو آپ کے ساتھ رہ کر ان روزوں کی قضا ممکن نہ ہوتی تھی، یہاں تک کہ ماہ شعبان آجاتا تھا۔ رسولؐ خدا شعبان سے زیادہ کسی مہینہ میں روزہ نہیں رکھتے تھے، آپ شعبان میں چند دنوں کے سوا پورا مہینہ روزہ رکھتے تھے . . . .

٣ ــ حدثنا محمد بن بشار، حدثنا عبدالرحمن بن مهدي، عن سفيان، عن منصور، عن سالم بن أبي الجعد، عن أبي سلمة، عن أم سلمة. قالت: مارأيت النبي (ص) يصوم شهرين متتابعين الا شعبان ورمضان[93]. وأخرجه النسائي، عن شعيب بن يوسف ومحمد بن بشار، عن عبدالرحمن مثله[94].

۳. . . . . ام سلمہ کہتی ہیں: میں نے پیغمبرؐ کو شعبان و رمضان کے سوا دوماہ پے در پے روزہ رکھتے ہرگز نہیں دیکھا . . . .

ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا مستحب ہے

روایات اہل بیتؑ

١ ــ محمد بن يعقوب قال أميرالمؤمنين (ع): «شهر الصبر وثلاثة أيام من كل شهر يذهبن ببلابل الصدر وصيام ثلاثة أيام من كل شهر صيام الدهر ان الله عزوجل يقول من جاء بالحسنة فله عشرا مثالها». ورواه الصدوق مرسلا ورواه في ثواب الأعمال بالاسناد السابق (والظاهر أنه محمد بن الحسن، عن الحسين بن الحسن بن أبان)، عن الحسين بن سعيد، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبدالله قال: ورواه في المجالس، عن جعفر بن محمد بن مسرور عن الحسين بن محمد بن عامر عن عمه

عبدالله بن عامر، عن محمد بن أبي عمير مثله (أي عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبدالله) ۹۵. ونحوه ما رواه الصدوق في الخصال باسناده، عن علي(ع) (في حديث الأربع مئة) مع زيادات فيه، ونحوه ماروه في الوسائل، عن الدروع الواقية، بسنده عن ابن عباس وأنه صيام النبي(ص)، ونحوه ما نقله في الاستبصار ضمن حديث نقله عن محمد بن يعقوب، عن الحسين بن محمد، عن معلى بن محمد، عن الوشا، عن حماد، عن الصادق(ع) ۹۶. ونقله في البحار عن كتاب فضائل الأشهر الثلاثة، عن محمد بن الحسين بن أحمد بن الوليد، عن محمد بن الحسن الصفار، عن أحمد بن عيسى، عن محمد بن أبي عمير، عن حماد بن عثمان، عن الحبي، عن أبي عبدالله(ع). قال: قال أميرالمؤمنين(ع) مثله. ورواه في البحار أيضا، عن الأمالي، عن ابن مسرور، عن ابن عامر، عن عمه، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي مثله ۹۷.

۱۔ محمد بن یعقوب ناقل ہیں کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا: ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین دن کا روزہ، دل کے غم والم کو دور کر دیتا ہے اور ہر ماہ میں تین دن کا روزہ رکھنے والا، صائم الدھر کے برابر ہوتا ہے، کیونکہ ارشاد رب العزت ہے، جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا اسے اس کا دس گنا اجر ملے گا.................

۲ ــ وفي (معاني الأخبار المجالس)، عن أحمد بن محمد بن يحيى، عن أبيه، عن أحمد بن محمد بن عيسى، عن نوح بن شعيب النيسابوري، عن عبيدالله بن عبدالله، عن عروة ابن أخي شعيب العقر قوفي، عن شعيب، عن أبي بصير، عن الصادق(ع)، عن آبائه(ع) (في حديث). قال: قال رسول الله(ص) لأصحابه يوما: أيكم يصوم الدهر؟ فقال سلمان: أنا يا رسول الله. فقال رجل لسلمان رأيتك في أكثر نهارك تأكل. فقال: لست حيث تذهب، اني أصوم الثلاثة في الشهر. قال الله عزوجل: من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها، وأصل شعبان بشهر رمضان فذلك صوم الدهر وفيه أن رسول الله(ص) قال للرجل أنّى لك بمثل لقمان الحكيم سله فانه ينبئك ۹۸. ورواه في البحار، عن معاني الاخبار والامالی، عن العطار، عن ابیه، عن ابن عیسیٰ مثله وفیه بعض الزیادات ۹۹

۲۔........ امام صادق علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد سے روایت فرماتے ہیں کہ: رسولؐ خدا نے ایک دن اپنے اصحاب سے فرمایا تم میں کون شخص صائم الدھر ہے؟ سلمان نے کہا: میں! یا رسول اللہ۔ ایک شخص نے سلمان پر اعتراض کیا کہ میں نے اکثر آپ کو دن میں کھاتے پیتے دیکھا ہے۔ سلمان نے جواب دیا جو کچھ تم سمجھ رہے ہو میں وہ نہیں کہنا چاہتا، میں ہر ماہ میں تین روزہ رکھتا ہوں، خداوند عالم کا ارشاد ہے۔

جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا اسے اس کا دس گنا اجر ملے گا، اور ماہ شعبان کو ماہِ رمضان کے روزے سے ملادیتا ہوں، اس طرح صائم الدھر ہوگیا۔ اسی روایت میں ہے، کہ رسول خداؐ نے اس شخص سے کہا تمہیں لقمان حکیم جیسا شخص کہاں ملے گا، سلمان سے پوچھو وہ تمہیں باخبر کریں گے ......

روایات اہل سنّت:

١ ــ أخبرنا عبدالرزاق. قال: أخبرنا معمر، عن سعيدالجريري، عن أبي العلاء بن عبدالله بن الشخير، قال: جاءنا أعرابي ونحن بالمربد. فقال: هل فيكم قارئ يقرأ هذه الرقعة. قلنا كلنا نقرأ (الى أن قال) قلنا ان رسول الله(ص) كتب لكم هذا الكتاب؟ قال: نعم أتروني أكذب على رسول الله(ص) وغضب فضرب بيده على الكتاب فأخذه. قال: فاتبعناه فقلنا، حدثنا يا أبا عبدالله عن شيء سمعته من رسول الله(ص). قال: سمعته يقول: ان مما يذهب كثيراً من وضرالصدر صوم شهر الصبر و صوم ثلاثة أيام من كل شهر.١٠٠ وأخرج البزار قول النبي (ص) عن يوسف بن موسى، عن حسين بن علي، عن زائدة، عن سماك ، عن عكرمة، عن ابن عباس١٠١.

١۔ .... عبداللہ بن الشخیر کا بیان ہے کہ ہم لوگ باڑہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اعرابی آیا اور سوال کرنے لگا کہ تم میں ہے کوئی جو اس رقعہ کو پڑھ سکے، ہم لوگوں نے کہا کہ ہم سب پڑھ سکتے ہیں ..... ہم نے کہا: کیا رسولؐ اللہ نے تمھیں خط لکھا ہے ؟ اعرابی نے کہا: ہاں، کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہ پر بہتان باندھ رہا ہوں یہ کہہ کر اعرابی نے غصہ کے عالم میں ہمارے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے اس سے کہا اے ابو عبداللہ پیغمبرؐ سے سنی ہوئی کوئی حدیث بیان کرو اعرابی نے کہا میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ، ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین دن کا روزہ دل کی کثافتوں کو دور کر دیتا ہے .....

٢ ــ أخبرنا أبوالحسين بن الفضل القطان ببغداد، أنبأنا أبوسهل بن زياد القطان،

حدثنا اسحاق بن الحسن الحربي، حدثنا عفان، أنبأنا حمادبن سلمة، أنبأنا ثابت عن أبي عثمان النهدي أن أبا هريرة كان في سفر له فلما نزلوا أرسلوا اليه وهويصلي ليطعم. فقال لمرسول اني صائم. فلما وضع الطعام وكادوا يفرغون فجاء فجعل يأكل فنظر القوم الى رسولهم فقال: ما تنظرون قد أخبرني أنه صائم. فقال أبو هريرة صدق أني سمعت رسول الله (ص) يقول صوم شهر الصبر وصوم ثلاثة أيام من كل شهر صوم الدهر فقد صمت ثلاثة أيام من الشهر فأنا مفطر في تخفيف الله وصائم في تضعيف الله.[١٠٢] وأخرج النسائي قول النبي (ص)، عن زكريابن يحيى، عن عبد الأعلى، عن حماد مثله.[١٠٣] وأخرجه أبو داود الطياسي، عن حماد مثله.[١٠٤]

۲۔ . . . . ابوہریرہ ناقل ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا: ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین دن کا روزہ، پورے زمانہ کا روزہ ہے۔ . . . .

ی

الوسائل ج ۷ ص ۳۴۷ و فی حاشیۃ الوسائل من نفس الصفحۃ ان الحدیث فی الاقبال ص ۵۵۴ وقال فی اول الحدیث، ذکر یحیی بن الحسین بن هارون الحسینی فی امالیہ باسنادہ الی النبی (ص) وقال بعد ذکر الحدیث: و روی المرزبانی ہذا الحدیث عن النبی (ص) من طرق جماعۃ فی المجلد السابع من کتاب الازمنۃ و رواہ محمد بن ابی بکر المدنی (و فی نسخۃ المدینی) الحافظ من النبی (ص) ایضاً فی کتاب دستور المذکورین۔

الوسائل ج ۷ ص ۳۴۷۔

البیہقی ج ص ۲۹۱ و رواہ باسانید اخری عن ابی ہریرہ و جندب بن سفیان البجلی۔

الترمذی ج ۳ ص ۱۱۷

مسلم ص ۱۶۹۔ ولکن ذکرھا بصیغۃ الجواب عن السؤال فی حدیث زھیر۔

ابن ماجۃ ج ۱ ص ۵۵۴۔ فیہ ان النبی (ص) سئل فاجاب۔

ابو داود ج ۲ ص ۳۲۳۔

الدارمی ج ۲ ص ۲۱۔

سنن الدارمی ج ۲ ص ۲۱۔

الوسائل ج ۷ ص ۳۶۴۔ والاستبصار ج ۲ ص ۱۳۸۔

الکافی ج ۴ ص ۹۱۔

۸۰۔ الوسائل ج ۷ ص ۳۶۰ و ۳۶۱۔ والکافی ج ۴ ص ۹۰۔

۸۱۔ الوسائل ج ۷ ص ۳۶۸۔ والکافی ج ۴ ص ۹۱۔

۸۲۔ الفقیہ ج ۲ ص ۵۷۔ ۸۳۔ البیہقی ج ۷ ص ۲۹۲۔ والبیہقی ج ۷ ص ۲۹۲۔

۸۴۔ الترمذی ج ۳ ص ۱۱۴۔ ۸۵۔ مسلم ج ۳ ص ۱۶۰ و ۱۶۱۔

۸۶۔ مصنف عبدالرزاق ج ۴ ص ۲۹۳۔ والموطأ ج ۱ ص ۲۸۷۔

۸۷۔ البخاری ج ۳ ص ۴۷۔

۸۸۔ النسائی ج ۴ ص ۱۵۰۔ وفی الثلاثة اختلافات لفظیہ بل فی الثالث نقیصہ الشطر الاول من الحدیث۔

۸۹۔ النسائی ج ۴ ص ۱۵۱ وفی الثانی اختلاف فراجع۔

۹۰۔ البیہقی ج ۴ ص ۲۹۲۔ ومسلم ج ۳ ص ۱۵۴ و ۱۵۵۔

۹۱۔ مصنف عبدالرزاق ج ۴ ص ۲۴۵۔ ۹۲۔ البخاری ج ۳ ص ۴۳۔

۹۳۔ الترمذی ج ۳ ص ۱۱۳۔

۹۴۔ النسائی ج ۴ ص ۱۵۰۔ وفی آخرہ (الا انہ کان یصل شعبان و رمضان)

۹۵۔ الوسائل ج ۷ ص ۳۱۰ وفی حاشیۃ الوسائل عن ثواب الاعمال ص ۴۹۔ والمجالس ص ۳۵۰ وفی الکافی ج ۴ ص ۹۲۔
اقول وظاہر الوسائل ان ہذہ الروایۃ مرسلۃ وان القائل ہو ابن یعقوب وذلک بسبب تقطیع ہذہ الروایۃ
عما قبلہا۔ وفی الکافی یظہر ان صاحب القول ہو الصادق ؑ بالاسناد السابق ای علی بن ابراہیم، عن ابیہ عن ابی
عمیر، عن حماد، عن الحلبی، عن الصادق۔

۹۶۔ الوسائل ج ۷ ص ۳۰۹۔ والوسائل ج ۷ ص ۳۲۲۔ والاستبصار ج ۲ ص ۱۳۶۔

۹۷۔ البحار ج ۹۳ طبع ص ۱۴۳۔ والبحار ج ۹۷ طق ص ۹۴۔

۹۸۔ الوسائل ج ۷ ص ۳۰۷۔

۹۹۔ البحار ج ۹۷ طق ص ۹۳ ۱۰۰۔ مصنف عبدالرزاق ج ۴ ص ۳۰۰ ۱۰۱۔ کشف الاستار ج ۱ ص ۴۹۴۔ وفیہ اختلاف فی اللفظ

۱۰۲۔ البیہقی ج ۴ ص ۲۹۳۔ ۱۰۳۔ النسائی ج ۴ ص ۲۱۸ ۱۰۴۔ منحۃ المعبود ج ۱ ص ۱۹۶۔

۱۰۵۔ البیہقی ج ۴ ص ۲۹۳۔

۱۰۶۔ منحۃ المعبود ج ۱ ص ۱۹۵۔

ل: آیت اللہ العظمیٰ منتظری
بہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

فقیہ عالی قدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ نے کچھ عرصے سے نوجوان نسل کے لئے بعض اہم موضوعات پر مشتمل نہج البلاغہ کے شہ پاروں کی تشریح و توضیح کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے پیش نظر مقالہ "معرفتِ الٰہی" کے موضوع پر آپ کے درس کا ترجمہ ہے جس میں مولائے کائنات کے خطبہ ۱۸۶ کی تشریح کی گئی ہے۔ درس میں بعض فلسفی مسائل کا ذکر بھی آیا ہے۔ ہر چند حضرت آیت اللہ العظمیٰ نے اسے آسان زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن فلسفہ پھر بھی فلسفہ ہے۔

"وبمقارنتہ بین الاشیاء عرف ان لاقرین لہ"
خدا نے چیزوں کو ایک دوسرے کا ہمنشین قرار دیا ہے (ساتھ ساتھ رکھا ہے)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کوئی قرین (ساتھی) نہیں رکھتا۔

ارن (قربت، ہمنشینی) کی قسمیں۔

قربت و تقارن، پانچ قسموں پر مشتمل ہے:۔

) تقارن زمانی۔

دو چیزیں ایک ہی زمانہ میں ہوں جیسے ہم اور آپ ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

اس کو تقارن زمانی کہتے ہیں۔

(۲) تقارن مکانی۔

دو چیزیں ایک مکان میں ہوں جیسے دو آدمی ایک ہی گاڑی پر سوار ہوں یا کسی جگہ ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں تو ان دونوں آدمیوں میں تقارن مکانی ہوگا۔

(۳) تقارن عرض و معروض۔

جیسے گچ اور سفیدی، گچ معروض ہے اور سفیدی عرض ہے۔ یہاں سفیدی گچ کے ساتھ ہے۔

(۴) تقارن مادہ وصورت۔

جیسے لکڑی جو مادہ ہے۔ بڑھئی کی مخصوص کاریگری کی بدولت کرسی یا دروازہ کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ یہاں اس لکڑی اور کرسی میں جو تقارن ہے اسے تقارن مادہ وصورت کہتے ہیں۔

(۵) تقارن بدن وروح۔

ہر انسان کی روح اس کے بدن کے ساتھ ہوتی ہے اس لئے کہ روح، مادۂ بدن کا محصول عالی ہے یعنی بدن نے حرکت جوہری کی وجہ سے کمال کی منزلیں طے کیں اور اس میں نفس مجرد (روح) پیدا ہو گیا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مقارنت دو چیزوں کی ہمنشینی وہمراہی کو کہتے ہیں یہ ہمنشینی، تقارن زمانی، تقارن مکانی، تقارن عرض ومعروض، تقارن مادہ وصورت کی شکل میں ہو یا تقارن بدن وروح کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی خدا کی ذات کے لئے ممکن نہیں ہے اس لئے خدا زمان ومکان سے خالی، عرض ومعروض سے بری، مادہ وصورت سے پاک اور بدن وروح سے منزہ ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ترکیب ضروری ہے۔ اگر خدا مرکب ہوگا تو محتاج ہو جائیگا اور خدا کے لئے محتاج ہونا محال ہے۔

بہرحال قرین و ہمنشین ہونے کی مذکورہ صورتوں میں سے اگر ہر ایک کی الگ الگ تحقیق کی جائے تو ہر
لازم جسم نکلے گا اور جسم کا محتاج ہونا بدیہی بات ہے لیکن خدا چونکہ بے نیاز ہے اس لئے اس کا کوئی
اور ہمنشین نہیں ہو سکتا، خدا کی ذات کے لئے کوئی "دوسرا" فرض ہی نہیں کیا جا سکتا جو اس کا ہم نشین
بھی بن سکے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ خدا ان تمام چیزوں کا خالق ہے، زمانہ
ہی نے پیدا کیا، مکان کا وہی خالق ہے پھر بھلا یہ چیزیں اس کی ہم نشین کیسے بن سکتی ہیں۔

ن۔

فلسفیوں کے درمیان مکان کے سلسلہ میں دو قول پائے جاتے ہیں۔
فلسفہ مشاء کے پیرو جیسے ارسطو کہتے ہیں کہ:۔
مکان، جسم کی اس سطح مقعر کو کہتے ہیں جو کسی جسم کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔
ب ایسا کوزہ جسمیں آپ پانی ڈالتے ہیں اس کی دو سطحیں ہیں:۔
۱۔ ایک وہ سطح جو ظاہری ہے اور ابھری ہوئی ہے۔
۲۔ دوسری وہ سطح جو باطنی، گہری اور پانی سے ملی ہوئی ہے، فلاسفہ مشاء اس گہری سطح کو ابھری
سطح آب کا مکان کہتے ہیں۔
فلسفہ اشراق کے پیرو جس کے سربراہ شیخ اشراق ہیں، فرماتے ہیں کہ:۔
"مکان سے مراد بُعد مجرد ہے"۔
یہ فرض کریں کہ عالم کی کوئی چیز فضا میں نہ ہوتی حتی کہ ہوا بھی نہ ہوتی اور ایک ایسی فضا موجود ہوتی جسمیں
چوڑائی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ فضا جو بعد میں اجسام سے پُر ہو گئی ہے تو اس فضا کو مکان
جیسے اگر ایک کتاب کے مکان کی تعریف کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ کتاب جسم ہے، اس کا مکان وہ فضا
ہے جس کو کتاب نے پُر کر رکھا ہے اگر یہ کتاب نہ بھی ہوتی، پھر بھی ایک فضا تو بہرحال ہوتی، فلاسفہ اشراق
فضا کو مکان کہتے ہیں ۔۔ مکان کے چاہے جو بھی معنی بیان کئے جائیں وہ مخلوق خدا ہے لہذا ممکن نہیں
یہ مکان خدا کا ساتھی ہو جائے ساتھ اور مقارنت تو اس صورت میں ہوتی جب مذکورہ پانچ صورتوں
سے ہم نشینی کی کوئی صورت خدا کے ساتھ متصور ہوتی خدا کے ساتھ اس کا کوئی دوسرا ساتھی فرض

نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو کچھ ہے وہ پرتو خدا ہے۔

"ضادّ النور بالظلمة"

خدا نے نور کو ظلمت کی ضد قرار دیا ہے۔

نور و ظلمت۔

یہ حصہ درحقیقت گذشتہ جملہ "و بمضادته بين الاشياء عرف ان لاضد له" کی شرح و تفسیر ہے۔ ہم یہ گذارش کر چکے ہیں کہ ضدین ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن میں ایک ساتھ جمع ہونے کی قابلیت نہیں پائی جاتی ضدین چاہے دو امر وجودی ہوں یا ایک وجودی اور ایک ایسا عدمی ہو جس میں موجود ہونے کی شان پائی جاتی ہو مگر فی الحال موجود نہ ہو جیسے ظلمت "الظلمة عدم النور عما من شانه ان يكون نوراً" ۔۔۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عدم کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ عدم مطلق ۲۔ عدم ملکہ۔ عدم ملکہ وہ عدم ہے جس میں وجود کی صلاحیت ہوتی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فضا میں نور آفتاب پھیلنے کی استعداد موجود ہے لیکن جس وقت نور آفتاب نہیں ہوگا تاریکی ہو گی فضا میں چھانیوالی یہ تاریکی عدم ملکہ والی تاریکی ہے عدم محض والی نہیں ہے۔

بہر حال حضرتؑ کے مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے نور و ظلمت کے درمیان تضاد قرار دیا ہے ۔۔۔ نور کی تعریف میں کہا گیا تھا کہ "الظاهر بالذات المظهر للغير" نور وہ ہے جو خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کرتا ہے جو شئے بھی دکھائی دیتی ہے وہ نور کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے ہم نور کا ادراک کرتے ہیں اور پھر اسی کے ذریعہ دوسری چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

"والوضوح بالبهمة"

اس نے واضح اور مبہم کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔

واضح اور مبہم۔

شارحین نہج البلاغہ میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ واضح سے مراد سفیدی اور مبہم سے مراد سیاہی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ "واضح" اور "مبہم" کا تضاد بہت ہی واضح ہے

توحید ٦٦

بات کو کنایہ میں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ہاں یہاں "مبہم" ہونا عدم ملکہ کی قسم سے ہے اس لئے
رح ایک وجودی امر ہے اور ابہام عدمی شے ہے مبہم وہ غیر واضح چیز ہے جس میں واضح ہونے کی صلاحیت

"الجمود بالبلل"

اس نے خشکی اور تری (رطوبت) کے درمیان تضاد قرار دیا ہے۔

صر اربعہ۔

زمانہ قدیم سے ہی عناصر کو فلاسفہ چار بتاتے ہیں۔ یہ عناصر، پانی، مٹی، آگ، ہوا ہیں اور عناصر اربعہ
م سے مشہور ہیں۔ فلاسفہ نے ان میں سے ہر ہر عنصر کی الگ الگ خاصیت بیان کی ہے۔ پانی کی خصوصیت
ب، خاک کی خصوصیت یبوست، آگ کی خصوصیت حرارت اور ہوا کی خصوصیت برودت ہے۔
ے بہت سے ڈاکٹر ان خصوصیتوں کو درست نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی اجمالی طور پر ان کا وجود بہت ہی
ہے یہ خاصیتیں غذاؤں میں مکمل طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔

لی اور تری۔

بہر حال حضرتؑ نے فرمایا کہ خدا نے خشکی اور تری کے درمیان تضاد قرار دیا ہے لہٰذا پانی جس میں
ب ہے اور خاک جس میں خشکی پائی جاتی ہے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

"والحرور بالصرد"

اس نے سردی اور گرمی میں تضاد قرار دیا ہے۔

رت و برودت۔

"حرور" حرارت کی صفت مشبہ ہے اور لفظ "صرد" جو صاد سے لکھا جاتا ہے وہ سین سے
انے والے "سرد" کے معنی میں ہے۔ لفظ "سرد" عربی کے لفظ "صرد" سے بنا ہے جس میں "ص" کو
ے بدل دیا گیا ہے۔ بہر حال "حرور" گرمی کے معنی میں اور "صرد" سردی کے معنی میں ہے ۔

حضرتؑ نے مذکورہ بالا دونوں جملوں میں ان چاروں خاصیتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے فلاسفہ جن کو عناصر اربعہ کی خاصیت کہتے ہیں (یعنی پانی کی خاصیت رطوبت، خاک کی خاصیت یبوست، آگ کی خاصیت حرارت اور ہوا کی خاصیت برودت) ان چاروں خاصیتوں کو جو ایک دوسرے کی ضد ہیں فلاسفہ کی اصطلاح میں مزاج بھی کہا جاتا ہے۔ انسانوں میں اگر درجہ حرارت ۳۷ ڈگری سے بڑھ جاتا ہے تو انسان بیمار ہوجاتا ہے۔ یا اگر خشکی بڑھ جائے اور جسم میں پانی کم ہوجائے تو یہ بات مزاج انسانی اور اسکی سلامتی کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔

مؤلف بین متعادیاتھا، مقارن بین متبایناتھا، مقرب بین متباعداتھا، مفرق بین متداناتھا۔

جو چیزیں ایک دوسرے کے لئے ناساز گار اور دشمن ہیں ان کو آپس میں ملانے والا جدا جدا چیزوں کو نزدیک کرنے والا، ایک دوسرے سے دور کو قریب کرنیوالا، اور جو چیزیں نزدیک ہیں ان کو دور کرنے والا ہے۔

دوستی اور دشمنی

جن موجودات میں آپس میں بیر ہے خدا نے ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے ان کو آپس میں ملا دیا ہے۔ جیسے حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست ان میں آپس میں تضاد ہے لیکن اس کے باوجود یہ ساری چیزیں بدن میں ایک ساتھ جمع ہیں ان ہی کے اختلاط کو مزاج کہا جاتا ہے۔

تعادی۔ عداوت سے ہے یہ دشمنی کے معنی میں ہے۔

متعادیات۔ وہ چیزیں جن میں آپس میں تضاد اور دشمنی ہو جیسے آب و خاک۔

مقارنہ ۔ نزدیک کرنے اور قرین قرار دینے کے معنی میں ہے۔

متباینات ۔ بینونت سے بمعنائے جدائی اور تفرقہ ہے۔

خدا نے ان چیزوں کو جو دور اور جدا ہیں، قریب کر دیا ہے، قریب ہی نہیں بلکہ باہم جمع بھی کر دیا ہے جیسے حرارت اور برودت، پانی اور خشکی، یہ ساری چیزیں بدن میں پائی جاتی ہیں۔ ان ہی کے اختلاط کو مزاج کا نام دیا جاتا ہے اسی طرح ان چیزوں کو جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں

ر دیا ہے۔

وفساد۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کون و فساد خدا کے قبضہ میں ہے یعنی ہمارا اور آپ کا وجود
پر منحصر ہے کہ وہ چیزیں جو دور ہیں نزدیک ہو جائیں (جیسے حرارت اور رطوبت) سے
وقت وہ بھی آئیگا جب بدن کے اجزاء جو آپس میں مضبوطی سے پیوست ہیں جدا ہو جائیں گے،
گل جائے گا، ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، اعضاء و جوارح الگ الگ ہو جائیں گے۔
غرضکہ عالم طبیعت عالم کون و فساد ہے ایک طرف سے پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے فنا کی
ہوتا چلا جاتا ہے۔
حضرتؑ کے گذشتہ تین جملے عالم کون سے متعلق ہیں اور آخری جملہ " مفرّق بین متدانیاتہا"
عالم فساد سے ہے۔ "دنو" اور "تدانی" نزدیکی کے معنی میں ہے۔ ہمارے جسم کے اجزاء جو
دوسرے سے ملے ہوتے ہیں سب ایک روح کے ذریعہ کنٹرول کئے جاتے ہیں ایک وقت
آ کہ سب جدا ہو جائیں گے۔ ہوا ہر ذرہ کو اڑا لے جائے گی۔ حضرتؑ نے اس جملہ میں فرمایا ہے
ان اشیاء میں جدائی اور تفرقہ ڈالدے گا جو ایک دوسرے کے قریب اور نزدیک ہیں۔

لا یشمل بحدٍ ولا یحسب بعدٍ

وہ حد میں محدود نہیں ہے اور نہ شمار کرنے سے شمار میں آتا ہے۔

وی اور حدّ فلسفی

حد کا لغوی معنی بھی ہے اور اصطلاحی معنی بھی جو منطق میں موجود ہے۔ لغت میں حد کسی چیز
کو کہتے ہیں جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ "اس چیز کی حد وہاں تک ہے" یعنی اس کی انتہا وہاں تک ہے۔
جائے کہ اس گھر کے چار حد ہیں۔ (شمال، جنوب، مشرق، مغرب) یہ حد کے لغوی معنی ہیں۔
لیکن اصطلاح منطق میں ذاتیات کی تعریف کو حد کہتے ہیں یعنی اگر آپ کسی چیز کی تعریف کرنا
تو کبھی عوارض کے ذریعہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی ذاتیات کے ذریعہ اس کی تعریف

کی جاتی ہے۔ عوارض کے ذریعہ کی جانے والی تعریف کو منطق میں "رسم" اور ذاتیات کے ذریعہ کی جانے والی تعریف کو "حد" کہتے ہیں — مثلاً اگر آپ سے پوچھا جائے کہ "ما ھو الانسان؟" "انسان کیا ہے؟" اور آپ جواب میں اس بات کو بتائیں جو انسان کی ذات میں دخل رکھتی ہے تو اس کو "حد" کہتے ہیں۔ اگر آپ نے جواب میں فرمایا کہ "الانسان حیوان ناطق" "انسان حیوان ناطق ہے" تو اس میں حیوانیت اور ناطقیت دونوں، انسان اور اس کی ذات کا جزو ہیں اس تعریف کو منطق کی اصطلاح میں "حد" کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر آپ تعریف میں اس کے خاص اور عوارض کو ذکر فرمائیں اور یوں کہیں کہ "انسان وہ ہے جو کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے، ہنستا ہے وغیرہ" تو یہ ساری باتیں انسان کے عوارض اور خواص ہیں، منطق میں اس تعریف کو "رسم" کہتے ہیں۔

بنابراین ذاتیات کی تعریف کو یعنی جنس اور فصل کے ذریعہ جو تعریف ہوتی ہے اس کو حد کہتے ہیں۔ خدا نہ حد لغوی رکھتا ہے نہ حد منطقی۔

خداوند عالم کے لئے جنس و فصل اور حد منطقی نہیں ہے اس لئے کہ جنس و فصل ان موجودات کی تعریف کی چیزیں ہیں جو ماہیت رکھتی ہیں اور مرکب ہیں، جیسے ہم اور آپ۔ لیکن خدا کی ذات نہ مرکب ہے نہ ماہیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ خدا ہستی غیر متناہی ہے — وہ حد لغوی بھی نہیں رکھتا، اس لئے کہ وہ جسم نہیں ہے جس کی کوئی حد اور انتہا ہو۔ اسی وجہ سے حضرت نے فرمایا کہ خدا کسی قسم کی حد میں محدود نہیں ہے۔

وہ بغیر شمار کے واحد ہے۔

"ولا یحسب بعد" خدا گننے سے شمار میں نہیں آتا لہٰذا جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ خدا واحد ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی "دوسرا" بھی اس کے لئے فرض ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ "دوسرے" کا تصور ہی اس کے لئے محال ہے — اس کے پہلے میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی حدیث نقل کر چکا ہوں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ "لفظ واحد کا اطلاق خدا کے لئے دو معنوں میں صحیح اور دو معنوں میں غلط ہے۔ میں اس وقت اس روایت کو دہرانا نہیں چاہتا لیکن اجمالاً اتنا کہوں گا کہ جو عدد

نے کیلئے استعمال ہوتا ہے وہ ذاتِ خدا کیلئے درست نہیں ہے۔
مقدار بتانے والا عدد "کم منفصل" ہے۔ خدا مقدار اور اندازہ والا نہیں ہے۔ اس کے لئے
فرض نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے اجزاء نہیں ہیں جو یہ کہا جائے کہ وہ اتنے
پہلے سے موجود ہے۔ عدد یا تو اس کی ذات کو شمار کرے گا یا زمانہ کو یا اس کے اجزاء کو اور
زمانہ رکھتا ہے نہ اجزاء کا حامل ہے نہ وہ خود شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ لہٰذا عدد کا جو
ل ہے) خدا کی ذات میں گذر نہیں ہے۔ جس طرح "کم متصل" یعنی خط، سطح، جسم تعلیمی (طول
لق) کا اس کی ذات میں گذر نہیں ہے اس لئے کہ "کم متصل" اجسام سے متعلق ہے۔

"انما تحد الادوات انفسها"

آلات تو اپنے ہی جیسے (جسموں) کو محدود کر سکتے ہیں۔

ادراک کی محدودیت۔

گذشتہ بیان میں عرض کر چکا ہوں کہ نفس انسان میں پانچ خبر رساں وسائل ہیں، جن کو حواس خمسہ
سے یاد کیا جاتا ہے ان حواس کے ذریعہ باہر کی دنیا اور مادی دنیا سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔
ں کو "ادوات" بھی کہتے ہیں۔ ادوات، بمعنائے آلۂ ادراک ہے جو ادات کی جمع ہے،
ھ دیکھنے کا اور کان سننے کا آلہ ہے، ہمارے علوم ان ہی آلات کے مرہون منت ہیں اسی لئے
ہے "من فقد حساً فقد علماً" جو حواس پنجگانہ میں سے کسی ایک سے محروم ہے تو گویا علم
راستہ اس کے لئے مسدود ہے۔
آلات ادراکیہ جو علم و ادراک کا ذریعہ ہیں چونکہ وہ جسم ہیں اس لئے جسم ہی کو درک کرنے
ہی کو محدود کرتے ہیں یعنی آپ کے حواس ان ہی چیزوں کی معلومات فراہم کرتے ہیں جو ان کی
کے حامل ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے ٹیلویژن کو دیکھ سکتے ہیں اس لئے کہ آنکھ بھی جسم ہے اور
بھی جسم ہے۔ آپ اپنی آنکھوں سے اپنی روح اور نفس کو نہیں دیکھ سکتے کیونکہ یہ روح
ت میں سے ہے بلاشبہ آنکھوں سے اس کا ادراک ممکن نہیں۔

"وتشیر الآلات الیٰ نظائرھا"

آلات اپنے ہی جیسی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔
آپ کے، ادراک کرنے والے آلات ان ہی چیزوں کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جو ان ہی جیسے ہیں۔ آپ اپنی انگلیوں یا آنکھوں سے ان کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں لیکن خدا کی طرف اشارہ کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ ذات باری تعالیٰ ادراک کے قابل نہیں ہے۔ اس کی کنہ تک کوئی نہیں پہونچ سکتا۔ یہاں تک کہ عقل بھی جو عالم مادہ سے مجرد ہے خدا کو درک نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ عقل محدود ہے اور محدود، لامتناہی کا احاطہ کرے یہ ناممکن ہے۔
لہٰذا آلات ادراک اپنی ہی طرح کی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہیں وہ ان چیزوں کا تعارف ہم سے کرا سکتے ہیں جو جسم ہیں، ہستی غیر متناہی خدا کی معرفت نہیں عطا کر سکتی۔ خداوند عالم نہ صرف یہ کہ اجسام سے درک نہیں ہو سکتا بلکہ وہ عقل کی دسترس سے بھی باہر ہے اس لئے کہ عقل محدود ہے وہ خدا کا ادراک کرنے یا اس کی کنہ ذات تک پہونچنے سے عاجز ہے۔

بے علم عابد

قال علی علیہ السلام :

التعبد علی غیر فقہ کحمار الطاحونۃ یدور ولا یبرح {الاختصاص شیخ مفید ص ۲۳۸}

علم فقہ سے جاہل عبادت گذار، کولھو کے اس گدھے کی مانند ہے۔ جو اپنی جگہ پر گھومتا تو بہت ہے لیکن اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ب ناصر مکارم شیرازی
: جناب سید احتشام عباس زیدی

اسلامی سیاست اور کتاب و سنت میں اس کی بنیادیں

(۲)

ہم عرض کر چکے ہیں کہ اسلام اور سیاست دونوں اپنے اصلی اور واقعی معنی کے اعتبار سے تانے بانے کی
ِ رکھتے ہیں۔ اگر اسلام کو سیاست سے جدا کر دیا جائے تو سیاست اپنا انسانی چہرہ کھو دے گی اور اگر سیاست
لام سے الگ کر دیا جائے تو اسلام کا حقیقی چہرہ مسخ ہو کر رہ جائے گا۔ دونوں کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے
تانے یا بانے کو ایک کپڑے سے کھینچ لیا جائے تو خود کپڑے کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ بعینہ یوں ہی اگر
یاست کو اسلام سے یا اسلام کو سیاست سے حذف کر دیا جائے تو خود اسلام فنا ہو جائے گا۔

اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لئے اسلامی فقہ خصوصاً اس کے سیاسی حصہ پر ایک نظر ڈالنا ضروری
کہ معلوم ہو سکے کہ سیاست، اسلامی فقہ میں کتنا رسوخ اور کس قدر گہرائی رکھتی ہے؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل چند نکات پر توجہ لازمی ہے۔

۱۔ علم فقہ کیا ہے؟
۲۔ علم فقہ کی وسعت اور جامعیت کس قدر ہے؟
۳۔ اجتہاد کے عمومی اور خصوصی معنی کیا ہیں؟
۴۔ تصویب کا باطل ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں "مالا نص فیہ" (جس مسئلہ میں کوئی آیت یا
یا روایت نہ ہو) کا کوئی وجود نہیں ہے اور ہر موضوع کے لئے ایک حکم موجود ہے۔

۱۔ علم فقہ ؟

لغوی اعتبار سے "فقہ" کے معنی "درک و فہم" ہیں۔ اس لحاظ سے "فقیہ" اسے کہتے ہیں جو ایک خاص اور اہم سطح کے فہم و ادراک کا حامل ہو۔

کائنات کی تمام موجودات عمومی طور سے خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے۔ "وان من شیٔ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم" یعنی دنیا کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں لیکن تم ان کی تسبیح کو درک نہیں کرتے۔ (سورۂ اسراء / ۴۴)

یا دوسری جگہ دوزخیوں کے خصوصیات کے سلسلہ میں فرماتا ہے :۔

"ولقد ذرانا لجھنم کثیراً من الجن والانس لھم قلوب لا یفقھون بھا۔" (اعراف/۱۷۹)

اور یقیناً ہم نے بہت سے انسانوں اور جنوں کو جہنم کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ ان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ لوگ دل تو رکھتے ہیں لیکن اس کے ذریعہ غور و فکر نہیں کرتے۔

لیکن علوم اسلامی کی اصطلاح میں فقہ سے مراد ایک خاص قسم کا علم و ادراک ہے۔ یعنی "شرعی مآخذ و مصادر سے فرعی احکام کا استنباط کرنا" اس مقولہ کی روشنی میں "فقیہ" اسے کہتے ہیں جو اسلامی مآخذ و مصادر کے ذریعہ ہر مسئلہ میں اسلامی حکم کو معین کر سکے اور یہ ملکہ "مختلف علوم سے آگاہی کے بعد حاصل ہوتا ہے بعض لوگ فقیہ کے لئے بارہ علوم سے واقفیت کو لازم جانتے ہیں اور بعض کے نزدیک فقیہ کے لئے کم از کم چھ علوم کی مہارت ضروری ہے ـــــ جب تک ان چھ علوم پر کامل عبور پیدا نہ ہو جائے کوئی فقیہ نہیں ہو سکتا۔

وہ چھ علوم یہ ہیں: عربی ادبیات، لغت، علم رجال و درایت، تفسیر، اصول فقہ اور فقہ استدلالی۔

ان کے علاوہ اور دوسرے علوم بھی ہیں جو ان علوم کے مقابلے میں دوسرے درجہ کی اہمیت کے حامل ہیں یا "منطق" جیسے علوم جو زیادہ تر وجدانی و فطری پہلو رکھتے ہیں۔

بہر حال ان علوم کی وسعت اس قدر ہے کہ ایک با استعداد شخص کو "فقیہ مطلق" جیسے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے کے لئے سالہا سال ان علوم کو حاصل کرنے میں صرف کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایسا عمیق و پیچیدہ ترین علمی سلسلہ ہے کہ اکثر اس بلند مرتبہ تک پہنچنے میں سو میں سے ایک ہی فرد کامیاب ہو پاتی ہے۔

۱۔ فقہ اسلامی کی وسعت و جامعیت:

علم فقہ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے
[کو]ئی فقہی حکم نہ پایا جاتا ہو۔ خواہ وہ موضوع اپنا مخصوص فقہی حکم رکھتا ہو یا ایک کلی و عمومی حکم کے
[آت]ا ہو۔

[ص]رف اخلاقی مسائل ہی نہیں بلکہ انسان اور خدا سے ارتباط رکھنے والا ہر حکم اسلام میں معین کیا جا چکا
[اجتم]اعی مسائل خواہ مختصر ہوں جیسے ایک خاندان یا وسیع ہوں جیسے پورا معاشرہ خواہ مادی ہوں یا معنوی
[...] اقتصادی ثقافتی و سیاسی مسائل غرض زندگی کا کوئی گوشہ فقہی حکم سے خالی نہیں ہے۔

[...] قرآن مجید واضح لفظوں میں بیان کرتا ہے:۔

[...]ما فرطنا فی الکتاب من شیئ (انعام/۳۸)

[...]ہم نے کسی چیز کو قرآن میں فراموش نہیں کیا ہے۔

[...]ا ہے:۔

و نزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیئ (سورۂ نحل/آیت ۸۹)

ہر چیز قرآن میں بیان کر دی گئی ہے۔

اگر ہم "کل شیئ" کی تفسیر ہر چیز کے وسیع مفہوم سے نہ بھی کریں تو کم از کم اس میں انسان کی سعادت
[...]ی سے متعلق تمام امور تو آہی جاتے ہیں اور ایک خاص یا جزئی حکم یا مطلق و عمومی حکم کے تحت قرآن
[...]س ہوتے ہیں۔

اسلامی احادیث میں اپنی ذاتی رائے سے فتوا دینے یا فیصلہ کرنے کی شدت سے ممانعت کی گئی ہے
[...]ب کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں:۔

من حکم برأیہ بین اثنین فقد کفر

جو شخص اپنی رائے سے دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کرے، وہ کافر ہے۔[۱]

---

[۱] [...]شیعہ، جلد ۱۸ حدیث ۴۵، باب ششم از ابواب صفات قاضی۔ اس باب میں اسی مضمون کی دوسری حدیثیں بھی مختلف عبارتوں میں ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جسے ذکر نہ کیا گیا ہو کہ انسان کو اپنی رائے اور اپنی مصلحت پر عمل کرنے کی احتیاج ہو۔

"بدعت" کو اسلام میں شدت سے حرام قرار دیا گیا ہے، تو اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ اسلامی احکام خود اتنی ہمہ گیری اور جامعیت رکھتے ہیں کہ کسی دوسرے حکم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی روایات میں "قیاس" کی حرمت اور اس کی شدید مذمت بھی اسی بنا پر کی گئی ہے کیونکہ جب ہر مسئلہ کے لئے ایک حکم وضع کیا جا چکا ہے تو قیاس کے ذریعہ کسی دوسرے حکم کے استنباط کی نوبت ہی پیش نہیں آتی۔

امام باقرؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:۔

ایاك واصحاب القیاس فی الدین فانهم ترکوا علم ما وکلوا به وتکلفوا ماقد کفوه

دین میں قیاس کرنے والوں سے پرہیز کرو کیونکہ جو علم انھیں حاصل کرنا چاہئے اسے انھوں نے چھوڑ دیا اور ایسی چیز کو اپنایا جس سے وہ بے نیاز ہیں۔[1]

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک اسلامی فقیہ کو قیاس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسلامی فقہ میں ہر مسئلہ و موضوع سے متعلق حکم الٰہی موجود ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اکثر احکام ایک کلی اصول کے تحت نازل کئے گئے ہیں جن سے ہزاروں حکم نکلتے ہیں۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

انما علینا ان نلقی الیکم الاصول وعلیکم ان تفرعوا

ہم پر لازم ہے کہ اصول تمہیں بتا دیں اور تم پر لازم ہے کہ ان اصولوں سے شاخ در شاخ احکام حاصل کرو۔[2]

اور امام علی رضاؑ نے فرمایا:۔

علینا القاء الاصول وعلیکم التفریع

یعنی ہمارا فریضہ احکام کے اصول تم تک پہنچا دینا ہے اور ان سے جزئی احکام کا معلوم کرنا تمہارا فرض ہے۔[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ حدیث ۲۴ باب ششم [2] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ حدیث ۵۱ باب ششم [3] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ حدیث ۵۲ باب ششم

اکثر اسلامی روایات میں احکام جزئیات بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں تاکہ یہ تصور نہ پیدا ہو کہ
ن ہی پر انحصار کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید بھی جو قوانین کے بیان کرنے کے سلسلہ میں معمولاً
سے کام لیتا ہے اور زیادہ تر اس کا حکم دستور اساسی کی حیثیت رکھتا ہے اکثر فقہی احکام کو اس قدر
ور تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔
مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی ۲۸۲ ویں آیت جو قرآن کی طویل ترین آیت ہے اور معاملات یا قرض
ع پر تحریری دستاویز کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، اس موضوع کے تحت "اٹھارہ فرعی حکم" کو
بیان کرتی ہے۔ ناظرین محترم کتب تفاسیر سے اس آیت کی تفسیر و توضیح معلوم کر سکتے ہیں۔ میرے
، اس طرح کے مسائل کے تحت قرآن کی یہ خاص روش شاید اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ
ندگی کا کوئی موضوع اسلامی حکم سے خالی نہیں اور اس کی مثال یہی آیت ہے جس میں تحریری
ز کی تنظیم کے سلسلہ میں تمام باریکیوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

اجتہاد — عمومی اور خصوصی معنوں میں

فقہ شیعہ خصوصاً اس حیثیت سے کافی واضح ہے۔ شیعہ فقہاء کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام کے تمام
ا کی طرف سے معین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اجتہاد کے خصوصی معنی کے سخت مخالف ہیں اور
ومی معنی کو صحیح و درست مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باب اجتہاد کسی دور میں بند نہیں ہوتا۔
س اجمال کی وضاحت یہ ہے کہ اسلامی احکام میں اجتہاد کے دو الگ الگ مفہوم پائے جاتے ہیں۔
اجتہاد یعنی فقہی مآخذ و مصادر سے اسلامی احکام کا استنباط کرنا۔ یہ صورت فقہ کی مذکورہ
سے زیادہ فرق نہیں رکھتی اس نظریہ کے تحت مجتہد وہ ہے جو کتاب و سنت سے تمام احکام
ں کے استنباط کی کافی استعداد رکھتا ہو۔ اپنے ذاتی عقیدہ اور رائے کا اظہار نہ کرتا ہو۔
س لحاظ سے مجتہد کا کام کتاب و سنت، اجماع و عقل کے ذریعہ مسلمانوں تک احکام الٰہی کا
ر پایا اور بس وہ خود ایک قانون ساز کی حیثیت نہیں رکھتا۔ دوسرے لفظوں میں مجتہد
کے ذریعہ سے قوانین اسلامی کو درک کرتا ہے شریعت میں خود کوئی دخل اندازی نہیں کرتا۔
لیکن اجتہاد کے "خصوصی" معنی کے تحت خصوصیت سے "مالا نص فیہ" (یعنی جہاں کوئی آیت

یا روایت وارد نہ ہوئی ہو) اور مجتہد قیاس کے ذریعہ اس کا حکم کشف نہ کر سکے تو اس موضوع کے مصالح و مفاسد معلوم کر کے اس کے لئے ایک حکم یا قانون وضع کرے اور اسے ایک اسلامی حکم کی حیثیت سے اعلان و نشر کرے۔

درحقیقت اس معنی کے مطابق مجتہد "مالانص فیہ" کی حدوں میں آنے والے موارد میں قانون سازی کا حق رکھتا ہے اور خود اپنی فکر کے مطابق شرعی قانون ڈھال سکتا ہے۔ علماء شیعہ اس نظریہ کے مخالف ہیں۔ اجتہاد کے خصوصی معنی کے حامیوں کا نظریہ یہ ہے کہ مجتہد اس طریقہ سے جو بھی حکم صادر کرے گا وہ خداوند عالم کی جانب سے بھی قابل تسلیم ہوگا اور اسے ایک شرعی حکم کی حیثیت حاصل ہوگی۔

یہ لوگ اسی نکتہ پر سخت مشکلات کے شکار ہوئے ہیں کیونکہ زیادہ تر علماء ایک دوسرے سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں ممکن ہے کہ کسی خاص مورد میں ہر مجتہد اپنا ایک الگ نظریہ رکھتا ہو اور یہ تمام حکم ایک دوسرے سے تضاد و ٹکراؤ رکھتے ہوں۔

لیکن کیا یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام میں کسی ایک موضوع سے متعلق دو متضاد حکم پائے جاتے ہوں اور لطف یہ کہ دونوں حکم بیک وقت "حکم خدا" بھی شمار ہوتے ہوں؟!

ان لوگوں نے اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے "تصویب"[1] کے نظریہ کو اپنایا اور کہنے لگے کہ ان تمام متضاد حکموں کے حکم خدا ہونے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ہر وہ حکم جسے کسی مجتہد نے قبول کیا ہو اس کے مقلدین کے لئے قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے موارد میں "واقعی حکم خدا" متعدد ہے اور ہر گروہ اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق ایک خاص حکم پر عمل کرے گا اگرچہ موضوع اور مسئلہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ "تصویب" باطل ہے۔

علماء شیعہ نے مکتب اہل بیتؑ کی روشنی میں تصویب کے اس معنی سے انکار کیا ہے اور مختلف جہات سے اسے غلط و نارسا قرار دیا ہے۔

الف۔ اس نوعیت کے اجتہاد کے نتیجہ یعنی تصویب پر اعتقاد رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسلام کو ناقص جانتے ہیں اور وہ ہماری احتیاجات اور ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا اور وہ

---

[1] تصویب

خدا جو ہر چیز سے آگاہ اور قیامت تک کے لئے انسانوں کی تمام احتیاجات وضروریات سے باخبر ہے اس نے اپنے قوانین کی تکمیل کے لئے خود لوگوں کے افکار سے مدد لی ہے۔ وہ ایسے اصول وضوابط امت کے دانشوروں کے حوالے کر سکتا ہے جن کی روشنی میں وہ اپنی تمام قانونی ضرورتوں کو پورا کر سکیں (جیسا کہ اس نے کیا بھی ہے)

بنابریں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ "ما لا نص فیہ" کے ذریعہ خود لوگوں کو قانون سازی کا اختیار دے دیا جائے۔ اصولی طور پر ایک مکمل آئین میں "ما لا نص فیہ" کوئی مفہوم ہی نہیں رکھتا

امیر المومنین علیؑ نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں بڑے بلیغ انداز میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

ترد علی احدھم القضیۃ فی حکم من الاحکام فیحکم فیھا برأیہ، ثم ترد تلک القضیۃ بعینھا علی غیرہ فیحکم فیھا بخلاف قولہ ثم یجتمع القضاۃ بذلک عند الامام الذی استقضاھم فیصوب آراءھم جمیعا، و الٰھھم واحد ونبیھم واحد، وکتابھم واحد افامرھم اللہ - سبحانہ - بالاختلاف فأطاعوہ؟ ام نھاھم عنہ فعصوہ؟ ام انزل اللہ سبحانہ دیناً ناقصاً فاستعان بھم علی اتمامہ ام کانوا شرکاء لہ فلھم ان یقولوا وعلیہ ان یرضیٰ؟! ام انزل اللہ سبحانہ دیناً تاماً فقصّر الرسولؐ عن تبلیغہ وادائہ؟! واللہ سبحانہ یقول" ما فرطنا فی الکتاب من شیئ (وفیہ تبیان لکل شیئ)

ایک دعویٰ پیش ہوتا ہے اور قاضی اپنی رائے کے مطابق حکم صادر کرتا ہے اور وہی مقدمہ دوسرے قاضی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ پہلے قاضی کے خلاف اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد تمام قاضی اپنے پیشوا و امام کے پاس جمع ہوتے ہیں جس نے انھیں قاضی معین کیا ہے۔ وہ ان سب کی رائے کو صاد کرتا اور سب کے فتووں کو درست قرار دیتا ہے جبکہ ان سب کا خدا ایک، پیغمبرؐ ایک اور کتاب ایک ہے۔

کیا خداوند عالم نے انھیں اختلاف کا حکم دیا جن کی انہوں نے اطاعت کی؟ یا اس نے اختلاف سے روکا تھا جسے انجام دے کر وہ معصیت کا شکار ہوئے؟! یا پھر خداوند عالم نے ناقص دین نازل فرمایا اور اس کی تکمیل کے لئے ان لوگوں سے مدد مانگی ہے؟ یا یہ لوگ خدا کے شریک ہیں اور

یہ جو کچھ کہیں خدا پر لازم ہے کہ اس پر اپنی رضا کا اظہار کرے یا پھر یہ کہ خود خداوند عالم نے تو کامل دین نازل فرمایا تھا لیکن پیغمبرؐ نے اس کی تبلیغ میں کوتاہی سے کام لیا؟ جبکہ خداوند عالم فرماتا ہے "ہم نے قرآن میں کسی بھی شئی کو فراموش نہیں کیا" نیز فرماتا ہے کہ "قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔"

ب۔ تصویب کے باطل ہونے کی دوسری وجہ امت کی ناہم آہنگی ہے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ آئین جس کی بنیاد توحید پر قائم کی گئی ہو واحد قانون کے تابع نہ ہو اور لوگوں کو اس کا حق دے کہ "مالا نص فیہ" میں اپنی فکر و سلیقے کے مطابق متضاد قوانین ڈھالیں اور اسے شرعی جامہ پہنائیں۔

اصولی طور پر ایک معاشرہ میں کسی ایک موضوع کے تحت مختلف و متضاد قوانین کا وجود خود قانون کی حیثیت کو پامال کر دیتا ہے اور آخر کار اس قانون سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

ج۔ ہم پیغمبروں کی بعثت کی ضرورت کے سلسلہ میں یہ کہتے ہیں کہ انسان کامل قوانین کے ادراک سے عاجز ہے ان قوانین کا بنانے والا صرف خدائے واحد ہے جو انسان کا خالق ہے وہ اس کی تمام جسمانی و روحانی احتیاجات سے واقف اور اس کے گذشتہ و آئندہ کی روشنی میں اس کی آج کی ضرورتوں سے باخبر ہے۔

پھر بلا کیسے ممکن ہے کہ ہم اچانک اس بنیادی اصل کو چھوڑ کر اس بات کا اقرار کرلیں کہ فقیہ کو ان موارد میں جہاں اسے آیت یا روایت کی صورت میں کوئی نص نہیں ملتی خود اپنی فکر و سلیقہ کے تحت قانون وضع کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ حق نہ صرف ایک شوریٰ یا جماعت کو حاصل ہے بلکہ ہر فقیہ فرداً فرداً یہ اختیار رکھتا ہے۔ اگر ایسا ممکن ہے تو پھر پیغمبروں کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی!

د۔ اصولی طور پر "مالا نص فیہ" کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ہماری نگاہ میں کوئی فقہی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو کتاب خدا، سنت، دلیل عقل اور اجماع کے عموم و خصوص کی حدود میں نہ آتا ہو۔ اگر ہم تمام فقہی مباحث کا جائزہ لیں تو ہمیں کسی جگہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ملتا جو اس وسیع دائرہ سے خارج ہو۔

بنیادی طور پر علماء اصول کے نظریہ کے مطابق جہاں ہمیں کسی مسئلہ کے لئے کوئی قطعی یا معتبر ظنی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹

توحید ۸۰

دلیل نہیں ملتی وہاں "اصول عملیہ" کا وجود پایا جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اصول عملیہ ایک طرح کا "حصر عقلی" رکھتے ہیں۔ یعنی تمام موارد ان ہی چار اصول عملی (یعنی اصل برائت، اصل احتیاط، اصل تخییر اور اصل استصحاب) میں محصور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح احکام اسلامی میں قانون ساز قسم کے اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فقہ اسلامی اور خصوصیت سے اہل بیتؑ کے فقہی مکتب فکر کی روشنی میں اسلامی احکام و قوانین، انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور اس کی تمام احتیاجات یا "کلی قاعدوں" یا "جزئی احکام" کے دائرہ میں آجاتی ہیں۔

فقہ اسلامی کی ہمہ گیری کو اس قدر سمجھنے کے بعد بھی کیا ہم ان سیاسی مسائل کو دین سے جدا کر سکتے ہیں جو انسانی زندگی کے مہم ترین حصوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یا پھر دین ایسی سیاست سے الگ ہو سکتا ہے۔ سیاسی مسائل ان اہم ترین مسائل میں سے ہیں جو کتاب و سنت، اجماع و عقل کے تحت آتے ہیں اور حقیقتاً کوئی سیاسی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حکم اسلام میں معین نہ کیا گیا ہو۔

البتہ ان احکام کی کلی و عمومی حیثیت فقیہ کے لئے راہ معین کرتی ہے کہ ان کی روشنی میں ہر زمانہ اور عہد کی ضرورتوں کو "فرد پر کل کی مطابقت" کے ذریعہ طے کرے اور اس میں اسلامی مقاصد کو عملی جامہ پہنائے۔

روزہ داروں کی جزاء

عن النبیؐ :

اَلصَّائِمُ فِی عِبَادَةِ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَ نَائِمًا عَلٰی فِرَاشِہٖ

مَالَمْ یَغْتَبْ مُسْلِمًا {کافی ۔ ج ۴ ۔ ص ۶۴}

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ؛ کہ روزہ دار اگر فرشِ خواب پر سویا بھی رہے تب بھی خدا کی عبادت میں مشغول ہے ۔ کیونکہ وہ اس وقت تک اپنے مسلمان بھائی کی غیبت سے محفوظ رہے گا ۔

پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے :

نَوْمُ الصَّائِمِ عِبَادَةٌ وَنَفَسُہُ تَسْبِیْحٌ

{بحار الانوار ج ۹۶ ص ۲۴۸}

روزہ دار کی نیند عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی ہر سانس تسبیح الٰہی کا ثواب ۔

جناب جعفر سبحانی
ترجمہ: جناب خادم حسین

اسلامی حکومت میں قانون سازی

زمین پر انسان کی سماجی زندگی کی توسیع اور جنگلوں و بیابانوں سے بساط زندگی کا خاتمہ اس بات کی نشانی ہے کہ انسان فطری طور پر سماجی زندگی کا خواہاں ہے تاکہ تعاون و امداد باہمی کے ذریعہ دشواریوں پر قابو پاسکے۔

دوسری طرف انسان ایک خود خواہ موجود ہے اور "حب ذات" اس کی فطرت میں مضمر ہے، وہ ہر شئ کو اپنے دائرہ اختیار میں لینا چاہتا ہے اور اگر کبھی سماجی قوانین و مقررات کو قبول کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف ضرورت و مجبوری ہے اور اگر ضرورت کارفرما نہ ہو تو ہرگز اجارہ داری سے دست بردار نہیں ہوتا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی موقعہ پاتا ہے دوسروں کا حق ضائع کرنے میں کسی طرح کا تامل نہیں کرتا۔

اس اعتبار سے تمام دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ ایک صحیح انسانی سماج قائم کرنے کے لئے بنیادی ڈھانچہ ضروری ہے تاکہ اس کی روشنی میں افراد کے حقوق اور سماجی زندگی میں انسانوں کی ذمہ داریوں کو نمایاں کیا جاسکے۔ یہ ڈھانچہ ان ہی سماجی قوانین میں ہے جو ایک انسانی سماج کے لئے بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہوگا کہ اس اعلیٰ ڈھانچے کو کون تیار کرے؟

اجمالی طور پر یہ کہنا چاہیئے: واضع قانون انسانی سماج کو اپنے بنائے ہوئے فردی و اجتماعی منصوبوں کے سہارے درجۂ کمال تک پہنچانا اور افراد کی ذمہ داریاں نیز ان کے حقوق فراہم و معین

کر کے ان کی جسمانی و روحانی سعادت فراہم کرنا چاہتا ہے۔
اس صورت میں واضع قانون کو درج ذیل دو شرطوں کا حامل ہونا چاہئے۔

۱۔ واضع قانون کو انسان شناس ہونا چاہئے۔

اگر وضع قانون سے مراد انسان کی جسمانی و روحانی ضروریات کو پورا کرنا ہے تو واضع قانون کو انسان کے جسمانی و روحانی تمام اسرار و رموز سے واقف ہونا چاہئے، جس طرح ڈاکٹر کا نسخہ تب ہی صحیح و کامل مانا جاتا ہے جب وہ بیمار کے تمام حالات سے باخبر ہو اور اس کی مزاجی کیفیت و نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے نسخہ مرتب کرے۔
دوسرے الفاظ میں: قانون گذار کو انسان شناس ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر سماجیات بھی ہونا چاہئے۔
انسان شناس ہونا ضروری ہے تاکہ انسانوں کے غرائز و عواطف سے آگاہ و باخبر رہے اور ان کے جذبات و خواہشات کا صحیح اندازہ لگا کر ہدایت دے سکے۔
سماجیات کا ماہر ہونا ضروری ہے تاکہ معاشرے میں افراد کی ذمہ داریوں، ان کے اعمال کی خوبیوں و خرابیوں، سماجی زندگی کے رد عمل اور انسانی تعلقات کے اثرات سے بخوبی آگاہ ہو سکے۔

۲۔ ہر طرح کے مفاد پرستی سے عاری ہونا چاہئے۔

واقعیت اندیشی اور انسانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ واضع قانون قانون وضع کرنے میں ہر طرح کی "حب ذات" اور "مفاد پرستی" سے عاری ہو، چونکہ جذبۂ خود خواہی واضع قانون کو اندھا کر دیتا ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی عادل و انصاف پسند کیوں نہ ہو خواہ ناخواہ مفاد پرستی و حب ذات کا شکار بن جاتا ہے۔
اب یہ دیکھیں کہ مذکورہ دو شرطیں کہاں پورے طور پر یکجا جمع ہو سکتی ہیں؟
اگر یہی طے پائے کہ قانون گذار کو انسان شناس ہونا چاہئے تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ خدا سے بڑھ کر کوئی انسان شناس نہیں ہو سکتا اور خالق سے زیادہ کوئی بھی اپنی مخلوق کے اسرار

و رموز سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔

اتفاقاً خود قرآن مجید میں اس موضوع پر اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے۔

الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر (ملک/۱۴)

بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے اور وہ تو بڑا باریک بیں واقف کار ہے۔

وہ خدا جو ذرات عالم کا پیدا کرنے والا، بے شمار خلیے وجود میں لانے والا اور انسانی وجود کے مختلف حصوں کو جوڑنے والا ہے قطعی طور پر پوشیدہ و آشکار ضروریات اور اپنی مخلوق کے سود وزیاں کے بارے میں دوسروں سے زیادہ واقف ہے۔

وہ اپنے وسیع علم کے ذریعہ افراد کے مابین تعلقات، ان تعلقات کے عمل و ردعمل، وہ ذمہ داریاں جو معاشرے کو انسجام بخشتی ہیں اور وہ تمام حقوق جو ہر انسان کے شایان شان ہے سب سے پوری طرح واقف ہے۔

دوسری شرط، یہ کہ قانون وضع کرنے میں ہر طرح کے مفاد پرستی سے عاری ہو، خدا کے سوا یہ شرط کسی دوسرے میں پائی نہیں جاتی، اس لئے کہ صرف خدا ہے جو ہمارے سماج سے کسی بھی فائدے کی توقع نہیں رکھتا اور ہر طرح کی خواہشات خاص طور پر خود خواہی سے پاک ومنزہ ہے، جبکہ بشریت کے تمام افراد کم وبیش حب ذات وخود خواہی جو صحیح وضع قانون کے لئے آفت ہے اس کے شکار ہیں اور جتنا بھی خود کو اس آفت سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں پھر بھی خود کو اس کا شکار پاتے ہیں۔

"جان جاک روسو" کے قول کے مطابق: اقوام عالم کے کام آنے والے بہترین قوانین بنانے کے لئے ایک ایسی عقل کامل کی ضرورت ہے جو تمام انسانی خواہشات کو دیکھے لیکن خود اس کی شکار نہ ہو۔ فطرت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو لیکن اس سے اچھی طرح واقف ہو، اس کی آسائش وخوش بختی کا تعلق ہم سے نہ ہو لیکن وہ ہمارے لئے اسباب آسائش وخوش بختی فراہم کرنے کے لئے تیار ہو، غرض یہ کہ ان افتخارات پر اکتفا کرے جو زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ آشکار ہوں، یعنی ایک صدی تک خدمت کرے اور دوسری صدی میں نتیجہ اخذ کرے[۱]۔

---

[۱] قرارداد اجتماعی، ترجمہ زیرک ص۸۱

اس مختصر مقدمہ کے بعد درج ذیل مسائل کا تجزیہ و تحلیل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اسلامی حکومت میں وضع قانون کا طریقہ۔

۲۔ ثابت و متغیّر قوانین۔

۳۔ اجتہاد کا رول۔

۴۔ مجتہدین و فقہاء کا مقام۔

۵۔ اسلامی حکومت میں اختلاف فتاویٰ اور اس کا حل۔

۶۔ مجلس شورای اسلامی کا کردار کیا ہے؟

۷۔ اسلامی حکومت کا سرکاری مذہب کس طرح معیّن کیا جاتا ہے۔

۸۔ اسلامی حکومت میں اقلیتوں کے حقوق۔

مذکورہ عناوین کے بارے میں مختصر طور پر بحث پیش کریں گے۔

۱۔ اسلامی حکومت میں قانون گذاری کا طریقہ:

اس موضوع سے متعلق قرآن مجید کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کوئی قوۂ مقننہ نہیں خواہ وہ انفرادی ہو یا گروہ کی شکل میں ہو، سوائے خدا کوئی واضع قانون و شارع وجود نہیں رکھتا، جہاں تک فقہاء و مجتہدین جیسے دوسرے افراد کی بات ہے وہ سب ایسے قانون داں ہیں جو قوانین کے مآخذ کی طرف رجوع کرکے احکام الٰہی کو بیان کرتے ہیں۔

قرآنی آیات کا جائزہ لینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تقنین و تشریع کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے اور نظام توحید میں کسی کی رائے کسی کے حق میں حجت و نافذ نہیں اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آراء و افکار سماج کے افراد پر زبردستی تھوپے اور طاقت کے بل بوتے پر نفاذ کے لئے لوگوں کو دعوت دے۔

توحیدی نظام میں بقول پیامبر گرامیؐ انسانی معاشرے کے تمام افراد کنگھی کے مانند ہیں جس میں کسی ایک کو دوسرے پر برتری و فضیلت نہیں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ کوئی فرد یا گروہ کسی ایک فرد یا گروہ کے مفاد یا نقصان میں کوئی قانون بنائے اور لوگوں کو اس پر عمل درآمد کا حکم دے۔ مساوات کا اعلیٰ نمونہ پیغمبر گرامیؐ کے اس قول میں ملتا ہے:

"الناس امام الحق سواء" تمام انسان حق و قانون کے سامنے برابر و یکساں ہیں۔

اس اعتبار سے قانون معاشرے کے تمام افراد کے حق میں بلا امتیاز و تفریق جاری و نافذ ہوگا۔

ؔ من لا یحضر ج ۴ ص ۲۷۲ ؔ تحف

اسلام نے ساسانی دور کی ظالمانہ طبقہ بندی سے جس میں کچھ لوگوں نے خود کو قانون سے مافوق سمجھ رکھا تھا اور کچھ نے قانون کی حمایت حاصل کر رکھی تھی اچھی طرح مقابلہ کیا ہے۔

طاغوتی نظام (جو ایران کے متعہد و ذمہ دار مذہبی سربراہوں اور مسلمان عوام کی ہمت و کوشش سے ختم ہوا) میں بادشاہ شہزادے اور تمام درباری افراد ٹیکس کے قانون سے معاف تھے، گویا اربوں، کروڑوں ڈالر رکھنے کے باوجود قابل رحم و معافی تھے جبکہ ملک کے دوسرے افراد یہاں تک کہ فقیر و نادار افراد ان پر عائد ٹیکس کا بوجھ بھی اپنے کاندھوں پر اٹھاتے تھے اور سوئی دھاگے تک کا ٹیکس بھی پیش کرنے پر مجبور تھے۔

وہ آیتیں جو قانون سازی کی محدودیت پر دلالت کرتی ہیں:

وہ آیتیں جو قانون سازی کو صرف خدا کا حق گردانتی ہیں اور کسی دوسرے کو اس حد میں داخل ہونے نہیں دیتیں زیادہ ہیں، ان میں سے کچھ پیش کی جاتی ہیں۔

حکم و حاکمیت صرف خدا کے لئے ہے۔

اس حصے سے متعلق آیتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسرے کو حکم و قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔ جیسے

ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم و اباءکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (یوسف/۴۰)

تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر بس ان چند ناموں ہی کی پرستش کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے گڑھ لیا ہے خدا نے تو ان کے لئے کوئی غالب دلیل نہیں نازل فرمائی حکومت تو بس خدا ہی کے واسطے خاص ہے۔ اس نے تو حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے مگر بہتیرے لوگ نہیں جانتے ہیں۔

جملہ "ان الحکم الا للہ" سورۂ یوسف میں دو بار وارد ہوا ہے، ایک تو مذکورہ بالا آیت

اور دوسری آیت ۶۷ اسی سورہ میں جسے ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

وقال یا بنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ وما اغنی عنکم من اللہ من شئی ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون۔" (یوسف/۶۷)

اور یعقوبؑ نے (نصیحتاً) چلتے وقت بیٹوں سے) کہا اے فرزندو! سب کے سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، متفرق دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اس کو جو خدا کی طرف سے (آئے) ٹال نہیں سکتا حکم تو (صرف خدا ہی کے واسطے ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

عربی لغت میں (حکم) سے مراد فرمانروائی ہے۔ کبھی کبھی تخلیقی وتکوینی فرمانروائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس اعتبار سے کہ پوری کائنات اس کے ہی قبضۂ قدرت وتدبیر میں ہے۔

دوسری آیت میں (ان الحکم) سے مراد یہی ہے اور دوسرے جملے بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جب حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی ہدایت دیتے ہیں اور کامیابی کی راہ دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا تو فوراً یہ بھی فرماتے ہیں کہ میرے بس میں کوئی کام نہیں، کائنات کے سارے امور خدا کے ہاتھ میں ہیں اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

آیۂ کریمہ کا لہجہ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مقصد خدا کی تکوینی حکومت وفرمانروائی کو بیان کرنا ہے، جس کے بارے میں دوسرے مقام پر اس جملے "لہ ملک السموات والارض" (حدید/۲) کے ذریعہ ارشاد کیا گیا ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقصد یہی ہے کہ دنیا کے تمام امور خواہ شکست سے ہو یا کامیابی وکامرانی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جبکہ پہلی آیت میں اس سے مراد تشریعی فرمانروائی ہے، یعنی خدا کا مقام و مرتبہ اس بات کا حقدار ہے کہ وہ امر ونہی کرے اور جائز وناجائز کرے، لہٰذا یہی وجہ ہے کہ بلا فاصلہ فرماتا ہے:۔

"امر الا تعبدوا الا ایاہ" اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

گویا جملہ "ان الحکم الا للہ" کے باوجود کوئی سوال کرتا ہے:

حکم وقانون سازی کا اختیار تو صرف خدا کو حاصل ہے پرستش وعبادت سے متعلق خدا

کا حکم کیا ہے؟ فوری طور پر جواب دیتا ہے: "امر الا تعبدوا الا ایاہ" اس جملہ "ان الحکم الا للہ" سے مراد وہ حکومت ہے جس کی بنیاد و نتیجہ تشریعی فرمانروائی و قانون ساز قدرت ہے اور یہ مقام و مرتبہ مکمل طور پر خدا کے دائرۂ اختیار میں ہے نہ کسی کو اس مقام و مرتبہ میں دخل دینے کا حق حاصل ہے اور نہ کوئی شخص بغیر اجازت کوئی قانون بنا سکتا ہے نہ کسی کی ذمہ داری معین کر سکتا ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ فرمانروائی خواہ کتنی ہی ظالمانہ اور طاغوتی کیوں نہ ہو قانون و ضابطے کے بغیر انجام پا نہیں سکتی اور اگر جنگلی طرز زندگی سے چشم پوشی کر لیں جسے کسی بھی قیمت پر انسانی زندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا، کوئی بھی تہذیب و معاشرہ خواہ کتنا ہی توحیدی نظام سے دور کیوں نہ ہو حکومت و فرمانروائی کے مسئلہ میں بغیر ضابط و قانون نہیں رہ سکتا۔ اگر مذکورہ آیتیں حکومت و فرمانروائی صرف خدا کے لئے گردانتی ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد جو کہ تشریع و قانون سازی ہے وہ بھی صرف خدا کے لئے ہی ہوگی۔

دوسرے الفاظ میں، حکومت کی روح اس کی اچھائی و برائی کا مظہر وہ قوانین ہوتے ہیں جو اس پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات حقیقت سے دور نظر آتی ہے کہ فرمانروائی و حکومت تو خدا کے لئے ہو لیکن قانون سازی اور اس کے ضابطے انسان کے دائرہ اختیار میں ہوں۔

۲۔ ثابت و متغیر قوانین

یہاں پر ایک عام سوال اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا کے ماسوا کوئی واضع قانون اور وحی کے ذریعہ نازل ہونے والے قوانین کے ماسوا جو کتاب و سنت میں پائے جاتے ہیں، کوئی قانون وجود نہیں رکھتا تو اس صورت میں معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات پر ثابت آسمانی قوانین کے ذریعہ کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے؟

دوسرے الفاظ میں، ترقی کی راہ پر گامزن معاشرے کے لئے ترقی یافتہ اور متغیر قوانین کی ضرورت ہے جبکہ آسمانی قوانین ثابت و ناقابل تغییر ہیں۔

جواب: خاتمیت سے متعلق تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام میں دو طرح کے قانون ہیں۔

۱۔ ثابت وناقابل تغییر قوانین جس میں کسی طرح کے جوڑ توڑ کی گنجائش نہیں۔
۲۔ متغیر اصول ومقررات جن میں حالات اور تقاضوں کی بنیاد پر تغییر وتبدیلی آتی ہے۔
جب قرآنی آیات وضاحت کے ساتھ تشریعی وحدت کو ثابت کر رہی ہیں تو قوانین کے اس کے دوسرے حصے میں تشریعی فرمانروائی کی کیا صورت ہوگی؟

جواب:

قوانین ومقررات کے اس حصّے میں جہاں زمانے کی رفتار وحالات میں تبدیلی آنے کے نتیجہ میں ان کی شکل وصورت میں تبدیلی آتی ہے کچھ ایسے ثابت اصول بھی پائے جاتے ہیں جن کی کسی بھی قیمت پر خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، تبدیلی ہمیشہ قانون کی شکل وصورت میں آتی ہے خود قانون میں نہیں۔

بعنوان مثال دوسرے ملکوں سے اسلامی حکومت کے تعلقات مختلف شکلوں میں ہو سکتے ہیں۔ کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوسکتا ہے کہ حکومت وقت دوستی کا ہاتھ بڑھائے اور دوستانہ تعلقات قائم کرے، اپنے سیاسی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات کو مزید وسعت بخشے اور کبھی حالات کا تقاضا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات منقطع کر دے یا کم سے کم تجارتی وثقافتی تعلقات کو معینہ مدّت ختم یا محدود کر دے، لیکن یہ تبدیلی قانون کی شکل وصورت یا طریقۂ نفاذ میں آسکتی ہے خود قانون میں نہیں، قانون کی اصلی شکل وصورت میں کبھی بھی تبدیلی نہیں آتی، اس لئے کہ اسلامی فرمانروا کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی مفادات اور مسلمانوں کی برتری کو محفوظ رکھے، اسلامی ملک کو کافروں اور سامراجیوں کے چنگل میں جانے سے بچائے، یہ قانون آیۂ کریمہ "ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا" (نساء/۱۴۱) کا لبّ لباب ہے۔

لہٰذا اسلام کی عزّت وآبرو کی حفاظت کبھی تعلقات ختم کرنے پر منحصر ہوتی ہے تو کبھی تعلقات قائم کرنے پر۔

اسی طرح اسلامی دفاع سے متعلق ایک کلّیہ ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ (انفال/۶۰)

اور ان کفار کے مقابلے کے واسطے جہاں تک تم سے ہوسکے۔ طاقت کا سامان

مہیا کرو۔

یہ قانون جو دنیا کی دوسری فوجوں پر اسلامی فوج کی برتری ظاہر کر رہا ہے ہرگز بدل نہیں سکتا زمانے کی رفتار کے ساتھ تبدیلی اگر آتی ہے تو صرف اس کی صورت و شکل یا طریقہ نفاذ میں آتی ہے ۔ گذشتہ زمانے میں اسلامی فوج کی طاقت و توانائی کا اندازہ تلوار و تیر و کمان چلانے کی مہارت سے کیا جاتا تھا اور اب یہ قانون دوسری صورت میں نافذ ہوتا ہے، اس اعتبار سے اسلامی فوج کو زمینی، ہوائی اور دریائی میدانوں میں جدید سے جدید ہتھیاروں سے آراستہ ہونا چاہئے۔

غرض یہ کہ تشریع الہٰی کبھی بھی بندوں کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتی، یہاں تک کہ مقررات کے اس حصے میں بھی قانون کی بنیاد و روح کا تذکرہ کیا گیا ہے قانون کی صرف ظاہری شکل اسلامی فرمانروا کے اختیار میں ہوتی ہے۔

۳- اجتہاد کا کردار

اجتہاد: صحیح طریقے سے اسلامی مقررات کو قرآن، روایت، اجماع، عقل کی مدد سے سمجھنے کی عالمانہ کوشش کو کہتے ہیں، اجتہاد اور تفقہ جسے اسلام کی قوۂ محرکہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسلام کی حیات جاوید کا ایک سبب ہے۔ اس لئے کہ اسی طریق سے ہر مسئلہ کا حکم قرآن و احادیث سے حاصل کر کے دوسروں کے بنائے ہوئے قانون سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی فقہ کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اجتہاد آج کی پیداوار نہیں بلکہ پیغمبر اسلام ؐ اور دیگر ائمہؑ کے زمانے میں بھی رائج تھا، البتہ یہ بات ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت کے اجتہاد اور آج کے اجتہاد میں کافی فرق ہے۔

اس زمانے کا اجتہاد آسان اور زحمت سے خالی تھا، اس لئے کہ وہ قرآن جو فہم احادیث کو آسان کرتے ہیں فراوانی کے ساتھ موجود تھے پھر یہ کہ جس آیت و روایت میں ابہام و پیچیدگی ہوتی تھی وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امامؑ سے دریافت کر سکتے تھے اور اپنے شک و شبہ و تردید کو دور کر سکتے تھے لیکن جیسے جیسے اس دور سے ہم دور ہوتے گئے، اختلاف آراء و روایات اور کچھ راویوں کے بارے میں شک و شبہ کے نتیجہ میں اجتہاد نے فنی شکل اختیار کرلی

اور آئے دن امت مسلمہ کی ضرورت اس کی نسبت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

یہ جاننے کے لئے کہ پیغمبر اسلامؐ کے اصحاب کرام کے درمیان بھی اجتہاد رائج تھا، بہت سی روایات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن صرف دو روایتوں پر آپ حضرات کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔

۱۔ جب معاذ بن جبل رسول گرامیؐ کی جانب سے راہی یمن ہو رہے تھے اس وقت آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا:

فیصلہ کرتے وقت تم کن مآخذ سے استفادہ کرو گے؟

کہا: قرآنی آیات سے۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: اگر فیصلہ طلب مسئلہ کو حل کرتے وقت تمہیں وہ آیت نہ ملی جس میں اس سے متعلق حکم بیان ہوا ہے تو کیا کرو گے؟

کہا: جو احادیث آپ سے سنی ہیں اور میرے پاس موجود ہونگی ان سے استفادہ کروں گا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر خاص اس مسئلہ سے متعلق کوئی حدیث نہ سنی ہو تو کیا کرو گے۔

کہا: اجتہاد سے کام لوں گا، یعنی وہ کلیات وضوابط جو قرآن اور آپ کی روایات کی بنیاد پر استوار ہیں ان کی مدد سے اس مسئلہ کا حکم استنباط کروں گا۔

رسول گرامیؐ خوش ہوئے اور فرمایا: شکر اس خدا کا کہ جس نے اپنے نبیؐ کے نمائندے کو اس صحیح راہ کی ہدایت کی جو اس کے نبیؐ کی خوشنودی کا باعث ہے[1]۔

۲۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے فقیہ صحابی "ابان بن تغلب" سے فرمایا:

ابان: مدینہ کی مسجد میں بیٹھ کر فتویٰ دو، مجھے یہ بات پسند ہے کہ تم جیسے افراد ہمارے احباب اور شیعوں کے درمیان ہوں[2]۔

ظاہر ہے فتویٰ سے مراد فقط نقل روایت نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جس مسئلہ سے متعلق خاص طور سے

---

[1] فہرست شیخ، ص۴۱۔

[2] طبقات کبریٰ، ج۲، ص۳۴۷

آیت یا روایت وارد ہوئی ہے اسی کی بنیاد پر فتویٰ صادر کریں، لیکن جس مسئلہ سے متعلق خاص طور سے کوئی آیت و روایت موجود نہ ہو اس کا حکم آیات و روایات کی بنیاد پر بنے ہوئے کلیہ و ضابطے اور امام علیہ السلام کے بنائے ہوئے عمومی قاعدے کی مدد سے استنباط کر کے فتویٰ دیا جائے، جس طرح سے خود ائمہ علیہم السلام نے فرمایا ہے:

علینا القاء الاصول وعلیکم التفریع۔[۱]

ہم تمہارے لئے کچھ کلیات و ضوابط بیان کر رہے ہیں تاکہ تم ان کی مدد سے جزئی مسائل کا حکم استنباط کر سکو اور کلیات کو ان جزئیات پر منطبق کر سکو۔

۴۔ اسلامی نظام میں مجتہدین و فقہا کی حیثیت۔

قوانین الٰہی استخراج کرنے والے کو فقیہ کہتے ہیں، وہ چاروں مآخذ کے سہارے قوانین الٰہی کو استنباط کر کے لوگوں کے حوالے کرتا ہے۔ اسلامی نظام میں فقیہ، قانون ساز نہیں ہوتا، نہ وہ کوئی قانون وضع کر سکتا ہے اور نہ کسی قانون کو منسوخ کر سکتا ہے، لیکن چونکہ قوانین الٰہی کو ان کے مآخذ سے حاصل کرنے کا کام مہارت اور علمی صلاحیت کا محتاج ہے لہٰذا مجتہد کچھ صلاحیتوں کو حاصل کرنے کے نتیجہ میں احکام الٰہی کو کتاب سنت، عقل اور اجماع کے ذریعہ استنباط کر کے دوسروں کو مزید زحمت سے بچاتا ہے۔

اگر مجتہد کی ذمہ داری صرف قانون شناسی اور مآخذ و مصادر کے پرتو میں استنباط احکام پر ہے تو اجتہاد، قانون شناسی کا محض ایک ذریعہ ہے، جس کے وسیلہ سے حق کو باطل سے اور قانون کو غیر قانون سے پہنچانا جا سکتا ہے۔ شیعہ فقہ میں اس مسئلہ پر اسلام کے دوسرے فقہی مذاہب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور شیعہ فقہا اپنے لئے "علماء احکام الٰہی اور موجود دلائل کے ذریعہ قانون خدا استنباط کرنے والے" کے سوا کسی دوسرے مقام کے قائل نہیں اور اجتہاد کو صرف بندوں کی ذمہ داریاں مشخص و معین کرنے کا ذریعہ مانتے ہیں، اس طرح سے اجتہاد محض شناخت کا ایک ذریعہ ہے اور قانون کے مصادر میں ہرگز شمار نہیں ہوتا۔

---

[۱] وسائل الشیعہ ج ۱۸۔ کتاب قضاء، باب ۶، حدیث ۵۱ و ۵۲۔

شیعہ فقہاء چاروں دلائل خاص طور پر "سنّت" رسولؐ کو جو ائمہ علیہم السلام کے ذریعہ ان تک پہنچی ہے معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات سے متعلق احکام خدا حاصل کرنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور اس نظریہ کی سچائی کو چودہ صدیوں میں عملی طور پر ثابت کر چکے ہیں، اس سلسلے میں یہ جان لینا کافی ہے کہ شیعہ احادیث کے ایک مجموعہ (وسائل الشیعہ) میں تقریباً ۳۸ ہزار فقہی احادیث موجود ہیں اور اگر حدیث کے ایک اور مجموعہ (مستدرک الوسائل) کو اس میں اضافہ کر دیا جائے تو اسلامی شیعہ فقہ کے مآخذ و مصادر کی وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، خاص طور پر ان احادیث کے درمیان کچھ ایسے جامع بنیادی اور کلّی قوانین بھی موجود ہیں جو بذات خود بہت سے مسائل کا حل پیش کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں فقہاء مذاہب اربعہ اور اسی طرح دوسرے فقہی مذاہب، خواہ وہ مذاہب جو اپنے بانیوں سے پہلے رائج تھے یا وہ جو بعد میں رواج پذیر ہوئے، سب اس بات پر متفق ہیں کہ اجتہاد حکم الٰہی کے مصادر و منابع میں سے ایک ہے۔ وہ محض شناخت کا ذریعہ نہیں بلکہ حکم و قانون کا مصدر و مأخذ سمجھتے ہیں اور دلائل اربعہ (کتاب، سنت، اجماع اور عقل) کے ساتھ اجتہاد کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے متعلق ان کی دلیل یہ ہے کہ دلائل اربعہ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں اور محدود مصادر بدلتے ہوئے نامحدود حالات کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اجتہاد کو قانون کے مأخذ و مصدر کے طور پر استعمال کرنا چاہئے، البتہ سر اجتہاد نہیں بلکہ وہ اجتہاد جو قیاس و استحسان اور مصالح و مفاسد کی بنیاد پر استوار ہو۔

مصر کے عالی مقام دانشور کتاب "الوحی المحمدی" میں بیان کرتے ہیں کہ فقہی احادیث مجموعی اعتبار سے پانچ سو احادیث سے زیادہ نہیں[1]۔ کیا ایسی صورت میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ سنت نبوی بقیہ تین مأخذوں کے ہمراہ زمانے اور معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔؟

قیاس کی ضرورت کے سلسلے میں ابن رشد کا استدلال ہے :

---

[1] الوحی المحمدی ص ۲۵

ان الوقایع بین اشخاص الاناس غیر متناهیة والنصوص والافعال والاقرارات (تقریر النبیؐ) متناهیة ومحال ان یقابل مالا یتناهی بما یتناهی [1]

وہ حوادث جو لوگوں کے درمیان رونما ہوتے ہیں ان کی کوئی حد نہیں جبکہ متون اور اسی طرح افعال و تقریر پیغمبرؐ محدود ہے اور یہ محال ہے کہ محدود شئی سے نامحدود اشیاء کا حل نکالا جائے۔

ابن رشد جیسے بڑے دانشور کے ذریعہ یہ تعبیر باعث بنی کہ دوسرے اسے اصل موضوع کے طور پر تسلیم کریں، یہاں تک کہ شام کے معاصر اہل قلم گراں قدر کتاب (المدخل الفقهی العالم) کے مؤلف "احمد مصطفیٰ الزرقا" نے ابن رشد کی عبارت کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں پیش کیا ہے:

ولا یخفی ان نصوص الکتاب والسنة محدودة متناهیة والحوادث الواقعة والمتوقعة غیر متناهیة فلا سبیل الی اعطاء الحوادث والمعاملات الجدیدة منازلها واحکامها فی فقه الشریعه الا علی طریق الاجتهاد بالرأی [2]

کتاب وسنت کے نصوص محدود ہیں جبکہ رونما ہوئے اور ہونے والے حوادث غیر محدود ہیں، لہٰذا رونما ہونے والے حوادث اور نئے معاملات کے احکام کو استنباط کرنے کے لئے شریعت اسلام کی فقہ میں "اجتہاد بالرأی" کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

تصویب و تخطئہ:

اسلامی اصول فقہ میں ایک اصطلاح "تصویب و تخطئہ" کے نام سے معروف ہے، تصویب کا تعلق اہل سنت حضرات اور تخطئہ کا شیعہ حضرات سے ہے اور ان دونوں اصطلاحوں سے مراد یہ ہے کہ کیا ہر مجتہد اپنے استنباط میں یقینی طور پر صحیح و صائب رائے پیش کرتا ہے یا اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اس کی کچھ آراء عین حقیقت ہوں اور کچھ اس کے خلاف؟

[1] بدایة المجتهد ج ۱ ص ۲

[2] المدخل الفقهی العالم ج ۱، ص ۶۶

جن مسائل کا حکم کسی نہ کسی شکل میں کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے اور خود شریعت نے اس کے حکم کو بیان کیا ہے، اس سے متعلق سبھی خود کو "مخطئہ" مانتے ہیں، اس لئے کہ خدا کا حکم اس صورت میں ایک ہے اور دونوں استنباط کرنے والے جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں صواب پر نہیں ہو سکتے، ان میں سے ایک ضرور لغزش وخطا کا شکار ہوا ہوگا، اس کا حکم خطا اور حقیقت کے مطابق نہ ہوگا۔

بحث ایسے موارد میں ہے کہ جہاں رونما ہونے والے حوادث سے متعلق محدود فقہی منابع وماٰخذ (فقہاء اہل سنت کی نظر میں) میں حکم موجود نہ ہو، ایسے موارد میں فقہاء اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ان حوادث سے متعلق تشریع احکام مجتہد وفقیہ افراد کے حوالے کیا گیا ہے کہ وہ "قیاس" "استحسان" "مصالح ومفاسد اور "سدالذرائع" جیسے خاص اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے احکام الٰہی کی تشریح کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں تخطئہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس اعتبار سے مجتہد جب تک اپنی رائے پر قائم رہے گا اس وقت تک حکم الٰہی وہی رہے گا اور تشخیص مجتہد کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہ ہوگی۔

غرض یہ کہ "تصویب" اور "تخطئہ" منصوص احکام میں نہیں ہے اور کسی بھی فرقے کو "مصوبہ" نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر مجتہد وفقیہ کی رائے عین حقیقت ہے، البتہ تصویب اس صورت میں کہی جا سکتی ہے، جب رونما ہونے والے حوادث سے متعلق حکم محدود منابع وماٰخذ میں موجود نہ ہو اور اس کی تشخیص خاص اصولوں کی رعایت کے ساتھ علماء وفقہائے عصر کے سپرد کی گئی ہو، ایسی صورت میں ہر مجتہد کی رائے عین حقیقت ہوگی اور اجتہاد ایسی صورت میں احکام کے منابع وماٰخذ میں شمار ہوگا نہ کہ ان کی شناخت کا ذریعہ۔

شیخ طوسیؒ کتاب "عدۃ الاصول" میں تصویب وتخطئہ سے متعلق اختلافی مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ابوعلی، ابوہاشم، ابوالحسن اور فقہاء اہل سنت کے اکثر وبیشتر اہل کلام "مصوبہ" ہیں، اس کے بعد محل اختلاف کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واعلم ان الاصل فی ھذہ المسئلہ القول بالقیاس والعمل باخبار الآحاد لان ما طریقہ التواتر وظواھر القرآن فلا خلاف بین اھل العلم

ان الحق فیما ھو معلوم فی ذالک[1]"

یہ عبارت "تصویب" کے مقصد کو اجاگر کرتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ اس کا محل استعمال وہاں ہے جہاں شرع کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، جیسا کہ قیاس و خبر واحد کے کچھ حصے (اخبار احاد کا پورا حصہ نہیں) کو شیخ طوسی حجت نہیں سمجھتے اور ان دونوں کو محض مثال کی غرض سے پیش کیا ہے۔

شناخت کا مسئلہ اس صورت میں صادق قرار پاتا ہے جب دائرہ شناخت سے خارج نہ ہو، جیسے کوئی حقیقت کتاب و سنت یا لوح محفوظ میں موجود ہو لیکن عقل کی رسائی اس تک نہ ہو ایسی صورت میں "اجتہاد" ذریعہ شناخت کے بدلے منبع شناخت اور فقیہ قانون داں سے مقنن و قانون گذار میں بدل جاتا ہے۔

جبکہ شیعہ فقہ میں اجتہاد اور تصویب و تخطئہ بھی دوسری شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اس مکتب فکر میں رونما ہوئے اور ہونے والے حوادث سے متعلق احکام وسیع اسلامی مآخذ و منابع میں بیان ہوئے ہیں اور شریعت الٰہی مکمل طور سے فقہاء و علماء کے دائرہ اختیار میں قرار دی گئی ہے، اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خصوصی توجہ کے ساتھ احکام کے بارے میں تحقیق کریں، وہ اس راہ میں کبھی مصیب اور کبھی خطا کار بھی واقع ہو سکتے ہیں، لیکن ہر حال میں معذور۔ لہٰذا کسی کو قانون سازی و تشریع کا حق حاصل نہیں، یہاں تک کہ خواہ وہ استنباطی اصول "قیاس و استحسان" کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] عدۃ الاصول، ج ۲، ص ۱۱۳-۱۱۴۔

شب قدر

(۱) حضرت رسول اکرمؐ :

اِنَّ اللہَ اختارَ مِنَ الاَیّامِ الجُمُعَۃَ وَمِنَ الشُّھُورِ شَھرَ رَمَضانَ وَمِنَ اللَّیالِی لَیلَۃَ القَدرِ

{ بحار الانوار ج ۹۷ ص ۵ }

بلاشبہ خداوند عالم نے دنوں میں جمعہ کو، مہینوں میں ماہ رمضان کو اور شبوں میں شب قدر کو اپنے لئے منتخب فرمایا۔

(۲) حضرت علی ابن ابی طالبؑ :

سلوا اللہ الحج فی لیلۃ سبع عشرۃ من شھر رمضان وفی تسع عشرۃ وفی احدی وعشرین وفی ثلاث وعشرین فانہ یکتب لوفد فی کل عام لیلۃ القدر وفیھا یفرق کل امر حکیم

رمضان المبارک کی سترہ (۱۷)، انیس (۱۹)، اکیس (۲۱) اور تیئس (۲۳) تاریخوں میں خداوند عالم سے حج کی درخواست کرو۔ کیونکہ ہر سال حج بیت اللہ کے لئے جانے والوں کے نام شب قدر میں لکھے جاتے ہیں۔ اور اسی شب میں ہر اہم امر مقدر کیا جاتا ہے۔

{ دعائم الاسلام ج ۱ ص ۲۸۱ }

جناب احمد آذری قمی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

انقلابات انقلاب مہدیؑ سے پہلے (۳)

گذشتہ دو شماروں میں امام زمانہؑ کے عالمی انقلاب سے پہلے برپا ہونے والے انقلابات پر ان روایات کے تحت روشنی ڈالی گئی جو محدود زمانہ اور محدود خطۂ ارض میں آنے والے انقلابات کو بھی غیر شرعی قرار دیتی ہیں اور ان کی ناکامی پر دلالت کرتی ہیں۔ ہم ثابت بھی کر چکے ہیں کہ ان روایات سے مراد یہ مفہوم نہیں ہے جس کا اظہار کیا جاتا ہے اور نہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلامی ممالک یا مسلمان علاقوں میں خداوند عالم کی حاکمیت قائم کرنے، امر بہ معروف اور نہی از منکر کے فرائض ادا کرنے، حدود الٰہی کو عملی جامہ پہنانے اور اسلام کے سیاسی، اقتصادی، قومی، اجتماعی، اخلاقی و تمدنی نظام کو عملی صورت بخشنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اسلامی تحریکوں اور انقلابات کی شرعی حیثیت صرف اسلام اور ائمہ معصومینؑ کے پیرو، عادل فقہاء کی قیادت و سرپرستی میں ثابت ہوتی ہے۔ ہر کس و ناکس کی قیادت ان انقلابات کو حرام بے سود اور ناکام بناتی ہے۔ اس مقالہ میں ہم اپنے مدعا کو مزید ثابت کرنے کے لئے امام زمانہؑ کے عالمی انقلاب سے متعلق قرآنی آیات اور اس موضوع کے تحت آنے والی روایات پر تبصرہ کریں گے۔

قرآن مجید میں مستضعفین کے غلبہ حاصل کرنے، احکام الٰہی کے جاری کرنے اور طاغوتیوں و مستکبروں کی ذلت و رسوائی سے متعلق متعدد آیتیں موجود ہیں۔ امام مہدیؑ کا انقلاب اپنی وسعت و عظمت کے ہمراہ ان آیات کا مسلم الثبوت مصداق شمار ہوتا ہے اور آئمہ معصومینؑ نے بھی ان آیات کی تفسیر

اسی پیرایہ میں فرمائی ہے۔ اسی بنیاد پر کچھ لوگ یہ سوچنے لگے کہ امام زمانہؑ کے ظہور سے قبل آنے والے تمام انقلابات ان روایات کے دائرہ سے خارج ہیں اور یہ آیات شریفہ صرف امام زمانہؑ کے خصوصی انقلاب سے ربط رکھتی ہیں، جبکہ ان آیات میں لفظ عام ہے اور قرآن میں وہ انقلاب امام زمانہ سے مخصوص نہیں ہے کیونکہ اگر ہم اسے امام مہدیؑ کے عالمی انقلاب سے مخصوص کر دیں تو آیات اپنے محل بیان سے خارج ہو جائیں گی!

مثال کے طور پر یہ آیات شریفہ: ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین. ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون و ھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون[1] - بنی اسرائیل کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کو فرعون نے ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کے پہلے کی آیت: ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم انہ کان من المفسدین[2] - مذکورہ بالا آیت جس میں فرعون و ہامان اور اس کے لشکریوں کی سرکوبی ذلت کا تذکرہ ہے اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اگر یہ آیت امام زمانہ کے داہنے بازو پر تحریر ہو یا ولادت کے وقت حضرتؑ اس کی قرائت فرمائیں تو یہ قاعدہ "جری وتطبیق" کے عنوان سے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس آیت کا مضمون ایسی سنت الٰہی ہے جو بدلا نہیں کرتی اور کسی ملک و قوم سے مخصوص نہیں ہے اگرچہ بلحاظ اس کا مصداق صرف بنی اسرائیل، فرعون و ہامان اور ان کے لشکری کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا ائمہ معصومینؑ کا اس آیت کو امام زمانہؑ کے عالمی انقلاب پر تطبیق کرنا آیت کو اس انقلاب میں منحصر نہیں کرتا بلکہ دلیل ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے، اس دائرہ میں تمام انقلابات اور تحریکیں بھی شامل ہیں۔

چنانچہ امام زمانہؑ کے ظہور سے پہلے کے سارے انقلابات اس کلی دائرہ میں آجائیں گے اور اس آیت کے موضوع و شرائط کی فراہمی کی صورت میں آیت میں مذکور پانچوں احکام (منت، امامت،

---

[1] سورہ قصص / ۵ و ۶

[2] سورہ قصص / ۴

وراثت، تمکن فی الارض اور طاغوتی طاقتوں کی سرکوبی کو بھی حاصل ہو جائیں گے۔

مزید وضاحت اور اس آیت کی کلیت و عمومیت ثابت کرنے نیز گذشتہ مقالہ کی ان روایات کی تائید کے لئے جو اس شبہ کو رفع کرتی ہیں کہ ان آیات میں مستضعفین سے مراد تمام مستضعفین ہیں چاہے وہ خدا، قیامت، اسلام کے حیات بخش فلسفہ اور اس کے احکام کو نہ مانتے ہوں، امامت اور الٰہی رہبروں کی پیشوائی و رہبری کو قبول نہ کرتے ہوں، مستکبروں اور ستمگاروں کے مقابلے میں ساکت و خاموش ہوں۔ ہم ان آیات پر بحث و گفتگو کریں گے۔ شاید قرآن میں کمزور و مستضعف طبقہ کے بارے میں جامع ترین اور کامل ترین یہی آیتیں ہیں کیونکہ بعض آیتوں میں ان کے لئے ایک وعدہ اور بعض آیتوں میں دو یا تین وعدے خدا نے بیان کئے ہیں لیکن سورۂ قصص کی ان زیر بحث آیتوں میں خدا نے ان سے حسب ذیل پانچ وعدے کئے ہیں۔

۱۔ مستضعفین پر خدا احسان کرے گا۔

احسان سے مراد خدا کی وہ بے پایاں نعمتیں ہیں جو صرف ظاہری قوت و اقتدار اور حکومت کی شکل میں ہی نہ ہوں گی بلکہ مادی اور معنوی تمام میدانوں میں الٰہی حاکمیت برقرار ہو گی۔ قرآن جبکہ معنویت اور روحانیت سے خالی مادی قدرت و حکومت کو نعمت ہی نہیں شمار کرتا تو ایسے اقتدار کو احسان کیوں کر کہہ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن نے بعثت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منت و احسان قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ (آل عمران/۱۶۴)

یقیناً خداوند عالم نے مومنین پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں، انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا، ان کے نفسوں کو پاکیزہ بناتا اور انہیں کتاب خدا اور عقل و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

یا جناب موسیٰؑ اور ان کی والدہ گرامی پر وحی نازل کرنے کے سلسلہ میں فرماتا ہے:۔

ولقد مننا علیک مرۃ اخریٰ اذ اوحینا الیٰ امک ما یوحیٰ (طہٰ/۳۷و۳۸)

ہم تو تم پر ایک مرتبہ اور احسان کر چکے ہیں جب ہم نے تمہاری والدہ پر وحی نازل کی جسے اب تمہیں بذریعہ وحی بتا رہے ہیں۔

لہٰذا زیر بحث آیت کی خصوصیات ہر محروم و ستم دیدہ مستضعف کے شامل حال نہیں ہیں بلکہ صرف ان کمزور و محروم افراد کے شامل حال ہیں جو خدائے واحد اور معارف الٰہی پر اعتقاد رکھتے ہیں اور رضائے پروردگار و الٰہی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوششوں میں مشغول رہتے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اگر دنیا کے تمام کمزور و ستم رسیدہ افراد اپنی آزادی اور نجات کی خاطر مل کر کوشش کریں تو ظالموں اور جابروں کو معزول کر کے انکی مسندوں پر قبضہ کر سکتے ہیں جیسا کہ قرآن فرماتا ہے :۔

"من کان یرید الحیٰوۃ الدنیا و زینتها نوف الیهم اعمالهم فیها وهم فیها لا یبخسون ۔ اولٰئک الذین لیس لهم فی الاٰخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیها و باطل ما کانوا یعملون" (ہود/۱۵-۱۶)

جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی رونق کا طالب ہو تو ہم انہیں ان کی کارگذاریوں کا بدلہ دنیا ہی میں بھرپور دیتے ہیں اور یہ لوگ دنیا میں نقصان میں نہیں رہیں گے۔ ہاں وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا تھا سب اکارت اور بیکار ہو گیا اور جو عمل انجام دیا تھا سب باطل ہو گیا۔

یا پھر دوسری جگہ فرماتا ہے کہ :۔

"من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزد لہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منها ..." (شوریٰ/۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کے لئے اس کی زراعت میں افزائش کریں گے اور جو شخص دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو گا تو ہم اسے اسی میں سے دیدیں گے مگر آخرت میں پھر اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا۔

یعنی انسان اپنے مادی مقاصد کے حصول کے لئے جو کوشش کرتا ہے وہ رائگاں نہیں جاتیں اور جیسا کہ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ قومیں اور ملتیں جنھوں نے اس سلسلہ میں اقدام کیا اور ظالموں سے نجات کی کوششیں کیں بالآخر وہ طاغوتوں کو سرنگوں کرنے میں کامیاب بھی ہوئے اور یہ بات اپنی جگہ پر

درست بھی ہے لیکن اس آیت کی خصوصیات اور وعدہ الٰہی کے پیش نظر ہم جس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ خدا کے نیک بندوں، الٰہی مکتب پر اعتقاد و اعتماد رکھنے والوں اور اس کے نورانی احکام پر عمل کرنے والوں کے جہاد و پیکار صبر و استقامت سے مخصوص ہے اور ہم ان مستضعفین سے کئے گئے ان تمام الٰہی وعدوں کو ایک ایک کرکے بیان کرتے ہیں ساتھ ہی ان الٰہی وعدوں کے شرائط کی دلیل پر دوسری آیات کے ذریعہ بحث و گفتگو کریں گے جیسا کہ ہم ضمنی طور سے اوپر بیان بھی کر چکے ہیں۔

۲۔ مستضعفین اور الطاف الٰہی۔

اصولی طور پر قرآن کریم میں وہ مستضعفین شامل الطاف الٰہیہ ہیں جو خدا پر اعتقاد رکھتے ہوئے حتی المقدور اپنی آزادی کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں اپنی نجات کے لئے درخواست اور دعا کرتے ہیں لیکن راہ نجات پیدا نہیں کر پاتے۔ قرآن سورۂ نساء میں فرماتا ہے:۔

"وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللّٰہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیاً واجعل لنا من لدنک نصیراً" (نساء/۷۵)

تم کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کمزور و بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں (کو کفار کے پنجے سے چھڑانے) کے لئے جہاد نہیں کرتے جو خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست اور ہمارا مددگار بنا دے۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کو نجات اور آزادی دلانے کے لئے مامور کیا گیا ہے جو خداوند عالم کی بارگاہ میں ستمگاروں کے پنجہ ظلم سے اپنی آزادی کی درخواست اور التماس کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کمزور افراد خدا پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں اور اپنی نجات و آزادی کے لئے ممکن حد تک کوشاں بھی ہیں۔

دوسری جگہ سورۂ نساء ہی میں ارشاد ہے کہ:۔

"ان الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا ..... الا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لایستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلاً" (نساء/۹۷-۹۸)

جن لوگوں کی روح فرشتوں نے اس وقت قبض کی ہے جب وہ (دارالحرب میں پڑے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (تو فرشتے قبض روح کے بعد حیرت سے) کہتے ہیں کہ تم کس حالت (غفلت) میں تھے۔ تو وہ (معذرت کے لہجہ میں) کہتے ہیں کہ ہم تو روئے زمین پر بیکس اور کمزور تھے تو فرشتے کہتے ہیں کہ خدا کی (ایسی لمبی چوڑی) زمین میں اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ تم کہیں ہجرت کر کے چلے جاتے ..... مگر جو مرد، عورتیں اور بچے اس قدر بے بس ہیں کہ نہ تو (دارالحرب سے نکلنے کی) کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ ان کو اپنی رہائی کی کوئی راہ دکھائی دیتی ہے تو امید ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے درگذر کرے۔

لہٰذا وہ مستضعف اور کمزور افراد جو اپنی نجات کے لئے حتی الامکان موقعوں سے فائدہ نہ اٹھائیں وہ اس آیت کے مطابق فرشتگان الٰہی کے خشم و غصہ کا نشانہ بنیں گے۔ برخلاف ان کے وہ لوگ جو اپنی نجات کے لئے کوئی راہ چارہ نہ پاتے ہوں معذور ہیں اور تمام مسلمان ان کی نجات پر مامور کئے گئے ہیں

۳۔ مستضعفین اور امامت و رہبری۔

ان الٰہی وعدوں میں سے ایک وعدہ مستضعفین کو امامت و رہبری کے عظیم مرتبہ پر فائز کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے:۔

وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون

(سورۂ سجدہ/۲۴)

یعنی ہم نے بنی اسرائیل کے کمزور طبقوں کے افراد میں سے امام اور رہبر بنائے تاکہ وہ ہمارے حکم سے دوسروں کی رہنمائی کریں کیونکہ انہوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور ہماری آیات و احکام پر یقین رکھتے تھے۔

چنانچہ ایسے مستضعفین رہبری کا استحقاق رکھتے ہیں جو سختیوں، شدائد اور فرعونی شکنجوں میں جکڑے جانے کے باوجود ایمانی صفات سے آراستہ۔ آیات و احکام الٰہی پر یقین رکھتے ہوں اور اس آیت کے مستحق قرار پائیں :-

"وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وکانوا لنا عابدین" (انبیاء/۷۳)

اور ہم نے ان سب کو لوگوں کا پیشوا و رہبر بنایا جو ہمارے حکم سے ان کی ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی بھیجی اور وہ سب کے سب ہماری عبادت کیا کرتے تھے۔

یعنی جب بنی اسرائیل نے جناب موسیٰؑ کی بعثت کے قبل شدائد و مصائب کے مقابلے میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اور خدا نے ان کو نیک اعمال، نماز و زکوٰۃ کی تلقین کی تو انہوں نے خدا کی آواز پر لبیک کہی اور اس کی عبادت و پرستش میں مشغول ہو گئے۔ ان ہی صفات نے انھیں پیشوائی اور رہبری کا مستحق قرار دیا۔

۴۔ مستضعفین، مستکبرین کے وارث۔

جیسا کہ قرآن بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے :-

وَاَورَثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا التی بارکنا فیھا وتمت کلمۃ ربک الحسنیٰ علیٰ بنی اسرائیل بما صبروا ودمرنا ما کان یصنع فرعون وقومہ وما کانوا یعرشون (اعراف/۱۳۶)

جن بیچاروں کو یہ لوگ کمزور سمجھتے تھے انھیں کو ہم نے زمین کا اور اس کے مشرق و مغرب کا وارث بنایا جس میں ہم نے برکت دی تھی اور چونکہ بنی اسرائیل نے (فرعون کے مظالم پر) صبر کیا تھا اس لئے تمہارے پروردگار کا نیک وعدہ (جو اس نے بنی اسرائیل سے کیا تھا) پورا ہو گیا اور جو کچھ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ کرتے تھے اور جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے سب ہم نے برباد کر دیں۔

یعنی بنی اسرائیل کے صبر و استقلال پر گامزن رہنے کی بنا پر شام اور اس کے مشرق و مغرب کے علاقے ان کے اختیار میں آگئے اور سورۂ دخان میں ارشاد ہوتا ہے کہ :-

کم ترکوا من جنات وعیون وزروع ومقام کریم ونعمة کانوا فیها فاکهین

کذلك واورثناها قوما آخرین - (دخان/۲۵-۲۸)

وہ لوگ (خدا جانے) کتنے باغ چشمے، کھیتیاں اور نفیس مکانات اور آرام کی چیزیں جس میں وہ عیش و چین کی بین بجاتے تھے چھوڑ گئے - یوں ہی ہوا اور ہم نے ان تمام چیزوں کا مالک دوسرے لوگوں کو بنا دیا۔

یعنی باغات، چشمے، کھیتیاں، محل مکانات اور فراواں نعمتیں بنی اسرائیل کو میراث کے طور پر منتقل ہوئیں۔

گذشتہ نکتہ کے علاوہ جس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے ان آیات سے اپنے مطلب و مقصد کے مطابق ایک اور نکتہ کا استفادہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان آیات میں ارض سے مراد تمام کرۂ زمین نہیں ہے بلکہ مندرجہ بالا آیات کے حکم و موضوع اور اس کی صراحت کے مطابق کوئی ایک ملک ہے جس کی آزادی اور نجات کے لئے اور ستمگاروں کے پنجے سے چھٹکارا پانے کے لئے کوشش اور جد وجہد کی گئی ہے تاکہ وہ آزاد ہو کر مستضعف مجاہدین کے زیر نگیں آجائے اور چونکہ امام زمانہؑ اور ان کے اصحاب و جاں نثار تمام کرۂ زمین کے رہبر و امام ہیں اور پوری دنیا کی آزادی کے لئے جہاد کریں گے لہٰذا پوری زمین ان کے اختیار میں آجائے گی۔ چنانچہ کسی مخصوص خطۂ زمین میں رونما ہونے والے انقلابات اگر تمام شرائط کے حامل ہوں تو اس مخصوص زمانہ اور مخصوص علاقہ میں کامیاب ہو کر رہیں گے اور یہ سنت الٰہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور چونکہ ارادۂ پروردگار اس میں شامل ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں پایا جاتا لہٰذا زمان و مکان اور دور و نزدیک کا کوئی فرق ہی پیدا نہیں ہوتا اور زمانہ غیبت کے انقلابات بھی اس قاعدہ کلی سے الگ نہیں ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ٹھیک ہے شرائط کے متحقق ہونے پر یقیناً تحریکیں کامیاب ہو جاتی ہیں لیکن ممکن ہے کہ گذشتہ مقالہ میں اشارہ شدہ روایات ان شرائط کے ناممکن اور غیر متحقق ہونے پر دلالت کرتی ہوں لہٰذا ہمارا وظیفہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم سکوت اور خاموشی اختیار کریں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ :-

اوّل تو یہ کہ ممکن ہے یہ روایات خاص حالات کی طرف اشارہ کرتی ہوں جن میں شرائط انقلاب متحقق نہ ہوں مثلاً تحریک کا رہبر غیر صالح ہو، چنانچہ عیض بن القاسم کی روایت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں حضرت صادق نے فرمایا: "اگر کوئی ہم میں سے (یعنی سادات بنی حسن اور ہم سے منسوب افراد) حکومت وقت کے خلاف تلوار اٹھائے تو اس کے ساتھ اقدام پیکار کے لئے نہ اٹھو لیکن زید کے لئے یہ نہ کہو کہ انہوں نے خروج کیا ہے کیونکہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ زید ایک عالم و فقیہ انسان اور الٰہی رہبر یعنی امام کے پیرو تھے انہوں نے امر بمعروف و نہی از منکر کے لئے تلوار اٹھائی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے حالات و شرائط میں تلوار اٹھانا صحیح و درست اور ایسے رہبر کی نصرت کرنا بھی شرعی و الٰہی فرائض میں شامل ہے۔

دوسرے ہمارا مدعا یہ ہے کہ زیر بحث آیات میں خدائی حکم اور الٰہی وعدے کامیابی کے شرائط کے تحقق پذیر ہونے کی دلیل بنے ہیں اور یہ روایت کسی صورت بھی وعدۂ الٰہی کو حقیقی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں مسلمانوں کی کوششوں کو نہیں روکتی۔ نہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ایسے حالات میں سکوت و گوشہ گیری اختیار کریں۔

۵۔ مستضعفین اور روئے زمین پر ان کا اقتدار۔

مستضعفین کے لئے خدا کا ایک وعدہ روئے زمین پر انھیں قدرت و اختیار کا حاصل ہونا بھی ہے بالآخر مستکبرین سے ان کی جدوجہد اور پیکار رنگ لائے گی اور وہ زمین پر اختیار حاصل کرنے کے بعد عدل و انصاف کو جاری کریں گے معاشرہ میں قانون عدالت کا بندوبست کریں گے ظالموں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو قطع کرکے ان سے مظلوموں کا حق لیں گے شرک و کفر و فساد کے مراکز کو نیست و نابود کریں گے طاغیوں اور گناہ پر کمربستہ افراد کا قلع قمع کرکے صرف خدائے واحد کے احکام جاری کریں گے اور اس زمانہ میں کسی کو بھی پروردگار عالم کی عبادت و پرستش کی راہ میں اشکال کرنے یا رکاوٹ بننے کا یارا نہ ہوگا کیونکہ کفر و استکبار کے سرخیل اپنی ماندوں میں جا چھپے اور انھیں جس کا خوف تھا وہ ان کے سامنے آکے رہا۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:۔

"ونُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ" (قصص/۶)

ہم فرعون و ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان ہی کمزوروں کے ہاتھوں وہ چیزیں

دکھائیں جن سے یہ لوگ ڈرتے تھے۔

زیر بحث آیات شریفہ پر استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ جو ملک و قوم بھی ظلم و ستم کا شکار ہو اور خدائے واحد و مسلک حق پر ایمان رکھتی ہو اور الٰہی حاکموں کی حاکمیت و رہبری کو قبول کرتی ہو اور حکومت الٰہی کی برقراری اور محرومین کی آزادی کے لئے جہاد کرے اور اپنے انسانی حق کے لئے دفاع کرے ہر طرح کی سختیوں اور دباؤ میں صبر و ثبات قدم سے کام لے وہ قطعی طور سے کامیاب ہو گی اور اپنے دشمنوں کو کو چاہے وہ جتنے بھی قوی اور زیادہ کیوں نہ ہوں شکست دیدے گی۔ البتہ یہ معاملہ مجاہدوں اور جد وجہد کرنے والوں کی ہمت و جوانمردی سے وابستہ ہے۔

اگر کمزور و مستضعف بنی اسرائیل نے اپنے زمانہ کے طاغوت (فرعون) کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں صبر و استقلال کو اختیار کیا اور اپنے پیشوا و رہبر الٰہی جناب موسیٰؑ کی آواز پر لبیک کہا تو آخر کار انہوں نے فرعون و ہامان اور اس کے لشکریوں کو دریائے نیل کے حوالہ کر دیا اور خود ان کے وارث و جانشین قرار پائے۔ اسی طرح آج بھی جنوب لبنان کے لوگ جو ظالم و غاصب اسرائیل اور دنیا کے بڑے ستم پیشہ افراد کے مسلسل حملوں اور مظالم کا شکار ہیں، اگر ان ظالموں کے آگے گھٹنے نہ ٹیکیں اور موجودہ زمانہ کے رہبر کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے شدید دفاع و جہاد کو جاری رکھیں تو جلد ہی ریگن، شولتز ان کے حلقہ بگوش غلاموں اور ان سب کی غیر شرعی اولاد یعنی اسرائیل کو اپنے ملک سے باہر نکال دیں گے۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:۔

بعثنا علیکم عباداً لنا اولی بأس شدید فجاسوا خلال الدیار وکان وعداً مفعولاً (اسراء/۵)

..... ہم نے اپنے کچھ بندوں کو تم پر مسلط کر دیا جو بڑے سخت لڑنے والے تھے تو وہ لوگ تمہارے گھروں کے اندر گھسے (اور خوب قتل و غارت کیا) اور خدا کے عذاب) کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ کسی خطہ ارض پر حکومت کرنے والے مستضعفین، کجروی اختیار کر کے کسی ظالم و جابر قوت سے جا ملیں تو وہ بھی ظالموں کا ایک جزو شمار کئے جائیں گے نتیجہ یہ ہو گا کہ خدا کا وعدہ بھی بدل جائے گا[1] اور جس طرح بنی اسرائیل نے منحرف ہو کر گوسالہ پرستی کا انتخاب کیا اور جناب موسیٰؑ سے

[1] ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (رعد/۱۱)

بت پرستوں کی طرح کا ایک محسوس اور مس کئے جانے والے خدا کا تقاضہ کیا :۔

یاموسیٰ اجعل لنا الٰھاً کما لھم الھۃ قال انکم قوم تجھلون (اعراف/۱۳۸)

بنی اسرائیل موسیٰ سے کہنے لگے۔ اے موسیٰ جیسے ان لوگوں کے معبود (بت) ہیں ویسے ہی ہمارے لئے بھی ایک معبود بناؤ تو موسیٰ نے جواب دیا کیا تم تو بڑے جاہل لوگ ہو۔

اس طرح بنی اسرائیل کی حالت میں تغیر پیدا ہوگیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا :۔

ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم وامددناکم باموال وبنین وجعلناکم اکثر نفیرا ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا فاذا جاء وعد الآخرۃ لیسؤا وجوھکم ولیدخلوا المسجد کما دخلوہ اول مرۃ ولیتبروا ما علوا تتبیرا۔ (اسراء/۶-۷)

پھر ہم نے تم کو دوبارہ ان پر غلبہ دے کر تمہارے دن پھیرے اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کی اور تم کو بڑے گروہ والا بنا دیا۔ اگر تم اچھے کام کروگے تو اپنے فائدہ کے لئے کروگے اور اگر تم برے کام کروگے تو (بھی) اپنے ہی لئے۔ پھر جب دوسرے وقت کا وعدہ آ پہنچا تاکہ وہ لوگ (مارتے مارتے) تمہارے چہرے بگاڑ دیں (کہ پہچانے نہ جاؤ) اور جس طرح وہ پہلی دفعہ مسجد (بیت المقدس) میں گھس گئے اسی طرح پھر داخل ہو کر جس چیز پر قابو پائیں خوب اچھی طرح برباد کردیں۔

واضح ہے کہ اگر فلسطینی اپنی جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے اسلام اور اس کی اہمیت کے بارے میں فکر کریں، خدائی رہبروں کے احکام کی پیروی کریں، علاقائی و بین الاقوامی زور و دباؤ کے آگے سر نہ جھکائیں تو یقیناً کامیابی ان کے قدم چومے گی اور وہ غاصب صہیونیت کو اسی طرح فلسطین کی سرزمین سے نکال کر دریا کے حوالہ کردیں گے جیسے خدا کے ان نیک اور کمزور بندوں نے فرعون اور فرعونیوں کو دریا کے حوالے کردیا تھا۔ سربداروں (ایک قدیم اسلامی ایرانی تحریک) نے اپنے عہد میں آلام و مشقت کو برداشت کرتے ہوئے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور خدا کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے ایک مخصوص علاقہ نسل چنگیز کے ظالم و جابر مغلوں کے قبضے سے آزاد کرالیا اور وہاں ایک حد تک حکومت اسلامی کے نظام کو رائج بھی کیا۔

مراکش کے "سادات ادارسہ" نے دوسری صدی ہجری میں، ادریس بن عبد اللہ کی رہبری میں خلفاء بنی عباس کے ظلم کے خلاف پرچم بلند کیا اور ایک علاقہ میں اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سادات زیدیہ نے بھی تیسری صدی ہجری میں طبرستان میں صبر واستقامت کے ساتھ وقت کی طاقت سے لڑتے ہوئے برسوں حکومت کی اور اسلامی نظام کو رائج کیا۔ اسی طرح یمن میں بھی زیدیوں نے اسلامی اقتدار قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح کے نمونے اسلامی تاریخ میں جابجا پائے جاتے ہیں۔ ایران میں صفوی حکومت کا قیام بھی ابتداء میں مذہبی نظریہ کے تحت عمل میں آیا تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن بعد میں وہ کجرویوں اور انحرافات کا شکار ہوکر راہ خدا سے دور ہوگئے۔ یہ سب حق طلب کامیاب تحریکوں کے وہ نمونے ہیں جو دامن تاریخ میں جابجا موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تحریکیں صحیح وکامل طور پر آئیڈیل کی حیثیت نہیں رکھتیں اور موجودہ انقلاب اسلامی سے کوسوں کا فاصلہ رکھتی ہیں جیسے یہ انقلاب امام مہدی کے انقلاب سے فاصلہ رکھتا ہے اور امید ہے کہ امام کے عالمی انقلاب کے لئے زمینہ ساز قرار پائے آج دنیا کے کمزور و مستضعف افراد اتحاد ویکجہتی کے ذریعہ دنیا کے مستکبروں سے مسلسل نبرد آزما ہوکر خدا پر ایمان، صبر و استقلال، رہبر الہٰی کی اطاعت اور اسلام کے حیات بخش مسلک کی پیروی کرتے ہوئے دنیا کی تمام بڑی طاقتوں پر فتح وکامرانی نیز عالمی حکومت کے قیام کے میدان ہموار کریں گے۔ پھر خداوند عالم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند امام زمانہ کو ایک عالمی حکومت کی قیادت ورہبری اور عالمی عدالت قائم کرنے کے لئے ظہور کرنے کا حکم صادر فرمائے گا۔ جس طرح گذشتہ انبیاء کی طرف سے دئے گئے وعدۂ الہٰی اور جناب موسیٰ کے ظہور کی امید و پیشین گوئی کی بنیاد پر بنی اسرائیل اپنے وقت کی بڑی طاقتوں سے ٹکرائے اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی جاں فرسا اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کیں پھر بھی اپنے جہاد کو پوری شدت وحدت کے ساتھ جاری رکھا بالآخر فیصلہ کن جنگ کے لئے خدا نے جناب موسیٰ کو مبعوث فرمایا جنہوں نے فرعون کو ہلاک کرکے اس کی طاقت کو فنا کیا اور الہٰی حکومت قائم کردی۔ موجودہ عہد میں اس نبرد وپیکار کی قیادت ورہبری کا ایک حصہ امام زمانہ کے نائب کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے.....

پس مذکورہ آیت اور اس سے مشابہ دوسری آیتیں صرف ایک مخصوص واقعہ یعنی امام زمانہ کے قیام وقیادت کی خبر نہیں دیتیں بلکہ یہ واقعہ ان آیتوں کے مصادیق کے عنوان سے یا اہم ترین مصداق کی حیثیت سے

جانا جاتا ہے اور اگر اس آیت کی تفسیر ائمہ معصومینؑ کی روایتوں میں ایک عالمی حکومت کے قیام کی حیثیت سے کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت اسی سے مخصوص ہے۔ کیونکہ اگر اس کے دوسرے مصادیق سے انکار کیا جائے تو کم از کم بنی اسرائیل کی مستضعف قوم اور جناب موسیٰؑ کے واقعہ کو اس آیت سے قطعاً جدا نہیں کیا جا سکتا چنانچہ آیت :۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

(انبیاء / ۱۰۵)

ہم نے اس نصیحت کو (توریت) کے بعد یقیناً زبور میں لکھ دیا ہے کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے اور دوسری آیت میں :۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون۔ (نور / ۵۵)

اے ایمان والو ! تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو (ایک نہ ایک دن) روئے زمین پر ضرور (اپنا) نائب مقرر کرے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو اپنا نائب بنایا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انھیں ضرور ضرور پوری قوت دے گا اور ان کے خائف ہونے کے بعد (ان کے ہراس کو) امن سے ضرور بدل دے گا وہ اطمینان سے) میری ہی عبادت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں اور جو شخص اس کے بعد بھی ناشکری کرے گا تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔

ایک عام اور کلی الٰہی وعدہ ہے جو تمام مومنین کے لئے ہے اور ان مومنین کے لئے بھی ہے جو کسی علاقہ کی آزادی کے لئے پیکار و جنگ کریں اور انھیں کمزور و ناتواں بنا دیا جائے اور ان پر ظلم و ستم و ستم توڑے جائیں ایک نہ ایک دن کامیاب ہوں گے۔ ہاں اگر وہ حق کی راہ میں احکام الٰہی پر عمل کرتے ہوئے محرومین کی حمایت میں ثابت قدم رہیں تو ان کی حکومت قائم و استوار رہے گی ورنہ نہیں

بھی تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی غیبت کے زمانہ میں آنے والے انقلابات بھی اسی قاعدہ کلی کے تحت آتے ہیں۔

لہٰذا اسلامی حکومت اور انصاف و قانون کی حاکمیت قائم کرنے کے لئے علماء و فقہاء کی جدوجہد جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ جیسا کہ اسلامی انقلاب کے رہبر امام خمینی نے کتاب "حکومت اسلامی" میں فرمایا ہے کہ:۔

"علماء پر واجب ہے کہ متحد ہو کر اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے میدان میں آئیں، کیونکہ امر بمعروف اور نہی از منکر، حدود و قوانین الٰہی کو عملی جامہ پہنانا اور ظالموں سے مظلوموں اور ستم زدہ افراد کا دفاع کرنا واجب مطلق ہے اور اس کے مقدمات میں سے سب سے اہم قدرت و حکومت کا حصول ہے اور یہ بھی واجب ہے۔"

یہ بات فطری ہے کہ مختلف ممالک کی قومیں اور ملتیں شرائط و حالات کے اعتبار سے مختلف ہیں لہٰذا ان میں اپنے حالات کے تحت یا طویل مقدمات مثلاً تہذیبی و تمدنی انقلاب سے ابتدا کرنی چاہئے تاکہ برسا برس کے بعد ہی سہی اس راہ میں مشکلیں اور صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد کامیابی حاصل کریں۔ کبھی کبھی کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہونے کے لئے بہت ساری منزلیں طے اور مقدمات فراہم کرنے پڑتے ہیں۔

جس روز امام خمینی مدظلہ نے اس ملک میں اسلام خواہی کی آواز بلند کی اس وقت سے انقلاب کی کامیابی تک کا فاصلہ بڑا طویل تھا اور ظاہر بین نگاہوں کو یہ کامیابی غیر ممکن نظر آتی تھی، لیکن امام خمینی نے خدا کی قوت اور اس کے وعدوں پر بھروسہ کرتے ہوئے ملت کی سوئی ہوئی طاقت کو بیدار کیا اور پندرہ سال کے طویل عرصہ کے بعد وقت کے فرعون و ہامان اور اس کے خادموں کو پسپا کر کے اسلام کی جمہوری حکومت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہ عظیم کامیابی اس بزرگ رہبر انقلاب و باہمت فقہاء، باعمل علماء اور ایران کی باعزم قوم کی باہمی کوششوں سے ہی حاصل ہو سکی جو دل و جان سے اسلام کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔

لہٰذا اس اقدام و تحریک کو جو نہ صرف شرعی حیثیت سے غلط نہیں تھی بلکہ امر بمعروف و نہی از منکر اور قوانین الٰہی کی بجا آوری کی بنیاد پر لازم و واجب تھی اور مذکورہ آیات شریفہ میں کئے گئے وعدوں کے مطابق اگرچہ ملک ایران کے محدود دائرہ ہی میں سہی، کامیاب ہوا ہی تھا اور اگر اسی طرح دوسرے ممالک کے مسلمان بھی اس آواز پر لبیک کہیں اور انقلاب کے تمام شرائط بشمول ایمان، عمل صالح، پائداری، ثبات قدم اور اسلام کے عظیم فقیہ کی پیروی پر گامزن ہوں تو یہ تحریک دنیا کے مختلف گوشوں میں وسعت پیدا کر سکتی ہے۔

اور اگر بعض روایتیں جو لوگوں کو بعض اقدامات اور تحریکوں میں شرکت سے روکتی ہیں، یا تحریک کے علمبردار کو طاغوت، شریک خدا اور بت قرار دیتی ہیں، یا سکوت، جمود اور گوشہ گیری کا حکم دیتی ہیں، یا صرف جہاد و قتال کی نیت پر اکتفا کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یا انقلابات و اقدامات کو بے سود و بے نتیجہ، شیعوں کے لئے زحمت کا سبب اور ائمہ معصومین کی ناراضگی کا موجب جانتی ہیں، یا انھیں بے موقع اور قبل از وقت اقدام شمار کرتی ہیں، تو صرف اس معروضہ کی بنا پر ہے کہ انقلاب کیلئے شرائط موجود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ قرآن مجید، احادیث، عقل اور انقلاب سے منع کرنے والی بعض روایات کے ذریعہ بھی اقدام کے جواز و وجوب اور اس کی کامیابی کے لئے اس کے لازمی شرائط کا موجود ہونا لازمی ہے۔ ذیل میں ہم تمام شرائط اور ان کی ضرورت واہمیت و اعتبار کو دلیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ تحریک انقلاب کے رہبر کو بندۂ خدا، امام قائمؑ یا فقیہ عالم، سچا، خواہشات نفسانی کا مخالف، مولا کا اطاعت گذار، مرضیٔ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلنے والا، نیک اعمال کا حکم دینے اور برے اعمال سے روکنے والا، عمل صالح انجام دینے والا اور زمانہ پر حاکم ظالم و جابر حکومت کو سرنگوں کرنے والا ہونا چاہئے۔ اور امام قائم عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور سے پہلے کسی اقدام سے منع کرنے کے معنی یہی ہیں۔ یعنی درحقیقت اقدام انقلاب امام زمانہؑ کے ذریعہ یا انکی اجازت ان کی مرضی یا ان کی نیابت میں انجام پانا چاہئے۔

اس شرط کی دلیل اور یہ کہ اس مشہور روایت "کل رایۃ ترفع قبل قیام القائم فصاحبھا الطاغوت یعبد من دون اللہ عزوجل"[1] سے مراد اس شرط کے سوا کچھ نہیں حسب ذیل ہے:۔

الف: "وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون (سجدہ/۲۴)

اور انہیں (بنی اسرائیل) میں سے ہم نے کچھ لوگوں کو چونکہ انہوں نے (مصیبتوں پر) صبر کیا تھا

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱ کتاب الجہاد ص ۳۷

پیشوا و رہبر بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کرتے تھے اور ہماری آیتوں کا دل سے یقین رکھتے تھے۔

مذکورہ آیت میں خداوند عالم کی طرف سے امامت و رہبری کے لئے صبر و پیکار اور آیات الٰہیہ پر ایمان و یقین کو شرط قرار دیا گیا ہے۔

ب : ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون (انبیاء/۱۰۵)

ہم نے توریت کے بعد یقیناً زبور میں لکھ دی تھی کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک و صالح بندے ہوں گے۔

اس آیت میں خداوند عالم نے وارث مکتوب اور زمین پر قدرت و اختیار کا حقدار فقط اپنے بندوں کو گردانا ہے۔

ج : وعد الله الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنّهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکننّ لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنّهم من بعد خوفهم امناً یعبدوننی لایشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذالک فاولئک هم الفاسقون (نور/۵۵)

اے ایمان والو! تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو (ایک نہ ایک دن) روئے زمین پر ضرور اپنا نائب مقرر کرے گا جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انھیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا اور ان کے خوف کے بعد (ان کے ہراس کو) امن سے بدل دے گا کہ وہ اطمینان سے میری عبادت کریں اور کسی کو ہمارا شریک نہ بنائیں اور جو اس کے بعد بھی کفر اختیار کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

اس آیت میں زمین پر حاکم جابر و ظالم قوتوں کی جانشینی، پسندیدہ دین کی حاکمیت، اس کے لئے نیک بندوں کا انتخاب، امن و امان توحید خدا پر انحصار اور مومنین و عمل صالح کرنے والوں کے ذریعہ خدا

کی عبادت کا وعدہ ہے۔ قرآن میں اس سلسلہ کی اور دوسری آیتیں بھی موجود ہیں۔

د : عیص بن قاسم کی روایت میں ایک جگہ حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ :-

ولا تقولوا خرج زید فان زیداً کان عالماً وکان صدوقاً ولم یدعکم الیٰ نفسہ وانما دعاکم الی الرضا من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ولو ظہر لوفیٰ بما دعاکم الیہ۔ انما خرج الی سلطان مجتمع لینقضہ فالخارج منا الیوم الیٰ ای شیئ یدعوکم الی الرضا من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فنحن نشہدکم انا لسنا نرضی بہ وھو یعصینا الیوم[1]

یہ نہ کہو کہ زید نے کیوں خروج اور علم جہاد بلند کیا ہے ، زید ، عالم و صادق تھے انہوں نے اپنی سرداری اور ریاست منوانے کے لئے آواز بلند نہیں کی ، بلکہ رضائے آل محمدؐ کی طرف لوگوں کو بلایا تھا اور اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو اپنے عہد کو پورا کرتے ۔ ان باتوں کے علاوہ انہوں نے ظالم و ستمگر حاکم سے ٹکر لینے اور سے نابود کرنے کے لئے اعلان جنگ کیا تھا ۔ آج خروج کرنے والا تمہیں کس چیز کی دعوت دے رہا ہے کیا مرضی آل محمد کی طرف ؟ تو یاد رکھو ہم اس سے راضی نہیں ہیں ، آج وہ ہماری مخالفت کر رہا ہے ۔

امام نے زید کے اقدام کو فقاہت ، تقویٰ و صداقت اور اپنی حکومت کے لئے نہیں بلکہ امام کو حاکمیت تفویض کرنے کے لئے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی پر اقدام کرنے کی دلیل سے اس وقت کے دوسرے اقدامات و انقلابات سے مستثنیٰ قرار دیا ہے " فانہ اتقی من ان یدعوا الی نفسہ " کہ وہ اس سے زیادہ صاحب تقویٰ تھے کہ لوگوں کو اپنی حکومت کی برقراری کے لئے دعوت دیں ۔

ھ : ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون وعداً علیہ حقاً فی التوراۃ والانجیل والقرآن ومن اوفیٰ بعہدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ وذلک ھو الفوز العظیم ۔ التائبون العابدون الحامدون السائحون

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱ کتاب الجہاد ص ۳۶

الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشر المومنین۔ (توبہ/۱۱۱-۱۱۲)

بے شک خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ (انکی قیمت) ان کے لئے بہشت ہے (اسی وجہ سے) یہ لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو کفار کو قتل کرتے اور خود بھی قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ پکا وعدہ ہے (جس کا پورا کرنا) خدا پر لازم ہے (اور ایسا پکا وعدہ ہے کہ) توریت وانجیل وقرآن (سب) میں (لکھا ہوا) ہے اور خدا سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا کون ہے۔ تم تو اپنی (خرید) فروخت سے جو تم نے خدا سے کی ہے خوشیاں مناؤ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔ (یہ لوگ) توبہ کرنے والے، عبادت گذار، خدا کی حمد و ثنا کرنے والے (اس کی راہ میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کاموں سے روکنے والے اور خدا کی (مقرر کی ہوئی) حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسول ان) مومنین کو بہشت کی خوشخبری دے دو۔

اس آیت میں خداوند عالم نے ان جہاد و پیکار کرنے والوں کو جنت کی بشارت عطا فرمائی ہے جو ہمیشہ توبہ، عبادت، ذکر پروردگار، روزہ، نماز، رکوع، سجدہ، امر بہ معروف اور نہی از منکر اور حدود خداوند کی حفاظت کے بہترین صفات سے آراستہ ہوں اور یہ وہی صفات ہیں جو اس روایت: "فاما من کان من الفقہاء صائناً لنفسہ حافظاً لدینہ مخالفاً علی ہواہ مطیعاً لامر مولاہ فللعوام ان یقلدوہ"[1] میں ذکر کئے گئے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں امام صادق علیہ السلام کا استدلال اس آیت شریفہ کی تائید کرتا ہے۔ (وسائل الشیعہ، کتاب الجہاد ج ۱۱ ص ۲۳)

امام نے یہ ثابت فرمایا کہ ہر شخص مسلح جہاد نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے سزاوار معدودے چند افراد جن میں منفرد شخصیت ہر دور کا امام معصوم اور ان کے نزدیک ترین افراد یعنی فقہاء اسلام ہیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۹۵ طبع بیروت۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ لوگ تحریک و انقلاب کے رہبر کی حمایت و اطاعت کریں اور اس میں پائداری کا مظاہرہ کریں۔ رہبران الٰہی کے ذریعہ مسلحانہ جنگ و پیکار اور اس کی کامیابی کے شرائط میں سے یہ بھی ایک اہم شرط ہے جبکہ تہذیبی و ثقافتی جہاد کے لئے اس طرح کی کوئی شرط نہیں ہے کہ اس میں لوگوں کی حمایت اور اطاعت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ جہاد تو ہمیشہ لازم و واجب اور کم از کم ممکن تو ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے اوصیاء کرام اپنی ساری زندگی کبھی بھی اس فریضہ سے دستبردار نہیں ہوئے۔ اس کے برخلاف مسلحانہ جنگ کا اقدام سچے پیروکار اور کسی حال میں جدا نہ ہونے والے جانبازوں کی ایک معتدبہ تعداد پر منحصر ہے۔ جناب موسیٰؑ ایک حد تک مسلسل بدلتے ہوئے حالات و شرائط کے ساتھ تقیہ کے ذریعہ یا ظاہر بظاہر تہذیبی و عقیدتی معرکوں میں مصروف رہے اور بالآخر انہوں نے مسلحانہ جہاد کے ذریعہ اپنے فریضہ کو انجام دیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تیرہ سال تک مکہ میں توحید اور اسلامی معارف کی تبلیغ کی ساتھ ہی ایمانی گروہ کی قوت و تعداد میں اضافہ فرماتے رہے اور دس سال کی مدینہ کی زندگی میں کفار و منافقین کے ساتھ جہاد پر مامور کئے گئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد چونکہ حضرت علی علیہ السلام جاں نثار افراد کی قلت کا شکار ہوئے لہٰذا انہوں نے مسلحانہ جہاد و جنگ کے لئے تلوار نہ اٹھائی اور اعتراض کرنے والوں کے جواب میں فرماتے تھے: "افلح من نھض بجناح او استسلم فاراح"[1] "یعنی کامیاب وہ ہے جو اٹھے تو پر و بال کے ساتھ اٹھے نہیں تو (اقتدار کی کرسی) دوسروں کے لئے چھوڑ بیٹھے اور اس طرح (خلق خدا کو بدامنی) راحت میں رکھے۔" مطلب یہ کہ کامیابی اسی رہبر کو نصیب ہوگی جو انسانوں کے گروہ میں اپنے ناصر و مددگار رکھتا ہے۔ پچیس سال تک مسلسل تہذیبی نظریاتی پیکار و دفاع میں مصروف رہنے کے بعد جب آپ کو قومی، جانباز، جاں نثار اور اطاعت گذار افراد حاصل ہو گئے تو آپ نے حکومت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے انسانیت کے دشمنوں سے جنگ کا اعلان کر دیا اور حکومت کے بندوبست اور عدل و انصاف قائم کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اسی طرح امام حسنؑ نے باوفا جانبازوں اور باہمت افراد کی کمی کی وجہ سے اپنے عہد میں فقط اسلام کے معارف اور اسلامی تہذیب کی تبلیغ پر اکتفاء کی اور ان کے بھائی حسینؑ ابن علی علیہما السلام نے بھی اپنی رہبری و امامت کے زمانہ میں اسی وظیفہ

---

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) خطبہ ۵

نجام دیا جسے ان کے برادر بزرگ نے انجام دیا تھا اور اگر امام حسنؑ بھی یزید کے زمانہ میں امام ہوتے تو
یظیم فریضہ کو انجام دیتے، جنگ کرتے، شہادت کا استقبال کرتے جس طرح امام حسین علیہ السلام نے جنگ کی
شہید ہوئے، امام صادقؑ فرماتے تھے کہ: "اگر میرے پاس فقط سترہ عدد مخلص مددگار ہوتے تو میں بھی
رام جہاد کرتا"۔

شیعہ فقہا اور امام زمانہؑ کے نائبین بھی مختلف علاقوں اور گوشہ وکنار میں اپنے مخصوص حالات
تحت انھیں فرائض کو انجام دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ گذشتہ صدی میں عراق میں مرحوم آیت اللہ میرزا
ن شیرازی کا قلمی جہاد اور مرحوم آیت اللہ شیخ محمد تقی شیرازی کا مسلحانہ جہاد اور فتح علی شاہ کے زمانہ میں
ران کے علماء کا مسلحانہ جہاد اور مرحوم آیت اللہ حائری کا صبر وسکون کے ساتھ علمی وتہذیبی جہاد
ہ معصومینؑ کی پیروی ہے اور ہمارے زمانہ میں اسلامی انقلاب کے رہبر کی مساعی جمیلہ کے ذریعہ تحریک
ے قبل اور اس کی پندرہ سالہ جدوجہد تدریجی کامیابی کے بعد برپا ہونے والا عظیم انقلاب، عالمی استکبار
ور اس کے پٹھوؤں کے مسلسل جنگ وجہاد سب اولیاء خدا کی مخصوص سیرت کے حامل ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اخبار اور حدیثیں جن سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ امام زمانہؑ کے ظہور سے
بل برپا کئے جانے والے تمام انقلابات پر حرمت کی سرخ لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ خود ائمہ معصومین کی جانب سے
رپا کئے جانے والے مذکورہ بالا انقلابات کے دوران ہی ائمہؑ سے صادر ہوئی ہیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ در
حقیقت یہ حدیثیں انقلابات کی نوعیت بیان کرتی ہیں اور ان کی تقسیم بندی کرتی ہیں۔ یعنی اگر انقلابات کیلئے
شرائط موجود ہوں تو یہ انقلابات لازم و مستحسن بھی ہیں اور کامیاب بھی ہوں گے اور اگر رہبر ناقص ہو
یا عوام مددگار نہ ہوں تو ایسی تحریک ناجائز اور بے نتیجہ ہوگی اور اس کا پرچم بلند کرنے والا طاغوت شمار
کیا جائے گا اور یہ اخبار واحادیث کسی صورت سے قرآن کریم کی آیتوں کے عام اور مطلق حکم کو تمام باشرائط
انقلابات کی فتح وکامیابی کے باوجود مقید کر سکتی ہیں۔ نہ کوئی عالم اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ حالات
کیا ہے جیسے ہوں کسی بھی رہبر کی سرپرستی میں انقلاب برپا کیا جائے تو وہ جائز، شرعی اور پر ثمر ہوگا۔

ہم یہ ثابت کرنا نہیں چاہتے کہ امام زمانہؑ کے ظہور سے پہلے کے تمام انقلابات صحیح اور بانتیجہ ہیں بلکہ ہم یہ
کہنا چاہتے ہیں کہ اگر انقلاب کے سارے شرائط پورے ہو جائیں تو کسی زمانہ کی قید باقی نہیں رہتی اور ایسی
تحریک میں شریک نہ ہونے کا بہانہ کوئی نہیں کر سکتا۔

تسلیم شدہ امر تو یہ ہے کہ ایک عالمی حکومت کا قیام صرف خاتم الاوصیاء امام زمانہ ؑ کے دست مبارک سے انجام پائے گا لیکن اس عالمی حکومت سے پہلے علماء و فقہاء کے ذریعہ محدود زمانہ یا محدود علاقہ میں اسلامی حکومت کا قیام محال اور غیر متحقق ہے : یہاں تک کہ اسکی ابتدا کرنا، ماحول کا سازگار کرنا اور لوگوں سے مدد لینا بھی ناجائز، غلط اور بے ثمر ہے ! یا عالمی حکومت کے قیام کے حالات و ماحول پیدا کرنا اور اس کے لئے مسلحانہ جہاد کرنا بھی امام زمانہ ؑ کے ظہور اور ان کی اجازت پر منحصر ہے ! یہ ایسی باتیں ہیں جو غیر منطقی اور بلا دلیل ہیں بلکہ قرآن کریم اور ائمہ معصومین و فقہائے کرام کی سیرت کے برخلاف ہیں ۔

اگر ہم امام زمانہ ؑ کے ظہور سے متعلق روایات کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ امام ؑ کا ظہور مقدمات ظہور کی فراہمی کے بعد ہی عمل میں آئے گا منجملہ ان مقدمات کے دنیا کا ظہور امام ؑ کے لئے آمادہ ہو جانا اور باوفا و جانباز مومنین کی فراہمی ہے اور یہ بات عمومی سطح پر اسلامی و دینی تربیت اور اس سلسلہ میں فقہاء و علماء کا مناسب اور صحیح وقت پر اقدام دینی تبلیغات، تہذیبی جدوجہد اور بعض حالات میں مسلحانہ اقدام اور ساتھ ہی کسی مخصوص علاقہ میں اسلامی حکومت کی برقراری سے ہی عملی جامہ پہن سکتی ہے ۔ یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ امام ؑ کے ظہور کا واقعہ غیر فطری نہیں ہے جسے اسباب و حالات کی فراہمی کی احتیاج نہ ہو اور نہ ایسا امر ہے جس میں خدا کا ارادہ کسی مخصوص و معین زمانہ سے تعلق رکھتا ہو ۔

چنانچہ امام زمانہ ؑ کی عالمی حکومت کا مسئلہ اس سے پہلے کے انقلاب کی نفی نہیں کرتا بلکہ یہ انقلابات اس راہ میں اثر انگیز قدم کی حیثیت رکھتے ہیں اور جیسا کہ بعض گذشتہ روایات میں ہے کہ سنگلاخ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹانا آسان ہے لیکن ایسی حکومت و سلطنت کو ختم کرنا مشکل ہے جو زوال پذیر نہ ہوئی ہو اور اس روایت کے تحت بعض لوگوں نے یہ تصور کر لیا کہ امام صادق ؑ نے اس سے طاغوتی حکومتوں کو نیست و نابود کرنے کی کوششوں کو بے ثمر قرار دیا ہے اور یہ حکومتیں اپنے معین وقت کے بعد ہی زوال پذیر و سرنگوں ہوں گی جبکہ اس روایت کا مقصد یہ ہے کہ یہ کام مقدمات کے فراہم کئے بغیر مشکل بلکہ محال ہے ۔ لیکن مقدمات کی فراہمی اور مناسب ساز و سامان و جد و جہد سے یہ کام ممکن اور آسان ہو جائے گا ۔ جبر و تشدد کی سرنگونی یا خاتمہ کے لئے کوئی سال یا دن معین نہیں ہوتا کہ جب تک وہ وقت نہ آئے اس کے خاتمہ کی کوشش بے سود و غلط ہوگی ۔ بلکہ اس کا خاتمہ تو اسی وقت ہے جب اس کے مٹانے کے لئے ضروری مقدمات

فراہم ہو جائیں اور اس کے خلاف پیکار پر اثر اور مفید واقع ہو۔ درحقیقت اس طرح کی تعبیریں و روایات لوگوں میں طاغوتیوں کے خلاف تحریک اور جذبۂ دفاع وجہاد کو ابھارنے اور اس نظریہ کو باطل ثابت کرنے کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ خدا کے نیک اور صالح بندوں کی زحمتوں اور جہاد کے بغیر ہی استکباری حکومتوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ جیسا کہ ہمارے ائمہ معصومین نے فرمایا ہے:۔

افضل الجہاد کلمۃ عدل [حق] عند امام جائر

یا پھر قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق ایک معتدبہ تعداد کی فراہمی تک جہاد و پیکار کے بجائے صرف مومنین کے اتحاد اور ان کی تربیت کے لئے بیان ہوتی ہیں مثلاً: وَاعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم (انفال/۶۰)

ان کفار کے مقابلہ کے لئے جہاں تک تم سے ہو سکے (اپنے بازوؤں کے) زور سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے لڑائی کا) سامان مہیا کرو۔ اس سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن اور اس کے سوا دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھا لوگے جنھیں تم نہیں جانتے مگر خدا ان کو جانتا ہے۔

بہر حال یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر چیز کی طرح خدا کے دشمنوں پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری امکانات، سازو سامان اور آمادگی کی ضرورت ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کامیابی کے لئے آگے نہیں بڑھنا چاہئے، نہیں، بلکہ مسلمان پہلے پوری تیاری کرلے پھر بھرپور آمادگی کے ساتھ جہاد و مبارزہ کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

جناب ابراہیم امینی
ترجمہ: سید علی الحسن رضوی

اسلامی حکومت

بین الاقوامی روابط اور خارجہ پالیسی

کافروں سے دوستی۔ تقیہ و اضطرار کی حالت میں:

قرآن مجید کا کفار کی دوستی اور ان کی ولایت و حاکمیت قبول کرنے سے روکنا، محض ملت اسلام کی آزادی و استقلال اور قدرت و خود مختاری کو تحفظ عطا کرنے کی غرض سے ہے چنانچہ اگر کسی وقت اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت اسی میں مضمر ہو تو اسلامی حکومت وقتی طور پر کفار سے دوستانہ روابط و تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کبھی اسلامی حکومت احساس کرتی ہے کہ اس وقت کفر کی طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے تو اسلامی مفادات کے تحت وقتی طور پر کافر حکومتوں کے تئیں نرم اور دوستانہ رویہ کا اظہار کر سکتی ہے تاکہ اس درمیان اپنی دفاعی طاقت کو مضبوط و مستحکم کر کے حالات کو بہتر بنایا جا سکے۔ اسی طرح اگر مصلحت اس بات کی متقاضی ہو کہ ذرا نرم اور مصالحانہ انداز اپنانے کی وجہ سے ان کو اسلام کی طرف جذب کیا جا سکتا ہے یا اس طرح اسلام کی ترویج و اشاعت کے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں تو کفار سے اظہار دوستی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی ۲۸ ویں آیت:۔

"لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیئ الا ان تتقوا منھم تقیۃ ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر" میں اگرچہ کفار کی ولایت و حاکمیت قبول کرنے کو سختی کے ساتھ

[1] مومنین صاحبان ایمان کے بجائے کفار کو اپنا دوست و سرپرست قرار نہ دیں جو شخص بھی ایسا کرتا ہے اس کا خدا سے

منع کر دیا گیا ہے مگر " الا ان تتقوا منھم تقیۃ " کی قید لگا کر حالت " تقیہ " کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔

تقیہ کا مسئلہ بہت سی روایات میں وارد ہے۔ اسی آیت کے ذیل میں صاحب " تفسیر صافی " نے کتاب " احتجاج " سے امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک قول نقل فرمایا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں :-

" وامرک ان تستعمل التقیۃ فی دینک فان اللہ یقول : (ایاک ثم ایاک ان تتعرض للھلاک وان تترک التقیۃ التی امرتک بھا فانک شائط بدمک ودماء اخوانک معرض لنعمک ولنعمھم مذلھم فی ایدی اعداء دین اللہ وقد امرک اللہ باعزازھم " (المیزان ۔ جلد ۳ ص ۱۶۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا :-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ یقول : لا ایمان لمن لا تقیۃ لہ ویقول : قال اللہ تعالیٰ : الا ان تتقوا منھم تقیۃ "[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر فرماتے تھے کہ جو شخص تقیہ سے کام نہ لیتا ہو وہ ایمان سے بے بہرہ ہے، پھر حضرت اضافہ فرماتے تھے کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے : (کفار کو اپنا دوست قرار نہ دو) مگر یہ کہ جب ان سے کوئی خوف ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :-

التقیۃ فی کل شیئ یضطر الیہ ابن آدم وقد احلہ اللہ لہ[2]

تقیہ ہر اس امر میں ہے جس میں آدمی اضطرار سے دوچار ہو اور ایسے ہی مواقع پر خداوند عالم نے تقیہ کرنے کی اجازت دی ہے۔

سے کچھ سروکار نہیں ہے (یعنی خدا سے اسکا کوئی رابطہ باقی نہیں رہتا مگر یہ کہ (اس طرح) ان کے شر سے محفوظ رہنا چاہے (اور اہم تر مصلحت کے پیش نظر تقیہ اختیار کرے) اور خدا تم کو اپنی نافرمانی سے ڈراتا رہتا ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے

[1] بحار الانوار ج ۷۲، ص ۴۱۴ (مطبوعہ بیروت) [2] ایضا ص ۴۳۵

امام حسن علیہ السلام پیغمبر اسلامؐ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

ان الانبیاء انما فضلهم اللّٰه علی خلقه لشدة مداراتهم لاعداء دین اللّٰه وحسن تقیتهم لاجل اخوانهم فی اللّٰه[1]

نبی اکرمؐ نے فرمایا : خداوند عالم نے اپنے انبیاء کو دیگر خلائق پر اس لئے برتری عطا کی ہے کہ و دشمنان خدا سے نرمی سے پیش آتے تھے اور اپنے دینی بھائیوں کی حفاظت کے لئے بہترین طریقے سے تقیہ کر

امام حسن عسکری علیہ السلام سے منسوب تفسیر میں ایک روایت ہے کہ :۔

قال الصادق علیه السلام (فی قول اللّٰه تعالیٰ "وقولوا للناس حسنا" ای للناس کلهم مؤمنهم ومخالفهم اما المؤمنون فیبسط لهم وجهه واما المخالفون فیکلمهم بالمدارة لاجتذابهم الی الایمان فانه بأیسر من ذالك یکف شرورهم عن نفسه وعن اخوانه المؤمنین ـ قال الامام علیه السلام ان مدارة اعداء اللّٰه من افضل صدقة المرء علی نفسه واخوانه کان رسول اللّٰه فی منزله اذا استأذن علیه عبد اللّٰه بن ابی بن سلول فقال رسول اللّٰه بئس اخو العشیرة ائذنوا له فلما دخل اجلسه وبشر فی وجهه فلما خرج قالت له عایشة : یا رسول اللّٰه قلت فیه ما قلت وفعلت به من البشر ما فعلت ؟ فقال رسول اللّٰه یا عویش یا حمیراء ان شر الناس عند اللّٰه یوم القیامة من یکرم لاتقاء شره)[2]

امام جعفر صادق علیہ السلام قرآن کی آیت "وقولوا للناس حسنا" کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوگوں سے (شیریں زبان میں) گفتگو کرنی چاہئے ۔ چاہے مومنین

---

[1] بحار الانوار ج ۲ ، ص ۴۱۲ (مطبوعہ بیروت)

[2] ایضاً ص ۴۰۱

ہوں یا مخالفین، مومنین سے ملتے وقت چہرہ پہ مسرت و انبساط کی لہریں دوڑ جانی چاہئے البتہ جہاں تک مخالفین کی بات ہے ان سے بھی نرمی کے ساتھ اس لئے پیش آنا چاہئے کہ ان کو اسلام و ایمان کی طرف مائل کیا جا سکے اور یہ (مومنین کے لئے) بڑی آسان سی بات ہے کیوں کہ وہ (اس طرح) خود کو اور اپنے ایمانی بھائیوں کو دشمنوں کے شر سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ نیز امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کسی شخص کا دشمنان خدا کے ساتھ نرمی سے پیش آنا بہترین صدقہ ہے جو وہ اپنے اور اپنے بھائیوں کی طرف سے نکالتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی خدمت میں جس وقت منافقین کے سرغنہ، عبد اللہ ابی نے شرفیابی کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا: اس قبیلہ کی بدترین فرد سے کہدو کہ وہ آ سکتا ہے اور جب وہ بزم پیغمبرؐ میں وارد ہوا تو آپ نے نہ صرف یہ کہ اس کو بیٹھنے کی اجازت دیدی بلکہ اس کے ساتھ نرم گفتاری کا مظاہرہ بھی فرمایا۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد عائشہ پیغمبرؐ سے سوال کرتی ہیں: یہ کیا بات ہوئی کہ اس کے بارے میں ایسی بات فرمانے کے بعد جب ملاقات ہوئی تو اس سے نہایت ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ فرمایا؟ حضرتؐ نے جواب دیا اے عویش اور اے حمیراء! روز قیامت بدترین آدمی وہ ہوگا جس کے شر و فساد سے خوف زدہ ہو کر (حالت تقیہ میں) لوگ اس کا احترام و اکرام کریں۔

مختصر یہ کہ آیات و روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت اس بات کا احساس کرتی ہے کہ کفار و مشرکین کے ساتھ اس کی صلح آمیز دوستانہ روش امت اسلام کے حق میں مفید اور مناسب نیز مصلحت اسلامی کے مطابق ہے تو وقتی طور پر اس طرح کی سیاست اپنانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن کسی بھی صورت میں شخصی اغراض و مقاصد یا ذاتی جاہ و اقتدار کی حفاظت کے لئے اسلامی حکومت کے اصل مقصد یعنی اسلام کی ترویج و اشاعت اور امت اسلام کی آزادی و استقلال کو فراموش کر کے کسی سازشی سیاست کے اپنانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

کفار سے تعاون و عدم جارحیت کا معاہدہ۔

اگر کفار کی جانب سے کسی طرح کی خیانت و سازش نیز مسلمانوں پر تسلط و غلبہ حاصل کر لینے کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور وہ صلح و سلامتی کے ساتھ زندگی گذارنے پر آمادہ ہوں تو اسلامی حکومت مصالح اسلامی کی بنیاد پر ان کے ساتھ ایسا امن معاہدہ قائم کر سکتی ہے جس کے تحت دونوں

مصالحت و مسالمت کے ساتھ زندگی گزار سکیں حتی کہ جن مسائل میں اسلامی شریعت اجازت دیتی ہے طرفین کے فوائد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعاون و امداد باہمی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ قرآن میں ارشاد الٰہی ہے :-

لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون

(سورہ ممتحنہ / ۸ و ۹)

خدا تم کو ان لوگوں کی دوستی سے منع نہیں کرتا جو تمہارے دین کے مسئلہ میں تم سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے، یا تم کو تمہارے گھروں سے نکل جانے پر مجبور نہیں کرتے۔ خدا ایسے لوگوں سے دوری کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ تم ان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرو (کیونکہ) خداوند عالم انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ خدا تو بس تم کو ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے مسئلہ میں جنگ و جدال کرتے ہیں اور تم کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں یا تم کو گھر سے محروم کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور (ظاہر ہے تم میں) وہ لوگ جو ان کے ساتھ دوستی کرتے ہیں ظالم و ستمگر ہیں۔

دوسری جگہ خدا فرماتا ہے :-

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا و توکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم

(انفال / ۶۱)

اور اگر وہ لوگ صلح پر مائل نظر آئیں تو ان کے ساتھ صلح قائم کر لو، خداوند عالم پر بھروسہ رکھو بے شک وہ سمیع و علیم ہے۔

بعض آیتوں سے تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ خود پیغمبر اسلامؐ نے کفار کے ساتھ اس طرح کے معاہدے قائم کئے تھے چنانچہ پیغمبر اکرمؐ سے خدا فرماتا ہے :-

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئاً

ولم یظاہروا علیکم احداً فاتموا الیھم عہدھم الیٰ مدتھم ان اللہ یحب المتقین" (توبہ/۴)

مگر یہ کہ جن مشرکین سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا اور انھوں نے اس کے بعد کسی طرح کی معاہدہ ں (بھی) نہیں کی نہ ہی تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی تو ان سے عہد و پیمان کی مدت ختم ہوتے تک ہدہ کا پاس و لحاظ رکھو بے شک خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

اگر تاریخ اسلام اور سیرت رسول کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ نے اپنے دور ت میں نہ صرف یہ کہ کفار سے معاہدے قائم کئے ہیں بلکہ ایفائے عہد کا خیال بھی رکھا ہے نمونہ کے طور پر ں آپ کے چند معاہدوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلا معاہدہ:

جس وقت آپ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت اختیار کی تمام مہاجرین و انصار اور یہود کے درمیان پنے ایک اہم تاریخی معاہدہ قائم کیا جو آج بھی تاریخ میں موجود ہے جس کے بعض ضروری حصے جو ری بحث سے مربوط ہیں سیرت ابن ہشام سے ہم پیش کر رہے ہیں۔

(۱)

"وانہ من تبعنا من یہود فان لہ النصر والاسوۃ غیر مظلومین ولا متناصرین علیھم"

یعنی یہود کی ہر وہ فرد جو ہماری اطاعت قبول کرے گا ہماری مدد اور تعاون کا حقدار ہوگا۔ ن کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا اور کسی کو اس پر ظلم و زیادتی کی اجازت نہ ہوگی ہی اس کے دشمنوں کی ہمنوائی کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۲-

"وان الیھود ینفقون مع المؤمنین ماداموا محاربین"

دوران جنگ یہود اپنے تمام جنگی اخراجات ادا کریں گے۔

۳- "للیھود دینھم وللمسلمین دینھم"

دینی معاملات میں یہود و مسلمین دونوں کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

۴۔ وان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھٰذہ الصحیفۃ۔

اس معاہدہ پر دستخط کرنے والوں سے جو کوئی بھی جنگ کرے گا تمام مسلمان اور یہود مل کر اس کے ساتھ جنگ کریں گے اور دونوں اپنے اپنے جنگی اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے۔

۵۔ "وان بینھم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم"

مسلمان اور یہود دونوں عہد کرتے ہیں کہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کے شریک و معاون رہیں گے نہ کہ برے کاموں میں (ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے)

۶۔ "وان بینھم النصر علی من دھم یثرب"

اس معاہدے پر دستخط کرنے والے تمام افراد مشترک طور پر مدینہ کا دفاع کریں گے۔[1]

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس معاہدہ میں نبی صلعم نے یہودیوں کے ساتھ تین بنیادی باتوں پر معاہدہ کیا ہے۔

۱۔ مشترک طور پر ملک (مدینہ) کا دفاع اور جنگی اخراجات کی برابر سے ادائیگی۔

۲۔ مذہبی آزادی۔

۳۔ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون۔

دوسرا معاہدہ: صلح حدیبیہ[2]۔

یہ معاہدہ پیغمبر اسلامؐ نے "حدیبیہ" کے مقام پر مکہ کے کفار و مشرکین کے ساتھ کیا تھا جس کے بعض پہلو لائق توجہ ہیں:۔

۱۔ مسلمان اور قریش اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ چار سال (یا دس سال) کے لئے لڑائی جھگڑا

---

[1] سیرہ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۴۷، الاموال ص ۲۹۰

[2] "الاموال" ص ۲۳۰، سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۴

بند رہے گا، دونوں ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے۔

۲۔ چوری اور خیانت کے مرتکب نہ ہوں گے، ایک دوسرے کے مال و اسباب کا احترام کریں گے

۳۔ جو مسلمان بھی حج وعمرہ یا یمن وطائف کی طرف سفر کی غرض سے مکہ میں وارد ہوگا اس کی جان ومال محفوظ رہے گا اسی طرح کفار ومشرکین میں سے جو کوئی شام اور مشرقی ممالک کے سفر کی غرض سے مدینہ میں وارد ہوگا محفوظ رہے گا۔

۴۔ مسلمان اور قریش آپس میں جس قبیلہ کے ساتھ چاہیں معاہدہ کرسکتے ہیں، ان کے معاہدوں کا احترام کیاجائے گا۔

۵۔ مسلمان اور قریش دونوں عہد کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف عداوت ودشمنی یا سازش سے کام نہیں لیں گے اور اپنے دل میں ایک دوسرے سے کدورت نہیں رکھیں گے۔

۶۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھی آیندہ سال مراسم حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ میں وارد ہوسکتے ہیں بشرطیکہ اسلحے ہمراہ نہ ہوں اور تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ فرمائیں۔

تیسرا معاہدہ:

"ایلہ" کے حاکم "یوحنا" کے نام پیغمبر اسلام کی طرف سے "امان نامہ" اصل متن کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔[1]

"یہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے "رویہ" کے فرزند "یوحنا" اور دیگر ساکنان ایلہ کے نام امان نامہ ہے: اس کے تحت اہل ایلہ، ان کی کشتیاں اور ان کے دریائی وصحرائی قافلے خدا اور اس کے رسول کی پناہ میں ہیں نیز یہ کہ شام ویمن وبحر سے تعلق رکھنے والے افراد اگر اس سرزمین سے عبور کرنا چاہیں تو امان میں رہیں گے۔ ایلہ کے باشندے اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ جو کوئی بھی کسی کے قتل کا مرتکب ہوگا مقتول کے ورثاء کو اس کی دیت ادا کرنی پڑے گی۔ اسی طرح وہ اس بات کا بھی عہد کرتے ہیں کہ وہ جس ساحل پر بھی لنگر انداز ہوں دوسروں کو سمندر سے استفادہ کرنے

---

[1] الاموال ص ۲۸۶

سے مانع نہیں ہو سکتے، نیز یہ کہ اپنے دریائی اور خشکی کے راستوں کو دوسروں پر مسدود نہیں کر سکتے۔"

چوتھا معاہدہ۔

نصارائے نجران سے معاہدہ[1]۔

اس کے بعض اہم حصے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اہل نجران عہد کرتے ہیں کہ ہر سال ۲ ہزار حلّے (مخصوص وضع کے لباس) دو قسطوں میں ٹیکس کے طور پر مسلمانوں کو دیتے رہیں گے۔

۲۔ پیغمبر اسلامؐ کے نمایندوں کی ایک ماہ یا اس سے کم مدت تک خاطر و مدارات کریں گے۔ البتہ یہ نمایندے ایک ماہ سے زیادہ وہاں قیام نہیں کریں گے۔

۳۔ جب کبھی بھی یمن سے کوئی معرکہ درپیش ہو اہل نجران حکومت اسلامی سے تعاون و ہم بستگی کے ثبوت میں تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس اونٹ بشرط ضمانت عاریتاً لشکر اسلام کے سپرد کریں گے۔

۴۔ نجران اور اس کے قرب و جوار کے باشندے خدا اور اس کے رسول کی پناہ میں رہیں گے ان کی جان و مال اور ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کے تمام گرجہ گھر، راہب، پادری اور خدام آزادی کے ساتھ اپنے امور انجام دیتے رہیں گے، کوئی (مسلمان) ان کے امور میں مانع نہ ہوگا۔

۵۔ کسی شخص کو حق حاصل نہ ہوگا کہ انھیں ان کی زمینوں سے محروم کرے، ان سے "عشر"[2] وصول کرے یا ان کے وطن پر فوج کشی کرکے انھیں پریشان کرے۔

۶۔ جس شخص نے بھی حق کا مطالبہ کیا اس کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیا جائے گا۔

۷۔ ان کا کوئی بھی آدمی دوسرے کے جرم میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ اہل نجران اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ وہ سود خوری (ربا) سے پرہیز کریں گے ورنہ

---

[1] فتوح البلدان ص۷۶ و الاموال ص۲۰۲

[2] یہ ایک اسلامی ٹیکس ہے جو مسلمان زمینداروں سے لیا جاتا ہے۔ البتہ اس کی مقدار اور کیفیت میں فقہاء میں اختلاف ہے۔

اگر انہوں نے اس کے خلاف کیا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ان سے کوئی واسطہ نہ ہوگا اور پورا معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

مذکورہ آیتوں نیز کفار کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے متعدد معاہدوں سے، جن میں سے بعض کی طرف نمونہ کے طور پر اشارہ کیا گیا ہے، یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مصلحت متقاضی ہو تو حکومت اسلامی کفار و مشرکین یا اہل کتاب سے ایسے امور خیر میں تعاون و امداد باہمی کے عہد و پیمان منعقد کر سکتی ہے جن میں دونوں کا بھلا اور مصلحت ہو چاہے یہ معاہدہ علمی تبادلہ کی نوعیت سے ہو یا زرعی، صنعتی، تجارتی، اقتصادی اور دفاعی حیثیت کا حامل ہو، عدم مداخلت کی بنیاد پر ہو یا کسی اور جہت سے کیا گیا ہو۔ البتہ اس طرح کے عہد و پیمان کے لئے بنیادی شرط وہی امت اسلامیہ کی آزادی اور استقلال کا مسئلہ ہے یعنی اس کے ذریعہ اسلامی حکومت کے داخلی مسائل میں کفار کے تسلط یا مداخلت کا امکان نہ پایا جاتا ہو۔ مختصر یہ کہ ہر طرح کے عہد و پیمان میں اسلامی ممالک کی عظمت و بزرگی اور استقلال و آزادی پیش نظر رکھنا ذمہ داران مملکت کا فریضہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذاتی اقتدار اور تخت کے تحفظ کے لئے کفار کی بندگی قبول کر کے ملت اسلام کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیا جائے مسلمان سربراہ مملکت کو کفار خصوصاً یہود کی اسلام دشمن سازشی فطرت و روش نیز ان کے ناپاک منصوبوں کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے ان سے اگر کسی طرح کا معاہدہ کیا بھی جائے تو پوری طرح سے اس بات کا دھیان رہے کہ کفار کے نفوذ و تسلط کا اس میں کوئی امکان تو نہیں پایا جاتا۔

ایفائے عہد کی تاکید۔

اگر اسلامی حکومت اپنی مصلحت کے پیش نظر بلا کسی جبر و اکراہ کے کسی دوسری حکومت، فرد یا کسی ملک سے وابستہ ادارہ کے ساتھ کسی معاہدہ پر دستخط کر دیتی ہے تو اسے اپنے عہد و پیمان پر عمل کرنا چاہئے۔ قرآن و احادیث میں اس مسئلہ پر بڑی تاکید کی گئی ہے چند آیتیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ "یا ایہا الذین آمنوا اوفوا بالعقود" (مائدہ/۱)

اے ایمان لانے والو! اپنے عہد و پیمان کو وفا کرو۔

۲۔ "والذینہم لاماناتہم وعہدہم راعون" (مومنون/۸)

اور وہ لوگ (مومنین) جو اماںتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس و لحاظ کرتے ہیں۔

۲- "واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم ولا تنقضوا الايمان بعد توكيدها وقد جعلتم الله عليكم كفيلاً ان الله يعلم ما تفعلون۔" (نحل/۹۱)

جب تم نے عہد و پیمان باندھ لیا تو خدا سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو اور اپنی قسم کو تاکید کے بعد نہ توڑو جبکہ تم خداوند عالم کو اپنی قسم کا ضامن و کفیل قرار دے چکے ہو تو جو کچھ بھی کرتے ہو خدا اس سے واقف ہے۔

ان آیات میں اپنے عہد و پیمان پر قائم رہنا علامات مومن میں شمار کرتے ہوئے اس کو مسلمانوں پر واجب قرار دے دیا گیا ہے اور ان آیات کا اطلاق کفار و مشرکین سے کئے ہوئے وعدوں اور معاہدوں پر بھی صادق آتا ہے اگرچہ بعض دوسری آیتوں میں کفار و مشرکین سے کئے ہوئے معاہدوں کے سلسلہ میں تصریح موجود ہے۔ چنانچہ اعلان ہوتا ہے:

"الا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئاً ولم يظاهروا عليكم احداً فاتموا اليهم عهدهم الى مدتهم ان الله يحب المتقين" (توبہ/۴)

مگر ہاں: جن مشرکین سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا اور ان کی طرف سے معاہدہ شکنی بھی نہیں ہوئی ہے نہ ہی انہوں نے تمہارے خلاف کسی کی مدد کی ہے تو جب تک مدت ختم نہ ہو جائے ان سے کئے ہوئے معاہدہ کا پاس و لحاظ رکھو۔ کیونکہ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں بعض روایتیں بھی ملتی ہیں جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام جناب مالک اشتر کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"وان عقدت بينك وبين عدوك عقدة او البسته منك ذمة فحط عهدك بالوفاء وارع ذمتك بالامانة واجعل نفسك جنة دون ما اعطيت فانه ليس من فرائض

اللہ شیئ الناس اَشدّ علیہ اجتماعا مع تفرّق اھوائھم وتشتت ارائھم من تعظیم الوفاء بالعھود[1]"

اگر اپنے اور اپنے کسی دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ کرو یا اپنے دامن میں پناہ دو تو پھر اپنے عہد و پیمان کے پابند رہو وعدہ کا لحاظ رکھو اور اپنے قول و قرار کی حفاظت کے لئے جان کو سپر بنا دو کیونکہ خدا کی جانب سے عائد شدہ فرائض میں سے کوئی فریضہ ایفائے عہد جیسی عظمت و اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ جس پر دنیا اپنے الگ الگ نظریوں اور مختلف رایوں کے باوجود یکجہتی سے متفق ہے۔

پیغمبر اسلامؐ اس سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیف اذا وعد[2]"

جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے وعدوں کو وفا کرنا چاہیئے۔

حضور صلعم کا ہی ارشاد گرامی ہے :۔

یجب علیٰ المؤمن الوفاء بالمواعید والصدق فیھا[3]

مومن پر واجب ہے کہ وہ اپنے وعدوں کو وفا کرے اور اس میں صداقت سے کام لے۔
ایفائے عہد انسانی فضائل و کمالات میں سے ہے جس کی خود انسانی فطرت (اگر مردہ نہ ہوئی ہو) تائید کرتی ہے۔ اسی لئے اسلام نے بھی اس پر بڑا زور دیا ہے مسلمانوں کو اپنے عہد و پیمان کے سلسلہ میں مکمل طور پر وفا کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے چاہے اس کے لئے انہیں مادی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے اسلام کی نظر میں معاہدہ کو ہر حالت میں احترام کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ عہد و پیمان کافر و فاسق ہی سے کیوں نہ کیا گیا ہو۔ مسلمانوں کو اپنے عمل کے ذریعہ دوسروں کو انسانیت اور ایمانداری کا درس دینا چاہیئے۔

اگر آپ پیغمبر اسلامؐ کی عملی زندگی کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ جب تک آپ کا مخالف اپنا معاہدہ

---

[1] نہج البلاغہ فیض ص ۱۰۲۷ نامہ ۵۳ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین ص ۳۳۲)
[2] کافی جلد ۲ ص ۳۶۳
[3] مستدرک ج ۲ ص ۸۵

خود توڑ نہیں دیتا تھا آپ ہمیشہ اپنے کئے ہوئے وعدوں پر قائم اور پابند رہتے تھے ۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام نے مشرکین مکہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر قریش میں سے کوئی فرد مکہ سے بھاگ کر مدینہ آتا ہے تو اس کو واپس ان کی تحویل میں دیدیں گے ۔ اس معاہدہ کے بعد اتفاق سے ایک نومسلم جن کا نام ابو بصیر تھا مکہ سے بھاگ کر مدینہ میں پناہ حاصل کرنے آگئے ۔ مشرکین نے پیغمبر اسلام کے پاس آدمی روانہ کیا کہ اپنے وعدہ کے مطابق ابو بصیر کو ہمارے حوالے کر دیجئے ۔ رسول خدا صلعم نے ابو بصیر سے فرمایا : ہم نے ان لوگوں سے معاہدہ کیا ہے کہ فرار اختیار کرنے والوں کو ان کے حوالے کر دیں گے اور ہمارے دین میں عہد شکنی یا وعدہ خلافی جائز نہیں ہے ۔ تم ان کے ساتھ جاؤ اور مطمئن رہو خداوند عالم تمہاری نجات کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا ۔ ابو بصیر نے عرض کی : یا رسول اللہ ! آپ مجھے مشرکین کے حوالے کر رہے ہیں کہ مجھ سے میرا دین چھین لیں ۔ آپ نے فرمایا : ابو بصیر ! میرا فرض یہ ہے کہ میں اپنے معاہدے پر قائم رہوں ، تم ان کے ساتھ جاؤ اور یقین رکھو کہ خداوند عالم تمہارے نیز تمام کمزور و بے بس افراد کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نجات ضرور پیدا کرے گا۔[1]

جنگ صفین کے موقع پر "واقعۂ تحکیم" کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کو معاویہ کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور جب خوارج کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے امیر المومنین سے معاہدہ فسخ کرنے کی درخواست کی جس کے جواب میں حضرت نے فرمایا :۔

"ویحکم ابعد الرضا والعہد نرجع ؟ اولیس اللہ یقول اوفوا بالعقود وقال اوفو بعہد اللہ اذا عاہدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا ان اللہ یعلم ما تفعلون"[2]

تم پر تف ہو (کیسی بات کرتے ہو) کیا ہم عہد و معاہدہ کے بعد اپنے قول سے پھر جائیں ؟ کیا خداوند عالم نے نہیں فرمایا ہے کہ جب کسی سے کوئی عہد کرو تو اس پر قائم رہو اور

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۳ ۔ ص ۳۲۷

[2] "وقعۃ صفین" لابن مزاحم ص ۵۱۴

(دوسری جگہ) حکم ہے کہ جب عہد و پیمان کرلو تو خدا سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو اور اپنی قسم کو تاکید کے بعد نہ توڑو جبکہ تم نے اپنی قسم کا ضامن اور کفیل خدا کو قرار دیا ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو خداوند عالم ان سب کی خبر رکھتا ہے۔

بہرحال خود پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے خلفاء و ائمہ طاہرین علیہم السلام اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں مکمل طور پر اپنے عہد و پیمان پر قائم اور اس کے پابند رہتے تھے۔ اور اصولی طور پر ایفائے عہد اسلام وایمان کی علامتوں میں سے ہے۔ البتہ معاہدہ شکنی کی صرف ایک صورت جائز ہے اور وہ یہ کہ مدمخالف خود اپنے معاہدہ پر باقی نہ رہے یا خیانت و خلاف ورزی پر کمربستہ نظر آئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس سلسلہ میں بار بار خداوند عالم نے اعلان فرما دیا ہے :۔

"واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیہم علی سواء ان اللہ لایحب الخائنین" (انفال/۵۸)

جب کبھی تمہیں (ایسی علامتیں نظر آئیں) کہ کوئی گروہ تمہارے ساتھ خیانت پر آمادہ ہے (یعنی عہد شکنی کرکے تمہارے اوپر غافلانہ حملہ کرسکتا ہے) تو عدل کا تقاضہ پورا کرتے ہوئے تم بھی ان ہی کے مثل ان کا معاہدہ ان کے منہ پر دے مارو کیونکہ خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اسی طرح سورۂ توبہ میں اعلان ہوتا ہے :۔

وان نکثوا ایمانہم من بعد عہدہم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر انہم لا ایمان لہم لعلہم ینتہون

(آیت/ ۱۲)

اور اگر یہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعنہ زنی کریں تو تم سربراہان کفر سے جنگ کرو کیونکہ (ان سے) اب تمہارا کوئی معاہدہ باقی نہیں رہ گیا۔ شاید اسی طرح (وہ اپنی شرارتوں سے) باز آجائیں۔

اسی کے فوراً بعد اعلان ہوتا ہے :۔

"الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانہم وہموا باخراج الرسول

وهم بدؤكم اول مرة اتخشونهم فالله احق ان تخشوه ان كنتم مؤمنين (توبہ/۱۳)

تم لوگ ایک ایسے گروہ سے جو اپنا عہد توڑ چکا ہے اور پیغمبر اسلام کو نکالنے پر آمادہ ہوا ہے جنگ کیوں نہیں کرتے ؟ جبکہ وہ لوگ تم سے جنگ کی چھیڑ خانی بھی کر چکے ہیں کیا تم ان سے ڈرتے ہو، حق تو یہ ہے کہ اگر تم صاحب ایمان ہو تو تم کو خدا سے زیادہ ڈرنا چاہیئے۔

اور یہ بات بھی پیغمبر اسلام کی سیرت اور ان کے خلفاء کے حالات میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جب تک مشرکین مکہ اپنے عہد پر قائم رہے، حضور بھی اس معاہدہ پر سختی سے کاربند رہے لیکن جب مشرکین مکہ اپنے عہد سے پھر گئے اور پیمان شکنی کرنے لگے تو پیغمبر اسلام نے بھی ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

دشمنوں کو مرعوب و خائف رکھنا۔

حکومت اسلامی کی خارجہ سیاست کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں دشمنوں کو خائف و مرعوب رکھنے پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنی فوجی و جنگی صلاحیت کو اس حد تک مضبوط و مستحکم کرے کہ اس میدان میں اس کو دنیا پر فوقیت و برتری حاصل ہو جائے تاکہ دشمنان اسلام اس سے مرعوب و خوف زدہ رہیں اور کبھی اس کے خلاف خیانت و دست درازی کا فتور ان کے دماغوں میں پیدا نہ ہو چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کہتا ہے :-

"واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لاتعلمونهم الله يعلمهم وما تنفقوا من شئ في سبيل الله يوف اليكم وانتم لاتظلمون" (انفال/۶۰)

اور ان (دشمنوں) کے مقابلہ میں جس حد تک بھی تم سے ممکن ہو اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کرو (اسی طرح) سبک رفتار گھوڑے (مہیا کرو) تاکہ اس کے ذریعہ

لپنے نیز اپنے خدا کے دشمنوں کو خوف زدہ کر سکو اور ان ہی کے مثل دوسرے افراد بھی ہیں جن (کی دشمنی) سے تم واقف نہیں ہو اور خدا ان کو خوب پہچانتا ہے تم خدا کی راہ میں جو کچھ بھی انفاق کرتے ہو وہ تم کو (دوسرے ذرائع سے) واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ تمہارے اوپر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا اس آیت میں کس طرح خداوند عالم نے تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے (اس میں محض پیغمبر اسلام مخاطب نہیں ہیں) ارشاد فرمایا ہے کہ جس حد تک بھی مسلمانوں کے بس میں ہو اپنی طاقت کو مضبوط و مستحکم بنانے کی کوشش کریں اور ایسی طاقت کا مظاہرہ کریں کہ دنیا کی تمام طاقتیں اپنے آپ کو پست محسوس کرنے لگیں۔ تجرباتی شعبوں، فوجی مظاہروں، جنگی منصوبہ بندیوں، جدید اسلحوں نیز زمینی و ہوائی اسباب نقل و حرکت کے میدانوں میں اسلامی حکومت کو اتنا طاقت ور ہونا چاہئے کہ دشمنان اسلام اس کی برتری تسلیم کر لیں اور وہ بھی اس طور پر کہ نہ صرف ایسے دشمن جنکی دشمنی ظاہر ہو چکی ہے یا جن کے بارہ میں حکومت واقفیت رکھتی ہے، بلکہ وہ بھی خوفزدہ رہیں جن کی نیتوں سے محض خداوند عالم آگاہی رکھتا ہے دراصل آیت کے جملے "وآخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم" بڑی دلچسپ حقیقت کے مالک ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو اس طور پر آمادگی کا حکم دیا گیا ہے کہ جن دشمنوں سے تم واقف نہیں ہو صرف خدا جانتا ہے وہ بھی تم سے خوفزدہ رہیں تاکہ کبھی ان کے ذہنوں میں تمہارے خلاف کسی سازش یا زیادتی کے کیڑے کلبلائیں بھی تو وہ اس کی ہمت نہ کر سکیں۔ اسی طریقہ سے دنیا کی ظالم و جابر بڑی طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کر کے دنیا سے ہر طرح کے فتنہ و فساد اور استعماری مشینریوں کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقدس اور خدا کی پسندیدہ راہ ہے کہ اس مقصد تک پہونچنے کے لئے جتنی طاقت بھی کام آئے گی، چاہے مالی طاقت ہو یا جانی، اس کا بدلہ خدا کی طرف سے ضرور حاصل ہو گا۔ کیونکہ اس وقت آپ کا مقصد اور آپ کی ساری کوششیں محض الٰہی مقاصد کی تکمیل اور انسانی فضل و کمال کے حصول پر مرکوز ہوں گی ذاتی اغراض و مقاصد اور شخصی جاہ و حشم کا دور دور تک تصور بھی نہ ہو گا۔

ب سید احمد فہری
سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم شہید ثانی اور امام خمینی کی نظر میں

آفات مناظرہ

حسد

حسد بھی مناظرہ کے لئے خطرناک بلا ہے۔ گذشتہ صفحوں میں تحریر کر چکا ہوں کہ حسد، کینہ کی وجہ سے
ہوتا ہے اور غیظ و غضب کینہ کا مصدر و سرچشمہ ہے۔
مناظرہ کا اصول ہے کہ کبھی مناظر کی فتح ہوتی ہے اور کبھی اس کے حریف کی کبھی مناظر کی دلیلیں حاضرین
دل کو چھو لیتی ہیں اور کبھی اس کے حریف کی۔ اس موقع پر مناظر قطعاً اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوتا کہ
محبوبیت اس کے حریف کے حصہ میں آئے۔ لہٰذا دل میں اس آرزو کا پیدا ہونا ہی حسد ہے، کیونکہ علم خدا کی
ں میں عظیم ترین نعمت ہے لہٰذا کوئی شخص ہنگام مناظرہ اگر یہ آرزو کرے کہ وہ علم جو مناظرہ کی کامیابی
مرانی کا سبب ہے اس کا نصیب قرار پائے تو یہ جذبہ دلیل ہے کہ مناظر آتش حسد میں جل رہا ہے اور یہ
ں حسد عموماً ہر مناظر میں سلگتی رہتی ہے مگر وہ افراد خدا جن کا محافظ و مددگار ہے۔
شہید ثانی علیہ الرحمہ جناب ابن عباس سے منقول حدیثوں کے بیان کے بعد لکھتے ہیں:۔
حسد کی مذمت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خرابیاں بے حد و حساب ہیں بطور خلاصہ یہ سمجھیں
بیل کے آغاز سے اب تک روئے زمین پر جس قدر گناہ ہوئے یا ہو رہے ہیں وہ حسد کا نتیجہ ہیں کیونکہ جب
ں کو آدمؑ سے شکست ہوئی اور خدا نے اسے اپنی بارگاہ سے ملعون قرار دیکر نکال دیا اور دائمی و ابدی عذا

کا وعدہ کیا تو اس نے اپنی محرومی کا انتقام اولادِ آدم سے لینے کی ٹھان لی، لہٰذا ابلیس بھی روح و لہو بن کر پیکرِ انسانی میں سرایت کر گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معاشرہ کے فساد و انتشار کا باعث ہوا۔

یہ حسد ہی تو تھا کہ فرزند آدم قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ پروردگار عالم نے حاسد کو شیطانِ ساحر کا ہم آواز و مصاحب قرار دیا ہے۔

من شر غاسق اذا وقب و من شر النفاثات فی العقد و من شر حاسد اذا حسد - (قرآن کریم)

حسد کی مذمت میں حضرت مرسل اعظم اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی کچھ حدیثیں یہاں پیش کر رہا ہوں:۔

ا۔ آنحضرت نے فرمایا:۔

"دب الیکم داء الامم قبلکم: الحسد والبغضاء وھی الحالقۃ لا اقول حالقۃ الشعر، ولکن حالقۃ الدین والذی نفس محمد بیدہ لا تدخلون الجنۃ حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا"

"پچھلی امتوں کی بیماریاں تم میں بھی سرایت کر چکی ہیں اور وہ "حسد و کینہ" ہے یہ دونوں چیزیں تمہارے دین کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں گی اس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم لوگ اس وقت تک داخل جنت نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو جاؤ اور مومن اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک ایک دوسرے کو دوست نہ رکھو گے۔

ب۔ محمد بن مسلم ایک طولانی حدیث کے ذیل میں کہتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:۔

.... ان الحسد لیاکل الایمان کما تاکل النار الحطب

حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو۔

ج۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔

آفۃ الدین الحسد، والعجب والفخر

حسد، خود بینی، اور بے جا فخر دین کی آفت ہے۔

حضرت نے مزید فرمایا پروردگارِ عالم نے جناب موسیٰ سے کہا:

یابن عمران، لاتحسدن الناس علیٰ ما آتیتھم من فضلی ولا تمدن عینیک الیٰ ذالک ولا تتبعہ نفسک فان الحاسد ساخط لنعمی، صادّ لقسمی الذی قسمت بین عبادی۔ ومن یک کذالک فلست منہ ولیس منی۔

اے موسیٰ: میں نے لوگوں کو جو نعمتیں اپنے فضل کی وجہ سے عطا کی ہیں اس کی وجہ سے آپ ان سے حسد نہ فرمائیں اور نہ ان نعمتوں کو خاطر میں لائیں اور نہ اس کی خواہش میں سرگرداں رہیں، کیونکہ حاسد ہماری نعمتوں پر ناشکری و چراغ پا ہے اور ہم نے بندوں کے درمیان نعمتوں کی تقسیم کا جو انداز رکھا ہے وہ اس کا مخالف ہے۔

اے موسیٰ! جو بھی ایسا ہوگا نہ اس کا ربط مجھ سے ہے اور نہ میرا ربط اس سے۔

۶۔ قطعِ تعلق۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تذکرہ کرچکا ہوں کہ اگر مناظرہ خدا کی خوشنودی کے لئے انجام نہ پائے تو قہری طور سے طرفین کے درمیان کینہ و ملال پیدا ہوجاتا ہے، ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا ہے حق اس کے ساتھ ہے اور اس کا مقابل غلطی پر ہونے کے باوجود اپنی غلطی پر مصر ہے، ایسی صورت میں ایک دوسرے سے ربط وضبط منقطع کرلیتے ہیں۔ جبکہ مومن کا اپنے برادر مومن سے قطع تعلق کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ احادیثِ اربابِ عصمت و طہارت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔ داود بن کثیر کا بیان ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے والد ماجد اور انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ آنحضرت نے فرمایا:۔

"ایما مسلمین تھاجرا فمکثا ثلاثا لا یصطلحان الا کانا خارجین من الاسلام ولم یکن بینھما ولایۃ، وایھما سبق الی کلام اخیہ کان السابق الی الجنۃ یوم الحساب"

اگر دو مسلمان باہمی کبیدگی و ملال کی وجہ سے قطع تعلق کرلیں اور تین روز کے اندر ان کے تعلقات استوار نہ ہوسکیں تو دائرۂ اسلام سے خارج ہیں اور پھر رشتۂ الفت و محبت برقرار نہ ہوسکے گا۔

یاد رکھو، ان دونوں میں جس نے کلام میں سبقت کی وہ قیامت کے دن جنت میں بھی پہلے داخل کیا جائے گا۔

ب۔ اسی مضمون کو امام صادق علیہ السلام نے بھی ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:۔

"لایفترقان رجلان علی الھجران الاّ استوجب احدھما البرائۃ واللعنۃ وربما استحق کلاھما فقال لہ معتب جعلنی اللہ فداک ھٰذا الظالم فما بال المظلوم ؟ قال : لانہ لا یدعوا خاہ الی صلتہ ولا یتعامس لہ عن کلامہ"

"سمعت ابی یقول اذا تنازع اثنان فعان احدھما الآخر فلیرجع المظلوم الی صاحبہ حتّی یقولَ لصاحبہ ای أخی انا الظالم حتی یقطع الھجران بینہ وبین صاحبہ فانّ اللہ تبارک وتعالیٰ حکم عدل یاخذ للمظلوم من الظالم۔"

اگر دو شخص ایک دوسرے سے کنارہ کشی کی خاطر جدا ہوجائیں تو ان میں سے ایک خدا کی لعنت و نفرت کا مستحق قرار پاتا ہے اور کیا تعجب ہے کہ دونوں خدا کی لعنت کے مستحق ہوں حاضرین میں سے ایک شخص نے حضور سے عرض کیا۔

یارسول اللہ ! قربان جاؤں، ظالم مستحق لعنت ہوگا یہ تو ٹھیک ہے، لیکن مظلوم بھی مستحق لعنت ہے، اس کی کیا وجہ ہے۔؟

حضرت نے فرمایا :۔

کیونکہ اس شخص نے اپنے اس بھائی سے تعلقات استوار کرنے کے لئے قرینے فراہم

نہیں کئے اور نہ گذشتہ باتوں کو درگزر کرتے ہوئے گفتگو کا موقع فراہم کیا حضرت نے مزید فرمایا :-

میں نے باباجان سے سنا ہے کہ اگر دو آدمی باہم نزاع واختلاف کریں تو مظلوم کو چاہئے اپنے ساتھی کے پاس جائے اور اس سے کہے بھائی، میں غلطی پر ہوں، اس طرح کہنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے دل سے رنج وملال کو نکال دے گا اور باہمی اختلاف کی خلیج پٹ جائے گی۔

چونکہ پروردگار عالم حاکم عادل ہے لہٰذا ظالم سے مظلوم کا حق لے لیگا۔

سخن ناروا۔

بدکلامی و بد زبانی مناظرہ کی ساتویں آفت ہے یعنی طرفین کے لئے مناسب نہیں کہ ایسی گفتگو کریں جو، یا غیبت بن جائے یا دروغ گوئی سے تعبیر کی جائے۔ درحقیقت اس غیبت و دروغ گوئی کی وجہ وہ کینہ وکدورت ہے جو مناظرے کی وجہ سے دونوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ کیونکہ اکثر مناظر اپنے حریف و مدمقابل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے فلاں صاحب سے اس طرح گفتگو کی، اس طرح انہیں مثلاً شکست دی ... اگر یہ تذکرہ حریف کی توہین و تحقیر کا باعث ہے تو غیبت ہے اور اگر نقل واقعہ میں کچھ کمی و زیادتی کردی تو یہ عمل کذب و بہتان، مکاری و عیاری اور دھوکہ دھڑی کہا جائے گا اور یہ گناہ کبیرہ ہے۔

کبھی کبھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مناظر کہتا ہے ــــ میں نے جن صاحب سے مناظرہ کیا کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے، یا مثلاً احمق تھے، وغیرہ وغیرہ یہ گفتگو کا انداز بھی اس کی حیثیت و منزلت کی پامالی و تحقیر کی بنا پر غیبت ہی سے تعبیر کیا جائے گا ــــ یہ ساری باتیں گناہ کبیرہ ہیں اور ان گناہوں سے متعلق بے شمار جگہوں پر قرآن وسنت میں عذاب کے وعدے کئے گئے ہیں۔ غیبت کی مذمت کے لئے بس یہی کافی ہے کہ خدا نے غیبت کو مردار بھائی کے گوشت کھانے سے تشبیہ دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے :-

ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ - (حجرات/۱۲)

ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تمہیں یہ گوارہ ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھاؤ۔ قطعاً تم اسے گوارہ نہیں کرو گے۔

د۔ غیبت کی مذمت کرتے ہوئے مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ

مسلمان پر مسلمان کا خون، مال اور آبرو ریزی حرام ہے، یعنی نہ اسے قتل کرے نہ اس کے مال پر تصرف کرے اور نہ اس کی تحقیر کے حالات مہیا کرے۔

ب۔ ایک دوسری حدیث میں غیبت کی مذمت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:۔

ایاکم والغیبۃ فان الغیبۃ اشد من الزنا۔ ان الرجل قد یزنی فیتوب فیتوب اللہ علیہ وان صاحب الغیبۃ لا یغفر حتی یغفر صاحبہ

غیبت سے بچو کیونکہ غیبت زنا سے زیادہ شدید ہے۔ زانی جب زنا کے بعد توبہ کرتا ہے تو خدا اس کی توبہ قبول بھی کرتا ہے لیکن جو غیبت کرتا ہے اس کے گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک وہ شخص نہ معاف کر دے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔

ج۔ براء کا بیان ہے:۔

مرسل اعظم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ایک دن ہم لوگوں کے درمیان بآواز بلند خطبہ دیا جس کی آواز گھروں میں بیٹھی پردہ نشینوں تک پہنچ رہی تھی۔ خطبہ کا مضمون یہ تھا:۔

اے لوگو! زبانوں سے تو تم ایمان لائے لیکن دل تمہارے ابھی ایمان سے خالی ہیں، مسلمانوں کی غیبت نہ کرنا اور نہ ان کی عیب جوئی میں لگے رہنا کیونکہ جس کسی نے اپنے برادر مسلم کے عیوب تلاش کئے خدا اس کے عیوب کو طشت از بام کر دے گا۔

یاد رکھو۔ خدا جس کے عیوب کے آشکار کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو خواہ گھروں کے اندر ہی کیوں نہ انجام پائیں خدا ظاہر کر کے رہے گا۔

حضرت کے خطبہ کی لفظیں یہ ہیں:۔

"خطبنا رسول اللہ (ص)، حتی اسمع العواتق فی بیوتہا فقال:

یا معشر من آمن بلسانہ ولم یومن بقلبہ لا تغتابوا المسلمین

توحید ۱۴۲

ولا تتبعوا عوراتهم، فان من تتبع عورة اخيه تتبع الله عورته
ومن تتبع الله عورته يفضحه الله ولو في جوف بيته "

د۔ حضرت امام صادق علیہ السلام اس ضمن میں فرماتے ہیں:۔
اگر کسی بندہ مومن نے اپنے برادر مومن کے آنکھوں دیکھے عیب اور سنی ہوئی باتوں کو آشکار کر دیا تو خدا ایسے انسان کی مذمت میں فرماتا ہے:۔
ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة في الذين آمنوا لهم
عذاب اليم - (نور/۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ مومنین میں بدکاری کا چرچا پھیل جائے۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

س۔ مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔
ایک بار کی غیبت کا گناہ تیس بار کے زنا کے گناہ سے زائد ہے۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:۔
ایک بار غیبت کرنا ۳۶ بار کے زنا سے زیادہ سخت تر ہے۔

جناب شہید ثانی فرماتے ہیں:۔
غیبت کی مذمت میں حدیثیں فراواں ہیں لیکن میں نے نمونے کے طور پر یہاں چند کا تذکرہ کر دیا ہے تاکہ غیبت کی اہمیت پر تھوڑی روشنی پڑ جائے۔
جناب شہید ثانی کی عبارت بالا سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شہید علیہ الرحمہ گذشتہ حدیثوں کے تذکرے کے بعد موضوع غیبت سے صرف نظر کرنا چاہ رہے تھے لیکن موضوع کی اہمیت نے انہیں دوبارہ کچھ مزید حدیثوں کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

ل۔ جناب مفضل بن عمر کی روایت ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔
اگر کوئی شخص مرد مومن کی کسی بات کو اس لئے نقل کر رہا ہو کہ اسے عوام کی نگاہوں میں

ذلیل و رسوا کرے تو ایسے شخص کو خدا اپنی سرپرستی سے نکال دیتا ہے اور شیطان کی سرپرستی میں دیدیتا ہے اگرچہ شیطان بھی اسے قبول نہیں کرتا۔
متن حدیث یہ ہے۔
"من روی علی مومن روایة یرید شینه وهدم مروته لیسقط من اعین الناس، اخرجه الله من ولایته الی ولایة الشیطان فلا یقبله"

ب۔ جناب زرارہ بن اعین امام باقر و صادق علیہما السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا:۔
کفر سے انسان سب سے زیادہ اس وقت قریب ہوتا ہے جب کسی سے رشتہ برادری استوار کرے اور اس کے بعد اس کی غلطیوں اور لغزشوں کو نظر میں رکھے۔
جناب شہید ثانی نے مزید عبرتناک حدیثیں نقل فرمائی ہیں جسے طول تحریر و ذوق قاری کا لحاظ رکھتے ہوئے ترک کر رہا ہوں۔

۸۔ کبر و نخوت

مناظرہ کی آٹھویں آفت کبر و نخوت ہے جو عموماً مناظرہ کرنے والوں میں پائی جاتی ہے، اس بری صفت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مناظر اپنے کو اپنی حیثیت سے زیادہ کر کے پیش کرتا ہے اور اگر مقابل کی گفتگو صحیح و درست بھی ہو تو بھی تسلیم نہیں کرتا تاکہ دیکھنے والوں کے سامنے مقابل کامیاب نہ ہو سکے۔
کبر کا ہی کارشمہ ہے کہ اگر مقابل سے شکست کھا بھی جاتا ہے تو واضح لفظوں میں نہیں کہتا کہ میں نے غلطی کی، حق آپ کے ساتھ تھا، بلکہ اپنی باتوں پر باقی رہتا ہے۔ جبکہ مرسل اعظم نے اس انداز کی ان الفاظ میں مذمت فرمائی ہے۔
"اگر کسی کے دل میں ذرہ برابر کبر و نخوت پایا گیا تو جنت کی بو نہیں سونگھ سکتا۔"
کبھی کبھی مناظر اسی کبر و نخوت کی وجہ سے حریف کی اس طرح تحقیر و توہین کرتا ہے کہ دیکھنے والے خیال کرتے ہیں اس کا حریف سو فیصد باطل پر ہے، اسے حق و باطل کے درمیان امتیاز کی صلاحیت بھی نہیں، علمی اصول و قوانین سے بالکل بے بہرہ ہے۔
جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے کبر و نخوت کی مذمت میں ابو حمزہ کی روایت کو پیش کیا ہے۔ ابو حمزہ

کا بیان ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔
قیامت میں تین گروہ ایسے ہوں گے جس سے خدا نہ کلام فرمائے گا نہ ان کی طرف نگاہ رحم و کرم سے دیکھے گا اور نہ تزکیہ و طہارت انہیں عطا کرے گا، ایسے افراد کے لئے دردناک عذاب ہے، ان تین گروہوں میں ایک وہ ہوں گے جو تکبر و نخوت کیا کرتے تھے۔

۹۔ عیب جوئی۔

مناظرے کے لئے نویں آفت عیب جوئی ہے۔ مناظرہ اس مذموم صفت سے بھی خالی نہیں ہوا کرتا۔ مناظر اس بات کی تاک میں لگا رہتا ہے کہ مدمقابل کی لغزشوں کو جمع کرتا رہے اور خود اس کو امی کی باتوں سے شکست دیکر اپنی بالاتری تسلیم کروالے۔
کبھی کبھی عیب جوئی کی عادت (ان بے خبر پڑھے لکھوں میں جنھوں نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا ہے) اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ حدود و اصول مناظرہ کو یک قلم نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف مدمقابل کی عیب جوئی میں لگ جاتے ہیں اور اس انداز کو صرف مناظرہ تک محدود نہیں رکھتے بلکہ مدمقابل کی روزمرہ کی زندگی میں عیب ڈھونڈا کرتے ہیں اور پھر انھیں بیان کرکے اسے شرمسار کرتے ہیں۔ ممکن ہے اپنے اس گناہ پر خوش بھی ہوں اور مدمقابل سے کہتے ہوں، دیکھا میں نے تمھیں کس طرح شرمندہ کر کے تمہاری بولتی بند کردی۔ خدا کی پناہ ان خطاؤں اور لغزشوں سے جس میں اہل غفلت و پیروان شیطان مبتلا ہوتے ہیں۔
عیب جوئی کی مذمت میں فراواں حدیثیں معصومین علیہم السلام سے مروی ہیں جو اس مقالہ میں سما نہیں سکتی ہیں۔ میں چند کا تذکرہ آفت ہفتم میں کر چکا ہوں، اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

۱۰۔ تمنائے بدحالی۔

مناظرہ کی دسویں آفت یہ ہے کہ مناظر اپنے مدمقابل و حریف کی بدحالی کی تمنا کیا کرتا ہے۔ اس کی خوشحالی کو دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ مذہب کہتا ہے اگر انسان ہر اس چیز کو جسے اپنے لئے پسند کرتا ہے اپنے بھائی کے لئے پسند نہ کرے تو اس کا ایمان ناقص و ادھورا ہے اور ایسا جذبہ رکھنے والا جادۂ دین سے منحرف، لیکن افسوس اکثر وہ افراد جو اپنے ہم عصروں پر اپنی برتری کی تمنا رکھتے ہیں ان میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔

حدیثوں میں ملتا ہے کہ مسلمان کا دوسرے مسلمان پر کچھ حق ہے اگر ان میں سے کسی نے ایک حق بھی ضائع کر دیا تو خدا کی نظر سے گر جاتا ہے ۔ ان حقوق میں ایک حق تو یہی ہے کہ جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسرے کے لئے بھی اسی کا انتخاب کرے ۔

اس جگہ جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت جس کے معلّی بن خنیس ناقل ہیں بحوالہ کافی نقل فرمایا ہے ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے ۔

"مسلمان کا مسلمان پر سب سے معمولی حق تو یہ ہے کہ جس چیز کو اپنے لئے دوست رکھتا ہے اسے اپنے برادر مومن کے لئے بھی دوست رکھے ۔"

۱۱ ۔ خودستائی

مناظرہ کے لئے گیارہویں آفت خودستائی ہے ۔ کسی نہ کسی انداز سے یہ مذموم صفت بھی مناظر میں پائی جاتی ہے ۔ چونکہ مناظر اپنے افکار و نظریات کو صحیح اور مقابل کی دلیلوں کو لچر تصور کرتا ہے لہذا ممکن ہے کہ صاف صاف کہہ بیٹھے ۔

"میں فکر و شعور کا مالک ہوں لہذا ایسا بھی نہیں کہ میں نہ سمجھ سکوں ...."

اس طرح کی گفتگو دلیل ہے کہ مناظر میں خودستائی کا عنصر پایا جاتا ہے جبکہ قرآن نے خودستائی سے روکا ہے ۔

لا تزکوا انفسکم (نجم/۳۲)

خودستائی نہ کرو ۔

کسی دانشور سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی بات ہے جو حق ہو لیکن اس کا کہنا مذموم ہے ؟ اس نے جواب دیا ۔ "خودستائی"

جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ خودستائی بری چیز ہے ، خدا نے اس سے روکا ہے ۔ بلکہ خودستائی کے بعد انسان خدا کے غضب کا مستحق تو ہو ہی جاتا ہے اس کے ساتھ جس بلندی و برتری کے اظہار کے لئے خودستائی کرتا ہے وہ مقصد بھی اسے حاصل نہیں ہوتا ۔

شہید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو یقین نہ آتا ہو تجربہ کر کے دیکھ سکتا ہے ۔ مثلاً ــــ اگر تمہارے سامنے

تمہارا ساتھی اپنی تعریف و توصیف کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ تمہاری نظروں میں اسکی وقعت نہیں بڑھتی بلکہ اس کے اس انداز کو تمہارا باطن پسند نہیں کرتا اور اس کی رہی سہی عزت بھی تمہاری نظروں میں گھٹ جاتی ہے۔ بس یہی حال تمہارا ہوتا ہے جب تم کسی دوسرے کے سامنے اپنی تعریف کرتے ہو۔ اگر تمہارے سامنے وہ کچھ نہ بھی کہے تو بھی پس پشت تمہارے انداز سے نفرت کرتا ہے۔

۱۲۔ نفاق

مناظرہ کی آخری آفت نفاق ہے جس سے مناظرہ کرنے والے دوچار ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ جس وقت مناظر اپنے مدمقابل کے روبرو ہوتا ہے نہایت پُرتپاک و مخلصانہ لب ولہجہ میں استقبال کرتا ہے۔ جبکہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ زبان سے اظہار کرے کہ "میں آپ کی زیارت کا مشتاق تھا، یہ سعادت ہے کہ آپ کی زیارت کا شرف ملا، درآنحالیکہ دل نفرت و کدورت سے بلیوں اچھل رہا ہوتا ہے اور دونوں اسے خوب اچھی طرف سمجھ بھی رہے ہوں کہ یہ سارے تکلفات زبانی ہیں اس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی موقع کے لئے مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

اذا تعلّم الناس العلم وترکوا العمل وتحابّوا بالالسن وتباغضوا بالقلوب وتقاطعوا فی الارحام لعنهم الله عند ذلک فاصمّهم واعمیٰ ابصارهم۔

جب لوگ علم حاصل کریں اور عمل کو بالائے طاق رکھ دیں، زبان سے دوستی و محبت کا اظہار کریں لیکن دل سے ایک دوسرے کو دشمن رکھتے ہوں اور قرابت داروں سے قطع تعلق کریں تو خدا ایسے افراد پر لعنت فرماتا ہے اور گونگا بہرا بنا دیتا ہے۔

یہ بارہ خصلتیں ہیں جسکی ابتداء کبر و نخوت اور انتہا نفاق پر ہے۔ اگر ان بارہ خصلتوں میں سے کوئی ایک انسان میں پیدا ہو جائے تو بہشت سے محرومی اور جہنم تک پہنچنے کے قرینے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بارہ خصلتیں مناظر کے علمی مرتبے اور فکر و فہم کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن کچھ خصلتیں تو وہ ہیں جو ہر مناظر میں پائی جاتی ہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ دین و دانشمندی اور جہاد بالنفس کیوجہ سے ان بری خصلتوں کو ظاہر ہونے نہیں دیتا اور عوام اس کے باطن سے آگاہ نہیں ہو پاتے ورنہ مناظر

بنیادی طور سے اس درد کے درمان کی تلاش میں نہیں ہوتا ۔

مختصر یہ کہ ان ساری آفتوں اور خرابیوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان "علم" خدا کے لئے حاصل نہیں کرتا ورنہ علم گوارہ نہیں کرتا کہ "صاحب علم" کی عمر عزیز بے کار و مہمل گذر جائے ۔

علم، صاحب علم کو پروردگار عالم کی بارگاہ سے قریب کرتا ہے اور اس کے لئے سعادت و خوش بختی کے امکانات فراہم کرتا ہے ۔

ایسا نہیں :

ممکن ہے اس جگہ کسی من چلے کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ بارہ آفتوں کے ذکر کا یہ مطلب ہے کہ مناظرہ ترک کر دیا جائے ۔ جبکہ مناظرے میں دو فائدے بھی ہیں ۔

پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔ اگر لوگوں میں عہدہ و منصب طمع و لالچ نہ ہو پھر کون پڑھے لکھے گا ۔ یہی حب جاہ و مقام ہے جو باب مناظرہ کھولے ہوئے ہے ۔ اگر مناظرہ نہ ہو تو ایوان علم زمیں بوس ہو جائے ۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مناظرہ سے طلبہ میں علمی استعداد پیدا ہوتی ہے ۔ لہٰذا علمی استعداد کو بڑھانے کے لئے مناظرہ سے روکنا استعداد کا خون کرنا ہے ۔

عزیز من، میری مراد آفات مناظرہ کے بیان سے یہ نہیں ہے کہ باب مناظرہ بند کر دیا جائے بلکہ میں گذشتہ صفحات میں مناظرے کے لئے آٹھ شرطوں اور بارہ آفتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں لہٰذا جب کوئی مناظرہ کرنا چاہے تو آٹھ شرطوں اور بارہ آفتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے مناظرہ کرے پھر ایسے مناظرہ کے لئے کوئی انگشت نمائی نہیں کرے گا ۔

لیکن ان دو فائدوں کے ذکر سے اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ صرف ان فائدوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بارہ آفتوں کے نقصانات کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بات حیرت انگیز ہے ۔

یاد رکھو، خدا و رسول خدا اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے جس علم دین کے حاصل کرنے پر اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی ہے اس کا ربط عہدہ و اقتدار سے نہیں ہے ۔

ہاں، یہ اور بات ہے کہ منصب و عہدہ قہری طور سے انسان کو تحصیل علم کے لئے آمادہ کرتے ہیں، شیطان بھی اسی فکر میں لگا ہے کہ ریاست و منصب کی طمع تمہارے اندر پیدا کرا کے علم حاصل کرائے تاکہ تم خدا کے مقررہ کردہ اجر و ثواب سے محروم ہو سکو۔ تمہیں چاہئے کہ علم کو صرف خوشنودی خدا کے لئے حاصل کرو اور ابلیس کی کوشش کو نقش برآب کردو۔

یاد رکھو، تم میں سے جس کسی نے ابلیس کے شوق دلانے پر علم حاصل کیا وہ انھیں لوگوں کے زمرے میں رکھا جائیگا جس کی طرف مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

ان اللہ یویدھذا الدین بالرجل الفاجر و باقوام لاخلاق لھم

پروردگار عالم اس دین کو فاسق و فاجر اور غیر مہذب لوگوں کے ذریعہ نصرت و مدد فرمائیگا

اور جو حضرت انبیاء و معصومین علیہم السلام کی ترغیب پر علم دین حاصل کرتے ہیں وہ انہیں انبیاء کے جانشین اور لوگوں میں خدا کے امین قرار پاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ علمی استعداد طلاب کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان آفتوں سے بھی اجتناب کرتا رہے جس کا تذکرہ کر چکا ہوں اور اگر مذکورہ آفات سے بچ نہیں سکتا ہے تو مناظرہ نہ کرے بلکہ پڑھنے لکھنے میں لگا رہے، ذہن کو کام میں لاتا رہے، برے اخلاق سے بچتا رہے یہی چیزیں مناظرہ سے زیادہ فکری استعداد بڑھانے کے لئے کافی ہیں۔ اس کی زندہ مثال علماء دین کی زندگیاں ہیں کہ انہوں نے ایسے مناظرے کرنے کے بجائے ذہن کو مطالب و حقائق کے درک کرنے میں مشغول رکھا۔

یہ ایک اصول ہے کہ اگر ایک چیز ایک فائدہ اور چند نقصانات رکھتی ہو تو صحیح نہیں ہے کہ اس ایک فائدہ کی خاطر متعدد خسارات و نقصانات کو برداشت کیا جائے۔ جیسا کہ شراب و جوئے کیلئے قرآن نے کہا ہے۔

ویسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما بقرہ/ ۲۱۹

اے رسول، آپ سے لوگ شراب اور جوئے سے متعلق سوال کر رہے ہیں آپ ان سے فرمادیں کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اگرچہ کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان فائدوں سے گناہ زیادہ ہے۔

اسی گناہ کی زیادتی کی وجہ سے خدا نے شراب و جوئے کو حرام قرار دیا ہے ۔

شہید ثانی علیہ الرحمہ نے جو آفاتِ مناظرہ ذکر فرمائے ہیں اس کا تعلق "تہذیب اخلاق"[1] کے اصولوں سے ہے ۔

در حقیقت نہایت بیش قیمت نکات ہیں اگر جدا جدا ہر ایک پر تفصیل سے کچھ لکھا جائے تو متعدد جلدیں تیار ہو جائیں گی ۔

چونکہ مقالہ ان تفصیلات کا متحمل نہیں لہٰذا میں نے بھی شہید کے بیانات کی تفسیر و تشریح نہیں کی ۔

معبود سے التجا ہے کہ حقیر کو جلد از جلد اس کی توفیق کرامت فرمائے کہ ان "مباحث اخلاقی" پر سیر حاصل کچھ لکھ سکوں جبکہ اس موضوع پر معلم اخلاق حضرت امام خمینی دام ظلہ کے بھی حیات بخش و پر حکمت افکار و نظریات پائے جاتے ہیں ۔

[1] حکمت عملی کی پہلی قسم کی طرف اشارہ، تدبیر منزل اور سیاست مدن حکمت عملی کی دوسری و تیسری قسمیں ہیں ۔ مزید اطلاع کیلئے اخلاق ناصری کا مطالعہ فرمائیں ۔ حسینی

روزہ

امیر المومنین علیؑ کی اپنے فرزند امام حسنؑ سے ایک وصیت

اَللهَ اَللهَ فِی صِیَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ فَاِنَّ صِیَامَهٗ جُنَّةٌ مِنَ النَّارِ {تحف العقول ص ۲۱۶}

خدارا خدارا ۔ رمضان کے روزوں کو پابندی سے بجا لاؤ ۔ کیوں کہ یہ روزے آتش جہنم کی سپر ہیں ۔

جناب سید مصطفیٰ محقق داماد

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

مصادر فقہ

اجماع

اجماع، عامہ و خاصہ کی نظر میں۔

اسلامی فقہ میں احکام کے حصول کا تیسرا مصدر اجماع ہے۔ اجماع لغت میں اتفاق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اصطلاح فقہ میں اس کے معنی کسی حکم شرعی پر فقہا یا ارباب حل و عقد کا اتفاق کرنا ہے[1]۔ اس تعریف کے مطابق احکام شرعی میں عام انسانوں کا اتفاق کرنا اجماع نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ شرعی احکام میں عوام کی رائے ان کی لاعلمی کی بنا پر مؤثر ثابت نہیں ہوگی۔

مندرجہ بالا معنی کے تحت اجماع اہل سنت کے نزدیک حکم خدا کے استنباط کے مصادر یعنی کتاب و سنت کی صف میں شمار ہوتا ہے۔

لیکن فقہ امامیہ میں اجماع ان معنوں کا حامل نہیں ہے۔ شیعہ، اجماع کو مستقل طور سے کتاب و سنّت کا کا ہم ردیف مصدر نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسے سنت معصوم کے لئے ایک کاشف کے طور پر جانتے ہیں اور اگر اصول فقہ کی کتابوں میں اسے فقہ کے ایک مصدر اور کتاب و سنت کی صف میں بیان بھی کیا گیا ہے تو اسے صرف اصول کی بحثوں کی تاریخی تدوین اور باب بندی کے سلسلہ میں قدما کی پیروی کہا جاسکتا ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں اگر ایک عہد کے تمام علماء کسی نظریہ سے اتفاق نہ رکھتے ہوں لیکن

---

[1] کتاب فصول نے اس تعبیر کو امام فخرالدین رازی سے نقل کیا ہے۔

علماء شیعہ کا ایک مختصر گروہ اس نظریہ پر اتفاق کرے اور ان کا یہ اتفاق قول و فعل و تقریر معصوم کا کاشف ہو تو
یہ اس مسئلہ میں اجماع کہلائے گا۔ اور اگر علماء کا ایک بڑا گروہ کسی مسئلہ پر اتفاق کرے لیکن اس اتفاق پر معصوم
کی تائید کی کوئی دلیل نہ ہو تو یہ اتفاق علماء، اجماع نہ ہوگا اور نہ ہی اس سے حکم شرعی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس
بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ اجماع، امامیہ فقہ میں کوئی مستقل دلیل کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ سنت معصوم کے
کشف کرنے کا فقط ایک وسیلہ ہے اور حقیقتاً سنّت کا ایک جزو ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ عوام کا اتحاد و اتفاق کسی بھی صورت سے احکام شرعی کی تعیین میں مددگار ثابت
نہیں ہو سکتا کیونکہ عوام کی جہالت اور احکام شرعی کی تمام جہتوں اور بنیادوں سے ان کی لاعلمی کے علاوہ
اصولاً ان کی رائے مختلف اجتماعی عوامل اور روزمرہ زندگی کی ضرورتوں کے زیر اثر وجود میں آتی ہے لہٰذا
ممکن ہے کہ ان کے نظریوں کا اتفاق و اتحاد خصوصاً احکام شرعی میں انسانی سماج کے کسی خاص پہلو یا اس کے
آداب و رسوم و ثقافت سے مخصوص ہو۔ جبکہ شارع مقدس مندرجہ بالا عوامل و عناصر کی تاثیر سے قطع نظر
اس کے حقیقی مصالح و مفاسد کے پیش نظر قانون سازی اور تعیین شریعت کرتا ہے۔ یہ تشریع یا قانون سازی
ضروری استحکام و بقا کی حامل ہوتی ہے۔ گردش ایام اور زمان و مکان کی تبدیلی اس پر اثر انداز نہیں
ہو سکتی۔ ایسی حالت میں اگر عوام عقلائی حیثیت سے جبکہ ان کا شمار عقلا میں ہوتا ہو، کسی مسئلہ پر اتفاق
کرلیں تو یہ اتفاق حجیت کا پہلو تو رکھتا ہے لیکن اس کا سبب اجماع عوام نہیں بلکہ اس کی
باعث حجیت عقل و بناء عقلاء ہے۔

فقہ اہل سنّت میں حجیّت اجماع کی دلیلیں۔

اہل سنّت اجماع کی حجیّت کو ثابت کرنے کے لئے کتاب، سنّت اور عقل سے دلائل پیش کرتے
ہیں[1]

الف) کتاب خدا۔ اہل سنّت کے نزدیک قرآن مجید کی حسب ذیل آیتیں اجماع کے لئے دلیل قرار
دیتے ہیں:

۱۔ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الہدیٰ ویتبع

[1] الاصول العامہ للفقہ المقارن ص ۲۵۸

غیر سبیل المومنین نولّہ ما تولّی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا ۔[1]

یعنی: جو شخص راہ راست کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسولؐ سے سرکشی کرے اور مومنین کے طریقہ کے سوا کسی اور راہ کو اختیار کرے تو جدھر وہ پھر گیا ہے ہم بھی اسے ادھر ہی پھیر دیں گے اور آخر اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ تو (بہت ہی) برا ٹھکانا ہے۔

۲۔ فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول[2]

یعنی، پس اگر تم آپس میں کسی بات پر جھگڑنے لگو تو اس کے فیصلہ کے لئے اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔

حضرات اہل سنت مندرجہ بالا آیتوں کو سند قرار دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت سے مراد یہ ہے کہ جو راہ مومنین کی راہ نہ ہو اس کا اختیار کرنا خدا کی نظر میں مذموم اور رسول خدا کی مخالفت شمار ہوتا ہے اور دوسری آیت کو دلیل بناتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ صرف نزاعی معاملوں میں خدا و رسولؐ سے رجوع کرنا لازم ہے اور آیت کے مفہوم سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اتفاقی مسائل میں تو کوئی نزاع نہیں ہوتی اور نہ اس میں رجوع کرنا لازم و ضروری ہے بلکہ کسی مسئلہ میں مختلف رائے اور نظریوں کا اتفاق کرنا خود حجت ہے۔

۳۔ وہ آیتیں جو اسلامی امت کی تعظیم و تکریم پر دلالت کرتی ہیں اور اسے امت وسط[3] اور اعتدال پسند گروہ یا بہترین امت[4] قرار دیتی ہیں۔

شیخ طوسی کتاب "عدۃ الاصول" میں اہل سنت سے یوں نقل فرماتے ہیں:

"۔۔۔۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے اسلامی امت کو ایسی بہترین امت فرمایا ہے جو امر بمعروف اور نہی از منکر کے بہترین فرائض انجام دیتی ہے لہٰذا ان سے خطا سرزد نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرح وہ بہترین امت نہ ہوگی اور بجائے نیکی کی ہدایت کرنے اور برائی سے روکنے والی ہونے کے بدی کی ہدایت کرنے والی اور نیکی سے روکنے والی کہلائے گی

---

[1] سورہ نساء / ۱۱۶ [2] نساء / ۵۹

[3] بقرہ / ۱۴۳ (وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً)،

[4] آل عمران / ۱۱۰ (کنتم خیر امۃ)

لہٰذا آیت شریفہ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ اسلامی امت سے کوئی خطا ہی سرزد نہیں ہوتی۔[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام استدلالات مخدوش ہیں اور اہل سنت میں بھی غزالی جیسے بہت سے علماء نے مذکورہ آیت سے اس طرح کے استنتاج کو غلط قرار دیا ہے۔

غزالی پہلی آیت سے استدلال کی رد میں کہتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ (جو شخص بھی رسول خدا کی مخالفت کرے ان کو اذیت پہنچائے اور مومنین کی راہ کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کرے اور رسول خدا کی پیروی اور ان کے دشمن سے جنگ کرنے سے انکار کرے . . . ہم اسے دوزخ میں ڈال دیں گے یعنی قرآن مجید نے فقط مومنین کی پیروی سے انکار پر ہی دوزخ کا عذاب مترتب نہیں کیا ہے)[2] اس کے علاوہ قرآن میں مومنین کی راہ سے مراد وہی صراط مستقیم اور خدا کی راہ ہے جسے بنیادی طور پر اسلامی امت نے اختیار کیا ہے اس آیت اور اس کے جیسی دوسری آیتوں کے مدلولات کا فرعی وعملی مسائل میں مسلمانوں کے اتفاق اور اتحاد نظر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

دوسری آیت کے استدلال کے بارے میں بھی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا وہ استدلال کرتے ہیں، اس آیت کا یہ مفہوم ہی نہیں ہے اور امور مذہبی میں مسلمانوں کا اتفاق واتحاد اور عدم نزاع کتاب وسنت سے حاصل شدہ تعلیمات کی روشنی میں قابل قبول ہے نہ کہ کتاب وسنت سے الگ خود بخود مسلمان کسی مسئلہ پر متحد ہو جائیں اور یہ اتحاد واتفاق بھی مقبول قرار پا جائے۔

تیسری قسم کی آیتیں کسی بھی عنوان سے اسلامی امت کی عصمت پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ دوسری امتوں کے مقابلے میں اس امت کی برتری اور رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ امت کی برتری اور اس کے معتدل ہونے کا عصمت سے کوئی ربط نہیں ہے۔ اس لئے کہ خوبی یا برتری کا خطا سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ نیک وصالح افراد یا بہترین اور کامیاب سماج بھی خطا کرسکتا ہے۔ اگر وہ اسی خطا میں معاف ہو۔

---

[1] عدۃ الاصول، شیخ طوسی ص ۲۴۲ ‏ ‏ ‏ الاصول العامہ للفقہ المقارن ص ۲۶۰

[2] المستصفی، غزالی ج ۱ ص ۱۱۱ ‏ ‏ ‏ اصول الفقہ مظفر جلد دوم

ب) سنّت:۔ اہل سنت اجماع کی حجیت کو ثابت کرنے کے لئے مختلف مضامین کی حامل ایسی روایات سے تمسک کرتے ہیں جو امت کی عصمت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ روایات گوناگوں طریقوں سے مختلف اشخاص کے ذریعہ نقل ہوئی ہیں منجملہ ان کے عمر، ابن مسعود، ابی سعید خدری، انس بن مالک، ابن عمر، ابو ہریرہ حذیفہ ابن الیمان کے نام لئے جاتے ہیں۔

محقق کاظمی فرماتے ہیں کہ "ان روایتوں میں اہم ترین روایت یہ ہے "لا تجتمع امتی علی الخطاء" یعنی میری امت خطا اور غلطی پر اجتماع و اتفاق نہیں کرے گی۔ بہت سارے علماء عامہ نے اس روایت سے متعلق تواتر معنوی کا دعویٰ کیا ہے[1] اور امامیہ علماء میں سے علامہ حلّی نے "منتہیٰ" اور "الفین" نامی کتابوں میں اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ نیز کتاب "قواعد" اور کتاب "تذکرہ" میں اس کو پیغمبر اسلام کے خصائص میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کی امت خطا پر اتفاق و اتحاد نہیں کرے گی۔[2]

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ان روایات کے مضامین اور متون کے آپس میں ٹکراؤ اور اختلاف کی بنا پر اس کے معنوی تواتر سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ اس مضمون و مطلب کی روایت مسلّم و مقبول ہے تو امت کے اجماع کا مطلب امت کے تمام افراد کا اتفاق کرنا ہے اور بلا شبہ امت اسلامی کے تمام افراد نے ہر زمانہ اور ہر صدی میں صرف گنے چنے چند مسائل میں اجماع و اتفاق کیا ہے اور بس جنھیں فقہ کی اصطلاح میں ضروریات دین کہتے ہیں مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ جن کے سلسلہ میں اجماع کی ضرورت ہی در پیش نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایسی روایتوں کے ذریعہ ارباب حل و عقد یا اہل مدینہ یا وہ مشہور و معروف فقہا جن پر پوری امت یقیناً شامل نہیں ہے ان کے اجماع کی حجیت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ج۔ عقل ۔ اہل سنت اس موقع پر عقل سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ "جب بھی ارباب فکر و نظر کا ایک بڑا گروہ اپنی پوری کوشش اور تحقیق کے بعد کسی بات پر اتفاق و اتحاد کرتا ہے تو عقل کی نظر میں امر محال ہے کہ وہ گروہ خطا یا غلطی پر ہو گا۔[3]

---

[1] محمد غزالی نے کتاب المستصفیٰ میں

[2] کشف القناع من وجوہ حجیۃ الاجماع، شیخ اسد اللہ معروف بہ محقق کاظمی - الاصول العامہ للفقہ المقارن ص۲۶۳

[3] مصادر التشریع ص۱۰۶

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس طرح کے اتفاق و اتحاد نظر کا لازمہ سنّت معصوم کے حصول کا تعین ہو تو اس کی حجیت میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ ورنہ کسی اور صورت میں متفق الرائے علماء کی کثرت سے بھی خطا و غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔ جس طرح خبر متواتر کے لئے بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ اس میں راویوں کی کثرت اس روایت کے غیر معتبر و غلط ہونے کے احتمال کو کم کر دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود پورے یقین و قاطعیت کے ساتھ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ راویوں نے اپنے استنباط میں غلطی ہی نہ کی ہوگی۔ کیونکہ یہ بات سامنے آچکی ہے کہ ایک فرقہ کے علماء کا ایک گروہ برسوں بلکہ صدیوں سے خطا اور اشتباہ پر اتفاق و اتحاد نظر رکھتا آیا ہے[1]۔

اجماع قولِ معصوم کا کاشف کیسے ہوتا ہے؟

ہم عرض کر چکے ہیں کہ اجماع مسلک امامیہ کے نظریہ کے مطابق صرف اسی صورت میں حجت ہے جب وہ قول معصوم کو ظاہر کرے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ قطعیت اور یقین کیسے حاصل ہوتا ہے۔

محقق کاظمی نے اس سلسلہ میں گیارہ طریقے ذکر کئے ہیں جنمیں سب سے زیادہ معروف تین طریقے ہیں۔ شیخ مرتضیٰ انصاری نے اپنی کتاب فرائد الاصول میں ان طریقوں پر بحث و تبصرہ فرمایا ہے۔ ذیل میں ہم اسے اجمالی طور سے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ طریقۂ حسّی یا تضمّنی۔

اسے اجماع دخولی بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد امت کا ایسا اجماع و اتفاق ہے جس سے ہمیں اس بات پر علم و یقین اور اطمینان حاصل ہو جائے کہ اس گروہ میں معصوم بھی موجود ہیں[2]۔ یا اجماع حاصل کرنے والا شخص تمام علماء کے اقوال کا مطالعہ اور ان پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنے اقوال و آراء کو پیش نظر دیکھے جن کے قائلین سے وہ خود ناآشنا ہو لیکن اجمالی طور سے اسے یہ علم ہو جائے کہ ان اتفاق رائے کرنے والوں میں خود معصومؑ بھی موجود ہیں۔ اگرچہ وہ ان افراد میں معصوم کو شخصی طور سے نہ پہچانتا ہو پھر بھی فقط معصومؑ

---

[1] الاصول العامہ للفقہ المقارن ص ۲۶۴

[2] الفصول ج ۲ بحث اجماع۔

کے وجود کا علم اجماع کو حجیت قرار دیدے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ معصوم کی غیبت کے زمانہ میں متحقق نہیں ہو سکتا۔

(۲) طریقہ لطفی۔

یہ طریقہ قاعدہ لطف پر مبنی ہے جسے شیخ طوسیؒ نے مباحث کلام اور کتاب عدۃ الاصول میں اصول فقہ کی بحث میں بطور استدلال پیش کیا ہے۔ اس کا اجمالی بیان حسب ذیل ہے۔

چونکہ خداوند عالم انسان کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا لازم ہے کہ وہ اپنے بندوں پر لطف و کرم فرمائے اور خدا کی طرف سے اس کا ترک کرنا قبیح اور اس کی شان خالقیت کے خلاف ہے۔ جیسا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے اس کی طرف سے انبیاء و مرسلین کا بھیجا جانا بھی اس کے لطف کا نمونہ ہے۔ اس اصل و قاعدہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جب بھی امت میں کوئی اجماع خلاف حق ظہور میں آئے تو ایسے میں بندوں پر لطف خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ معصوم کے ذریعے سے اس کا سدِباب کرے اور ان کو بطور احسن راہ راست کی ہدایت فرمائے۔

لیکن اس قاعدۂ لطف کو اسلامی دانشوروں نے علم کلام کی بحثوں میں مخدوش قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ بندوں پر خداوند عالم کا لطف مسلم ہے لیکن اس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ امامؑ ہمیشہ امت کے درمیان موجود رہے کیونکہ امامؑ کی غیبت امت کی نااہلی اور خطاکاری کی بنا پر ہے اور جب بھی ظہور کے شرائط پورے ہوجائیں گے اور امت شائستہ اور دین داری سے قریب ہو جائے گی امامؑ حاضر و ظاہر ہو جائیں گے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی اپنی کتاب تجرید الاعتقاد[۱] میں فرماتے ہیں کہ "وجودہ لطف و تصرفہ لطف آخر و عدمہ منا" یعنی امام کا وجود ایک لطف خداوندی ہے اور ان کا تصرف و اختیار دوسرا عظیم لطف ہے لیکن انکی غیبت ہماری طرف سے ہے۔ یعنی ہمارے اعمال کی وجہ سے۔

۳۔ طریقہ حدسی۔

یہ طریقہ شاید گذشتہ دونوں طریقوں سے زیادہ عملی ہو کیونکہ اکثر متأخرین نے اسی طریقہ سے استفادہ کیا ہے۔ مرحوم محقق قمی نے اپنی کتاب قوانین الاصول میں اس کی تکمیل فرمائی ہے جس کا اجمالی بیان یہ ہے:

جب بھی ہم ایسے مسئلہ سے دوچار ہوں، جس پر امامیہ فقہا پوری تاریخ فقہ میں اتحاد و اتفاق

---

[۱] کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد ص ۲۸۵ چاپ قم۔

نظر رکھتے ہوں۔ جبکہ ایسا اتفاق کم ہی واقع ہوتا ہے کیونکہ فقہا زیادہ تر اختلاف نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے اتفاقات ونظریاتی اتحاد میں اس حقیقت سے آشنا کرتے ہیں کہ اجماع بغیر سند کے ظہور میں نہیں آیا اور حتمی طور سے امام معصومؑ کے نظریہ سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی مدرسہ کے تمام طلبہ کسی مسئلہ میں اتحاد نظر رکھتے ہوں تو اس سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے استاد کا نظریہ بھی یہی ہے اور اس مورد اتفاق مسئلہ نے استاد ہی کے ذریعہ سے نشوونما پائی ہے[1] ایسی قطعیت حاصل کرنے کے لئے یہ روش اسی وقت مفید ثابت ہوگی جب تمام علماء پوری تاریخ میں یعنی معصومین کے زمانہ سے لیکر عصر حاضر تک کسی مسئلہ پر متفق ہوں۔ دوسری صورت میں مثلاً اگر ساتویں صدی یا اس کے بعد کے علماء کسی مسئلہ پر متحد و متفق ہوجائیں لیکن اس صدی کے پہلے کے نظریات اس اتحاد و اتفاق کے خلاف ہوں تو اس مسئلہ میں ایسا اتحاد نظر قابل اعتبار نہ ہوگا۔

اجماع کی قسمیں:-

اجماع کی حسب ذیل قسمیں ہیں:

۱- اجماع محصّل

اس سے مراد ایسا اجماع ہے جس میں فقیہ خود علماء و فقہا کے اقوال کی چھان بین کرتے ہوئے مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ معصومؑ کے قول کو حاصل کرے۔

۲- اجماع منقول

ایسا اجماع جسے حاصل کرنے والا اس اجماع کو دوسروں تک منتقل کرے۔ اس اجماع کی حجیت کے سلسلہ میں ہم بعد میں بحث کریں گے۔

۳- اجماع سکوتی

اس اجماع سے مراد یہ ہے کہ کوئی فتویٰ کسی ایک فقیہ یا فقہا کے ذریعہ صادر ہو اور رفتہ رفتہ اس زمانہ کے تمام فقہا کے درمیان منتشر ہوجائے اور ایک مدت گذرنے کے بعد بھی کوئی فقیہ اس فتویٰ کی مخالفت نہ کرے۔

فقہائے امامیہ کے نزدیک اس طرح کا اجماع کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ کسی خاموش شخص

[1] قوانین الاصول ج ۱ بحث اجماع۔

سے کوئی نظریہ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ بعض علماء اہل سنت نے اس کی تائید اور بعض نے اس کی تردید کی ہے کشف الاسرار میں تحریر ہے کہ: "اجماع سکوتی اکثر علماء کے نزدیک قطعی ہے۔"[1] لیکن غزالی فرماتے ہیں کہ: "قابل اختیار و محدود و اعتبار نظریہ یہ ہے کہ اجماع سکوتی نہ تو اجماع ہی ہے نہ حجت و دلیل۔"[2]

۴۔ اجماع مرکب۔

اس اجماع سے مراد یہ ہے کہ مثلاً فقہا کا ایک گروہ کسی عمل کی حرمت کا نظریہ پیش کرے اور بقیہ تمام فقہا اس کی کراہت کا فتویٰ صادر کریں۔ ایسے دو نظریوں کو باہم جمع کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ عمل واجب یا مستحب نہیں ہے۔ اس قسم کا اجماع امامیہ فقہ کی کتابوں میں اکثر و بیشتر مستند قرار پایا ہے اور اس سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔

۵۔ اجماع مستند

علمائے امامیہ چونکہ اجماع کو فقط سنت معصوم کے لئے کاشف کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اور اسے فقہ کے مستقل مصدر و منبع کی حیثیت سے شمار نہیں کرتے لہٰذا جب وہ دیکھتے ہیں کہ اجماع کے سلسلہ میں کوئی لفظی دلیل موجود ہے۔ یعنی چاہے احتمالاً ہی سہی اگر اجماع دلائل لفظی پر تکیہ کئے ہوئے ہے تو اسے رد کر دیتے ہیں اور حجت قرار نہیں دیتے۔ ایسے اجماع اصطلاحاً اجماع مستند کے نام سے معروف ہیں اور کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اس کی دلیل واضح و روشن ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں شیعی نقطہ نظر سے علماء کا خود بخود اتفاق و اتحاد کرنا اجماع نہیں کہلاتا جب تک کہ وہ کاشف سنت معصوم نہ ہو یعنی قول معصوم کی تائید نہ کرتا ہو لیکن اس نکتہ پر توجہ کرنی چاہیئے کہ جب بھی کوئی نظریہ دلائل لفظی کے ذریعہ تقویت حاصل کرے اور اس نظریہ پر علماء کا اتفاق و اتحاد بھی ہو اگرچہ یہ اتفاق سنت معصوم کا کاشف نہ ہو۔ تو ایسا اتفاق، اجماع تو نہ ہوگا اور نہ دوسر زمانہ کے علماء کے لئے اس کا اتباع و پیروی ہی لازمی ہو گی لیکن چونکہ اس نظریہ کی سند اور مصدر مستحکم اور قابل استدلال ہے لہٰذا وہ نظریہ بذات خود دوسرے مجتہدین کے فتویٰ کا موضوع بن سکتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر بعض علماء استدلال کی بنیاد پر اس نظریہ کی موافقت نہ کرتے ہوں اور اس کی سند کی کمزوری

---

[1] کشف الاسرار ج ۳ ص ۲۲۸

[2] المستصفیٰ مبحث اجماع۔

کی وجہ سے اسے مردود قرار دیں یا کسی دوسرے طریقہ سے اس کی شرح و توجیہ کریں تو یہ اتفاق و اتحاد نظر ان کے لئے کسی سند و دلیل کا حامل نہ ہو اور علماء اس بات کے حقدار ہوں گے کہ اپنے نظریہ کے تحت فتویٰ صادر فرمائیں۔

اجماع منقول کی حجیّت :-

اگر اجماع، متواتر طریقہ سے منتقل ہو تو بلاتردید وہ اجماع محصل کہلائے گا۔ کیونکہ تواتر خود قطع و یقین کا موجب و سبب ہے۔ گویا اجماع کو خود حاصل کیا گیا ہو۔ لیکن اگر اجماع خبر واحد کے ذریعہ سے حاصل ہو تو اس کی حجیت و اعتبار کے سلسلہ میں اصول فقہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

فقہا کا وہ گروہ جو خبر واحد کو حجت تسلیم نہیں کرتا ان کے نزدیک خبر واحد کے ذریعہ حاصل شدہ اجماع بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن جو لوگ خبر واحد کی حجیت کے قائل ہیں۔ خبر واحد کے ذریعہ حاصل ہونے والے اجماع منقول کے سلسلہ میں ان میں بھی دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اس طرح کا اجماع حجت ہے کیونکہ یہ اجماع معصوم کی رائے سے ہم آہنگ ہوتا ہے چاہے راوی حسی طور سے خود معصوم سے ان کا قول سنے یا نامعلوم افراد میں سے قول معصوم کا استنباط کرے۔ بہرحال قول معصوم کے ثبوت و وجود کی بنا پر ایسا اجماع حجت ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ خبر واحد کی حجیت صرف حسی طور سے یعنی خود راوی کے قول معصوم کے نقل کرنے کی بنا پر ہے اور استنباط کے ذریعہ راوی کو حاصل ہونے والے قول معصوم پر نہ بانی اور حسی ذرائع سے راوی تک پہنچنے والے قول معصوم کا قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

جناب ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی
ترجمہ: جناب خادم حسین

بنیادی حقوق کے مصادر

بنیادی حقوق کے ماہرین و محققین کچھ مآخذ و مصادر بنیادی حقوق کے لئے معین کرتے ہیں بعض مآخذ عمومیت رکھتے ہیں، یعنی اکثر و بیشتر ملکوں کا دار و مدار ان ہی مصادر پر ہوتا ہے اور بعض کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ کے بنیادی حقوق بعض مآخذ میں مشترک ہیں، لیکن اس کے بعض مصادر مخصوص ہیں جو انتہائی معتبر و باوزن ہیں، جیسے قرآن مجید، جو ہمارے بنیادی حقوق کے مستحکم ترین و معتبر ترین مآخذ میں شمار ہوتا ہے، اس لئے کہ ہمارا دستور اساسی الٰہی پہلو کا حامل ہے اور اصولی طور پر اس نے اپنی مشروعیت پیروی قرآن کے نتیجہ میں حاصل کی ہے۔

ماہرین قانون جن مصادر کا تذکرہ کرتے اور ہر ملک کے بنیادی حقوق کو اس کی بنیادوں پر استوار مانتے ہیں، وہ یہ ہیں: دستور اساسی، عام قوانین، آداب و رسوم، عدالتوں کے رویئے، صدر مملکت کے فرمان، ماہرین قانون کے نظریات اور قوۂ مقننہ کے داخلی قوانین و مقررات۔ ہمارے بنیادی حقوق مذکورہ مآخذ کے علاوہ خاص طور سے قرآن و سنت کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ لہٰذا دوسرے مصادر پر روشنی ڈالنے سے پہلے ان دو مصادر کے بارے میں وضاحت نہایت ضروری ہے۔

خاص مصادر

۱۔ قرآن بنیادی حقوق کا سب سے پہلا اور بنیادی مصدر۔ اسلامی جمہوریہ، یعنی وہ جمہوریہ جس کے

اصول و احکام و بنیاد و مقاصد مکمل طور اسلامی ہیں۔ قرآن زندہ و جاوید رہنما ہے، سارے اسلامی علوم کا سرچشمہ ہے۔ وہ قرآن جو وحی کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوا اور جسے انسانوں کے لئے چراغ ہدایت کے نام سے جانا جاتا ہے، درحقیقت گذشتہ چودہ صدیوں سے امت مسلمہ کا دستور اساسی رہا ہے۔ تمام فرقے اختلاف آراء و عقائد کے باوجود اصالت قرآن اور اس کے احکام کی قطعیت پر اتفاق رائے ظاہر کرتے ہیں۔ (اگرچہ غفلت کی بنا پر عمل نہیں کرتے!)

اصولی طور پر اسلامی معاشرے میں قرآن کے ہوتے ہوئے کیا کوئی دوسرا دستور اساسی ہو سکتا ہے؟ بہمن ۱۳۵۷ھ (فروری ۱۹۷۹ء) میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد یہ سوال اٹھا۔ کیا دستور اساسی کے بجائے محض قرآن سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا؟ اگر حکومت اور اس سے وابستہ سرکاری ادارے قائم ہوں گے تو ہمیں قانون کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسا قانون جو دستور اساسی کے عنوان سے پہچانا جاتا ہو کیا قرآن کی برابری کر سکتا ہے؟ کیا اسلامی معاشرے میں اصولاً قانون سازی ممکن ہے؟

دستور اساسی، اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے اور دستور اساسی کی تدوین کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے مقابلے میں ایک دوسری قوت تسلیم کی جائے۔ قرآن انسانیت کے زندہ و پائیدار احکام کا ضامن ہے۔ قرآن ہر دور و زمانے کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ قرآنی احکام الطاف ایزدی اور وحی کے سہارے پیغمبرؐ اسلام پر نازل ہوئے اور ان ہی عبارتوں کے ساتھ آج بھی ہو بہو باقی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ کا دستور اساسی قرآن پر مبنی ہے اور اگرچہ ملکی مسائل اور ضرورتوں کے پیش نظر اصولوں کو روزمرہ و عام فہم زبان کے ڈھانچے میں ڈھال لیا گیا ہے لیکن ان اصولوں کے اسلامی بنیادوں پر استوار ہونے کے نتیجہ میں ان کا کوئی بھی جزء قرآن کے منافی نہیں ہو سکتا۔ دستور اساسی کی اکثر و بیشتر دفعات کا تعلق براہ راست قرآنی آیتوں سے ہے نمونہ کے طور پر بعض آیتوں کی طرف اشارہ کریں گے اور موقع و محل کی مناسبت سے تفصیلی بحث بھی پیش کرتے رہیں گے۔

دستور اساسی کا مقدمہ نہایت مناسب آیت (جو بنیادی حقوق کی غرض و غایت و سمت کو معین کرتی ہے)

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط

اسی مقدمہ میں جہاں اسلامی حکومت کے طریقہ کار، حکمت عملی اور ایک عالمی امت مسلمہ کی تشکیل

کا تذکرہ ہوا ہے وہاں آیہ کریمہ "ان ھٰذہٖ امتکم امۃ واحدۃ و انا ربکم فاعبدون" کو اس فکر کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ ظلم و استبداد سے چھٹکارا پانے اور لوگوں کے مقدرات کو خود ان ہی کے حوالے کرنے کے سلسلے میں آیہ کریمہ "ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم" کا سہارا لیا گیا ہے۔ جہاں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ملک کے سیاسی اداروں کو مدبر و صالح افراد کی زیر نگرانی ہونا چاہئے وہاں آیہ کریمہ "ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" پر توجہ دی گئی ہے۔ "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" کو انسانی ارتقاء کا ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ مستضعفین کی حکومت تشکیل پانے کے سلسلے میں آیہ کریمہ "ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین" کو سند قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں راہنمائی کی گئی ہے۔ جہاں ملکی دفاع کو مستحکم بنانے کی بات ہوئی ہے وہاں آیہ کریمہ "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللّٰہ وعدوکم و آخرین من دونھم" کا سہارا لیا گیا ہے۔ جہاں عدالتوں میں عدل و انصاف کی رعایت کے سلسلے میں بیان ہوا ہے وہاں ارشاد باری تعالیٰ "واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل" سے مدد لی گئی ہے۔ جہاں اسلامی معاشرے کو اسوہ و نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہاں آیہ مبارکہ "وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس" کو بطور شاہد پیش کیا گیا ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں بیان کیا ہے تو آیہ شریفہ "والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر" کو بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ غیر مسلم افراد کے حقوق کی رعایت کے سلسلے میں آیہ مبارکہ "لا ینھاکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم عن دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین" کو معیار و ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ دستور اساسی میں قومی، نسلی، زبانی اور رنگی امتیازات و برتری کو منسوخ قرار دیا گیا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ "یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم" کو معیار و ماخذ مانا گیا ہے۔ بیوی اور خاندان سے تعلقات کو سورۂ روم کی ۲۱ ویں سورۂ نحل کی ۹۷ ویں اور سورۂ بقرہ کی ۲۲۸ ویں آیتوں کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ "ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ" "من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم

اجرھم باحسن ما کانوا یعملون" اور "ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ۔"

سورۂ نساء کی ۵۹ ویں آیت "یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللّٰہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللّٰہ والیوم الآخر" اور سورہ مائدہ کی ۴۴ ویں، ۵۰، ۴۵ ویں اور ۴۶ ویں آیتیں "ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الکافرون۔ ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الظالمون۔ ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الفاسقون" اور سورۂ انعام کی ۵۷ ویں آیت ان الحکم الا للّٰہ اور سورہ بقرہ کی ۲۲۹ ویں آیت "ومن یتعد حدود اللّٰہ فاولئک ھم الظالمون" جملہ مذکورہ آیتیں دستور اساسی اور بنیادی حقوق کا بہترین ماخذ محسوب ہوتی ہیں اور دستور اساسی کی دفعہ نمبر ۴، ۷۲، ۹۱، ۱۰۵ اور ۱۷۰ ان آیتوں کی بنیاد پر مرتب ہوئی ہیں۔

دستور اساسی کے اقتصادی قوانین میں سورۂ نساء کی ۵ ویں اور ۲۹ ویں آیت "لاتؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللّٰہ لکم قیاما۔ یاایھا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم" سورہ بقرہ کی ۲۹ ویں آیت "ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعاً" سورۂ بقرہ کی ۱۶۸ ویں آیت یاایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیبا" سورۂ انفال کی پہلی آیت "یسئلونک عن الانفال قل الانفال للّٰہ والرسول" اور سورۂ اعراف کی ۱۲۸ ویں آیت "ان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ کو بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

زراندوزی و انجماد سرمایہ کی ممانعت کے سلسلے میں درج ذیل آیتوں کو بطور سند پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ علق کی چھٹی و ساتویں آیت "ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ" سورۂ حشر کی ساتویں آیت "ما افاء اللّٰہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللّٰہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" اور سورۂ توبہ کی ۳۴ ویں آیت "والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولاینفقونھا فی سبیل اللّٰہ فبشرھم بعذاب الیم"۔

سود کی ممانعت (دستور اساسی کی دفعہ نمبر ۴۳) میں سورۂ بقرہ کی ۲۷۵ ویں، ۲۷۸ ویں اور ۲۷۹ ویں آیت پر توجہ مبذول کی گئی ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: "الذین یاکلون الربا لایقومون

الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطان من المس ذالک بانهم قالوا انما البیع مثل الربا و احل الله البیع وحرم الربا" "یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله و ذروا مابقی من الربا ان کنتم مؤمنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله وان تبتم فلکم رئوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون ۔"

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے دستور اساسی نے اسراف و تبذیر کی بھی ممانعت کی ہے اور اس کا ماخذ سورۂ اعراف کی ۳۱ ویں آیت اور سورۂ اسراء کی ۲۶ ویں اور ۲۷ ویں آیتیں قرار پائی ہیں، جن میں ارشاد ہوتا ہے ۔" کلوا واشربوا ولا تسرفوا انه لا یحب المسرفین" "ولا تبذر تبذیرا ۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین ۔"

دستور اساسی میں شوریٰ کی منظوری سورۂ آل عمران کی ۱۵۹ ویں اور سورۂ شوریٰ کی ۳۸ ویں آیت کی بنا پر ہوئی ہے : "وشاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی الله" اور "وامرهم شوریٰ بینهم"

قیادت و رہبری کی خصوصیات سورۂ یونس کی ۳۵ ویں اور سورۂ بقرہ کی ۲۴۶ ویں آیت کی بنیاد پر معین ہوئی ہیں : افمن یهدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یهدی الا ان یهدی فما لکم کیف تحکمون" اور " ان الله اصطفیه علیکم وزاده بسطة فی العلم والجسم"

آج کے ہمارے دستور اساسی نے اغیار کے اثر و رسوخ کا سدباب کیا ہے اور اس سلسلے میں سورۂ نساء کی ۱۴۱ ویں آیت کو معیار قرار دیا ہے ۔" ولن یجعل الله للکافرین علی المؤمنین سبیلا "

۲۔ سنت

فقہی ماخذ (کتاب ، سنت ، اجماع ، عقل) اگرچہ دستور اساسی کے ماخذ میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کا اصلی ماخذ قرآن ہے ۔ پیغمبر اسلامؐ اپنے علم الٰہی کے سہارے اسلامی قوانین کی وضاحت لوگوں کے لئے پیش کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کوئی بات خدا کے حکم کے ماسوا منہ سے نکلنے نہ پائے خدا کے حکم کے مطابق پیغمبرؐ کے حکم کی تعمیل لازمی ہے ۔ پیغمبرؐ کے برحق جانشینوں کو بھی اسلامی احکام و قوانین کی توضیح و تفسیر پیش کرنے کا حق حاصل ہے اور ان کے اقوال بھی کشف احکام الٰہی میں سند کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبرؐ وائمہ علیہم السلام کے تمام اعمال واقوال جو سنت کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں اسلامی جمہوریہ کے دستور اساسی کے بنیادی ماخذ میں شمار ہوتے ہیں اور دستور اساسی کی اکثر وبیشتر دفعات سنت ہی کی بنیادوں پر استوار ہیں۔

پیغمبرؐ وائمہ طاہرین علیہم السلام کی احادیث وروایات اور خاص طور پر نہج البلاغہ کو اسلامی جمہوریہ کے دستور اساسی میں خاص درجہ ومقام حاصل ہے۔ بعنوان مثال فوج کے سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول ملتا ہے کہ۔

"فالجنود باذن اللّٰہ حصون الرعیۃ وزین الولاۃ وعز الدین وسبل الامن ولیس تقوم الرعیۃ الا بہم" (نہج البلاغہ)

حکومت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"ان عملک لیس لک بطعمۃ ولکنہ امانۃ" (نہج البلاغہ)

"الذلیل عندی عزیز حتیٰ آخذ الحق لہ والقوی عندی ضعیف حتی آخذ الحق منہ" (نہج البلاغہ)

انسانی حقوق کے بارے میں ہے:

"واشعر قلبک الرحمۃ للرعیۃ والمحبۃ لھم واللطف بھم ولا تکونن علیھم سبعاً ضاریاً تغتنم اکلھم فانھم صنفان اما اخ لک فی الدین واما نظیر لک فی الخلق یفرط منھم الزلل وتعرض لھم العلل" (نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳)

بے جا امتیازات سے پرہیز اور مساوات کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کا یہ قول ہے:

"ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد، الا لا فضل لعربی علی اعجمی ولا اعجمی علی عربی ولا اسود علی احمر ولا احمر علی اسود الا بالتقوی"

(حدیث نبوی)

آزادی سے متعلق دفعہ میں حضرت علی علیہ السلام کے اس قول سے استفادہ کیا گیا ہے:

"لا تکن عبد غیرک وقد جعلک اللّٰہ حراً۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۱)

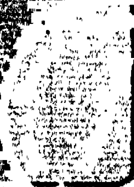
رہبری و قیادت کی خصوصیات کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :-
ان اللہ فرض علیٰ ائمۃ العدل ان یقدروا انفسھم بضعفۃ الناس۔ (نہج البلاغہ)
یا امام حسین علیہ السلام کا یہ قول :
"مجاری الامور بید العلماء باللہ الامناء علیٰ حلالہ وحرامہ" [۱]
ہم ان تمام احادیث و روایات کی توضیح و تشریح کرنے کا فی الحال ارادہ ترک کرتے ہیں جن کا تعلق دستور اساسی سے ہے انشاء اللہ آیندہ فصلوں میں ان مآخذ کا تذکرہ کریں گے۔

---

[۱] تحف العقول میں امام حسین بن علی علیہ السلام سے منقول روایات کے باب میں حضرت کا مشہور و معروف خطبہ درج ہے، جسے امام علیہ السلام نے حکومت معاویہ کے آخری دور میں بیان کیا تھا :
وانتم اعظم الناس مصیبۃ لما غلبتم علیہ من منازل العلماء لو کنتم تشعرون ذلک بان مجاری الامور والاحکام علیٰ ایدی العلماء باللہ الامناء علیٰ حلالہ وحرامہ فانتم المسلوبون تلک المنزلۃ وما سلبتم ذلک الا بتفرقکم عن الحق واختلافکم فی السنۃ بعد البینۃ الواضحۃ۔ ولو صبرتم علی الاذیٰ وتحملتم المؤونۃ فی ذات اللہ کانت امور اللہ علیکم ترد وعنکم تصدر والیکم ترجع ولکنکم مکنتم الظلمۃ من منزلتکم واسلمتم امور اللہ فی ایدیھم، یعملون بالشبھات ویسیرون فی الشھوات سلطھم علیٰ ذالک فرارکم من الموت واعجابکم بالحیوۃ التی ھی مفارقتکم۔"
تمہاری مصیبت تمام لوگوں کی مصیبت سے زیادہ عظیم ہے اس لئے کہ علماء کا رتبہ و مقام تم سے لیا گیا ہے، تمام احکام و امور کو علماء دینی دانشوروں کے ہاتھوں میں ہونا چاہئیے جو خدا کے حلال و حرام کے محافظ ہیں، لیکن تم سے یہ مقام و مرتبہ لے لیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم حق سے دور ہو چکے ہو، سنّت رسول خدا میں تم نے اختلاف کیا جبکہ تمہارے سامنے واضح

← دلائل موجود تھے۔ اگر تم نے اذیتوں کو برداشت کیا ہوتا اور خدا کی راہ میں مصائب و مشکلات پر صبر کیا ہوتا تو الٰہی امور تم پر آشکار ہوتے اور تمہارے ہی ہاتھوں ان کا صدور ہوتا اور تم تمام امور و مسائل کے عقدہ کشا قرار پاتے لیکن تم نے ظالموں کو موقعہ دیا کہ وہ تم سے یہ مقام و مرتبہ لے لیں، اس طرح تم نے الٰہی امور کو ان کے حوالے کر دیا تاکہ وہ حدس و گمان کے سہارے عمل کریں اور جیسے چاہیں من مانی کریں۔ جو چیز ان کے حکومت پر قابض ہونے کی باعث ہوئی وہ وہ موت سے تمہارا فرار اور دنیاوی زندگی کی خواہش تھی جو ایک دن تم سے جدا ہو جائے گی۔

توحید



شذرات

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمۃ

بدل اشتراک



توحید

اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد ۴، شمارہ ۴،

ترتیب

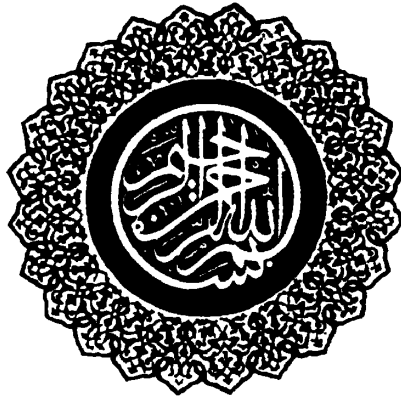
مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

فون: ۲۴۵۸۴



...قعدہ — ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ / جولائی - اگست ۱۹۸۷ء



نوٹ :-

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذره

حج کے اسرار و رموز

حج اسلام کا ایک اہم جزو اور دین کا ایک محکم رکن ہے۔ یہ اسلام کی وہ عبادت ہے جس میں نہ صرف انسانی حیات کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلو روشن نظر آتے ہیں، بلکہ اس قدر جامع ہے حسین آئینہ کی طرح اسلامی چہرہ کے تمام نقوش اجاگر ہیں۔ حج شوکتِ اسلام کی نمود ہے، حج کلمہ لا الٰہ کی جلالت کا اعلان ہے اور حج کثرت میں وحدت کا مرقع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حج جیسے ہمہ گیر اور جامع موضوع پر صدیوں سے بہت کچھ لکھا اور پڑھا جاتا رہا اور اسلامی وغیر اسلامی مفکر و قلمکار اس کی اہمیت و جامعیت سے متعلق اپنے نظریاتی زاویے پیش کرتے رہے۔ لیکن اصل میں حج کی روح کیا ہے؟ حج کو درحقیقت کس طرح بجالانا چاہئے؟ اعمال حج کی بجا آوری میں انسان کا قصد و آہنگ کیا ہونا چاہئے؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب مکتب اہل بیتؑ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام نے حج کی ضرورت و اہمیت اور اعمال حج کے اسرار و رموز کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے معارف و عرفان کے جو بیش بہا موتی رولے ہیں ان کی چمک دمک آپ اپنی مثال ہے اور حق بھی یہی ہے کہ بارگاہ بے نیاز کے یہ خدا شناس بندے ہی اس کی بندگی کے حقیقی رموز سے آگاہ اور ان کا اظہار کرنے والے ہیں۔ ذیل میں ہم حج سے متعلق امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ایک طویل حدیث ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ ان ارشادات کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ خدا ہم سب کو ان تعلیمات پر عمل کی توفیق کرامت فرمائے۔

امام زین العابدینؑ حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ کی جانب واپس ہوئے تو آپ کے ایک صحابی شبلی آپ کے استقبال کو پہنچے۔ امامؑ نے دوران گفتگو ان سے دریافت فرمایا: شبلی کیا تم نے حج ادا کر لیا؟ صحابی نے جواب دیا: ہاں، یا ابن رسول اللہ انجام دے چکا۔ تو آپ نے ان سے مزید دریافت فرمایا: کیا تم میقات پر پہنچ کر سلے ہوئے کپڑوں کو اپنے جسم سے علاحدہ کر کے غسل کیا؟ عرض کی، ہاں فرزند رسولؐ۔

فرمایا: سلے ہوئے کپڑے جسم سے علاحدہ کرتے وقت کیا تم نے یہ نیت کی تھی کہ گناہ کا لباس جسم سے اتار رہے ہو اور اطاعت پروردگار کا لباس زیب تن کر رہے ہو؟ — نہیں — فرمایا: سلے ہوئے لباس اتارتے وقت کیا تمہارے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اس لباس کے ہمراہ تم ریا، نفاق اور شکوک و شبہات والے گناہوں کو اپنے آپ سے دور کر رہے ہو؟ — نہیں — فرمایا: کیا غسل کرتے وقت تم نے اپنے دل میں یہ قصد کر رکھا تھا کہ خود کو گناہوں اور خطاؤں سے پاک کر رہے ہو؟ — نہیں — فرمایا: اگر ایسا ہے تو گویا نہ تم میقات کی منزل پر پہنچے، نہ سلا ہوا لباس جسم سے اتارا اور نہ تم غسل ہی کیا ہے۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: پھر کیا تم نے خود کو پاک صاف کر کے احرام کا لباس پہنا اور حج کے لئے آمادہ ہوئے؟ عرض کی: ہاں، یا مولا! فرمایا: تو کیا خود کو پاک صاف کرتے وقت یہ نیت کی تھی کہ اپنے جسم کی تنظیف کے ساتھ ساتھ خدا کی بارگاہ میں سچے دل سے توبہ کر کے اپنی روح اور جان کو بھی گناہوں کی کثافت سے پاک و پاکیزہ بنانا چاہتے ہو؟ — نہیں — فرمایا: کیا احرام پہنتے وقت یہ مفہوم تمہارے پیش نظر تھا کہ جن چیزوں کو خدا نے تم پر حرام قرار دیا ہے اب انھیں اپنی ذات پر حرام کر لو اور ان کے قریب بھی مت جاؤ؟ — نہیں — فرمایا: پھر کیا جب تم نے حج کا پیمان باندھا تو یہ خیال بھی تمہارے دل میں تھا کہ اب اللہ سے پیمان باندھنے کے بعد اللہ کے سوا ہر اس شئے سے کئے ہوئے عہد و پیمان توڑ لو گے جو خدا کی رضا کے خلاف ہے؟ — نہیں — فرمایا: اگر تمہارے دل میں یہ ارادے نہیں تھے تو درحقیقت نہ تم نے تنظیف کی، نہ احرام باندھا اور نہ حج کا قصد و پیمان ہی کیا۔

پھر امامؑ نے فرمایا: کیا تم نے میقات میں داخل ہونے کے بعد احرام کے لئے دو رکعت نماز ادا کی اور کیا اس کے بعد لبیک کہی؟ — عرض کی: ہاں، اے فرزند رسولؐ۔ فرمایا: میقات میں داخل ہوتے وقت کیا تم نے اپنے دل میں زیارت بیت اللہ کا قصد بھی کیا تھا؟ — نہیں — فرمایا: احرام کے لئے دو رکعت نماز پڑھتے وقت آیا تم یہ نیت رکھتے تھے کہ یہ نماز جو بندوں کے لئے بہترین عمل اور بزرگ ترین حسنات میں شمار ہوتی ہے، اس کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہو؟ — نہیں — فرمایا: کیا لبیک کہتے وقت تمہارا قصد یہ تھا کہ ہر حال میں اس کی اطاعت اور گناہوں و معصیتوں سے پرہیز کا عہد کرنے کے بعد خدا سے ہم کلام ہو رہے ہو؟ — نہیں — فرمایا: ایسی صورت میں نہ تم میقات میں داخل ہوئے، نہ حقیقتاً نماز ادا کی اور نہ صحیح معنی میں لبیک کہی۔

اس کے بعد امام نے فرمایا: جب تم حرم میں داخل ہوئے تو کیا کعبہ کا دیدار کر کے نماز ادا کی؟ — عرض کی:

ہاں یابن رسول اللہؑ۔ فرمایا، تو کیا جب تم حرم میں داخل ہوئے تھے، اپنے دل میں یہ بھی طے کیا تھا کہ آج کے بعد سے مسلمانوں کی غیبت (جواب تک کیا کرتے تھے) اپنے نفس پر حرام جانوگے اور اس امن کی جگہ پر ملت اسلام کو اپنی فکر و زبان کے شر سے محفوظ رکھوگے؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ فرمایا: مکہ میں داخل ہونے کے بعد کیا تم نے یہ قصد بھی کیا تھا کہ اس سفر میں فقط خدا کا تصور اور اس کی اطاعت کا سودا رکھتے ہو؟ (فانت لاغیرک مرادی ولک لا سواک سعری و سهادی) یعنی اے میرے معبود اس سفر میں تو ہی میرا مطلوب و مقصود ہے اور تیرے سوا میرے دل میں کسی اور کی آرزو نہیں۔ میرے شب و روز صرف تیرے ہیں؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ فرمایا؛ پھر نہ در اصل تم حرم میں داخل ہوئے نہ کعبہ کا دیدار کیا اور نہ نماز ادا کی۔

اس کے بعد آپؑ نے دریافت فرمایا: آیا تم نے طواف خانۂ کعبہ، اس کے ارکان کے مس کرنے اور سعی کا فریضہ انجام دیا؟ عرض کی: ہاں اے فرزند رسولؐ۔ فرمایا: جب تم سعی کر رہے تھے تو کیا صمیم قلب سے یہ نیت بھی رکھتے تھے کہ در حقیقت اس سعی کے ذریعہ شیطان کے شر سے فرار کرتے ہوئے خدا کی پناہ میں آرہے ہو، کیا تمہارا غیب داں خدا بھی تمہارے اس عمل کو باور کر رہا ہے؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ فرمایا: تب گویا نہ تم نے طواف کیا نہ کعبہ کے ارکان مس کئے، اور نہ صحیح معنی میں سعی ہی بجا لائے۔

پھر امامؑ نے فرمایا: پھر کیا تم نے حجر اسود کا مصافحہ کیا اور مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی؟ عرض کی: ہاں اے مولاؑ۔ یہ سنکر امامؑ چیخ کر رو دئے اور آپ کی حالت اس قدر متغیر ہوگئی کہ معلوم ہوتا تھا آپ کی روح جسم سے مفارقت کر جائے گی۔ پھر آپؑ نے فرمایا آہ! آہ! جو شخص حجر اسود کا مصافحہ کرتا ہے گویا وہ خداوند عالم سے مصافحہ کا شرف حاصل کرتا ہے۔ پس اے مسکین (انسان) دیکھ اس اجر و جزا کو ضایع مت کر جس کی حرمت خداوند متعال کی بارگاہ میں بہت عظیم ہے۔ اور دیکھ گنہگاروں کی طرح خدا کے احکام کی مخالفت اور حرام امور میں ملوث ہو کر اس مصافحہ کی قدر و قیمت کو ہاتھ سے جانے نہ دے اور معبود کی بندگی سے سر پیچی نہ کر۔

پھر آپؑ نے دریافت فرمایا: مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر کیا تم نے ہر حال میں اطاعت پروردگار اور گناہوں سے دوری اختیار کرنے کی نیت بھی دل میں رکھی تھی؟ عرض کی؛ نہیں۔ فرمایا: مقام ابراہیم پر نماز ادا کرتے وقت کیا تمہارا قصد یہ بھی تھا کہ تم اپنے اس عمل کے ذریعہ شیطان کو پچھاڑ اس کی ناک

رگڑ رہے ہو۔؟ ــ نہیں ــ فرمایا: پھر گویا نہ تم نے حجر اسود کا مصافحہ کیا نہ مقام ابراہیم پر کھڑے ہوئے اور نہ وہاں نماز ہی ادا کی۔

پھر امام نے فرمایا: کیا تم نے چاہ زمزم پر جاکر اس کا پانی بھی پیا؟ ــ عرض کی: ہاں ــ فرمایا، چاہ زمزم (جو ایک خاتون کے اخلاص و توکل اور ایمان کا سرچشمہ ہے) پر پہنچ کر کیا اطاعت پروردگار کا اخلاص اور گناہوں سے کنارہ جوئی کا عزم بھی تمہارے دل میں پیدا ہوا تھا؟ (تاکہ یہ چشمہ تمہارے ظاہر و باطن دونوں کو پاک کردے) ــ نہیں ــ فرمایا: پھر گویا نہ تم چاہ زمزم پہ گئے اور نہ اس کے پانی سے سیراب ہوئے (کیونکہ امراض قلبی سے تمہاری روحی طہارت نہ ہو سکی)

اس کے بعد فرمایا: کیا تم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی انجام دی؟ ــ عرض کی: ہاں ــ فرمایا: کیا تم صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے یہ نیت بھی رکھتے تھے کہ اس وقت تم اپنے اعمال کی قبولیت کے سلسلے میں خوف و رجاء کے درمیان ہو؟ ــ نہیں ــ فرمایا: پھر تم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کا حقیقی فریضہ ہی انجام نہیں دیا، اور تمہاری یہ بھاگ دوڑ روح سے خالی تھی۔

فرمایا، کیا تم مکہ سے منیٰ کی جانب بھی گئے؟ ــ عرض کی: ہاں ــ فرمایا: منیٰ کی طرف جاتے ہوئے کیا تمہاری نیت یہ بھی تھی کہ آج کے بعد سے لوگ تمہاری زبان، قلب اور ہاتھ سے محفوظ و مصئون رہیں گے؟ ــ نہیں ــ فرمایا: پھر گویا تم منیٰ کی طرف ہی نہیں گئے۔

پھر امام نے فرمایا: کیا تم نے عرفات میں وقوف اختیار کیا، جبل الرحمہ کی بلندی پر پہنچے اور وادی نمرہ کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اپنے پروردگار کو رمی جمرات کے وقت یاد کیا؟ ــ عرض کی، ہاں فرمایا: کیا تم نے عرفہ میں وقوف کے دوران خدا کی صحیح معرفت حاصل کی اور اپنی استعداد کے مطابق الٰہی علوم و معارف سے بھی آگاہ ہوئے اور کیا تم نے اس کا احساس کیا کہ تمہارا پورا وجود خدا کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ وہ تمہارے سارے قلبی رازوں سے بھی واقف ہے؟ ــ نہیں ــ فرمایا، جبل الرحمۃ کی بلندی پر پہنچ کر کیا تمہارے دل میں یہ احساس بھی تھا کہ خداوند عالم تمام مومنین و مومنات پر رحمتیں نازل فرماتا ہے اور ہر کلمہ گو کی مدد و نصرت کرتا ہے؟ ــ نہیں ــ فرمایا: وادی نمرہ میں کھڑے ہو کر کیا یہ احساس بھی تمہارے اندر بیدار ہوا کہ جب تک تم خود اوامر و نواہی پر عمل نہ کروگے اور خدا کے احکام پر خود عمل پیرا نہ ہوگے تب تک

تمہارا عمل دوسروں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا ؟ —— نہیں — فرمایا : جب تم علم و نمرات کے نزدیک کھڑے ہوئے تو کیا تم نے یہ خیال بھی کیا کہ یہ سب تمہاری اطاعات و عبادات کے شاھد و گواہ ہیں اور پروردگار سمٰوات کے ذریعہ اس کے فرشتوں کے ہمراہ تیرے محافظ و نگہبان ہیں ؟ — نہیں — فرمایا : ایسی صورت میں نہ تم نے عرفات میں وقوف اختیار کیا ۔ نہ کوہ "رحمت" کی بلندی پر پہنچے ۔ نہ کوہ نمرہ کی معرفت حاصل کی نہ خدا کو اس کی صحیح معرفت کے ساتھ صدا دی اور نہ نمرات میں وقوف ہی کیا ۔

اس کے بعد امام نے دریافت فرمایا : کیا تم علمین (عرفات و مشعر الحرام) کے درمیان سے گزرے اور کیا اس کے پہلے دو رکعت نماز ادا کی ۔ مزدلفہ میں گھوم پھر کر کنکریاں چنیں اور مشعر الحرام سے بھی گزرے ؟ —— عرض کی : ہاں ۔ فرمایا : کیا یہ نماز پڑھتے وقت تمہارے دل میں یہ نیت بھی تھی کہ اسے تم دسویں شب خدا کی شکرگزاری اور اپنی مشکلات کے حل کے لئے ادا کر رہے ہو ؟ —— نہیں — فرمایا : علمین کے درمیان سے گزرتے وقت جب اپنے دائیں اور بائیں ہونے سے خود کو بچا رہے تھے تو کیا یہ نیت بھی تھی کہ اسی طرح ہمیشہ دین خدا پر ثابت رہو گے —— راہ خدا میں مستقیم رخ اختیار کرو گے اور اپنی زبان، قلب اور جملہ اعضاء و جوارح کو ہر طرح کے انحراف سے محفوظ رکھو گے ؟ —— نہیں —— فرمایا : مزدلفہ جاتے ہوئے اور سنگریزے چنتے ہوئے کیا تم نے یہ قصد بھی کیا تھا کہ یوں ہی ہر طرح کے جہل و گناہ کو اپنے دل کی زمین سے چن لو گے اور علم و عمل کو اس میں پروان چڑھاؤ گے ؟ —— نہیں —— فرمایا : مشعر الحرام کو عبور کرتے وقت کیا تمہارے دل میں خوف پروردگار پیدا ہوا تھا ؟ جیسا کہ صاحبان تقویٰ کا شیوا ہے کہ وہ ہر حال میں خوف خدا رکھتے ہیں ؟ —— نہیں —— فرمایا : پھر گویا نہ تم نے علمین کو عبور کیا ، نہ نماز ادا کی ، نہ زمین مزدلفہ سے گزرے نہ رمی جمرات کے لئے سنگریزے اکٹھا کئے اور نہ مشعر الحرام ہی گئے ۔

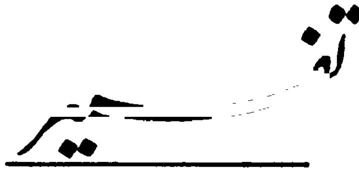
پھر امامؑ نے دریافت فرمایا : کیا تم نے منیٰ پہنچ کر رمی جمرات کا فریضہ انجام دیا ، بال ترشوائے ، قربانی کی اور مسجد خیف میں نماز ادا کی ، اس کے بعد مکہ واپس ہو کر طواف بھی بجالائے ؟ عرض کی : ہاں اے مولاؑ ۔ فرمایا : منیٰ پہنچ کر رمی جمرات کے بعد کیا تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تم نے اپنے اعمال کی غرض و غایت اور نتیجۂ کار کو پا لیا ہے اور پروردگار تمہاری ساری حاجتیں بر لائے گا ؟ ۔ نہیں ۔

فرمایا: کیا رمی جمرات کے وقت تمہارے دل میں یہ تصور تھا کہ اپنے اس عمل سے تم اپنے دشمن شیطان کو مار رہے ہو اور اپنے اس حج کو انجام دیتے ہوئے اس کی پوری پوری مخالفت کر رہے ہو۔ ؟ — نہیں — فرمایا: کیا سر کے بال تراشنے کے موقع پر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس عمل کے ذریعہ تمام روحانی کثافتوں اور آلودگیوں سے پاک صاف ہو گئے ہو اور لوگوں پر ظلم و ستم سے توبہ کر کے ایک دم طاہر ہو گئے۔ ایسے ہو گئے ہو گویا آج ہی تمہاری ولادت ہوئی ہے ؟ — نہیں — فرمایا: مسجد خیف میں نماز ادا کرتے وقت کیا تم نے اس بات کو درک کیا کہ سوائے خدا اور اپنے گناہوں کے نہ کسی سے ڈرنا چاہئے اور نہ سوائے رحمت خدا کے کسی اور شے سے امید وابستہ کرنی چاہئے ؟ — نہیں — فرمایا: کیا قربانی کرتے وقت تمہارے دل میں یہ نیت تھی کہ زہد و ورع کے ذریعہ جانور ذبح کرنے کے ساتھ ساتھ تم حرص و طمع کے گلے پر بھی چھری پھیر رہے ہو اور اپنے اس عمل سے جناب ابراہیمؑ کی سنت پر عمل کر رہے ہو جنھوں نے اپنے فرزند کو خدا کی راہ میں ذبح کر کے اپنے بعد لوگوں کے لئے خدا کی بندگی و اخلاص کی داغ بیل ڈال دی۔ ؟ — نہیں — فرمایا: منیٰ سے مکہ پہنچ کر طواف بجا لانے کے بعد کیا تمہارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب تمہاری بندگی و اطاعت پر رحمت خدا سایہ افگن اور حب خدا تمہارے دل میں موجزن ہے۔ تم نے واجبات بندگی ادا کر کے تقرب پروردگار کی منزل حاصل کر لی ؟ — نہیں —

یہ سنکر امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ایسی صورت میں نہ تم منیٰ گئے، نہ رمی جمرات کا فریضہ انجام دیا نہ بال ترشوائے نہ قربانی کی، نہ مسجد خیف میں نماز ادا کی نہ مکہ واپس آکر طواف بیت اللہ انجام دیا اور نہ خدا کا تقرب حاصل کیا۔ خلاصہ یہ کہ تم نے گویا حج ہی انجام نہیں دیا۔ شبلی، امامؑ سے اعمال حج کے ان اسرار و رموز کو سن کر اور اپنے بے روح اعمال کو دیکھ کر بہت روئے اور آئندہ سال انہوں نے پورے یقین و معرفت کے ساتھ ادا کیا۔[1]

---

[1] مستدرک الوسائل، طبع اسلامیہ، جلد ۲، کتاب الحج، ابواب العود الی منیٰ۔ باب ۷، ص ۱۸۶—۱۸۷



- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا

بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ

لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ

بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ:

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ملائکہ نے اور صاحبان علم نے ۔ درآں حالیکہ (اللہ) عدل پر قائم ہے ۔ صاحب غلبہ و صاحب حکمت اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (۱۸) بے شک، اللہ کے نزدیک دین، اسلام (و فرمان برداری) ہے

اور آسمانی کتاب رکھنے والوں نے اختلاف پیدا نہیں کیا مگر علم و آگاہی کے
بعد اور وہ بھی باہمی ظلم و ستم کے عالم میں، اور جو بھی انکار
کرے اللہ کی آیتوں (دلیلوں) کا، تو اللہ جلد (ہی) حساب لینے والا ہے (۱۹) اس
کے بعد بھی اگر یہ لوگ آپ سے حجت کریں تو کہدیجئے، میں نے اللہ کے حضور اپنی
پیشانی جھکادی اور ان لوگوں نے (بھی)، جو میرے پیرو کار ہیں اور اہل کتاب نیز
ان لوگوں سے پوچھیے جن کے پاس کتاب نہیں ہے۔ کیا تم اسلام قبول کرتے ہو؟
پھر اگر وہ اسلام لے آئیں (بات مان لیں) تو انھوں نے سیدھی راہ پالی، اور
اگر منہ پھیر لیں تو آپ کا کام پیام خدا پہنچانا ہے اور بندوں کے معاملات تو اللہ
خوب دیکھتا ہی ہے (۲۰)

تفسیر

۱۸۔ شھد اللّٰہ انہ لا الٰہ الا ھو ....

اہل کتاب سے عموماً اور نصاریٰ سے خصوصاً بات ہو رہی ہے، بات کی بنیاد ہے "اللہ" کو ماننا۔ جو اللہ کو مانتا ہے وہ اسے یکتا اور عادل ماننے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اپنی توحید پر خود اللہ گواہ ہے۔ (قائماً۔ کلمۂ۔ اللہ۔ کا حال ہے) اس مربوط و منظم کائنات کا وجود، عملی گواہی ہے کہ اس کا خالق واحد و یکتا اور نظام عدل کا نگراں ہے۔ اگر دو خدا ہوتے تو کائنات تباہ ہو جاتی۔ اگر اللہ عادل نہ ہوتا تو نظام خلقت میں ہم آہنگی نہ رہتی۔ عقلِ سلیم و وجدانِ صحیح اس گواہی کو محسوس کرتا ہے۔ خالق کی عملی گواہی کے بعد ملائکہ بھی گواہی دیتے ہیں وہ احکام شریعت و وحی لاتے اور فرمان الٰہی کی تعمیل کر کے دوسرے خود ساختہ خداؤں کی نفی کرتے ہیں اور پھر ان دونوں حقیقتوں سے آگاہ انسان "جنھیں اللہ نے علم سے نوازا ہے" یعنی انبیاءؑ، اوصیاءؑ و ائمہ معصومینؑ توحید کے گواہ ہیں۔ صاحبان عقل اور حکمت قرآن سے آگاہ بھی کہتے ہیں "لا الٰہ الا اللہ" عیسیٰؑ نے کب کہا کہ میری عبادت کرو اور کسی نبی و ولی نے کب کسی غیر خدا کے سامنے گردن جھکائی ان حضرات کی قولی و فعلی گواہی، معجزہ و علم اسرار کائنات کی تائید کے ساتھ ثبوتِ توحید کے لئے کافی ہے۔ وہ واحد بھی ہے اور عادل بھی۔

ملائکہ کے ساتھ "اولوا العلم" کا تذکرہ علم اور پاک پاکیزہ علما کے شرف پر دلیل ہے۔

۱۹۔ انّ الدّین عند اللّٰہ الاسلام . . . . . .

دین، جزا، اطاعت۔ حساب۔ شریعت کہ اس میں اطاعت و جزا کا پہلو نمایاں ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں دین کو اسلام کہا گیا ہے۔

"دین، اسلام ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللّٰہ نے انبیاء کو قانون عطا کیے۔ ان کا مطلب فقط اللّٰہ کی اطاعت تھا اور آج بھی توحید الٰہی وحدت دین کا ستون ہے، یعنی اللّٰہ عز اسمہ کے حضور تسلیم و عاجزی و اطاعت۔ حضرت علی علیہ السلام نے "نہج البلاغہ" میں سمندر کو کوزے میں یوں بند فرمایا ہے، الاسلام ھو التسلیم . . . . . اسلام تسلیم ہے اور تسلیم سے مراد تعین ہے، تعین نام ہے تصدیق کا اور تصدیق عبارت ہے اقرار سے۔ اقرار کا مطلب ہے ادا، اور ادا کے معنی ہیں عمل (تفسیر البرہان)

اہل کتاب سے امید تھی کہ وہ اسلام کا طریقہ اختیار کریں گے ان کی رفتار و گفتار اطاعت شعاری پر مبنی ہوگی، مگر انھوں نے علم حقیقت توحید و آیات الٰہی کے باوجود ذاتی انا اور باہمی سرکشیوں کی وجہ سے اختلاف ڈالا، جس کا محاسبہ اللّٰہ کے حضور ہوگا۔ دیکھیے یہی سورہ آیت ۸۳ و ۸۵ - النساء آیت ۱۲۵

۲۰۔ فان حاجّوک فقل اسلمت وجھی للّٰہ . . . .

اسلمت وجھی : میں نے اپنا چہرہ اللّٰہ کے سپرد کر دیا، یعنی چشم و گوش و ہوش پابند حکم الٰہی کر دیے۔ یا "وجہ" سے مراد "نفس" ہے۔

"اسلمت وجھی للّٰہ" میرا وجود و حقیقت اور میری پیشانی وقف سجدہ اور آنکھیں منتظر اشارۂ فرمان ہیں۔

یہ اہل کتاب، نصرانی اپنی کج بحثی نہ چھوڑیں تو آپ ان سے یہ کہہ دیجیے کہ ہم اور ہمارے ساتھی تو سب سے منہ موڑ کر اللّٰہ سے لو لگا چکے۔ تم اہل کتاب و بے کتاب، مشرک و مکی لوگ اگر اطاعت شعار بنتے ہو تو فائز المرام و ہدایت یافتہ ہو اور اگر بات نہیں مانتے تو رسول کی ذمہ داری پیغام پہنچانا اور بات سمجھانا ہے۔ باقی، اللّٰہ جانے اور تم، اس کی نظر میں نیت و عمل، ظاہر و باطن سب کچھ ہے وہ اپنے بندوں کا عمل جانتا ہے اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ دے گا۔

اہل کتاب کے مقابلے میں امی۔ کیا نفیس تعبیر ہے۔ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ باہر سے آئے ہوئے

یہود و نصاریٰ جو مدعیان علم ہیں اور شہر مکہ "ام القریٰ" کے رہنے والے جو دعوائے علم نہیں کرتے۔ وہ امی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ
النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝

ترجمہ:

بلاشبہ، جو لوگ اللہ کے احکام کا انکار کرتے ہیں، انبیا کو ناحق قتل کرتے اور ان لوگوں کی جان لے لیتے ہیں جو انصاف کا درس دیتے ہیں۔ تو انھیں دردناک عذاب کی اطلاع (بشارت) دے دیجیے (۲۱) یہی ہیں جن کے اعمال، دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ (۲۲)

تفسیر

۲۱- ان الذین یکفرون بآیات اللہ . . . . .

۲۲- اولئک الذین حبطت اعمالھم . . . . .

ان یہود کی تاریخ (سورہ بقرہ میں گزر چکی) اور بنی اسرائیل کی سفاکی یہاں تک پہنچی کہ ایک ایک دن میں ان لوگوں نے کئی کئی نبی اور ان کے جان نثاروں کو شہید کیا، اللہ کے احکام نافذ کرنے والوں کے خون بہائے، اس کے بعد ان کے عمل خود ان کی رسوائی کے علاوہ کیا رہ گئے۔ بے اساس و بے بنیاد، کام کی قیمت ہی کیا، ان کی تو دنیا و آخرت دونوں تباہ ہیں۔

آج بھی لبنان میں یہ بنی اسرائیل، علماء صالحین کے قتل اور مومن بستیوں کی تباہی میں جو دلیری دکھا رہے ہیں وہ دلیل ہے کہ اخلاق و عقیدہ نہ ان کے بزرگوں کے پاس تھا نہ ان کے پاس ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

ترجمہ:

کیا آپ نے ان لوگوں کا مشاہدہ نہیں کیا، جن کو کتاب (آسمانی) کا تھوڑا حصہ ملا تھا، انھیں "کتاب اللہ" کی طرف بلایا گیا کہ وہ کتاب ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرے، اس پر ان کے ایک فریق نے منہ پھیر لیا، درآن حالیکہ وہ سب منحرف لوگ ہیں (۲۳) ان کا یہ رویہ اس بنا پر ہے کہ ان کے بقول، جہنم کی آگ انھیں گنتی کے دنوں سے زیادہ چھوئے گی بھی تو نہیں۔ ان کی خود ساختہ باتوں ہی سے تو اپنے دین میں یہ لوگ بہکے ہیں (۲۴) پھر کیا حال ہوگا، جب ہم ان کو اس دن یکجا کریں گے جس (کے آنے) میں شک کی گنجائش نہیں ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔ (۲۵)

تفسیر:

۲۳۔ الم تر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتٰب . . . . .

یہود و نصاریٰ کے رویہ پر سرزنش ہے کہ یہ لوگ تورات و انجیل کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس کے بچے کچھے حصے کے علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انھیں غیر تحریف شدہ حصے کا علم ہے۔ اس کے باوجود جب ان سے اس کتاب کے مطابق فیصلے کرنے کو کہا جاتا ہے اور نبی کریمؐ ان کی غلطیاں دور کرنا چاہتے ہیں تو ایک فریق روگردانی کرتا اور اپنے دعوے سے منحرف ہو جاتا ہے۔ دراصل ان لوگوں نے کچھ غلط عقائد اور بے معنی تصورات قائم کر رکھے ہیں اور خود فریبی کا شکار ہو چکے ہیں۔

بعض روایات کے مطابق ایک شادی شدہ عورت سے زنا کے جرم میں خیبر کے یہودی جھگڑے میں پڑ گئے۔ وہاں کے حاکم نے زانی کو بڑا آدمی ہونے کی بنا پر سنگسار نہ کیا۔ آخر طے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاملہ طے کرائیں۔ آنحضرتؐ نے اس وقت کی تورات کے بموجب سنگساری کا حکم دیا۔ لیکن ابن صوریا (ربی) نے اول تو تورات کی وہ آیت چھپالی اور جب عبداللہ بن سلام نے اسی کتاب سے وہ آیت پڑھ دی تو ان لوگوں نے بات نہ مانی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر نمونہ میں، تورات سفر لاویان، بیسویں فصل، جملہ نمبر دس نقل کیا ہے، جس میں تحریف کی بنا پر سنگساری کے بجائے یہ درج ہے:

> "اگر کوئی آدمی کسی غیر کی بیوی سے زنا کرے (مثلاً) اپنے ہمسائے کی عورت سے زنا کرے تو زانی و زانیہ حتماً قتل کیے جائیں گے۔"

۲۴۔ ذٰلک بانھم قالوا . . . . .

حقائق سے انکار اور نافرمانی کے احساس میں شدت کا سبب ان لوگوں کے من گھڑت تصورات ہیں۔ مثلاً یہ خیال کہ یہود جہنم سے آزاد ہیں اور اگر دوزخ میں گئے بھی تو کچھ دن بطور اذیت رہ کر نکل آئیں گے۔ ایسے عقائد نے انھیں دین سے منحرف کر دیا ہے۔ دین تو قانون کی پابندی کا نام اور جزا و سزا میں انصاف، اللہ کا دستور ہے یہ نہ ہو تو آسمان سے کتابیں اور پیغمبر آنے کا فائدہ کیا ہے۔

۲۵۔ فکیف اذا جمعنٰھم لیوم . . . . .

ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے باطل خیالات کی حقیقت دیکھ لیں گے جب ہر ایک کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ لہٰذا اس دن کا انتظام ابھی سے کر لو۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل عام پر سازمان تبلیغات اسلامی کا احتجاج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان کے مظلوم و مستضعف مسلمانوں کے قتل عام کی بے حد افسوسناک اور غم انگیز خبریں مسلسل گوش گزار ہو رہی ہیں اور صورت حال یہ ہے کہ مسلمانان ہند کے خون کی یہ ہولی ایک انتہائی منظم سامراجی سازش کے تحت کھیلی جا رہی ہے، بڑی طاقتوں نے مسلمانوں سے ہندوؤں کی دیرینہ نفرت و تعصب اور قدیمی دشمنی کو ہوا دے کر اپنے زرخرید غلاموں کے ذریعہ اس سازش کو عملی جامہ پہنایا ہے، ایسے میں ان عظیم حوادث اور زبردست نقصانات کے سلسلے میں بین الاقوامی اداروں اور نام نہاد اسلامی ممالک کے سربراہوں کی یکلخت خاموشی انتہائی تعجب خیز امر ہے۔ حالانکہ جب بڑی طاقتوں کی سیاست اور مفاد کے خلاف کہیں معمولی سی بھی کوئی شورش ہوتی ہے تو سامراجی ذرائع ابلاغ حلق پھاڑ پھاڑ کر مدتوں چیخا کرتے ہیں لیکن اس وقت مسلمانوں کے قتل عام کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ وہ ان کی صدائے "یا للمسلمین" کو اپنی خاموشی کے ذریعہ نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں بلکہ بزدلانہ تہمتوں کے ذریعہ اس کی شکل کو مکمل طور پر مسخ کر کے اہل عالم کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں ــــ لیکن امت مسلمہ کا موقف ان کی شرمناک خاموشی کے بالکل برخلاف ہے اور وہ ان ہولناک مظالم کا تمام تر ذمہ دار حکومت ہند کو قرار دیتی ہے اور اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ اگر یہ صورت حال اب بھی جاری رہی اور وہ لوگ اس ناپاک سامراجی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے باز نہ رہے تو بیدار ضمیر مسلمان اپنے اسلامی فرائض کی ادائیگی پر بہر طور مجبور ہو جائیں گے، کیونکہ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس سلسلے میں کسی قسم کے رد عمل کوئی اظہار نہ کیا جائے اور خاموشی کے ساتھ مسلمانان ہند کے قتل عام کا تماشا دیکھتے رہیں خاص کر ان حالات میں جب کہ سامراج کے زرخرید غلام اسلام اور مسلمانوں سے نبرد آزمائی کے لئے تعینات کر دیے گئے ہوں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک رہنما جناب سید عبد اللہ بخاری کی گرفتاری کے مسئلہ کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ تمام مسائل اسلامی جذبات و احساسات کو ہوا دینے کے لئے کافی ہیں، بلکہ ہم تو اس روش کو پوری امت مسلمہ کے خلاف نبرد آزمائی اور جنگ تصور کرتے ہیں ــــ چنانچہ دنیائے اسلام کے تمام رہنماؤں بالخصوص علمائے اعلام، نیز تمام اسلامی انجمنوں اور ثقافتی اداروں بلکہ دنیا کے تمام آزاد فکر انسانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ان مظالم کے سلسلے میں وہ اپنے شدید رد عمل اور غم و غصہ کا اظہار کریں اور اس زبردست خوں ریزی و المیہ کے تمام جرائم پیشہ ذمہ داروں کی سخت مذمت کریں

سازمان تبلیغات اسلامی

محمد تقی مصباح
ترجمہ جناب سید علی الحسن رضوی

مقدمۂ معارف قرآن

نزولِ قرآن

قرآن مجید کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کا اطمینان بخش جواب اس سے مکمل استفادہ کے لئے بے حد ضروری ہے اس طور پر بیان کئے جا سکتے ہیں کہ :۔

۱۔ آیا یہ کتاب واقعی طور پر خدائے متعال کی طرف سے نازل ہوئی ہے ؟

۲۔ آیا اس کے مخاطب تمام افراد انسانی ہیں یا کسی مخصوص افراد اور گروہ سے تعلق رکھتی ہے ؟

۳۔ اس کے نزول کا مقصد کیا ہے ؟

۴۔ اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کا کیا طریقہ ہے ؟ نیز اس کے بیان کردہ مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کی کیا صورت ہے ؟ ہم ان سوالات کا جواب خود قرآنی آیات کی روشنی میں تلاش کرنے کے لئے متعلقہ آیات کو الگ الگ عنوان کے تحت مورد مطالعہ قرار دیں گے ۔

قرآن کا خدا کی کتاب ہونا

قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ خداوند متعال کی طرف سے جبرئیل امین کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ پر نازل کیا گیا ہے ۔ اس کی تدوین و تنزیل میں کسی بھی دوسرے حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلامؐ کا بھی کوئی دخل نہیں ہے چنانچہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے قرآن نے دلیلیں بھی پیش کی ہیں ۔ پہلے ہم ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن سے قرآن کا اصلی مدعیٰ یعنی "قرآن کا خدا کی طرف سے نازل ہونا" ثابت ہوتا ہے اس کے

بعدوہ آیات جو اس کے نزول کی کیفیت بیان کرتی ہیں ذکر کریں گے اور آخر میں ان آیات کو بیان کریں گے جو ان مطالب کی دلیلیں پیش کرتی ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان آیات کے بارہ میں کوئی تحقیقی جائزہ پیش کریں جن میں قرآن کا خدا کی طرف سے نازل ہونا بیان کیا گیا ہے ان تمام آیتوں کو ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جن میں اصل نزول سے متعلق کوئی بات کہی گئی ہے (البتہ یہ آیات ان آیات مفردہ کے علاوہ ہیں جن کا ہم "اوصاف وعناوین قرآن" کے ذیل میں الگ الگ ذکر کر چکے ہیں جیسے کلام اللہ" آیات "اللہ" یا تنزیل" وغیرہ) یہ آیات مختلف تعبیرات کی حامل ہیں جن کو مادہ لفظ کے تحت درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ مادہ نزول، تنزیل اور انزال

الف: نزول — نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبك لتكون من المنذرین (شعراء/۱۹۳)

اسی طرح سورۂ اسراء/۱۰۵ اور سورۂ حدید/۱۶ ملاحظہ فرمائیں۔

ب: تنزیل — "ذالك بان اللہ نزل الكتاب بالحق" (بقرہ/۱۷۶)

"تبارك الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیكون للعالمین نذیراً" (فرقان/۱)

"انا نحن نزلنا علیك القران تنزیلاً" (انسان/۲۳)

"والذین آتیناهم الكتاب یعلمون انه منزل من ربك بالحق" (انعام/۱۱۴)

ان آیات کے ضمن میں لفظ "تنزیل" پر مشتمل وہ ۱۳ آیتیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں جن کو اوصاف وعناوین قرآن" کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتیں بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں:۔

بقرہ: ۲۳، ۹۰، ۹۷، ۱۰۵۔ آل عمران: ۳۔ نساء: ۴۷، ۱۳۶، ۱۴۰۔ مائدہ: ۱۰۱ — اعراف: ۱۹۶۔ حجر: ۶، ۹۔ نحل: ۴۴، ۸۹، ۱۰۱، ۱۰۲۔ اسراء: ۸۲، ۱۰۶۔ فرقان: ۳۲ — شعراء: ۱۹۸۔ زمر: ۲۳۔ زخرف: ۳۱۔ محمد: ۲، ۲۶ اور سورۂ حدید: ۹۔

ج : انزال ۔ لو انزلنا ھٰذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ (حشر/۲۱)
"انا انزلناہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون" (یوسف/۲)
"یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک" (مائدہ/۶۷)
اللہ الذی انزل الکتاب بالحق (شوریٰ/۱۷)

مندرجہ ذیل آیات بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں :۔

سورہ بقرہ : ۴، ۴۱، ۹۰، ۹۱، ۹۹، ۱۳۶، ۱۷۰، ۱۸۵، ۲۳۱ اور ۲۸۵ ۔ آل عمران : ۴، ۷، ۷۳، ۸۴ اور ۱۹۹ ۔ نساء : ۶۰، ۶۱، ۱۰۵، ۱۱۳، ۱۶۲، ۱۶۶ اور ۱۷۴ ۔ مائدہ : ۴۸، ۴۹ (مکرر)، ۵۹، ۶۴، ۶۶، ۶۸ (مکرر)، ۸۱، ۸۳ اور ۱۰۴ ۔ انعام : ۹۲، ۹۳، ۱۱۴، ۱۵۵ ۔ اعراف : ۲ اور ۱۵۷ ۔ توبہ : ۸۶، ۹۷، ۱۲۴ اور ۱۲۷ ۔ یونس : ۹۴ ۔ ہود : ۱۴ ۔ رعد : ۱، ۱۹، ۳۶، ۳۷ ۔ ابراہیم : ۱ ۔ نحل : ۴۴، ۶۴ ۔ اسراء : ۱۰۵ ۔ کہف : ۱ ۔ طٰہٰ : ۲، ۱۱۳ ۔ انبیاء : ۱۰ و ۵۰ ۔ حج : ۱۶ ۔ نور : ۱ (مکرر)، ۳۴، ۴۶ ۔ فرقان : ۶ ۔ قصص : ۸۷ ، عنکبوت : ۴۶، ۴۷ اور ۵۱ ۔ لقمان : ۲۱ ، سباء : ۶ ۔ ص : ۲۹ ۔ زمر : ۲، ۴۱ اور ۵۵ ۔ دخان : ۳ ۔ احقاف : ۳۰ محمد : ۹ اور ۲۰ ۔ مجادلہ : ۵ ۔ تغابن : ۸ ۔ طلاق : ۵ اور ۱۰ اور سورہ قدر : ۱ ۔

تحقیق و نظر

ان میں کچھ آیتیں قرآن کے بعض حصوں سے مخصوص ہیں جیسے سورۂ نور کی پہلی آیت (سورۃٌ انزلناھا ... ") اور کچھ آیتیں قرآن کے بارہ میں دوسروں کے افکار و خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں، حتیٰ کہ ان میں وہ آیتیں بھی شامل ہیں جن میں دشمنوں کے استہزا کا ذکر ہے پھر بھی یہ بات طے ہے کہ ان تمام آیتوں میں قرآن کے نزول کا دعویٰ کیا گیا ہے ۔ مثال کے طور پر سورہ حجر کی چھٹی آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے :۔ "وقالوا یاایھا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون"
بہرحال یہ تمام آیتیں دلالت کے اعتبار سے اختلاف مراتب کے باوجود قرآن کے اسی دعوے کی تائید کرتی ہیں کہ قرآن خدا کی نازل کردہ کتاب ہے اس میں ایک حرف بھی کسی غیر کی اختراع نہیں ہے ۔

معنائے نزول ۔ قرآن مجید کے "مستقل عنوانات" کے تحت ساتویں عنوان "تنزیل" کے ذیل

میں بیان کئے جاچکے ہیں۔ اصل میں تنزیل و انزال کے معنی بھی اسی لفظ نزول کے معانی سے واضح ہو جاتے ہیں۔

یہاں تین اہم نکتوں کی وضاحت ضروری ہے :۔

۱) انزال اور تنزیل میں کیا فرق ہے ؟

۲) قرآن کا نازل کرنے والا کون ہے ؟ آیا ان آیات میں اختلاف بیان سے تو کام نہیں لیا گیا ہے جہاں نازل کنندہ کے طور پر کبھی خدا اور کبھی جبرئیل امین کا نام لیا گیا ہے ؟

۳) منزّل علیہ کون ہے ؟ کیوں کہ بعض آیتوں میں پیغمبر اسلام پر قرآن کے نازل ہونے کا ذکر ہے اور بعض میں عوام الناس پر۔

انزال اور تنزیل میں فرق

بعض مفسرین نے انزال و تنزیل کے درمیان یہ فرق بتایا ہے کہ " انزال ـــ نزول دفعی یعنی ایک ساتھ نازل ہونے اور تنزیل ـــ نزول تدریجی یعنی رفتہ رفتہ نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے چنانچہ جس جگہ بھی وحدت و دفعیت ملحوظ رہی ہے وہاں لفظ انزال سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے :۔

ا) شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (بقرہ / ۱۸۵)

ب) حٰم والکتاب المبین انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ (دخان / ۱ تا ۳)

ج) انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (قدر / ۱)

اور جہاں کہیں کثرت اور تدریجی طور پر نازل کرنا مقصود رہا ہے اس عمل کی تعبیر لفظ "تنزیل" سے کی گئی ہے ۔ لیکن اس قول کا تمام موارد میں درست ثابت ہونا ایک مشکل امر ہے مثال کے طور پر سورۂ نور کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وانزلنا فیھا آیات بیّنات

اور اسی سورہ نور کی ۴۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"لقد انزلنا آیات مبیّنات"

اگرچہ ان دونوں موارد میں تعدد و کثرت آیات ملحوظ رہی ہے پھر بھی اس کو لفظ انزال

سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے رخ سے بھی یہ قول ثابت کرنا مشکل ہی نظر آتا ہے چنانچہ سورہ فرقان کی ۳۲ ویں آیت میں اعلان ہوتا ہے :-

وقال الذین کفروا لولا نزل علیه القرآن جملة واحدة

یہاں پورے قرآن کو ایک مجموعہ "جملة واحدة" کے طور مورد نظر رکھا گیا ہے پھر بھی لفظ تنزیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نساء میں خدا فرماتا ہے :-

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات الله یکفر بها و یستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره (آیت ۱۴۰)

حالانکہ یہاں بھی کل قرآن مورد نظر ہے پھر بھی کلمۂ نزّل استعمال ہوا ہے۔

البتہ ان دونوں کلمات (انزال و تنزیل) کے درمیان فرق واضح کرنے کے سلسلہ میں ایک دوسری بات کہی جا سکتی ہے جو مذکورہ قول کے مقابلہ میں زیادہ روشن و واضح بھی ہے اور بلا استثناء تمام موارد میں اسکی تطبیق بھی کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ :-

لفظ انزال (متعدی کے طور پر) صرف نازل کرنے پر دلالت کرتا ہے اور اس کے مفہوم میں نہ تو وحدت ملحوظ نظر ہے نہ ہی کثرت مقصود ہے اور بہ صورت دونوں رخ سے مطابقت رکھتی ہے۔ اسی طرح لفظ "تنزیل" میں باب تفعیل کی مناسبت و خصوصیت کے پیش نظر معنائے کثرت مراد لئے گئے ہیں (مگر اس کے معنی میں بھی تدریجی نزول پیش نظر نہیں ہے) کیونکہ کثرت کبھی فعل میں پائی جاتی ہے جیسے "طوّفت الکعبة" یعنی میں نے مکرر طور پر کعبہ کا طواف کیا اور کبھی کثرت فاعل کی مناسبت سے ہوتی ہے جیسے موّتت الأبال یعنی بہت سے اونٹ مرگئے اور اسی طرح کبھی کثرت مفعول کے تحت ہوئی ہے جیسے غلّقت الابواب یعنی میں نے بہت سے دروازوں کو بند کیا۔ جہاں تک قرآن کا سوال ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ممکن ہے کثرت سے مراد تعدد آیات کو لیا گیا ہو اور اسی طرح ممکن ہے کہ کثرت سے مراد متعدد طور پر مختلف جہات سے قرآن کا نازل ہونا مقصود ہو جیسا کہ ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن حقیقی کے نزول اور اس کے لباس الفاظ و معانی سے آراستہ ہونے کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ پایا جاتا ہے۔ اس طرح "تنزیل" کی تعبیر قرآن کی ایک آیت کے بارے میں

اور جمع قرآن کو ایک واحد مجموعہ قرار دیکر بھی صحیح ہے۔

اور اگر اس نظریہ کو بھی کسی کا ذہن قبول نہ کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ انزال اور تنزیل، دونوں متعدی طور پر محض نزول پر دلالت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مترادف ہونے کی حیثیت سے دونوں کا ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال صحیح ہے۔

قرآن کس نے نازل کیا؟

قرآن مجید کی مذکورہ بعض آیتوں میں اگرچہ قرآن نازل کرنے والے کا صریحی طور پر ذکر نہیں کیا گیا ہے پھر بھی قرائن اس بات کی نشان دہی کر دیتے ہیں کہ اس سے مراد خداوند متعال کی ذات والاصفات ہے مثال کے طور پر سورۂ اسراء کی ۱۰۵ ویں آیت "وبالحق نزل" کی ماقبل آیت میں "وبالحق انزلنا" موجود ہے جو اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ نازل کنندۂ قرآن خداوند عالم ہے یا اسی طرح سورہ بقرہ میں شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن (آیت/۱۸۵) سے نازل کنندہ کا پتہ نہیں چلتا مگر اس سے مشابہ دوسری آیتوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ نازل کرنے والا خدائے وحدہ لاشریک ہی ہے۔ ویسے زیادہ تر آیتوں میں نازل کنندہ کے طور پر خداوند متعال کا ذکر صریحی طور پر موجود ہے صرف چند موارد میں اس کی نسبت "جبرئیل" "روح القدس" یا "روح الامین" کی طرف دی گئی ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:-

قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علیٰ قلبک باذن اللہ (آیت/۹۷)

سورۂ نحل میں اعلان ہوتا ہے:-

قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق (آیت/۱۰۲)

یا سورہ شعراء میں ارشاد ہے:-

وانہ لتنزیل رب العلمین۔ نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین (آیت/۱۹۱، ۱۹۲ و ۱۹۳)

بظاہر روح القدس، اور روح الامین سے بھی جبرئیل امین ہی مراد ہیں۔

ممکن ہے کسی کو ان دونوں صورتوں کے تحت ایک طرف خداوند عالم اور دوسری طرف جبرئیل امین کا نازل کنندہ کے طور پر ذکر ہونا درست و مناسب معلوم نہ ہو لیکن خود ان آیات کا بغور جائزہ لینے کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ قرآن مجید میں ہی جبرئیل امین کا تعارف نزول قرآن کے سلسلہ میں ذریعہ و واسطہ کی حیثیت سے کرایا گیا ہے چنانچہ سورۂ نحل میں اعلان ہوتا ہے :۔

قل نزّلہ روح القدس من ربک (آیت/۱۰۲)

لہٰذا ان کی طرف نازل کرنے کی نسبت غلط نہیں قرار دی جا سکتی اور نہ ہی اس کے ذریعہ خدا کے اصل نازل کنندۂ قرآن ہونے میں کوئی فرق پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآنی آیات کی روشنی میں ہی یہ بات ثابت ہے کہ فرشتوں کے عمل کی خود کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کی اجازت اور اس کے امر کے تحت انجام دیتے ہیں جیسا کہ اسی سورۂ بقرہ میں جبرئیل امین کی طرف نزول قرآن کی نسبت دیتے ہوئے اس پر "باذن اللہ" کی مہر ثبت کر دی گئی ہے ۔۔۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

فانہ نزّلہ علیٰ قلبک باذن اللہ (آیت/۹۷)

اور مجموعی طور پر فرشتوں کے اعمال کے سلسلہ میں یوں ارشاد ہوتا ہے :۔

لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون (انبیاء/۲۷)

یعنی فرشتے کبھی کسی بات میں خداوند عالم پر سبقت اختیار نہیں کرتے (جب بھی زبان کھولتے ہیں خدا کی اجازت سے کلام کرتے ہیں) اور صرف اسی کے حکم کے تحت عمل انجام دیتے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اس طرح کے کسی شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جبرئیل امین نے خود اپنی طرف سے پیغمبر اکرمؐ پر کوئی بات القاء کی ہو۔

قرآن کس پر نازل ہوا۔

بعض آیات میں قرآن کے نزول کا تو ذکر ہے مگر قرآن کس پر نازل کیا گیا اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

ان ولیّ اللہ الذی نزّل الکتاب وھو یتولی الصالحین (اعراف/۱۹۶)

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (حجر/۹)

كـذالك انـزلنا ه قرانا عـربياً (طٰہٰ/۱۱۳)

اسی زمرہ میں مندرجہ ذیل آیات بھی شامل ہیں:۔

سورۂ بقرہ: ۴۱، ۹۰، ۱۷۰، ۱۷۶ و ۱۸۵ ۔ سورۂ آل عمران: ۴ و ۵۳ ۔ سورۂ نسار: ۴۷، مائدہ/۴۸، ۴۹، ۱۰۱ و ۱۰۴ ۔ سورہ انعام: ۹۲، ۹۳، ۱۱۴ و ۱۵۵، سورۂ اعراف: ۱۵۷، سورۂ توبہ: ۸۶، ۱۲۳ و ۱۲۷ ۔ سورہ ھود: ۱۴ ۔ سورہ یوسف: ۲، سورہ رعد: ۳۷ ۔ سورۂ نحل: ۱۰۱ و ۱۰۲، سورہ اسرار: ۸۲، ۱۰۵ و ۱۰۶ ۔ سورہ انبیاء: ۵۰، سورۂ حج: ۱۶، سورۂ نور: ۱ و ۳۴ سورہ فرقان: ۶ و ۳۲ ۔ سورۂ لقمان: ۲۱ ۔ سورۂ زمر: ۲۳ ۔ سورۂ شوریٰ: ۱۷ ۔ سورہ دخان: ۳، سورۂ احقاف: ۳۰ ۔ سورۂ محمدؐ: ۹، ۲۰ و ۲۶، سورۂ حدید: ۱۶، سورۂ مجادلہ: ۵ ۔ سورۂ تغابن: ۸ و سورۂ قدر: ۱ ۔

لیکن ایسی آیتیں بھی کثرت سے ہیں جن میں پیغمبر اسلامؐ پر قرآن نازل ہونے کی تصریح موجود ہے مثال کے طور پر سورۂ محمدؐ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وآمنوا بـمـا نـزّل عـلی محـمـد وهو الحق من ربّـهـم (آیت/۲)

سورۂ فرقان میں اعلان ہوتا ہے:۔

تبارك الـذی نـزّل الفرقان علیٰ عبده (آیت/۱)

سورۂ مائدہ میں خدا فرماتا ہے:۔

واذا سـمعوا ما انـزل الی الرسول ترىٰ اعينهم تفيض من الـدّمع (آیت/۸۳)

اسی طرح سورۂ انسان میں ہے:۔

انا نحن نـزّلنا عليك الـقرآن تـنزيـلاً (آیت/۲۳)

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتوں میں منزل علیہ کی تشریح موجود ہے:۔

سورۂ بقرہ: ۴، ۲۳، ۹۷، ۹۱ اور ۲۸۵ آل عمران: ۳، ۷ ۔ نسار: ۶۰، ۱۰۵، ۱۱۳، ۱۳۶، ۱۶۲، ۱۶۶، مائدہ: ۴۸، ۴۹، ۶۴، ۶۷ و ۸۱ ۔ اعراف: ۲، ۱۵۷ ۔ توبہ: ۹۷ یونس: ۹۴ ۔ رعد: ۱، ۱۹، ۳۶ ۔ ابراہیم: ۱، نحل: ۴۴ ۔ ۶۴ و ۸۹ ۔ کہف: ۱ ۔ طٰہٰ: ۲:

شعراء: ۱۹۳، قصص: ۸۷۔ عنکبوت: ۴۷ و ۵۱۔ سبا: ۶۔ ص: ۲۹، زمر: ۲ و ۴۱ و سورۂ حدید: ۹۔

نزول قرآن سے متعلق کچھ ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن کا عام لوگوں پر یا عام لوگوں کی طرف نازل ہونا بیان کیا گیا ہے چنانچہ سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وهو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا (آیت/۱۱۴)

سورۂ بقرہ کی ۲۳۱ ویں آیت میں اعلان ہوتا ہے:۔

واذکروا نعمة الله علیکم وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة

مندرجہ ذیل آیتیں بھی اسی انداز کی ہیں:۔

بقرہ: ۱۰۵، ۱۳۶ و ۲۳۱۔ آل عمران: ۷۲ و ۱۹۹، نساء: ۱۴۰، ۱۷۴۔ مائدہ: ۵۹۔ انعام: ۱۱۴۔ نحل: ۴۴۔ انبیاء: ۱۰۔ نور: ۳۴ اور سورۂ طلاق: ۵ و ۱۰۔

البتہ یہ ایک واضح اور بدیہی امر ہے کہ قرآن براہ راست عام لوگوں پر نازل نہیں ہوا نیز کثرت کے ساتھ ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے قرآن کریم کا پیغمبر اسلام پر نازل ہونا ثابت ہے لہٰذا عام لوگوں پر یا عام لوگوں کی طرف قرآن کے نزول کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس قرآن کا بالواسطہ طور پر پیغمبر اسلام کے ذریعہ عوام کی طرف نازل ہونا مراد ہے۔

اسی مضمون کی اور بھی دوسری آیات موجود ہیں جو مادہ "نزول" سے تو نہیں ہیں پھر بھی اسی کے قریب المعنیٰ ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کی ۱۷۴ ویں آیت: یا ایها الناس قد جاءکم برهان من ربکم" اور سورۂ مائدہ کی ۱۵ ویں آیت: قد جاءکم من الله نور وکتاب مبین" میں "جاءکم" کے ذریعہ اسی مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے۔

۲۔ مادہ مجیٔ:

قرآن مجید کے اتارے جانے سے متعلق آیتوں میں ۲۵ سے زائد موارد ایسے ہیں جہاں اس کلمہ کے مشتقات (جاء۔ جاءك، جئناك وغیرہ) استعمال ہوئے ہیں، جیسے:۔

سورۂ بقرہ کی آیت: ۸۹، ۱۲۰ و ۱۴۵۔ نساء کی آیت: ۱۷۰ و ۱۷۴۔ مائدہ کی آیت: ۱۵، ۴۸ و

۸۴ - انعام: ۵، ۱۰۴، ۱۵۷ - اعراف کی آیت: ۵۲ - یونس: ۵۷، ۹۴، ۱۰۸ - ھود: ۱۲۰،
رعد: ۳۷ - اسراء: ۸۱، ۹۴ - کہف: ۵۵ - مومنون: ۷۰ - فرقان: ۳۳ - قصص ۴۸،
عنکبوت: ۶۸ - سبا: ۴۹ - صافات: ۳۷ - زمر: ۳۲ - غافر: ۶۶ - فصلت: ۴۱ -
زخرف: ۲۹، ۳۰ و ۷۸ - احقاف: ۷ - ق: ۵ - ممتحنہ: ۱ - سورۂ صف: ۶ -

ان میں سے بعض آیتوں میں قرآن کی آمد کو حق کی آمد سے تعبیر کیا گیا ہے اگرچہ ان میں نہ تو اس کے لانے والے کا کوئی تعارف کرایا گیا ہے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کی نشاندہی کی گئی ہے جس کے پاس حق آیا ہے مثال کے طور پر سورۂ اسراء میں اعلان ہوتا ہے :-

وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا (آیت/۸۱)

یہی انداز سورہ سبا کی ۴۹ ویں آیت میں بھی ہے۔

ان میں کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں جو پیغمبر اسلام پر قرآن نازل ہونے پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے سورۂ یونس میں اعلان ہوتا ہے :-

لقد جاءك الحق من ربك (آیت/۹۴)

اس کے علاوہ سورۂ ھود کی آیت: ۱۷ - سورہ مائدہ کی آیت ۴۸، بقرہ کی آیت ۱۳۰ و ۱۴۵ - رعد کی آیت: ۳۷ - غافر: ۶۶ اور فرقان کی آیت: ۳۳ بھی اسی انداز کی ہے۔

بعض آیتوں میں خدا کی جانب سے بندوں کی طرف آنے کی خبر دی گئی ہے مثلاً سورۂ نجم کی ۲۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے :-

"ولقد جاءهم من ربهم الهدىٰ"

اسی کے مثل سورۂ یونس کی آیت: ۵۷، ۱۰۸ - سورۂ نساء کی آیت: ۱۷۴، مائدہ کی آیت: ۱۵ - انعام: ۱۰۴ و ۱۵۷ بقرہ کی آیت: ۸۹ اور قصص: ۴۸ بھی ہے۔

بعض دوسری آیات میں قرآن نے کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے چنانچہ سورۂ اعراف میں ارشاد گرامی ہے :-

"ولقد جئناهم بكتاب فصلناه علىٰ علم" (آیت/۵۲)

سورۂ زخرف کی ۷۸ ویں آیت بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

ان آیتوں کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسمیں قرآن کا عام لوگوں کی طرف آنا کسی لانے والے کا تعارف کرائے بغیر ذکر ہوا ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں۔

سورہ ممتحنہ: ۱۔ مائدہ: ۸۴۔ انعام: ۵۔ اسراء: ۹۴، ق: ۵؛ کہف: ۵۵۔ احقاف: ۷۔ فصلت: ۴۱۔ زخرف: ۲۹، عنکبوت: ۶۸۔ زمر: ۳۲ اور اسی طرح سورۂ زخرف کی تیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

ولمّا جاءھم الحق قالوا ھٰذا سحر وانّا بہ کافرون

ان ہی آیات میں ایک آخری قسم ان آیات کی بھی ہے جس میں پیغمبر اسلام کو قرآن لانے والے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ نساء میں ارشاد ہے:۔

قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم (آیت/۱۷۰)

ان آیات میں بظاہر جو ابتدائی اختلاف نظر آرہا ہے اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو جیسا کہ ہم مادہ "نزول" سے متعلق آیات کے ذیل میں کہہ چکے ہیں، یہ اختلاف خود بخود برطرف ہو جاتا ہے۔

۳۔ مادہ اتیان وایتاء

نزول قرآن سے متعلق آیات میں تقریباً دس موارد ایسے نظر آتے ہیں جہاں ان دونوں مادوں سے مشتق کلمات استعمال ہوتے ہیں چنانچہ سورہ حجر میں اعلان ہوتا ہے:۔

ولقد اٰتیناک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم (آیت ۸۷)

دیگر نو موارد اس طرح ہیں: سورۂ طٰہٰ: ۹۹، سورۂ نحل: ۵۵۔ سورہ عنکبوت: ۴۶، سورۂ روم: ۵۴۔ سورہ مومنون: ۷۱ و ۹۰۔ سورۂ انبیاء: ۲۔ سورۂ شعراء: ۵ اور سورۂ نساء: ۵۴۔

۴۔ مادۂ وحی

کلمہ "وحی" اور اس کے مشتقات (اوحی، یوحی وغیرہ) نزول قرآن سے متعلق تقریباً

چالیس موارد میں استعمال ہوئے ہیں ۔ مثال کے طور پر :۔

کذالک اوحینا الیک قرآناً عربیاً (شوریٰ : ۷)

ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ (اسراء/۳۹)

دیگر آیات :۔

سورۂ آل عمران : ۴۴ ۔ سورۂ نساء ۱۶۳ ۔ سورہ شوریٰ : ۳ ، ۱۳ ، ۵۱ و ۵۲ سورۂ فاطر : ۳۱ ۔ سورۂ انعام : ۱۹ ، ۵۰ ، ۱۰۶ و ۱۴۵ ۔ سورۂ انبیاء : ۴۵ و ۱۰۸ سورۂ نجم : ۴ و ۱۰ ۔ سورۂ طٰہٰ : ۱۱۴ ۔ سورہ یوسف : ۳ و ۱۰۲ ۔ سورۂ یونس : ۲ ، ۱۵ ، ۱۰۹ ۔ سورۂ رعد : ۳۰ ۔ سورہ زمر : ۶۵ ۔ سورۂ کہف : ۲۷ و ۱۱۰ ، سورہ عنکبوت : ۴۵ ۔ سورہ ھود : ۱۲ ، ۴۹ ۔ سورہ احزاب : ۲ ۔ سورۂ احقاف : ۹ ۔ سورۂ اعراف : ۲۰۳ ۔ سورہ فصلت : ۶ ۔ سورہ اسراء ۷۳ ، ۸۶ سورہ نحل : ۱۲۳ ، سورۂ سباء : ۵۰ ، سورۂ جن : ۱ اور سورۂ ص کی آیت : ۷۰ ۔

ان میں سے بعض آیتیں مثلاً سورۂ ھود کی ۴۹ ویں آیت :۔

"تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک"

اور سورۂ اسراء کی ۳۹ ویں ، نحل کی ۱۲۳ ویں ، شوریٰ کی ۱۳ ویں ، آل عمران کی ۴۴ ویں انعام کی ۱۴۵ ویں ، سباء کی ۵۰ ویں ، جن کی پہلی ، ص کی ۷۰ ویں نیز سورۂ یوسف کی ۱۰۲ ویں آیتیں وغیرہ قرآن کریم کے بعض مخصوص حصوں سے مربوط ہیں ۔ بعض آیتیں پورے قرآن سے متعلق ہیں اور کچھ آیتوں کے بارے میں یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ شاید قرآن کے علاوہ وحی بھی ان میں شامل ہے ۔ مثال کے طور پر سورۂ احزاب کی دوسری آیت میں ارشاد ہے :۔

"واتبع ما یوحیٰ الیک من ربک"

یا سورۂ یونس کی آیت : ۱۰۹ ۔ سورۂ انعام کی آیت : ۱۰۶ اور سورہ شوریٰ کی آیت : ۳ ملاحظہ فرمائیں ۔

"وحی" کا کیا مطلب ہے؟

وحی کے معنیٰ اشارہ و رمز کے ہیں۔ اگر کسی کو پوشیدہ طور پر مخصوص انداز میں کچھ سمجھانا مقصود ہو تو اس کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اگرچہ اس کے اصل معنیٰ سرعت، و تیزی کے ہیں (امر وحی یعنی سریع) اور شاید اسی مناسبت کے تحت وحی کو "اشارہ" کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اشارہ میں سرعت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے:۔

فاوحیٰ الیہا الطرف انی احبہا ؛ فاثر ذالک الوحی فی وجناتھا

(یعنی اس نے اس کو آنکھوں کے اشارہ سے بتایا کہ میں تم کو دوست رکھتا ہوں اور یہ اشارہ اس کے چہرہ پر اثر انداز ہو گیا)

چنانچہ اس کے بعد ہر وہ بات جو پوشیدہ طور پر یا مخصوص انداز میں کی جاتی "وحی" سے موسوم کر دی جاتی چاہے یہ راز و نیاز لب و لہجہ کی تخفیف کی وجہ سے ہو، زبان و الفاظ میں اشارہ کنایہ کے استعمال کی بنیاد پر ہو یا کسی دوسری صورت کی بنا پر ہو۔

البتہ اہل شرع کی اصطلاح میں کسی نبی یا رسول پر خداوند عالم کی طرف سے پیغامات پہنچنے کو "وحی" کہتے ہیں چاہے پیغامات بلا واسطہ یعنی براہ راست حاصل کئے جائیں یا کسی فرشتہ کے ذریعہ حاصل ہوں۔ خواہ دوسرے اس کلام کو سن سکیں یا نہ سن سکیں، کسی نبی و رسول کو مکتوبی طور پر حاصل ہوا ہو یا محض ایک حقیقت الٰہیہ کی صورت میں کسی کے قلب پر اتار دیا جائے۔ عالم خواب میں اتارا جائے یا بیداری کی حالت میں۔

لیکن جہاں تک قرآن میں لفظ وحی کے استعمال کا سوال ہے یہ اپنے تمام تر لغوی و عرفی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ محض شرعی اصطلاح تک محدود نہیں ہے کیونکہ اس لفظ کو انبیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں اور ملائکہ کے سلسلہ میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن میں "وحی" کا استعمال

قرآن کریم میں لفظ "وحی" درج ذیل موارد میں استعمال ہوا ہے:۔

الف ۔ مادر جناب موسیٰؑ کے سلسلہ میں :۔

واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ ... (قصص / ۷)

اس سلسلہ میں سورۂ طٰہٰ کی ۳۸ ویں آیت بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ب ۔ حواریین جناب عیسیٰؑ کے سلسلہ میں :۔

واذ اوحیت الی الحواریین ان آمنوا بی وبرسولی قالوا آمنا واشھد باننا مسلمون" (مائدہ / ۱۱۱)

ج ۔ شہد کی مکھی کے سلسلے میں :۔

واوحیٰ ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا (نحل / ۶۸)

د ۔ ملائکہ کے سلسلہ میں :

اذ یوحی ربك الی الملائکۃ انی معکم (انفال / ۱۲)

ھ ۔ شیطانی وسوسوں کے سلسلہ میں :۔

وان الشیاطین لیوحون الیٰ اولیائھم لیجادلوکم (انعام / ۱۲۱)

اسی سورہ کی ۱۱۲ ویں آیت بھی اسی ذیل میں وارد ہوئی ہے۔

و ۔ زمین کے سلسلہ میں :۔

"... بان ربك اوحیٰ لھا (زلزال / ۵)

اسی طرح سورۂ مریم کی گیارہویں اور سورۂ فصلت کی بارہویں آیت بھی اسی ذیل میں آئی ہے۔

بہر حال اگر ہم اس بحث میں الجھے کہ آیا "وحی" کا استعمال تمام موارد میں حقیقت کے طور پر ہوا ہے یا ان میں سے بعض میں مجاز کے طور پر اور بعض میں حقیقت کے طور پر ہے تو ہم اپنے موجودہ مقصد سے دور ہو جائیں گے لہٰذا اس کو ہم کسی اور مناسب موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

۵ ۔ مادۂ تلاوت

تلك آیات اللہ نتلوھا علیك بالحق (بقرہ / ۲۵۲)

اس آیت کے علاوہ بھی تقریباً ۴ موارد میں نزول قرآن مادہ تلاوت کے ذریعہ بیان کیا گیا

ہے، آل عمران کی ۱۰۸ ویں اور ۵۸ ویں آیتیں، جاثیہ کی چھٹیں اور سورۂ قصص کی تیسری آیت ملاحظہ فرمائیں۔

۶۔ مادۂ قرائت

ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ (قیامت ۱۷، ۱۸)

۷۔ مادۂ اقراء

"سنقرئک فلا تنسیٰ" (سورۂ اعلیٰ: ۶)

۸۔ مادۂ ترتیل

ورتلناہ ترتیلا (سورہ فرقان: ۳۲)

۹۔ مادہ القاء و تلقی

وانک لتلقی القرآن من لدن حکیم علیم (نمل: ۶)
وما کنت ترجوا ان یلقی الیک الکتاب الا رحمۃ من ربک (قصص/۸۶)
اسی طرح سورۂ مزمل کی پانچویں آیت ملاحظہ فرمائیں۔

۱۰۔ مادۂ تعلیم

الرحمٰن علم القرآن (سورہ رحمان: ۱ و ۲)
اسی کے مانند سورۂ نساء کی ۱۱۳ ویں، سورۂ یٰس کی ۶۹ ویں اور سورۂ نجم کی ۵ ویں آیت بھی ہے۔

۱۱۔ مادۂ قصص

نحن نقص علیک احسن القصص (یوسف: ۳)

وکلاً نقص علیک من انباء الرسل مانثبت بہ فؤادک (ہود/۱۲۰)

اسی طرح مندرجہ ذیل آیتیں بھی ہیں:۔

سورۂ انعام: ۵۷ - سورۂ نحل: ۱۱۸ - سورۂ نساء: ۱۶۴ - سورۂ غافر: ۷۸ - سورۂ اعراف: ۱۰۱

سورۂ ہود: ۱۰۰ - سورۂ کہف: ۱۳ و سورہ طٰہٰ: ۹۹۔

مادۂ فرض:

ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد (قصص: ۸۵)

سورۃ انزلناھا وفرضناھا (نور: ۱)

حاصل بحث

یہ تمام کی تمام مذکورہ آیتیں جن میں سے بعض پورے قرآن سے متعلق ہیں اور بعض اس کے بعض حصوں سے مربوط ہیں مختلف تعبیرات کے ساتھ اسی دعوے کو کہ قرآن کریم خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے ثابت کرتی ہیں۔ اسی طرح وہ آیات بھی جن میں قرآن مجید کو کلام اللہ، آیات اللہ، یا اسی کے مانند دوسرے عنوان سے یاد کرتے ہوئے اس کو حق وصدق قرار دیا گیا ہے (جن کا گذشتہ فصلوں میں عناوین مفردہ کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے) اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دوسری آیتیں موجود ہیں جو بڑی صراحت کے ساتھ قرآن کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ

اور سورۂ یونس کی ۳۷ ویں آیت میں اعلان ہوتا ہے:۔

وما کان ھٰذا القرآن ان یفتریٰ من دون اللہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین

جناب شیخ محمود قانصوہ

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

ایام بیض میں روزہ رکھنا مستحب ہے

روایت اہل بیتؑ:

۱ ــ علي بن موسى بن طاووس في (الدروع الواقية) نقلاً عن كتاب تحفة المؤمن تأليف عبدالرحمن بن محمد بن علي الحلواني، عن علي بن أبي طالب(ع). قال: قال رسول الله(ص) أتاني جبرئيل. فقال: قل لعلي: صم من كل شهر ثلاثة أيام (الى أن قال) فقلت: ماهي يا رسول الله (ص) قال: الأيام البيض من كل شهر وهي الثالث عشر والرابع عشر والخامس عشر۱۰۷.ش

۱۔ . . . . حضرت علیؑ بن ابی طالب ناقل ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: جبرئیل میرے پاس پیغام لے کر آئے ہیں کہ میں علی سے کہدوں کہ ہر مہینہ میں تین دن روزہ رکھیں۔ میں نے دریافت کیا، یارسول اللہ یہ تین دن کون سے ایام ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا، ہر مہینہ کے ایام بیض اور یہ تیرھویں، چودھویں، پندرھویں تاریخیں ہیں۔

روایات اہل سنت

۱ ــ أخبرنا أبوالحسين بن بشران العدل ببغداد أنبأنا اسماعيل بن محمد الصفار، حدثنا الحسن بن علي بن عفان، حدثنا ابن نصير، عن فطر بن خليفة، عن يحيى بن سام، عن موسى بن طلحة، عن أبي ذر (رضي الله عنه) قال: أمرنا رسول الله (ص) بصيام ثلاثة أيام البيض ثلاث عشرة واربع عشرة وخمس عشرة۱۰۹. وروى الترمذي نحوه، عن محمود بن غيلان، عن أبي داود، عن شعبة، عن الأعمش، عن يحيى بن بسام مثله۱۱۰. وأخرج النسائي، عن محمد بن عبدالعزيز، عن الفضل بن موسى، عن فطر مثله، وكذا عن عمرو بن يزيد، عن عبدالرحمن، عن شعبة مثل الترمذي۱۱۱.

۱۔ . . . . ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے ہمیں ایام بیض کے تین دن، ۱۳-۱۴-۱۵ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا . . . . . .

۲ ــ وأخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوبكر محمد بن الحسن وأبوسعيد بن أبي عمرو قالوا: حدثنا أبوالعباس الأصم، حدثنا العباس بن محمد، حدثنا روح بن عبادة، حدثنا شعبة. قال: سمعت أنس بن سيرين. قال: سمعت عبدالملك بن المنهال، عن أبيه ــ وكان من أصحاب النبي (ص). قال: كان رسول الله (ص) يأمرنا بصيام أيام البيض الثلاثة ويقول هن صيام الدهر۱۱۲ وأخرجه النسائي، عن محمد بن عبد الأعلى، عن خالد، عن شعبة مثله. وعن محمد بن حاتم، عن حبان، عن عبدالله، عن شعبة مثله۱۱۳. وأخرجه أبوداود، عن محمد بن كثير، عن همام، عن أنس أخي محمد، عن ابن ملحان القيسي، عن أبيه.

۲۔ . . . . صحابی پیغمبرؐ منہال کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا ہمیں ایام بیض کے تین دنوں میں روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے ـــــــ اور فرماتے تھے یہ روزے صیام دہر کے برابر ہیں . . . .

روزہ داؤد مستحب ہے۔

روایات اہل بیتؑ

۱ ــ قال: (والظاهر أنه علي بن موسى بن جعفر بن طاووس في الدروع الواقية)

وروينا من كتاب الصيام عن ابن فضال، عن محمد بن أحمد بن يحيى، عن عاصم بن حميد، عن ابراهيم بن أبي يحيى، عن أبي عبدالله(ع)، عن أبيه: إن رجلا سأل النبي(ص) عن الصوم. فقال: اين أنت من صيام البيض ثلاثة عشر وأربعة عشر وخمسة عشر. فقال: إن بي قوة. فقال أين أنت عن صيام يومين في الجمعة. فقال: ان بي قوة. فقال: اين أنت عن صوم داود(ع) كان يصوم يوماً ويفطر يوما ۱۱۴.

۱۔ . . . . امام جعفر صادقؑ اپنے پدر بزرگوار سے روایت فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے پیغمبرؐ سے روزہ کے متعلق دریافت کیا، پیغمبرؐ نے فرمایا کیا تم ہر مہینہ کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کو ایام بیض کے روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں! رکھ سکتا ہوں، حضرتؐ نے فرمایا ہر ماہ میں دو دن جمعہ کو روزہ رکھو۔ اس نے کہا میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ حضرتؐ نے فرمایا پھر تم روزۂ داؤد رکھو، حضرت داؤد ہر دوسرے دن رکھا کرتے تھے۔

۲ ـ قال: (والظاهر أنه علي بن موسى بن جعفر بن طاووس في الدروع الواقية) ومن كتاب الصيام عن ابن فضال، عن محمد بن عبيد، عن جبارة، عن فرج بن فضالة، عن أبي وهب، عن أبي صدقة الدمشقي، عن ابن عباس. قال: أتاه رجل يسأله عن الصيام. فقال ان كنت تريد صوم داود فانه كان من أعبد الناس (الى أن قال) وقال رسول الله(ص): ان أفضل الصيام صيام أخي داود(ع) كان يصوم يوما ويفطر يوما. (الحديث) ۱۱۵.

۲۔ . . . . . . ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے روزہ سے متعلق سوال کیا، انھوں نے کہا: اگر تم روزہ داؤد رکھنا چاہتے ہو تو حضرت داؤد سب سے زیادہ عبادت گزار بندے تھے، رسول خداؐ کا ارشاد ہے کہ افضل ترین روزہ ہمارے بھائی داؤد کا روزہ ہے، وہ ہر دوسرے دن روزہ رکھتے تھے۔

روایات اہل سنت

۱ ـ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أنبأنا محمد بن يعقوب، حدثنا ابراهيم بن عبدالله، أنبأنا روح بن عبادة، عن شعبة (قال وأنبأنا) محمد بن يعقوب، حدثنا الحسين بن

محمد القباني، حدثنا محمد بن مثنى، حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن زياد بن فياض قال: سمعت أبا عياض، عن عبدالله بن عمرو أن رسول الله (ص) قال: صم يوما ولك أجر مابقي. قال: اني أطيق أكثر من ذلك. قال: صم يومين ولك أجر مابقي قال اني أطيق اكثر من ذلك. قال: صم ثلاثة أيام ولك آجر مابقي. قال اني أطيق أكثر من ذلك قال: صم اربعة ايام ولك اجر ما بقي قال: اني اطيق اكثر من ذالك قال: صم افضل الصيام عند الله صوم داود كان يصوم يوما و يفطر يوما ١١٦. وقريب منه ماروى عن عبدالله بن عمرو بن العاص انه كان يصوم ـــ ذلك وآمره بصيام ثلاثة ايام فقال له: أطيق أكثر فأمره بصيام داود ١١٧. ونحوه ما رواه مسلم، عن أبي الطاهر، عن عبدالله بن وهب، عن يونس، عن ابن شهاب، عن ابن المسيب وأبي سلمة، عن عبدالله بن عمرو ١١٨. ومثله مارواه مسلم، عن بن المثنى مثله وعن ابن أبي شيبة، عن غندر، عن شعبة مثله ١١٩. وروى عبدالرزاق نحوه، عن معمر، عن الزهري، عن ابن المسيب وأبي سلمة، عن عبدالله ١٢٠. وروى البخاري نحوه باسانيد عديدة فراجع ١٢١. وروى النسائي نحوه باسانيد عديدة أيضا ١٢٢. وروى أبوداود نحوه عن الحسن بن علي، عن عبدالرزاق مثل عبدالرزاق ١٢٣.

۱ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبداللہ بن عمرو، ناقل ہیں کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا: ایک دن روزہ رکھو بقیہ دنوں کا اجر بھی تمہیں ملے گا، اس نے کہا میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں، حضرت ؐ نے فرمایا دو دن روزہ رکھو اور بقیہ دنوں کا اجر لو، اس نے کہا مجھ میں اس زیادہ توانائی ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا: تین دن رکھو اور بقیہ کا اجر حاصل کرو، اس نے کہا میں اس سے زیادہ روزے رکھ سکتا ہوں، رسول ؐ خدا نے فرمایا پھر تم خداوند عالم کے نزدیک بہترین روزہ، روزۂ داودؑ رکھو، حضرت داودؑ، ہر دوسرے دن روزہ رکھتے تھے . . . . . .

۲ ــ أخبرنا أبوالحسين علي بن محمد بن عبدالله بن بشران، أنبأنا أبوجعفر محمد بن عمرو الرزاز، حدثنا عبدالملك بن محمد، حدثنا روح، حدثنا ابن جريج، عن عمرو بن دينار، عن عمرو بن أوس، عن عبدالله بن عمرو، قال: قال رسول الله (ص): أحب الصلاة الى الله تعالى صلاة داود كان يرقد شطر الليل ثم يقوم ثلثه بعد شطره ثم يرقد آخره وأحب الصيام الى الله تعالى صيام داود كان يصوم يوما ويفطر يوما ١٢٤. وروى الترمذي نحوه عن هناد، عن وكيع، عن مسعر وسفيان، عن حبيب بن أبي ثابت، عن أبي العباس، عن عبدالله بن عمرو ١٢٥. ورواه مسلم، عن ابن أبي شيبة وزهير بن حرب، عن سفيان، عن عمرو بن دينار مثله وعن محمد بن رافع، عن عبدالرزاق، عن ابن جريج مثله ١٢٦. وأخرجه عبدالرزاق، عن ابن جريج وابن عيينة مثله ١٢٧. وأخرجه ابن

ماجة، عن ابي اسحاق الشافعي، عن سفيان، عن ابن دينار مثله ١٢٨. وأخرجه النسائي، عن قتيبة، عن سفيان مثله ١٢٩. وأخرجه أبوداود، عن ابن حنبل ومحمدبن عيسى ومسدد، عن سفيان. ١٣٠. وروى الحميدي نحوه عن سفيان، عن عمرو بن دينار ١٣١.

۲۔ عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا خداوند عالم کی نظر میں بہترین نماز، نماز داؤد ہے، آپ نصف شب تک سوتے تھے اور شب کے تیسرے حصہ میں عبادت کرتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں پھر سو جاتے تھے اور خداوند تعالیٰ کی نظر میں محبوب ترین روزہ، روزہ داؤد ہے، آپ ہر دوسرے دن روزہ رکھا کرتے تھے . . . .

شادی نہ ہونے کی صورت میں روزہ مستحب ہے

روایت اہل بیت:

١ ـ محمدبن يعقوب، عن محمدبن يحيى، عن محمدبن الحسين، عن يحيى بن عمروبن خليفة الزيات، عن عبدالله بن بكير، عن بعض أصحابنا، عن أحدهما(ع). قال: قال رسول الله(ص): يا معشر الشباب عليكم بالباه فان لم تستطيعوا فعليكم بالصيام فانه وجاءة ١٣٢.

۱۔ . . . . ارشاد رسولؐ خدا ہے اے جوانو! شادی کرو اور اگر شادی کا امکان نہ ہو تو، روزہ رکھو، کیونکہ روزہ شہوت کو تسکین بخشتا ہے۔

روایت اہل سنت:

١ ـ أخبرنا أبومحمد الحسين بن علي بن المؤمل، حدثنا أبوعثمان عمروبن عبدالله البصري، حدثنا أبوأحمد محمدبن عبدالوهاب، أنبأنا يعلى بن عبيد، حدثنا الأعمش، عن عمارة بن عمير، عن عبدالرحمن بن يزيد. قال: قال عبدالله كنا مع رسول الله(ص) شبابا ليس لنا شيء. فقال يا معشر الشباب من استطاع منكم الباه فليتزوج فانه أغض للبصر وأحصن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فان الصوم له وجاءة ١٣٣. وأخرجه البخاري، عن عبدان، عن أبي حمزة، عن الأعمش، عن ابراهيم،

عن علقمة، عن عبدالله مثله وليس فيه (يا معشر الشباب) ١٣٤. وأخرجه النسائي، عن محمودبن غيلان، عن أبي أحمد، عن سفيان، عن الأعمش مثله وكذا عن بشر، عن

محمدبن جعفر، عن شعبة، عن سليمان، عن ابراهيم كالبخاري وعن هارون بن اسحاق، عن المحاربي، عن الأعمش كالبخاري أيضا وزاد مع علقمة (الأسود) وعن هلال بن العلاء، عن أبي، عن علي بن هاشم، عن الأعمش مثل البيهقي ونحوه، عن عمرو بن زرارة، عن اسماعيل، عن يونس، عن أبي معشر، عن ابراهيم، عن علقمة، عن ابن مسعود ١٣٥.

۱۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالرحمٰن بن یزید ناقل ہیں کہ عبداللہ کا بیان ہے، ہم رسول خدا میں حاضر تھے، جوان تھے لیکن ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا، رسول خدا نے ہم لوگوں سے فرمایا: جوانو! تم میں سے جو شخص شادی کرسکتا ہے اسے چاہئے شادی کرے کیونکہ شادی آ اور شرمگاہ کی حفاظت کرتی ہے اور جس کے لئے شادی کا امکان نہ ہو، وہ روزہ رکھے شہوت کو تسکین بخشتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

موسم سرما میں روزہ رکھنا مستحب ہے

روایات اہل بیت ؑ :

١ ــ في معاني الأخبار، عن محمدبن الحسن بن أحمدبن الوليد، عن محمد بن يحيى، عن محمدبن أحمدبن يحيى، عن ابراهيم بن اسحاق النهاوندي، عن محمد بن سليمان الديلمي، عن أبيه، عن أبي عبدالله(ع). قال: سمعته يقول: الشتاء ربيع المؤمن يطول فيه ليله فيستعين به على قيامه ويقصر فيه نهاره فيستعين به على صيامه. و (صفات الشيعة)، عن محمدبن علي ماجيلويه، عن عمه، عن محمدبن علي، عن محمد بن سليمان مثله. وفي (الأمالي)، عن محمدبن الحسن، عن أحمدبن ادريس، عن أحمد بن يحيى مثله ١٣٦. ونقله في البحار، عن الأمالي، عن ابن الوليد، عن أحمدبن ادريس، عن الأشعري، عن النهاوندي مثله. ونقله عن معاني الأخبار بالسند المتقدم ١٣٧.

۱۔۔۔۔۔۔۔ سلیمان دیلمی کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے سنا ہے کہ: موسم سرما مومن کے لئے بہار ہے، اس کی راتیں طویل ہوتی ہیں جس کی مدد سے وہ شب میں عبادت خدا کر سکتا ہے اور دن چھوٹے ہوتے ہیں، جن کے سہارے وہ روزہ رکھ سکتا ہے۔۔۔۔۔۔

٢ ــ محمد بن علي بن الحسين الصدوق. قال: روي عن أبي عبدالله(ع) أنه قال: الصوم في الشتاء هو الغنيمة الباردة. ونحوه ما أرسله أيضا عن رسول الله(ص)١٣٨. ونقله في البحار عن كتاب الامامة والتبصرة، عن الحسن بن حمزة العلوي، عن علي بن محمد بن أبي القاسم، عن أبيه، عن هارون بن مسلم، عن مسعدة بن صدقة، عن الصادق(ع)، عن أبيه(ع)، عن آبائه(ع). قال: قال رسول الله. وساق الحديث ونقله عنه أيضا، عن أحمد بن علي، عن محمد بن الحسن، عن محمد بن الحسن الصفار، عن ابراهيم بن هاشم، عن النوفلي، عن السكوني، عن جعفر بن محمد(ع) مثله باختلاف يسير بالتقديم والتأخير١٣٩.

۲۔۔۔۔۔۔۔ محمد بن علی بن الحسین الصدوق کہتے ہیں کہ امام صادقؑ سے روایت ہے کہ: موسم سرما میں روزہ بلا مشقت غنیمت ہے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، حدثنا ابوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا محمد بن اسحاق، حدثنا أبو الأسود، حدثنا ابن لهيعة، عن دراج أبي السمح، عن أبي الهيثم، عن أبي سعيد الخدري، قال: قال رسول الله(ص): الشتاء ربيع المؤمن قصر نهاره فصام وطال ليله فقام١٤٠.

۱۔۔۔۔۔۔ ابوسعید خدری ناقل ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا: موسم سرما مومن کی بہار ہے، دن چھوٹے ہوتے ہیں، لہٰذا روزہ رکھتا ہے، رات طویل ہوتی ہے، لہٰذا اٹھ کر عبادت کرتا ہے۔

٢ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ وأبوبكر محمدبن محمدبن أحمدبن رجاء الأديب. قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا الحسن بن علي بن عفان العامري، حدثنا زيدبن الحباب، حدثنا سفيان الثوري، عن أبي اسحاق السبيعي، عن نميربن عريب، عن عامربن مسعود. قال: قال رسول الله(ص): الصوم في الشتاء الغنيمة الباردة[١٤١]. ورواه الترمذي، عن محمدبن بشار، عن يحيى بن سعيد، عن سفيان مثله[١٤٢].

٢۔ . . . . عامر بن مسعود راوی ہیں کہ، رسول خداؐ نے فرمایا: موسم سرما میں روزہ بلامشقت غنیمت ہے۔

حواشی

١٠٧ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٢١ ١٠٩ــ البیہقی ج ١ ص ١٩٤ ١١٠ــ الترمذی ج ٣ ص ١٣٤ ١١١ــ النسائی ج ٤ ص ٢٢٣

١١٢ــ البیہقی ج ٤ ص ٢٩٤ ١١٣ــ النسائی ج ٤ ص ٢٢٤ . ولیس فیها ــ انه کان من اصحاب النبیؐ

١١٤ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٢٢ ١١٥ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٢٢ ١١٦ــ البیہقی ج ٤ ص ٣٩٦

١١٧ــ البیہقی ج ٤ ص ٣٩٩ ١١٨ــ مسلم جلد ٢ ص ١٦٣ ١١٩ــ مسلم ج ٣ ص ١٦٦

١٢٠ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٢٩٤ . وابوداود ج ٢ ص ٣٢٢ ١٢١ــ البخاری ج ٣ ص ٤٩ و ٥٠

١٢٢ــ النسائی ج ٤ ص ٢٠٩ و ص ٢١٠ و ص ٢١١ و ص ٢١٢ و ص ٢١٣ و ص ٢١٢ و ص ٢١٥ و ص ٢١٦ و ص ٢١٧

١٢٣ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٢٩٤ وابو داود ج ٢ ص ٣٢٢ ١٢٤ــ البیہقی ج ٤ ص ٣٩٥

١٢٥ــ الترمذی ج ٣ ص ١٤١ ١٢٦ــ مسلم ج ٢ ص ١٦٥ . وفیها اختلاف فی التقدیم والتاخیر۔

١٢٧ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٢٩٥ ١٢٨ــ ابن ماجہ جلد ١ ص ٥٤٦ وفیہ اختلاف فی التقدیم والتاخیر۔

١٢٩ــ النسائی ج ٤ ص ١٩٨ ۔ وفیہ اختلاف فی التقدیم والتاخیر ١٣٠ــ ابوداؤد ج ٢ ص ٣٢٧

١٣١ــ الحمیدی ج ٢ ص ٢٦٨ ١٣٢ــ الوسائل ج ٧ ص ٢٩٩ ١٣٣ــ البیہقی ج ٤ ص ٢٩٦ ۔

١٣٤ــ البخاری ج ٣ ص ٣٣ ١٣٥ــ النسائی ج ٤ ص ١٦٩ و ص ١٧٠ و ص ١٧١ ١٣٦ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٠٣

١٣٧ــ البحار ج ٩٢ طبع ص ٢٤٩ ١٣٨ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٠٢ ١٣٩ــ البحار ج ٩٢ طبع ٢٥٧. البحار ایضاً ص ٢٥٧

١٤٠ــ البیہقی ج ٤ ص ٢٩٧ ١٤١ــ البیہقی ج ٤ ص ٢٩٧

١٤٢ــ الترمذی ج ٣ ص ١٦٣ ۔ وفی لفظ الترمذی اختلاف بالتقدیم والتاخیر

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفت خدا

فقیہ عالیقدر حضرت آیت اللہ العظمیٰ مدظلہ نے کچھ عرصے سے نوجوان نسل کے لئے بعض اہم موضوعات پر مشتمل نہج البلاغہ کے شہپاروں کی تشریح و توضیح کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے پیش نظر مقالہ معرفت خدا کے موضوع پر آپ کے درس کا ترجمہ ہے جس میں مولائے کائنات کے خطبہ نمبر ۱۸۶ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی ساتویں قسط ملاحظہ فرمائیے۔

مقدمہ

میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس خطبہ میں بڑے عمیق فلسفی مسائل بیان کئے ہیں ہماری کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو علم فلسفہ کی اصطلاحوں کو استعمال کئے بغیر مطالب کو ذہنوں تک پہونچا دیا جائے۔ اس لئے کہ معرفت خدا ہمارے تمام عقیدوں کی بنیاد ہے۔ اگر ہم خدا کو پہچان گئے تو ہمارے اخلاق و اعمال بھی مطابق اسلام ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو خدا کی معرفت رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خدا ہمارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور آیہ "ھو معکم اینما کنتم" کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتا ہے وہ کبھی بھی دوسروں پر ظلم و تعدی کرے گا نہ کسی کے حق کو پامال کرے گا اور نہ کبھی ایسے کام کرے گا جو نامناسب ہوں۔

اگر کوئی نامناسب یا برا کام کرنا چاہتا ہے تو اپنے اطراف و جوانب کی طرف نگاہ کرتا ہے کہ کہیں کوئی اس کو دیکھ تو نہیں رہا ہے کہیں کوئی اس کی باتوں سے باخبر تو نہیں ہے کہ یہ چیزیں بعد میں رسوائی

اور شرمندگی کا باعث ہوں ۔ لہٰذا جو انسان اس بات کا راسخ عقیدہ رکھتا ہوگا کہ اس کے تمام اعمال سب سے زیادہ اور سب سے پہلے خدا کے حضور پیش ہوتے ہیں جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے وہ خدا دیکھ لیتا ہے تنہائی کے لمحات میں خدا اس کے ساتھ ہے۔ اسکے تمام اعمال اور سارے نیک و بد کاموں پر ملائکہ موکل ہیں۔ تو ایسا انسان ایسے عقیدہ کے بعد کبھی بھی کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ معرفت خدا اس کے اخلاق، کردار اور گفتار میں اپنا اثر دکھا کر رہے گی۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اپنے خطبوں میں ہمیشہ خدا کا تعارف کراتے ہیں اور ہم کو متنبہ کرتے ہیں کہ خدا ہر حال میں حاضر و ناظر ہے اور ہمارے کاموں پر نگاہ رکھتا ہے۔

اب ہم خطبہ کے دوسرے حصہ کو بیان کر رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:۔

منعتها (منذ) القدمية وحمتها (قد) الازلية وجنبتها (لولا) التكملة -

انہیں (آلات کو) لفظ (منذ) نے قدیم ہونے سے منع کر دیا اور لفظ (قد) نے ہمیشگی سے روک دیا اور لفظ (لولا) نے کامل ہونے سے باز رکھا۔

اس جملہ میں حضرت امیرالمومنین نے فلسفہ اور ادبیات عرب دونوں ہی کو سمو دیا ہے اس جملہ میں دو احتمالات ہیں ہم خدا کی مدد سے دونوں کی تشریح کریں گے اور خواتین و حضرات سے بھرپور توجہ کے طالب ہیں۔

ادبیات عرب کے تین حروف (منذ، قد، لولا) کو حضرت نے یہاں استعمال فرمایا ہے۔

منذ

علماء نحو کا بیان ہے کہ "مذ" اور "منذ" زمانہ کی ابتدا کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے سوال کریں کہ "آپ نے کب سے اپنے والد کی زیارت نہیں کی ہے" تو مثلاً اس کا جواب ہوگا "ما رأیته منذ یوم الجمعه" میں نے ان کو جمعہ سے آج تک نہیں دیکھا یہاں کلمہ منذ ابتدائے زمانہ کو معین کر رہا ہے۔

قد

"قد" جب فعل ماضی پر آتا ہے تو گزرے ہوئے زمانہ کو حال سے قریب کر دیتا ہے ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "قد فعل ماضی پر تحقیق کے لئے آتا ہے" تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ حال سے جتنا نزدیک ہوگا اتنا ہی محقق اور یقینی ہوگا مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ "آپ نے فلاں شخص کو دیکھا ہے ؟" ۔ اگر آپ نے جواب میں فرمایا کہ "رأیتہ" (ہاں) میں نے اس کو دیکھا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے کہ دس سال پہلے آپ نے اس شخص کو دیکھا ہو ۔ لیکن اگر آپ نے جواب میں یہ فرمایا "قد رأیتہ" "میں نے اسے یقیناً دیکھا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی چند دنوں پہلے آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قد ماضی کو حال سے نزدیک کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

لولا

"لولا" پہلے جملہ کے وجود کے سبب دوسرے جملہ کی نفی کے لئے آتا ہے مثلاً آپ کسی کے کمالات کو شمار کرنا چاہیں اس کی تعریف کریں اور آخر میں کہیں کہ (لولا) "اگر یہ صفت بد نہ ہوتی" تو اس جگہ آپ نے تمام کمالات کے باوجود کلمۂ لولا کے ذریعہ اس کے عیب اور نقص کو معین فرمایا نمونہ کے طور پر اس قسم کا ایک جملہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔ مثلاً زید بہت اچھا آدمی ہے ، پڑھا لکھا ہے ، صاحب فضل و کمال ہے "لولا حاسد ہے" ۔ یہ لولا جو (اگر ایسا نہ ہوتا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی تمام مذکورہ کمالات کی نفی لولا کے ذریعہ کی جاتی ہے

ان تینوں کلموں (منذ ، قد ، لولا) کا استعمال ہم انسانوں کے بارے میں تو صحیح ہے لیکن خدا کے بارے میں درست نہیں ہے اس کے لئے کہ خدا کے لئے ابتدائے زمانہ نہیں ہے کہ کلمہ "منذ" کو استعمال کیا جائے ، یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا مثلاً دس کروڑ سال سے موجود ہے ! اس لئے کہ خدا زمانہ ہی نہیں رکھتا ۔ اسی طرح کلمہ "قد" کا استعمال بھی درست نہیں ہے ۔ اس لئے کہ یہ کلمہ بھی زمانہ ہی سے تعلق رکھتا ہے ماضی کو حال سے قریب کرنے کے لئے اس کلمہ کو استعمال کیا جاتا ہے ۔ کلمۂ "لولا" بھی خدا کے لئے صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ہر کمال خدا ہی کی ذات کے لئے

ہے کوئی عیب اس کی ذات میں متصور ہی نہیں ہے کہ ہم اس کے لئے کہہ دیں کہ وہ تمام کمالات کا حامل ہوتا اگر ___ فلاں عیب نہ ہوتا۔

دو احتمال

اب ہم ان دو احتمالات کو بیان کریں گے جن کا تذکرہ شارحین نہج البلاغہ نے کیا ہے۔

۱۔ ایک احتمال تو یہ ہے کہ "ھا" کلمۂ "منعتھا" میں آلات و وسائل ادراک کی طرف پلٹتا ہے۔ اس صورت میں "منذ" فاعل "ھا" اس کا مفعول اوّل اور "القدمیۃ" مفعول دوم ہوگا۔ اس وقت جملہ "منعتھا منذ القدمیۃ" کا مطلب یہ ہوگا کہ کلمۂ لولا، قد اور منذ کا مفہوم آلات ادراک کے لئے متصور ہے ان کا استعمال ہم انسانوں کے لئے درست ہے مثلاً اگر یہ سوال ہو کہ آپ کب پیدا ہوئے؟ تو جواب ہوگا کہ منذ اربعین سنۃ ___ مثلاً ہم چالیس سال پہلے پیدا ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم قدیم نہیں ہیں محتاج زمانہ ہیں کیونکہ منذ وہ حرف ہے جو زمانہ کو بیان کرتا ہے اس طرح حضرت کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ "منذ" نے ہم کو قدیم ہونے سے روک دیا اسی طرح بقیہ دو کلموں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

کلمۂ "قد" بھی ہم انسانوں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور وہ اس لئے کہ ہم پابند و محتاج زمانہ ہیں ___ لہٰذا کلمۂ "قد" نے ہمارے آلاتِ ادراک (حواس خمسہ) کو ازلیت سے روک دیا ہے یعنی ہم ازلی نہیں ہیں اس لئے کہ ہمارا آغاز ہے اور خدا کے لئے آغاز کا تصوّر ہی نہیں ہو سکتا۔

اور کلمۂ لولا نے ہمارے آلات ادراکیہ کو کامل ہونے سے روک دیا ہے چونکہ ہمارے اندر عیوب و نقائص پائے جاتے ہیں اس لئے ہم کامل نہیں ہیں۔ جو ذات ہر عیب سے پاک ہر نقص سے مبرّا اور کامل مطلق ہے وہ خدا کی مقدس ذات ہے بنابرایں اس کلمۂ لولا نے ہم کو کامل ہونے سے روک دیا ہے جو ہمارے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لہٰذا تینوں کلمے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہم ازلی نہیں ہیں کامل نہیں ہیں۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ہم جملہ کے معنی کو خدا کے سلسلہ میں بیان کریں یعنی "القدمیۃ" "الازلیۃ" اور "التکملۃ" کو فعل کا فاعل مان لیں اور "منذ" ___ "قد" ___ اور "لولا"

کو مفعول قرار دیں اس وقت حضرت کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ — خدا کے قدیم ہونے نے ہم کو اس کی ذات مقدس کے بارے میں کلمہ منذ کو استعمال کرنے سے روک دیا ہے"— ۔ چونکہ خدا قدیم ہے لہٰذا اس کی ذات کے لئے کلمۂ "منذ" کا استعمال روا نہیں ہے اور خدا کی ازلیت نے ہم کو کلمۂ "قد" کے استعمال سے منع کر دیا ہے ۔ اس کے کمال نے اس کی ذات کے سلسلہ میں کلمہ "لولا" کے استعمال سے روک دیا ہے ۔ خلاصہ یہ کہ خدا کے قدیم، ازلی اور کامل ہونے نے ہم کو ان تینوں کلموں کے استعمال سے روک دیا ہے ۔

بنابرایں مقصود امیرالمؤمنین یہ ہے کہ چونکہ ان میں سے ایک کلمہ ابتدائے زمانہ کے لئے دوسرا گزرے ہوئے زمانہ کو حال سے قریب کرنے کے لئے اور تیسرا کلمہ عیب اور نقص کی نشان دہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے ان تینوں کلموں کو خدا کیلئے استعمال کرنا درست نہیں ہے ہاں ہم انسانوں کے لئے درست ہے اس لئے کہ ہم قدیم نہیں ہیں ہمارا آغاز ہے اور ہر طرح کا عیب بھی ہمارے اندر پایا جاتا ہے لیکن خدا نہ زمانہ رکھتا ہے نہ حادث ہے اور نہ کوئی عیب اور نقص اس کے اندر پایا جاتا ہے ۔

بہا تجلی صانعہا للمعقول

چونکہ خدا اعضاء و جوارح اور حواس و مشاعر کا خالق ہے اس لئے انہیں آلات کے ذریعہ وہ عقلوں کے سامنے جلوہ گر ہوا ہے ۔

آلات ادراک، ذریعہ معرفت خدا

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ آلات ادراک حواس خمسہ (ذائقہ، شامہ، باصرہ، سامعہ، لامسہ) ہیں اور یہ حواس خدا کا ادراک نہیں کر سکتے اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے جو اسے دیکھا یا سنا جا سکے لیکن انہی حواس میں غور و فکر کرنے سے ہم خدا کو پہچان سکتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اگر ہم آنکھوں کی بناوٹ اور اس میں پوشیدہ لطیف اور باریک کاریگری پر غور کریں تو پتہ چل جائے گا کہ بڑے بڑے علماء فیزیکس PHYSIQUE نے انتھک تحقیق و جستجو کے بعد جس کاریگری اور باریکی کا ثبوت خوردبین اور دوربین کے بنانے میں دیا ہے وہ ساری فنی باریکیاں آنکھوں میں موجود ہیں صرف انسان کی آنکھوں میں نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی چیونٹی کی کی آنکھوں

میں بھی وہ تمام باریکیاں پائی جاتی ہیں ہم ان ہی آنکھوں سے عالم کی وسعتوں، دنیا میں موجود چیزوں اور مخلوقات خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں لہٰذا باوجودیکہ ہم ان آنکھوں سے خدا کو درک نہیں کر سکتے لیکن آنکھوں کی بناوٹ میں غور وفکر کرنا خدا کی معرفت کا موجب ہے صرف آنکھیں ہی خدا کی معرفت نہیں عطا کرتیں بلکہ عالم کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی نشانیوں نیز خود انسان کے نفس میں غور وفکر کرنا معرفت خدا کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ انسان اپنی عقل کے سہارے یہ سمجھ جاتا ہے کہ کوئی ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اور خالق ہے۔ خداوند عالم خود قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: "سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم" ہم دنیا میں اور خود ان کے نفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔

اگر حقیقت بین نگاہوں سے صرف آنکھوں کی بناوٹ پر غور کر لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اندھے اور بے شعور ذروں (ایٹم) میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی بنانے والے کی مدد کے باہم مل کر حادثاتی اور اتفاقی طور پر آنکھوں کو ایجاد کر دیں پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس عالم کے پس پشت کوئی صاحب قدرت ہاتھ ہے جس نے نظام عالم کو زیور وجود سے آراستہ کیا ہے اور یہ سارا عالم ایک لامتناہی صاحب ارادہ و علم وقدرت ہستی سے وابستہ ہے۔

اسی وجہ سے حضرت نے فرمایا کہ ان آلات ادراک کے ذریعہ جو بہت ہی چھوٹے اور باریک ہیں خدا کو پہچانا جا سکتا ہے وہ ذات نہیں کے توسط سے ہمارے لئے آشکار ہوتی ہے۔

وبھا امتنع عن نظر العیون

انہیں آلات کی وجہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کا آنکھوں سے دکھائی دینا محال ہے۔

موجودات عالم چونکہ جسم اور محدود ہیں اس لئے آنکھیں انہیں دیکھ لیتی ہیں لیکن ان موجودات کا خالق محدود نہیں ہو سکتا اسلئے ہم اس کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ہم ان ہی آنکھوں کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اجسام محدود ہیں مگر ان اجسام کا خالق محدود نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر وہ بھی محدود ہو تو ایک دوسرے پیدا کرنے والے کی ضرورت ہوگی، جو اسے پیدا کر سکے۔

بنابرایں ان ہی آلات ادراک سے (جن میں سے آنکھ بھی ہے) ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو آنکھوں کی مدد سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ گویا حضرت یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ یہ آلات خدا کو درک نہیں کر سکتے لیکن تم کو مایوس نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ انہیں آلات کی مدد سے عقل تمہارے خالق کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

شہید آیت اللہ بہشتی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

حج اور قرآن

حج اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں موسم حج کا عظیم اجتماع عالم اسلام کا اہم ترین اجتماع ہے۔ اس اجتماع کی اہمیت و جاذبیت نے بہت سے اسلامی محققین کو تحقیق و تحریر، بحث و گفتگو کے لئے اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ کیوں کہ حج کی یہ اجتماعی عبادت ہر دور میں اہل نظر کو انفرادی و اجتماعی طور پر دعوت فکر و نظر دیتی رہی ہے۔

زیر نظر تحریر آیت اللہ شہید بہشتی اعلی اللہ مقامہ کی سورۂ بقرہ کی آیات حج سے متعلق منظم تفسیری بحث ہے جسے آپ نے ۱۳۵۱ ـــ ۱۳۵۲ ہجری شمسی مطابق ۱۹۷۲ - ۱۹۷۳ عیسوی میں یعنی ایران میں اسلامی انقلاب رونما ہونے سے پہلے صاحبان ذوق کے روبرو پیش فرمایا تھا۔

یہ تحریر اس عہد کے سماج اور معاشرہ پر ان کی گہری نگاہ اور کامل بصیرت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ برسوں بعد آج بھی اس مضمون میں ان کے افکار و ارشادات کی تازگی محسوس کی جا سکتی ہے۔

آیات حج کا ترجمہ

حج و عمرہ کو خدا کی رضا اور اس کی خاطر بجا لاؤ۔ لیکن اگر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اپنی جگہ پر - تا حد امکان

قربانی کا فریضہ انجام دو۔ (اور احرام کھول دو۔ تاکہ تمہارا حج اسی منزل پر تمام ہو جائے) اور (اگر تم حج کو جاری رکھے ہوئے ہو تو) اس وقت تک اپنے بال نہ تراشو جب تک تمہاری قربانی اپنی منزل تک نہ پہنچ جائے (اور قربانی سے پہلے اپنے ——— سر کے بال نہ تراشو) لیکن اگر کوئی شخص بیمار ہے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہے تو (اسے چھوٹ ہے کہ وہ سر نہ تراشے اور) اس کے بدلے میں روزہ، صدقہ یا قربانی کی صورت میں کفارہ ادا کردے (ان دنوں کا کفارہ جن میں تم امن و سکون سے رہ رہے ہو) لیکن اگر ممکن ہو تو حج کو مکمل کرو۔ جو شخص حج کو حج تمتع کی شکل میں بجالا رہا ہے یعنی عمرہ بجالا رہا ہے۔ ساتھ ہی چاہتا ہے کہ اسے حج سے بھی ملادے تو اگر اسے میسر ہو تو ایک قربانی حج کے لئے بھی رکھ چھوڑے اور اگر اس کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے (مل نہیں رہا ہے یا وہ خرید نہیں سکتا) تو وہ تین روز حج کے درمیان اور سات روز جب وہ اپنے گھر واپس ہو، کل ملا کر کامل دس روز روزے رکھے۔ یہ حکم (فطری طور سے) اس شخص کے لئے ہے جس کا گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہو (اور وہ اس علاقہ کا رہنے والا یا اہل مکہ میں سے نہ ہو) خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ خدا کا عذاب شدید اور سخت ہے۔

حج، معین مہینوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص حج کا ارادہ کرے وہ جان لے کہ جنسی استفادہ، جھوٹ، فسق و فجور، گناہ، مجادلہ (یا قسم کھانا) حج میں منع ہے اور ہر وہ نیک کام جو تم انجام دیتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔ زاد سفر مہیا کرو کہ بہترین زاد سفر تقویٰ ہے اور اے صاحبان فہم و خرد میرا تقویٰ اختیار کرو۔

اگر تم حج کے سفر میں اپنے پروردگار کی بخشش اور عطا کی جستجو میں بھی رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مراسم حج میں) جب تم عرفات سے چل کر مشعر حرام کے نزدیک پہنچو تو خدا کو یاد کرو (اور ذکر خدا میں مشغول ہو جاؤ) خدا کو یاد کرتے رہو جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت فرمائی جبکہ تم اس کے پہلے گمراہ تھے۔

(اس کے علاوہ تم) وہاں سے جس جگہ سے تمام افراد روانہ ہوتے ہیں (منیٰ

کی طرف اچل پڑو اور خدا سے اپنے گناہوں کے سلسلہ میں مغفرت کی دعا کرو کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اور جب تم حج کے تمام اعمال انجام دے لو تو اپنے خدا کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے آباء و اجداد کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بڑھ کر اپنے خدا کو یاد کرو۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے میرے خدا ہمیں اسی دنیا میں تمام چیزیں یا نعمتیں عنایت فرما دے (یعنی ہم جزا کے طور پر اپنا حصہ اسی دنیا میں چاہتے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت میں اپنا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔

لیکن ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو یہ دعا کرتا ہے کہ: خدایا دنیا میں بھی ہمیں بہتر زندگی عطا فرما اور آخرت میں بھی اپنے الطاف سے محروم نہ رکھ اور ہمیں دوزخ (اور عذاب آتش) سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ انہوں نے خود سے حاصل کیا ہے اس سے بھی بیش قیمت حصہ پائیں گے اور خدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ (ان مراسم کی انجام دہی کے بعد) بھی مخصوص دنوں میں خدا کی یاد میں مشغول رہو۔ اگر کوئی شخص جلدی کر بیٹھے اور دو ہی روز میں (منیٰ سے مکہ کی طرف پلٹ آئے) تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی تیسرے دن ٹھہرا رہے اور تاخیر سے آئے جبکہ تقویٰ و پرہیزگاری اس کے پیش نظر رہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور جان لو کہ تم سب اسی (خدا) کی جانب پلٹائے جاؤ گے۔

ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ

یہ سورہ بقرہ کی ۱۹۶ سے ۲۰۳ آیتوں کا ترجمہ تھا جس میں کہیں کہیں مختصر توضیح بھی کی گئی ہے جو حضرات حج سے مشرف ہو چکے ہیں یا مناسک حج سے واقفیت رکھتے ہیں وہ ان آیتوں سے ایک حد تک آشنا ہیں لیکن جو افراد اس سلسلہ میں معلومات نہیں رکھتے انھیں ان آیتوں کے سمجھنے میں کافی وضاحت کی ضرورت ہوگی۔ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ خدا کے حکم سے جناب اسماعیلؑ اور جناب ہاجرہ کو فلسطین میں واقع اپنے گھر سے لیکر نکلے۔ جناب

ابراھیمؑ کا واقعہ جسے آپ بارہا سن چکے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے "سارا" نام کی خاتون سے شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ اس زمانہ میں چونکہ اس معاشرہ میں اولاد اور خصوصاً اولاد نرینہ کی بڑی اہمیت تھی جیسا کہ آج بھی ہمارے موجودہ معاشرہ میں خاندانی روابط کے استحکام میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ جناب "سارا" نے غور کیا کہ میں تو بہرحال صاحب اولاد نہ ہو سکوں گی لہٰذا اپنی کنیز کو جن کا نام "ھاجرہ" تھا اپنے شوہر ابراھیمؑ سے بیاہ دوں تاکہ اس کے ذریعہ ابراھیم کی ذریت پروان چڑھے۔ "ھاجرہ" سے جناب ابراہیمؑ کے یہاں ایک فرزند متولد ہوا جس کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا۔ چنانچہ فطرتاً بچہ کی پیدائش کے بعد "سارا" اور "ھاجرہ" کے انداز میں فرق آگیا۔ اب وہ پہلے جیسی بات نہ تھی۔ پہلے ھاجرہ ایک خادمہ کی حیثیت سے اس گھر میں رہتی تھیں اور اب زوجہ کی حیثیت سے اپنے شوہر کے گھر میں رہ رہی تھیں اور وہ بھی ایک فضیلت و امتیاز کے ساتھ یعنی صاحب اولاد بیوی اور بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے۔ لہٰذا "سارا" کو احساس ہوتا تھا کہ ھاجرہ اب پہلے جیسی نہیں رہیں۔ رفتہ رفتہ سارا کے لیے ھاجرہ کا وجود ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی بیماری اور اذیت ہے جسے کم ہی خواتین برداشت کر پاتی ہیں۔

جب ابراھیمؑ نے یہ دیکھا کہ ھاجرہ اور اسماعیل کا یہاں رہنا ان کی گھریلو زندگی کے سکون و آرام کو درہم و برہم کر دے گا۔ تو آپ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے لگے اور قرآن کریم کے مطابق، خداوند عالم نے انہیں یہ حکم دیا کہ اسماعیل اور ھاجرہ کو ہمیشہ کے لیے سرزمین فلسطین سے دور کہیں اور پہنچا آئیں۔

یہاں توریت میں ایک ایسے علاقہ کا نام ذکر کیا گیا ہے، جس کی تعیین میں جغرافیائی اعتبار سے بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت توریت سے سروکار نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیات سے جو بات معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ جناب ابراھیمؑ، اسماعیل و ھاجرہ کو مکہ کی سرزمین پر لے کر آئے۔ اس وقت وہاں چند بدو عرب خانوادے ایک مختصری آبادی کی صورت میں رہ رہے تھے۔ مکہ اس وقت نہ تو ایک شہر کی صورت میں آباد تھا اور نہ ایک اچھی خاصی آبادی کی کوئی شکل ہی تھی۔ کیونکہ وہاں زندگی کے امکانات بہت ہی محدود تھے۔ آج بھی شہر مکہ، حجاز کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں بے آب و گیاہ، اجاڑ اور خشک شہر ہے۔ اگرچہ گذشتہ چند برسوں میں اسکی حالت قدرے سدھر گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر مدینہ سے اس کا موازنہ کیا جائے تو مکہ ایک بے آب و گیاہ خشک شہر نظر آئے گا۔ اگرچہ مسجد حرام سے سات سو میٹر کے فاصلہ پر موجودہ وسائل کے تحت کچھ شجر کاری اور ہریالی پیدا کی گئی ہے پھر بھی مکہ کو ایک خشک اور بے شجر شہر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اس کے بہ نسبت طائف یا مدینہ میں پانی، سبزے، باغات اور کھیتیاں ان علاقوں کی شادابی کا ثبوت دیتے ہیں۔
مختصر یہ کہ اس وقت مکہ میں جانوروں کو پالنے یا کھیتی کرنے کے امکانات بہت ہی کم تھے جس کے نتیجہ میں وہاں
زندگی دشوار تھی۔

بنائے کعبہ

جناب ابراہیمؑ نے جناب ہاجرہ و اسماعیل کو ایسی ہی ویران اور اجاڑ جگہ پر لاکر بسا یا۔ اس کے بعد
قرآن کریم میں اس سلسلہ میں مزید وضاحت نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو خداوند عالم کی طرف سے
یہ حکم ہوا کہ وہ دونوں مل کر اس کی عبادت کرنے والوں کے لئے ایک گھر تعمیر کریں۔
توریت بھی اگرچہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ وضاحت نہیں دیتی لیکن اس کی شرحوں و تفسیروں اور
بنی اسرائیل کی دوسری تاریخی کتابوں میں اس پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تاریخی
حیثیت روشن اور مسلّم نہیں ہے۔ لہٰذا ان مصادر سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں بھی قرآن سے استفادہ
کرتے ہیں جو سند کے اعتبار سے قطعی و یقینی حیثیت کا حامل ہے۔ بہرحال اسماعیل اسی سرزمین مکہ میں زندگی
گزارتے ہوئے منزل شباب کو پہنچے اور دونوں باپ بیٹے کو خدا کی عبادت کے لئے اللہ کی جانب سے ایک گھر
بنانے کا حکم ملا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خدا کا یہ گھر تعمیر کے سادہ ترین آلات و وسائل کے ذریعہ بنایا جاتا ہے
اور بلا کسی تزک بھڑک اور شان و شوکت کے ناتراشیدہ پتھروں کو تلے اوپر رکھ کر صرف قدآدم تک ایک
چہار دیواری کھینچ دی جاتی ہے تاکہ اللہ کی عبادت کے لئے ایک جگہ معین ہو سکے۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن
کہتا ہے:۔

"جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اس گھر کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے تو ان کے لبوں پر یہ دعا
تھی کہ خدایا اس جگہ، اس گھر اور اس سرزمین کو ہمارے فرزندوں کی اقامت گاہ قرار
دے اور زندگی بسر کرنے کے امکانات ان کے لئے فراواں کر دے اور ہمارے فرزندوں
کو اس کی توفیق عطا فرما کہ وہ خدا پرست طیب و طاہر، حق کے بندے اور حق کی راہ میں
زندگی گزارنے والے ہوں اور ہمیں بھی یہ حکم صادر فرما کہ ہم تیری عبادت و پرستش کے
قانون کے تحت کون سا عمل بجا لائیں؟ اعمال و عبادات اور اس کے طریقوں کے سلسلہ میں

ہماری رہنمائی فرما۔ (بقرہ، آیات ۱۲۷ــــ۱۲۸)

اس غیر مرئی خدا کی عبادت و پرستش، پاکیزگی و صفائے قلب اور اس کی عظمت کی مناسبت سے ہونی ہے۔ وہ خدا جسے ہم نہیں دیکھتے اور جس کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ سب سے بزرگ و برتر ، یہاں تک کہ ہمارے قیاس و خیال اور وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے ایسے خدا کی عبادت اور اس عبادت لور وطریقہ، بت پرستی، اشخاص پرستی، بودھوں کے طرز پرستش، آفتاب و ماہتاب و ستاروں کی پرستش یا بت وچوب وسنگ کی پرستش سے بہرحال فرق رکھتا ہے۔ اگرچہ بت پرستوں نے بھی بتوں کی پرستش بادت کے لئے مخصوص رسمیں، ترانے، آہنگ اور بتوں کی تعظیم و تکریم کے لئے مخصوص تکلفات وضع یہ کیے ہیں۔ نیز ان کے آئین میں کسی شخص کو بھی اسکی اجازت نہیں ہے کہ جس کا جس طرح جی چاہے بتوں کی ستش کرے۔ لیکن خدا کی عبادت کا مسئلہ اس سے کہیں بالاتر اور اہم ہے اور وہ یہ کہ ہم کیا کریں کہ خدا کے لئے ہماری دت بت پرستی کی شکل اختیار نہ کرنے پائے؟ یہ بات بہت اہم ہے یہاں واقعاً کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ جس طرح چاہے خدا کی عبادت کرے۔

خدا کی عبادت اس کی معرفت کی روح سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں فلاں عمل خدا کی رضا کے لئے یا اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے صرف خداپرستی کے عنوان سے انجام دے رہا ہوں، لہٰذا ب مجھ پر کوئی تنقید نہیں کرسکتا، تو ہم اس سے یہ کہیں گے کہ خدا کی عبادت کا طور وطریقہ خود الٰہی تعلیمات سے حاصل یا چاہیے۔ خود ساختہ خداپرستی کجروی اور گمراہی کا سبب بنتی ہے، کیونکہ اس طرح خدا کا تقرب حاصل کرنا غلط ہے اور اسلام کے خداشناسی اور عبادت کے تصور سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ بہرحال جناب ابراہیمؑ و سماعیلؑ نے خدا کی بارگاہ میں یہ درخواست کی کہ اے خدا تو اپنی عبادت کے طرز و آئین کو ہمارے لئے خود بیان فرما دے۔[1] س طرح ایک گھر کی تعمیر کی جاتی ہے جو رفتہ رفتہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت و بندگی کرنے والوں کے لئے اجتماع کا مرکز بن جاتا ہے اور دھیرے دھیرے وحیٔ الٰہی کے فرمان کے مطابق جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اس گھر میں خود پنے لئے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے خدا کی عبادت کے طریقے معین و مقرر فرماتے جاتے ہیں کہ لوگو! اس طرح حج کے اعمال بجالاؤ اور خدا کی عبادت کے مراتب و مدارج کو محفوظ رکھو۔

---

[1] سورۂ بقرہ / آیت ۱۲۸

حج کے نام پر خرافات و توہمات

چونکہ کوئی شئی بھی زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہی، لہٰذا یہ احکام و قوانین عبادت بھی دیگر ہاتھوں سے نہ بچ سکے۔ ابھی کچھ دن نہ گزرے تھے کہ جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے ذریعہ مقرر کردہ خدا پرستی کے مناسک و قوانین میں چند توہمات و خرافات کا اضافہ بھی ہوگیا اور کچھ مزید ایام گزرنے کے بعد وہ سادہ اور غیر مزین گھر جو ہر عیب و نقص سے پاک خدا کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا ایک بڑے بت خانہ میں تبدیل ہوگیا اور حج کے وہ اعمال و مناسک جو خدا کی عبادت کے عنوان سے انجام دئے جاتے تھے، حج کے نام پر فقط توہمات و خرافات کا پلندہ بن گئے۔ اب یہ حج خانۂ خدا کا حج نہیں تھا بلکہ ایک بڑے بت خانہ کا حج تھا۔

حج کے اعمال و مناسک میں یہ فرض تھا کہ جو شخص بھی عبادت گزاروں کے اس اجتماع میں چند روز کے لئے شرکت کرنے مکہ معظمہ آئے وہ شان و شوکت کے اظہار کے لئے لباس فاخرہ پہن کر نہ آئے اور اس جگہ اس کا لباس اور اس کے شب و روز دوسروں کے لئے اپنے مال و دولت، جاہ و جلال، بزرگی و عظمت کی نمائش نہ بنیں، بلکہ وہ سادگی کو اپنا شعار بنائے لیکن مرور ایام سے یہ مفہوم اس قدر تبدیل ہوا کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا، اظہار تجمل و شان و شوکت سے روکے جانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ لباس ہی نہ پہنیں بلکہ ایک دم مادر زاد برہنہ ہو کر یہاں آئیں اور اسی حالت میں خانۂ کعبہ کا طواف کریں۔ چنانچہ تھوڑے وقفہ کے لئے تجمل اور شان و شوکت سے روکے جانے کا مطلب یہ نکال لیا گیا کہ برہنہ طواف کرنا چاہئے اور تماشا یہ کہ اس کی توجیہ بھی با آسانی یہ کی جا سکتی ہے کہ چونکہ یہ ایسا با عظمت مقام ہے جہاں ہر شخص کو اپنے آپ سے بے پرواہ و غافل ہو کر فقط خدا کو یاد کرنا چاہئے اور جب انسان اپنے آپ سے غافل ہوجائے تو وہ اپنے اردگرد سے بھی غافل ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے چلنے والا انسان ہے یا جانور؟ لباس پہنے ہے یا برہنہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس غلط نظریہ کی توجیہ کتنی آسانی سے کردی گئی اور وہ بھی کس قدر عالی اور پُر معرفت توجیہ۔!

اتفاق سے دین کی صحیح شناخت کے سلسلہ میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ہم اس طرح کی توجیہات کے ذریعہ دین کی حقیقت کو پہچاننا چاہیں تو آسانی سے اسے صحیح یا غلط ہر رنگ میں ڈھال سکتے ہیں۔ میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ دو متضاد مطالب کے سلسلہ میں ایک سطح کا ذہن رکھنے والے افراد کے دو الگ الگ مجمع میں ایسی دلچسپ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ دونوں گروہ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ کیا اچھی اور صحیح بات کہی گئی ہے لیکن جب ان دونوں گروہ کے افراد آپس میں ملتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

کہ جس بات کو انھوں نے ایک خاص آئیڈیالوجی اور ایک طرز فکر کے تحت صحیح تسلیم کیا تھا وہ اس کی ایک دم ضد اور الٹی بات ہے جسے ان کے دوسرے رفیقوں نے ایک الگ فکری بنیاد کے تحت صحیح مانا ہے۔ کیونکہ درحقیقت یہ توجیہیں غلط اور گمراہ کنندہ ذوق و سلیقہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی لئے اسلام میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ نہ صرف دین کے معاملے میں بلکہ مجموعی طور سے اصول زندگی کے انتخاب کے سلسلہ میں مسلمات اور مستحکم افکار و نظریات پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور حتی الامکان ذوق و سلیقہ اور ظن و گمان سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اگر صرف ظنی و ذوقی توجیہات سے کام لیا جائے تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دو متضاد باتوں کو ایک ہی گروہ کے درمیان صرف چندماہ کے فاصلہ سے ایسی دلچسپ توجیہ کے ساتھ بیان کروں کہ گذشتہ تقریر پر واہ واہ کرنے والے افراد اس تقریر پر بھی واہ واہ کہہ اٹھیں اور اس سے غافل ہو جائیں کہ ابھی چند ماہ پہلے میں اس کی ایک دم الٹی تصویر پیش کر چکا ہوں۔

ہمارے زمانہ کے جوشیلے اجتماعات کا حال بھی یہی ہے کہ لوگ جذبات و احساسات سے متاثر عوام کو جذباتی اور ہیجان انگیز تقریروں کے ذریعہ ادھر ادھر گھماتے پھرتے ہیں اور وہ بیچارے تھوڑے ہی وقفہ کے فاصلہ سے ایک دوسرے کی ایک دم متضاد باتوں پر کبھی زندہ باد اور کبھی مردہ باد کا شور بلند کرتے رہتے ہیں۔ یہی ناپختہ فکری کی نشانی ہے۔ لہٰذا ان کی محکم اور استوار زندگی کے لئے انسانی معاشرہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اسے صحیح انداز فکر کا سلیقہ سکھایا جائے اور نہ صرف یہ سلیقہ انھیں سکھایا جائے بلکہ اسی نہج پر ان کی تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ ہمیشہ صحیح ڈھنگ سے سوچنے اور فکر کرنے کے عادی ہو جائیں۔

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے ان مذکورہ آیات کے ذیل میں "یا اولی الالباب" یعنی "اے صاحبان خرد" کی قید کے ساتھ انسان کو مخاطب کیا ہے، وہ اس لئے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ صحیح و استوار فکر کو بروئے کار لائے۔ کیوں کہ یہی تمام مسائل کے حل کی کلید ہے۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اگر پیغمبر خدا و علی مرتضیٰ دس ہزار سال تک اس دنیا میں تشریف رکھتے اور اتنی مدت تک تبلیغ کے دوران ان کا سابقہ بے وقوفوں اور ناسمجھ افراد سے پڑتا تو کیا وہ خطرات ہدایت کا کوئی کام انجام دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرم کی مکہ کی تیرہ سالہ تبلیغی زندگی میں سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ دین کے لئے پورے طور سے آمادہ افراد کو پہلے فکری طور سے کامل و مستحکم بنایا جائے تاکہ یہ لوگ اس تحریک کے لئے ڈھانچے کا کام دے سکیں اس طرح یہ تحریک آنے والے دنوں میں بھی عمومی طور سے بالغ نظری اور فکری رشد و کمال

کی فضا قائم کر سکے۔

مناسک حج میں تحریف

بہر حال لوگوں نے جناب ابراہیمؑ کے بعد حج کے مراسم میں بڑی تحریفیں کر ڈالیں۔ مقصد یہ تھا کہ جو شخص بھی حج کے ارادے سے خدا کے گھر کی طرف جائے اسے چاہیئے کہ ان چند دنوں کے لئے اپنی بزرگی و برتری کو فراموش کر دے تاکہ سب کے سب وہاں یکساں ہو جائیں لیکن اس کی مضحکہ خیز توجیہ یہ کی گئی کہ اس سے بہتر یکسانیت کی اور کون سی صورت ہو گی کہ سب برہنہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس میں مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عورتیں رات کی تاریکی میں برہنہ ہو کر طواف کرتی تھیں اور مرد دن کی روشنی میں دندنا کر طواف کرتے تھے۔ ان روز افزوں انحرافات کے علاوہ بھی بہت سی تحریفیں ان دنوں رونما تھیں، ان ہی حج کے مراسم میں جبکہ تمام لوگ اپنے سارے امتیازات ختم کرنے کے لئے برہنہ طواف کرتے تھے، قریش اور مکہ کے دوسرے ممتاز افراد نے حج کے موقع پر مراسم کی ادائیگی میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے ممتاز اور جدا کر رکھا تھا۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو صحرائے "عرفات" میں قیام کرتے تھے اور عصر کے وقت یعنی غروب آفتاب کے قریب "منیٰ" کی طرف کوچ کرتے تھے لوگ شب عرفہ وہاں جاتے تھے اور شب و روز "عرفہ" وہیں قیام کرتے تھے۔ جو لوگ شب میں نہیں پہنچ پاتے تھے دن میں آ کر ان لوگوں سے مل جاتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ غروب آفتاب کے وقت منیٰ کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ لیکن قریش کے ممتاز افراد کہتے تھے کہ ہمارا طریقہ عام لوگوں سے الگ ہے۔ ہم پہلے ہی سے وادی "مشعر الحرام" کی حدود میں جا کر وہیں اقامت کریں گے اور وہاں سے "مکہ" کی طرف واپس روانہ ہو جائیں گے اور وہ بھی ایک خاص وضع اور امتیاز کے ساتھ اور اس کی توجیہ بھی اس طرح کرتے رہے ہوں گے کہ چونکہ ہم گروہ قریش، خانۂ خدا کے ان تمام مہمانوں کے میزبان ہیں لہٰذا ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم عام لوگوں کی نسبت مکہ سے ایک منزل نزدیک رہیں تاکہ حاجیوں کے استقبال کے لئے ان سے پہلے مکہ پہنچ جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی توجیہات کے ذریعہ تو تقریباً سارے اعمال حج کا قصہ پاک کیا جا سکتا تھا، اسی لئے مناسک حج کے مختلف حصوں میں بہت ساری تحریفیں پیدا ہو گئی تھیں

صلح حدیبیہ

پیغمبر اسلامؐ نے جب مدینہ کو اپنا مقر بنا لیا اور اجتماعی طور سے اتنی قوت پیدا کر لی کہ ان غلط رسموں

کو توڑا جا سکے۔ تو آپ ایک "مثالی حج" بجالانے کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہجرت کے چھٹے سال آنحضرتؐ نے ایک ہزار دو سو یا تین سو اصحاب کے ہمراہ ایام حج میں مکہ کی جانب پیش قدمی فرمائی۔ لوگوں کے ہمراہ ان کی قربانیوں کے جانور بھی تھے۔ ان دنوں معمول یہ تھا کہ قربانی کے جانوروں کی گردنوں میں علامت کے طور کوئی چیز آویزاں کر دیتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جانور چرنے کے لئے نہیں جا رہے ہیں بلکہ قربانی کے جانور ہیں یہ علامتیں اس لئے لگائی جاتی تھیں کہ جانور چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس وجہ سے ان علامتوں کو قلائد و شعائر کہا جاتا تھا۔ "گردن بند یا علامت و نشانی" لیکن چونکہ مشرک عربوں کی طاقت ابھی اتنی زیادہ تھی کہ جب پیغمبرؐ اسلام اپنے حج کے قافلے کے ساتھ مکہ کے نزدیک پہنچے تو آپ کو روک دیا گیا

شاید آپ سوال کریں، پیغمبرؐ کو روک کیوں دیا گیا؟ جواب صاف ہے اور وہ یہ کہ رسموں اور رواج کے خلاف قدم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ابھی ہجرت کا چھٹا سال ہے پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ ایسے مسلمان ہیں جو ابھی اٹھارہ انیس برس ہوئے اسلام لائے ہیں، کچھ دس، بارہ سال کے مسلمان ہیں، کچھ افراد سات آٹھ سال پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو ابھی تین یا دو یا ایک سال پہلے رسول خداؐ اور قرآن حکیم پر ایمان لائے ہیں۔ بہر حال پیغمبر اسلامؐ ابھی سرزمین حدیبیہ پر پہنچے تھے کہ کفار مکہ کے نمائندوں نے اسلامی قافلہ کا راستہ روک لیا اور پیغمبرؐ سے کہنے لگے اس سال آپ حج نہیں کر سکتے ورنہ جنگ برپا ہو جائے گی۔ آخر کار یہ معاملہ صلح پر تمام ہوا اور یہ طے پایا کہ اس سال پیغمبرؐ بغیر حج کئے واپس تشریف لے جائیں اور آئندہ سال بھی صرف تین روز کے لئے حج کی غرض سے تشریف لائیں ان تین دنوں میں مشرکین خانۂ خدا سے دور رہیں گے اور اللہ کے گھر کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن ایک شرط یہ بھی ہے کہ حج کے دوران مسلمان کوئی ہتھیار، یہاں تک کہ تلوار بھی اپنے ساتھ نہیں لا سکتے تاکہ مشرکین ہر صورت میں مسلمانوں سے محفوظ رہیں۔

رسم شکنی

جب صلح کا مرحلہ طے ہو گیا تو پیغمبرؐ نے اعلان فرمایا کہ "ہم احرام باندھ کر مکہ کی جانب آئے اور

لہ رسموں کو توڑنے کے لئے بت شکنی سے کہیں زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ رسموں کو توڑنا بتوں کو توڑنے سے زیادہ سخت ہے۔ وہ افعال و افکار جن کے لوگ عادی ہو چکے ہوں ان سے ٹکرانا اور ہمیشہ کے لئے انھیں مٹانے کی کوشش کرنا بہت ہی مشکل اور دیر رس کام ہے۔

اپنی قربانیاں بھی ہمراہ لائے تھے لہٰذا اپنا حج یوں ہی تمام نہیں کریں گے۔ بہتر ہے کہ ہر شخص اسی مقام پر اپنی اپنی قربانیاں ذبح کرے اس کے بعد احرام کھولے" پیغمبرؐ کا یہ اعلان ہر ایک کے لئے حیرت انگیز تھا۔ کیونکہ صدیوں سے یہ رسم و عادت ہو چکی تھی کہ جب لوگ احرام پہنتے تھے تو سرزمین "منیٰ" میں ہی یہ لباس جسموں سے اترتا تھا اور آج پیغمبرؐ یہ فرما رہے ہیں کہ یہیں اسی صحرا میں اپنے جانور ذبح کرو اور احرام کھول ڈالو، اگرچہ پیغمبرؐ نے مسلمانوں کو کئی مرتبہ قربانی کرنے اور احرام کھولنے کا حکم دیا لیکن مسلمان اس عجیب و غریب حکم کے لئے تیار نہ تھے۔ سب حیرت سے پیغمبرؐ کی طرف دیکھ رہے تھے اور کچھ لوگ تو جو آنحضرتؐ کے اس حکم پر عمل بھی نہیں کر رہے تھے آپس میں یہ کہنے لگے کہ ہم ایک مدت سے پیغمبرؐ کو اللہ کے رسولؐ کے عنوان سے مانتے آئے لیکن ہماری صدیوں کی عادت کے خلاف "سرزمین حدیبیہ پر اپنے جانوروں کی قربانی کرو" ان کے اس حکم نے ہم کو ان کی پیغمبری سے متعلق شک میں مبتلا کر دیا ہے۔ درحقیقت اس شک کی ایک اور بنیاد بھی تھی اور وہ ایک خواب تھا جسے پیغمبرؐ نے ان سے بیان فرمایا تھا کہ تم لوگ مسجد الحرام کی زیارت سے مشرف ہو گے۔

اس موقع پر عموماً مورخین ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس نے تحریک میں ایک نئی سیاسی و اجتماعی صورت حال پیدا کر دی۔ کچھ چنے ہوئے مسلمان پیغمبرؐ کے ساتھ ہیں۔ پیغمبرؐ فرماتے ہیں کہ حکم خدا یہی ہے کہ اپنی قربانیوں کو ذبح کرو اور احرام اتار ڈالو۔ آپ کے بار بار فرمانے کے باوجود لوگ آپ کے حکم پر عمل نہیں کرتے۔ بہر حال کسی بھی تحریک کے لئے یہ سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق پیغمبر اسلامؐ دل برداشتہ ہو کر ام المومنین ام سلمہؓ کے خیمے میں تشریف لائے۔ ام سلمہؓ نے آپ کی یہ حالت دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یا رسول خداؐ! بات کیا ہے؟ جواب میں پیغمبرؐ نے فرمایا کہ میں بار بار ان لوگوں سے کہہ رہا ہوں کہ خدا کا حکم بجا لاؤ اور اپنے ساتھ جو بھی قربانی کے جانور لائے ہو یہیں ذبح کرو اور احرام اتار ڈالو، لیکن یہ لوگ میرے کہنے پر عمل ہی نہیں کرتے۔

ام سلمہؓ نے فرمایا یا رسول اللہ یہ مشکل تو بڑی آسانی سے حل ہو سکتی ہے۔ آپ تشریف لے جائیے اور اس مرتبہ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنی قربانی کے جانور خود ذبح کر ڈالئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے دیکھا کہ یہ اچھا مشورہ ہے رہبر کو بعض اوقات خود ہی میدان کارزار میں قدم آگے بڑھانا چاہیئے اس کی یہ پیش قدمی زبانی قانون بتانے یا تبلیغ کرنے یا دلائل وغیرہ پیش کرنے سے کہیں زیادہ پُر اثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ پیغمبرؐ نے نہ کسی سے بات کی نہ کسی کو حکم دیا بلکہ سیدھے اپنی قربانی

کے جانوروں کے پاس تشریف لائے اور تمام جانوروں کو ذبح کر ڈالا۔ یہاں "ابن اثیر" نے "کامل" میں
کیا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے اس طرح شوق و ذوق سے اپنی قربانیوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا کہ
ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو ابھی حکم پیغمبر کو ماننے سے تامل اور انکار کر رہے تھے۔ گویا سب کو یہ ا
ہو گیا تھا کہ ہم سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے کیا کسی تحریک کے لئے یہ بات مفید ہے کہ ایسے اہم اور نازک
پر اپنے رہبر کے حکم سے منہ موڑا جائے اور یہ نافرمانی بھی ایسے خطرناک حالات میں، جب دشمن سے ٹکرا
کا خطرہ ہو وہ بھی ایسے رہبر کے حکم سے انکار جو حکم خدا کے عنوان سے ہمیں پیغام پہنچا رہا ہے۔ کیا اس کا
یہ نہیں ہے کہ ہم اس کی پیغمبری میں شک کر رہے ہیں؟ آیات میں اس موضوع کی طرف بھی اشارہ کیا گیا۔

فتح مکہ

پہلی مرتبہ پیغمبر اسلامؐ چھٹی ہجری میں مکہ کی جانب تشریف لائے کہ تمام خرافات، توہمات و تحریفا
سے مبرا اور پاک و پاکیزہ حج کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش فرمائیں لیکن مشرکین نے آپ کو اجازت نہ
دوسرے سال صرف عمرہ بجا لائے آخر کار ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا۔ نویں سال اگرچہ مسلما
نے فریضہ حج کو مکمل طور سے انجام دیا لیکن پیغمبر اسلامؐ اس حج میں مسلمانوں کے ہمراہ نہ تھے۔ اسی سال امیر المؤ
حضرت علیؑ، پیغمبرؐ کی طرف سے مشرکوں کے سامنے سورۂ "برائت" کی تبلیغ پر مامور ہوئے۔ دس ہجرت کا دسوا
تھا جب پیغمبر اسلامؐ، مسلمانوں کے جم غفیر کے ساتھ ایک اعلیٰ اور مثالی حج ادا کرنے کے لئے مکہ تشریف لا
اور آج حج کے جو اعمال و افعال ہمارے سامنے موجود ہیں، پیغمبرؐ کے اسی حج کا پرتو ہیں۔

لفظ "حج" یعنی خانہ خدا کی طرف جانے کا قصد و ارادہ۔ اس وقت اگر کسی سے دریافت کرتے
کہ کہاں جا رہے ہو تو وہ یہ جواب دیتا تھا میں خدا کے گھر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں (انا احج البیـ
رفتہ رفتہ اس سفر کا نام ہی حج پڑ گیا۔

لفظ "عمرہ" سے مراد آباد و تعمیر کرنا ہے۔ حج معمولاً سالانہ مناسک و مراسم کے عنوان سے بجا
جاتا ہے لیکن عمرہ چھوٹا حج ہے۔ اس طرح بڑے حج سے مراد ایسی اجتماعی عبادت ہے جو سال بہ سال
کی جاتی اس کے بارے میں ہم آیندہ وضاحت کریں گے۔ لیکن چونکہ یہ حج سال میں ایک مرتبہ انجام پاتا
لہٰذا اس کے خاتمہ پر کعبہ کے اطراف و جوانب اور اس کے ارد گرد کی بستیاں بھی سنسان ہو جاتی تھیں یہ

ج بھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ حج کے موقع پر مکہ اور کعبہ میں اس قدر مجمع ہوتا ہے جس کی حد نہیں لیکن اگر کوئی
فص ماہ ذی الحجہ کے آخری دنوں میں مسجد الحرام میں جائے تو دقت نماز کے علاوہ عام اوقات میں وہاں بھی ایسا
ں سناٹا نظر آئے گا جیسا ہماری مسجدوں میں ہوتا ہے اسی بنا پر یہ سنت قائم کی گئی کہ حج کے دنوں کے علاوہ
ی لوگ خانہ خدا کی زیارت کو جائیں ۔ اس زیارت کو "عمرہ" کہا جاتا تھا ، یعنی وہ زیارت جو خدا کے گھر اور
ں کے اطراف کو آباد رکھے ۔ چنانچہ اس کا نام خدا کے گھر کو آباد رکھنے کی زیارت یا "عمرۂ اعتمار" پڑ گیا ۔

عرب معمولاً رجب کے مہینہ میں حج کے لئے جاتے تھے کیوں کہ یہ مہینہ ماہ حرام تھا ۔ لیکن چونکہ یہ تنہا حرام مہینہ
ا لہٰذا اس ماہ میں ایسے ہی لوگ مکہ جا سکتے تھے جن کے گھر مکہ سے صرف سات ، آٹھ یا زیادہ سے زیادہ
ں روز کے فاصلہ پر ہوتے تھے ۔ تاکہ اس میں دس دس روز کی آمد و رفت کے علاوہ دس بارہ روز مکہ میں قیام
ی کر سکیں ۔ لیکن وہ لوگ جن کے گھر مکہ سے ایک ماہ کی مسافت پر تھے وہ اس عمرہ میں شریک نہیں ہو پاتے
ہے اس لئے کہ ماہ امن و امان ختم ہو چکا ہوتا تھا ۔ اب چونکہ رجب کے علاوہ ذی القعدہ ، ذی الحجہ اور محرم
ی محترم مہینے تھے لہٰذا جو لوگ مکہ سے تیس ، چالیس روز کی مسافت پر بھی رہتے تھے ۔ ان متصل
ہینوں میں آکر اطمینان سے حج کے فرائض ادا کر کے واپس جا سکتے تھے ۔ اسی وجہ سے ذی الحجہ کے مہینہ
حج بڑے حج کی حیثیت سے جانا جاتا تھا کیوں کہ اس میں بہت بڑا اجتماع ہوا کرتا تھا ۔ ماہ رجب کا حج عمرے
یادہ اہمیت اختیار نہ کر سکا ۔ جو لوگ مکہ سے ایک روز یا چند گھنٹوں کی مسافت پر رہتے تھے وہ معمولاً
رہ بجا لایا کرتے تھے اور برابر ایسی زیارتیں کرتے تھے جو خدا کے گھر کی آبادی کا سبب بنتی تھیں ۔

جو لوگ مکہ سے زیادہ دور رہتے تھے ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں بجا لا سکتے تھے ۔ یعنی
ں از وقت مکہ پہنچ کر ایک دو عمرہ و زیارت انجام دیتے اور چند دن وہاں قیام کرتے تھے یہاں
ک کہ حج بزرگ کی تاریخیں آجاتی تھیں اس طرح ایک ہی سفر میں وہ حج و عمرہ دونوں بجا لاتے تھے ۔
حج ہمارے یہاں "حج تمتع" کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

شیعہ فقہ میں موجودہ فتووں کے مطابق وہ مسلمان جو مکہ سے اڑتالیس میل[1] یا اس سے زیادہ دور
اس پر حج تمتع واجب ہو جاتا ہے ۔ یعنی ایک حج جس میں عمرہ و حج دونوں بجا لائے جائیں ۔

---

[1] ایک فرسخ برابر تین میل ، ایک میل برابر چار ہزار ہاتھ ، ایک ہاتھ برابر چوبیس انگل ۔۔۔ شرح لمعہ ج ا صلوٰۃ المسافر

حجۃ الوداع

ہجرت کے دسویں سال پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کے انبوہ کثیر کے ساتھ حج کے لئے مکۂ معظمہ تشریف لائے موزخین نے اس حج میں حاجیوں کی تعداد اسی ہزار نقل کی ہے۔ خانۂ کعبہ کے گرد اسی ہزار مسلمانوں کا اجتماع بڑی اہمیت اور عظیم شکوہ کا حامل تھا۔ اس حج میں ایک شخص بھی بت پرست نہ تھا کیونکہ اس کے پہلے سال یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ سال سے بت پرست مشرکین حج کے مراسم میں شرکت کے حقدار نہ ہوں گے۔ چنانچہ وحدت پرست مسلمانوں کا یہ متحد اجتماع اسلامی تحریک کے حق میں ایک اعلیٰ معیار کا قابل دید، موثر اور باعظمت مظاہرہ تھا۔ وہ پیغمبر جو دس سال پہلے سختیوں، مصائب و شدائد کے ساتھ اسی سرزمین مکہ سے کئی فرسخ دور کر دیا گیا تھا، آج پورے جاہ و جلال کے ساتھ اسی ہزار افراد کے ہمراہ اسلام کے عظیم رہبر کی حیثیت سے خانۂ کعبہ کی طرف واپس آرہا تھا اور اس کے ہمراہ ایسا عظیم اجتماع تھا کہ میرے خیال سے آج سے پچاس برس پہلے ہمارے ملک میں بھی ایسا مجمع ایک بے مثل و بے نظیر اجتماع شمار ہوتا تھا۔

ایک ہی وقت میں اسی ہزار افراد پر مشتمل اجتماع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ مجموعی طور سے اس وقت کی آبادی کے اعداد و شمار ہمارے سامنے نہیں ہیں، نہیں معلوم کہ اس وقت عرب کی کل آبادی پانچ لاکھ بھی تھی یا نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس وقت سب سے بڑے شہر کی آبادی بھی دس ہزار افراد سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔

عرب کی سرزمین پر ایسے حالات و شرائط کے تحت وہ پیغمبرؐ اور مسلمان جو دس سال قبل اسی سرزمین سے نکال دیئے گئے تھے آج ایک متحد اجتماع کی شکل میں اکٹھا ہوئے ہیں۔ ایسا اجتماع جس میں ہر طرف سے ایک ہی آواز "اللہ اکبر" بلند ہو رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ "لبیک" حج کے مراسم کا ایک حصہ ہے۔ "لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لاشریک لک" یعنی نغمہ توحید ہر طرف بلند ہو رہا ہے اور آج اسی ہزار افراد ایک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں "لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک" یہ وہی سرزمین ہے جہاں ابھی ایک سال پہلے تک جب مشرکین و بت پرست بھی حج میں شریک ہوا کرتے تھے، ایک گروہ "یاھبل یاھبل" کہتا ہوا آتا تھا تو دوسرا گروہ "یالات یالات" کہتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر گروہ کا ایک مخصوص نعرہ تھا اور وہ اپنے اپنے بتوں کو پکارا کرتے تھے اور مجمع بھی شاید دس ہزار سے زیادہ نہ ہوا کرتا تھا اور آج اسی ہزار کا ایک عظیم مجمع ایک رہبر کی سرپرستی میں ایک قانون کے تحت ایک ہی نعرہ بلند کر رہا ہے اور سب کے سب ایک ساتھ کہہ رہے ہیں "لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک"

خدایا ہم تیری دعوت کو قبول کرتے ہوئے اس سرزمین پر آئے ہیں اور تیرے روبرو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی کو بھی تیری خدائی میں شریک تسلیم نہیں کرتے۔ یہ منظر کتنا باعظمت اور قابل دید ہوگا۔ بلاشبہ حجۃ الوداع کے مراسم نے اسلامی تحریک کے استحکام میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔

موجودہ حج اور اسلامی امت

آج کل ہمیں حج جیسی اجتماعی عبادت سے جس قدر استفادہ کرنا چاہئے حاصل نہیں کرتے۔ آج کے مسلمان حج کے عنوان سے جو اعمال انجام دے رہے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے اسّی فیصد بلکہ اکثر نوے فی صد دور ہے اور اسے فراموش کئے ہوئے ہیں[1]۔ لیکن اسلامی حج کی یہی بچی کھچی حیثیت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ موجودہ حالات و شرائط کے تحت کسی بھی صورت میں اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا مقصد یہ بھی نہیں کہ کسی صورت میں آئندہ بھی ایسے حالات نہیں رہیں گے۔ کیوں کہ ممکن ہے وقتی طور پر بعض مخصوص اجتماعی حالات و شرائط کے تحت یا اجتماعی اسباب و علل کے پیش نظر خود مصلحت اسلامی ایک، دو یا تین سال کے لئے حج کو حرام ہی قرار دیدے لیکن اس عبادت کی حیثیت و اہمیت میں کسی طرح کی کمزوری ہرگز نہیں آنی چاہئے۔ ہاں اگر بنیادی طور سے حج کو ہی کمزور بنانے کی کوشش کی گئی تو اس وقت اس سلسلہ میں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ میں نے خود سفر حج میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے، نیز اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس کی حقیقت سے آشنا ہوا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر حج کے مراسم نہ ہوتے تو اب تک جو کچھ باقی ماندہ خوبیاں دنیا کے مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں اسلام کے داخلی و خارجی دشمن انھیں بھی نابود کر چکے ہوتے۔

اسلام میں فرقہ بازی و تفرقہ پردازی خود ملت اسلامیہ کے لئے ایک بڑی مصیبت رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ امت اسلام میں ہر گروہ دین فہمی کے سلسلہ میں آزاد ہے، جو کچھ وہ اسلام کے بارے میں سمجھتا ہے

---

[1] شہید مظلوم آیت اللہ بہشتی نے برسوں پہلے اسلامی حج کو اس کے صحیح معنی و مفہوم کے ساتھ ادا کرنے کی آواز اٹھائی تھی۔ اور آج خصوصیت سے ہزاروں ایرانی حاجیوں کی موجودگی میں حج کی اس شان و شوکت پر عالمی استکبار اپنے پورے اضطراب و التہاب کے ساتھ ان سے دست و گریباں نظر آرہا ہے۔

اس پر عمل کرتے میں آزاد ہے۔ ایک شیعہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شیعہ رہے اور اسلام سے متعلق اپنا نظریہ پیش کرے۔ اس کے سامنے کوئی مجبوری نہیں ہے کہ وہ سنی کی پیروی کرے۔ خود اہل سنت میں بھی کیا کم گروہ بندی ہے؟ چھوٹے چھوٹے گروہوں کو تو جانے دیجئے ان کے بڑے گروہ بھی چار عدد ہیں۔ فقہ میں حنفی ہیں، شافعی ہیں، مالکی ہیں، حنبلی ہیں اور اصولِ عقائد و اسلام شناسی میں اشعری ہیں، معتزلی ہیں اور ..... شافعی کسی حنفی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ تمہیں میرے مسلک پر چلنا ہوگا۔ اسی طرح حنفی بھی شافعی پر کوئی جبر نہیں کر سکتا کہ میری ہی پیروی کرو، بلکہ ہر گروہ خود مختار ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم اسلام سے متعلق اپنی آزاد فکر رکھتے ہیں اور ہماری منطق جس بات کو قبول کرتی ہے اسی پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز حرام ہے وہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی سے کہے، چونکہ تم شافعی ہو اور میں حنفی ہوں لہٰذا ہم آپس میں دینی بھائی نہیں ہیں۔ اسی طرح شیعہ و سنی ہیں، کہ شیعہ سنیؓ سے کہے کہ چونکہ تم سنیؓ ہو لہٰذا ہم میں تم میں کوئی دینی برادری نہیں۔ ایسی بُری اور اسلام کُش تعبیریں جو ہمارے درمیان رائج ہوگئی ہیں اور اکثر اہل علم حضرات کی زبانوں سے بھی سنی جاتی ہیں خدا معلوم کہاں سے آگئی ہیں۔

ہماری یہ بحث ناصبی یا دشمن اہلبیت کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ وہ ایک الگ موضوع ہے۔ آج کروڑوں افراد پر مشتمل اسلامی سماج میں بہت سی جگہوں پر سرے سے ناصبیوں کا وجود ہی نہیں ہے اور اگر اہل سنت کی آبادی والے ممالک میں بعض جگہوں پر پائے بھی جاتے ہیں تو اہل سنت بھی ان سے نفرت کرتے ہیں۔ یہاں ہم ناصبی اور دشمن اہل بیتؑ سے متعلق بحث ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہماری بحث کا موضوع خالص اور سیدھے سادے اہل سنّت ہیں، جن کی اکثریت اہل بیتؑ سے محبت کرتی ہے۔ حقیقتاً بہت سے مقامات پر مجھے ذاتی طور سے کئی اہل سنّت دوستوں کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جن میں زیادہ تر افراد اہل بیتؑ کے دوستدار ہیں۔ میرا ایک دوست اپنے مصر کے سفر کے حالات مجھ سے بیان کر رہا تھا کہ میں نے مصر میں ایک سنی بھائی سے ملاقات کی، دوران گفتگو اس سنی بھائی نے مجھ سے فرمایا:۔

"آپ سوچتے ہیں کہ اہل بیتؑ کے دوستدار فقط آپ ہی لوگ ہیں؟ ہم بھی اہل بیتؑ کو دوست رکھتے ہیں۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ مصر میں جس قدر علی، حسن و حسین جیسے نام رکھے جاتے ہیں اتنے عثمان، ابوبکر و عمر نام نہیں رکھے جاتے اور اگر آپ لوگ حسنؑ یا حسینؑ کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں تو ہمارے یہاں بھی جو سب سے زیادہ جو نام رکھا جاتا ہے وہ حسین ہے۔"

میں خود اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کروں جسے میں اپنے ایک دوست سے ذکر بھی کر چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میں ہیمبرگ، جرمنی میں چند ترکوں سے جو حنفی مذہب تھے، گفتگو کر رہا تھا، میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں کے دلوں میں اہل بیتؑ کی محبت کا جذبہ پیدا کروں چنانچہ میں نے اس مقصد کے تحت دو حدیثیں ان کے سامنے نقل کیں اچانک میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں کے تاثرات بدل گئے اور وہ عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے سوچا شاید یہ لوگ اس جذبہ سے بہت دور ہیں اور میں نے ابتدا ہی غلطی کی ہے لہٰذا ان کو کچھ اور فاصلہ سے اپنے مقصد کے قریب لانا چاہیئے۔ (میں چونکہ ترکی نہیں جانتا تھا لہٰذا جرمنی زبان میں گفتگو کر رہا تھا اور میرا ترجمان خود ترکی تھا میری گفتگو کو ترکی میں ترجمہ کرکے ان سے بیان کر رہا تھا) میں نے آزمائش کے طور پر ان سے ایک اور بات کہی کہ دیکھوں یہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جیسا میں سوچ رہا تھا مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان لوگوں نے ترجمان کو جواب دیا کہ ان (ان کی اصطلاح میں خواجہ) سے کہو کیا ہم دوستدار اہل بیتؑ نہیں ہیں جو یہ ہم سے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم اہل بیتؑ کو دوست رکھتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور دوستدار اہل بیتؑ نہ ہو؟ لہٰذا ہم ناصبیوں سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ اصل میں یہ گفتگو سنی مسلمان بھائی سے متعلق ہے جن میں کوئی بھی ناصبی نہیں ہے۔

ایک شیعہ کا فریضہ

ایک شیعہ کو کسی صورت میں ایسی باتیں کہنے کا حق حاصل نہیں ہے جن سے دینی، سیاسی و اجتماعی سطح پر اہل سنت مسلمان بھائی سے اس کی دینی بھائی چارگی اور اتحاد کی بنیاد متزلزل ہو جائے۔ اگر حج جیسی عظیم عبادت نہ ہوتی تو اب تک مسلمانوں میں انتشار پھیلانے والے بے شمار فتنے سرے سے اسلام ہی کو باد فنا کی نذر کر چکے ہوتے اور میرے خیال سے جن اتحاد بخش رابطوں کو پیغمبرؐ اسلام اور صدر اسلام کے مسلمانوں نے اپنے خون جگر اور اپنی جان و مال کا نذرانہ دیکر قائم کیا تھا، مولا علیؑ نے تیس سال کی خاموش زندگی میں خون دل پی پی کر جس کی حمایت و حفاظت کی تھی، امام حسنؑ مجتبیٰ نے اپنے زمانہ کے تلخ سیاسی شرائط کے ہاتھوں ایک غیر مطلوب دستاویز قبول کر کے جسے محفوظ رکھا اور جنگ روک دی تھی، امام سجادؑ (زین العابدین) سے لیکر امام حسنؑ عسکری تک ہمارے تمام ائمہ طاہرینؑ نے امت

کے اسی اتحاد و یک جہتی کے پیش نظر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کئے تھے۔ اگر امام حج نہ ہوتے تو ان بزرگواروں کی یہ تمام جانفشانیاں اب تک نہ جانے کب کی نقش عدم بن چکی ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اتحاد میں رخنہ ڈالنے والوں نے اہل سنت کے ذہن میں یہ بات بھر دی کہ شیعہ اصلاً خدا کو نہیں مانتے۔ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ جبرئیل سے غلطی ہوگئی۔ طے یہ تھا کہ وہ علیؑ کے گھر جائے لیکن وہ بھول کر پیغمبر کے گھر چلا گیا اور یہ بھی درست ہے کہ شیعوں کے درمیان یہ بات مشہور کر دی گئی ہے کہ جتنے سنی ہیں سب حضرت علیؑ کے دشمن ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت علیؑ و ائمہ علیہم السلام کا احترام کرتی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اس طرح کی غلط تبلیغات نے اپنا پورا پورا اثر دکھایا پھر بھی آخر سال میں ایک بار مختلف ممالک سے کم از کم ایک لاکھ سے زیادہ شیعہ اور سات آٹھ لاکھ سے زیادہ اہل سنت مکہ میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اگر اک ذرا ہمت و حوصلہ پیدا کر کے ایک دوسرے کے بارہ میں غور کریں اور آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے حالات معلوم کریں تو بڑی آسانی سے یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے گی کہ یہ سب افواہیں تھیں، جھوٹ اور فریب تھا۔ سوچئے! ابھی حج کی شکل میں کم از کم سال میں ایک ہی بار سہی، اس دروغ آزمائی کا موقع تو مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔

اگر حج کے اسی ایک فائدہ کو محسوس کیا جائے تو یہی اپنے آپ میں بہت بڑا اور اہم ترین فائدہ ہے۔ لہٰذا میں ذاتی طور سے حج کی اسی ایک امتیازی شان کے تحت اس بات پر بہت زور دیتا ہوں کہ حج کے مراسم ہر سال زیادہ سے زیادہ جمعیت اور شان و شوکت کے ساتھ ادا کئے جانے چاہئیں۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ اپنی وصیت میں اپنے بیٹے امام حسنؑ اور اہل خاندان کو اس قدر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

> اللہ اللہ خدا کی یاد میں مشغول رہو، اس کا تقویٰ اختیار کرو خوف خدا اپنے دل میں لیئے رہو۔ حج ادا کرو اور اپنے خدا کے گھر اور اس کے اطراف کو خالی و تنہا نہ چھوڑو ورنہ دوسرے اس پر قبضہ جما لیں گے۔[1]

یہ سب اس لئے ہے کہ حج چاہے مقصد کے اعتبار سے جس قدر ضعیف و کم اثر ہو جائے پھر بھی ہمارے لئے ایک عظیم پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسی عظیم پناہ گاہ کو کسی بھی حال میں خالی نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں موجودہ حج سے جو فائدہ ہم حاصل کرتے ہیں مختلف برسوں اور مختلف شرائط و حالات کے تحت

---

[1] نہج البلاغہ۔ وصیت بہ حسنین علیہما السلام۔

ہ حج "اسلامی حج" سے صرف دس سے بیس فی صدی تک ہم آہنگی رکھتا ہے ۔ لہٰذا ہمیں اس پُرعظمت عبادت کے
س اسّی سے نوّے فی صدی حصہ کو بھی اختیار کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے ۔

اللہ کی حقیقی معرفت

حج سے مراد پہلی منزل میں دین کی اہم ترین اصل کی حفاظت کے لئے ایک اہم واقعہ کی یاد تازہ کرنا ہے ۔
دین کی اس اہم ترین اصل کا نام توحید ہے ۔ اسلام کا نعرہ "لا الٰہ الا اللہ" اور پیغمبر اسلام کی رسالت
کا نقطہ آغاز "قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا" ہے ۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ کہو نجات پا جاؤ گے ۔ کیا
توحید اتنے اہم کردار کی حامل ہے ؟ جامع و کامل توحید ، انسانی زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیتی ۔
ہمارے عیب و نقص کا سبب یہ کہ ہم میں صحیح یکتا پرستی کا تصور نہیں ہے ۔ اللہ سے متعلق بیشتر لوگوں
کی معرفت یا کچھ کم و کاست کے ساتھ یا پھر بہت سے مواقع پر ایک دم انحراف کا شکار ہے ، جن میں
سے بعض انحرافات تو مذکورہ آیات میں بھی بیان کئے گئے ہیں ۔ تم کیسے خدا کی عبادت کرتے ہو ، یہی مسئلہ
ہر اس انسان کے لئے پہلا اور آخری مسئلہ ہے جو خدا کے لئے ، اسی کے نام پر اور اسی کی یاد میں زندگی گزارے
اس مسئلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ اور بے پایاں بات یہ ہے کہ انسان کو برابر ، پیہم اور مسلسل اپنے توحیدی
عقیدہ کی اصلاح کرتے رہنا چاہیئے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسئلہ اس قدر اہم اور سخت ہے کہ اس سلسلہ میں
ایک ، دو ، چار ، دس مرتبہ نہیں بلکہ برابر اور ہمیشہ اصلاح کرتے رہنا لازمی ہے ؟ جواب : ہاں یہ مسئلہ
اتنا ہی مشکل اور اہم ہے ۔ میں مذکورہ آیات سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو اس کی اہمیت کا
احساس ہو جائے ۔

ایک یمنی عرب جو بت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہوا ہے اور بتوں کی پرستش چھوڑ کر اب صرف اللہ
کو یاد کرتا ہے لیکن کیا بات یہیں تمام ہو جاتی ہے اور اس کی توحید کامل ہو جاتی ہے ؟ نہیں بلکہ یہ عرب
حج کے لئے یمن سے مکہ کی جانب روانگی کا ارادہ کرتا ہے ۔ اس طولانی سفر میں زاد سفر ، سواری اور
آذوقہ کا انتظام ایک بدیہی اور لازمی امر ہے ۔ لیکن وہ کہتا ہے ، کیا اس سفر میں میں خدا کا مہمان نہیں ہوں ؟
چنانچہ جب اس سفر میں خدا کا مہمان ہوں تو مجھے زاد راہ اور سواری وغیرہ کے وسیلہ کی کیا ضرورت ہے ؟
اور اسی امید پر وہ سفر کے لئے نکل پڑتا ہے اور ظاہر ہے یہیں اس کے عقیدۂ توحید کی خامیاں ظاہر

ہو جاتی ہیں۔ کوئی اس سے کہے لے یعنی مسلمان بھائی کیا تو اپنے گھر میں خدا کا مہمان نہیں تھا اور فقط اس سفر میں اس کا مہمان ہوا ہے ؟ کیا تو صرف حج کے زمانہ میں خدا کے الطاف و اکرام سے فیض یاب اور اس کا مہمان ہوتا ہے ؟ یہ پوری زمین تو اسی کا عام دستر خوان ہے۔ آخر تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ تو فقط سفر کے ان چار دنوں میں خدا کا مہمان ہے ؟ عقیدۂ توحید کی یہی اور خامی جو اس مسلمان بھائی میں پائی جاتی ہے اس کے عمل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ فکری انحراف اس کے محور زندگی اور اس کے حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نتیجہ میں وہ اسلامی قانون اور رضائے خدا کے برخلاف اپنے گھر سے بغیر توشہ اور زاد سفر نکل پڑتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی ہے کہ یہی خدا پر ایمان رکھنے کا تقاضا ہے۔ یہ عجیب خدا فہمی اور خدا شناسی ہے کہ وہ کہے زاد سفر اپنے ہمراہ نہ لو اگر تم نے ایسا کیا تو گویا خدا پر تمہارا بھروسہ نہیں ہے۔ لیکن وہ خدا جسے اسلام محور و مرکز قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر تم نے توشہ سفر ساتھ نہ لیا تو خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے خلاف عمل انجام دیا۔ اب ذرا اس نظریہ کے تحت ہم اپنی جگہ پر غور کریں کہ ہمارے سامنے کتنے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ امور جو ہم عملاً واقعاً اور قلباً خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انجام دیتے ہیں ان میں کس قدر انحراف پایا جاتا ہے ؟ ہمارے ایسے کتنے اعمال آزمائش اور کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہیں ؟ اگر انسان اپنی پوری زندگی یا پھر اپنے ارد گرد دوسروں کی زندگیوں یہاں تک کہ علماء و عرفاء کی زندگیوں پر اس زاویہ سے غور کرے تو اسے نظر آئے گا کہ ایک عارف جس نے برسہا برس معرفت خدا میں کمال پیدا کرنے کی کوشش کی ، اس کی معرفت میں اضافہ بھی ہوا اور وہ عام اور معمولی سطح سے کہیں بلند تر ہو گیا ہے لیکن کیا مسئلہ یہیں تمام ہو گیا اور معرفت خدا کی حد ختم ہو گئی ؟ نہیں یہ مسئلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور ایسا لا محدود ہے کہ میدان عمل میں بھی اپنا اثر رکھتا ہے۔ آیت میں ارشاد ہوتا ہے : " وتزودوا " یعنی زاد سفر بھی اپنے ہمراہ لو۔ یہاں قرآن کے بیان کا ہنر اور اس کی بلاغت ہمیشہ کی طرح اپنے کمال پر ہے جہاں وہ ایک عام بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہیں اس کے پہلو بہ پہلو ایک بہترین نتیجہ بھی برآمد کرتا ہے ؛ زاد سفر مہیا کرو اور دیکھو آخرت کے سفر میں بھی زاد راہ کی ضرورت پیش آئے گی (فان خیر الزاد التقوٰی) تقویٰ آخرت کے سفر کا توشہ ہے۔ بہر حال ہر سفر میں زاد سفر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہاں اعتبارات بدلے ہوتے ہیں۔

حج اور اقتصادی فائدے

حج کی ان آیات میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور یہ نکتہ بھی عرب کے ایک گروہ کی غلط خدا شناسی کی تصویر

پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ ظہورِ اسلام کے بعد جب بھی حج کے لئے جاتے، ہر منافع بخش کام سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ہم خدا کے لئے سفر پہ نکلتے ہیں اور جو شخص حج کے لئے خانۂ خدا کی طرف سفر کرے اسے تجارت اور کسب و کار کے تصور کو اپنے ذہن سے ایک دم نکال دینا چاہئے۔ اتفاق سے یہ بات آج بھی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ میں نے خود بعض علماء کو دیکھا ہے جو بعض حاجیوں پر تنقید کرتے ہوئے نظر آئے کہ معلوم نہیں یہ لوگ تجارت کے لئے سفر کرتے ہیں یا زیارت کے لئے۔ ظہورِ اسلام کے بعد یہی فکر عربوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ اسلام کے پہلے حج کے مراسم، دینی و زیارتی مراسم سے زیادہ اقتصادی، اجتماعی و سیاسی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ حج کے زمانہ میں بڑے بڑے بازار لگائے جاتے تھے۔ منجملہ ان میں بازار "عکاظ" مکہ کے نزدیک اور ایک دو دوسرے بازار بھی الگ الگ جگہوں پر تشکیل پاتے تھے۔ ان بازاروں میں اقتصادی پہلوؤں کے علاوہ اجتماعی، ادبی و ہنری پہلو بھی قابلِ توجہ تھے۔ ان کی ایک مثال سال کے بہترین اشعار کا ان بازار میں پیش کیا جانا بھی ہے۔ یہ ایک سالانہ بازار تھا۔ آج بھی دنیا میں سالانہ بازار لگتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی جلد ہی سالانہ بین الاقوامی تجارتی نمائش کا آغاز ہوا ہے۔

یہ طریقہ دنیا کے اقتصادی اصول میں سے ہے کہ اہلِ صنعت سال کے مختلف زمانوں میں دنیا کے الگ الگ گوشوں میں یہ تجارتی نمائشیں لگاتے ہیں۔ مثلاً "ھانوور" (HANNOVER) مغربی جرمنی کے ایک شہر میں مارچ، اپریل کے مہینوں میں ایک بہت بڑی نمائش لگتی ہے۔ جس میں دنیا کے بہت سے ملکوں کی رنگ برنگی ایجادات و مصنوعات پیش کی جاتی ہیں ان نمائشوں کا مقصد نئی نئی ایجادات اور مشنریوں کے لئے بازار بنانا ہوا کرتا ہے۔ عرب کے لوگوں میں بھی ایسے بڑے بڑے سالانہ بازار برپا ہوتے تھے اور وہ بھی سال میں کئی بازار مختلف جگہوں پر لگتے تھے۔ ان میں سے تین بازار حج کے زمانہ سے مربوط تھے جو حج کے راستوں کے الگ الگ مراکز پر قائم ہوتے۔ ان ہی میں سے ایک مرکز جہاں بالعموم حجاج اکٹھا ہوا کرتے تھے "عکاظ" تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد مسلمان یہ کہنے لگا کہ میں چونکہ خدا کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس سفر پہ نکلا ہوں لہٰذا تجارت، کام کاج اور پیسہ وغیرہ کا تصور مجھے اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے۔ وہ یہ فکر کرتا تھا کہ حج کے سفر میں تجارت یا مزدوری وغیرہ سرے سے حرام ہے اور سفر کی اہمیت و وقعت کو ختم کر دیتی ہے۔ چنانچہ آیت نازل ہوئی:-

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم .... (بقرہ/۱۹۸)

اگر حج کے سفر میں خدا کی بخششوں کے امیدوار بھی رہو تو اسمیں کوئی حرج نہیں ہے۔

متعدد روایتیں یہ بیان کرتی ہیں کہ : میں نے امام سے پوچھا کہ میں حج کے سفر میں اپنے اونٹ کرایہ پر دیتا ہوں اور اس ذریعے سے پیسہ کماتا ہوں کیا میرے لئے یہ بہتر ہے کہ میں اس سفر میں احرام نہ باندھوں اور حج نہ بجالاؤں یہاں یہ دیکھنا چاہیئے کہ "لیس علیکم جناح " سے کیا مراد ہے؟ اور یہ طرز تفکر کہ حج کے سفر میں اجتماعی، سیاسی و اقتصادی فائدے حاصل کرنا حج کی پاکیزگی اور خلوص کو زائل کر دیتا ہے، کون سا طرز فکر ہے؟ اور حقیقتاً یہ خیال کیسے پیدا ہوا ؟ یہ انحراف کہاں سے وجود میں آیا؟ کیا توحید اور معرفت خدا نے یہ تصور پیدا کیا ہے۔ آخر مسلمان کیسے خدا کی معرفت رکھتا ہے کیا وہ ایسے خدا کی معرفت رکھتا ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے صرف اس کی یاد میں گم رہیں اور کوئی کام کاج نہ کریں جبکہ اسلام کا خدا ایسا نہیں ہے۔ اسلام کا خدا تو وہ ہے جو یہ فرماتا ہے کہ جو شخص اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے روزی حاصل کرنے میں تگ و دو کرتا ہے وہ خدا کی راہ میں جدو جہد اور جہاد کرنے والوں کے مانند ہے۔ یہ بھی جہاد ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسلام چاہتا ہے کہ ہم مسلمان یورپ اور امریکا کے عیسائیوں جیسے نہ بن جائیں۔ اس بات کو میں نے بارہا خود ان لوگوں سے بھی سنا ہے اور وہاں پر تحقیق کے لئے گئے ایرانیوں سے بھی۔ ابھی حال میں ایک شخص جو وہاں سے واپس ہوا ہے مجھ سے بیان کرنے لگا کہ ایک عیسائی شخص صرف یکشنبہ کے دن جب وہ کلیسا میں جاتا ہے تو اللہ کا بندہ ہے۔ اس دن وہ کلیسا میں جا کر صحیح معنوں میں خدا سے لو لگاتا ہے اور اسکی یاد میں مشغول رہتا ہے لیکن جب وہ کلیسا سے باہر آتا ہے تو کمزور ہو جاتا ہے یعنی یوں کہا جائے کہ خدا سے دور ہو جاتا ہے اور دوشنبہ سے لیکر شنبہ تک اس کا خدا سے کوئی رابطہ نہیں رہتا۔ نہ وہ اسے یاد کرتا ہے۔ ایک عیسائی کا یہی معمول ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک بار اپنے خدا کو ضرور یاد کرتا ہے۔ جبکہ اسلام ایک مسلمان کو ایسا نہیں دیکھنا چاہتا کہ وہ شنبہ تک تو کسب و کار اور فکر معاش بلکہ ہر طرح کے کاموں میں مشغول ہو اور خدا کو فراموش کر دے۔ اگرچہ تمام عیسائی ایسے نہیں ہیں بلکہ آجکل کلیسا کی روش نے ہی یہ طرز عمل پیدا کر دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ایسے بہت سارے عیسائی ہیں جو پورے ہفتہ اپنے تمام کاموں میں خدا کی یاد میں مشغول رہا کرتے ہیں۔ اور کلیسا کی پرانی روش بھی

---

[1] فروع کافی ج ۴۔ کتاب الحج، باب ما یجزی من حجۃ الاسلام و ما لا یجزی۔

ی ہی تھی ۔ سابق میں ایسا نہ تھا کہ عیسائی ہفتہ میں ایک بار کلیسا جائے بلکہ وہ صبح، دوپہر اور شب تینوں اوقات
میں کلیسا جایا کرتا تھا ۔ اگر ہم خدا کے ذکر اور اس کی یاد کو کلیسا سے مخصوص سمجھیں تو چونکہ ہمارے شب و روز
کی مصروفیتیں ہفتہ میں ایک بار سے زیادہ ہمیں کلیسا جانے کی مہلت نہیں دیتیں لہٰذا ہم بھی ہفتہ میں ایک بار سے
زیادہ خدا کی عبادت نہیں کر سکتے ۔ اسلام کا خدا کلیسا والا خدا نہیں ہے ۔ اسلام کا خدا وہ ہے جو ہر وقت ہر جگہ
موجود ہے لہٰذا اسلام ایک بندہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تو اپنے کسب و کار و معاش میں بھی مشغول ہے
تب بھی اپنے خدا کو یاد کرتا رہ ۔ اور اسے کسی حال میں بھی فراموش نہ کر ۔ خدا کے نام اور اس کی یاد کے ساتھ
کسب و کار و فکر معاش میں مشغول ہونے اور بغیر یادِ خدا کے محنت و معاش میں بہت فرق ہے ۔ خدا کے
ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ علمی مطالعہ (یہاں تک سائنس و ٹیکنالوجی میں بھی) مشغول ہونے اور بغیر یادِ خدا
کے تحصیل علوم میں بہت فرق ہے ۔ وہ شخص جو سائنسی تجربہ گاہ میں خدا کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ
مشغول ہے چونکہ خدا ہمیشہ اس کے پیش نظر ہے لہٰذا وہ کبھی بھی اپنے آثار، تجربات اور سائنسی مطالعات
کو ظالموں کے حوالہ نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ خدا اپنے قہر و جلال کے ساتھ اس کے پیش
نظر نہیں ہے ۔ اگر کوئی نام خدا و یادِ خدا کے ساتھ اسلحے و جنگی ہتھیار بناتا ہے اس میں اور خدا کو فراموش کر کے
اسلحے بنانے والے میں بہت فرق ہے ۔ جو خدا کے نام پر ہتھیار بناتا ہے وہ بغور دیکھتا ہے کہ یہ اسلحہ
کس کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے اور کون اس کا نشانہ بن رہا ہے ۔ یہ تیر کسی ظالم کا گلا پھاڑ رہا ہے یا کسی
مظلوم کے حلق میں پیوست ہو رہا ہے ۔ وہ کوئی بہت بڑا احمق ہی ہوگا جو یہ کہے کہ میں خدا کے نام پر اور
اس کی یاد میں ہتھیار بنا رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کل اسی ہتھیار سے اہل حق قتل کئے جائیں گے ۔ حقیقتاً
یہ بہت بڑی بیوقوفی ہے ۔ اسی بنا پر اسلام ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ خدا کی یاد ہر جگہ اور ہر حالت میں ہمارے
پیش نظر رہے : "والذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم"[۱] یعنی وہ لوگ
جو اٹھتے، بیٹھتے اور کروٹ لیتے ذکر خدا میں مشغول رہتے ہیں ۔ انسان کے یہاں تین حالت کے علاوہ
چوتھی حالت نہیں پائی جاتی ۔ یا وہ کھڑا ہے اور کام کر رہا ہے، یا وہ بیٹھا ہوا ہے اور یا لیٹا ہوا ہے
اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ وہ ہر حالت میں خدا کو یاد کرتا رہے ۔

مندرجہ بالا گفتگو کی بنیاد پر حج کے سفر میں اقتصادی منافع حاصل کرنے کی فکر اسی شخص کے حج کے

۱۔ آل عمران / ۱۹۱

خلوص نیت کو نقصان پہنچا سکتی ہے جو پیسہ کمانے کے سلسلہ میں خدا کا تصور نہ رکھتا ہو۔ ورنہ خدا کے تصور کے ساتھ کسب معاش اور خدا کی عبادت میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اگر ہم کسب معاش کرنے والے سے یہ پوچھیں کہ تم یہ پیسہ کیوں کما رہے ہو؟ تو وہ یہی جواب دیگا کہ اس سے میں اپنے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کروں گا اور یہ وہ فریضہ ہے جسے خداوند عالم نے میرے ذمہ عائد کیا ہے۔ کیا ایسی صورت میں پیسہ حاصل کرنا ذکر خدا سے ٹکراؤ کا باعث ہوتا ہے؟ اگر ہم اپنی آمدنی کے اضافی حصہ کو خدا کے فرمان:۔ "وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" یعنی خدا کی راہ میں اپنے مال کو خرچ کرو اور خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو" کے مطابق خدا کی راہ میں انفاق کریں، تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے حکم پر عمل کرنے کے لئے کچھ اپنے پاس رکھتے بھی ہوں تاکہ اسے راہ خدا میں خیرات کر سکیں یہاں کمائیں تاکہ دوسری جگہ خیرات کریں۔ کیا ایسا کام اللہ کی رضا سے ٹکراؤ رکھتا ہے؟ نہیں۔ ہاں صرف اپنی خواہشات وضروریات کے پورا کرنے اور پیسہ کمانے سے متعلق اسلام کے معین کردہ تمام حدود وقوانین سے صرف نظر کر جانا، خدا سے ٹکراؤ کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر انسان اپنے معاملات میں خدا کو ثانوی حیثیت دے اور اس نیت کے تحت حج کے سفر میں پیسہ کمائے یا تجارت کرے تو یہ درست نہیں ہے۔ لیکن وہ انسان جو خدا کو اپنی زندگی کا محور ومرکز قرار دیتا ہے اور اپنی روح کی مانند جو اس کے جسم کے ذرہ ذرہ میں یوں سرایت کئے ہوئے ہے کہ جسم کا کوئی ریشہ اس سے خالی نہیں ہے، اس طرح اگر وہ اپنے خدا پر عقیدہ رکھتا ہے تو اس کا کوئی عمل، محنت وتجارت، ایمان ومعنویت سے کبھی کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتا۔

سفر حج اور تحفے

میرے ایک دوست حج کے لئے جا رہے تھے، مجھ سے پوچھنے لگے اگر میں اس سفر میں تحفے تحائف خریدوں اور اس خریداری میں اپنا کچھ وقت صرف کروں تو کیسا ہے؟ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیسے تحفے اور کس نیت سے خریدنا چاہتے ہو؟ اگر تم خیال کرتے ہو کہ میں اس عظیم سفر پر آیا ہوں لہٰذا یادگار کے طور پر اپنے بیوی بچوں، ماں باپ، بھائی بہنوں یا عزیزوں کے لئے کچھ تحفے لے جاؤں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر یہ فکر رہے کہ لوگ کتنا سامان لے جا رہے ہیں میں کتنا لے جاؤں، یعنی فکر حرص وہوس اور اپنے مال و دولت کی نمائش ہو تو غلط ہے اور صاف نیت کے ساتھ وہ تحفے

جو تمہارے عزیزوں اور دوستوں کو خوش و مسرور کریں ان کی خریداری میں جو چند گھنٹے صرف کروگے اور عزیزوں کی خوشی کو خدا کی رضا اور اسلامی فریضہ شمار کروگے تو یہ عمل بہر حال بہت بہتر ہوگا۔[1]

درحقیقت مسلمان ایک خشک اور سخت انسان نہیں ہے بلکہ ایک تربیت یافتہ الفت و شفقت، مہر و محبت کا مجسمہ ہے، لہٰذا اس کی زندگی میں بھی ایسے حالات آشکار ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے یہاں روایات میں اس بات کی تاکید نہیں ہے کہ جب بھی اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر جاؤ کم از کم ایک عدد سرخ سیب لے جاؤ اور اس مختصر تحفہ کے ذریعہ ہی اپنے عزیز مومن کو خوش و مسرور کرو؟ یہ سب کیا ہے؟ مہر و محبت، دوستی و برادری سے بھری ہوئی ایسی زندگی خود مطلوب پروردگار عالم ہے اور جو اس راہ میں قدم رکھتا ہے وہ خدا کی مرضی و خوشنودی سے کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتا اور اس عمل کے ذریعہ اس کے اس سفر کے اخلاص میں کوئی فرق ہی پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اب مسئلہ یہی رہ جاتا ہے کہ تم کیسا تحفہ، کس نیت سے خریدنا چاہتے ہو۔ جو شخص خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کی بنیاد پر کوئی تحفہ خریدنا چاہتا ہے تو جب وہ اسے خریدنے نکلتا ہے تو پورے طور سے مطمئن رہتا ہے کہ مجھے کیا خریدنا ہے اور کس لئے خریدنا ہے، کیسا تحفہ خریدنا ہے اور کس قدر خریدنا ہے۔ اپنے اس اطمینان کی روشنی میں وہ ان تمام باتوں پر غور کرتا ہے۔ ورنہ اگر مثال کے طور پر میں سود کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے یا قرض لئے گئے پیسوں سے تحفے وغیرہ خریدوں (یہاں بقیہ طریقوں کو بیان نہیں کروں گا، صرف انھیں پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا) یا میں لوگوں کا مقروض ہوں اور لوگ مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں پھر بھی میں وقت پر انھیں قرض ادا نہیں کرتا بلکہ ان پیسوں سے تحفے خرید کر لاتا ہوں اگر اس انداز سے کوئی تحفے وغیرہ خریدے تو یہ (حج کے سفر) سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ یا یہ کہ جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں اگر اس میں ایسے محتاج افراد بھی رہتے ہوں جن کی ضرورتیں تحفے تحائف کی خریداری پر مقدم ہیں تو ایسے تحفے یا سوغات کا خریدنا بھی مناسب نہیں ہے۔ در اصل خدا کی یاد روح کی مانند ہمارے رگ و ریشہ میں موجود رہنی چاہئے تاکہ وہ انسان کے لئے ہدایت کا کام کر سکے اور اس کے لئے راہ کا تعین کرے کہ فلاں جگہ جاؤ اور فلاں جگہ مت جاؤ۔ یہ کام کرو اور وہ کام

---

[1] اس سلسلہ میں روایت بھی موجود ہے جس میں ارشاد ہے کہ "الھدیۃ من نفقۃ الحج" یعنی ہدیے اور تحفے حج کے اخراجات کا جزو ہیں۔ فروع کافی ج ۴۔ کتاب الحج، باب الفضل فی نفقۃ الحج ص ۲۸۰

نہ کرو۔ ایسے کرو، ویسے نہ کرو، اسلام ایسے ہی خدا کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اس طرز فکر کی روشنی میں اب جبکہ ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں اور بت پرستی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں صحیح اور پاکیزہ اسلامی حج ادا کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں ہمیں متوجہ رہنا چاہیئے کہ اس سفر کے دوران کاروممعاش کی فکر غلط فکر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ایکدم گریز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کی شناخت میں غلط نتائج حاصل کئے ہیں۔ یہ غلطی کہاں سے وجود میں آئی؟ صحیح اور غلط توحید و خدا پرستی میں اختلاط کی بنیاد پر۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی اپنے وسیع اور کامل معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک مسلمان کی زندگی پر بھرپور اثر انداز ہوتی ہے اور یہ صحیح خدا پرستی و توحید ہی ہے جو اسلامی فرد و امت دونوں کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اسی بنا پر جناب ابراہیم نے ایک باعظمت موحد کی حیثیت سے اپنے فرزند اسماعیل کے ہمراہ اہل توحید کے لئے اس دور افتادہ مقام پر ایک سادہ سے گھر کی بنیاد رکھی اور توحید سے سازگار عبادتی اعمال و مناسک قائم کئے ہیں۔ لہٰذا توحید و خدا پرستی کے اصل محور و مرکز کی سالمیت و حفاظت کے لئے ان کی عظیم خدمات کو یاد رکھنا چاہیئے اور یہی حج کی اساس و بنیاد ہے۔

مناسک حج کا مقصد، توحید کی حفاظت

چونکہ توحید ہی حج کی اساس و بنیاد ہے لہٰذا ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ مناسک حج میں اس اصل کی کہاں تک رعایت کی گئی ہے تاکہ حج کے تمام اعمال کو اسی محور پر پرکھا جا سکے۔ چنانچہ ہم اس کی ابتدا وہیں سے کرتے ہیں جس کی طرف پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

اگر خدا ایک ہے تو اہل توحید کا سماج بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کوئی چیز اہل توحید کے اس متحد سماج میں افتراق و اختلاف کا سبب نہیں بن سکتی۔ کیا خدا بھی دو ہو سکتا ہے؟ جب خدا ایک ہی ہے تو خدا پرستوں کا سماج بھی ایک اور متحد ہونا چاہیئے۔ حج کی صورت میں سال بہ سال ایک اجتماع اس مقصد کے استحکام میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اہل توحید کے سالانہ اجتماع کے لئے کسی ایک نقطہ یا مرکز کا انتخاب کرنا چاہیں تو ان دو معصوم خدا پرستوں کے ہاتھوں تعمیر شدہ خدا کے اس سادہ گھر سے پاکیزہ اور بہتر اور کون سی جگہ نظر آتی ہے؟ وہ مرکز جہاں تک اہل توحید کا سفر کرنا خود توحید و یکتا پرستی کی راہ میں ایک عظیم محافظ و نگہبان کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ہم مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ،

اے اہلِ اسلام دنیا کے ہر گوشہ و کنارے سے ہر درہ عمیق سے (جیسا کہ خود قرآن میں فج عمیق آیا ہے[1]) اور دور و نزدیک سے خدا کے نام پر اور اس کی یاد کے ساتھ اپنے گھروں سے کوچ کرو تاکہ ایک مخصوص دن مخصوص جگہ پر تمام آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک و پاکیزہ ایک عظیم اجتماع تشکیل پائے اور تم اپنی آنکھوں سے اس اجتماع کے (لیشہدوا منافع لہم[2]) مادی، دنیاوی اور معنوی و روحانی منافع و فوائد دیکھو۔ اور درک کر سکو! اس اجتماع سے متعلق ایک نکتہ کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ اس جگہ مزید دو ایک نکتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس نکتہ کی طرف اشارہ کر چکا ہوں وہ یہ تھا کہ حج کا موجودہ اجتماع ایسی بہت ساری سازشوں کا (اجمالی طور پر) سدباب کرنے میں بڑا موثر ثابت ہوا ہے جو صدیوں سے ہم مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی کا سبب بنی ہوئی ہیں اور جن کے ذریعہ مذہبی عنوان کے تحت مختلف طریقوں سے اسلامی سماج و معاشرہ کے اتحاد و یگانگت میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ میں پورے اطمینان و وثوق سے کہہ سکتا ہوں (اور وہ بھی اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر) کہ اگر حج کا یہ سالانہ اجتماع نہ ہوتا تو آج جو کمزور و خفیف سا اتحاد و یگانگت گوناگوں فرقوں اور مسلکوں کے مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے، وہ بھی نہ ہوتا یا اگر ہوتا بھی تو بہت ہی ضعیف و کمزور تر ہوتا۔ کیونکہ درحقیقت امت اسلامی کے اتحاد کی حفاظت و نگہبانی حج کا فریضہ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب خدا ایک ہے تو خدا پرستوں کی امت بھی ایک ہی ہے۔ چنانچہ جب ایک شیعہ مسلمان جس کے دماغ میں سنی مسلمان کے خلاف سیکڑوں قسم کی غلط باتیں ڈال دی گئی ہیں جب وہاں جاتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تمام سنی مسلمان علیؑ کے دشمن نہیں ہیں وہ یہ دیکھتا ہے کہ سیکڑوں سنی علیؑ سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ اس نے یہ سنا تھا کہ تمام سنی فاطمہ زہراؑ کے دشمن ہیں یہ جھوٹ ہے بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ سیکڑوں سنی جنت البقیع جاتے اور اس جگہ کا احترام کرتے ہیں یہاں تک کہ بقیع میں دفن دیگر ائمہ معصومینؑ کا بھی احترام بجالاتے ہیں۔ اس وقت اسے یہ خیال آتا ہے کہ اب تک اسے دھوکہ میں رکھا گیا اور وہ سنی مسلمان بھی جس نے یہ سن رکھا تھا کہ شیعہ در اصل کسی دوسرے دین کا حامل ہے اور ایک الگ قبلہ کی طرف اسلام سے ایک عجیب و غریب نماز پڑھتا ہے۔ وہاں وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتا ہے شیعہ اسی کی طرح اسی قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر رہا ہے۔

---

[1] حج/۲۷ [2] حج/۲۸

ویسے ہی انداز میں حج کے مناسک بجا لا رہا ہے جیسے ہم ادا کرتے ہیں۔ فقط چند جگہوں پر فتووں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ خود اہل سنت بھی آپس میں (فتووں کا اختلاف) رکھتے ہیں۔ اس طرح اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں جو غلط تبلیغات کے ذریعہ یہ اتارا گیا تھا کہ شیعہ کافر اور بے دین ہوتے ہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ (لیشھدوا) اور جب وہ ان تمام مفید باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو پھر غلط تبلیغات آسانی سے اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

ان مناظر کا دیکھنا اور ان پر غور کرنا بہت مؤثر ہے۔

جناب سید علی خامنہ ای
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

ہمارے ائمہ اور سیاسی جدوجہد

زیر نظر مقالہ امام رضا علیہ السلام سے متعلق دوسری عالمی کانفرنس کے موقع پر صدر جمہوریہ اسلامی ایران حجۃ الاسلام والمسلمین جناب سید علی خامنہ ای مدظلہ کے افتتاحی خطاب سے ماخوذ ہے۔ البتہ اس محققانہ بحث کی اہمیت کے پیش نظر طباعت سے قبل موصوف نے نظر ثانی کے دوران حسب ضرورت اس میں اضافہ و تشریح بھی فرما دیا ہے ہم اس امید کے ساتھ کہ ائمہ علیہم السلام کی سیرت طیبہ کا یہ اہم عنصر مفکرین اسلام کی فکر و نظر کے دریچے کھولنے کا سبب بنے گا یہ گراں بہا مقالہ قارئین توحید کی خدمت میں نذر کر رہے ہیں۔

مدیر

خدا کا ہزار شکر کہ اس عظیم اجتماع میں ایک دیرینہ آرزو کے پورے ہونے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ ائمہ علیہم السلام کی مظلومیت ان بزرگان اسلام کی زندگیوں تک محدود نہیں رہی، بلکہ آج سیکڑوں سال گزر جانے کے باوجود ان حضرات کی سیرت کا ایک اہم ترین بلکہ اصلی ترین رخ لوگوں کی عدم توجہی کا شکار ہے جس نے ائمہ کی مظلومیت کو تاریخی استمرار عطا کر دیا ہے۔ یقیناً گذشتہ صدیوں میں بڑی ہی بے مثال اور قیمتی کتابیں اور مقالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں کیونکہ ان پاک اور بزرگ ہستیوں کی زندگیوں سے متعلق تمام روایات مختلف مجموعوں کی شکل میں آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے جمع کر دینا ایک بڑا کارنامہ ہے پھر بھی "سیاسی جدوجہد کے نقوش" جو ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی تقریباً دو سو پچاس (۲۵۰) سال کی ظاہری زندگی کے اہم ترین اور ممتاز ترین پہلو ہیں، ان بے شمار احادیث و روایات اور ان کے علمی و معنوی

پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی سوانح حیات میں تقریباً گم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہمیں ائمہ علیہم السلام کی زندگی، درس اور اسوہ کے عنوان سے ہمہ وقت یاد رکھنی چاہئے نہ کہ اس کا م صرف ایک شاندار قابل فخر یادگار کے عنوان سے وقتاً فوقتاً ذکر کر لیا کریں اور بس ـــ چنانچہ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان عظیم ہستیوں کی سیاسی روش اور ان کے طریقہ کار پر بھی توجہ دیں۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے اس رخ نے خاص طور پر متاثر کیا ہے اور میں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ میرے ذہن میں یہ خیال ۱۹۷۰ء ان سخت ترین امتحانی ایام میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی ائمہ معصومینؑ کی زندگی کے اس رخ سے غافل نہیں تھا اور اعلائے کلمۂ توحید و استقرار حکومت الٰہی کے سلسلہ میں ان عظیم مجاہدوں کی قربانی و فداکاری میرے پیش نظر تھی پھر بھی وہ نکتہ جو اس گھڑی ناگہانی طور پر میرے ذہن میں روشن ہوا یہ تھا کہ ان بزرگواروں کی زندگی ـــ اس ظاہری تفاوت کے باوجود جس کو دیکھ کر بعضوں نے متناقض کردار کا گمان کیا ہے ـــ دراصل مجموعی طور پر ایک مسلسل اور طولانی تحریک ہے جو ۱۱ھ سے شروع ہوئی ہے اور دو سو پچاس سال تک مسلسل جاری رہ کر ۲۶۰ھ میں غیبت صغریٰ کی ابتداء کے ساتھ منتہی ہو جاتی ہے۔ یہ تمام ہستیاں مل کر ایک واحد کردار و شخصیت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ان سب کا راستہ اور مقصد ایک ہی ہے لہٰذا ہم بجائے اس کے کہ زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کا الگ اور زندگی سید الشہداءؑ کا الگ اور زندگی سید سجادؑ کا الگ جدا گانہ طور پر جائزہ لیں اور پھر احیاناً اس خطرناک اشتباہ اور دام میں گرفتار ہو جائیں کہ ان تینوں ائمہؑ کی زندگیوں میں بظاہر فرق ان کے درمیان اختلاف و تعارض کی نشاندہی کرتا ہے، ہم ان سب کی زندگی کو ملا کر ایک ایسے انسان کی زندگی فرض کریں جس نے دو سو پچاس سال کی عمر پائی ہو اور ۱۱ھ سے لیکر ۲۶۰ھ تک ایک ہی راہ پر مسلسل طور پر گامزن رہا ہو اس طرح اس عظیم اور معصوم زندگی کا ایک عمل قابل فہم اور لائق توجیہ ہو جائے گا۔

ہر وہ انسان جو عقل و حکمت سے مالا مال ہوگا، چاہے وہ معصوم نہ بھی ہو، جب وہ اتنی طویل مدت طے کرے گا تو حتمی طور پر وقت اور حالات کے تحت مناسب حکمت عملی اختیار کرے گا۔ ممکن ہے وہ کبھی تیزی کے ساتھ حرکت کرنا ضروری سمجھے اور کبھی سست رفتاری میں مصلحت سمجھے حتیٰ کہ ممکن ہے کبھی وہ کسی حکیمانہ تقاضے کے تحت پسپائی بھی اختیار کرلے۔ تو ظاہر ہے وہ لوگ جو اس کے علم و

حکمت اور ہدف و مقصد سے دوستی کا علم رکھتے ہیں اس کی عقب نشینی کو بھی پیش قدمی شمار کریں گے۔ اس نقطۂ نظر سے امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کے ساتھ اور آپ کی زندگی سید الشہداء امام حسینؑ کی زندگی کے ساتھ اور حضرت کی زندگی دیگر آٹھ ائمہ کی زندگیوں کے ساتھ ۲۶۰ھ تک ایک مسلسل تحریک کہی جا سکتی ہے۔

یہ وہ خیال تھا جس کی طرف میں اس وقت متوجہ ہوا اور پھر اسی نقطۂ نظر سے میں نے ان عظیم ہستیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا میری اس فکر کو تائید حاصل ہوتی گئی۔

اگرچہ اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کرنا ایک نشست میں ممکن نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ پیغمبر اسلامؐ کی ذریت طاہرہ یعنی ائمہ معصومینؑ کی پوری زندگی ایک خاص سیاسی موقف کے ہمراہ رہی ہے لہٰذا یہ اس قابل ہے کہ اس کو جداگانہ طور پر مستقل عنوان کی حیثیت سے مورد بحث قرار دیا جائے۔ لہٰذا میں مختصر طور پر یہاں اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

گذشتہ سال اپنے پیغام میں ائمہ طاہرینؑ کی زندگی میں سخت سیاسی جدوجہد کی طرف اشارہ کر چکا ہوں آج ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

پہلی چیز یہ عرض کرنا ہے کہ ائمہ کی فیصلہ کن سیاسی جدوجہد سے ہماری مراد کیا ہے؟

میری نظر میں ائمہ کی مجاہدانہ کوششوں کو محض علمی، اعتقادی اور کلامی مبارزہ کا نام دینا درست نہیں ہے جس طرح کی کلامی تحریکوں کی مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں جیسے معتزلہ و اشاعرہ وغیرہ کی تحریکیں، علمی نشستوں میں ائمہ کی شرکت، حلقۂ درس کی وسعت، بیان حدیث و نقل معارف اسلامی اور احکام فقہی کی تشریح و توضیح وغیرہ فقط اسی لئے نہیں تھی کہ علم فقہ یا علم کلام سے متعلق اپنے مکتب فکر کی حقانیت ثابت کر دی جائے بلکہ ان سے کہیں زیادہ اہم مقاصد میں مضمر تھے۔

اسی طرح اس کو اس نوعیت کا مسلحانہ قیام کہنا بھی درست نہیں ہے جیسا کہ جناب زید شہید اور ان کے بعد ان کے ورثہ یا بنی الحسنؑ اور بعض آل جعفرؑ نیز اسی قبیل کے دوسرے افراد کے یہاں ائمہ علیہم السلام کی حیات کے دوران نظر آتا ہے۔ ان حضراتؑ نے ایسا کوئی مبارزہ نہیں کیا۔ البتہ اسی مقام پر اشارہ کر دینا ضروری ہے (اگر ممکن ہوا تو بعد میں تفصیل سے عرض کروں گا) کہ ائمہ معصومینؑ نے بطور مطلق ان تمام قیام کرنے والوں کی مخالفت بھی نہیں کی اگرچہ بعض کی مخالفت بھی کی ہے۔ لیکن اس کا سبب مسلحانہ قیام نہیں تھا

بلکہ کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔ بعض کی بھرپور تائید بھی کی ہے بلکہ بعض کی مختلف عنوان سے پشت پناہی اور مدد بھی کی ہے۔ اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث قابل توجہ ہے آپ فرماتے ہیں:۔

لوددت ان الخارجی یخرج من آل محمد وعلی نفقۃ عیالہ

مجھے یہ پسند ہے کہ کوئی آل محمدؐ وعلیؑ میں سے خروج کرنے والا قیام کرے اور اس کے اہل وعیال کے اخراجات کا میں ذمہ دار بنوں۔ (اس میں مالی امداد، آبرو کی حفاظت، مخفی جائے تحفظ مہیا کرنا یا اسی طرح کی دوسری مدد بھی شامل ہے) لیکن بہ نفس نفیس خود امام وقت کی حیثیت سے جہاں تک میری نگاہ ہے اس طرح کے کسی موقع پر ان حضرات نے مسلحانہ قیام میں کبھی شرکت نہیں کی۔

چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی جدوجہد سے مراد نہ تو وہ پہلی علمی مبارزہ کی صورت ہے اور نہ ہی اس دوسری نوعیت کا مسلحانہ قیام بلکہ اس سے مراد وہ مبارزہ ہے جو ایک سیاسی ہدف اور مقصد کے تحت ہمیشہ ائمہ علیہم السلام کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اور وہ سیاسی مقصد" ایک اسلامی حکومت کی تشکیل" ہے جس کو ہم اپنی زبان میں حکومت علوی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۲۶۰ھ تک مسلسل طور پر ائمہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک الٰہی حکومت قائم کریں اور یہی اصل مدعا ہے البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود اپنے ہی دور میں (یعنی ہر امام اپنے اپنے دور میں) اسلامی حکومت قائم کردینا چاہتا تھا ممکن ہے یہ جدوجہد مستقبل قریب، مستقبل بعید حتی کہ بعض حالات میں نزدیک ترین مدت سے متعلق رہی ہو مثلاً امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں کی جانے والی کوششیں آئندہ کم سے کم مدت میں اسلامی حکومت کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہیں چنانچہ میب ابن نجبہ اور اسی قبیل کے دوسرے افراد نے جب امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ: آپ نے کیوں سکوت اختیار کرلیا؟ تو ان کے جواب میں امام نے جو جملہ ارشاد فرمایا ہے وہ اسی کی طرف اشارہ ہے امام فرماتے ہیں:۔

"ما ندری لعلہ فتنۃ لکم ومتاع الی حین"

جناب سید سجادؑ کے دور میں یہ کوشش میری نظر میں، مستقبل قریب کے لئے تھیں جس کیلئے ثبوت وشواہد موجود ہیں جو آئندہ پیش کئے جائیں گے۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں غالباً نزدیک ترین مستقبل میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش جاری رہی البتہ امام ہشتم کی شہادت کے بعد

کی جانے والی کوششوں کے سلسلہ میں گمان اس بات کا ہے کہ مستقبل بعید کے لئے رہی ہوں۔ مختصر یہ کہ یہ حکومت کب قائم ہو اس اعتبار سے جد و جہد کا طریقہ کار مختلف ہو سکتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کوششیں ہمیشہ جاری رہی ہیں۔

ائمہ علیہم السلام کی سوائے ان روحی و معنوی امور کے جو ایک بندہ اپنے خدا سے قربت اور عرفانی مراحل کی تکمیل کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے ہر طرح کی سرگرمی۔ درس و تدریس، حدیث و علم کلام کی موشگافیاں مخالفین سے علمی و سیاسی مناظرے مختلف گروہوں کی حمایت یا مخالفت وغیرہ سب کچھ اسی مقصد کے لئے تھی کہ ایک اسلامی حکومت قائم کی جا سکے۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے۔

البتہ اس موضوع پر لوگوں کے درمیان اختلاف نظر رہا ہے اور رہے گا اور مجھے بھی قطعی اس پر اصرار نہیں ہے کہ ہر شخص میری فکر اور نظریہ کو آنکھ بند کر کے قبول کرے بلکہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ بحث کا یہ سرا پوری توجہ اور دقت کے ساتھ مورد نظر قرار دیا جائے اور ائمہ کی زندگی پر اس زاویہ سے تجدید نظر ضرور کی جائے۔ ادھر چند برسوں میں میری تحقیق و جستجو اس محور پر رہی ہے کہ یہ خیال کس حد تک مجموعی طور پر تمام ائمہ علیہم السلام کے بارہ میں اور کس حد تک فرداً فرداً ان حضرات کے سلسلہ میں محکم دلائل کے تحت صادق آتا ہے؟ چنانچہ اس سلسلہ کی بعض دلیلیں کلی نوعیت کی ہیں، مثال کے طور پر :-

ہمیں معلوم ہے کہ امامت، سلسلہ نبوت کی ہی ایک تکمیلی کڑی ہے اور نبیؐ کا از اول امام ہونا ثابت ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول سے بھی ظاہر ہے: "ان رسول اللّٰہ کان ھو الامام۔۔۔ اور رسول اللّٰہ صلعم نے حق و عدالت پر مبنی ایک الٰہی نظام قائم کرنے کے لئے ہی قیام فرمایا تھا اور ایک عرصہ تک اپنی انتھک جد و جہد کے بعد اس طرح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے جسکی تاحیات آپؐ حفاظت بھی کرتے رہے۔ لہٰذا امام جو جانشین نبی ہے، ایک ایسے نظام سے ہرگز غفلت اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ استدلال کی ایک کلی صورت ہے البتہ اس ذیل میں بحث و گفتگو اور مختلف نکات پر غور و خوض کے ذریعہ تحقیق کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ہماری بعض دلیلیں جو خود ائمہ علیہم السلام کے ان کلمات سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے بطور دلیل کے صادر فرمائے ہیں یا ان کے اس طریقۂ زندگی سے مستفاد ہیں جو اس نکتہ کی طرف متوجہ رہتے اور اس اعلیٰ مقصد کو ذہن میں رکھنے کے بعد اپنے اندر

معنی پیدا کر لیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے اگر ہم اپنے آپ کو اس زمانہ کی وضعیت اور ماحول میں پہونچا کر حالات کا جائزہ لیں تو اس صورتحال کے سمجھنے میں ضرور کسی حد تک مدد مل سکتی ہے جس سے ائمہ نبرد آزما تھے یعنی اگر ہم خود اپنے آپ کو انکی جگہ پر محسوس کریں تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ جیسا کہ اس زمانہ (شاہ) میں ہمارے لئے یہ کیفیت حاصل تھی، تاریک و متعفن قید خانے میں پہونچکر ایک انسان "السلام علیٰ المعذب فی قعر السجون وظلم المطامیر ذی الساق المرضوض بحلق القیود" جیسے جملے کا مفہوم اور علت و وجہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال اسی نقطہ نظر کو مرکز بحث قرار دیتے ہوئے اپنے افکار و خیالات آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

جو افراد دوسری صدی ہجری کی سیاسی تاریخ پر بھرپور نظر رکھتے ہیں اور جنھوں نے ۱۰۰ھ سے کچھ قبل سے لیکر ۱۳۲ھ یعنی بنو عباس کے آغاز حکومت تک بنی عباس کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا ہے کسی حد تک ائمہ علیہم السلام کی بھرپور سیاسی جدوجہد کو اس وقت کی بنی عباس کی سیاسی زندگی سے شبیہ دے سکتے ہیں لیکن جس نے بنوعباس کی زندگی ان کی سیاسی جدوجہد اور ان کی دعوتوں کا قاعدہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے اس کے لئے ہرگز یہ شبیہ قابل فہم ورسا نہیں ہو سکتی ــ اسی طرح کے حالات ائمہؑ کی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں بس فرق جوہر کا ہے جو ائمہ کے مقصد اور بنی عباس کے مقصد، ائمہ کی روش اور بنی عباس کی روش ائمہ کی شخصیت اور بنوعباس کی شخصیت کے درمیان پایا جاتا ہے البتہ شکل و نقشہ کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بہت نزدیک نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض موارد میں یہ دونوں راہیں ایک دوسرے میں مخلوط و مدغم نظر آتی ہیں یعنی بنوعباس آل علیؑ کے ساتھ اپنے طریقہ کار، تبلیغات اور نعرہ و دعوت کی یکسانیت و قربت کی وجہ سے عراق و حجاز سے دور علاقوں میں ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہ آل علیؑ کی راہ پر ہی کاربند ہیں ــ حتیٰ کہ مسوّدہ نے بنوعباس کی طرف دعوت آغاز کے وقت جب خراسان دے میں سیاہ لباس پہنے تو نعرہ لگایا: "ھٰذا السواد، حداد آل محمد و شھداء کربلا و زید و یحییٰ"

یعنی یہ سیاہ لباس شہداء کربلا اور زید و یحییٰ کے ماتم کی علامت ہے۔ چنانچہ یہاں کے بعض رہنے والے حتیٰ کہ سرداران قبیلہ بھی ان سیاہ پوشوں کے بارہ میں یہی خیال کرتے تھے کہ یہ لوگ آل علیؑ کے لئے کام کر رہے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ میں بھی نظر آتی ہے البتہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، تین بنیادی عنصر — مقصد، روش اور اشخاص کے فرق کے ساتھ ہے۔ ائمہ کی زندگی میں سیاسی جدوجہد کا یہی مطلب ہے۔

ائمہ کی سیاسی تحریک کی کلی تصویر

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کے سیاسی جہاد اور جدوجہد کی کلی طور پر تصویر کشی کر دی جائے اس کے بعد ائمہ کی زندگی سے ان کی سیاسی جدوجہد کے چند روشن نمونے بھی پیش کیے جائیں گے۔

اس کلی تصویر کشی کے سلسلہ میں پہلے تین ائمہ یعنی امیرالمومنینؑ، حسن مجتبیٰؑ اور سیدالشہداء علیہم السلام کی زندگیوں کو فی الحال ہم مورد بحث قرار دینا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے بارہ میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کا سیاسی تحریک سے وابستہ ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے چنانچہ ہم اپنی بحث جناب سید سجاد علیہ السلام سے شروع کرتے ہیں۔

میری نظر میں امام زین العابدین علیہ السلام کے دور یعنی سنہ ۶۱ھ سے لیکر سنہ ۲۶۰ھ تک دو سو سال کا عرصہ تین سیاسی سرحدوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

یہ پہلا مرحلہ سنہ ۶۱ھ سے سنہ ۱۳۵ھ یعنی منصور عباسی کی ابتدائے خلافت تک پھیلا ہوا ہے اس مرحلہ میں سیاسی جدوجہد ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اس میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے پھر گہرائی حاصل کر کے پھیلنا شروع ہوتی ہے اور پورے اوج پر آجاتی ہے یہاں تک کہ سنہ ۱۳۵ھ میں سفاح کی موت اور منصور دوانقی کی خلافت کے ساتھ یہ ایک نئے موڑ سے دوچار ہوتی ہے ایسی مشکلات سامنے آتی ہیں کہ بڑی حد تک اس کی ترقی میں ٹھہراؤ پیدا ہوتا نظر آنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے سیاسی تحریکوں میں اس طرح کی صورت اکثر پیش آتی رہتی ہے۔ خود اسلامی انقلاب ایران کے سلسلہ میں ہم ایسی کیفیات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

دوسرا مرحلہ سنہ ۱۳۵ھ سے سنہ ۲۰۲ھ یا سنہ ۲۰۳ھ تک کا ہے جو شہادت امام رضا علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ دور پہلے دور کے بہ نسبت جدوجہد کے اعتبار سے بالاتر عمیق تر اور وسیع تر نظر آتا ہے اگرچہ اس دور کا آغاز سخت مشکلات کے ہمراہ ہوا تھا پھر بھی اس نے رفتہ رفتہ اوج حاصل کر لیا، پھیلا

اور قدم بہ قدم کامیابیوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ امام ہشتم حضرت علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس جدوجہد میں پھر توقف پیدا ہو گیا۔

تیسرا مرحلہ، ۲۰۴ھ میں مامون رشید کے بغداد چلے جانے کے بعد اسلامی جدوجہد کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے دراصل مامون کی خلافت کے ابتدائی دن ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے نہایت ہی دشوار اور محنت و تعب کے دن ہیں اگرچہ اس دور میں ہمیشہ سے زیادہ تشیع پھیلا، میری نظر میں اس عصر میں ائمہ علیہم السلام کو مصائب و آلام کا مقابلہ ہمیشہ سے زیادہ کرنا پڑا ہے اور یہ وہی زمانہ ہے جب میرے خیال میں، اس سیاسی جدوجہد کا رخ مستقبل بعید کے ہدف کی طرف پھر چکا تھا۔ یعنی اب ائمہ کو غیبت صغریٰ سے قبل الٰہی حکومت کے قیام کی امید نہیں رہ گئی تھی ان کی کوششیں مستقبل بعید کے لئے زمین ہموار کرنے کی طرف منتقل ہو چکی تھیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکری ؑ کی شہادت اور غیبت صغریٰ کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

یہ تینوں ادوار کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جنھیں اجمالی طور پر بیان کروں گا۔

پہلا دور

یہ دور سید سجادؑ، امام باقرؑ اور صادق اہلبیت طہارتؑ کی زندگی کے ایک حصے پر مشتمل ہے چنانچہ اس کا آغاز بے پناہ دشواریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کربلا کے حادثہ نے دنیائے شیعیت بلکہ پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور قتل و قید و شکنجہ و ظلم کوئی نئی بات نہ تھی لیکن خاندان نبوت کی شہادت اور پھر مخدرات عصمت و طہارت کی اسیری، ان کی شہر بہ شہر تشہیر، فرزندان زہراؑ کے سرہائے بریدہ کا نیزوں پر بلند کیا جانا جبکہ ابھی وہ لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے ان لبہائے مبارک کو پیغمبر اسلام کا بوسہ دیتا خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ چیزیں تھیں جس نے پورے جہان اسلام کو مبہوت و متحیر کر دیا تھا کسی کے تصور میں بھی نہ تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے اگر یہ شعر جو جناب زینب سلام اللہ علیہا کی طرف منسوب ہے درست ہو کہ ؎

ماتوهمت یاشقیق فؤادی   کان هذا مقدراً مکتوبا

دراصل اسی ناقابل تصور درد و کرب کا اظہار ہے۔ اور یہی احساسات تمام لوگوں کے تھے۔

یکایک ذہنوں میں یہ تصور پیدا ہونے لگا کہ موجودہ سیاست ایک دوسری قسم کی سیاست ہے یہ ظلم و زیادتی ایک ہونے والی زیادتیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ناقابل تصور چیزوں نے عملی جامہ پہن لیا اور انجام دی گئیں چنانچہ تمام دنیائے اسلام پر ایک عجیب قسم کی دہشت اور رعب کا عالم طاری تھا صرف کوفہ میں توابین اور پھر مختار کی برکت سے کچھ فضا متحرک ہوتی نظر آئی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ مدینۂ منورہ نیز دیگر مقامات پر واقعۂ کربلا کے اثر سے ایسا شدید قسم کا رعب مسلط تھا حتی کہ مکہ معظمہ میں بھی جہاں کچھ دنوں بعد عبداللہ بن زبیر نے آواز اٹھائی — ایسی کیفیت طاری تھی کہ تاریخ اسلام میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کوفہ میں بھی اگرچہ سنہ ۶۴ سنہ ۶۵ ہجری میں دکیونکہ بظاہر توابین کو سنہ ۶۵ھ میں شہید کیا گیا) توابین کی کوششوں سے وہاں کی مرگبار بوجھل فضا میں ایک تازہ لہر پیدا ہوئی لیکن دوبارہ توابین کی شہادت نے اس خوف و وحشت میں اور اضافہ کر دیا اور پھر جب اموی کارخانۂ سیاست کے دشمن یعنی مختار اور مصعب ابن زبیر آپس میں لڑ پڑے اور عبداللہ ابن زبیر کو مکہ میں رہ کر بھی اہلبیتؑ کے طرفدار جناب مختار کا وجود کوفہ میں برداشت نہ ہو سکا اور مصعب ابن زبیر کے ہاتھوں مختار قتل کر دیئے گئے اس سے خوف و وحشت میں مزید اضافہ ہوا اور امیدیں، مایوسی سے بدلنے لگیں اور آخرکار جیسے ہی عبدالملک ابن مروان کو تخت بنوامیہ پر تسلط حاصل ہوا تھوڑے ہی عرصہ میں پوری دنیائے اسلام پر بنوامیہ کی گرفت مضبوط ہوگئی اور اکیس سال تک پورے قدرت و اقتدار کے ساتھ وہ مسلمانوں کی تقدیر کے ساتھ کھیلتا رہا۔

واقعۂ حرّہ

اس مقام پر خاص طور سے واقعۂ حرّہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سنہ ۶۴ھ میں جس سال مدینۂ رسولؐ پر مسلم بن عقبہ نے چڑھائی کی ہے یہ واقعہ رونما ہوا جو مزید رعب و وحشت پیدا کرنے کا سبب قرار پایا اور جس نے اہلبیتؑ کو مکمل طور پر غربت و مظلومیت میں مبتلا کر دیا۔ اس حادثہ کی حقیقت مختصر طور پر یہ ہے کہ سنہ ۶۲ھ میں یزید نے شامی سرداروں میں سے ایک ناتجربہ کار جوان کو نمایندہ بنا کر مدینہ روانہ کیا جس نے اہل مدینہ کے خیالات یزید کی طرف سے صاف کرنے کیلئے چند افراد کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شام جا کر یزید سے ملاقات کریں چنانچہ کچھ لوگ اس

پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے شام جا کر یزید سے ملاقات بھی کی اگرچہ یزید نے ان کو بہت زیادہ انعامات (تقریباً پچاس ہزار سے ایک لاکھ درہم تک) سے نوازا لیکن یہ لوگ جو خود صحابہ میں سے یا اولاد صحابہ میں سے تھے یزیدی دربار کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اور زیادہ متنفر اور خشمگین ہو گئے اور جب مدینہ واپس ہوئے تو عبد اللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ نے اپنی حکومت کا اعلان کر کے یزید کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا مرکزی حکومت سے مدینہ کا رابطہ منقطع کر لیا گیا۔ یزید نے بھی مسلم ابن عقبہ کو ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور مدینۂ رسول میں ایسا عظیم المیہ برپا ہوا جس نے تاریخ میں خون کے آنسو رلا دینے والے سسکیوں اور آہوں سے معمور باب کا اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بھی لوگوں میں شدید رعب و وحشت ایجاد کرنے کا سبب بنا۔

فکری انحطاط

اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے جس نے لوگوں کو دین کی طرف سے بے اعتنا اور لاپرواہ بنا رکھا تھا گذشتہ بیس برسوں کے دوران پورے عالم اسلام میں ایک عجیب فکری انحطاط پیدا ہو چکا تھا جس کے نتیجہ میں دینی تعلیمات کو لوگوں نے یکسر فراموش کر دیا تھا۔ گویا سنہ ۴۰ھ کے بعد تقریباً بیس سال کے عرصہ میں دین و ایمان کی تعلیم، آیات الٰہی کی تفسیر اور پیغمبر اسلام کے حق و آگہی سے بھرپور بیانات اس حد تک محدود ہو کر رہ گئے تھے کہ عوام الناس اعتبار و ایمان کے لحاظ سے بالکل فرومایہ، کھوکھلے اور دیوالیہ ہو چکے تھے۔ جب ایک انسان اس دور کی عوامی زندگی کا ذرا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور مختلف تاریخوں اور روایتوں میں ان کے حالات کھنگالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی معاشرہ میں علماء و قاریٔین اور محدثین و مقدسین بالکل ناپید ہو چکے تھے (ان کے بارہ میں بھی گفتگو بعد میں آئے گی) پھر بھی عوامی زندگی بلاشبہ بے ایمانی و بے اعتقادی کا شکار تھی حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ خود دربار خلافت سے تعلق رکھنے والے افراد نبوت کو بھی زیر سوال قرار دینے لگے تھے چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ خالد بن عبد اللہ قسری، جس کو بنوامیہ کی پستی و رذالت کا بدترین نمونہ کہا جا سکتا ہے، بڑی ہی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتا ہے:۔

"کان یفضل الخلافۃ علی النبوۃ" (معاذ اللہ) خلافت نبوت سے بالاتر ہے!! اور اس کے لئے دلیل کے طور پر کہتا تھا کہ، "ایہما افضل ؟خلیفۃ الرجل فی اھلہ او رسولہ الی اصحابہ؟" اگر تم ایک شخص کو اپنا جانشین، اپنے خانوادہ میں مقرر کرتے ہو تو وہ شخص تم سے قریب تر ہو گا یا وہ شخص جس کو کسی کے پاس پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا جائے؟! ظاہر ہے جس کو تم اپنے خانوادہ میں منتخب کر کے اپنا جانشین مقرر کرتے ہو وہی تم سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفۃ اللہ (یہ لوگ خلفاء کو خلیفۂ رسول کے بجائے خلیفۂ خدا تصور کرنے لگے تھے) رسول اللہ سے بالاتر ہے۔

یہ تو خالد بن عبد اللہ قسری کی بات تھی یقیناً اس طرح کی باتیں دوسرے افراد بھی کرتے رہے ہونگے جب میں نے بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کے شعراء کے یہاں تلاش کرنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ عبد الملک بن مروان کے زمانہ سے خلفاء کے لئے خلیفۃ اللہ کی تعبیر اس کثرت سے استعمال کی جانے لگی کہ عوام یہ بھی بھول گئے کہ خلیفہ، خلیفۂ پیغمبر بھی ہوتا ہے یہ سلسلہ بنو عباس کے دور میں بھی جاری رہا چنانچہ بشار ابن برد نے جب یعقوب ابن داؤد اور منصور کی ہجو لکھی تو اس میں بھی یہی تعبیر استعمال کی:

ضاعت خلافتکم یا قوم فالتمسوا خلیفۃ اللہ بین الزق والعود

سوچنے کا مقام ہے جب ایک شاعر ہجو کرتا ہے تو بھی خلیفۃ اللہ کی لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس زمانہ کے تمام نامور شعراء۔ جریر، فرزدق، نصیب اور سیکڑوں بڑے مشہور شعراء جب خلیفہ کی مدح سرائی کرتے ہیں تو اس کو خلیفۃ اللہ خطاب کرتے ہیں۔

یہ اس زمانہ کے لوگوں کے اعتقاد کا صرف ایک نمونہ ہے دین کی بنیادی باتوں کے سلسلہ میں بھی اس حد تک ایمان کمزور ہو چکا تھا۔

لوگوں کے اخلاق و عادات تو اس سے بھی زیادہ خراب تھے۔ ابو الفرج کی کتاب اغانی کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ یہ میرے ہاتھ آیا کہ تقریباً اسّی اور نوے ہجری سے ۵۰، ۶۰ سال بعد تک جتنے بڑے بڑے گانے بجانے والے عیاش اور عشرت طلب افراد تھے وہ مدینہ سے تعلق رکھتے تھے یا مکہ سے۔ چنانچہ جب شام میں خلیفہ کا دل اکتا جاتا تھا اور محفل رقص و سرود گرم کرنے کی خواہش مچلنے لگتی تھی تو بہترین قسم کے گانے بجانے والوں کے حاضر کئے جانے کا حکم صادر ہوتا تھا اور فوراً کسی کو مکہ یا مدینہ، جو اس وقت کے مشہور و معروف گانے بجانے والے مغنیوں اور طبلہ بجانے والوں کا

مرکز تھے، روانہ کیا جاتا اور وہ وہاں سے چنیدہ افراد کو ساتھ لے آتا۔ بدترین فحاشی اور ہرزہ سرائی کرنے والے شعراء مکہ اور مدینہ میں موجود تھے۔

مرکز وحی والہام اور منبع ایمان واسلام مرکز فحشا و فساد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہمیں مکہ ومدینہ کے بارے میں ان تلخ حقائق کو بھی جاننا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ائمہ کے حالات زندگی سے متعلق کتب وآثار میں ان تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی کی گئی ہے۔

مکہ میں ایک عمر ابن ربیعہ نامی شاعر تھا جس کا شمار بدترین عریاں اور فحش نگاروں میں ہوتا تھا۔ البتہ شک نہیں کہ فن شاعری میں اس کو پوری قدرت اور کمال حاصل تھا۔ اس کی داستان اور اس قسم کے دوسرے شعراء کا کردار ایک نہایت ہی افسوسناک اور شرم انگیز تصویر پیش کرتا ہے خود مقامات طواف ورمی جمرات نیز دیگر مشاہدہ مقدسہ ان لوگوں کی بیہودہ گوئی اور فسق وفجور کے شاہد ہیں۔ "مغنی" میں درج یہ اشعار ہے

بدالی منہا معصم حین جمرت ÷ وکف خضیب زینت ببنان

فواللہ ما ادری وان کنت داریا ÷ بسبع رمین الجمرام بثمان

اسی دور کی وضعیت وکیفیت کی عکاسی کرتے ہیں ــــ ایک راوی کے الفاظ میں جس وقت عمر ابن ربیعہ مرا ہے پورے مدینہ میں صف ماتم بچھ گئی مدینہ کی گلیوں اور کوچوں سے لوگوں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں بلند تھیں۔ جس طرف سے گزریئے نوجوانوں کی ٹولی حلقہ بنائے عمر ابن ربیعہ کی موت پر!! رنج وغم میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ میں نے ایک کنیز کو دیکھا کہ کسی کام سے چلی جارہی ہے اور اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہیں گریہ وزاری کرتی ہوئی جب وہ کچھ نوجوانوں کے قریب سے گزری تو انھوں نے سوال کیا، کیوں اس قدر گریہ کررہی ہو؟ کنیز نے جواب دیا "اس لئے کہ یہ شخص ہمارے ہاتھ سے چلا گیا"! کسی نے کہا "غم نہ کرو مکہ میں ایک دوسرا شاعر حارث ابن خالد مخزومی موجود ہے اور وہ بھی عمر ابن ابی ربیعہ کی طرح شعر کہتا ہے" یہ کہہ کر اس نے حارث کا ایک شعر سنایا جس کو سن کر کنیز نے اپنی آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "الحمد للہ الذی لم یخل حرمہ (خدا کا شکر کہ اس نے اپنا حرم خالی نہیں چھوڑا!!)

یہ اہل مدینہ کی اخلاقی کیفیت کا ایک معمولی سا نقشہ تھا۔ اس طرح کی بے شمار داستانیں اور اہالیان مکہ و مدینہ کی نشست و برخاست کے واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور یہ پست طبقہ کے افراد تک محدود نہیں بلکہ ہر طبقہ کا یہی عالم تھا ایک گدائی کرنے والا فاقہ خور و بدبخت شاعر اور جو کہ "اشعب الطامع" (لالچی) کے نام سے مشہور تھا اس سے لیکر کوچہ و بازار میں پھرنے والے معمولی آدمی اور کیا عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والے قریشی نواب زادے سبھی یکساں تھے حتی کہ بعض ائمہ جن کا نام میں یہاں نہیں لینا چاہتا ان کی بھی یہی حالت تھی۔ قریش کی مشہور و معروف شخصیتوں کی اولاد کیا مرد اور کیا عورتیں عیاشوں، فاسقوں اور فاجروں کی صف میں شامل تھیں۔ یہی شخص حارث بن خالد کی گورنری کے زمانہ میں ایک دن عائشہ بنت طلحہ طواف میں مصروف تھی چونکہ یہ شخص اس سے خاص تعلق خاطر رکھتا تھا، جب اذان کا وقت ہوا عائشہ نے حارث کے پاس پیغام بھجوایا کہ کہدو کہ جب تک میرا طواف تمام نہ ہو اذان نہ دی جائے حارث نے حکم دیدیا کہ عصر کی اذان نہ دی جائے لوگوں نے اعتراض کیا کہ تم ایک شخص کے طواف کی خاطر چاہتے ہو کہ لوگوں کی نماز میں تاخیر ہو جائے؟ تو حارث جواب دیتا ہے: "بخدا اگر کل صبح تک بھی اس کا طواف طول کھینچتا تو میں یہی کہتا کہ اذان نہ دی جائے۔"!!

سیاسی بدعنوانیاں

اس فکری اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ہی ساتھ یہ دور سیاسی بدعنوانیوں سے بھی دوچار تھا اور اس کا بھی دینی احکام سے بے اعتنائی میں بڑا دخل تھا۔ زیادہ تر بڑی بڑی شخصیتیں اپنی مادی خواہشات کی تکمیل کے لئے حکومت کے سربرآوردہ افراد کی ڈیوڑھیوں پر سلامی دیا کرتی تھیں۔ محمد بن شہاب زہری جیسی بزرگ شخصیت جو ایک وقت امام سجادؑ کے شاگردوں میں داخل تھی اپنے آپ کو اس پستی میں گرا چکی تھی کہ امام چہارمؑ کو وہ مشہور و معروف خط لکھنا پڑا جو صرف ایک خط ہی نہیں بلکہ ان حقائق کی بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ اس نے کس قسم کے لوگوں سے ربط ضبط پیدا کر رکھا تھا اور محمد بن شہاب جیسے افراد کی کمی نہیں تھی۔۔ علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ نے جوابات ابن ابی الحدید سے نقل کی ہے اس کو پڑھ کر انسانی ذہن کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ بحار الانوار میں علامہ مجلسیؒ

نے اولاً جناب جابرؓ کی زبانی امام سجادؑ کا ایک قول نقل کیا ہے امامؑ فرماتے ہیں : مالندری کیف نصنع بالناس ، ان حدثناھم بما سمعنا من رسول اللہ ضحکوا (نفعلیہ کہ حدیث رسول کو قبول نہیں کرتے بلکہ ہنس کر مذاق اڑاتے ہیں) وان سکتنا لم یسعنا۔

اس کے بعد علامہ ایک ماجرا نقل کرتے ہیں کہ حضرتؑ لوگوں کے درمیان حدیث نقل کر رہے ہیں کہ مجمع کے درمیان سے ایک شخص اٹھ کر مذاق اڑاتا ہے اور حدیث قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے "۔ واقعہ نقل کرنے کے بعد علامہ مجلسی، زہری اور سعید ابن مسیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ منحرفین میں سے تھے۔ (اگرچہ میں ذاتی طور پر سعید ابن مسیب کے سلسلہ میں یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیوں کہ دوسری دلیلوں سے آپ کا امام علیہ السلام کے حواریین میں سے ہونا ثابت ہے البتہ زہری کے سلسلہ میں یہ بات صحیح ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے افراد پر یہ بات صادق آتی ہے) جیسا کہ اس کے بعد خود علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ: "ابن ابی الحدید نے ایسی بہت سی شخصیتوں اور اس دور کے رجال (معزز ہستیوں) کا نام ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سب اہلبیت سے منحرف تھے اور پھر آپ حضرت سجادؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا : مابمکۃ والمدینۃ عشرون رجلاً یحبونا "پورے مکہ اور مدینہ میں ایسے بیس آدمی بھی نہیں ہیں جو ہم کو دوست رکھتے ہوں۔

امام زین العابدین علیہ السلام ایسے بدترین حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے اور یہی وہ دور ہے جب آپ اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد شروع کرتے ہیں اور اسی زمانہ کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں : "ارتد الناس بعد الحسین الاّ ثلاثۃ" امام حسینؑ کے بعد تین افراد کے علاوہ سبھی لوگ مرتد ہو گئے تھے ۔ اور ان تین آدمیوں کا نام لیتے ہیں : ابو خالد الکابلی یحییٰ ابن ام الطویل اور جبیر بن مطعم (البتہ علامہ شوستری کا خیال ہے کہ جبیر بن مطعم کے بجائے حکیم ابن جبیر ابن مطعم ہونا چاہئے۔ بعض نقلوں میں محمد ابن جبیر بن مطعم درج ہے۔ بحار کی ایک روایت میں چار افراد کے نام ملتے ہیں جبکہ بعض روایتوں میں پانچ اشخاص کے نام لئے گئے ہیں ۔ پھر بھی یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ قابل جمع ہیں) اتنے سخت ماحول اور ایسی سنگلاخ وادی میں رہتے ہوئے امام اپنے ہدف کی تکمیل کے لئے جد و جہد کا آغاز کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)



جناب ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

اسلامی سیاست
اور
کتاب و سنّت میں اس کی بنیادیں

اسلامی سیاست کا امتیاز۔

چونکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان کی خلقت کا اصل مقصد عبادت قرار دیا گیا ہے :۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الذاریات/۵۱)

لہٰذا فقہ اسلامی میں ہر مکلف کے اعمال دو قسم کی عبادتوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

۱۔ عبادت خصوصی معنوں میں۔

۲۔ عبادت عمومی معنوں میں۔

عبادت کے خصوصی معنی سے مراد وہ تمام اعمال و فرائض ہیں جنھیں اگر بغیر قصد قربت کے انجام دیا جائے تو باطل ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج و زکات وغیرہ۔

لیکن عبادت کے عمومی معنی سے مراد وہ تمام امور ہیں جن میں قصد قربت تو پایا جاتا ہے لیکن وہ اس کے بغیر بھی صحیح و درست ہیں۔ مثال کے طور پر اگر انسان کھیتی، صنعت و حرفت یا تجارت وغیرہ میں مشغول ہو اور اس کا مقصد یہ ہو کہ حلال روزی کمائے گا اور خدا کی خاطر اسلامی مملکت اور مسلمان معاشرہ کو اقتصادی اعتبار سے استحکام بخشنے میں مدد دے گا، تو یہ عمل عمومی عبادت کا مفہوم رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ امور قصد قربت کے بغیر بھی صحیح ہیں۔ مباح کاموں کے لئے تجارت کا معاملہ، زراعت کا معاہدہ یا کسی

کارخانہ کو کرایہ پر لینا ہر قصد و ارادہ کے تحت درست ہے چاہے یہ ارادہ مباح ہو یا قصد قربت ہو۔ ہاں اگر الٰہی مقصد و ارادہ بھی اس میں شامل ہو تو وہی فعل عبادت یا ارتقاء نفس کا باعث اور خدا کی طرف سے جزا کا موجب قرار پائے گا۔

اس طرح ایک مومن مسلمان اپنے شب و روز کے تمام امور کو فردی و اجتماعی دونوں اعتبار سے عبادت کے رنگ میں ڈھال سکتا ہے اور درحقیقت اسلام بھی اسی راہ پر چلنے کی دعوت دیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی مادی و معنوی زندگی کے تمام امور لفظ عبادت کے وسیع مفہوم کے تحت انجام پائیں۔

اس اہم حقیقت کی وضاحت دوسرے انداز میں یوں کی جا سکتی ہے: کہ اسلام کی نظر میں خود انسان کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ عمل سے پہلے اس کے قصد و ارادہ کو دیکھنا چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص جنگ کے مجروحین و معلولین کے لئے ایک ہسپتال بنوائے تو ظاہراً یہ کام اسلامی و انسانی لحاظ سے بہت خوب ہے لیکن حقیقتاً اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ فیصلہ درست نہیں ہے بلکہ پہلے اس ہسپتال بنوانے والے کے قصد و ارادہ کو پرکھنا ہوگا۔

اس نے یہ عمل صرف خدا کی خوشنودی کے لئے انجام دیا ہے اور اس سے اس کا مقصد مجروح اور معلول افراد کی مدد کرنا ہے؟ یا اس عمل سے اس کا مقصد خود نمائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اسلامی ممالک میں لوگوں کے درمیان ایک نمایاں مقام پیدا کر کے خود کو خالص مسلمان ثابت کرنے اور بعد میں اس سے غلط فائدہ اٹھاتے اور اپنے مادی مقاصد تک پہنچنے کے لئے مکر و فریب کا جال تیار کرے۔؟

پہلی صورت میں اس کا قصد و ارادہ اپنے عام مفہوم کے تحت سراسر عبادت ہوگا۔ لیکن اگر اس کا قصد دوسری صورت کا حامل ہو تو یہی عمل عبادت کے بجائے ریاکاری اور سراسر گناہ ہوگا۔

نیت کی قسمیں: مندرجہ بالا تقسیم کے بعد الٰہی مقاصد کے اقسام پر غور کرنے کی نوبت آتی ہے اور جیسا کہ اسلامی فقہ میں "نیت" کی بحثوں میں بیان کیا گیا ہے ان کے بھی درجے اور مراتب ہیں۔

الف ۔ کبھی عبادت کا مقصد مادی اور دنیوی نعمت کا حصول ہوتا ہے۔ مثلاً "نماز استسقاء" تاکہ اس کے ذریعہ بارش کی دعا کرے اور اپنی کھیتیوں اور باغات کو پُرثمر بنا سکے۔

ب ۔ کبھی آتش جہنم کا خوف اور عذاب دوزخ کا ڈر اسے خدا کی اطاعت کی طرف مائل کرتا ہے۔

ج ۔ کبھی انسان کی عبادت کا اصل محرک جنت کی طمع اور اس کی نعمتوں سے ہم کنار ہونے کی

تمنا ہوتا ہے۔

د۔ کبھی انسان صرف اپنے پروردگار کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس میں وہ عبادت کو ثواب کے حصول اور عذاب سے نجات کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ وہ عبادت کے ذریعہ پروردگار کا تقرب "مطلوب نفسی" کے عنوان سے چاہتا ہے۔ حصول ثواب یا عقاب سے نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔

ھ۔ کبھی وہ ان تمام مقاصد و نیات سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ وہ بندگی اپنے لئے نہیں کرتا بلکہ اپنے محبوب کے لئے اور اپنے اس خدا کی عبادت کرتا ہے جو پرستش و عبادت کے لائق ہے۔ اور حضرت علیؑ کے اس ارشاد کے مطابق:۔

الٰھی ما عبدتک خوفاً من نارک ولا طمعاً فی جنتک بل وجدتک اھلاً للعبادۃ فعبدتک[1]

"اے میرے معبود نہ میں تیری عبادت تیرے جہنم کے خوف سے کرتا ہوں اور نہ تیری جنت کی تمنا و آرزو میں بلکہ میں نے تجھ کو عبادت کے لائق پایا اس لئے تیری عبادت کرتا ہوں۔" عمل کرتا ہے۔ اس کا محرک "حب ذات" سے وابستہ نہیں ہوتا۔

معقول فنافی اللہ اور غیر معقول فنافی اللہ:

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ نفسیاتی طور سے انسان کے تمام اعمال و حرکات و سکنات کا محرک درحقیقت اس کی اپنی ذات سے محبت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ عبادت بھی جو وہ آخرت کے لئے انجام دیتا ہے اور وہ شہادت جو:۔

احیاء عند ربھم یرزقون (آل عمران/۱۶۹)

جیسے بلند مقام تک پہنچنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تشکیلیں مادی نہیں بلکہ معنوی ہیں لیکن ان میں بھی اپنی ذات سے محبت پائی جاتی ہے۔

لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان "اپنی ذات سے محبت" کے محرک کو، جو عمل کی منزل میں ایک انجن

---

[1] بحار الانوار جلد اول ص ۱۴ حدیث ۲۴

کی حیثیت سے اسے قوت و توانائی بخشتا ہے، ترک کر دے؟ اور خداوند عالم کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر یہ کہے کہ: معبود! میں فقط تیری عبادت کرتا اور فقط تجھی کو چاہتا ہوں۔ اے میرے خدا میں تجھ سے بس تیری ہی تمنا کرتا ہوں!!

اس سوال کا جواب ذرا دقت طلب اور توجہ طلب ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کبھی انسان "فنافی اللہ" جیسی بلند منزل تک پہنچ جاتا ہے (یہاں ایک بات عرض کر دوں کہ وہ "فنافی اللہ" نہیں جسے اکثر صوفیا بیان کرتے ہیں اور بعض مراحل میں خلق و خالق کو ایک کر دیتے ہیں اور اللہ و بندے کے "اتحاد" و "حلول" کی ڈینگیں ہانکتے ہیں یہ ایک دم بے سروپا اور باطل باتیں ہیں۔ بھلا کہاں ممکن اور کہاں واجب؟ کہاں معنی حرف جو ہر اعتبار سے وابستہ اور کہاں معنی اسم جو ہر جہات سے مستقل ہے؟ اس کے علاوہ ان صوفیوں کا یہ عقیدہ قرآنی نصوص کے بھی خلاف ہے۔ قرآن نے ہر جگہ خلق و خالق کی دوئی کا لحاظ رکھا ہے۔ اس اعتبار سے نہیں کہ یہ دونوں دو مستقل وجود میں بلکہ ایک موجود جو خالق ہے مستغنی بالذات اور ہر جہت سے بے نیاز ہے اور دوسرا وجود جو مخلوق ہے۔ ہر پہلو سے محتاج ہے۔

"فنافی اللہ" کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسان، خدا کی بارگاہ میں اپنے آپ کو گم کر دے یعنی وہ خدا کی معرفت و اخلاص کی اس منزل پر پہنچ جائے کہ جس شئی کو دیکھے اور جس طرف نگاہ کرے: "ما رایت شیئاً الا و رأیت اللہ قبلہ و بعدہ و معہ" کے مصداق کے مطابق ہر شئے کے پہلے، ہر شئے کے بعد اور ہر شئے کے ہمراہ جلوۂ خدا کا نظارہ کرے۔ کیونکہ خدا ہر شئے سے پہلے موجود تھا اور ہر شئے کے بعد موجود رہے گا۔ وہی ہر شئے کا نگہبان اور محافظ ہے "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شئی قدیر" وہی اول ہے وہی آخر، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن، اور وہی ہر شئے پر قدرت و اختیار رکھنے والا ہے۔[1]

"فنافی اللہ" کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ انسان وجود پروردگار کی شمع کے روبرو ایسا پروانہ بن جائے کہ سوائے روشنی اور شمع کے کوئی دوسری فکر ہی اس کے ذہن میں نہ رہے۔ اپنے آپ کو ایک دم بھلا دے اپنی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کو اس کے اوامر کے آئینہ میں مشاہدہ کرے اور اپنی تمام سختیوں اور تلخیوں کو اس کے نواہی کی روشنی میں محسوس کرے۔ یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور کی فکر کرے اور نہ اس کے سوا

[1] سورہ حدید / ۳

ی اور کے عشق کا اسیر ہو۔

بس یہی وہ راہ ہے جس کے ذریعہ "حبِ ذات" کی تحریک ختم ہو جاتی ۔ عبادت اپنے اوج کمال کو پہنچتی ہے ۔ اور خدا بھی اس شخص کو ایسی جزا عطا کرتا ہے جس کی ہم پلہ کوئی دوسری جزا نہیں ۔

ہم اس گفتگو کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک طرف تو تمام انسانی اعمال عبادت ں منحصر ہیں یا کم از کم یہ اعمال عبادت کے لئے انجام پاتے ہیں اور دوسری طرف ہر عبادت چاہے وہ عام ہو یا امی الٰہی رنگ کی حامل ہوتی ہے ۔ یہاں تک کہ آخر کار عشقِ پروردگار اس کا منتہائے مقصود ہو جاتا ہے ۔ اب ہم ں مسئلہ پر دوسرے عنوان سے روشنی ڈالتے ہیں ۔

واجب اعمال کی اجرت لینا کیوں حرام ہے ؟

یہ بات ہمارے تمام فقہا تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تمام امور جن پر اسلامی سماج کا انحصار ہے واجبات کفائی شمار ہوتے ہیں ۔ اور اگر ان کی انجام دہی کے لئے بقدر کافی افراد موجود نہ ہوں تو یہی امور "واجب عینی" یعنی سماج کی ہر فرد پر واجب ہو جاتے ہیں ۔ نیز یہ مسئلہ بھی اجماعی اور مسلّم ہے کہ واجبی امور کے عوض اجرت لینا حرام ہے ۔

اگرچہ اس حرمت کے سلسلہ میں علماء نے بہت سے دلائل ذکر کئے ہیں لیکن سب سے زیادہ روشن اور واضح بات یہ ہے کہ "وجوب" اور " اجرت لینے " کے درمیان بالعموم عقلاء اور بالخصوص اہل شرع کے یہاں ایک طرح کا تضاد و ٹکراؤ ہے اور اگر انسان کے لئے ہر کام فریضۂ الٰہی ہو جائے تو اس کی اجرت لینا گویا باطل ذریعہ سے مال کا حصول ہوگا ۔ جب کوئی شخص کسی واجب کام کو انجام دے گا اور اس کے عوض اجرت طلب کرے گا تو اس سے یہ کہا جائے گا کہ " یہ تو تمہارا فریضہ تھا کہ تم یہ عمل بجا لائے، اجرت کا مطالبہ کیوں کرتے ہو ؟"

یعنی یہ دونوں صورتیں باہم جمع نہیں ہو سکتیں اور شاید واجبی امور کے عوض اجرت نہ لینے کے سلسلے میں فقہائے عظام کے بہت سارے دلائل میں یہی مسئلہ تضاد محور قرار پاتا ہے ۔

مثلاً بعض افراد کے قول کے مطابق اعمال کے واجب قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال کی ملکیت سلب یا ختم کر دی گئی ہے ۔ یا امور کا واجب قرار دینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کا حق ہے اور جو شئے اللہ کا حق ہے اس پر اجرت نہیں لی جا سکتی ۔ اسی طرح اجرت کی حرمت پر فقہا کے اجماع اور بعض دوسرے

ولائل کا سرچشمہ بھی یہی "وجوب" اور "اخذ اجرت" میں تضاد ہے۔

اس مقام پر علماء کو ایک بڑی مشکل یہ درپیش ہوئی کہ ان کے مندرجہ بالا بیان کے مطابق اسلامی سماج میں کسی بھی واجب کام کی اجرت نہیں لی جاسکتی جبکہ اسلامی سماج میں ہمیشہ یہ سیرت رہی ہے کہ لوگ ایسے بہت سے کاموں کے عوض اجرت لیا کرتے تھے اور اب تک کسی فقیہ نے زراعت، صنعت وطبابت وغیرہ جیسے امور کے عوض اجرت طلب کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔

اس تضاد کو دور کرنے اور اس مشکل سے چھٹکارا پانے کے لئے ہر ایک فقیہ نے ایک الگ راہ کا انتخاب کیا ہے۔ بعض فقہا واجبات کی حرمت پر اجماع جیسی اہم دلیل کو ان امور سے متعلق نہیں سمجھتے۔ اور بعض فقہا خود سماج کے نظام میں خلل پڑنے اور اغراض و مقاصد کے خاتمہ کو ایسے امور میں اجرت لینے کے جواز پر دلیل مانتے ہیں کیونکہ اگر سماج کے اساسی و بنیادی کاموں کے عوض اجرت لینا درست نہ ہو تو سماج میں جمود پیدا ہوجائے گا اور معاشرہ کے نظام میں جس اختلال سے ہم بچنا چاہتے تھے اسی کے شکار ہوجائیں گے۔

بعض دوسرے فقہا نے اس طرح کے کاروبار وتجارت کے وجوب کو اس قید کے تحت تسلیم کیا ہے کہ ان کے عوض اجرت بھی لی جاسکتی ہے۔ اس بنا پر بلا اجرت کاموں کے وجوب کو ثابت کرنے کی کوئی دلیل سرے سے موجود نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا اصل جواب وہی ہے کہ اجرت نہ لینے کی صورت میں "نقض غرض" لازم آتا ہے۔

مزید وضاحت۔

اگر سماج کے اکثر یا قریب قریب تمام افراد سماج کے ضروری امور کی انجام دہی میں مصروف ہوجائیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا وہ زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے یہ خدمات انجام دیتے ہیں اور اس سے پیسہ کماتے ہیں یا لوگوں کے رفاہ کے لئے کام کرتے ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ ایک سماج کی سطح تمدن اس قدر بلند ہوجائے کہ تمام افراد فقط اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کام کریں اور لوگوں سے اپنے کام کی اجرت بھی نہ لیں اور اس طرح بقول مشہور "امام زمانہ کے عہد کا سماج" جیسا ماحول پیدا ہوجائے جس میں چیزوں کی قیمت صرف "صلوات" ہوگی لیکن ایسے اعلیٰ سماج تک پہنچنے کے لئے ابھی بڑی راہ طے کرنی ہوگی۔

موجودہ صورت میں تو ہمارے سماج کی تہذیب پر "جلب منفعت" اور "مادی درآمد" کا تصور حاکم ہے
ظاہر ہے کہ ایسے سماج سے منفعت و درآمد کے اس تصور کے خاتمہ کا مطلب معاشرہ کا جمود اور اس کے
ام کا درہم و برہم ہو جانا ہی ہوگا۔ جبکہ شارع مقدس نے اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے پر اصرار کیا ہے اور
ب شارع مقدس اس کی حفاظت پر زور دیتا ہے تو یہ بھی طے ہے کہ سماج کے نظم میں جمود یا گندگی و
ستی پر بھی راضی نہ ہوگا۔ اس بنا پر وہ زندگی سے متعلق امور کے عوض اجرت لینے دینے سے ہرگز نہیں
ر کے گا۔

حکومت ایک واجب والٰہی فریضہ!

ایک اہم مسئلہ یہاں یہ درپیش ہے کہ وہ امور جو عادی کاروبار سے متعلق نہیں ہیں، پھر بھی
ن پر سماج کے نظام کا انحصار ہوتا ہے مثلاً قضاوت، جہاد اجرائے حدود وغیرہ۔ یہ امور اگرچہ معمولاً
جب کفائی ہیں پھر بھی ان کے عوض اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ اور جو لوگ ان کاموں پر مامور ہیں
ہ بیت المال سے اپنا حق المحنت لینے کا حق رکھتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ان لوگوں کے کام اور اجرت کے درمیان کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔ چاہے
ام کا حجم کم ہو یا زیادہ وہ اپنا کام بلاعوض انجام دیں اور اپنی ضرورت کے مطابق بیت المال سے
رچ لیں چاہے وہ کم ہو یا زیادہ۔

اگر یہ کہا جائے کہ بیت المال سے اپنی ضرورت کے مطابق پیسہ لینے اور کام کی اجرت لینے میں کیا فرق
ہے جبکہ کام کی اجرت عوض کہلاتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ در اصل ان دونوں کی ماہیت اور ذا
ن فرق موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ محنت اور اجرت کے درمیان کمی و کیفی رابطہ پایا جاتا ہے اور بیت المال
ے پیسہ لینے میں کمیت و کیفیت کو کوئی دخل نہیں ہے۔

یہیں سے ہم حکومت کے مسئلہ کی جانب توجہ دیتے ہوئے اپنی گفتگو سے حسب ذیل نتیجہ برآمد کرتے ہیں
ہ اسلامی معیار کے مطابق حکومت بھی ایسے ہی واجبات میں سے ایک ہے جسے فریضہ کے طور پر انجام پانا
اہیئے اور حکومت سے متعلق سربرآوردہ افراد بھی اس کے عوض کوئی اجرت نہیں لے سکتے۔ صرف
بیت المال سے اپنی ضرورت کے بقدر پیسہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر "ولی فقیہ" جو اسلامی حکومت کا سربراہ اور اس سے متعلق امور کا نگہبان ہے اپنے اس عظیم فریضہ کے عوض کوئی اجرت نہیں لیتا ہاں اگر اسے اپنی روزمرہ کی زندگی کے لئے کوئی ضرورت درپیش ہو تو وہ صرف بیت المال سے پیسہ لے سکتا ہے (اگرچہ حکومت کے امور کی انجام دہی کے سلسلے میں فقیہ کچھ لوگوں کو نوکر رکھ سکتا ہے)

اس طرح وہ ہمیشہ عبادت اور فرمان خدا کے اجرا میں مشغول رہتا ہے۔ وہ ایسے امور میں مشغول رہتا ہے جس میں کسی دوسرے کو اس کا شریک نہیں بنا سکتا۔

یہی وہ منزل ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کے فرق کو واضح کرتی ہے کیونکہ اسلامی حکومت ایک "فریضہ" ہے اور غیر اسلامی حکومت ایک "پیشہ"۔

یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا کے سیاست داں جب اپنی خواہشات میں کامیاب ہو کر کسی مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں تو نہ صرف بڑی بڑی تنخواہوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ ہر طرح کے حلال و حرام طریقوں سے ہمیشہ اپنے اور اپنے خاندان والوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے دوستوں اور حاشیہ برداروں کو بھی اس قدر سیر کر دیتے ہیں کہ وہ ان کے ذریعہ برسوں حرام خوری میں مشغول رہتے ہیں۔ جبکہ امیرالمومنینؑ جیسا حاکم، حکومت کے سلسلے میں فرماتا ہے:-

"اما والذی فلق الحبۃ وبرئ النسمۃ لولا حضور الحاضر وقیام الحجۃ بوجود الناصر وما اخذ اللّٰہ علی العلماء ان لا یقاروا علی کظۃ ظالم ولا سغب مظلوم لالقیت حبلها علی غاربها، ولسقیت آخرها بکاس اولها ولالفیتم دنیاکم هٰذه اهون عندی من عطفۃ عنز"

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳ بنام خطبۂ شقشقیہ)

یعنی اس خدا کی قسم جس نے زیر خاک دانہ کو شگافتہ کیا اور انسانوں کو وجود بخشا۔ اگر لوگوں کا ایک گروہ میری مدد و نصرت پر کمربستہ نہ ہو گیا ہوتا اور ان کے ذریعہ مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور اگر خداوند عالم نے ہر معاشرہ کے علماء و دانشوروں سے یہ تاکیدی عہد و پیمان نہ لیا ہوتا کہ ستمگاروں کی پرخوری اور مظلوموں کی گرسنگی اور تنگ دستی پر خاموش نہ بیٹھے رہیں

تو میں خلافت و حکومت کے شتر کی مہار کو ایکدم سے چھوڑ دیتا اور اس کی جانب نگاہ بھی نہ کرتا۔ اس وقت تم بخوبی مشاہدہ کر لیتے کہ اپنی تمام خوبیوں اور آرائش کے باوجود تمہاری دنیا کی حیثیت میری نگاہ میں اس پانی سے بھی حقیر تر ہے جو بکری کی ناک سے بہتا ہے۔

مندرجہ بالا ارشاد کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ خلافت و حکومت کے مسئلہ کو ایک ایسا فریضہ جانتے ہیں جس پر لوگوں کی طرف سے حجت تمام ہوگئی ہو۔ ان کے ارشاد کے مطابق درحقیقت خلافت و حکومت، خدا کی طرف سے علماء سے کئے گئے عہد و پیمان کا وفا کرنا ہے۔ آپ اسے مادی حیثیت سے ایک اونچی پوسٹ اور اہم عہدہ یا ایک شیریں اور تر نوالہ نہیں سمجھتے۔

اس طرح اسلامی سیاست کے نظام میں حکومت کی تمام مشینریاں عبادت کے رنگ میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اسی بات کو واضح لفظوں میں یوں سمجھیں کہ اسلامی پارلیمان ہو یا وزارت عظمیٰ کا دفتر یا پھر صدر جمہوریہ کی جلسہ گاہ، گویا اسلامی حکومت کے دائرہ میں ان تمام جگہوں کو ایک عبادت گاہ کی مانند ہونا چاہیئے اور جو لوگ وہاں کام کرتے ہیں انھیں بھی عبادت کے عنوان سے اپنے اپنے فرائض کو انجام دینا چاہیئے۔

سیاست اسلامی کا یہی وہ الٰہی رنگ ہے جو اسے تمام مشرقی و مغربی سیاسی مکاتب سے جدا کر کے ایک قابل امتیاز مقام عطا کرتا ہے اور یہ اسلامی سیاست کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر ایک کو باخبر ہونا چاہیئے، اس پر غور کرنا چاہیئے اور عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ انشاء...

رسالۂ اہوازیہ کا ایک گوشہ۔

اہل بیتؑ کے دوستدار، اہواز کے حاکم نجاشی نے امام صادقؑ کی خدمت میں خط لکھا کہ میں اس عہدہ کو قبول کر کے سخت آزمائش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ آپ امام اور پیشوا کی حیثیت سے میرے حدود و وظائف روشن اور واضح کیجئے اور میرے لئے ایک ایسا لائحہ عمل مرتب فرمائیے جو مجھے خدا و رسولؐ کی بارگاہ میں مقرب قرار دے اور اس کے ذریعہ میں گمراہی سے محفوظ رہوں۔ اس خط کے جواب میں امام علیہ السلام نے ایک مفصل خط کے ذریعہ نجاشی کو ایک اسلامی حاکم کے فرائض تعلیم فرمائے (نجاشی دوستدار اہل بیتؑ تھے اور انہوں نے مظلوموں اور مستضعفوں کی جان و مال کی حفاظت کی مصلحت کے تحت یہ عہدہ قبول کیا تھا) یہاں ذیل میں اس کا ایک مختصر حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ امامؑ کا یہ فرمان ہماری گذشتہ جملہ گفتگو پر

بہترین دلیل کی حیثیت رکھتا ہے:۔
...... مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم اہواز کے گورنر ہو گئے ہو۔ اس سے میں خوش بھی ہوا اور غمگین بھی خوش اس لئے ہو کہ شاید تمہارے ذریعہ خداوند عالم با ایمان غمزدہ، محروم و بینوا افراد کو نجات عطا فرمائے، انھیں خوش و مسرور فرمائے مخالفین نے ان بے چاروں کے خلاف بغض و عناد کی جو آگ بھڑکا رکھی ہے اسے خاموش کر دے ۔۔ اور غمگین اس لئے ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس عہدے کے زعم میں تمہارے ہاتھوں کسی بے گناہ کا خون ہو جائے یا تم خدا کے بندوں کے لئے دشواریوں اور آزار کا سبب بن جاؤ۔ یاد رکھو ایسی صورت میں تم جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکتے ۔۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں سے صلح جوئی، تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ لوگوں سے ملاقات میں ایسی نرمی کا برتاؤ کرو جس میں تمہاری کمزوری کا اظہار نہ ہو اور ایسا فیصلہ کن انداز اختیار کرو جس میں زور و زبردستی نہ پائی جائے .... خوب غور سے سنو کہ کہیں مال دنیا کی ذخیرہ اندوزی کا شکار نہ ہو جانا ورنہ اس آیت کے مصداق بن کر عذاب الٰہی کے شکنجے میں گرفتار ہو جاؤ گے ۔ الذین یکنزون الذھب و الفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ... (توبہ/۳۴) "یعنی جو لوگ سونا، چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اے رسولؐ انھیں دردناک عذاب کی بشارت دیدیجئے۔" جہاں تک ہو سکے گرسنہ اور بھوکے افراد کی شکم سیری کی کوشش کرو، کیونکہ پیغمبر اسلامؐ نے ایک روز اپنے اصحاب سے فرمایا: ما آمن باللہ والیوم الآخر من بات شبعان وجارہ جایع۔ "جو شخص رات کو شکم سیر ہو کر سو جائے جبکہ اس کا ہمسایہ بھوکا رہ گیا تو وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔" جو شخص کسی مومن کو بلا وجہ ڈرائے دھمکائے اور خوفزدہ کرے خداوند عالم اسے قیامت میں خوفزدہ رکھے گا اور جو شخص کسی مصیبت زدہ کی فریاد سنے اور اس کی دادرسی کرے تو خداوند عالم اس روز اس کی فریاد کو سنے گا اور دادرسی کرے گا جس روز خدا کے سایۂ رحمت کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ جو شخص اپنے مومن بھائی کی ایک حاجت پوری کرے گا اور اس کی کوئی ایک مشکل حل کرے گا، خداوند عالم اس کی بہت سی حاجتیں پوری کرے گا۔ جن میں سے ایک حاجت جنت بھی ہوگی۔
..... اور سنو، تقویٰ و پرہیزگاری سے بہتر دنیا کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ میں تمہیں تقویٰ اور خدا کے احکام کی اطاعت کی وصیت کرتا ہوں کسی چیز کو خدا کی رضا پر مقدم نہ کرنا۔ والسلام۔" (کشف الریبہ۔ شہید ثانی)

اس خط کا مفہوم اور اس کی ہمہ گیری پورے طور سے اس بات کی وضاحت کر دیتی ہے کہ ایک اسلامی سیاست داں اور حاکم کن امور سے متعلق غور و فکر کرتا ہے؟ ۔۔ کس چیز سے خوفزدہ ہوتا ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ ۔۔ اگر اپنے پیشوا و امام سے کوئی دستور العمل چاہتا ہے تو اسمیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ ۔۔ اور اس کے امام کا دستور العمل بھی کن مسائل سے متعلق ہوتا ہے؟ اور وہ کن چیزوں اور کن امور سے اسے روکتا ہے؟ مندرجہ بالا باتیں ان حقائق کی جانب بخوبی اشارہ کرتی جن پر ہم اس مختصر سے مقالے میں بحث کر رہے تھے۔

جناب جعفر سبحانی
ترجمہ: جناب خادم حسین

اسلامی حکومت میں قانون سازی

۵۔ اسلامی حکومت میں اختلاف فتاویٰ اور اس کا حل

فقہ میں اجتہاد جہاں شریعت کی بقاء و دوام کا باعث ہے وہاں اختلاف و دوئیت پرور بھی ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اسلامی حکومت میں اختلاف فتاویٰ کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر یہ کہ شیعہ فقہ میں اجتہاد کا دروازہ (بغیر اس کے کہ مجتہد خود کو کسی خاص مذہب "جیسے حنفی یا شافعی" کا پابند مانے) وسیع پیمانے پر کھلا ہوا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ استنباط کرنے والے کی رائے تمام صاحبان نظر یہاں تک کہ فقہ کے معروف و مشہور اماموں کی آراء سے بھی مختلف ہو، اس طرح کا وسیع اجتہاد اختلاف کا باعث ہے اور ظاہر ہے کہ لوگوں کی زندگی، حکومت کی منصوبہ سازی اور عدالتی امور پر خراب اثرات مرتب کرتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں اس مشکل کو کس طرح حل کیا جائے گا؟

جواب:-

ہماری گفتگو کا تعلق ایسے دور سے ہے جس میں اسلامی نظام مستحکم ہو، فتنہ و فسادات اور سازشیں ختم ہو چکی ہوں اور کسی طرح کی اضطراری کیفیت و ضرورت کی گنجائش باقی نہ ہو۔ اس طرح اضطرار و ضرورت ہماری بحث سے خارج ہے۔

ضرورت کے موارد کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں چنانچہ اس کا حل اس پر حاکم حالات و شرائط کا تابع ہوتا ہے، اس اعتبار سے ہماری بحث و گفتگو ایک ایسے مستحکم نظام کے بارے میں ہے جس پر اضطرار حاکم نہ ہو۔

اختلاف فتویٰ کی مشکل تین مرحلوں میں ظاہر ہو سکتی ہے

۱۔ لوگوں کی زندگی اور تعلقات میں۔
۲۔ قضاوت وانصاف میں۔
۳۔ حکومت کی منصوبہ سازی میں۔

ہر ایک مرحلے کی مشکل الگ الگ طریقے سے قابل حل ہے۔

الف: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ شیعہ فقہ نے اجتہاد کے دروازے کو کھلا چھوڑ رکھا ہے اور زندہ مجتہد کی تقلید کو لازمی قرار دیا ہے اور یہی بات بنی ہے کہ اس کی فقہ ترقی یافتہ شکل وصورت اختیار کرے اور ہر زمانے میں موجود تقاضوں کو پورا کرے۔ مردہ شخص کی تقلید پر زور دینے سے فقہ کی ترقی وشگوفائی میں رخنہ پڑتا ہے اور اس کی ارتقا کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔

مشہور شیعہ فقہا نہ صرف زندہ کی تقلید کو واجب سمجھتے ہیں بلکہ فرد اعلم (جو احکام الٰہی کو اس کے ماخذ ومنابع سے استنباط کرنے میں اعلم ہو) کی تقلید کو لازمی سمجھتے اور لوگوں کو اعلم وافقہ کی تقلید کرنے کی ہدایت دیتے ہیں اور غالباً اعلم وافقہ شخص کی شناخت باصلاحیت افراد کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ نتیجۃً زیادہ تر لوگوں کو اختلاف فتویٰ کی مشکل سے روبرو ہونا نہیں پڑتا ہے اور عام مرجعیت ایک ہی فرد میں متمرکز ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ مختلف مراجع سے احکام دریافت کرتے ہیں اور تعیین فتویٰ کے لئے کوئی اعلم وافقہ فرد مرجعیت کے عنوان سے نہیں ہوتی تب بھی کسی طرح کی مشکل پیش نہیں آتی، اس لئے کہ ان مسائل میں اختلاف بہت کم ہوتا ہے جو عام لوگوں کو درپیش ہوتے ہیں اور اگر ذہن میں کسی طرح کا اختلاف ہوتا بھی ہے تو مراجع اپنے رسالہ عملیہ میں مشہور فتووں سے چشم پوشی اختیار نہیں کرتے، نتیجۃً عبادات ومعاملات سے متعلق مسلمانوں کے زیادہ تر اعمال اکثر وبیشتر فقہا کی نظر میں مورد تائید قرار پاتے ہیں اور خاص مسئلہ سے متعلق ہر فرد اپنے مرجع تقلید کے فتوے کی پیروی کرتا ہے اور اپنے مسئلہ کا حل اسی سے دریافت کرتا ہے۔

دراصل گذشتہ چند صدیوں کے دوران اختلاف فتویٰ نے لوگوں کی زندگی میں کسی طرح کی مشکل ایجاد نہیں کیا ہے اور مذکورہ باتوں کے پیش نظر یہ مسئلہ کسی بھی طرح قابل ملاحظہ مشکل ایجاد نہیں کر سکتا اور اگر کوئی مشکل وجود میں آتی بھی ہے تو مشکل اجتہاد کے نمایاں فوائد زمانیت کے عظیم مسئلہ کو حل کرتا ہے اور فقہ وشریعت کو ارتقا بخشتا ہے اور اسے ہر تہذیب

وتمدن کے لئے قابل انطباق بناتا ہے ہ کے سامنے کوئی اہم بات نہیں ہو سکتی۔ عظیم مفکرین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کے کھلے دینے پر اصرار کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ وسعت بخشیں۔

ب۔ ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ اختلاف فتویٰ عدالتوں کے کام میں مشکل پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ قاضی فتووں میں اختلاف کی صورت میں اپنی رائے ظاہر کرنے میں حیران رہتا ہے کہ کس مجتہد کے فتوے کے مطابق فیصلہ کرے مثال کے طور پر مجرم کو سزا دے یا بری کرے اور اور سزا دینے کی صورت میں کمیت وکیفیت کے اعتبار سے کس فتوے کو معیار قرار دے۔

شیعہ فقہ میں عدالتی قوانین کی رو سے یہ مشکل حل شدہ ہے، اس لئے کہ عدالتوں میں قاضی ہونے کی شرط، اجتہاد ہے اور شیعہ فقہ کے مطابق قاضی کو مجتہد و فقیہ ہونا چاہئے، اسے فائل سے متعلق حکم کو تدوین یافتہ قانون کے بجائے استدلالی مصادر سے نکال کر اپنی رائے صادر کرنا چاہئے اس سلسلے میں جو بات سامنے آسکتی ہے وہ محض یہ کہ ممکن ہے دو قاضیوں کا اجتہاد مکمل طور پر مشابہ دو فائلوں کے سلسلے میں مختلف ہو، لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

اولاً: اگر فائل کا جائزہ وہ کمیٹی لے جس کے تمام ممبران مجتہد و مستنبط ہوں تو ظاہر ہے کہ اختلاف میں کمی واقع ہوگی اور تمام عدالتوں میں دو مشابہ فائلوں کی صورت ایک ہوگی۔

ثانیاً: اگر قاضیوں کے لئے تدوین شدہ قانون بھی تیار کر لیا جائے تب بھی یہ مشکل باقی رہ سکتی ہے اس لئے کہ تدوین شدہ قانون کو منطبق کرنے میں بھی اختلاف نظر فطری و اجتناب ناپذیر ہے۔

اصولی طور پر قاضیوں کے لئے تدوین شدہ قانون فراہم کرنے کا مطلب مغربی عدالتوں کی پیروی اور قاضیوں کے اجتہاد سے مکمل طور پر چشم پوشی ہے اور یہ بات شیعہ فقہ کی رو سے مناسب نہیں اس لئے کہ مطلوبہ فائل یا دیوانی سے متعلق ہوگی یا فوجداری سے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا تعلق مالی و حقوقی مقدمات سے ہوگا یا حدود و تعزیرات سے۔ پہلے مسئلہ سے متعلق قاضی اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنے اجتہاد کے مطابق رائے دے اور اگر تدوین شدہ قانون اس کی رائے کے مطابق ہو تو کیا کہنا ورنہ اسے اپنے اجتہاد کے مطابق رائے دینا چاہئے اور اگر اپنی تشخیص کے خلاف فتویٰ دیتا ہے تو یہ فعل حرام ہے۔

دوسرے مسئلہ (حدود) سے متعلق اسلام میں احکام معین و مشخص اور ان کے بارے میں اختلافات شاذ و نادر ہیں، اس اعتبار سے "قانون کی تدوین" "لزوم مالا یلزم" کے مانند ہوگا جبکہ قاضی کا اپنا اجتہاد اسے تدوین شدہ قانون سے بے نیاز رکھتا ہے۔

تعزیرات کے سلسلے میں اسلامی فقہ کی رو سے تعزیر و تنبیہ کی کیفیت و کمیت کا انحصار قاضی کی تشخیص پر ہوتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کا انحصار "علیٰ مایراہ الحاکم من المصلحۃ" قاضی کی مصلحت پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے محض اختلاف آراء سے پرہیز کے لئے تعزیرات کا قانون تدوین کر کے قاضیوں کے سپرد کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ بات اسلامی فقہ کی نمایاں خوبی ہے کہ مجرموں کی تنبیہ سے متعلق کیفیت کو قاضی کی تشخیص پر منحصر قرار دیا ہے اور تمام مجرموں کو اگرچہ ان کے جرم کی نوعیت ایک ہی کیوں نہ ہو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہکایا ہے، اس لئے کہ ممکن ہے ایک مجرم معمولی سی تنبیہ سے ہی سدھر جائے اور دوسرا مجرم جرم ایک ہونے کے باوجود پچاس تازیانوں سے بھی نہ سدھرے۔ اس بات پر اصرار کہ تعزیرات سے متعلق ایک تدوین شدہ قانون ہونا چاہئے جس پر تمام قضاۃ عمل کریں مذکورہ اصول کے خلاف ہے جس پر تمام فقہاء اسلام متفق ہیں۔

یہ اصرار کہ عدالتیں دیوانی ہوں یا فوجداری ان میں ایک ہی تدوین شدہ قانون ہونا چاہئے محض اس لئے ہو سکتا ہے کہ قاضی کے اجتہاد سے چشم پوشی کی جائے یا مجبوری کو مدنظر رکھا جائے کہ مجتہد قاضی نہ ملنے کی صورت میں ایسے دو افراد سے استفادہ کیا جائے جو مجتہد نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے لئے تدوین شدہ قانون کا ہونا لازمی ہے۔

البتہ دستور العمل کے طور پر قضاۃ کے لئے قانون کی تدوین میں کوئی قباحت نہیں، تاکہ قضاۃ ضوابط کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہیں، اس لئے دستور العمل تو ایک ظاہری ضابطہ ہے اصل چیز قاضی کی رائے اور اس کی تشخیص ہے نہ کہ دستور العمل۔

ت:

اختلاف فتاویٰ کا حکومت کی منصوبہ سازی اور مجلس شورای اسلامی کے ممبران کے کام میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا، اس لئے کہ:-

اولاً: الٰہی احکام طہارت سے لیکر دیات تک حکومت کی منصوبہ سازی اور پارلیمنٹ کے اختیارات کے دائرے سے باہر ہیں، اصولی طور پر اس طرح کے احکام کا تعلق فقہائے اسلام سے ہے اور اس سلسلے میں اظہار رائے کی گنجائش نہیں، بعنوان مثال بیع و ربا اور قصاص و دیات کے سلسلہ میں پارلیمنٹ قانون وضع نہیں کرسکتی، کیونکہ حکم الٰہی بندوں کے اختیار سے باہر ہے۔

ثانیاً: ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور حکومت سے وابستہ دوسرے معاملات میں نمائندوں کو منصوبے تیار کرتے وقت الٰہی احکام کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے، رہی موافقت یا احکام سے مخالفت کی بات اس کی نظارت فقہا کے ذمے ہے اور انھیں کو اس سلسلے میں رائے دینا چاہئے۔

یہ سنگین ذمہ داری شورای نگہبان کے فقہا کے دوش پر ہے، ظاہر ہے کہ انھیں اچھے اور آگاہ مجتہدین میں سے ہونا چاہئے اور جن احکام کو صحیح قرار دیں ——— انھیں شرعی موازین کی رعایت سے خود استخراج کیا ہو، اس سلسلے میں کسی دوسرے مجتہد کی رائے کو عمل میں نہیں لاسکتے۔

مذکورہ باتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اختلاف فتویٰ سوائے ضرورت کی صورت میں کسی طرح کی مشکل ایجاد نہیں کرتا۔

البتہ مجلس کے پاس کردہ اصول وضوابط کو "تدوین شدہ قانون" یا دوسرے الفاظ "تدوین شدہ مقررات" کی صورت میں ہونا چاہئے اور اجرائی مراکز کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

۶۔ مجلس شورای اسلامی کا کردار کیا ہے؟

مجلس شورای اسلامی اس بات کی ذمہ دار ہے کہ تمام منصوبوں کو اسلامی قوانین کے مطابق تیار کرے۔ ہر ملک خواہ وہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اپنے معاشرے کی آئے دن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر منصوبہ سازی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

مجلس شورای اسلامی کی جانب سے پاس کردہ قوانین، نفاذ کی صورت میں وہی الٰہی قوانین ہیں جو کلی سے جزئی شکل اختیار کرتے ہیں۔

چونکہ یہ بات ممکن ہے کہ منصوبہ تیار کرتے وقت اراکین مجلس اسلامی اصولوں سے آگے

بڑھ جائیں اور ان کے پاس کردہ بل اسلامی اصولوں کے خلاف ہوں، لہٰذا مجلس کے امور پر نظارت رکھنے کے لئے جید فقہا کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ان قوانین کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھ کر موافقت کا اعلان کریں، اسلامی جمہوریہ کے نظام میں اس گروہ کو شورائی نگہبان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۷۔ اسلامی حکومت کا سرکاری مذہب کس طرح معین کیا جاتا ہے؟

اس مسئلے سے متعلق کبھی سوال ایک ہی ریاست کے بارے میں ہوتا ہے جیسے اسلامی جمہوریہ ایران اور کبھی متحدہ اسلامی ریاستوں کے بارے میں، جس وقت فرضی حدود ختم ہو جائیں اور تمام اسلامی ممالک ایک ہی پرچم تلے جمع ہو جائیں (پروردگار عالم وہ دن دکھائے جس میں نام نہاد اسلامی اور طاغوتی حکومتوں کا خاتمہ ہو، جن کی جھولی میں ہر چیز سوائے اسلام کے موجود ہے) دوسرے سوال سے متعلق جواب فی الحال ہماری بحث سے خارج ہے اور جب تک یہ اتحاد و انسجام عملی شکل اختیار نہیں کرتا اس وقت تک اس سوال کے بارے میں اظہار رائے فضول ہے۔ ایسی صورت میں جواب دیا جا سکتا ہے جب اس طرح کی ریاست کی کمیت و کیفیت وضاحت کے ساتھ سامنے آئے، لہٰذا دوسرے سوال کا جواب ہمارے دائرے بحث سے خارج ہے۔

لہٰذا سوال ایک ہی جمہوریہ کے بارے میں ہے جو بفضل الٰہی فی الحال ایران میں قائم ہوئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام فقہی مذاہب آئین و دستور کے بموجب قابل احترام ہیں اور ہر فرد پر فقہی مکتب و مذہب اختیار و انتخاب کرنے میں آزاد ہے۔

شک نہیں ہے کہ حکومت کے اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی امور کے لئے ایک مذہبی بنیاد ضروری ہے تاکہ اپنے اقدامات کو اسی کسوٹی پر پرکھے اور ایک اصول کے مطابق عمل کرے اور یہ ایک حکومت کا منسجم و متحد فقہی نظام کے بغیر امکان پذیر نہیں، ایسی صورت میں ایک ہی فقہی مذہب کو اس پر حاکم ہونا چاہئے اور چونکہ حکومت کو عوام نے منتخب کیا ہے لہٰذا اکثریت پر حاکم فقہی مذہب معیار اور وہی سرکاری مذہب ہوگا۔

لیکن چونکہ اختلاف فتویٰ کا مسئلہ ہر مذہب میں موجود ہے لہٰذا شادی بیاہ، طلاق اور وراثت وغیرہ جیسے مسائل میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے کی

آزادی ہونی چاہئے۔

اس کے علاوہ تمام مذاہب کے جید قاضیوں کو موجود ہونا چاہئے تاکہ افراد کے رجوع کی صورت میں وہ انہیں کے مذہب کے مطابق فیصلہ کرسکیں۔ خوش قسمتی سے اسلام کے دیوانی اور فوجداری میں اختلافی مسائل کم اور مشترکات زیادہ ہیں، جس کے نتیجہ میں فقہی مذاہب کے مابین اختلاف فتویٰ کا مسئلہ اس سلسلے میں کسی طرح کی مشکل ایجاد نہیں کرتا۔

۸۔ اسلامی حکومت میں اقلیتوں کے حقوق:

دنیا کا کوئی دین اور کوئی نظام حکومت اسلام کے مانند اقلیتوں کی آزادی کا ضامن، ان کے شرف و قومی حقوق کا محافظ نہیں، کون سا دین اور کون سا قانون، اسلام کے مانند اقلیتوں کے لئے قدر و احترام کا قائل ہے؟

صرف اسلام ہے جو اسلامی ملک میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ اپنے علاقے کے تمام باشندوں کے لئے مذہب، نسل، زبان اور رنگ مختلف ہونے کے باوجود اجتماعی عدالت کا ضامن ہے اور یہ عالم انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے کہ کوئی قانون و مذہب، اسلام کے سوا اس مقصد کو پورا نہیں کرسکتا۔ اقلیتوں سے وابستہ افراد ذمی کے طور پر اسلامی ملک کی قومیت حاصل کرکے دوسرے مسلمانوں کی طرح سماجی حقوق اور داخلی و خارجی امن و امان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(۱) ذمّی کے شرائط (حمایت کا عہد)

وہ شرائط جن کے ذریعہ "ذمّہ" اور حمایت کا عہد نامہ منعقد ہوتا ہے، یا کسی ایک شرط کے باطل ہونے سے حمایت کا عہد نامہ منسوخ قرار پاتا ہے مندرجہ ذیل تین چیزوں پر مشتمل ہیں۔

(۱) ذمّی افراد کو معاہدے کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دینا چاہئے، بعنوان مثال مسلمانوں سے جنگ یا مشرکوں اور اسلام دشمنوں کی حمایت اور اسلام و مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سازش۔

(۲) ذمّی افراد کو یہ عہد کرنا پڑے گا کہ اسلام کا قانون سزا ان کے بارے میں بھی نافذ کیا جائے۔

(۳) انھیں یہ بات قبول کرنا ہوگی کہ ہر سال کچھ رقم "جزیہ" ٹیکس کے طور پر اسلامی حکومت کو ادا کریں گے۔

یہ تین شرطیں "عہد ذمّہ" کی اصلی شرطوں میں شمار ہوتی ہیں لیکن دوسری شرطیں اسی صورت میں قابل نفاذ ہوں گی جب ان کا اندراج عہد نامہ کے متن میں ہوا ہو۔

اس عہد نامہ کے بموجب شرعی اعتبار سے مسلمانوں کی نسبت انھیں ایک طرح کا حق مکمل حمایت اور ہر طرح سے امن و امان حاصل ہوگا، یہاں تک کہ وہ اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے میں بھی آزاد ہوں گے اہل کتاب (یہود، نصاریٰ، مجوس) جو مسلمانوں کی نگاہ میں "اھل ذمّہ و معاھد" قرار پاتے ہیں کے حق میں یہ تسامح ایک مسالمت آمیز زندگی کی بنیاد پر استوار ہے۔ درحقیقت اسلامی حکومت میں "اھل ذمّہ" پر عاید پابندیوں کے باوجود اسلام نے ان کی آزادی و رفاہ کے امکانات کو حتی المقدور فراہم کیا ہے اور یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے مال، جان، شرف اور ناموس کا احترام کرے اور کسی بھی قیمت پر ان کے حقوق ضائع نہ ہونے دے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ان اقلیتوں سے وابستہ افراد کی عزت و آبرو جو اسلام کے ذمہ میں اور مسلمانوں کے ساتھ ہمبستگی و حمایت کا عہد کر چکے ہیں مسلمانوں کی عزت و آبرو کے مانند قابل احترام ہے اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت علی علیہ السلام کو اطلاع ملی کہ معاویہ کے حکم سے کچھ خودسر و گستاخ سپاہیوں نے عراق کے ایک شہر پر حملہ کرکے لوگوں کے مال و دولت و عزت و آبرو پر حملہ کیا ہے، حد سے زیادہ متأثر ہوئے اور ان کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:۔

ولقد بلغنی ان الرجل منھم کان یدخل علی المرأۃ المسلمۃ والاخری المعاھدۃ فینتزع حجلھا وقلبھا وقلائدھا ورعثھا ماتمتنع منہ الا بالاسترجاع والاسترحام ثم انصرفوا وافرین مانال رجلاً منھم کلم ولا اریق لھم دم[1]

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

مجھے اطلاع ملی ہے کہ معاویہ کے لشکر کے ایک سپاہی نے زبردستی ایک مسلمان اور ایک ذمّی خاتون کی پائل، چوڑیاں، ہار اور بُندوں کو چھینا ہے اور وہ دونوں رونے پیٹنے کے علاوہ اپنے سے دفاع کرنے سے بھی قاصر تھیں۔

حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں مسلمانوں اور اہل ذمّہ کی عزت و آبرو اس قدر لائق احترام ہے کہ فرماتے ہیں :۔

"فلو ان امرءً مسلماً مات من بعد هذا اسفاً ما كان به ملوما بل كان به عندي جديرا۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۲۷)

(۲) جزیہ منصفانہ ٹیکس

"جزیہ" کس لئے ہوتا ہے؟ جزیہ ایک طرح سے اسلامی حکومت کو وہ مالی امداد ہے جو اہل ذمّہ امن و امان اور جان و مال کی حفاظت کی ذمّہ داری کے عوض میں اسلامی حکومت کو بطور ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ جزیہ وہ سرکاری ٹیکس ہے جو مسلمانوں سے مختلف عناوین من جملہ زکات، خمس اور صدقات وغیرہ کے طور پر وصول کیا جاتا ہے، لیکن معذور و ناقص العقل افراد، بچے اور خواتین جزیہ دینے سے مستثنیٰ ہیں اس لئے کہ جزیہ گویا وہ ٹیکس ہے جو آمدنی پر عائد ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

"جرت السنة ان لا تؤخذ الجزية من المعتوه ولا من المغلوب على عقله"

سیرت اسلاف کے مطابق معذور و ناقص العقل افراد سے جزیہ نہیں لینا چاہئے۔

جزیہ کی کوئی ثابت و معین مقدار نہیں، اس کا تعلق اہل ذمّہ کی استطاعت و امکانات سے ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے جزیہ کی مقدار کے بارے میں سوال ہوا، انہوں نے

فرمایا:۔

ذالک الی الامام یأخذ من کل انسان منھم ماشاء علی قدر ماله وما یطیق ۔

یہ بات امام پر منحصر ہے کہ وہ جزیہ کی مقدار معین کرنے سے پہلے ان کی حالت کا جائزہ لے تاکہ جزیہ کی مقدار منصفانہ طور پر معلوم ہو سکے ۔

عیسائی مورخ جرجی زیدان کتاب "تاریخ تمدن اسلام" میں لکھتا ہے :۔

رومی جس علاقے کو فتح کرتے تھے اس علاقے کے باشندوں پر ٹیکس عائد کرتے تھے جس کی مقدار مسلمانوں کے جزیہ سے کہیں زیادہ ہوتی تھی ۔ مثال کے طور پر جب رومیوں نے "گل" موجودہ فرانس پر قبضہ کیا تھا اس وقت ہر فرد پر پندرہ لیرے (پاونڈ) مقرر کئے تھے جو مسلمانوں کے جزیہ کی سات گنا رقم تھی اور کوئی شخص یہاں تک کہ زرخرید غلام بھی اس کی ادائیگی سے مستثنیٰ نہیں تھے ۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ لینے سے متعلق اسلام میں اہل ذمہ کے ساتھ کتنی رعایت برتی گئی ہے اور یہ مسلمانوں کے اغماض بخشش اور مسالمت آمیز روش کی بہترین دلیل ہے ۔

"محمد بن مسلم" فرماتے ہیں :۔

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا "اہل ذمہ" کو اپنی جان اور مال و دولت کی حفاظت کے بدلے کیا دینا چاہیئے ؟

انہوں نے فرمایا :۔

"خراج" (اگر قابل زرع وکشت زمین کے مالک ہوں) اور اگر ان سے جزیہ وصول کیا جاتا ہو تو خراج نہیں دیں گے اور اگر زمین سے متعلق خراج دیتے ہیں تو جزیہ سے معاف قرار پائیں گے ۔

اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل ذمہ یا جزیہ (آمدنی پر ٹیکس) دیتے ہیں یا پھر خراج (زمین پر عائد ٹیکس) لہٰذا اسلامی حکومت کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ مذہبی اقلیتوں سے جزیہ یا خراج دونوں میں سے صرف ایک کے سوا اور کسی قسم کا ٹیکس وصول کرے ،

چنانچہ محمد بن مسلم فرماتے ہیں :۔

میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا : کیا جزیہ کے علاوہ ذمیوں سے مال و دولت اور مویشیوں سے متعلق اور کوئی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے ؟

فرمایا :۔

" نہیں "۔

اس اعتبار سے جزیہ کی مقدار اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے بہت ہی ناچیز سی ہے ۔ اہل ذمہ سالانہ رقم دے کر نہ صرف اپنی جان و مال و دولت کی حفاظت کرتے ہیں بلکہ ہر طرح کی فوجی و دفاعی ذمہ داری سے معاف قرار پاتے ہیں ۔ ساتھ ساتھ اس ٹیکس سے بھی معاف ہوتے ہیں جو اسلامی قوانین کے مطابق مسلمانوں سے مختلف عناوین کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں اہل ذمہ سے کئی گنا زیادہ ہیں ، اس لئے کہ مسلمان خمس ، زکات ، خراج اور صدقات کے عنوان سے حکومت کو رقم دینے کے باوجود اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وقت ضرورت فوجی خدمات انجام دینے کے لئے حاضر ہوں جبکہ اہل ذمہ ناچیز رقم ادا کر کے اسلامی حکومت کے تمام امتیازات سے فائدہ اٹھاتے اور مسلمانوں کے برابر قرار پاتے ہیں ، اور حکومت کی ذمہ داری امن وامان اور آسائش فراہم کرنے میں دونوں کے لئے یکساں ہے۔

(۳) اقلیتوں کے حقوق کا اعتراف

قرآن مجید نے دوسری قوموں اور تمام دوسرے مذاہب کے حقوق کی رعایت کے بارے میں اسلام کی کلی سیاست کو پوری وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے :۔

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین ۔ (ممتحنہ/۸)

جو لوگ تم سے (تمہارے) دین کے بارے میں نہیں لڑے بھڑے اور نہ تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے ساتھ انصاف سے پیش آنے سے خدا تمھیں منع نہیں کرتا۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی اقلیتوں یا اسلام مخالفین نے تمہارے ساتھ مذہبی جنگ اگر شروع نہ کی ہو، تم پر دباؤ نہ ڈالا ہو اور تمہیں تمہارے وطن سے نہ نکالا ہو تو ان کے ساتھ نیکی و انصاف سے پیش آنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے اسلام مذہبی اقلیتوں اور اسلام مخالفین کو اسلامی معاشرے میں رہنے اور انسانی حقوق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسلام و مسلمانوں کے لئے باعث زحمت نہ بنیں اور نہ ان کے خلاف کوئی کام انجام دیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون۔ (ممتحنہ/۹)

خدا تو بس ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے باہر کیا اور تمہارے نکالنے میں (اوروں کی) مدد کی اور جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے وہ لوگ ظالم ہیں۔

مذہبی اقلیتوں اور اسلام مخالفین سے متعلق اسلام کی کلی سیاست مذکورہ دونوں آیتوں سے مستفاد ہوتی ہے، یعنی جب تک اقلیت سے وابستہ افراد اکثریت کے حقوق کو پامال نہیں کرتے اور اسلام و مسلمین کے خلاف کوئی سازش نہیں کرتے ہر طرح سے اسلامی ملک میں آزاد ہیں اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے ساتھ نیکی و انصاف سے پیش آئیں، لیکن اگر اسلام و مسلمانوں کے خلاف دوسرے ملکوں کا سہارا لیتے ہیں تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی سرگرمیوں کو روکیں اور ہرگز انہیں اپنا دوست نہ مانیں۔

اسلام میں مذہبی اقلیتوں کی آزادی و احترام اس حد تک ہے کہ اگر کوئی ذمی ایک ایسے کام کو انجام دے جو اس کی شریعت میں جائز لیکن اسلامی شریعت کی رو سے ناجائز ہو جیسے اسلامی حکومت میں شراب خواری وغیرہ تو کسی کو اعتراض کرنے کا حق اس وقت تک نہیں جب تک کہ وہ اس عمل کا تظاہر نہ کرے اور اگر تظاہر کرتا ہے تو نقض قانون (تحت الحمایت) کے عنوان سے وہ جوابدہ قرار پائے گا۔

اگر کوئی ایسا کام کر بیٹھے جو اس کے دین میں بھی حرام ہے جیسے زنا اور لواط وغیرہ تو قانون و حقوق کے اعتبار سے اسی سزا کا مستحق ہو گا جو ایک مسلمان کے ساتھ رائج ہے اور قاضی کو اختیار حاصل ہو گا، کہ وہ حد جاری کرے یا اسے اس کی قوم کے حوالے کر دے تاکہ ان ہی کے مذہبی قوانین کے مطابق سزا دی جائے اور اسلامی فقہ میں ہے کہ: اگر دو ذمی افراد مسلمان قاضی کے پاس دعویٰ لے جائیں تو قاضی کو درج ذیل آیت کی رو سے اسلامی احکام کے مطابق فیصلہ سنائے یا کنارہ کشی کا پورا حق حاصل ہے۔

فان جاءوك فاحكم بينهم او اعرض عنهم (مائدہ/۴۲)

تو (اے رسول) اگر یہ لوگ تمہارے پاس (کوئی معاملہ لیکر) آئیں تو (تم کو اختیار ہے) خواہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کشی کر و۔

(۴) مذہبی اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں کا حسن سلوک

اسلام مسلمانوں کو یہ تاکید کرتا ہے کہ وہ اہل ذمہ سے متعلق حمایت کے معاہدہ کا احترام کریں اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ رکھیں۔ جیساکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

"ولا تجادلوا اهل الكتاب الا بالتي هي احسن الا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذي انزل الينا وانزل اليكم" (عنکبوت/۴۶)

اور اے (ایمان دارو!) اہل کتاب سے مناظرہ نہ کیا کرو مگر عمدہ اور شائستہ الفاظ و عنوان سے لیکن ان میں سے جن لوگوں نے تم پر ظلم کیا (ان کے ساتھ رعایت نہ کرو) اور صاف صاف کہدو (کتاب) جو ہم پر نازل ہوئی اور جو کتاب تم پر نازل ہوئی ہے ہم تو سب پر ایمان لا چکے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ نے اس کتاب کے بارے میں مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ ان کے ساتھ نیک برتاؤ رکھیں، اس سلسلے میں ایک حدیث پیغمبر اسلامؐ سے نقل کی گئی ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے:۔

من ظلم معاهدا وكلفه فوق طاقته فانا حجيجه يوم القيامة[1]

جو کوئی مسلمانوں کے ساتھ عہد کرنے والوں میں سے کسی ایک پر ظلم کرے گا یا اس کی توانائی سے زیادہ کام لے گا قیامت کے دن میں خود اس سے جواب طلب کروں گا۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:۔

من آذى ذميا فانا خصمه ومن كنت خصمه خصمته يوم القيامه[2]

جو شخص کسی ذمّی کو اذیت دے گا میں اس کا دشمن ہوں اور اس سے قیامت کے روز انتقام لوں گا۔

---

[1] فتوح البلدان، ص۱۶۷

[2] روح الدین الاسلامی ص۲۷۴



جناب حسین نوری
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

معاد

جس طرح ایک مستحکم تعمیر دو مستقل حصوں ــــ بنیاد اور عمارت ــــ پر مشتمل ہوتی ہے یا ایک مضبوط و توانا درخت کے لئے جڑیں اور شاخیں ضروری ہوتی ہیں دین اسلام بھی دو حصوں، اصول دین اور فروع دین میں منقسم ہے اصول دین کو عمارت کی بنیاد یا درخت کی جڑوں کی حیثیت حاصل ہے جبکہ فروع دین خود عمارت یا درخت کی شاخوں کی منزل میں ہے۔

اصول دین کا ربط انسان کے دل و دماغ سے ہے اور اس پر ایمان و اعتقاد، قلب کی پاکیزگی اور قوت ادراک کا فریضہ ہے جبکہ فروع دین کا تعلق انسان کے اعمال و افعال سے ہے اور میدان عمل میں اس کی رعایت ضروری ہے۔

اصول دین اسلام تین ہیں:

(۱) توحید (۲) نبوت (۳) معاد[1]

یہاں ہمارا مقصد (اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی) دین اسلام کی تیسری بنیاد، معاد سے متعلق بحث کرنا ہے۔ "معاد" مصدر میمی ہے جس کے معنی عود کرنے اور پلٹنے کے ہیں اور اس سے ــــ انسان کا مرنے

[1] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ علماء شیعہ کے نزدیک اصول دین تین اور اصول مذہب شیعہ پانچ ہیں جن میں مذکورہ اصول دین کے ساتھ عدل اور امامت بھی شامل ہے۔ مترجم۔

کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا اور دوسری دنیا میں اس کے اعمال کے نتائج کا سامنے آنا مراد ہے چنانچہ معاد کا عقیدہ نہ صرف دین اسلام بلکہ تمام آسمانی و الٰہی ادیان میں ایک بنیاد و اساس کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ معاد کا موضوع انسان کے لئے دو اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے:۔

اولاً یہ کہ اس سے انسان کے انجام کا گہرا ربط ہے اور ہر انسان اپنا انجام و نتیجہ جاننے کے سلسلہ میں بے حد دلچسپی رکھتا ہے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ آیا اس کی حیات اسی چند روزہ زندگی میں محدود و محصور ہے اور موت آتے ہی زندگی درہم و برہم اور دفتر حیات بند ہو جاتا ہے یا یہ کہ وہ ایک پائدار زندگی کا حامل ہے اور موت کا مطلب "فنا ہو جانا" نہیں ہے بلکہ محض اس دنیا سے ایک دوسری دنیا میں جس کا تعلق خود انسان کے اعمال سے ہے، منتقل ہو جانے کا ذریعہ ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ "معاد" سے متعلق براہین و دلائل اس بات کی صاف نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی جاوید اور پائدار ہے اور نہ صرف یہ کہ موت انسان کو فنا و نابود نہیں کرتی بلکہ اس کو اور زیادہ بیدار و ہوشیار بنا دیتی ہے چنانچہ اپنی اسی بیداری و ہوشیاری کے آئینہ میں وہ دوسری دنیا کی زندگی کو آگے بڑھائے گا۔

اگرچہ انسان کا بدن، عام طور پر، موت کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے اعضائے بدن ایک دوسرے سے جدا ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ نیز ممکن ہے کہ ایک مشت خاک کسی بیابان کا ڈھیر یا کسی عمارت کا جزء قرار پا جائے پھر بھی انسان کی روح جس پر اس کی زندگی کا اصل دار و مدار ہے موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور دنیوی زندگی میں انسان کے جیسے اعتقادات اور اخلاق و اعمال رہے ہیں اسی کے مطابق ایک دوسری دنیا میں، جس کو عالم برزخ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ ایک مخصوص قسم کے قالب میں ڈھلکر مثالی اعضاء کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے یہاں تک کہ اس دن جس کو روز قیامت کہتے ہیں خداوند عالم اپنے علم و قدرت سے اس خاکی بدن کے تمام اجزاء کو چاہے وہ جس جگہ اور جس صورت میں بھی ہوں یکجا کر کے دوبارہ اس کا ڈھانچہ تشکیل دیکر اس کی روح کو جسم سے مرتبط کر دیتا ہے تاکہ اس کے اعمال کا دفتر جس کی پوری امانت داری کے ساتھ کارخانۂ قدرت میں حفاظت

کی گئی ہے اس کے سامنے رکھ کر اسی کے مطابق عدل و انصاف پر مبنی فیصلہ سنایا جائے اور پھر اسی فیصلہ کی بنیاد پر اس کا انجام جنت یا جہنم کی زندگی کی صورت میں اس کے سامنے آجائے۔

ثانیاً یہ کہ معاد کا عقیدہ اس اعتبار سے بھی قابل اہمیت ہے کہ اس کا انسان کی زندگی اور اس کے افعال و کردار پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ انسان ہمیشہ یہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے کہ آیا یہ اچھے اچھے کام جو وہ اپنی عقل اور دین کے فیصلہ کے تحت اپنا وظیفہ و ذمہ داری سمجھ کر انجام دیتا ہے دوسری دنیا میں اس کا کوئی اچھا نتیجہ بھی برآمد ہونے والا ہے یا نہیں؟ اور اسی طرح عقل و دین کے ناپسندیدہ قرار دینے کی بنا پر جن امور کے ارتکاب سے پرہیز برتا ہے یا کسی وجہ سے ان کا مرتکب ہو گیا تو آیا ان اعمال کا کوئی اچھا یا برا انجام سامنے آنے والا ہے یا نہیں؟ آیا یہ قدرت و اقتدار کے مالک جو اس دنیا میں مظلوم و محروم اقوام پر ظلم و زیادتی روا رکھتے ہیں دوسری دنیا میں ان کو اس ظلم کی پاداش اور مظلوموں کو ان کا حق واپس ملے گا یا نہیں؟ آیا ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لیا جائے گا یا نہیں؟

کیا واقعی اس دنیا میں انسان کے اعمال کسی کھیت میں ڈالے جانے والے ایسے بیج کے مانند ہیں جن کا پھل دوسری دنیا میں سامنے آتا ہے؟ یا یہ کہ اس دنیا میں انجام دیئے جانے والے امور اس دانے کے مانند ہیں جو بنجر اور پتھریلی زمین پر چھڑک دیئے جاتے ہیں اور پھر وہ اسی ریگ زار یا شورہ زار بیابان کے سینے میں دفن ہو کر رہ جاتے ہیں اور کبھی بار آور نہیں ہوتے؟

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ معاد سے متعلق براہین و دلائل جن کا انشاء اللہ آئندہ ذکر کیا جائے گا اس حقیقت کو واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ انسان کے تمام قول و فعل چھوٹے ہوں یا بڑے، کم ہوں یا زیادہ ضائع و ناپید نہیں ہوتے بلکہ اس کشت زار ہستی میں اپنی جڑیں مضبوط کرتے رہتے ہیں اور ایک دن ان کے آثار ضرور ظاہر و متجلی ہوں گے اصل میں انسانوں کے تمام گفتار و کردار کا حساب کتاب خداوند عالم کی جانب سے ہر شخص کے دفتر حیات میں بڑے ہی دقیق انداز سے ثبت ہوتا رہتا ہے انسان جو کچھ بھی کرتا ہے قدرتی کیمرے ان کی عکس برداری کرتے رہتے ہیں۔ ہر اچھے عمل کے لئے جزا اور ہر برے فعل کے لئے سزا مقرر ہے اور پوری تحقیق و تدقیق اور عدل و انصاف کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے والوں سے مظلوموں اور محروموں

کا انتقام لیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ہم قرآن مجید سے مدد حاصل کرتے ہوئے اس مطلب کو مزید واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن جناب لقمان کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"یابنی انها ان تلك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السموات او فی الارض یات بها الله ان الله لطیف خبیر۔" (لقمان/۱۶)

اے فرزند! (یاد رکھو) لوگوں کے رتی برابر بھی اعمال (ضائع نہیں جاتے) ولو پتھروں کے سینہ میں یا آسمان کی بلندیوں میں یا زمین کی تہوں میں کیوں نہ پنہاں ہوں خداوند عالم ایک ایک چیز کا حساب کتاب رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر شئے سے واقف و آگاہ ہے۔

اصول دین عقلی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اصول دین بنیادی طور پر عقلی ہیں یعنی ان کی بنیاد عقلی دلائل پر استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ ان کے بارہ میں تحقیق و تدقیق سے کام لے اور پورے طور پر اپنی عقل و قوت ادراک کو کام میں لا کر ان میں سے ہر ایک کے بارہ میں موجود دلائل و براہین سے آشنائی حاصل کرے اور اسی کی بنیاد پر ان کو قبول کرتے ہوئے ان کو اپنے قلب میں اتار لے۔ چنانچہ یہ دلائل و براہین اس قدر محکم و استوار ہیں کہ جب بھی کوئی عقل و خرد سے کام لینے والا منصف مزاج شخص سچے دل سے اس راہ میں قدم بڑھاتا ہے اس پر بخوبی ان کی حقیقتیں آشکار و منکشف ہو جاتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی طرح کی تقلید اور پیروی ہرگز صحیح نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور نہج البلاغہ نیز دیگر تمام دینی و مذہبی کتب میں عقیدۂ معاد کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں جو بھی مطالب بیان کئے گئے ہیں وہ حکم عقل کی تائید کرتے ہیں۔

اصول دین میں سب سے پہلا موضوع جو مورد بحث و توجہ قرار پاتا ہے اور جس سے تمام مباحث کی ابتدا ہوتی ہے توحید اور اثبات صانع عالم ہے۔

یعنی اصول عقائد اسلامی سے بحث و گفتگو کرتے وقت ضروری ہے کہ سب سے پہلے مادہ پرستی کے مقابلہ میں اس خالق کائنات کے وجود کو ٹھوس دلیلوں کے ساتھ ثابت کیا جائے جو علم و حکمت اور حیات و قدرت جیسے تمام صفات کمالیہ کا حامل نیز ہر طرح کے نقائص و عیوب سے منزہ و مبرا ہے اور اس کے ضمن میں ان تمام شکوک و شبہات کے جوابات بھی پیش کر دیئے جائیں جن کو مادیین سند میں پیش کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد نبوت اور معاد کا موضوع، بحث و توجہ کا مرکز بنتا ہے یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کے تینوں اصول ــــ توحید، نبوت اور معاد ایک ہی حیثیت و منزلت کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان میں توحید کو ایک خاص مقام حاصل ہے دراصل توحید تمام اصولوں کی اصل ہے اور نبوت و معاد سے متعلق تمام بحثیں اسی توحید پر استوار ہیں۔

چنانچہ ہماری موجودہ بحث اگرچہ معاد سے متعلق ہے پھر بھی اس کا دارومدار عقیدہ توحید پر ہی ہے اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہاں معاد سے متعلق براہین و دلائل پیش کرنا ہی ہمارا مقصود ہے لہٰذا اب ہم ان میں کی ایک دلیل جو برہان حکمت کے نام سے مشہور ہے، ذکر کرتے ہیں:۔

برہان حکمت

یہ برہان (دلیل) دو مقدموں سے مل کر تشکیل پاتا ہے:۔

پہلا مقدمہ

مباحث توحید میں قطعی دلائل سے خداوند عالم کا حکیم ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ اس کا کوئی بھی عمل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اس سے ہرگز کوئی عبث اور لاطائل فعل صادر نہیں ہو سکتا ــــ عدل خداوندی کے معانی میں سے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اس کے افعال ہر طرح کے نقائص و عیوب سے پاک و منزہ ہیں اور اسی موضوع کی بنیاد پر خداوند عالم کے تمام کام کسی نہ کسی مقصد اور حکمت و مصلحت کے تحت ہوتے ہیں۔

یہ بات علاوہ اس کے کہ علم توحید کے ذیل میں قطعی دلائل کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے قرآن مجید نے بھی بار بار اس کی تاکید و تصریح کی ہے ہم نمونہ کے طور پر صرف دو آیتیں

پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :

سورۂ دخان میں اعلان ہوتا ہے :۔

وماخلقنا السموات والارض ومابینھما لاعبین وماخلقنا ھما الا بالحق ولکن اکثرھم لایعلمون (آیت/ ۳۸و۳۹)

یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ بھی ان دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے (ان سب کو) محض مشغلہ یا کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے بلکہ ہم نے ان کو حق کی بنیاد پر حکمت و مصلحت کے تحت خلق کیا ہے یہ اور بات ہے کہ بیشتر افراد ان (مصلحتوں) کو سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

یہ آسمانوں اور زمین نیز ان کے درمیان پائی جانے والی چیزوں کا حق کی بنیاد پر خلق ہونا قرآن کریم میں بارہ[۱۲] مقامات پر ذکر ہوا ہے اور اس بار بار کے ذکر سے اسی حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ خلقت کا مقصد اس کائنات کو لباس وجود عطا کر کے دوبارہ عدم سے ہم آغوش کر دینا نہیں ہے، بلکہ کائنات کی پیدائش میں ایک بنیادی و اساسی مصلحت کارفرما ہے۔

دوسرا مقدمہ

اگر انسانوں کی خلقت اسی چند روزہ دنیوی زندگی کے لئے ہوتی جو طرح طرح کی زحمتوں، مصیبتوں، محرومیوں، اور بیماریوں سے دامنگیر رہتی ہے اور موت کے بعد ایک دوسرے وجود کا تصور درمیان میں نہ ہو اور اسی موت پر زندگی کا خاتمہ مان لیا جائے تو یہ تخلیق بے مقصد عبث اور لاطائل قرار پاتی ہے۔

کوئی شخص ہرگز اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی یہ مختصر سی زندگی ہر وقت مختلف قسم کی الجھنوں، تلخیوں اور مصیبتوں سے دوچار رہتی ہے چنانچہ اولیائے اسلام کے کلمات و اقوال میں بھی اس ذیل میں بڑی تاکید کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے:۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :۔

ایھا الناس : انما انتم فی ھذہ الدنیا غرض تنتضل فیہ المنایا

مع کل جرعۃ شرق وفی کل اکلۃ غصص (نہج البلاغہ/خطبہ:۱۴۵)

اے لوگو! تمہاری زندگی اس دنیا میں طرح طرح کی موتوں — قتل، آتش سوزی اور غرقابی وغیرہ کے نشانے اور زد پر لگی ہوئی ہے ہر جرعۂ آب خطر گرفتاری اور ہر لقمۂ نان اندیشۂ گلوگیری کے ہمراہ ہے۔

حضرتؑ دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"دارٌ بالبلاء محفوفۃ وبالغدر معروفۃ لاتدوم احوالہا ولایسلم نزالہا احوال مختلفۃ وتارات متصرفۃ العیش فیہا مذموم والامان منہا معدوم وانما اھلہا فیہا اغراض مستھدفۃ ترمیہم بسامہا وتفنیہم بحمامہا۔" (نہج البلاغہ/خطبہ ۲۲۶)

یہ دنیا وہ سرائے ہے جو بلاؤں اور پریشانیوں سے گھری ہوئی ہے اس کی فریب کاری مشہور ہے کبھی بھی ایک حال پر باقی نہیں رہتی اس کے ساکنین کے لئے امن وسلامتی مفقود ہے حالات میں تغیر اور اطوار میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے، یہاں عیش وراحت مذموم اور امن وآسودگی معدوم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے والے تیر بلا کا شکار ہیں دنیا اپنے تیروں سے ان کو نشانہ بناتی رہتی ہے اور موت کی آغوش میں پہونچا کر ان کے نشانات مٹا کر دم لیتی ہے۔

غرضیکہ، اس طرح کا تصور کہ انسان کی خلقت محض چند دنوں کی وہ بھی ایسی دشوار زندگی کے لئے ہوئی ہے ایک ایسی ہی فکر ہے جیسے کوئی شخص ایک وسیع وعریض دسترخوان پر طرح طرح کی نعمتیں چن کر لوگوں کو ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی دعوت دے اور دوسری طرف دسترخوان کے اردگرد درندہ صفت جانوروں اور جلاد طبع افراد کی قطار کھڑی کردے کہ ہر وقت ان آنے والے مہمانوں کو اپنے خطرناک پنجوں، ناخنوں، دانتوں اور خنجروں سے خون آلود کرتے رہیں۔ کیا کسی کریم سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے؟! اور اگر کوئی ایسا کرتا بھی تو کیا یہ چیز اس کے مقصد کے خلاف نہ ہوگی؟! کیا اس طرح کی دعوت و مہمانی لغو و لاطائل نہیں ہے؟!!

ظاہری بات ہے ایک ایسا کام جو خلاف مقصد اور عبث ولاطائل ہو کسی کریم اور حکیم سے ہرگز صادر نہیں ہو سکتا۔

البتہ، اس صورت میں جبکہ ان تمام شدائد و مشکلات اور مصائب و آلام کے پس پشت بنی نوع انسان کی آزمائش اور تربیت ملحوظ خاطر ہو، کیوں کہ تربیت کا ایک یہ بھی اصول ہے اور اس کا مقصد انسان کے اندر صبر و تحمل کے ساتھ مشکلات سے مقابلہ کرنے کی عادت و صلاحیت پیدا کرنا ہوتا کہ لوگ آسانی کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کر سکیں اور جس وقت ایک دوسری دنیا میں وارد ہوں اور ایک نئے ماحول سے روبرو ہوں ان کی روح ترقی یافتہ اور نفس تہذیب شدہ ہو۔ وہ جب دوسری دنیا میں قدم رکھیں ان کی تمام تر صلاحیتیں کھل کر سامنے آچکی ہوں اور پھر ان کے سامنے ان کی کوششوں اور مشقتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا ثمرہ و نتیجہ پیش کر دیا جائے تو یہ طریقۂ کار نہ صرف یہ کہ مقصد کے خلاف اور عبث ولاطائل نہیں ہے بلکہ ایک ایسا کام ہے جو اصولی طور پر تعریف و تحسین کا مستحق ہے۔

نتیجہ

ان دونوں مقدموں سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم کی حکمت خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسانی زندگی اسی دنیا تک محدود و محصور نہ ہو چنانچہ ہماری موجودہ بحث "معاد" کا ماحصل بھی یہی ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیوی حیات پر منتہی نہیں ہو جاتی بلکہ یہ انسان جاودانہ زندگی کا حامل ہے اور اس دنیا کے بعد اس کے سامنے ایک اور دنیا ہے جہاں پہونچکر اس دنیا میں کئے گئے کاموں کا پورا نتیجہ اس کے ہاتھ آئے گا۔

عقل و نقل میں ہم آہنگی

مذکورہ دلیل جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ایک عقلی دلیل ہے، نقلی دلائل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب خدا میں اس موضوع سے متعلق دلیل کے طور پر تین عنوان سے آیتیں وارد ہوئی ہیں۔

۱۔ وہ آیتیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم کوئی چیز بلاوجہ اور عبث پیدا نہیں کرتا اس نے ہر شئی کسی نہ کسی مقصد اور حکمت کے تحت پیدا کی ہے جس کا ایک نمونہ گذشتہ بحث کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

۲۔ وہ آیتیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جن میں بار بار شدید تاکید کے ساتھ کہا گیا ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیا میں محدود و منحصر نہیں ہے۔ اس دنیا کے بعد ایک دنیا اور بھی ہے جہاں اعمال کا حساب کتاب اور پھر جزا و سزا کے طور پر جنت و جہنم موجود ہے۔

۳۔ وہ آیتیں ہیں جن میں کار تخلیق کا بے کار و عبث نہ ہونا معاد سے مربوط قرار دیا گیا ہے اور جو پوری صراحت کے ساتھ کہتی ہیں کہ اگر معاد درمیان میں ہوتا تو انسان بلکہ پوری کائنات کی تخلیق فضول و عبث قرار دیدی جاتی۔ یہاں ہم اپنے موضوع سے مناسبت کی بنا پر اس طرح کی آیتوں کے چند نمونے پیش کر دینا چاہیں گے۔

الف: افحسبتم انما خلقناکم عبثا و انکم الینا لاترجعون فتعالی اللّٰہ الملک الحق لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم" (مومنون/۱۱۵ و ۱۱۶)

آیا تم لوگ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو یوں ہی عبث، پیدا کر دیا ہے اور تم کو ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے، پتہ چلا کہ اگر خدا کی جانب بازگشت اور معاد، بیچ میں نہ ہوتی تو انسانوں کی خلقت بے کار و عبث قرار دیئے جانے کی مستحق ہوتی اور اس کے بعد خداوند عالم نے خود کو چار صفتوں میں متصف قرار دیا ہے تاکہ بیان کامل طور پر بارثبوت کو پہنچ جائے۔

۱) ملک، یعنی وہ اس جہان ہستی کا سلطان ہے اور — یہ پوری کائنات اسی کے تحت فرمان ہے آفرینش ہستی کا اختیار، اس کا آغاز و انجام، روزی روٹی، حیات و موت، بازگشت و حساب کتاب یہ سبھی کچھ اسی کے دست قدرت میں ہے۔

۲) وہ حق ہے اس سے کوئی باطل، لغو اور عبث کام صادر ہونا محال ہے۔

۳) لا الٰہ الا ھو، یعنی اس کے علاوہ کوئی دوسرا خدا اور حکم صادر کرنے والا نہیں ہے جو اس کے فرمان اور ارادہ پر برتری رکھتا ہو چنانچہ اس کے احکام ہمیشہ نافذ و واجب العمل ہیں۔

۴) ھو رب العرش الکریم، یعنی وہ عرش عالم ہستی کا فرمانروا اور پروردگار ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ ایک اکیلا اس پوری کائنات کا فرماں روا ہے تمام چیزیں اسی کے حکم و ارادہ سے وجود میں آتی ہیں اور اس کا ہر حکم حق ہوتا ہے اور چونکہ وہ حق ہے اس کا ہر فعل بیکار و عبث اور باطل و لغو ہونے سے منزہ ہے — اور اگر معاد، درمیان میں نہ ہو تو کائنات کی تخلیق

فضول و باطل قرار پاتی ہے۔

ب ۔ وما خلقنا السموات والارض وما بینهما الا بالحق وان الساعة لاتیة (حجر/۸۵)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ بھی ان کے درمیان ہے ان سب کو نہیں پیدا کیا مگر یہ کہ ان کو حق قرار دیا ہے اور قیامت کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے۔

گذشتہ آیت کی طرح اس آیت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اگر قیامت درمیان میں نہ ہوتی تو آسمان وزمین اور ان کے مابین پائی جانے والی تمام مخلوقات حق نہ قرار پاتیں اور ظاہر ہے اگر حق نہ ہوتیں تو عبث قرار پاتیں۔ (تفسیر المیزان، جلد دہم ص ۔ ۱۹۹ ۔)

ج ۔ وخلق الله السموات والارض بالحق ولتجزى كل نفس بما كسبت وهم لايظلمون (جاثیہ/۲۲)

خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین کو حق پر اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کی جزا پائے یعنی جو کچھ اس نے انجام دیا ہے اس کا نتیجہ اس کو مل جائے اور کسی پر ظلم نہ ہو لوگ کیوں حیرانی و سرگردانی سے دوچار رہیں؟

یہاں معاد سے متعلق دلائل کے ذیل میں سب سے پہلی دلیل جس کو برہان حکمت کے عنوان سے ہم نے ذکر کیا تھا تکمیل کو پہونچتی ہے لیکن اس سلسلہ کی کوئی اور دلیل پیش کرنے سے پہلے برہان حکمت سے متعلق ایک اہم نکتہ کی طرف متوجہ کردینا ضروری ہے وہ یہ کہ اکثر و بیشتر جو لوگ کائنات کی خلقت کو عبث یا فضول تصور کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ بات انہیں حیرت و استعجاب میں غوطہ خوری پر مجبور کردیتی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ انہوں نے خلقت کے رموز و مقاصد پر مذکورہ برہان حکمت کی بنیاد پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اس دنیا پر تصور آخرت سے جدا ہوکر نظر ڈالی ہے گویا آخرت کو بالکل نظر انداز کردیا ہے چنانچہ یہ لوگ انسانی زندگی کو اسی چند دنوں کی دنیوی زندگی میں محدود و مقید خیال کرکے یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ ہم موت کے بعد فنا ہوجائیں گے یعنی موت ہماری زندگی کا خاتمہ ہے اور جب ایسا ہے تو اس خلقت کا فائدہ ہی کیا ہے؟ تخلیق کائنات فضول و عبث ہے اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ہے!!



جناب ابراہیم امینی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

اسلامی حکومت

بین الاقوامی روابط اور خارجہ پالیسی

گذشتہ دو شماروں میں آپ ملاحظ فرما چکے ہیں کہ یہ بات اپنی جگہ قطعی طور پر مسلّم ہے کہ اسلام سیاست میں مکمل طور پر دخیل ہے اور حکومت کی تاسیس، ملت اسلام کی نگرانی وحفاظت اور ان سے متعلق انفرادی واجتماعی احکام وقوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک مستقل نظریہ کا حامل ہے۔ سب سے پہلے ہم نے اس سوال کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی کہ آیا دنیا کے دیگر افراد اور ممالک کے سلسلہ میں ہماری کسی طرح کی کوئی ذمہ داری بھی ہے یا نہیں؟ آخر اس سلسلہ میں اسلام نے ہم سے کچھ چاہا ہے یا نہیں؟ اور اگر چاہا ہے تو اس کے پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے علاوہ ہم نے عرض کیا کہ ہمیں کن ممالک سے رابطہ قائم کرنے کی اسلام نے اجازت دی ہے اور کن سے رابطہ قائم کرنا غیر اسلامی عمل قرار دیا ہے اس کے ذیل میں پیغمبر اسلامؐ کی آفاقیت اور عالمی رسالت، اسلام کی تبلیغ و اشاعت، خیر کی طرف دعوت اور مسلمانوں کے فرائض، ظلم و استکبار سے مقابلہ، محروم وبے بس اقوام کا دفاع، امت اسلامیہ کی آزادی و استقلال کا تحفظ، ممالک کفر سے اسلامی حکومت کا رابطہ، ان سے تقیہ و اضطرار کی حالت میں دوستانہ تعلقات، تعاون و امداد باہمی اور عدم مداخلت کا معاہدہ، ایفائے عہد نیز دشمنان اسلام کو خائف و مرعوب رکھنا جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں:۔

دشمن کے مقابلہ میں قاطعیت و ثبات قدم :

قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ کبھی بھی کفار کی حقیقت و اصلیت ان کی دشمنی و نفرت اور کینہ و حسد کی عادت، سازشانہ روش اور خفیہ منصوبہ بندی سے غفلت نہیں برتنی چاہئے کیونکہ وہ ہر گھڑی اس فکر میں رہتے ہیں کہ کب موقع ملے اور مسلمانوں پر غلبہ و تسلط حاصل کرکے ان سے ان کا دینی استقلال و آزادی چھین لیں۔ مسلمانوں کو الٰہی مقاصد کی تکمیل کے لئے دشمنوں کے مقابلہ میں انتہائی ثبات قدم و پایداری سے کام لینا چاہئے اور ان کے غیر شرعی مطالبات کا پابند نہیں بننا چاہئے۔ خداوند عالم نے قرآن مجید میں صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ:۔

"محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم" (سورۂ فتح / ۲۹)

محمد مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے رفقاء کفار کے تئیں نہایت ہی سخت گیر اور آپس میں بے پناہ نرم و مہربان ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم ومأواھم جھنم وبئس المصیر (تحریم / ۹)

اے پیغمبرؐ! کفار و منافقین سے جہاد و قتال کیجئے اور سخت سے سخت رویہ اپنایئے ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم میں قرار دیا گیا ہے اور اس سے بدتر کون سا مقام ہو سکتا ہے

اس آیت میں پیغمبر اسلام کو کفار و منافقین سے جہاد اور سختی سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بظاہر جہاد سے مراد کوشش و جستجو ہے اس لئے کہ پیغمبر صلعم نے منافقین سے کوئی جنگ نہیں لڑی ہے البتہ اس میں پیغمبرؐ کو دلیلوں، موعظوں، نصیحتوں، پیغام رسانیوں نیز تمام دوسرے ہدایت و آگہی کے ممکنہ وسیلوں کو کام میں لاکر الٰہی مقاصد کی تکمیل کرنے اور کفار و منافقین کے منصوبوں اور سازشوں کو خاک میں ملانے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ اس راہ میں ہر طرح کے ضعف و اضمحلال یا سستی و نرمی سے اجتناب کرتے ہوئے استقلال و پایداری کا مظاہرہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ خدا

فرماتا ہے :۔

فلا تطع المکذبین ودّوا لو تدھن فیدھنون (قلم/۸ و ۹)

اے پیغمبر ان تکذیب کرنے والوں کی (جو آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں) پیروی نہ کیجئے۔ ان کی بڑی خواہش ہے کہ آپ ان سے نرمی سے پیش آئیں تاکہ وہ بھی (نفاق سے) آپ کے ساتھ نرم برتاؤ کریں۔

اسی طرح کفار کے لئے ارشاد ہے :۔

فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً (فرقان/۵۲)

یعنی آپ (ہرگز) کفار کی پیروی نہ کیجئے (بلکہ) ان سے جہاد کیجئے ایک عظیم جہاد۔

اور مومنین کو ان الفاظ میں جوش دلایا گیا ہے :۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین (آل عمران/۱۳۹)

سست اور غمگین نہ ہو تم (تو) دنیا کے اعلیٰ ترین افراد میں ہو بشرطیکہ تم مومنین ہی سے رہو۔"

پیغمبر اسلام سے خطاب ہوتا ہے :۔

فلذلک فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم (شوریٰ/۱۵)

اس لئے (سب کو دین اسلام کی طرف) دعوت دیتے رہو اور جس چیز کا تم کو حکم دیا گیا ہے اس پر ثابت قدم رہو اور ان کی خواہشات نفسانی کی ہرگز پروا نہ کرو۔

اسی انداز کا دوسری جگہ بھی حکم ہے :۔

"فاستقم کما امرت ومن تاب معک ولا تطغوا انہ بما تعملون بصیر ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون" (ھود/۱۱۲/۱۱۳)

پس (اے ہمارے رسولؐ) جس چیز پر ہم نے آپ کو مامور کیا ہے ثابت قدم و پائداری کا ثبوت دیجئے اور یہی ان لوگوں کے لئے بھی حکم ہے جو آپ کے ساتھ خدا پر ایمان لا چکے ہیں (لوگو) سرکشی نہ کرو کیونکہ جو کچھ تم کر رہے ہو خدا

دیکھ رہا ہے۔ ظالموں پر تکیہ نہ کرو ورنہ تم کو (بھی) آتش گھیرے گی اور (اس وقت) سوائے خدا کے کوئی یاور و مددگار اور آقا و سرپرست نظر نہ آئے گا اور تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

اور آخر میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ :۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (سورہ احقاف/۱۳)

جو لوگ کہتے ہیں ہمارا پروردگار "اللہ" ہے اور (اپنے اس قول پر) قائم و ثابت رہتے ہیں، ان پر کسی طرح کا حزن و ملال یا خوف طاری نہیں ہوتا ہے۔

دنیا کے مسلمانوں سے حکومت اسلامی کے روابط۔

اسلام کی نظر میں دنیا کے تمام مسلمان "ایک امت" کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی بنیاد عقائد و نظریات اور مقصد و ہدف کی ہم آہنگی پر رکھی گئی ہے مسلمانوں کے تمام گروہوں کے درمیان ایک ایسا گہرا نظریاتی رابطہ موجود ہے جس کو قوم و قبیلہ، ملک و زبان یا کسی بھی طرح کے دوسرے اختلافات کے ذریعہ پارہ پارہ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے اسی چیز کی طرف متوجہ کیا ہے کہ :۔

ان ھٰذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون (انبیاء/۹۲)

یعنی یہ (عظیم انبیاء جن کی طرف اشارہ کیا گیا اور ان کے پیرو) سب کے سب ایک ہی امت سے تعلق رکھتے تھے (اور ایک مقصد کے پیرو تھے) میں تمہارا خدا ہوں پس میری عبادت کرو۔

اس آیت میں تمام مسلمانوں کو ایک ہی امت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور سب کو ایک مشترک مقصد کی طرف گامزن بتایا گیا ہے جن کا ایک ہی پروردگار ہے اور ان سب کا مقصد اسی خدائے واحد کی پرستش و اطاعت ہے۔

بہت سی ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن میں تمام مسلمانوں کو ایک پیکر کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے گویا مسلمین ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی حیثیت رکھتے ہیں مثال کے طور پر

ابو سعید پیغمبر اسلامؐ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا :-

"المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضا" (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۸۷)

یعنی ہر مومن دوسرے مومن کے لئے ایک پایہ اور اساس (بنیاد) کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصوں کا محافظ و نگراں ہوتا ہے۔

اسی طرح خود پیغمبرؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا :-

"ان المؤمن من اھل الایمان بمنزلۃ الرأس من الجسد یألم المؤمن لاھل الایمان کما یألم الجسد لما فی الراس" (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۸۷)

یعنی ایک مومن اہل ایمان سے وہی نسبت رکھتا ہے جو سر اور بدن کے درمیان نسبت پائی جاتی ہے۔ مومن دیگر صاحبان ایمان کے درد کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح بدن کے درد کا ادراک سر کے ذریعہ ہوتا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر رسول اسلامؐ فرماتے ہیں :-

من اصبح لا یھتم بامور المسلمین فلیس منھم ومن سمع رجلاً ینادی یا للمسلمین فلم یجبہ فلیس بمسلم (کافی ج ۲ ص ۱۶۴)

جس نے اپنا دن امور مسلمین کے سلسلہ میں کوئی اہتمام کئے بغیر گزار دیا اسے خود کو ان کی فہرست میں شامل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اور جو اپنے کسی دینی بھائی کی فریاد "اے مسلمانو!" سنے اور اس کا (مثبت) جواب نہ دے (دراصل) وہ مسلمان (ہی) نہیں ہے۔

اسی طرح ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :-

"المؤمن اخو المؤمن کالجسد الواحد ان اشتکی شیئاً منہ وجد ألم ذالک فی سائر جسدہ" (کافی ج ۲ ص ۱۶۶)

ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے گویا وہ ایک جسم کے مانند ہیں (چنانچہ) اگر جسم کے ایک حصہ کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے اس کا اثر جسم کے ایک ایک اعضا میں

سرایت کر جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ہی ارشاد گرامی ہے :-

انما المؤمنون اخوة بنو اب وام واذا ضرب علی رجل منهم عرق سهر له الاخرون (کافی ج ۲ ص ۱۶۵)

بے شک تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کی رگ کٹتی ہے یا اس پر چوٹ لگتی ہے تو دوسروں کی آنکھوں سے بھی نیند اڑ جاتی ہے۔

امام صادق علیہ السلام کا ایک قول اس طرح بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :-

المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یخذله ولا یخونه ویحق علی المسلمین الاجتهاد فی التواصل والتعاون علی التعاطف والمواسات لاهل الحاجة وتعاطف بعضهم علی بعض حتی تکونوا کما امرکم الله عزوجل : "رحماء بینکم" متراحمین مغتمین لما غاب عنکم من امرهم علی ما مضی علیه معشر الانصار علی عهد رسول الله صلی الله علیه وآله (کافی، ج ۲ ص ۱۷۴)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں کر سکتا، اس کو اس کے مقام سے گرانے کی کوشش نہیں کر سکتا، نہ ہی اس کے ساتھ خیانت کر سکتا اور یہ مسلمانوں پر ہے کہ وہ آپس میں تعاون و ارتباط اور ہمدردی و وابستگی کی بنیاد پر حاجت مندوں کے ساتھ مواسات برتیں ایک دوسرے کی دل سوزی اور خیر خواہی کریں اور بعینہ ویسے ہی جیسے خدا نے حکم دیا ہے اس کے قول پر عمل کرتے ہوئے کہ " وہ آپس میں بہت زیادہ شفیق و مہربان ہیں " آپس میں ہمدردی و شفقت کا مظاہرہ کریں۔ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہوئے ان لوگوں سے ہمدردی کا ثبوت دیں جو تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے دور میں گروہ انصار کا برتاؤ کچھ ایسا ہی تھا۔

ان تمام اقوال وارشادات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلکہ یک پیکر اور جسم کی حیثیت رکھتے ہیں کیسے ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے غفلت اور بے توجہی برتیں۔ ان کے درمیان بھائی چارگی، محبت و دوستی، ہمدردی و دلسوزی، تعاون وامداد باہمی اور دفاع و خیرخواہی کی روح کارفرما رہنی چاہئے۔ چنانچہ یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے کہ حکومت اسلامی کی ذمہ داریاں محض ایک مخصوص جغرافیائی دائرے میں محدود نہیں کی جاسکتیں بلکہ اس پر دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے سلسلہ میں کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عارض ہوتی ہیں اور حتی الامکان اپنی کوششوں کو بروئے کار لانا اس کا فریضہ ہے۔ اس کے اہم فرائض حسب ذیل ہیں:۔

الف ۔ دنیا کے تمام مسلمانوں میں صحیح اسلامی معارف و حقائق کی نشر و اشاعت کرنا اور یہ کام کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی اشاعت کے ذریعہ، علماء و مبلغین کے وفود کے ذریعہ، علمی و ثقافتی تعلقات و تبادلات کے ذریعہ مساجد، مدارس میں اساتذہ اور مبلغین کی تقرری کے ذریعہ دینی تبلیغی اجتماعات اور جلسوں کے ذریعہ یا کسی بھی دوسرے عوامی ذرائع ابلاغ کے وسیلہ سے بخوبی انجام دیا جاسکتا ہے۔

ب ۔ دنیا میں تمام مسلمانوں کی آزادی کے لئے اسلامی انقلابی تحریکوں کی حمایت کرنا۔

ج ۔ دنیا کے محروم، بے بس اور محتاج افراد کی اقتصادی مدد کرنا۔

د ۔ مظلوم و ستم دیدہ اقوام کا دفاع کرنا۔

ھ ۔ دنیا کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و وحدت کی کوشش کرنا۔

و ۔ اگر دشمن واستعماری طاقتیں، مسلمانوں کے وجود و آزادی پر حملہ آور ہوں تو ان کا دفاع کرنا۔

اگرچہ اسلامی حکومت کے کاندھوں پر بڑی عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں پھر بھی طاقت و امکانات کے تحت ہی ایک حکومت اپنے فرائض ادا کرسکتی ہے اور وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ــ کیونکہ وقت، افراد، زمانہ اور ملک کے اعتبار سے یہ مصلحتیں بدلتی رہتی ہیں چنانچہ یہ بھی حکومت اسلامی کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری ہے کہ وہ پہلے موجودہ شرائط و حالات اور کیفیات و امکانات کا بھرپور جائزہ

لے پھر اسی کے مطابق اپنی خارجہ سیاسی پالیسی مرتب کرے۔

مسلمانوں پر حاکم حکومتوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے روابط۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ حکومتیں جو مسلمانوں پر تسلط واقتدار حاصل کئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ اسلامی حکومت کو کس قسم کی سیاست اپنانی چاہیئے ؟ کیا ان سے بھی روابط و تعلقات کی بنیاد ان ہی اصولوں پر مبنی ہوگی جو ممالک کفر کے ذیل میں بیان کئے جا چکے ہیں ؟ یا ان کے سلسلہ میں کوئی دوسری سیاست انتخاب کی جائے گی۔؟ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں پر حاکم یہ حکومتیں بھی سب کی سب یکساں نہیں ہیں۔ مجموعی طور پر ان کو مندرجہ ذیل چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ حکومتیں جو کامل طور پر سو فی صدی اسلامی ہوں اور اسلامی نظام و دستور پر یقین رکھتی ہوں نیز انھیں تمام شعبہ ہائے زندگی میں بروئے عمل بھی لا رہی ہوں۔

۲۔ وہ حکومتیں جو اجمالی طور پر اسلام پر یقین رکھتی ہیں لیکن مکمل طور پر اسلام سے واقفیت نہیں رکھتیں، اسلام کے بارہ میں اس کے عبادی احکام وعقاید اور کچھ اخلاقی اصول و ضوابط کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتیں اور اس بات سے قطعی ناواقف ہیں کہ اسلام نہ صرف عبادی و اخلاقی بلکہ سیاسی و اجتماعی اصول و قوانین کے اعتبار سے بھی ایک کامل نظام ہے چنانچہ کامل طور سے اسلام کے بروئے عمل لانے کا ان کے یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ یہ صورت جہل و نادانی کی بنیاد پر ہو نہ کہ بغض و عناد کی بنیاد پر۔

۳۔ وہ حکومتیں جو اسلام کی مدعی ہیں لیکن جن کا مقصد حکومت و اقتدار پر قابض رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ایسی حکومتیں جاہ و سلطنت اور عیش و عشرت کی دلدادہ ہوتی ہیں ان کو اسلام یا غیر اسلام سے کوئی غرض نہیں ہوتی چنانچہ اسلامی احکام و قوانین کی پابند بھی نہیں ہوتیں۔

۴۔ وہ حکومتیں جو نہ صرف یہ کہ اسلامی احکام و قوانین کی پابند نہیں ہیں بلکہ حقیقتاً انھیں کافر و غاصب بڑی استکباری طاقتوں نے بیچارے مسلمانوں پر مسلط کر رکھا ہے اور

انہیں کی حمایت کے سہارے کفرنواز، اسلام دشمن استکباری طاقتوں کی نمایندگی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اسلامی حکومت کے روابط و تعلقات تمام ایسی حکومتوں سے ایک جیسے تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اصل میں اسلامی حکومت ایک ہدف و مقصد رکھتی ہے اور اس کی بنیاد ایک مستقل نظریہ اور فکر پر استوار ہے ظاہر ہے وہ ہر ایک کے ساتھ ایسی سیاست کا انتخاب کرے گی جو زیادہ سے زیادہ اس کے مقاصد سے ہم آہنگ اور نزدیک ہو۔ اسلامی حکومت چونکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے سلسلہ میں ذمہ دار و جواب دہ ہے اور اجمالی طور پر اسکی ذمہ داریاں جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، کچھ اس طرح کی ہیں:-

۱- مسلمانوں کی بیداری کے لئے اسلامی تہذیب و ثقافت اور علوم و معارف کی ترویج و اشاعت کے وسائل فراہم کرنا۔

۲- مسلمانوں کے درمیان محبت و اخوت اور اتحاد و مفاہمت کی فضا ہموار کرنا۔

۳- مسلمانوں کے مسائل میں بڑی استعماری طاقتوں کا عمل دخل ختم کرنا۔

۴- امت مسلمہ کی مکمل آزادی و استقلال کے لئے کوشش کرنا۔

۵- خالص اسلامی حکومت کی تاسیس اور دنیا میں مکمل اسلامی قوانین و احکام کے نفاذ کے اسباب فراہم کرنا۔

۶- محروموں اور کمزوروں کو ان کا حق دلانا اور اس کے لئے دنیا میں عدالت اجتماعی کے قیام کی کوشش کرنا۔

۷- کفر و الحاد اور مادہ پرستی کے مقابلہ میں توحید و خدا پرستی اور اسلامی مقاصد کا احیاء کرنا۔

اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں ایسی سنگین ہیں کہ جن کا انجام دینا بہت ہی دشوار ہے۔ ذمہ داران مملکت اسلامی کا فریضہ ہے کہ وہ مذکورہ مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی خارجہ پالیسی اس طور پر مرتب کریں کہ بہتر سے بہتر انداز میں جلد سے جلد اپنے مقاصد کو حاصل کر سکیں اور یہ ایک فطری سی بات ہے کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہنکایا جا سکتا

بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے اعتبار سے ان کی عمومی وضعیت و کیفیت زمان و مکان کے فرق کے ساتھ حتیٰ کہ دنیا کے عمومی حالات و کوائف اور حوادث و واقعات نیز خود اسلامی حکومت کی اقتصادی سیاسی اور فوجی صورت حال اور امکانات مختلف ہو سکتے ہیں، اہم یہ ہے کہ کسی صورت میں بھی اسلامی مقاصد اور ہدف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ہر منزل میں ان مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے ہر ممکنہ موقع اور وسیلہ سے فائدہ اٹھانا ہمارا فریضہ ہے۔

کبھی مکمل طور پر رابطہ قائم کر لینے میں بھلائی مضمر ہوگی اور کبھی رابطہ منقطع کر لینا بہتر ہوگا، کبھی جنگ کرنے میں مصلحت پائی جائے گی کبھی صلح کر لینا مناسب ہوگا اور یہ ذمہ داران مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے لئے بہترین راہ کا انتخاب کریں۔ جہاں تک اچھے روابط استوار کرنے کے فوائد کا مسئلہ ہے اجمالی طور پر ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ دو حکومتوں کے درمیان تفاہم و دوستی ہونے کی صورت میں ملت کے درمیان بہتر طور پر رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ اسلام کے حیات آفریں قوانین و معارف کے نشر کرنے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اسلامی حقائق سے روشناس کرانے نیز مکمل طور پر اسلامی دستور و ضوابط کے نافذ کرنے کے لئے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

۲۔ دوستانہ روابط استوار ہونے کی صورت میں بین الاقوامی سطح پر ان کی باہمی کوششوں سے اسلام کے مفاد میں بہتر طور پر کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اچھے تعلقات برقرار ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اسلامی وحدت کی فضا قائم کی جا سکتی ہے مختلف قوموں اور حکومتوں کو کفر و استکبار کے خونی چنگلوں سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ جبھی تو اسلام دشمن بڑی کافر طاقتوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ایجاد کیا جائے تاکہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ان کے دامن میں پناہ حاصل کریں۔ چنانچہ مسلمان ممالک کے درمیان قطع تعلق کو ہوا دینا ایک بڑی استعماری سازش کا جزء ہے لہٰذا اگر اسلامی حکومت اپنے اصل مقاصد کو فراموش کئے بغیر، دیگر اسلامی ملکوں سے اپنے روابط برقرار رکھتی ہے اور ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش جاری رکھتی ہے تو قہری طور پر یہ چیز اس کو اپنے مقصد سے قریب تر کرے گی کیونکہ اسلامی حکومت جیسے جیسے

ان ملکوں اور قوموں سے قریب تر ہوتی جائے گی دنیا کی بڑی استعماری طاقتیں خود بخود ان سے دور ہوتی چلی جائیں گی۔

۴۔ اگر اسلامی حکومت کسی ملک سے اپنے روابط قطعی طور پر منقطع کر لیتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ظاہر ہے وہ حکومت اپنے وجود کے تحفظ کے لئے اپنے آپ کو بڑی استکباری طاقتوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ٹھوس بنیادوں پر وابستہ کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دم سے دامن کفر و استکبار میں پناہ حاصل کر لے اور یہ چیز یقینی طور پر اسلامی دنیا کے مفاد میں نہیں قرار دی جا سکتی۔

۵۔ ایسی حکومتوں سے اسلامی حکومت کے روابط اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی اعتبار سے دونوں ملکوں کے عوام کے حق میں بے حد مفید ہوں گے۔

۶۔ حسن تفاہم اور دوستانہ روابط کے نتیجہ میں ان کی دشمنی اور سازش سے محفوظ رہا جا سکتا ہے یا کم از کم اس میں کمی پیدا کی جا سکتی ہے۔

۷۔ اسلامی حکومت اپنے مفاہمت آمیز رویہ اور اقتصادی، ثقافتی، علمی و فوجی روابط کے ذریعہ تمام اسلامی ممالک سے اپنے بہت سے ضروری وسائل زندگی با آسانی فراہم کر سکتی ہے اور اپنی جگہ خود کفیل یا کم از کم خود کفالت سے قریب تر ہو سکتی ہے اسی طرح اسلامی دنیا کی ضرورتوں کو پورا کر کے ان ممالک سے قریبی تعلقات کی بنیاد پر دوسروں سے ان کی وابستگی میں کمی پیدا کر کے بڑی استعماری طاقتوں پر ایک کاری ضرب لگا سکتی ہے۔

لیکن یہ تمام باتیں اس بات پر منحصر ہیں کہ اسلامی حکومت کسی صورت میں بھی اپنی اسلامی ذمہ داری اور مقصد و ہدف کو فراموش نہ ہونے دے اور ہر منزل میں اصل مقصد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صحیح اور مناسب اسلامی راہ کا انتخاب کرے یا کم از کم اصل مقصد تک پہونچنے کے لئے کوشش و جستجو جاری رکھے۔ البتہ حصول مقصد کے لئے ضروری نہیں ہے کہ صرف کسی ایک راہ کو اپنے لئے لازمی قرار دے لیا جائے بلکہ وقت، افراد اور حالات کے اعتبار سے پالیسی میں تبدیلی پیدا کی جانی چاہئے اور یہی راہ عمل کا انتخاب نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ دقیق اور نازک مسئلہ ہے بلکہ ایک چھوٹی سی غفلت و بے توجہی یا سہل انگاری ممکن ہے ناقابل تلافی

نقصانات کا باعث بن جائے اور دنیا کی نظروں میں حکومت اسلامی کا وقار و عظمت پارہ پارہ ہو جائے۔

بہرحال اسلامی حکومت کے لئے بین الاقوامی روابط اور خارجہ پالیسی کا انتخاب اس کے اصل مقصد و ہدف کا تحفظ کرتے ہوئے ایک نہایت ہی دشوار امر ہے جس کے لئے بے حد ہوشیاری اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔ ذمہ داران مملکت اسلامی کا فریضہ ہے کہ بھرپور عقل و تدبر کے ساتھ نتائج و عواقب پر نظر رکھتے ہوئے عمومی حالات و کیفیات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسلامی اصول و قوانین کی روشنی میں جو بہترین اور نزدیک ترین راہ ہو سکتی ہے اس کا انتخاب کریں اور پھر منزل تک پہونچنے کی بھرپور کوشش و جستجو بھی کریں۔ خارجہ پالیسی کی یہی وہ چہار دیواری ہے جس میں کبھی کبھی قطع تعلقات، خفیہ انقلابی تحریک اور آخر میں باقاعدہ علی الاعلان جنگ کی نوبت بھی پہونچ سکتی ہے۔

غدیر

اسلام کی ایک اہم عید

یوم غدیر، تاریخ اسلام کا سب سے اہم دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب خداوند کریم نے مسلمانوں پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کر دی۔ احکام دین کامل و استوار ہو گئے۔ ہدایت کے رسالتی سلسلہ کو امامت سے متصل کر دیا گیا۔ بندگی کی راہ میں گامزن امت کو ولایت کی سرپرستی عطا ہوئی۔ مسلمانوں کا آیندہ رہبر معین کیا گیا اور فرزند کعبہ، مسند امامت پر جلوہ افروز ہوا۔

یوں تو پیغمبر اسلام مختلف موقعوں پر امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی امامت و خلافت کا ذکر اہل اسلام کی بزم میں فرمایا کرتے تھے۔ لیکن درحقیقت باقاعدہ طور سے اس کا عمومی اعلان ضروری تھا۔ مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ اسلامی سرزمین میں پھیلتے جا رہے تھے، چنانچہ اپنی رسالت کے آخری سال میں آنحضرتؐ نے عمومی حج کا اعلان فرما دیا۔ ایسے تاریخ ساز امر کے اظہار و ابلاغ کے لئے حج کے مجمع سے بہتر اور کون سا مجمع ہو سکتا تھا۔ خود پیغمبر اسلامؐ نے مکہ سے ہجرت کے بعد سے اب تک کوئی حج ادا نہیں فرمایا تھا کیونکہ اب تک مکہ، کفار و مشرکین کے زیر اثر تھا لیکن اب جبکہ جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں بھی کلمہ توحید کی آواز بلند تھی اور زمین کا ایک بڑا حصہ پرچم اسلام کی ہواؤں سے سرشار تھا، لہٰذا عمومی حج کے لئے یہ ایک بہترین موقع تھا۔

اس عمومی حج کا اعلان اسلامی مملکت میں ہر طرف منتشر کر دیا گیا۔ بھلا پیغمبرؐ کی رکاب میں حج کی سعادت سے کون محروم رہتا۔ لوگ جوق در جوق پیادہ و سوار حضرتؐ کے ہمراہ ہو گئے۔ مومنین

مطابق ایک لاکھ چند ہزار افراد نے آنحضرتؐ کے ہمراہ مکہ کی طرف کوچ کیا۔ بعد میں آکر اس قافلہ سے ملنے والوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

یہ حج، حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اسی حج میں رسول اکرمؐ نے اپنی امت سے وداع کہی۔ یا پھر اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حج پیغمبر اسلامؐ کا آخری حج تھا۔

غدیر کا واقعہ

پیغمبر اسلامؐ حجاج کے اس انبوہ کثیر کے ساتھ مکہ سے واپس ہوتے ہوئے اٹھارہ [۱۸] ذی الحجہ کو غدیر خم کے علاقہ میں پہنچے۔ غدیر ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں بارش کا پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اس تپتے ہوئے صحرا میں ایسی جگہیں بہت اہم ہوا کرتی ہیں۔ اس زمانہ میں اس مقام کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہیں سے قافلے مختلف سمتوں میں متفرق ہوا کرتے تھے جب رسول اسلامؐ اس مقام پر پہنچے تو خداوند عالم کی جانب سے ولایت کی تبلیغ کرنے کا حکم پوری تاکید و تہدید کے ساتھ نازل ہوا۔ امین وحی، خدا کا یہ عظیم پیغام لیکر نازل ہوئے۔

"یا ایھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔" (مائدہ/۶۷)

اے پیغمبر خداؐ جو حکم آپ پر خدا کی طرف سے نازل ہو چکا ہے اس کی تبلیغ کر دیجئے اور اگر آپ نے یہ عمل انجام نہ دیا تو گویا رسالت کی تبلیغ نہ کی اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

آیت کریمہ میں تبلیغ کے اس حکم سے مراد جملہ تعلیمات اسلام کی تبلیغ ہرگز نہیں، ورنہ تہدید کا جملہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اگر ہم اسے رسالت کی تبلیغ کا حکم مانیں تو شرط و جزا میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے گا اور اس طرح آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اے پیغمبرؐ! آپ رسالت کی تبلیغ کیجئے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے رسالت کی تبلیغ نہیں کی۔" ظاہر ہے کہ آیت کے یہ معنی صحیح اور درست نہیں ہو سکتے پھر ماننا پڑے گا کہ اس تبلیغ سے مراد کوئی ایسا اہم امر ہے جس پر پورے دین کا دارومدار ہے۔ اگر اسے انجام نہ دیا گیا تو رسالت کی تمام تبلیغات و تعلیمات بے کار ہو کر رہ جائیں گی۔ کیونکہ یہی امر دین کی

بقا کا موجب اور شریعت کے دوام کا ضامن ہے اور بغیر اس کے کوئی تبلیغ کارگر اور کوئی شریعت مکمل نہیں ہو سکتی اور وہ مسلمانوں کے آیندہ رہبر کی تعین کا مرحلہ ہے جس کی اتنی تاکید کی جا رہی ہے۔[1]

اسلام کے سارے اصول و تعلیمات کی تبلیغ کے موقعوں پر کبھی خدا نے لوگوں سے آنحضرتؐ کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا لیکن یہاں نبیؐ کو پس و پیش میں دیکھ کر خدا نے آپ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا کہ وہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ولایت کی تعین کا مرحلہ ایسا تھا جو کسی کو بغض و حسد میں مبتلا کرتا اور کسی کو سوءظن کا شکار بناتا۔ چونکہ امیرالمومنینؑ نے گذشتہ اسلامی جنگوں میں عرب کے بے شمار سرکشوں کو زمین دکھائی تھی، انہوں نے خوف و ترس کی وجہ سے تو اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ان کے دل میں علیؑ کی طرف سے بغض و عناد بھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف رسول خدا سے نزدیک ترین قرابت رکھنے کی وجہ سے علیؑ کا انتخاب سادہ لوح افراد کے لئے سوءظن کا باعث ہوتا جو دشمنوں اور بدخواہوں کے لئے بڑا سودمند ثابت ہوتا۔ لہٰذا رسول اسلامؐ کو خدشہ تھا کہ کہیں اس امر کا اعلان بُرے نتائج کا پیش خیمہ نہ ثابت ہو۔ یہی وجہ تھی کہ خداوند عالم نے پیغمبر اسلامؐ کو ان تمام عواقب سے مطمئن کر دیا کہ خدا آپ کو بدخواہوں کے شر سے محفوظ رکھے گا "و اللّٰہ یعصمک من الناس"

خدا کے اس قدر مستحکم وعدہ کے بعد پیغمبرؐ نے کمال اطمینان کا مظاہرہ فرماتے ہوئے دین رکھنے کا اعلان کر دیا اور حکم دیا کہ جو لوگ آگے جا چکے ہیں انھیں واپس بلایا جائے اور خود پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ یہ بڑا عجیب و غریب موقع تھا۔ سب ایک دوسرے سے پوچھتے تھے آخر اس تپتے ہوئے صحرا میں جبکہ حاجی اپنی ردائیں تلووں میں پیٹے، اونٹوں کے سایوں میں دبکے پھر رہے ہیں پیغمبرؐ نے یکبیک سب کو کیوں روک لیا؟ کون سا ایسا امر ہے جو پیغمبرؐ کو اس چلچلاتی دھوپ میں انجام دینا ہے؟

لوگوں کا استعجاب اپنے کمال کو پہنچ رہا تھا کہ رسول خداؐ نے اس مقام پر اُگے ہوئے چند درختوں کے سایہ میں اونٹوں کے کجاؤں سے منبر بنانے کا حکم دیا۔ ظہر کا ہنگام تھا، عالم اسلام نے

---

[1] علاوہ اس کے اس آیت کی شان میں فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر ج ۳ ص ۶۳۶، ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ ص ۲۷ اور جلال الدین سیوطی نے تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۲۹۸ اور بہت سے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت علی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

اسی تپتی ہوئی زمین پر نماز ادا کی۔ ادائے نماز کے بعد آنحضرتؐ منبر پر تشریف لے گئے اور بڑی بلند اور رسا آواز میں ایک اہم ترین اور تاریخ ساز خطبہ ارشاد فرمایا:۔

..... اے لوگو! عنقریب میں دعوت حق پر لبیک کہنے والا ہوں اور تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والا ہوں۔ مجھ سے رسالت سے متعلق سوال کیا جائے گا اور تم سے بھی دریافت کیا جائے گا تو تم کیا کہو گے۔

سب نے ایک زبان ہو کر کہا: "ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے امور رسالت پوری طرح سے انجام دیا آپ لوگوں کے خیر خواہ رہے اور اس راہ میں بڑی زحمتیں اٹھائیں۔ خداوند عالم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے"۔

آپ نے فرمایا: "کیا تم خدا کی وحدانیت، میری رسالت، جنت و دوزخ، موت و حیات کی حقانیت کی گواہی نیز قیامت اور مُردوں کو دوبارہ زندہ کئے جانے کی شہادت نہ دو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر پیغمبرؐ کے قول کی تصدیق کی۔

آپ نے فرمایا: "خدایا تو گواہ رہنا۔ پھر آپ نے دریافت کیا، تم سب میری آواز سن رہے ہو؟" مجمع کے اثبات پر آپ نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "میں تم سے پہلے حوض کوثر پر پہنچنے والا ہوں اور تم بھی وہاں وارد ہو گے (یعنی میں وہاں تم سے ملاقات کروں گا اور اس گمان میں نہ رہنا کہ آئندہ کبھی میری اور تمہاری ملاقات نہ ہو گی) لہٰذا غور سے سنو کہ میں تمہارے درمیان جو دو اہم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ان کے ساتھ کس طرح پیش آؤ گے؟"

مجمع نے دریافت کیا: "اے خدا کے رسول وہ چیزیں کیا ہیں"؟ آپ نے فرمایا: "ان میں سے ایک خدا کی کتاب قرآن حکیم ہے جو ثقل اکبر ہے اور تمہارے اور خدا کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے اسے اپناؤ تاکہ گمراہ نہ ہو اور دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں۔ خداوند عالم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ یہ قرآن سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور قیامت میں قرآن کے ہمراہ مجھ سے ملاقات کریں گے۔ دیکھو ان دونوں پر سبقت نہ کرنا اور نہ ان کے حق میں کوئی کوتاہی کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد آپ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ تھاما اور اس قدر بلند فرمایا کہ دونوں کی سفیدی بغل نمایاں ہو گئی، گویا لوگوں کے سامنے حضرتؑ کو اس طرح پہچنوا دیا کہ کسی شک و تردید کی گنجائش نہ رہ جائے پھر فرمایا: "اے لوگو! کیا میں مومنین سے زیادہ ان کے نفوس پر اولیٰ نہیں ہوں؟ (یہ اشارہ

اس آیت کریمہ کی طرف ہے جو آپ کی ولایت مطلقہ پر دلالت کرتی ہے یعنی النبی اولی بالمومنین من انفسہم ، لوگوں نے یک آواز ہو کر اس کی تصدیق کی۔ آپ نے تین بار اس جملہ کی تکرار کی اور لوگوں سے اقرار لیا اور اس طرح جب موضوع کو مشخص کر دیا تو فرمایا : "جس جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ خدایا تو ان کے دوستوں کو دوست رکھ اور ان کے دشمنوں سے دشمنی کا سلوک فرما۔ جو ان کی نصرت کرے اس کی نصرت فرما اور جو انھیں چھوڑے تو بھی اس سے اپنی رحمت کو دور فرما دے۔ اس مجمع میں موجود افراد پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کو جا کر اس واقعہ کی خبر دیں۔"[1]

ہزاروں افراد اس عظیم واقعہ کے گواہ تھے۔ ان میں سے اکثر افراد نے مختلف انداز میں جس سے اس کے اصلی معنی پر حرف نہیں آتا، نقل بھی کیا۔ خصوصیت سے "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" تو ایسا جملہ ہے جو قطعی تواتر سے آنحضرتؐ سے نقل ہوا ہے اور کوئی شخص بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا۔

ابھی مجمع متفرق نہیں ہوا تھا کہ جبرئیل امین پیغمبر اسلامؐ پر آیت لیکر نازل ہوئے "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً"[2] "آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔ تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے دین سے راضی ہو گیا۔"

ہر صاحب فکر غور کرے کہ آخر یہ کیسا واقعہ اور کیسا اعلان تھا، جس کے بغیر نہ دین کامل تھا نہ رسالت کی نعمت تمام ہوئی اور نہ یہ شریعت ہی پورے طور سے مستحکم و استوار ہو پائی تھی۔ کیا تاریخ اسلام میں اس سے اہم بھی کوئی واقعہ ہے ؟

اس کے بعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ایک خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا اور حضرت امیر علی علیہ السلام کو جلوہ گر فرمایا اور لوگوں کو ان کی بیعت کا حکم عام صادر فرمایا۔ تمام اصحابؓ انصار نے حضرت کے ہاتھوں پر بیعت کی یہاں تک کہ حضرت عمر کا جملہ تاریخ میں ثبت ہو کر رہ گیا: "مبارک ہو مبارک ہو اے ابن ابی طالب، آج آپ میرے اور تمام مومنین و مومنات کے مولا ہو گئے"[3]

---

[1] تفسیر درمنثور، ملا جلال الدین سیوطی ج ۲ ص ۲۹۸ و طبع قدیم مصر ص ۲۰۹

[2] سورۂ مائدہ / ۳ [3] مرحوم علامہ امینی نے اس جملہ کو جو حدیث تہنیت کے نام سے مشہور ہے اپنی کتاب الغدیر ج ۱ ص ۲۳۰ تا ص ۲۳۲ میں ساٹھ علماء اہل تسنن سے نقل فرمایا ہے۔

حسان بن ثابت نے آنحضرتؐ سے اجازت لے کر اس موقع کی مناسبت سے اشعار پڑھے جو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت وخلافت پر لوگوں کی عمومی رضایت وتسلیم کی بہترین دلیل قرار پائے۔ حسان کا ایک شعر بہت مشہور ہوا۔[1]

فقال لہ قم یا علی فاننی　　　رضیتک من بعدی اماماً وھادیاً

غدیر سے دشمنی

افسوس ابھی کچھ عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ لوگوں نے حضرتؐ کی بیعت کو اس طرح فراموش کر دیا جیسے یہ واقعہ ہی ظہور میں نہ آیا ہو۔ سچ ہے دشمنی بھی دوستی کی طرح اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام برابر آنحضرتؐ کے اصحابؓ انصار سے روز غدیر سے متعلق سوال کرتے تھے اور لوگ سر جھکا کر اثبات کا اظہار کرتے تھے۔ روایت میں ہے کہ انس بن مالک نے جواب میں عذر خواہی کرتے ہوئے کہا: میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور مجھے یاد نہیں رہا حضرتؐ نے دعا کی خدایا اگر یہ شخص دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے تو ایسا مرض اس پر نازل فرما کہ یہ اسے چھپا نہ سکے چنانچہ جلد ہی وہ برص کے مرض میں اس طرح مبتلا ہوئے جو ان کی پیشانی تک پھیل گیا۔

خود غدیر کے دن بھی کچھ لوگ اپنے کینہ وحسد کو چھپا نہ سکے۔ حارث فہری نے پیغمبر اسلامؐ سے گستاخی کے ساتھ دریافت کیا آپکا یہ حکم خدا کی طرف سے ہے یا خود اپنی طرف سے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ خدا کا حکم ہے۔ اس بدبخت نے آنحضرتؐ کی طرف پشت کر کے کہا خداوندا اگر یہ حکم تیری طرف سے ہے تو مجھ پر عذاب نازل فرما! اور لوگوں نے دیکھا کہ ابھی ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ آسمان کی طرف سے ایک پتھر اس کے سر پر نازل ہوا اور وہ اسی جگہ ہلاک ہوگیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے یہ اعلان کرنے کے بعد لوگوں پر اپنی حجت تمام کر دی اب جو چاہے اسے قبول کرے اور جو ترک کرنا چاہے ترک کرے، "لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حی عن بینۃ"

---

[1] حسان بن ثابت کے اشعار مختلف علماء اہل سنی نے بھی نقل فرمائے ہیں جن میں حافظ ابونعیم اصفہانی، حافظ ابوسعید سجستانی خوارزمی مالکی، جلال الدین سیوطی و سبط بن جوزی بہت مشہور ہیں۔

اس اعلان کے وقت مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ کوئی بھی اس سے انکار یا لاعلمی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصیت سے پیغمبر اکرمؐ نے وہاں موجود مسلمانوں کو یہ پیغام دوسروں تک پہنچانے کا حکم بھی صادر فرمایا تھا لیکن خواہشات نفس کے پیرو اور منحرف انسانوں نے جو لپتے فرار کے راستے تلاش کیا کرتے ہیں آنکھیں بند کر کے کہدیا: پیغمبرؐ کا اس قدر اہتمام اور اتنی تاکید صرف اس لئے تھی کہ آنحضرتؐ لوگوں کو حضرت علیؑ سے دوستی کی طرف دعوت دینا چاہتے تھے؟ تعجب ہے! کیا دوستی بھی حکم کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے اور لوگوں نے تو اس پر بھی عمل نہیں کیا اور تقریباً پچانوے سال تک منبروں سے حضرتؑ پر سب وشتم کیا جاتا رہا۔

غدیر ـ عید کا دن

اس عظیم واقعہ کو ہمیشہ زندہ رکھنے اور اس کی یاد دلوں میں باقی رکھنے کے لئے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس دن کو اسلام کی ایک عظیم عید قرار دیا۔ بلکہ پیغمبر اسلامؐ نے بھی اس روز کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ "غدیر کا دن میری امت کے لئے پر عظمت عید کا دن ہے، یہ وہ دن ہے جب خداوند عالم نے میرے بھائی علیؑ کو میری امت کے لئے ہدایت کا پرچم قرار دیا اور اس کے ذریعہ دین کو کامل فرمایا۔ نعمتوں کو اتمام بخشا اور اسلام کو منتخب فرمایا۔[1]

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا: "چار دن ایسے ہیں جب شیطان رو پڑا ۱) جس دن وہ ملعون قرار پایا ۲) جس دن وہ آسمان سے نکال باہر کیا گیا۔ ۳) جس دن رسول خداؐ مبعوث کئے گئے۔ ۴) جس دن غدیر میں امامت علیؑ کا اعلان ہوا۔[2]

حسن بن راشد کہتے ہیں: میں نے امام صادق علیہ السلام سے دریافت کیا، کیا عید فطر اور عید اضحیٰ کے علاوہ بھی مسلمانوں کی کوئی اور عید ہے؟ فرمایا: ہاں، ان دونوں سے اعظم واشرف عید ہے۔ عرض کی وہ کون سا دن ہے؟ فرمایا: وہ دن جب امیر المومنینؑ مسلمانوں کے رہبر ومولا بنائے گئے

---

[1] بحار الانوار ج ۳۷ ص ۱۰۹

[2] بحار الانوار ج ۳۷ ص ۱۳۱

اس سے ملتی جلتی بہت سی روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ اس دن کے مخصوص اعمال بھی ائمہ علیہم السلام سے منقول ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ ساری روایتیں و اعمال درحقیقت ولایت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

غدیر کی اہمیت

غدیر کی اہمیت درحقیقت ولایت کی اہمیت کی بنا پر ہے۔ اسی پر دین کی بقا کا انحصار ہے کیونکہ یہی دین کی سب سے اہم بنیاد ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں نقل ہوتی ہیں جن کو صاحب کتاب وسائل الشیعہ نے اس کتاب کے شروع میں جمع فرمایا ہے۔ ان میں سے نمونہ کے طور پر ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں، نماز، روزہ، حج، زکات اور ولایت اور لوگوں سے جس قدر ولایت کی تاکید کی گئی ہے کسی اور کی نہیں کی گئی۔[1]

اگرچہ اسلام کے ارکان ان پانچ چیزوں سے کہیں زیادہ ہیں مثلاً جہاد، امر بالمعروف، نہی از منکر وغیرہ لیکن یہ سب ولایت میں داخل ہیں اور بغیر ولایت ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک معتبر روایت میں ہے خداوند عالم کی طرف سے نازل ہونے والے فرائض میں سے آخری فریضہ ولایت ہے اور اس کے بعد کوئی فریضہ نازل نہیں ہوا۔[2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام پر وحی نازل ہوئی "میں نے آپ پر نماز، روزہ، حج اور زکات نازل کئے اور اب ولایت علی کو نازل کر رہا ہوں۔ یہ پانچواں فریضہ ہے اور میں ان چاروں کو بغیر اس ولایت کے قبول نہیں کروں گا۔

ولایت مطلقہ

مذکورہ بالا روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دین کے ان ارکان سے مراد الٰہی فرائض ہیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ [2] بحار الانوار ج ۳۷ ص ۱۱۳

مجموعاً احکام اسلامی کی دو قسمیں ہیں۔ فرائض الٰہی اور سنت رسول اکرمؐ۔ ان دونوں کے بنیادی فرق کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ اصل میں اس مقصد کو واضح کرنا تھا یہاں ان پانچ ہی چیزوں کا ذکر اس لئے کیا گیا، تاکہ ان کی اہمیت و حیثیت واضح ہو سکے۔ بنیادی نکتہ تو یہ ہے کہ ولایت دین کی اہم ترین اساس اور عظیم ترین فریضۂ الٰہی ہے اور بغیر اس کے انسان کا کوئی عمل قبول نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا ولایت علی علیہ السلام سے مراد صرف ان کی دوستی اور محبت کا اظہار اور ان کو محبوب و دوست مان لینے سے دین کا کمال اور اتمام نعمت کا تصور کرنا ایک بہت بڑی بھول ہوگی۔

رسول خداؐ نے جملہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" فرمانے سے پہلے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس ولایت سے مراد مومنین کے نفوس پر ان کی اولویت ہے اور ولایت مطلقہ کے یہی معنی ہیں کہ وہ جو حکم دے اس پر عمل کیا جائے۔ وہ حاکم علی الاطلاق، مسلمانوں کا ولی اور اسلامی معاشرہ کا رہبر ہوتا ہے۔ بنابراین نہ اس جملہ کی تاویل کی کوئی گنجائش ہے نہ واقعۂ غدیر کو نادیدہ قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ ہر مسلمان کو منصفانہ طور سے صحیح راہ کی تشخیص کرنی چاہیئے۔

وان ھٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولاتتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔ (انعام/۱۵۳)

ولایت فقیہ

آج بحمد اللہ اسی بابرکت ولایت کا شیریں اور خوشگوار ثمرہ ایران کے مسلمانوں کو نصیب ہوا۔ وہ ملت ایران جس کی اکثریت ولی اللہ اعظم حضرت امیر المومنین کی والہ و شیدا ہے۔ ہمیں خدا کی بارگاہ میں اس عظیم نعمت الٰہی کا شکر گزار ہونا چاہیئے اور بجا طور پر اس کی قدر و قیمت کا احساس کرنا چاہیئے۔

ولایت فقیہ، ولایت اہل بیتؑ کے مقابلے میں کوئی الگ سی چیز نہیں بلکہ درحقیقت اہل بیتؑ ہی کی ولایت ہے۔ فقیہ ایک نائب کے عنوان سے ان ہی حضرات کے احکام و اوامر کو بجا لانے اور لوگوں کو ان کی پیروی کا حکم دیتا ہے۔ درحقیقت اس طرح وہ حضرت ولی عصر عجل اللہ فرجہ کی ولایت کو عملی صورت بخشتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ منصب ویسی ہی اہمیت کا حامل بھی ہے اور جو شخص بھی اس ولایت

الٰہی کا انکار کرے گا اس کا کوئی عمل قبول نہ کیا جائے گا۔ فقہا اسی دلیل کے تحت حاکم شرع یعنی مجتہد جامع الشرائط کے حکم کی خلاف ورزی کو جائزہ نہیں جانتے کیونکہ معصوم کا ارشاد ہے:۔

الراد علیہم کالراد علینا والراد علینا کالراد علی اللّٰہ وھو فی حد الشرک باللّٰہ

"جو شخص ولی فقیہ کے حکم سے روگردانی کرے گویا اس نے ہمارے حکم سے انکار کیا اور جس نے ہمارے حکم سے انکار کیا گویا وہ خدا کے حکم کا منکر ہوا اور خدا کے حکم کا منکر مشرک کے مانند ہے۔" اور بلاشبہ مشرک کا کوئی عمل قبول نہ کیا جائے گا۔

آج ہمارے عہد میں یہ بات روشن ہو چکی ہے کہ ایک عادل و آگاہ ولایت دین کی حفاظت و نگہبانی میں کیا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کس طرح لوگوں کو انحراف و گمراہی سے روکتی ہے۔ اسلامی حدود کی حفاظت کرتی ہے اور شریعت کے اصول کو محکم و استوار کرتی ہے۔

شہید آیۃ اللہ باقر الصدر
ترجمہ: جناب سید محمد ظفر حسینی

قرآن کا فلسفہ تاریخ

ہم نے گذشتہ قسط میں، قرآن کریم کے فلسفہ تاریخ اور اس کے بیان کردہ تاریخی اصول وضوابط کے اثبات کے لئے جو قرآنی نصوص پیش کئے ہیں، ان کے تقابلی مطالعہ سے ہم پر تین ایسے بنیادی حقائق منکشف ہوئے ہیں جن کے پیرایہ میں قرآن نے تاریخی اصول وضوابط کو ڈھال کر بیان کیا ہے اور ان پر بھرپور زور دیا ہے۔

پہلی حقیقت جس کی تاریخی اصول و قوانین کے سلسلے میں قرآن نے نشاندہی کی ہے وہ ان کی عمومیت کا پہلو ہے یعنی یہ تاریخی اصول وضوابط بلاقید زمان و مکان، ہر دور میں، ہر گام پر ہمیشہ نافذ اور جاری و ساری نظر آئیں گے، ان کی شکل اتفاقی امور اور ناگہانی مسائل کی نہیں ہے بلکہ یہ ہمیشہ برقرار رہنے والے ضوابط ہیں، جن میں عام حالات میں کوئی تغیر و تبدل اس وقت تک نہیں واقع ہو سکتا جب تک نظام کائنات فطری و طبیعی طور پر اپنے بنیادی اور عالمگیر اصولوں کے مطابق رواں دواں ہے۔

ان قوانین کی عمومیت اور عدم تغیر کا مسئلہ تاریخی اصول وضوابط کو علمی پہلوؤں کا حامل بناتا ہے، اس لئے کہ علمی قواعد و قوانین کا اہم ترین امتیاز یہی ہے کہ وہ جامع، ہمہ گیر، کلی و دائمی، ناقابل ترمیم اور ہمیشہ جاری و ساری ہوتے ہیں۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن تاریخی اصول وضوابط کی ہمہ گیری و عمومیت اور دوام و عدم تغیر کے موضوع پر تاکید کے ذریعہ ان کا علمی رخ ہمارے سامنے لانا چاہتا ہے اور مسلمان نسل میں ایک ایسا زندہ شعور بیدار کرنا چاہتا ہے جس کی بدولت ان میں تاریخی حادثات و واقعات کو بصیرت کی نگاہ سے جانچنے پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے، آنکھیں بند کر کے بغیر کسی دلیل کے انھیں

قبول نہ کریں، زبردستی اور بدرجۂ مجبوری ان کے سامنے تسلیم خم نہ کریں۔ بھولے پن اور سادہ لوحی سے
ان کا مطالعہ نہ کریں بلکہ ان کے تحقیقی و تنقیدی جائزے کے عادی بنیں۔
اسی لئے اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا :۔

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ... (احزاب/۶۲)
یعنی تم اللہ کے قوانین میں کوئی تبدیلی ہرگز نہ پاؤ گے۔
ولا تجد لسنتنا تحویلا.... (اسراء/۷۷)
یعنی تمہیں ہمارے قوانین کوئی ترمیم نظر نہ آئے گی۔
ولا مبدل لکلمات اللہ ... (انعام/۳۴)
یعنی، اللہ کے قوانین کو بدلنے کی کسی میں طاقت نہیں۔

یہ وہ قرآنی نصوص ہیں جن کا تذکرہ اس سے پہلے والی قسط میں ہم کر چکے ہیں، یہ آیتیں تاریخی اصول و قوانین
کے دوام و استمرار اور کلیت و عدم تغیر کے مسئلے پر بھرپور روشنی ڈال رہی ہیں، یعنی ان کے علمی رخ سے
ہمیں روشناس کرنا چاہتی ہیں اور وہ لوگ جو تاریخی اصول و قوانین سے مستثنیٰ ہونے کا خواب دیکھ رہے ہوں
ان کے افکار و نظریات کی مکمل تردید کر رہی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک آیۂ کریمہ جس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے ہمارے دعوے کی روشن دلیل ہے:۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم
مستھم البأساء والضراء و زلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین
آمنوا معہ متیٰ نصر اللہ الا ان نصر اللہ قریب (بقرہ/۲۱۴)

یعنی، کیا تم اس خیال خام میں مبتلا ہو کہ بغیر ان حالات سے گزرے ہوئے جنت میں چلے
جاؤ گے، جن سے تمہارے اسلاف کو گزرنا پڑا، انھیں فقر و تنگدستی کا سامنا کرنا پڑا
مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلنا پڑیں۔ نقصانات اٹھانا پڑے یہاں تک کہ پیغمبرؐ اور
ان کے ساتھیوں کو کہنا پڑا کہ نصرت الٰہی کب ہمارے شامل حال ہوگی؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے
کہ اللہ کی مدد بہت قریب ہے۔

یہ آیت ان تمام لوگوں کے خیالات و نظریات کی تردید کر رہی ہے جو اس بات کے متمنی اور خواہشمند

ہیں کہ انھیں تاریخی اصول و قوانین کی گرفت سے آزاد اور مستثنیٰ کر دیا جائے، جیسا کہ اس موضوع پر گذشتہ قسط میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

اس سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم ہمیں اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ تاریخی اصول و ضوابط ناقابل ترمیم و تنسیخ، ابدی و دائمی نیز سدا جاری و ساری اور نافذ ہوتے ہیں، ان کی عمومیت و ابدیت کا یہ پہلو انھیں علمی رنگ عطا کرتا ہے تاکہ ایک ایسے نہج سے انسان کی تربیت ہو سکے جس کی بدولت وہ بیدار علمی ذہنیت کا مالک بن سکے اور ان ہی قوانین کے حدود و دوائر میں رہ کر تاریخی حالات و واقعات کے تحلیل و تجزیہ کا عادی بن جائے۔

دوسری حقیقت جس کی جانب قرآن کریم نے ہماری رہنمائی کی ہے وہ ان اصول و قوانین کا الٰہی ہونا ہے یعنی تمام تاریخی اصول و ضوابط قدسی و ربانی ہیں، ان کا تعلق براہ راست ذات ربوبیت سے ہے۔ قرآن میں انھیں کہیں "سنۃ اللہ" یعنی سنت الٰہی اور کہیں "کلمات اللہ" یعنی الٰہی کلمات سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ تاریخ کے اصول و قوانین میں سے ہر قانون "کلمۃ اللہ" اور ہر ضابطہ "سنۃ اللہ" اور خدا ہی کا وضع کردہ ہے۔

تاریخی اصول و قوانین کے الٰہی اور غیبی ہونے پر قرآن نے جس قدر زور دیا ہے اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ذہن انسانی میں تصور الوہیت کو اس حد تک راسخ کر دیا جائے کہ نظام عالم اور قوانین فطرت سے بہرہ مند ہوتے ہوئے کسی بھی مرحلے میں انسان سے خدا کا تصور جدا نہ ہونے پائے، وہ ذات ربوبیت کا عارف بن سکے اور یہ رمز اس پر بخوبی آشکار ہو جائے کہ دنیا کے متعدد میدانوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے معینہ نظام سے مدد لینے اور ان پر حاکم مختلف اصول و قوانین سے بہرہ مند ہونے کا مطلب قطعاً اللہ سے دوری اور اس سے کنارہ کشی نہیں ہے، کیونکہ پورے نظام کائنات اور تمام قوانین حیات میں اللہ ہی کی قدرت جلوہ ریز و کار فرما ہے اور یہ اصول و قوانین ارادۂ الٰہی کے علاوہ کوئی اور شئے نہیں ہیں، درحقیقت یہی قواعد و ضوابط ہیں جو حکمت خداوندی کی تجلی گاہ اور اس کے نظم کائنات کے روشن مظہر ہیں۔

یہاں پر ایک غلط نظریہ، یہ جنم لے سکتا ہے کہ قرآن نے تاریخ اور قوانین تاریخ کے الٰہی و غیبی پہلو پر جو اس قدر زور دیا ہے اس کا لازمہ یہ ہے کہ تاریخ علمی دائرے سے خارج ہو کر

الٰہی حدود میں داخل ہو جائے اور پھر آزادانہ ماحول میں اس کا علمی تجزیہ نہ کیا جا سکے بلکہ فکر انسانی تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کی صرف الٰہی تفسیر و تعبیر کی پابند ہو۔

یہ وہ نظریہ ہے جو عیسائی مفکرین کے ایک "لاہوتی مکتب فکر" کی نمائندگی اور اس کے افکار و خیالات کی ترجمانی کرتا ہے، اس مکتب فکر کے افراد نے تاریخ کی الٰہی تفسیر پیش کرنا چاہی ہے، جیسا کہ ہم بھی کبھی کبھی تاریخی اصول و ضوابط کی تفسیر ان کے الٰہی ہونے کی بنیاد پر کرتے رہتے ہیں، چنانچہ یہی روش "لاہوتی مکتب فکر" کے نمایاں افراد میں "آگوسٹن" وغیرہ کی بھی رہی ہے۔

لیکن ہمارے پاس اس کی رد اور جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی اصول و ضوابط کا یہ الٰہی و غیبی پہلو انھیں اعتقادی اور غیبی مسائل کا روپ عطا کر دیتا ہے اور تاریخ کو علمی حدود سے خارج کر دیتا ہے، مگر یہاں پر مسئلے کو درک کرنے میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، اس لئے کہ تاریخ کو غیب اور عالم علوی سے مربوط کرنے اور تاریخی اصول و قوانین کو الٰہی و غیبی رخ سے پیش کرنے میں جو قرآن کا اسلوب و طریقۂ کار ہے وہ ان عیسائی مفکرین کی روش و طریقۂ کار سے کہیں مختلف ہے جو تاریخ کی الٰہی تفسیر و تعبیر کے سلسلے میں "لاہوتی مکتب فکر" کی نمائندگی کرتے ہیں، دونوں کے طرز و اسلوب اور افکار و خیالات میں بنیادی اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق موجود ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ:۔

جب عیسائی مفکرین کسی تاریخی واقعہ کا تجزیہ الٰہی اور غیبی زاویہ سے کرتے ہیں اور تاریخ کی لاہوتی تفسیر پیش کرتے ہیں تو وہ رونما ہونے والے ہر تاریخی واقعہ کو براہ راست خدا کی ذات سے منسوب کرتے ہیں اور تنہا اسی سے مربوط سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں اس واقعہ کا دیگر حالات و واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ اس کے سلسلے کو بقیہ دیگر تمام حادثات و واقعات سے منقطع کر کے ان کے عوض اللہ کی ذات سے متصل کر دیتے ہیں، ان کے لئے یہ بات قطعاً قابل قبول نہیں ہے کہ تاریخی حادثات و واقعات کا باہم ایک دوسرے سے کوئی ربط ہوتا ہے اور یہ ربط ان کے سلسلے میں الٰہی قوانین و اصول کی عکاسی و ترجمانی کر سکتا ہے۔

اس کے برخلاف قرآن کریم کے نظریات یہ ہیں کہ تاریخی واقعات و حادثات کو جو الٰہی اور غیبی رخ سے پیش کیا گیا ہے اور ان کی الٰہی تفسیر کی گئی ہے اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ انھیں باہمی طور پر ایک دوسرے سے جدا، غیر منسلک اور غیر مربوط تصور کرتے ہوئے براہ راست عالم بالا

سے متعلق و مربوط تسلیم کیا جائے۔

قرآن تاریخ کی دنیا میں موجود علت و معلول، سبب و مسبب اور مفہوم و مصداق وغیرہ جیسے روابط کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی بھی واقعہ کو بطور مستقل عالم بالا سے متصل و مربوط نہیں بتانا چاہتا، بلکہ وہ تاریخی اصول و قوانین کو خدا کی ذات سے منسلک و مربوط بتاتا ہے اور اس کی طرف اس نظام کو منسوب کرتا ہے جس کے تحت تاریخی واقعات و حادثات کے درمیان باہمی ارتباطات و اتصالات کا قانون جاری و ساری ہے۔

بہرکیف یہ بات مسلم ہے کہ قرآن دنیا میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات و حوادث کے درمیان ربط باہمی کا قائل ہے اور انہیں ایک دوسرے سے جدا تصور نہیں کرتا، البتہ وہ واقعات و حوادث کے اسی باہمی ارتباط کو حکمت الٰہی سے تعبیر کرتا ہے، اسے معبود کا حسن انتظام بتاتا ہے اور دنیائے تاریخ میں خدا کا بہترین نظم و نسق اور تدبیر و تدبر قرار دیتا ہے۔

یہیں سے ہم پر عیسائی نظریات اور قرآنی نقطہ نظر کا باہمی فرق بنیادی طور پر واضح ہو جاتا ہے جس کی مزید توضیح موجودات عالم کی ایک مثال کے ذریعہ بخوبی پیش کی جا سکتی ہے۔ جیسے بارش ہی کے نظام کو لے لیا جائے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ انسان جب اس کی توضیح و تشریح کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو کبھی وہ اس فطری نظام کی تفسیر اس طرح کرتا ہے کہ بارش وہ شئے ہے جس کا نزول محض اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت سے ہوتا ہے، گویا وہ مشیت پروردگار کو ان تمام فطری اسباب و علل کا قائم مقام قرار دیتا ہے جن کے باعث بارش کے قطرات زمین پر گرتے ہیں۔

اس نظریہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ بارش کا نظام ایک ایسا امر ہے جس کا دیگر امور سے کوئی باہمی ربط نہیں اور ان میں آپس میں کسی قسم کی نسبت کا کوئی وجود نہیں بلکہ دراصل بارش خود ایک مستقل شئے ہے جس کا براہ راست تعلق خداوند عالم کی ذات سے ہے یعنی دیگر موجودات عالم اور فطری امور سے اس کا کوئی ربط۔

یہ نظریہ بارش کے نظام کی سائنسی توضیح و تشریح سے بھرپور تضاد رکھتا ہے، اسی کے مقابلے میں دوسرا نظریہ یوں سامنے آتا ہے کہ بارش خود بخود نہیں ہوتی بلکہ اس کے کچھ اسباب و علل ہوتے ہیں، بارش کے نظام کا دیگر موجودات عالم سے بھی ایک ربط ہے، بارش پانی کی ایک فطری

وطبیعی گردش کا نام ہے، وہ اس صورت سے کہ پانی سے بھاپ وجود میں آتی ہے، یہی بھاپ ایک قسم کی گیس میں تبدیل ہوتی ہے، پھر یہ گیس بادل بن کر آسمان کی طرف جاتی ہے، پھر بادل درجۂ حرارت کے گرنے سے بتدریج پانی کی شکل میں دوبارہ تبدیل ہوتا ہے اور اس طرح بارش شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن فطری اسباب وعلل کے تحت رواں دواں یہ پورا مستحکم نظام اور موجودات عالم کا یہ فطری وطبیعی باہمی ربط حکمت پروردگار، الٰہی تدبیر وتدبر اور خدائی حسن انتظام کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

اس نظریہ کا بارش کی سائنسی تعریف وتوضیح سے ہرگز کوئی ٹکراؤ اور تضاد نہیں، کیونکہ یہاں پر اس نظام وقانون کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس کے تحت بارش ہوتی ہے، نہ یہ کہ خود بارش کو ذاتی طور پر براہ راست ذات پروردگار سے مربوط قرار دیا گیا ہو اور اسے دیگر تمام فطری اسباب وعلل اور ظاہری امور سے غیر مربوط و بے تعلق فرض کیا گیا ہو۔

چنانچہ قرآن بھی جب تاریخی اصول وضوابط کو الٰہی نقطۂ نظر سے سامنے لاتا ہے تو وہ ان کی توجیہ وتفسیر محض الٰہی رخ سے پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت پر پورا زور دیتا ہے کہ یہ اصول وقوانین قدرت خدا کے دائرے سے ہرگز باہر نہیں ہیں، دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ قدرت پروردگار انھیں اصول وضوابط کی شکل میں مجسّم ہو کر سامنے آتی ہے اور یہ اسی کا دوسرا نام ہیں۔

غرضیکہ یہی وہ فطری اصول وقوانین ہیں جنھیں کلمات الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وہ ارادۂ خداوندی، حکمت پروردگار اور الٰہی اصول ہیں جو پوری کائنات میں نافذ وجاری وساری ہیں تاکہ کسی آن بھی خدا سے انسان کا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے اور اس طرح علم ودانش اور ایمان وعقیدہ کا باہمی اٹوٹ رشتہ پائیدار واستوار اور مستحکم سے مستحکم تر بن کر سامنے آئے، چنانچہ عین اس عالم میں جب ہم فطری اصول وقوانین کو علمی زاویے سے پرکھ رہے ہوں، ایمان وعقیدے کی نگاہ سے بھی ان کا تجربہ کر سکیں۔

قرآن نے تاریخی اصول وضوابط کو بذات خود ایک مستقل حیثیت کا حامل قرار دیا ہے اور انھیں اتفاقات کی دین ہرگز تصوّر نہیں کیا ہے، بلکہ اس مسئلے پر اس حد تک زور دیا ہے کہ غیبی امور کو بھی زیادہ تر حالات میں تاریخی اصول وقوانین کا تابع قرار دیا ہے یہاں تک کہ الٰہی وغیبی مدد کے مسئلے کو بھی تاریخی اصول وضوابط سے اس طرح وابستہ ومربوط بتایا ہے کہ

اسے کسی بھی شکل میں تاریخی حالات و کیفیات سے جدا نہیں کیا جا سکتا، یعنی قرآنی نظریہ کے مطابق غیبی مدد اسی صورت میں انسان کے شامل حال ہو سکتی ہے جب ماحول اور اس وقت کے حالات و کیفیات اس کے متقاضی ہوں۔

جب ہم تاریخ کی اس قرآنی تفسیر کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نقطۂ نظر اور اس مکتب فکر میں کتنا زیادہ فرق ہے جو تاریخی حوادث و واقعات کو محض عالم غیب کی دین تصور کرتا ہے اور انھیں صرف اتفاقیہ، غیر منظم اور بے ضابطہ امور قرار دیتا ہے، در حقیقت قرآنی نقطۂ نظر منطق، عقل و دانش اور سائنس سے اس حد تک ہم آہنگ ہے کہ غیبی مدد کے مسئلے کو بھی اس میں امر اتفاقی نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ اسے تاریخی اصول و ضوابط اور فطری اسباب و علل سے وابستہ و مشروط بتایا گیا ہے۔

ہم گذشتہ صفحات میں قرآن میں مذکور تاریخی اصول و ضوابط کا ایک نمونہ اس آیۂ کریمہ کی شکل میں پیش کر چکے ہیں:۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم البأساء والضراء و زلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین آمنوا معہ متیٰ نصر اللہ (بقرہ/۲۱۴)

یعنی کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ جنت میں پہنچ جاؤ گے درآنحالیکہ تم نے ابھی اس رنج و مصیبت کا سامنا نہیں کیا جس سے تمہارے بزرگوں کو گزرنا پڑا، ان لوگوں نے اتنی سختیاں برداشت کیں اور نقصانات اٹھائے کہ رسولؐ اور مومنین کو کہنا پڑا کہ نصرت پروردگار کب شامل حال ہو گی۔

اب ہم ان آیات کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں غیبی مدد کے تذکرے وارد ہوئے ہیں تاکہ یہ اندازہ لگانا آسان ہو جائے کہ خود قرآن نے غیبی والٰہی مدد کے مسئلے کو کس طرح اصول و قوانین کا پابند قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثۃ آلاف من الملائکۃ منزلین بلیٰ ان تصبروا و تتقوا و یأتوکم من

فورہم ھٰذا یمددکم ربکم بخمسۃ آلاف من الملائکۃ مسومین وما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ و ما النصر الا من عند اللہ العزیز الحکیم (آل عمران / ۱۲۴-۱۲۶)

یعنی اے پیغمبرؐ جب آپ نے مومنین سے کہا، کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ نے تین ہزار ملائکہ تمہاری مدد کے لئے نازل کئے، ہاں! اگر تم جہاد میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے رہو اور ہمیشہ باتقویٰ رہو تو ایسے میں جب کفار تم پر یلغار کریں گے، اللہ تمہاری نصرت و مدد کے لئے ایسے پانچ ہزار فرشتے مبعوث کرے گا جن کے ہاتھوں میں پرچم ہوں گے۔ اللہ نے فرشتوں کی آمد کو تمہارے لئے خوشخبری کا وسیلہ قرار دیا ہے تاکہ تمہیں غیبی مدد کا اطمینان حاصل ہو جائے، نصرت و کامیابی تو صرف اس پروردگار کی دین ہے جو صاحب قدرت و دانائی ہے۔

آیت میں جس غیبی مدد اور الٰہی نصرت کا تذکرہ ہے اسے قرآن نے تاریخی اصول و ضوابط اور اسباب و علل سے جدا کرکے ایک مستقل حیثیت سے نہیں پیش کیا ہے بلکہ اس کے حصول کی شرط صبر و استقامت اور تقویٰ و پرہیزگاری کو قرار دیا ہے، یہاں اس نکتہ کی طرف ذرا اجمال کیساتھ اشارہ کیا گیا ہے لیکن دیگر آیات سے اس مسئلے پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے، بہرکیف قرآنی نظریہ کے مطابق غیبی مدد کا تعلق بھی تاریخی اصول و قوانین سے ہے۔

غرضکہ قرآن تاریخی حوادث و واقعات کو جو الٰہی رخ سے پیش کرتا ہے اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ان کے فطری اسباب و علل سے چشم پوشی اور قطع نظر کرکے انھیں محض الٰہی پہلو کا حامل قرار دینا اور تنہا عالم غیب سے وابستہ و مربوط بتانا چاہتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ علم و دانش اور ایمان و عقیدہ کے اس باہمی ربط کی نشاندہی کرے جو انسان کی اسلامی تربیت میں پورے طور پر موثر ثابت ہو اور وہ مکمل توحیدی و الٰہی نقطۂ نظر کا حامل بن سکے۔

تیسری حقیقت

گذشتہ آیات و نصوص میں ایک اور حقیقت ہے جسے قرآن نے آشکار کیا ہے۔ وہ انسان کی

ارادہ و اختیار کا مسئلہ ہے۔

تاریخی اصول وضوابط کے موضوع پر بحث کے دوران اس حقیقت سے قرآن کا متعرض ہونا اور اس پر بہم زور دینا حد سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ ہم اس مسئلے پر آئندہ روشنی ڈالیں گے۔

تاریخی اصول وضوابط کے موضوع پر بحث و تبصرہ کے دوران ایک وہم جو معرض وجود میں آتا ہے، جس میں بہت سے مفکرین و دانشور مبتلا ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ قوانین تاریخ اور انسان کی آزادی و اختیار کے درمیان تناقض و تضاد پایا جاتا ہے، لہٰذا اب اگر ہم اس بات کے قائل ہیں کہ تاریخ کی دنیا میں اس کے کچھ قوانین و اصول ہیں تو ہمیں بہرحال انسان کی آزادی و حریت اور ارادہ و اختیار کے نظریے کی تردید کرنا ہوگی لیکن اگر ہم اس نقطۂ نظر کے حامل ہیں کہ انسان وہ مخلوق ہے جو صاحب ارادہ و اختیار ہے اور اسے زندگی میں مکمل آزادی حاصل ہے، تو ضروری ہے کہ ہم اس فکر کو لغو و باطل قرار دیں کہ تاریخ کی دنیا میں اس کے کچھ اصول وضوابط پائے جاتے ہیں، یعنی ہر شعبۂ حیات میں اس کے کچھ قوانین و اصول ہیں مگر شعبۂ تاریخ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔

یقیناً یہ ایک ایسا وہم اور فاسد نظریہ ہے جس کی تردید اور کاٹ قرآن کا اولین فریضہ تھا یہی وجہ ہے کہ شعبۂ تاریخ کے لئے اصول و قوانین کو ثابت کرتے ہوئے قرآن نے اس باطل فکر کی، کہ آزادی بشر اور قوانین تاریخ کے درمیان تناقض و تضاد پایا جاتا ہے، سختی سے رد کی ہے اور اس مسئلے پر بے حد زور دیا ہے کہ دنیا میں یکے بعد دیگرے، مسلسل جو حوادث و واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان میں مرکزی حیثیت انسان ہی کے ارادہ و اختیار کو حاصل ہے ان شاء اللہ ہم آئندہ اس فنی اسلوب کا تذکرہ کریں گے جس کے ذریعہ آزادی انسان اور قوانین میں تاریخ کے درمیان ہم آہنگی کا تصور عطا کیا گیا ہے، نیز یہ بھی وضاحت کریں گے کہ قرآن ان دونوں امور کو یکجا کرنے میں کیونکر کامیاب ہو سکا ہے اور آزادی بشر کے نظریہ کو ان تمام آیات و نصوص سے اخذ و درک کیا جا سکتا ہے جن میں تاریخ کے اصول وضوابط کے بارے میں کوئی اشارہ یا نشاندہی موجود ہے۔

اس مسئلے پر باقاعدہ ہم آئندہ روشنی ڈالیں گے، فی الحال چند قرآنی آیات کی تلاوت پر اکتفا کرتے ہیں:۔

۱۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم (رعد/۱۱)
یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اس میں تبدیلی نہ پیدا کریں

۲۔ و ان لو استقاموا علی الطریقۃ لأسقینا ھم ماءً غدقاً (جن/۱۶)
یعنی اگر وہ لوگ راہ راست پر باقی رہتے تو ہم ضرور انہیں خوشگوار پانی سے سیراب کرتے۔

۳۔ ..... وتلک القریٰ اھلکنا ھم لما ظلموا وجعلنا لمہلکہم موعداً (کہف/۵۹)
یعنی یہ ہم نے ان قریوں کے باشندوں کو ان کے ظلم و تعدی کے نتیجہ میں ہلاک کر دیا اور ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کیا۔

ملاحظہ فرمائیں کہ تاریخی اصول و ضوابط کس طرح نہ صرف یہ کہ انسان کے بس اور اس کے قبضہ و اختیار سے باہر کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ وہ امور ہیں جن کا تعلق مکمل طور پر بشری قدرت و ارادہ سے ہے، چنانچہ معبود کا یہ ارشاد کہ اللہ کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اس میں تبدیلی نہ لائیں یعنی زندگی میں ہر طرح کی مطلوبہ تبدیلی خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے، اسی صورت یہ ارشاد بھی کہ اگر وہ لوگ راہ راست پر ثابت قدم رہتے تو ہم انہیں خوشگوار پانی سے سیراب کرتے۔ یعنی معبود کے لطف و کرم کا مستحق بننا بھی انسان کے اپنے اختیار کی چیز ہے، یہ سب وہ مثبت پہلو ہیں جو انسان کے حق میں ہیں اور اس کی آزادی و حریت، قدرت و اختیار اور ارادہ و آزادئ عمل کے مکمل آئینہ دار ہیں۔

ان مثبت پہلوؤں کی جھلکیاں تاریخی اصول و قوانین، ان کی معینہ جزا و سزا اور ان سے مرتب ہونے والے نتائج و اثرات کے بیان کے ضمن میں دیکھنے کو ملتی ہیں، جس سے یہ بات کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ کے میدان میں انسانی ارادہ و اختیار کو مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے اور شعبۂ تاریخ، بشری جنبہ کا حامل ہے، کیونکہ وہ انسان کو اپنے مثبت کردار کی ادائیگی سے قطعاً باز نہیں رکھتا ہے اور اس کی آزادئ و حریت، قدرت و اختیار اور ارادہ و عمل کی راہ میں کسی قسم کی کوئی

رکاوٹ ہرگز پیدا نہیں کرتا ہے اور نہ صرف یہی بلکہ شعبۂ تاریخ، تاریخی حوادث و واقعات کی دنیا میں انسانی کردار کی اہمیت پر بے انتہا زور دیتا ہے اور اس کی ذمہ داریوں کو بے حد حساسیت کا حامل قرار دیتا ہے۔

تاریخی اصول و ضوابط کے حدود اجراء۔

قرآن میں مذکور تاریخی اصول و ضوابط جن تین اہم امتیازات و خصوصیات کے حامل ہیں، ایک ایک کر کے ہم انھیں بیان کر چکے ہیں اور اب ہمیں یہ سوال درپیش ہے کہ تاریخ کے ان اصول و قوانین کے نفاذ و اجراء کے حدود کیا ہیں؟

ہم اب تک تنہا اسی تعبیر پر اکتفا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ اصول و قوانین تاریخ کی دنیا میں نافذ اور جاری و ساری ہوتے ہیں لیکن ابھی تک ہم نے اس کی کوئی حد بندی نہیں کی ہے، لہٰذا یہ سوال اٹھتا ہے کہ تاریخی حوادث و واقعات کی دنیا جتنی وسیع ہے کیا اتنا ہی وسیع و ہمہ گیر تاریخی اصول و قوانین کے نفاذ کا میدان بھی ہے یا یہ اصول و قوانین تاریخ کے صرف بعض موارد میں قابل اجراء ہوتے ہیں، یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ تاریخی اصول و قوانین جو نوعاً دیگر علوم جیسے فیزیکس (طبیعیات) بیالوجی (حیوانیات)، فیزیالوجی (علم اعضاء) اور فلکیات وغیرہ کے اصول و قوانین سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، یہ تاریخ کی جن حدود میں قابل اجراء ہیں ان کا تعلق پوری دنیائے تاریخ اور تاریخی حوادث و واقعات کے تمام موارد سے ہے یا ان کی وسعتیں تاریخ کے کسی خاص حصے اور تاریخی حوادث و واقعات کے کچھ مخصوص موارد تک محدود ہیں۔؟

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا کوئی جواب دیں اس امر کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ دنیائے تاریخ اور جولانگاہ تاریخ سے ہماری مراد کیا ہے؟

دنیائے تاریخ، میدان تاریخ اور جولانگاہ تاریخ سے ہماری مراد شعبہ ہے جو ایسے حوادث و واقعات پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں مؤرخین عالم، اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں اور ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بہت سے حوادث و واقعات رونما ہوتے ہیں جنھیں ارباب تاریخ اور مؤرخین

عالم نہایت اہم شمار کرتے ہیں اور اپنی کتابوں کے سینوں میں بذریعۂ تحریر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں، چنانچہ وہی شعبہ جو اس طرح کے حوادث و واقعات سے لبریز ہوتا ہے، ہم اسے دنیائے تاریخ یا حوالتاً تاریخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب اسی سوال کو جس کا تذکرہ ابھی گزر چکا ہے دوبارہ ہم ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں کہ وہ تمام حوادث و واقعات جو مؤرخین عالم کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں اور ان کی نظروں میں اہم اور قابل ضبط و تحریر ہوتے ہیں، کیا وہ کل کے کل تاریخی اصول و قوانین کی قلمرو میں آتے ہیں — وہ اصول و قوانین جو کائنات اور عالم فطرت کے دیگر اصول و قوانین سے نوعاً مختلف ہیں — یا ان حوادث و واقعات کے کچھ مخصوص موارد ہیں جہاں تاریخی اصول و قوانین کی حکمرانی ہوتی ہے!

اس سوال کا صحیح اور واضح جواب یہ ہے کہ تاریخی حوادث و واقعات کے وہ بعض مخصوص موارد اور تاریخ کے کچھ خاص حصے ہیں جو تاریخی اصول و قوانین کی زیردستی اور قلمرو میں آتے ہیں، اس لئے کہ ہمیں ایسے بیشمار حوادث و واقعات نظر آئیں گے جو تاریخی اصول و قوانین کے زیرنگیں قطعاً نہیں ہیں بلکہ وہاں دیگر علوم و فنون سے متعلقہ قوانین جاری ہوئے ہیں، جیسے فیزیکس اور فیزیالوجی کے قواعد و قوانین، حیات و موت کے اصول و قوانین اور کائنات و عالم فطرت کے مختلف میدانوں میں جاری و ساری دیگر ضوابط و قوانین۔

مثال کے طور پر ایک معینہ سال میں جناب ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہ علیہما السلام دونوں کا سانحۂ ارتحال ایک اہم ترین تاریخی واقعہ ہے جو مورخین کے لئے حد سے زیادہ قابل توجہ اور لائق ضبط تحریر ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ایک ایسا المیہ ہے جو تاریخ کی دنیا میں بعض ایسے پہلوؤں کا حامل ہے جس پر بیشمار تاریخی آثار مرتب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں نظر آئے گا کہ یہ اہم ترین واقعہ، تاریخی اصول و قوانین کی قلمرو سے باہر ہے۔

اس واقعہ میں جن اصول و قوانین کا اجراء ہوا ہے وہ فیزیالوجی کے اصول و ضوابط اور حیات و موت کے قواعد و قوانین ہیں جنکی بنیاد پر اس معینہ وقت میں جناب ابوطالب اور اور حضرت خدیجہ علیہما السلام کے لئے پیغام اجل آیا۔ یقیناً یہ المناک واقعہ مؤرخین عالم کے لئے اہمیت کا حامل ہے، لیکن یہاں تاریخی اصول و قوانین جاری نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہاں پر فیزیالوجی

کے اصول و قوانین جاری ہوئے ہیں جن کا تعلق جناب ابوطالبؑ کے جسمانی حالات و کیفیات اور حضرت خدیجہؑ کے جسمانی حالات و کیفیات ______________ سے ہے، اسی طرح یہاں پر حیات و موت سے متعلقہ قوانین جاری ہوئے ہیں جن کی بنیاد پر مخصوص حالات و کیفیات میں انسان بیماری اور بڑھاپے وغیرہ کے مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔

دوسری مثال کہ خلیفۂ سوم عثمان بن عفان کی زندگی اور ان کی عمر کا طولانی ہونا یہ ایک تاریخی حقیقت اور واقعہ ہے، انھیں اسّی سال کی عمر ملی، جس کی بنیاد پر تاریخ اسلام میں بہت سے اثرات مرتب ہوئے۔

اب اگر یہ فرض کیا جائے کہ ان کی موت فیزیالوجی کے قوانین کے تحت فطری اور طبیعی طور پر شورش و انقلاب سے پہلے ہی واقع ہو جاتی تو اس بات کا امکان تھا کہ بہت سے تاریخی واقعات ظہور پذیر ہی نہ ہوتے، یا ان کی شکل و صورت حال بدلی ہوئی ہوتی، مثلاً اس بات کا امکان ہوتا کہ حضرت علیؑ بغیر کسی نزاع، شورش، باہمی اختلاف اور رد و کد کے خلافت ظاہری کے منصب پر فائز ہوتے، لیکن عثمان بن عفان کے جسم پر نافذ و جاری فیزیالوجی کے قوانین کا تقاضا یہی تھا کہ ان کی درازی عمر کا سلسلہ صرف اس وقت تک باقی رہے جب تک ان کے خلاف برپا شدہ شورش میں حصہ لینے والے انقلابی مسلمانوں کے ہاتھوں انھیں قتل نہ کر دیا جائے۔

یقیناً یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو مؤرخین عالم کی توجہ کا مرکز بھی بنا، نیز اس سے دیگر تاریخی امور کا بھی تعلق ہے، اس تاریخی مسئلے کا دیگر تاریخی حوادث و واقعات کو معرض وجود میں لانے اور انھیں مخصوص شکل عطا کرنے میں مثبت یا منفی اعتبار سے ایک کردار بھی ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں نظر آئے گا کہ یہاں بھی تاریخی اصول و قوانین جاری نہیں ہوئے ہیں بلکہ جن قوانین کا اجرا ہوا ہے وہ فیزیالوجی اور حیات و موت کے اصول و قوانین ہیں، جن کی بنیاد پر عثمان کو اسّی سال کی عمر ملی۔

اجتماعی اور معاشرتی امور میں عثمان بن عفان کے نظریات و تصرفات اور ان کا طریقۂ کار یقیناً وہ امور ہیں جو تاریخی اصول و قوانین کی گرفت سے ہرگز باہر نہیں ہو سکتے لیکن ان کی درازیٔ عمر کا مسئلہ علیحدہ سے ایک چیز ہے، اس کا تعلق یا حیات و موت کے اصول و قوانین سے، یا فیزیالوجی کے قوانین سے ہے، یا طبیعیات کے قوانین سے ہے، یعنی تاریخ کے اصول و قوانین سے

اس کا کوئی ربط اور واسطہ نہیں۔

بہرکیف نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ تاریخی اصول و قوانین، تاریخ کے تمام مراحل اور موارد میں جاری وساری نہیں ہیں، وہ سارے حوادث و واقعات جنہیں طبری اور دیگر مؤرخین اپنی کتب تاریخ میں درج کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا تعلق تاریخی اصول و قوانین سے نہیں ہوتا بلکہ وہ شعبۂ تاریخ کے بعض موارد ہیں جہاں ان کا نفاذ و اجراء ہوتا ہے۔

(۵)

جناب مصطفیٰ محقق
ترجمہ: جناب سید اعتشام عباس زیدی

مصادر فقہ

عقل

اہل سنّت اور شیعوں کے فقہا و مجتہدین کے درمیان دلیل عقلی اگرچہ اجمالی طور سے دینی احکام کے استنباط اور حصول کے لئے ایک مصدر و منبع کے عنوان سے رائج رہی ہے لیکن کسی بھی دور میں اس کی صحیح و دقیق تعریف ہمارے سامنے نہیں آسکی۔ مزید برآں چونکہ اسلام میں فقہ کے مختلف ابواب و مکاتب کے ظہور میں آنے کی بنا پر دلیل عقلی بھی مختلف شکلوں اور گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا ہم اس کی ضروری وضاحت کے لئے اجمال کے ساتھ قدما و متأخرین کے اقوال و فرمودات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس موضوع کا ایک مختصر تاریخی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

دلیل عقلی کا تاریخی پس منظر

شیخ مفید سے پہلے کے علمائے اصول و فقہ کے علمی آثار میں عقل کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ شیخ نے اپنے "رسالۂ اصولیہ" میں جس کی "تلخیص" کراجکی نے کی ہے، سب سے پہلے عقل کو موضوع بحث قرار دیا، اگرچہ شیخ نے وضاحت کے ساتھ اسے دلائل چہار گانہ میں سے ایک دلیل کے عنوان سے پیش نہیں کیا ہے اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں کہ "اصول احکام، کتاب و سنّت و اقوال ائمہ معصومینؑ میں، اور اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ہم تین طریقوں سے ان اصول کو حاصل کر سکتے ہیں ۱۔ شفاہی ذریعہ سے یعنی خود معصوم سے دریافت کریں۔ ۲۔ اخبار و احادیث کے ذریعے اور ۳، عقل کے ذریعہ سے۔" شیخ مفید اجماع کا ذکر کئے بغیر عقل کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے

اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں "عقل حجیت قرآن اور دلائل اخبار و احادیث کی پہچان کا ذریعہ ہے" اور جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، وہ عقل کو ایک "طریقہ و ذریعہ" مانتے ہیں مستقل طور سے اسے دلیل و حجت نہیں سمجھتے۔

شیخ مفید کے بعد ان کے شاگرد شیخ طوسی اپنی کتاب "عدۃ الداعی" میں جو علم اصول پر شیعوں کی سب سے پہلی کتاب ہے، بالواسطہ طور پر عقل کی وضاحت فرماتے ہیں اور ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "معلومات دو طرح کی ہوتی ہیں، اکتسابی اور ضروری ـــ اکتسابی سے مراد وہ معلومات ہیں جنھیں مختلف عقلی و سمعی طریقوں سے حاصل کیا جائے اور ضروریات سے مراد وہ بدیہیات اور واقعیات ہیں جو خود بخود اپنا وجود رکھتی ہیں اور انسان ان کو بغیر کسی استدلال کے قبول کر لیتا ہے مثلاً عدل کا حسن ہونا اور ظلم کا قبیح ہونا۔ شیخ طوسی اس سے زیادہ عقل کے سلسلہ میں کچھ نہیں فرماتے۔

قدما میں سب سے پہلے عقل کے سلسلہ میں وضاحت کے ساتھ اگر کسی نے قلم اٹھایا ہے تو وہ نبیرۂ شیخ طوسی ابن ادریس ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب "سرائر" میں تحریر فرمایا ہے :-

فاذا فقدت الثلاثة یعنی الکتاب والسنة والاجماع فالمعتمد عند المحققین التمسك بدلیل العقل فیها۔

اگر تینوں مصادر یعنی کتاب و سنت اور اجماع میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو اہل تحقیق کی نظر میں حکم عقل ہی سند قرار پاتا ہے۔

ابن ادریس کے بعد محقق حلی اور ان کے بعد شہید اول نے بھی اپنی نگارشات میں عقل کو موضوع بحث قرار دیا ہے۔

اصول کے متقدم اور متأخر علماء نے عقل کے سلسلہ میں وضاحت کے ساتھ بحث نہیں کی ہے اس وجہ سے آج بھی دینی درسگاہوں میں معالم الاصول و کفایۃ الاصول وغیرہ کے نام سے جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ عقل کے موضوع کو فقط ضمنی اشارہ تک محدود رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض متأخرین مثلاً محقق قمی کے یہاں بھی یہ موضوع بہت روشن اور واضح نظر نہیں آتا۔ عصر حاضر میں عقل کے موضوع پر سب سے بہتر تشریح علامہ سید محسن کاظمی نے اپنی کتاب "المحصول" میں فرمائی اور ان ہی کی پیروی کرتے ہوئے ان کے شاگرد رشید مرحوم شیخ محمد تقی اصفہانی، "صاحب حاشیۂ معالم" نے وسیع

پیمانے پر اس موضوع پر تحقیق فرمایا ہے۔ یہ تھا دلیل عقل کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ۔

عقل۔ حضرات شیعہ و اہل سنت کی نگاہ میں

امامیہ فرقہ ابتدا ہی سے عقل کی دلیلیت کا قائل رہا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ علمائے عامہ میں جو افراد شیعوں کے قریب رہے انہوں نے بھی ایک حد تک دلیل عقل کو تسلیم کیا ہے۔ منجملہ امام مالک جنھیں حضرت امام صادق ؑ کے درس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے جلال الدین سیوطی شافعی، جو ایک عظیم مصری دانشور ہیں اپنی کتاب "الحاوی" میں تحریر فرماتے ہیں: "اہل سنت احکام کے حصول کا منبع و مصدر صرف منقولات کو مانتے ہیں اور معقولات کو قبول نہیں کرتے، مزید یہ کہ صرف شیعہ امامیہ اور معتزلہ فرقے کے افراد عقل کو احکام کے مستقل مصدر و منبع کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں"۔ [۱]

جلال الدین سیوطی منقول سے کتاب و سنت و قیاس کو مراد لیتے ہیں اور معقول سے مراد جو شیعوں کے یہاں عقل کے نام سے مشہور ہے۔ ابو زہرہ، جو موجودہ عہد میں قانون کے مشہور دانشور اور استاد ہیں اپنی کتاب "الامام الصادق" کے صفحہ ۴۸۲ پر تحریر فرماتے ہیں: "برادران امامیہ احکام اسلامی کے حصول کے لئے عقل کو خاص اہمیت دیتے ہیں"۔

عقل کے بارے میں اہل سنت کا نظریہ

علمائے عامہ کلی طور سے تو عقل کو ایک مستقل مصدر و منبع کے عنوان سے قبول نہیں کرتے ہاں اسے استحسان و مصالح مرسلہ اور قیاس کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔

چند گنے چنے علمائے عامہ کے یہاں یہ بات ملتی ہے کہ وہ دلیل عقل کو شیعوں کی طرح فقہ کی چوتھی اصل و بنیاد کے عنوان سے شمار کرتے ہیں لیکن ان کے اظہارات و بیان کردہ تعریفات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ عقل سے ان کی مراد جیسا کہ شیعہ تسلیم کرتے ہیں ایک مستقل اصل نہیں ہے، کہ اس سے وسیع پیمانہ پر استفادہ کیا جا سکے۔ بلکہ انہوں نے عقل کو برائت یا استصحاب وغیرہ کے استحکام و استناد

---

[۱] الحاوی جلد ۲ ص ۱۵۹

کے لئے ایک دلیل کے عنوان سے قبول کیا ہے۔ غزالی ان افراد میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں اس سلسلہ میں بحث کی ہے[1]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بعض امامیہ علماء کے یہاں بھی اس طرح کا خلط مبحث پایا جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ یوسف بحرانی کی کتاب "حدائق الناظرہ" میں بھی ایسی ہی بحث نظر آتی ہے۔

عقل کے متعلق امامیہ مجتہدین کا متوازن موقف

امامیہ مجتہدین عقل سے استفادہ کرنے اور اس کے ذریعہ احکام شرعیہ میں استنباط کرنے کے لئے فقہ کی پوری تاریخ میں ہمیشہ دو مخالف جہتوں اور زاویوں سے روبرو رہے ہیں۔ ایک طرف فقہائے عامہ کے مقابلے میں جن کو اصطلاحاً اصحاب رائے کہا جاتا ہے، دوسری طرف اخباریوں کے مقابلے میں جو عقلی نتائج کو قابل اعتبار ہی نہیں مانتے۔ درحقیقت امامیہ فقہ نے اپنے لئے ان دونوں افراطی و تفریطی گروہوں کے درمیان ایک معتدل راہ کا انتخاب کیا ہے۔

اصحاب رائے کا نظریہ، وہی ہے جس کی طرف ہم اپنے مقدمہ میں تاریخ اجتہاد کے تذکرہ میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اس طرز فکر کا نتیجہ جو دوسری صدی ہجری کے اواسط میں ظہور میں آیا ہے عقلی ادراک کو بیش از حد اہمیت دینا ہے۔ چنانچہ یہ افراد جب کسی مسئلہ میں کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں پاتے تھے تو فوراً اپنے ذاتی اور شخصی تفکرات و خیالات کا سہارا لیکر اپنے ذوق و سلیقہ کے ذریعہ، حالات و ضروریات کی مناسبت سے اس مسئلہ کے تحت اپنا نظریہ پیش کر دیتے تھے۔

اہل سنت کے چار فقہا میں ابو حنیفہ کو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت و فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ ان کا نظریہ یوں نقل کیا جاتا ہے کہ "میں کسی بھی مسئلہ کے تحت سب سے پہلے کتاب خدا سے رجوع کرتا ہوں اور جو کچھ میں چاہتا ہوں اگر اس میں نہیں پاتا تو سنت رسولؐ میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ اگر میرا منشاء اس سے بھی پورا نہیں ہوتا تو آنحضرتؐ کے اصحاب کے اقوال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس میں بھی جو بات میرے مطلب کی ہوتی ہے اسے منتخب کر لیتا ہوں اور جس کی طرف خود میرا میلان نہیں ہوتا اسے ترک

---

[1] المستصفیٰ ج ۱ ص ۱۲۷

کر دیتا ہوں اور اگر نوبت ابراہیم شعبی، حسن اور ابن سیرین کے اقوال تک پہنچے تو میں اپنے آپ کو زیادہ سزاوار و حقدار سمجھتا ہوں کہ اپنی فکر و خیال کے تحت عمل کروں اور اس میں اجتہاد کروں، کیونکہ خود انہوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔"

یہ روش فکر اس لئے پروان چڑھی کہ ان افراد نے رسول خدا کی وفات کے بعد اہل بیت کی امامت کے عقیدہ سے کنارہ کشی اختیار کرلی جس کے نتیجہ میں وہ احکام الٰہی کے حصول میں تنگدستی کا شکار ہوگئے دوسری طرف انہوں نے کتاب و سنت کو انسانوں کی تمام احتیاجات و ضروریات کے لئے ناکافی تصور کیا لہٰذا مجبوراً عقلی استدلال کے دامن میں پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہوئے۔

عقل کی بے اعتباری کا نظریہ

کتاب (قرآن) کی بحث میں اخباریوں کے موقف کی تشریح کے ضمن میں اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔ یہاں ہم اس نظریہ پر مزید تشریح کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں گروہ امامیہ کے ایک فقیہ (ملا امین استرآبادی) نے علمی دنیا کے سامنے اپنی کتاب "فوائد المدنیہ" پیش کرتے ہوئے احکام کے استخراج و استنباط کے لئے ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اسے اسماعیلیہ، صوفیہ و باطنیہ اور انہیں کے مانند فرقوں کی افراطیت کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں تمام علوم کو دو صنفوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہتے ہیں، پہلی صنف کے علوم وہ ہیں جن کے قضیے حسی بنیاد کے حامل ہیں اور دوسری صنف کے علوم وہ ہیں جن کے قضیے حسی بنیاد نہیں رکھتے نہ حواس ظاہری کے ذریعہ ان کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ استرآبادی کی نظر میں ریاضیات پہلی صنف کے علوم میں آتے ہیں جن کے اصل قضیے حواس ظاہری کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن فلسفہ مابعدالطبیعہ جس میں تجرد روح بقائے نفس اور اثبات ھیولا وغیرہ کے موضوع پر بحث ہوتی ہے دوسری صنف کے علوم کے تحت آتا ہے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صرف پہلی صنف کے علوم ہی سودمند اور مفید ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ تمام علوم کسی طرح کی افادیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ پہلی صنف کے علوم انسان کے حواس ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسری صنف کے علوم انسان کے گمان و خیال، اندازہ و تخمینہ تک محدود رہتے ہیں۔ استرآبادی کی نظر میں ریاضی کے قضیے مثلاً ۴ = ۲+۲ ہوتا ہے۔ ایک حسی قضیہ ہے۔ برخلاف اس کے مثلاً اجتماع نقیضین محال ہے، اس کی بنیاد

عقلی استدلالات پر ہے۔ جس کا احساس سے کوئی رابطہ نہیں لہٰذا ان کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

استرآبادی اس طرز تفکر کی بنیاد پر ہر طرح کے اجتہاد و استنباط یہاں تک کہ قرآن کی ظاہری آیتوں پر عمل کرنے سے بھی انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف قرآن کے نصوص پر عمل کرنا جائز ہے۔ اس سلسلہ میں انکا استدلال یہ ہے کہ قرآن کے نصوص کے مطابق عمل کرنے میں عقلی استدلال سے کوئی سروکار نہیں رہتا لیکن قرآن کے ظاہری احکام پر عمل کرنے کے سلسلہ میں عقل کی کمک بھی درکار ہوتی ہے اب چونکہ عقلی استدلالات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اس لئے قرآن کی ظاہری آیات سے تمسک کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا جب بھی قرآن کی کوئی آیت صریح اور واضح نص کی صورت میں اپنے معنی پر دلالت نہ کرے تو اس کے حکم پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کہ اس آیت کی تفسیر میں کوئی حدیث نہ وارد ہوئی ہو ایسی صورت میں اس آیت کے حکم پر اس حدیث کی بنیاد کے تحت عمل کیا جائے گا۔

ملا امین استرآبادی کے پیروکار جو قرآن کے سلسلہ میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف اخبار و احادیث کے ذریعہ تفسیر شدہ آیات کو سند قرار دینا اور ان پر عمل کرنا جائز ہے ایسے افراد کو اصول فقہ کی اصطلاح میں "اخباری" کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ اصول دین میں بھی اخبار و احادیث کی بنیاد پر عمل کرتا ہے اور اس میں بھی مذکورہ دلیل کے مطابق عقل سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ وہ عقل کو کسی بھی صورت میں اہمیت ہی نہیں دیتا۔ چنانچہ شیخ طوسی نے اپنی کتاب "عدۃ الاصول" میں ان کو مقلدہ کے نام سے یاد کیا ہے۔

مرحوم استاد شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنے استاد مرحوم آیت اللہ بروجردی کا قول نقل کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک درس میں اخباریوں کے اس مسلک پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا: "اہل اخبار دراصل یورپ کے فلسفہ حسی کی لہر سے متأثر تھے۔ لیکن قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ملا امین استرآبادی "جان لاک" متوفی ۱۷۰۴ عیسوی اور "ڈیوڈ ہیوم" متوفی ۱۷۷۶ عیسوی سے ایک صدی پہلے موجود تھے جنھوں نے یورپ میں فلسفۂ حسّی کو رواج بخشا اور ملا امین استرآبادی نے ۱۰۲۳ ہجری مطابق ۱۶۱۴ عیسوی میں وفات پائی۔ اس لحاظ سے ان کو "فرانسس بیکن" متوفی ۱۶۲۴ عیسوی کا ہمعصر کہنا زیادہ بہتر ہوگا جو درحقیقت فلسفۂ حسی کا بانی تھا۔

بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ ان دونوں فکری نظریوں میں بڑی حد تک یکسانیت و نزدیکی پائی جاتی ہے اور مزید دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس فلسفۂ حسّی کے جو نتائج یورپ میں ظاہر ہوئے بعینہ وہی نتائج اسلامی

ثقافت کی تاریخ میں بھی رونما ہوئے کیونکہ جس طرح فلسفۂ حسی کے رواج کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلی و فکری استدلالات بے معنی ہوگئے اور منطقی دلیلیں بیکار ہوگئیں اور بالآخر لوگ علوم عقلی فلسفۂ مابعد الطبیعہ و الٰہیات سے دور ہوتے چلے گئے اسی طرح اخباریوں کی اخبار نوازی کا اثر یہ ہوا کہ حکماء، فلاسفہ و متکلمین اور تمام اسلامی دانشوروں کے ذریعہ خدا کے وجود پر کئے گئے فکری و عقلی استدلالات ان کی طرف سے بے بنیاد و بے سود، یہاں تک کہ ناجائز اور غلط قرار دے دیئے گئے۔ لیکن ان دونوں افکار کے تاریخ میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ کہ یورپ میں اس طرز فکر کے رواج کا نتیجہ کفر و الحاد کا سرچشمہ بن گیا۔ لیکن چونکہ اخباریوں کے افکار دینی اسباب و علل کے حامل تھے لہٰذا عقل سے ان کا ٹکراؤ طبیعی علوم و سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کے افکار کی اساس یہ تھی کہ وہ دین و شریعت کی اصالت و خالصیت کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے وحی کے اصل معانی و مفاہیم کی حفاظت اور دین میں صرف عقلی و فکری رجحان کے پھیلاؤ اور وسعت کے خوف سے عقلی استدلالات کو ممنوع قرار دے دیا۔ جبکہ یورپ میں فلسفۂ حسی کے پیروکاروں نے آزادانہ طور پر بلا کسی قید و شرط کے اپنے آپ کو سائنس و ٹیکنالوجی کی تحقیقات و تجربات اور اس کے نتائج کے حوالہ کر دیا اور غیر حسی، منطقی نتائج و عقلی استدلالات سے صاف انکار کرنے لگے۔

لیکن امامیہ مجتہدین نے اپنے بہترین موقف کو ان دو فکری خطوط کے درمیان سے انتخاب و اختیار کیا اور اسی پر گامزن رہے ہیں۔ یہ علماء ایک طرف تو اپنے ائمہ معصومینؑ کی پیروی کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ :-

ان دین اللّٰہ لا یصاب بالعقول۔

یعنی دین خدا صرف عقل کے ذریعہ ہاتھ نہیں آسکتا۔ اس کے باوجود وہ نہ صرف احکام خدا کے حصول کے لئے عقل سے استفادہ کرتے ہیں بلکہ عقل کو احکام الٰہی کے جاننے کے لئے ایک مستقل مصدر و منبع فقہ تسلیم کرتے ہوئے اسے کتاب و سنت کی ہمپلہ قرار دیتے ہیں اور اصول دین و عقائد کے سلسلہ میں تو تنہا عقل ہی کو اس کی شناخت کا وسیلہ مانتے ہیں ___ بلکہ اس میں کسی غیر کی تقلید کو باطل قرار دیتے ہیں۔

یہ بزرگوار علماء عقلی نتائج کے بیان کرنے کے سلسلہ میں فرقۂ اشاعرہ سے ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں

اور عقل کو ایک رہبر باطن تسلیم کرتے ہوئے اس کی طرف سے دفاع کرتے رہے ہیں۔
چنانچہ امامیہ علماء دلیل عقل کے موضوع پر مختلف جہتوں اور گوناگوں طریقوں سے برسرپیکار رہے اور اس موضوع پر کبھی اشاعرہ، کبھی اخباریین تو کبھی اصحاب رائے سے برابر انکا مناقشہ رہا۔
ہم ان مختلف جہات کو آئندہ فصل میں دقیق طور سے واضح کریں گے۔

اسلامی، علمی، فکری، دو ماہی رسالہ

توحید

جلد ۴، شمارہ ۵، محرم - صفر ۱۴۰۸ھ / ستمبر - اکتوبر ۱۹۸۷ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

- قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین ملت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ شرق و غرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے
تعاون کی درخواست ہے۔

بدل اشتراک

ملک		فی پرچہ
ایران		۱۵۰ ریال
پاکستان	ــــــــ	۱۵ روپیہ
ہندوستان	ــــــــ	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	ــــــــ	۱۵ ٹکہ
متحدہ عرب امارات	ــــــــ	۸ درہم
سعودی عرب	ــــــــ	۸ ریال
قطر	ــــــــ	۸ ریال
کویت	ــــــــ	۱۵۰ فلس
افریقہ	ــــــــ	۴ ڈالر
برطانیہ	ــــــــ	۲ پونڈ
امریکہ	ــــــــ	۳ ڈالر
کینیڈا	ــــــــ	۲½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاونٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (دفتر مطالعات)
بانک ملی ایران شعبہ خیابان ۴۴۳
خیابان طالقانی، نبش فرصت
تہران - جمہوری اسلامی ایران



اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد (۴) شمارہ (۵)

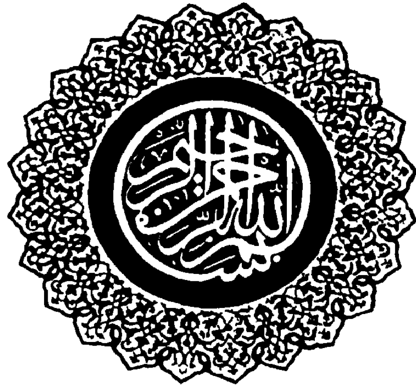
ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۳۴۵۵ – ۳۷۱۸۵
قم، جمہوری اسلامی ایران
فون نمبر ۲۴۵۸۴



محرم ۔ صفر ۱۴۰۸ھ / ستمبر ۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء

فکر و فلسفہ



نوٹ :-

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

فریاد یا محمدؐ!

سرزمین حرم لالہ گوں ہے۔ سعودی جلادوں نے اس مقدس مقام کی حرمت کو پامال کر ڈالا ہے۔ بیت اللہ الحرام کے زائروں کو ابولہب و ابوجہل کے وفاداروں نے خاک و خون میں ملا دیا ہے، آہ! آج شعب ابی طالب اور پیغمبرؐ کی وفادار شریک حیات خدیجہ کی قبر کے جوار میں رسول اکرمؐ کی دردناک یاد تازہ ہو رہی ہے، یہی وہ مقام تو تھا جہاں حضورؐ کے لبوں پر قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا کا نعرہ تھا اور جواب میں پتھروں کی بارش اور چند لحظوں بعد حضورؐ کا لہولہان بدن، آج رسولؐ تو نہیں لیکن ان کے حقیقی پیرو وہی پرچم اٹھائے ہوئے ہیں انھیں بھی لا الٰہ الا اللہ کا جواب پتھروں ہی سے ملتا ہے اور اس کے بعد گولیوں کی بوچھار۔ شاید اس ماڈرن دور میں پتھروں کو اپنے کافر اجداد کی یاد میں استعمال کیا گیا ہو! عجب مظلومیت کا عالم ہے۔ ہر طرف خون ہی خون ہے۔ راہ خدا میں اپنے ہاتھوں بیٹوں کو قربان کئے ہوئے، مجاہد، شہیدوں کی بیوائیں اور مائیں جلوس کے آگے آگے ہیں مسلمانوں کی غیرت کو للکار رہی ہیں، راہ اسلام میں ایثار و قربانی کا عملی نمونہ سامنے ہے، نہ جانے کتنی مائیں ہیں جنھوں نے اپنے دو دو تین تین لال اسلام پر قربان کر دیئے ہیں اور پیشانی پر بل نہیں، نوعمر جوان جن کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے، تعاون اسلام کی خاطر اپنے ہاتھ پاؤں قربان کر کے رضائے معبود پر خوش ہیں اور ابھی جو کچھ توانائی بچی قربان کرنے کے لئے آمادہ ہیں، ان کے پیچھے منتظرین ایثار و شہادت کا ایک جم غفیر ہے ان میں بھی سب سے آگے وارثان حضرت خدیجہ، شیر دل خواتین ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ، یا ایھا المسلمون اتحدوا اتحدوا[1] کا خوش نوا پیغام ان کے لبوں پر ہے الموت لامریکا، الموت لروسیا، الموت لاسرائیل[2] کے دشمن شکن نعروں سے

---

[1] مسلمانو! متحد ہو جاؤ۔ [2] امریکہ مردہ باد، روس مردہ باد، اسرائیل مردہ باد

سے لات و ہبل و عزی کے خلاف پیغمبر کے نعروں کو جامۂ عمل پہنا رہے ہیں، "لبنان لبنان ضد الظلم والطغیان[1]"، "افغان افغان ضد الظلم والعدوان[2]" کے ولولہ انگیز ترانوں سے اپنے مظلوم وستم رسیدہ لبنانی و افغانی بھائیوں کے جذبہ جہاد و ایثار کو نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ "خیبر خیبر یا صہیون جیش محمد قادمون[3]" کے حوصلہ بخش نیز دشمن کے دل ہلا دینے والے نعروں سے پنجۂ ظلم میں اسیر مسلمانوں اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے والے متکبروں کو بیدار باش دے رہے ہیں، سنی شیعہ سب ساتھ ساتھ ہیں، عرب عجم کی تفریق مٹ چکی ہے، کالے گورے شانہ بشانہ ایک ساتھ چل رہے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا عہد و پیمان کئے ہوئے بڑھ رہے ہیں، نہ اختلاف ہے نہ تفرقہ، نہ بغض و حسد کی خلیج ہے نہ کینہ و نفرت کی کھائی، چند لحظوں کے لئے انسان آج کی نفرت انگیز دنیا کو بھول کر اس روح پرور منظر میں کھو جاتا ہے۔ یہ انوکھا اور بین الاقوامی جلوس جس میں عرب بھی شامل ہیں اور عجم بھی صہیب رومی بھی نظر آتے ہیں اور بلال حبشی بھی، صدر اسلام کی مسجد نبوی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ جہاں مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتا تھا۔ انسانوں کی بنائی ہوئی موہوم سرحدیں حائل نہ تھیں لیکن یہ خوش آئند سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا، اچانک گولیوں کی آواز اسے چونکا دیتی ہے، ہائیں! کیا یہ حقیقت ہے؟ فتح مکہ کے چودہ سو سال بعد بھی؟ کیا اب بھی سرزمین مکہ پر لا الٰہ الا اللہ کا جواب پتھروں ہی سے نہیں بلکہ گولیوں سے ملے گا، آہ! یہ حقیقت ہے اور دردناک حقیقت، منٹوں میں کشتوں کے پشتے لگ گئے، خون کی ندی جاری ہو گئی۔ راہ خدا میں اپنے ہاتھ پاؤں قربان کئے ہوئے جوانوں کے جنازے زمین پر بکھر گئے، شہیدوں کی مائیں، اپنے فرزندوں سے جا ملیں۔ نہتی اور بے دفاع عورتوں کے سروں پر ہنٹر برس رہے ہیں، کہیں سے "تشدد کے پنجہ میں اسیر بلال صفتوں کی "احد احد" کی آواز آ رہی ہے، دلیر و بہادر نوجوان اپنی ماں بہنوں کو پٹتے اور اپنے بھائیوں کو خون میں نہلاتے دیکھ رہے ہیں مگر تقدس حرم کی خاطر جوابی کاروائی سے معذور ہیں۔ اپنے رہبر و پیشوا کے حکم سے مجبور ہیں جس نے حرمت مکہ کے پیش نظر ہر قسم

---

[1] لبنان لبنان، دشمن ظلم و طغیان [2] افغان افغان دشمن ظلم و عدوان

[3] صیہونیو! خیبر کو یاد رکھو، لشکر محمدؐ آنے والا ہے۔

کی جوابی کارروائی سے منع کر رکھا ہے، وگرنہ آج مکہ کا نقشہ ہی اور ہوتا۔ اے پابند شریعت دلیرو! آفریں تمہارے صبر پر، سلام تمہارے ایثار پر۔ آل سعود جو چاہے کہے لیکن دنیا کے حاجیوں نے دیکھ لیا کہ دو لاکھ مظاہرین پر گولی برسے، پتھروں کی بوچھار ہو، اور جواب میں کسی عمارت کا ایک شیشہ بھی نہ ٹوٹے، کسی دوکان کو ایک پیسہ کا نقصان نہ پہونچے، اسے کہتے ہیں شجاعت و بہادری، اسے کہتے ہیں، نفس پر قابو، اسے کہتے ہیں خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔

کعبہ، پہلی عبادت گاہ ہے جسے روئے زمین پر بنایا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۲ اور سورہ آل عمران کی آیت ۹۶ اس کی گواہ ہیں۔ اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ہوئی ہے لیکن آپ نے حکم خدا سے اس کی از سر نو تعمیر کی ہے۔

کعبہ اسلام سے صدیوں قبل بھی عرب قبیلوں کی نگاہوں میں محترم تھا اور وہ اسے مقام امن و امان سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کی تعمیر کے بعد خدا سے سات دعائیں کیں، پہلی دعا شہر مکہ کا امن و امان ہے ۔۔ ربِّ اجعل ھٰذا البلد آمناً (ابراہیم/۳۵) پروردگارا! اس سرزمین کو مہد امن و امان قرار دے۔ خدا نے حضرت ابراہیم کی دعا کو قبول کرتے ہوئے اسے مرکز امن قرار دیدیا۔ ومن دخلہ کان آمناً ۔ ہر شخص کی جان و مال محفوظ ہے۔ اس شہر میں ہر قسم کی جنگ اور لڑائی حرام ہے، نہ صرف انسان بلکہ حیوانوں کو بھی امن ہے۔ حرم کے جانوروں کا شکار بھی حرام ہے۔ اس حرم الٰہی میں پناہ لینے والے مجرموں کو گرفتار کرنا بھی جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ حرم سے باہر نہ نکل آئیں۔ اسلام نے خود ماہ حج، ماہ ذی الحجہ کو بھی "ماہ حرام" قرار دیا ہے تاکہ حاجیوں کو مکمل امن و سلامتی حاصل ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ قبل از اسلام، وحشی عرب قبیلے بھی اس "امن" کی رعایت کرتے تھے، اور پیغمبر نے اسی "امن کعبہ" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن و اسلام کی آواز کو زائرین مکہ کے کانوں تک پہنچایا اور یہیں سے بیعت عقبہ و اسلام اہل مدینہ کے مقدمات فراہم ہوئے۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مکہ ہمیشہ مختلف سیاسی، نظریاتی بحث و گفتگو و مناظرہ اور نشر اسلام کا مرکز رہا ہے۔ ائمہ سے منقول روایات میں ہے کہ لوگ حج کے لئے آئیں اور زیارت بیت اللہ سے

فارغ ہوکر ہمارے یہاں حاضری دیں اور اسلامی تعلیمات ومعارف ہم سے سیکھیں۔ امام صادقؑ اور ابن ابی العوجاء جیسے منکرین خدا کے درمیان مباحثے دامن تاریخ میں محفوظ ہیں۔

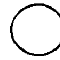
خود پیغمبر اکرمؐ کی تحریک اسلام، جس کا سیاسی پہلو نمایاں تھا، اسی مکہ سے شروع ہوئی ہے، سورہ برائت کی تلاوت اسی مکہ میں انجام پائی جسے اسلامی انقلاب کا منشور کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سورہ میں دشمنوں اور مشرکوں سے بیزاری کا اعلان، مومنین کی اخوت و برادری کا پیغام، ائمہ کفر سے جنگ کا حکم، مشرکوں سے دوری اختیار کرنے کا فرمان، جنگی واقعات، تبوک وحنین کی داستان، فتح وشکست کا راز، اسلامی ٹیکس، زکوٰۃ نہ دینے والوں کی مذمت، علم دین سیکھنے کا حکم، حضرت علیؑ کی نیابت، منافقین کے تذکرے، ان کے بخشے نہ جانے کا ذکر، صادقین کا تعارف، مختصر یہ کہ جملہ اہم نکات موجود ہیں۔ اس سورہ کو حضور اکرمؐ کے حکم سے حضرت علیؑ نے جمرہ عقبہ (بڑے شیطان) کے پاس کھڑے ہوکر پڑھا۔ چنانچہ مجاہد وبیدار مسلمان رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ کی اسی تاسی میں اور نزول سورۂ برائت کی یاد ہی میں مکہ معظمہ میں "جلوس برائت" نکالتے ہیں جس میں سورۂ برائت کی روشنی میں مشرکوں، شیطانوں خاص کر بڑے شیطان (امریکہ) کے خلاف نعرے لگائے جاتے ہیں اور اسی جلوس برائت کو سعودی حکمرانوں نے منافقوں ومشرکوں کے سرغنہ اور بڑے شیطان (امریکہ) کے اشارہ پر خاک وخون میں ملادیا۔

پیغمبر اسلامؐ فتح مکہ کے موقع پر اسلامی سیاست کے آئینہ دار نعرہ " لا الٰہ الا اللہ الٰھا واحدا ونحن لہ مسلمون ...... ولو کرہ المشرکون .... کی گونج میں شہر مکہ میں داخل ہوئے اور فوراً ہی حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے آپ کے دوش مبارک پر چڑھ کر مشرکوں کے مقدس وبیش بہا بتوں کو توڑ ڈالا۔

امام حسینؑ، یزید کے خلاف اپنی تحریک کے سلسلہ میں مکہ مکرمہ تشریف لائے اور یزیدی حکومت کو نیست ونابود کرنے کے لئے اہم تبلیغات آپ نے اسی شہر میں انجام دیں، اکثر خطوط آپ نے یہیں سے لکھے، ولولہ انگیز تقریریں آپ نے یہیں پر فرمائیں، علی الخصوص آپ کی وہ تقریر جو آپ نے علماء وتابعین کے مجمع میں کی ہے۔ امامؑ اس تاریخی دپرمعنی تقریر میں فرماتے ہیں: "جو شخص کسی ظالم وستمگر حکمراں کو دیکھے کہ بندوں کے درمیان برخلاف احکام خدا عمل کر رہا ہے، محترم خون بہا رہا ہے اور وہ شخص اپنے ہاتھ اور زبان سے

سے منع نہ کرے تو خدا پر حق ہے کہ وہ اس شخص کو اسی راستے سے جہنم میں داخل کرے جہاں سے اس ظالم حاکم کو وارد کرے گا۔

مختصر یہ کہ مکہ ہمیشہ اسلامی سیاست کا مرکز رہا ہے مسلمین عبادت کے دوش بدوش اسلامی سیاسی مسائل پر بھی بحث وگفتگو اور اس کے حل کے لئے غور و فکر کرتے رہے ہیں، ان تمام تاریخی شواہد کو اداریہ میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔



حج اور مکہ کی سیاسی اہمیت ہمیشہ اسلام دشمنوں کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی ہے۔ وہ اس مرکز کی نابودی یا اسے بے اثر بنانے کے لئے کوشاں رہے ہیں چنانچہ وہ کعبہ جو عظمت اسلام کی علامت تھا، "لا یزال الدین قائما ما قامت الکعبۃ" تھا، بقائے دین کا سبب تھا، استکباری سازشوں سے اس کی انقلابی خاصیت سے تہی کر کے خشک و بے روح عبادت کا مرکز بنا دیا گیا۔

امام خمینی کی قیادت میں کامیاب ہونے والے اسلامی انقلاب کی ظفرمندی کے بعد- جس کا مقصد ہی اسلامی تعلیمات کا احیاء اور عظمت اسلام کی بحالی ہے -حج کو اس کی اصلی شکل میں پلٹانے نیز کعبہ اور مکہ کو صدر اسلام کی عظمت و اہمیت سے مالا مال کرنے کی صلح آمیز کوشش شروع ہو گئی پہلے صرف ایرانی حاجیوں اور بعد میں دیگر ممالک کے حاجیوں کی شرکت سے مدینہ میں جلوس وحدت اور مکہ میں جلوس برائت نکلنے لگا، مکہ اور مدینہ میں اسلامی دردمند و مخلص دانشوروں کی کانفرنس کا انعقاد ہوا، سال بہ سال مظاہرہ کی رونق بڑھتی گئی، عوامی انتظامات نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا کہ اتنا بڑا جلوس اور اس قدر منظم! اور کیوں نہ ہو ہر شخص خود کو "نظم امرکم" کا پابند سمجھتا تھا۔

شروع ہی سے سعودی حکومت اس اسلامی مظاہرہ کی راہ میں مختلف بہانوں سے روڑے اٹکاتی رہی ہے، ۱۹۸۳ء میں سعودی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ ایرانی حاجیوں کو صرف اس شرط پر حج کی اجازت دی جائے گی کہ:۔

(۱) ان کی تعداد دس ہزار سے زائد نہ ہو۔

(۲) مظاہرہ سے باز رہیں۔

(۳) کوئی تیسرا ملک ان کی ضمانت لے۔

لیکن جب امام خمینی نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: "سعودی حکومت کی کیا مجال جو ایرانی حاجیوں کو حج سے روک سکے۔" سعودی حکومت نے گھبرا کر اپنی بات واپس لے لی اور مظاہرے کے دوران کوئی خاص مزاحمت نہیں کی، البتہ غیر ایرانی حاجیوں کو اس مظاہرے میں شرکت سے روکتے تھے، انہیں قید کرکے غل و زنجیر میں جکڑتے تھے، لیکن خواب غفلت سے بیدار ہونے والے مسلمان ان حربوں کی پرواہ کئے بغیر مظاہرہ میں حصہ لیتے تھے اور ان کی تعداد ہر سال بڑھتی جا رہی تھی۔ سعودی حکومت ہر سال مظاہرہ سے پہلے بڑی شدت کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کرتی تھی کہ سیاست دین سے جدا ہے دھمکیاں دیتے تھے کہ اگر مظاہرہ ہوا تو اچھا نہ ہوگا۔ دوسرے ملکوں کے مسلمان اس اسلامی مظاہرہ سے نالاں ہیں، گویا وہ پہلے ہی سے بہانہ تیار رکھنا چاہتے تھے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر دین سیاست سے جدا ہے اور حج کے موقع پر کسی قسم کی سیاسی گفتگو نہیں ہونی چاہئے تو پھر پیٹرو ڈالر سے چلنے والے ان رنگ برنگ اخباروں پر مکہ میں داخل ہونے کی پابندی کیوں نہیں لگائی جاتی۔ ریڈیو ٹیلی ویژن کی خبریں اور سیاسی تبصرے بند کیوں نہیں کئے جاتے؟ سعودی حکمرانوں کی مدح سرائی میں زمین آسمان کا قلابہ ایک کرنے والے یہ مختلف زبانوں کے اخبارات حاجیوں کے درمیان مفت کیوں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی روک تھام کیوں نہیں کی جاتی؟ یا صرف اسلامی سیاست دین سے جدا ہے اور امریکی سیاست عین اسلام و جزو حج؟!! کیا دیگر ممالک کے مسلمان صرف لا الہ الا اللہ، دعوت اتحاد، اور امریکہ، روس، اسرائیل جیسے اسلام دشمنوں کے خلاف نعروں کے مخالف ہیں؟ اور استعماری ایجنٹ محمد ابن عبدالوہاب کی تفرقہ انداز تعلیمات کو گلے لگاتے ہیں ــــ جو اس کی تعلیمات پر مشتمل لاکھوں کی تعداد میں کتابیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اس کے عقیدوں کے مخالفوں پر کفر و شرک کا فتویٰ لگایا جاتا ہے یا اس کے برعکس وہ تعلیماتِ محمد بن عبداللہ صلعم کے دلدادہ اور محمد بن عبدالوہاب سے متنفر ہیں جس کی وجہ سے انھیں قبر پیغمبرؐ، جنت البقیع اور خانہ خدا میں نجدی درندوں کے کوڑے کھانے پڑتے ہیں؟؟

○

اس سال کا مظاہرہ انتہائی منظم تھا، ہر شخص، انتظام کی تعریف کر رہا تھا، کسی قسم کی بدنظمی کا احتمال تک نہ تھا۔ اگرچہ حجاج کرام اسلامی مظاہرہ کے لئے سعودی حکومت کی غاصب حکومت کی اجازت کے

محتاج نہیں ہیں لیکن ہر قسم کی بدنظمی اور لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لئے سعودی حکمرانوں سے اس سلسلہ میں گفتگو کی گئی اور گھنٹوں کی بحث وتمحیص اور انہیں اس مظاہرہ کے جواز اور ضرورت کے سلسلہ میں قانع کر دینے کے بعد جس کی ویڈیو فلم موجود ہے وہ اجازت دینے پر تیار ہو گئے اور مظاہرہ کی ابتداء وانتہا طے پا گئی۔ پس یہ جلوس خود سعودی حکمرانوں کی اجازت سے نکالا گیا تھا جس کا اعتراف سعودی وزیر داخلہ "نایف بن عبدالعزیز" نے ۲۵ اگست ۱۹۸۷ء کو سو ملکوں کے نامہ نگاروں کی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا ہے۔

نعرے انتہائی منظم تھے، اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ صدام و فہد، حسنی مبارک جیسے سامراج کے گھس پیٹھ ایجنٹوں کے خلاف کوئی نعرہ نہ لگایا جائے تاکہ انہیں مزاحمت کا کوئی بہانہ نہ مل سکے، بلکہ صرف ان اسلام دشمن طاقتوں، امریکہ، روس، اسرائیل کے خلاف نعرے لگائے جائیں جن کے ظلم وستم سے تمام مسلمان آگاہ اور ان کی اسلام دشمنی پر سب متفق ہیں۔

سعودی پولیس، گارڈ، فوج، مظاہرین کو چاروں طرف سے اپنے محاصرہ میں لئے ہوئے تھی، اور ہر قسم کے اسلحے سے لیس تھی، خلافِ معمول مکہ کی ساری دکانیں بند تھیں، سعودی پولیس نے مختلف سڑکوں کی ٹریفک کو روک رکھا تھا، جب کہ گذشتہ مظاہروں میں ایسا نہ ہوتا تھا، جس سڑک سے جلوس گزرتا تھا اسے بھی بند نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ مزید گاڑیوں کو ادھر گھما دیا جاتا تھا تاکہ وہ ہارن بجائیں اور نعروں کی آوازیں لوگوں کے کان تک نہ پہنچ سکیں — یہ نامشرکین مکہ والا عمل، کان بند کر لو تاکہ صدائے محمد نہ سنائی دے۔ اتنی کثیر تعداد میں فورسز، مختلف قسم کے اسلحے، بند دوکانیں، اور ٹریفک کی معطلی دیکھ کر ایک خیال آتا تھا کہ کہیں کچھ ہونے والا تو نہیں ہے، یہ تیاری کیسی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر اطمینان ہو جاتا تھا کہ ان لوگوں نے خود ہی اجازت دی ہے اور ان کی اجازت کے خلاف کوئی عمل انجام نہیں پا رہا ہے لہٰذا کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ لیکن یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور اس کے بعد جو المیہ رونما ہوا وہ آپ اسی رسالہ میں توحید کے خصوصی نمائندہ جناب سید احتشام عباس صاحب کی چشم دید رپورٹ "سرزمین مکہ پر خون کی ہولی" میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

۱۔ المیہ کے دوسرے دن، سعودی حکومت نے اس سانحہ کو غیر اہم قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئے

اعلان کیا کہ:" ایرانیوں نے نمازیوں کا راستہ بند کر رکھا تھا، کچھ حاجیوں نے انھیں نصیحت کی چنانچہ آپس میں جھڑپ ہوگئی جس میں تقریباً ۳۰ افراد ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے" یاد رہے کہ اعلان تمام شہداء کی لاشوں کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۔ المیہ کے تیسرے دن فہد کی صدارت میں کابینہ کے ہنگامی اجلاس کے بعد دوسرے سرکاری اعلان میں کہا گیا کہ "پولیس نے ایک گولی بھی نہیں چلائی"۔!

۳۔ اسی دن سے سعودی خبر رساں ایجنسی نے مظاہرے کے کچھ فوٹو اخبارات کو فراہم کئے جسے وہ بڑی بڑی سرخیوں سے شائع کرتے تھے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ اتنے بڑے مظاہرہ اور اس عظیم المیہ کی صرف پندرہ تصویریں فراہم ہو سکیں جسے سعودی اخبار باری باری ایران کے جرم کی سند کے طور پر چھاپتے تھے۔ نہیں معلوم خود ان اخباروں کے رپورٹر اور فوٹوگرافر کیا کر رہے تھے۔ سعودی ایجنٹوں کے ہاتھوں میں موجود درجنوں کیمرے، اور خفیہ و ظاہری موویی کیمرے اس المیہ کی صرف پندرہ تصویریں لے سکے۔ کیا کوئی عقل اسے مان سکتی ہے؟ یا یہ کہ تصویریں تو ہزاروں تھیں لیکن وہ سعودیوں کے جرم کی منہ بولتی تصویریں تھیں لہٰذا انھیں دبا لیا گیا۔

۴۔ جن تصویروں کو سند جرم کے طور پر شائع کیا گیا وہ کچھ اس طرح کی تھیں: ایک تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ مظاہرین امام خمینی کی تصویر اٹھائے ہوئے تھے!! یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ سیکڑوں حاجیوں کو گولیوں سے بھون دیا جائے۔ دوسری تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ مظاہرین امریکی جھنڈے کو آگ لگا رہے ہیں۔ یہ تصویر تمام اخبارات میں متعدد بار شائع ہوئی، گویا سب سے بڑا جرم یہی تھا۔ تیسری تصویر میں تھا کہ ایرانی حکومت کا فلاں عہدیدار مظاہرہ میں شریک تھا، نہیں معلوم کسی عہدیدار کا حج میں شریک ہونا کب سے جرم قرار دیا گیا ہے۔ پھر دوسرے ممالک سے آئے ہوئے وزراء کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کچھ ایسے افراد کے نام بھی لکھے گئے تھے جو حج میں تھے بھی نہیں۔ چوتھی تصویر میں جلوس کے نظم کو برقرار رکھنے والے اور پانی پلانے والے جوانوں کو دکھایا گیا تھا، جو اپنے بازوؤں پر سرخ و سبز رنگ کی پٹی باندھے ہوئے تھے جس پر "خادم الحجاج" اور "سقایۃ الحاج" لکھا ہوا تھا، اسی طرح کی دوسری تصویریں، جو نہ صرف یہ کہ مظاہرین کے جرم کی دلیل نہیں ہیں بلکہ ان کے افتخار کی سند ہیں۔

۵۔ مظاہرے کے مقاصد کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا! سعودی اخباروں نے لکھا کہ مظاہرین کا

مقصد، مسجد الحرام پر قبضہ، امام جماعت کا قتل، امام خمینی کی بیعت، کعبہ کی آتش زنی اور اسے قم منتقل کرنا تھا۔ جبکہ مظاہرہ کی کیفیت کے سلسلہ میں خود ان کے اخبارات نے لکھا ہے کہ جلوس کے آگے آگے ہاتھ پیر سے معذور و ہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے جوان اور عورتیں تھیں۔

الف ۔ اگر مظاہرین کا مقصد مسجد الحرام پر قبضہ کرنا ہوتا تو اس کے لئے مظاہرہ کی ضرورت نہ تھی، بلکہ یہ ڈیڑھ دو لاکھ کا مجمع علیحدہ علیحدہ مسجد میں جا کر اکٹھا ہوتا اور وقت معین پر اٹھ کھڑے ہوتے اس طرح کسی مزاحمت کے بغیر بڑی آسانی سے قبضہ مل جاتا۔

ب ۔ اگر مسجد الحرام پر قبضہ مقصود ہوتا تو شام کے چھ بجے جلوس نہ نکالا جاتا کہ سات بجے حرم پہنچیں، جبکہ مسجد غیر ایرانیوں سے کھچا کھچ بھر چکی ہو اور مظاہرین کا امام جماعت تک پہنچنا ممکن نہ ہو۔

ج ۔ کونسی عقل تسلیم کرتی ہے کہ اس مقصد کے لئے نکالے جانے والے جلوس میں آگے آگے ہاتھ پیر سے معذور افراد اور عورتوں کو رکھا جائے۔ ایسے جلوس میں تو سب سے آگے تجربہ کار قوی ہیکل جوانوں کو رکھا جاتا ہے، جو ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کر سکیں۔

د ۔ یہ مظاہرین کس اسلحہ کے ذریعہ مسجد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، کیا انہی کیتلیوں اور نیل کٹروں کے ذریعہ جن کی تصویر سعودی ٹیلی ویژن نے دکھائی تھی؟ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ جدید ترین امریکی اسلحوں سے لیس سعودی فوج کا مقابلہ نیل کٹر اور پانی پلانے کی کیتلی سے کر کے مسجد الحرام پر قبضہ کر لیا جائے گا۔

ھ ۔ اگر ایرانی مکہ کے بجائے قم کو قبلہ بنانا چاہتے تھے تو کم از کم اپنی مسجدوں کا رخ کعبہ کے بجائے قم کی طرف بناتے اور خود قم کی طرف نماز پڑھتے، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لیے پروپیگنڈہ کرتے۔ آخر جھوٹ بولنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیا کریں، دنیا اتنی احمق تو نہیں ہے کہ ان کے اس سفید جھوٹ کو آنکھ بند کر کے قبول کر لے گی۔

و ۔ اگر سعودی حکومت مظاہرین کے ان مبینہ مقاصد سے واقف تھی تو اس نے مظاہرے کی اجازت ہی کیوں دی؟ اور اگر اجازت کے بعد پتہ چلا تھا تو مظاہرہ شروع ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ روک دیا۔ جس طرح مدینہ میں دعائے کمیل نہ ہونے دی۔ مظاہرہ سے دو گھنٹہ قبل تقریریں ہوتی رہی ہیں اس وقت مجمع بھی کسی قدر کم تھا، اسی وقت منع کیوں نہ کیا؛ چاروں طرف سے گھیر

ہوئے تھے۔ طاقت بھی موجود تھی، مجمع کو منتشر کر دیا ہوتا ؟! اس طرح کے سیکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب سے سعودی حکومت عاجز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مظاہرہ کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کی تاسی اور نزول سورۂ برائت کی یاد میں جلوس برائت نکال کر اسلام اور مسلمانوں کو درپیش خطرات سے آگاہ کریں انہیں ان کے دشمنوں سے واقف کرائیں، لبنان، فلسطین اور افغانستان میں امریکی، اسرائیلی اور روسی بربریت سے مسلمانوں کو مطلع کریں، ظالم سامراجی حکومتوں کے پنجۂ ظلم میں اسیر مسلمانوں کی درد بھری داستان سنائیں اور پھر سب مل جل کر، شانہ سے شانہ ملا کر، اسلامی تعلیمات کے احیاء اور عظمت اسلام کی بحالی کے لئے لائحہ عمل تیار کر کے اسے بروئے کار لانے کے لئے اقدام کریں تاکہ پھر نہ روس کو افغانستان میں جارحیت کی ہمت ہو، نہ امریکہ و اسرائیل کو لبنان و فلسطین میں مسلمانوں کے قتل عام اور انھیں دربدر کرنے کی جرئت ہو اور نہ ہندوستان میں نام نہاد سیکولر حکومت کو بے گناہ و مظلوم مسلمانوں کے خون بہانے کا خیال آئے۔

اور اب ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ اتحاد مسلمین اور اسلام دشمن طاقتوں سے اظہار بیزاری اور برائت کی آواز بلند کرنے والے اس جلوس پر خادم الحرمین شریفین! کے حکم پر گولیوں کی بوچھار اور حرم امن الٰہی میں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کس کے لئے سودمند تھا اور کسے ضرر پہنچانا چاہتا تھا۔ پاک اور مقدس زمین پر بہنے والے اس خون نے کتنے چہروں پر پڑی ہوئی نقابیں نوچ ڈالی ہیں۔ اب انھیں پہچاننا ہمارا کام ہے۔



- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان ۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب ۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی ۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی ۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط ۔

مرتضیٰ حسین

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ :

کہئے — اے تمام عالم کے مالک ، اللہ ! تو ہی جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور تو ہی جسے چاہے عزت دے اور تو ہی جسے چاہے ذلت دے ، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی قبضے میں ہے — بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے (۲۶) رات کو دن میں داخل کرتا اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی مردہ سے زندہ کو پیدا اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے ۔ اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے (۲۷)

تفسیر :

۲۶۔ قل اللّٰھم مالك الملك . . . .

پیغمبر : اہل کتاب کی سرکشی اور ان کی مشرکین سے دوستی، کفر کی قوت اور مسلمانوں کی موجودہ حالت سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ۔

وفد نجران کی پریشانی اور ابو حارثہ ابن علقمہ (رئیس وفد) کا یہ کہنا بے معنی ہے کہ ــ محمدؐ پر ایمان لائیں تو روم کے بادشاہ جو مالی و اخلاقی امداد و اعزاز سے نوازتے ہیں اس سے محروم ہو جائیں گے۔

مشرک و اہل کتاب، مسلمانوں کے اس یقین پر ہنستے تھے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں زیر ہوں گی اور یہ لوگ روم و ایران کے مالک بنیں گے۔

پیغمبر! آپ کہئے ۔ یہ کہنا، جواب ہے ان سوالات کا جو بیان ہوئے۔ یہ جواب ہے، ان خیالات کا جو کمزور بازو اور طاقت اور عقیدہ و کردار رکھنے والے مسلمانوں کی عزیمت دیکھ کر آئندہ پیدا ہو سکتے ہیں ۔ یہ آیت حمد کے پیرایہ میں جواب و تعلیم حکمت قرآن ہے۔

طاقتوں کو نہ دیکھو، اللہ کی پناہ میں رہو، اصل مالک ملک وہی ہے جسے چاہتا ہے عارضی ملک عطا کر دیتا ہے پھر آزماتا ہے کہ وہ شکر گزار ہے یا ناشکرا، وہی ملک و ملکوت پر اقتدار دیتا ہے۔ انبیاء و اولیاء اسی کی طرف سے قوت و اقتدار حاصل کرتے ہیں۔

عزت و ذلت فقط اللہ کے قبضے میں ہے، وہ اپنی حکیمانہ مصلحتوں کے مطابق اپنی قدرت مطلقہ کا مظاہرہ فرماتا ہے۔ کسی قوی کو اپنی قوت پر گھمنڈ اور کسی مستضعف کو اپنی حالت پر مایوس نہ ہونا چاہئے۔

بنی اسرائیل کو غرور تھا کہ ان کا خاندان ہی نبوت کا وارث ہے تو اللہ نے اولاد اسماعیلؑ میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا کیا اور ختم نبوت و قرآن و ائمہ کو اسی گھرانے میں ودیعت کیا۔

۲۷۔ تولج اللیل فی النہار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قدرت باری کی عظمت ہے کہ امور تکوینیہ میں رات اور دن کی آمد و رفت، ایک کا دوسرے سے چھوٹا بڑا ہونا، زندگی کی ان سے وابستگی، پھر مردہ زمین کا زندہ اور کافر کے گھر میں مومن کا پیدا ہونا یا اس کے برعکس فقط اللہ کی خالقیت و مالکیت کی دلیل ہے۔ وہی ہر قسم کی روزی، پوری کائنات کو دے رہا ہے۔ لہٰذا، وقتی جاہ و جلال، مال و منال پر تکبر کرنا نادانی ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ
الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَمَنْ يَفْعَلْ
ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ
اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝ قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ
أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ
وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ
مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ
أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ:

مومن، مومن کو چھوڑ کر کافروں کو سرپرست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا۔ اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر اس حالت میں (استثناء ہے) کہ تم ان سے بچاؤ چاہو اور اللہ تم کو اپنے ہی سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (۲۸) آپ کہہ دیں، تم اپنے دلوں کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو (بہرحال) اللہ اسے جانتا ہے اور وہ (تو) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس سے (بھی) باخبر ہے۔ اور اللہ، ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے (۲۹) جس دن ہر شخص سامنے دیکھ لے گا جو بھی اس نے نیکی کی ہوگی یا جو بدی انجام دی ہوگی۔ (اس وقت) وہ آرزو کرے گا، کاش! اس کی بدی اور خود اس کے درمیان دور دراز کا فاصلہ پڑ جائے۔ اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اور اللہ، بندوں پر (رؤف) مہربان بھی (۳۰)

تفسیر:

۲۸۔ لایتخذ المؤمنون الکافرین . . . .

سماجی و فکری و سیاسی اعتبار سے مومن و کافر کی دوستی کا مطلب ہے اسلام کی اساس سے انحراف

کی راہ نکالنا اور صراط مستقیم سے ہٹنا محبت، دوستی، امداد طلبی و سربراہی کی جو حیثیت بھی ہو کافر کا عمل دخل مومن فرد یا معاشرے پر ہونے کا امکان پیدا کرتا ہے اور یہ امکان خطروں کی راہ اور گمراہی تک لے جانے والی بات ہے۔ اس سے احتیاط ضروری ہے ـــ الا ان تتقوا منھم تقٰـۃ۔ معاشرتی معاملات میں بسا اوقات الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں ہوتا، پھر بین الاقوامی تعلقات میں بھی اسلامی مفادات کا تحفظ ضروری ہے۔ قرآن مجید نے ایسے مقامات کے لئے قانونِ تقیہ وضع کیا ہے۔ تقیہ، جسے آیت میں تقٰـۃً کی قرائت اور تتقوا (مشتق) کے ذریعہ بطور اصول ذکر کیا ہے۔ تقیہ، موجودہ قانون کی سائینس، انسانی جبلت اور عقلی تقاضوں کے مطابق ہے۔ تقیہ، دفاع کا ایک انداز بھی ہے اور پیش قدمی کا رخ بھی ہے اور مرد مومن کو ان مقامات سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اور بتا دیا ہے کہ جب حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ کی طرح وقت آپڑے تو حفاظت خود اختیاری کے لئے دشمن سے وقتی ہم نوائی کرنے میں تامل نہ کرو۔ بشرطیکہ عقیدہ نہ بدلے اور دین کو ضرر نہ پہنچے۔ تقیہ کو ہمارے بھائی "اکراہ" اور مدارات کا نام دیتے ہیں۔ مولانا محمود حسن و شبیر احمد صاحب نے حواشی قرآن میں لکھا ہے:

"الا ان تتقوا منھم تقاۃ کو حقیقت موالات نہیں فقط صورت موالات سمجھنا چاہیئے، جس کو ہم مدارات کے نام سے موسوم کرتے ہیں"۔

تقیہ۔ سیرت حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ماننے والوں کے انداز تبلیغ و مقابلۂ کفار کا مسلم طریقہ کار تھا۔ مکہ مکرمہ میں پوری زندگی تقیہ کی آئینہ دار رہی اور مدینے میں بھی آپ نے قرآن کے اس حکم کو لوگوں تک پہنچایا۔ حدیث و فقہ و سیرت کی کتابوں میں تفصیل و اجمال موجود ہے۔ مکے سے خفیہ ہجرت اور اس کے جزئیات، دشمنوں سے جنگ کا ایک رخ تھا جو تقیہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن یہ اس وقت جب اپنی جان اور اپنا مال بچانے کے لئے تقیہ سے اصل دین کو خطرہ نہ ہو اور اگر دین اور اپنی ذلت کا معاملہ آپڑے تو امام حسینؑ کے ماننے والے شہادت قبول کر لیتے ہیں مگر یزید جیسوں کی بیعت نہیں کرتے۔ نیز دیکھئے سورۃ النحل آیت/۱۰۶ اور میرا مقالہ مشمولہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ، طبع پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

بعض مفسرین نے نزول آیت کا موقعہ یہ بتایا کہ حاطب ابن بلتعہ نے ایک خفیہ خط کے ذریعہ

کفارِ مکہ کو ہجرتِ رسولؐ کے منصوبے سے باخبر کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے باشارۂ وحی، حضرت علیؑ کو قاصد کی گرفتاری کے لئے بھیجا، حضرت علیؑ نے ایک عورت سے وہ خط برآمد کر لیا، کچھ عرصے بعد آنحضرتؐ نے اس خط کے بارے میں ایک اجتماع سے سوال کیا، حاطبؓ اقرارِ جرم کیا اور حضرتؐ نے تنبیہ فرمائی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۹۔ قل ان تخفوا ما فی صدورکم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بات نفاق وکذب کی ہو یا تقیہ و مدارات کی، اللہ تو ظاہر و باطن نیت و عمل کے ہر گوشے سے باخبر ہے اس کے حضور زمین و آسمان کی ہر بات عیاں و آشکار ہے وہ قادر و مختار ہے اس لئے مومن کو نیت پاک اور عقیدہ استوار رکھنا چاہیئے۔

۳۰۔ یوم تجد کل نفس ما عملت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کافروں سے روابط استوار کرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ قیامت کا دن آنے والا ہے وہاں نفاق کام نہیں آئے گا، ہر شخص کا نامۂ اعمال اسے دیا جائے گا مومن و نیک عمل خوش ہوں گے۔ بدکردار لوگوں کو وحشت ہوگی۔ وہ سوچیں گے یہ دن دور ہی رہتا تو اچھا تھا۔ ان حالات و خطرات سے آگاہی کیلئے رحمت و کرم خداوندی تمہیں ایک مرتبہ پھر قبل از وقت ڈراتا اور توبہ و بازگشت کی راہ دکھاتا ہے ابھی وقت ہے کہ اللہ کی رحمت کا سہارا لے لو اور کافروں سے رشتہ توڑ دو۔

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ: کہہ دیجئے۔ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری راہ چلو تاکہ اللہ بھی تم سے محبت

فرماتے اور تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۳۱) کہہ دیجئے، تم سب اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑلیں تو یقیناً اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا (۳۲)

تفسیر

۳۱ - قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی . . . . .

انسان اپنی آسانی کی خاطر فرار کی راہ تلاش کرنے میں سستی نہیں کرتا۔ انھیں راہوں میں ایک راہ ہے دعوئے محبت و وصال الٰہی۔ اب کون کہے کہ آپ خدا سے محبت کرتے ہیں تو دلیل لائیے۔ لوگ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنے لگے کہ عشق الٰہی کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کچھ لیا جائے وہ قرآن ہی سے لیا جائے، قرآن کافی ہے۔ ایسے محقق نما افراد ماضی کی طرح آج بھی ہیں۔ اللہ عز اسمہ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا۔ اللہ سے سچی محبت کا تقاضہ اس کی رضا جوئی و قربت کی سعی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: "ما احب اللہ من عصاہ" جو اللہ کا نافرمان ہو، اللہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ محبت خدا کا دعویٰ یہ اس آیت کی رو سے اطاعت خاتم الانبیاءؐ کے بغیر غلط کار ہے۔ جب محبت خدا میں اطاعت رسول کرے گا تو قرآن ضامن ہے کہ اللہ بھی اس سے محبت کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"..... وھل الدین الا الحب والبغض فی اللہ، اس فلسفہ محبت کے بعد اسلام "محبت" کا نام ہے۔ مگر اللہ کی محبت، اللہ کی رضا کے لئے محبت۔

محبت خدا کے ساتھ اطاعت رسولؐ غفور و رحیم اللہ کی طرف سے بخشش گناہ کی نوید رکھتی ہے۔

۳۲ - قل اطیعوا اللہ والرسول . . . . . .

یہود و نصاریٰ کی طرح کسی کا یہ دعویٰ ماننے کے قابل نہیں کہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے اسے اللہ و رسول کی اطاعت کرنا لازم ہے" اطیعوا " اطاعت کرو ایک حکم عام ہے اور اسی کے ساتھ اللہ اور بلا فاصلہ حرف و فعل "الرسول" کا ہونا دلیل وحدت حکم ہے، جو بھی آپ کی اطاعت نہیں کرتا وہ کافر ہے اور اللہ کافر کو پسند نہیں فرماتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝

ترجمہ:

بے شک اللہ نے آدمؑ، نوحؑ اور آل ابراہیمؑ و آل عمران کو پورے جہان سے چن لیا ہے (۳۳) وہ اولاد تھے ایک دوسری کی۔ اور اللہ سننے اور علم رکھنے والا ہے (۳۴)

تفسیر:

۳۳- اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ ۔۔۔۔۔

مفسرین کے بقول ان آیتوں کا نزول وفد نجران کے ذیل میں ہوا۔ یعنی نصاریٰ کے مذہبی لیڈروں کے خیالات پر گفتگو ان آیتوں کا پس منظر ہے۔

نجران، حجاز و یمن کے درمیان بہتر بستیوں کا علاقہ جہاں کی آبادی عیسائی اور تقریباً ایک لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھی۔ تین سرداران کے حکمران۔ عاقب، جو حاکم و سردار تھا، دوسرا "سید" جو تمدنی و سیاسی امور کی ذمہ داری رکھتا تھا۔ تیسرا "اسقف" ۔ بشپ تھا۔

فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں نجران سے ایک وفد تینوں سرداروں کے ہمراہ سرور دو عالمؐ کے حضور حاضر ہوا۔ قرآن میں جو کچھ ہے اس سے وفد کی ملاقاتوں میں مذہبی امور پر گفتگو اور اسلام کا موقف عیسائیت کے بارے میں واضح ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ عیسائیان نجران جو کبھی کعبہ ڈھانے اور متقابل بڑا چرچ بنانے کی سوچا کرتے تھے، وہ بڑی شان و شوکت سے تو آئے مگر گردن جھکائے اور صلح پر آمادہ رہے۔

بات آدم و نوح و ابراہیم علیہم السلام سے شروع ہوتی ہے کہ ان پر عیسائی و موسائی بھی متفق ہیں۔ اللہ نے کہا: ہم نے کائنات سے آدمؑ و نوحؑ کو چنا۔ پھر آل ابراہیمؑ اور آل عمران کا انتخاب کیا

اسی آخری کلمہ پر سورے کا نام آل عمران قرار پایا - آدمؑ و نوحؑ پر سب کا اتفاق ہے، ابراہیمؑ کو بھی سب مانتے ہیں تو اسلام ان سب کا پیام ہے - ابراہیمؑ کی آل میں اسحاقؑ کو لے کر بنی اسرائیل الگ ہو گئے اور اسماعیلؑ کو چھوڑ گئے پھر عمران کی اولاد میں عیسیٰ ہوئے، قرآن ان کو بھی منتخب و سردار دینی قرار دیتا ہے۔

۳۴- ذریۃ بعضھا .....

آل ابراہیمؑ و آل عمران ایک ہی دادا کی اولاد ہیں، بنی اسرائیل یا کسی کو ان کے نہ ماننے کا جواز کیا ہے اسماعیلؑ نے کعبہ بنایا ابراہیمؑ کا ہاتھ بٹایا، ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ پروردگارا! میری ذریت کو بھی امامت دے، میں نے وعدہ کیا تھا کہ "غیر ظالم" افرادِ ذریت کو منصب دوں گا، یہ محمدؐ اسی ابراہیمؑ و اسماعیلؑ علیہما السلام کی آل ہیں، جیسے عیسیٰ عمران کی آل ہیں - یہ خاندانی اعزاز ہم نے بخشا - یہ سب ایک ہی دین کے داعی اور ایک ہی راہ کے امام ہیں -

یاد رہے کہ اسی ضمن میں آل محمدؐ کا انتخاب اور ان کی بڑائی کا مظاہرہ ہونے والا ہے (آیت / ۶۱ و نیز النساء آیت / ۳۳ و ۳۴)

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ
مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ●
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ
بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ
وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ●
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا
زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ
عِندَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ

عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ۞

ترجمہ:
(وہ تاریخ یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے اللہ سے دعا کی: اے رب! میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے اسے میں تیری نذر کرتی ہوں وہ "محرّر" ہوگا، تو، میری نذر قبول فرما! بے شک تو سمیع وعلیم ہے (۳۵) پھر جب اسے جنا۔ کہنے لگیں۔ میں نے تو یہ لڑکی جنی ہے! اور اللہ تو خوب جانتا ہے کہ اس نے کیا جنا۔ اور لڑکا، لڑکی جیسا تو نہیں ہوتا۔ اور میں نے اس کا نام "مریم" رکھا۔ اور میں اس کو اور اس کی ذرّیت کو مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں (۳۶) تو اس کے پروردگار نے اسے حسن قبول کے ساتھ قبول کر لیا اور اس کی نشو ونما اچھی طرح کی۔ اور زکریا کو (اللہ نے) مریم کا کفیل بنایا جب بھی زکریا اس کے پاس محراب میں آتے (تو) اس کے پاس کھانا موجود پاتے۔ پوچھتے، مریم، تمہارے پاس یہ کہاں سے آتا ہے؟ وہ کہتیں: یہ، اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ بے شک، اللہ، جسے چاہے بے حساب روزی دیتا ہے (۳۷)

تفسیر:

۳۵۔ اذ قالت امرأۃ عمران ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورت کا مرتبہ اور فضائل عیسیٰ کا بیان دیکھیے، حضرت عمرانؑ کی بیوی (بقول امام صادقؑ حنہ) بڑی متقی اور خدا دوست تھیں، زمانۂ حمل میں اولاد کو خدمتِ دین کے لئے وقف کرنے کی آرزو کا انعام پایا کہ قرآن میں تذکرہ آیا اور مسلمان خواتین کو انداز فکر اور اولاد کی مثال سمجھائی گئی۔ زوجۂ عمران نے خدا سے عہد کیا " ان کے شکم میں جو بھی ہے پیدا ہونے کے بعد اسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گی۔

۳۶۔ فلما وضعتھا قالت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہر عورت کی خواہش کے مطابق حنہ بھی سوچتی ہوں گی "اللہ لڑکا دے گا"۔ خدا کی قدرت ــــ پیدا ہوئی لڑکی، حنہ کو ذرا دھچکا سا لگا۔ مگر نیت نہ بدلی۔ صرف اتنا عرض کیا۔ لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہوتے

"محرّر" ۔ ہر ذمہ داری سے آزاد مرد جس طرح دین کی خدمت کر سکتا ہے، عورت کہاں کر سکے گی؟ اس کے باوجود "ام مریم" نے نذر پوری کی ۔ لڑکی کا نام "مریم" رکھا، جس کے معنی ہیں "عابدہ خاتون"۔ پھر دل کی گہرائی سے دعا کی ـــ یااللہ! اسے اور اس کے بچوں کو (جب بھی ہوں) شیطان کے شر سے بچانا، اسے معصوم بنانا اس کی اولاد کو عصمت دینا ۔

یہ دعا اور اس میں " ذریت " کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا یاد دلاتا ہے ۔ اور" اولاد در اولاد " کے معنی معین کرتا ہے ۔ جیسے آل عمران سے بیٹی اور نواسے کے معنی عیاں ہیں ۔

۳۷ - فتقبلها ربها بقبول حسن . . . . . .

حنہ کی نذر قبول ہوئی ۔ اللہ نے مریم کو ہر مرد سے زیادہ محترم خدمت گزار بیت المقدس کے طور پر قبول کیا ۔ اس معصومہ کی پرورش کے لیے قدرت نے اپنے پسندیدہ بندے حضرت زکریا کو منتخب کیا (دیکھئے آیت ۴۴) جناب زکریا نے مریم کے سمجھ دار ہونے پر بیت المقدس کا ایک حجرہ عبادت کے لئے مخصوص کر دیا ۔

مادر مریم کی فکر بلند کا تذکرہ کرنے کے بعد، حضرت مریمؑ کی زندگی کا ابتدائی دور بیان کرنے کے بجائے صرف مریم کی محبوبیت و تقریب اور اپنے انعام کی یاد دلائی ۔

مریم خدمت بیت المقدس کرتی اور حجرۂ عبادت میں سرگرم یاد خدا رہتی تھیں، زکریاؑ، آتے اور رنگارنگ نعمتیں دیکھ کر دنگ ہو کر پوچھتے تھے، مریم! یہ کہاں سے آیا؟ مریم، جواب میں کہتی تھیں ۔ بے حساب روزی رساں معبود کے یہاں سے آتا ہے یہ جنت کے میوے اور کھانے ہیں اور بے موسم کے پھل ۔

هُنَالِكَ
دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً
طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ
قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ
وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝

اس موقع پر زکریا نے اپنے رب سے دعا کی۔ کہا: پروردگار، مجھے اپنی بارگاہ سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے (۳۸) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، جو ملائکہ نے انھیں ندا دی۔ اللہ، آپ کو یحیٰی کی خوشخبری دیتا ہے، وہ کلمہ "اللہ" کی تصدیق کرنے والے اور سردار اور جنسی خواہشات سے دور، اور صالحین میں سے نبی ہوگا (۳۹) زکریا نے عرض کیا، پروردگار! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوگا۔ حالانکہ میرا بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری زوجہ بانجھ ہے۔ (اللہ نے) فرمایا: اللہ، اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (۴۰)

تفسیر:

۳۸ - ھنالك دعا زکریا ......

جناب زکریا نے، خدا کے حضور، مریمؑ کا مرتبہ دیکھ کر اپنی محنت و پرورش کا پھل پایا اور جیسے حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تکمیل و تجدید کے موقعہ کو قبول دعا کا لمحہ سمجھا تھا ویسے ہی حضرت زکریاؑ نے سوچا جو اللہ، مریمؑ کو بے موسم کے پھل دے رہا ہے وہ مجھ بوڑھے کو اولاد کا میوہ بھی دے سکتا ہے، لہٰذا انہوں نے "ذریت طیبۃ" کی دعا کر دی۔

۳۹ - فنادتہ الملٰئکۃ وھو قائم ....

حضرت زکریاؑ کو عین نماز کی حالت میں نہ صرف فرزند عطا کرنے کی نوید دی گئی بلکہ قبل از ولادت ان کا نام اور سب سے اہم ذمہ داری بتائی گئی یعنی وہ اولوا العزم رسول، عیسیٰؑ کی خبر آمد دیں گے۔ اعلان رسالت کریں گے تو یحیٰی ان کی تائید کریں گے اور یہ تائید و گواہی معمولی نہیں، ایک قائد، ایک زاہد بے مثال اور

نبی معصوم و صالح کی گواہی ہوگی۔

"یحییٰ" نام کی اہمیت کے لئے اور ان کی ولادت سے حضرت عیسیٰ کا استدلالی ربط سورۂ مریم کے آغاز میں دیکھئے۔ اور "کلمۃ من اللہ" کے معنی حضرت عیسیٰ کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۱۷۱ ——— اور آل عمران کی آیت ۴۴ —

۴۰۔ قال ربِّ انّٰی یکون لی غلام ....

جناب ذکریاؑ نے ایک سوال حل کرانا چاہا۔ بھلا بانجھ عورت اور بوڑھے کھوسٹ کے یہاں بچہ ہوسکتا ہے؟ فزیکلی ناممکن بات ہے۔ اللہ نے جواب دیا۔ آدمؑ کو بے ماں باپ کے پیدا کیا، تمہارا بیٹا عام تجربوں کے برخلاف پیدا ہوگا، یہ تمہید ہے عیسیٰؑ کے وجود پذیر ہونے کی۔ اللہ ہر چیز پر قادر و مختار ہے جو اسے مانتا ہے وہ چون و چرا کیسے کرسکتا ہے۔ یہ سوال وہاں ہوسکتا ہے جہاں قوانینِ طبعیت کی پابندیاں ہوں، وہ تو خالق کل ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

ترجمہ:

(ذکریاؑ نے) عرض کی: پروردگار! میرے لئے ایک نشانی مقرر کردے، اللہ نے فرمایا: تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تین دن اشارے کے علاوہ بات نہ کہہ سکوگے۔ اور اپنے رب کا شام اور صبح زیادہ (سے زیادہ) ذکر کرنا۔ (۴۱)

تفسیر

جیسے حضرت ابراھیمؑ نے مردے کو زندہ کرنے کی دعا مانگی تھی کہ اطمینانِ قلب و عین الیقین میں کمال حاصل کریں اسی طرح جناب ذکریاؑ کے دل سے صدا نکلی تاکہ قدرت مطلقہ کا یہ کرشمہ بھی دیکھ لیں۔

یہ کیسے ہوگا کہ قوتِ باہ اور طاقتِ حمل نہ رکھنے والوں کے یہاں بچہ ہو جائے۔ اشارہ ہوا کہ جب تین دن تک تم ذکرِ خدا کے علاوہ کچھ نہ بول سکو گے اس وقت میری آیت و معجزہ نمائی دیکھنا کہ استقرارِ حمل کا تعین ہو جائے گا۔ بس ذکرِ خدا صبح و شام جاری رکھو اس سے اطمینانِ قلب حاصل ہوگا۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۝ ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْہِ اِلَیْکَ ؕ وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ ۠ وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۝

ترجمہ:

اور وہ واقعہ جب ملائکہ نے کہا: اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا اور پاک کر دیا اور پوری دنیا کی عورتوں میں سے تم کو منتخب کیا (۴۲) اے مریم! اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ بجالاؤ، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع (۴۳) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو بھیجتے ہیں۔ اور تم ان کے پاس نہ تھے، جب انھوں نے اپنے اپنے قلم (قرعہ کے لئے) ڈالے، کہ ان میں سے مریم کی نگہداشت (کفالت) کون کرے، اور نہ تم اس وقت ان کے پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑا کر رہے تھے (۴۴)

تفسیر

۴۲ - واذ قالت الملائکۃ . . . . . .

حضرت زکریا کی دعا اور قبولیت کی بات حضرت مریم و مسیح کے اظہارِ شرف کا ایک پہلو

اور واقعات کے متعلق فوائد کے لئے تھی۔ اب مریم سلام اللہ علیہا کے شرف پر ایک اور نظر ہے۔ مریم سے ملائکہ ہم کلام ہوئے، وہ پیغمبر نہیں تھیں مگر اللہ نے انہیں بیت المقدس کی خدمت کے لئے منتخب فرمایا (یہ بہت بڑا مرتبہ ہے) انہیں ظاہری و باطنی طہارت عطا فرمائی پھر انہیں کلمۃ اللہ" کا امین اور مس بشر کے بغیر روح اللہ کی ماں بننے کا شرف بخشا۔

احادیث فریقین کی روشنی میں سب کا اتفاق ہے کہ اولین و آخرین میں نسوان عالم کی سردار حضرت فاطمہ زہرا ہیں اور مریم اپنے عہد کی عورتوں پر برتری رکھتی تھیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل فرمائی ہے: اما مریم کانت سیدۃ نساء زمانھا، اما فاطمۃ فھی سیدۃ نساء العالمین من الاولین والآخرین۔

علامہ اقبال نے مثنوی اسرار و رموز میں کہا:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز	از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمۃ للعالمین	آن امام اولین و آخرین
بانوے آن تاجدار ہل اتیٰ	مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
مادر آن مرکز پرکار عشق!	مادر آن کاروان سالار عشق
آن یکی شمع شبستان حرم	حافظ جمعیت خیر الامم
وان دگر مولائے ابرار جہاں	قوت بازوئے احرار جہاں

۴۳۔ یامریم اقنتی لربك . . . . .

ملائکہ نے انتخاب و طہارت و اصطفا کی خبر دینے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ طبقہ نسواں میں وحی و اصطفا و طہارت کا مرتبۂ بلند ملنے پر عبادت میں سرگرمی بڑھتی رہنا چاہئے۔ قیام و سجود و رکوع کے آداب بجا لاتی رہو رکوع کے معنی نماز بھی مراد لئے گئے ہیں اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا مطلب ہے کہ جیسے رکوع کرنے والے رکوع کرتے ہیں، اسی طرح تم بھی سجدہ ریز و رکوع گزار رہو۔

۴۴۔ ذالك من انباء الغیب نوحیه . . . . .

حضرت مریم بطور نذر قبول ہو چکیں، تو آل عمران کے اس اعزاز میں حصہ لینے کے لئے، خاندان در بیت المقدس کے عہدیداروں میں یہ بحث شدت پکڑ گئی کہ مریم کی پرورش کون کرے؟ جب کوئی

فیصلہ نہ ہو سکا تو بات قرعہ پر ٹھہری اور رسم کے مطابق ہر ایک نے ایک ایک قلم پانی میں ڈالا، حضرت زکریاؑ کا قلم نہ ڈوبا تو وہی کفیل مریم قرار پائے۔ حضرت زکریاؑ نبی معصوم اور حضرت مریم کے خالو تھے۔ اس طرح گھر کا شرف گھر ہی میں رہا۔

واقعات کا یہ سلسلہ اس وقت ہوا جب حضرت رسالت مآبؐ تشریف نہ رکھتے تھے، اس بنا پر یہ بیان اور اس کی لطافت و پاکیزگی و ہدایت آفرینی وحی کا ثبوت اور نبوت ختم الرسلؐ کا معجزہ ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ
النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ
رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ
يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَ
رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ
اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ
طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ● إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ●

ترجمہ:

اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے کہا: اے مریم! اللہ تم کو اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم" دنیا و آخرت میں آبرومند اور مقربین الٰہی میں ہوگا (۴۵) اور لوگوں سے گہوارے میں اور بڑی عمر پاکر (بھی) گفتگو کرے گا اور صالحین میں ہوگا۔ (۴۶) مریم نے عرض کی: میرے بچہ کہاں سے ہوجائے گا۔ حالانکہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا: اللہ جسے چاہتا ہے یونہی پیدا کر دیتا ہے۔ جب وہ معاملے کو طے کر دے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ فرما دے "ہو" اور وہ ہوجائے (۴۷) اور اللہ اس کو کتاب وحکمت اور تورات و انجیل کا علم دے گا۔ (۴۸) اور بنی اسرائیل کا رسول قرار دے گا۔ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس معجزے کے ساتھ آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے گندھی مٹی سے جانور کی شکل بناتا پھر اس میں دم کرتا ہوں پھر وہ اللہ کے حکم سے اڑنے لگے گا۔ اور میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور مردے کو زندہ کردوں گا، اللہ کے حکم سے اور میں تمہیں جو کھایا ہے اور جو گھروں میں جمع کیا ہے وہ بتادوں گا۔ اس میں تمہارے لیے دلیل ہے اگر تم ایمان قبول کرتے ہو (۴۹) اور تصدیق (تائید) کرتا ہوں جو میرے سامنے ہے۔ تورات۔ اور (میرے آنے کا سبب یہ ہے کہ) میں (حکم خدا سے) حلال کر دوں بعض ایسی چیزیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں اور میں تمہارے سامنے تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (۵۰) بے شک اللہ، میرا رب ہے

اور تمہارا بھی (وہی) رب ہے تو اسی کی عبادت کرو۔ یہ ہے صراط مستقیم (۵۱)

تفسیر:

۴۵۔ اذقالت الملائکۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فرشتوں نے مریمؑ کو بشارت فرزند دی، مگر قرآن کی عظمت دیکھئے کہ اس نے کرامت مریمؑ کے لئے فرزند کی جگہ "کلمۃ منہ" کہا ہے۔ "مسیح عیسیٰؑ" کلمۃ اللہ ہیں، تکوینی طور پر کہ کن فیکونؑ سے بغیر پدر خلق ہوئے۔ یا حامل کلام اللہ ہونے کی بنا پر۔ یا، ان کا وجود و ظہور کتب سابقہ کی بشارتوں کا مظہر تھا اس کے بعد عیسیٰؑ ابن مریم ہیں انہیں "ابن اللہ" کہنا کس قدر غلط اور آبرو مندو مقرب خدا عیسیٰ کی کتنی بڑی توہین ہے؟

۴۶۔ ویکلم الناس فی المھد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ پختہ عمر تک پہنچیں گے۔ ان کی دعوت کا آغاز، گہوارے سے ہوگا اور بڑھاپے تک وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے رہیں گے۔

۴۷۔ قالت ربّ انی یکون لی غلام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نظام تخلیق بشر بظاہر تو زن و مرد کے ذریعہ ہی قائم ہے۔ اسی لیے لوگوں کو شبہ ہوگا۔ بن باپ کے بچہ کیسے؟ مولانا فرمان علی کہتے ہیں کہ "میں اس حیرت میں ہوں کہ خود ماں باپ دونوں سے مل کر کیوں کر پیدا ہوئے۔ اگر وہ (نیچری و نصاریٰ) کہیں کہ دونوں نطفوں کا مل جانا پیدائش کا سبب ہے، تو آخر سیکڑوں ہزاروں نطفے روزانہ بیکار کیوں جاتے ہیں؟ انسان، جب جماع کرے تو نطفہ کیوں منعقد نہیں ہوتا اور سیکڑوں بے اولاد کیوں رہ جاتے ہیں۔ آخر اس میں اثر کس نے دیا کہ کہیں ہوا کہیں نہ ہوا" اور اس سے بڑھ کر سات آیتوں سے پہلے بے قوت باہ اور بانجھ عورت کی بات ہو چکی، اللہ نے اسباب منقطع ہونے کے بعد اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا۔ یوں ہی اگر مریم کو مرد نے نہ چھوا تو کیا ہوا؟ ہماری قدرت کا ایک مظہر یہ بھی دیکھ لو۔

تخلیق عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اسلام کے اس موقف کا مقابلہ عیسائی داستانوں سے کر کے دیکھ لو۔

۴۸۔ ویعلمہ الکتاب والحکمۃ ....

مریم سے خطاب اور قوموں کو اطلاع ہے۔ عیسیٰؑ کو اللہ، کتاب وحکمت، تورات وانجیل کا علم دے کر بھیجے گا۔ یعنی یہی نہیں کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوں گے، بلکہ وہ جھولے میں بات کریں گے، عالم کتب وحکمت الٰہیہ بن کر دنیا میں آئیں گے (دیکھئے سورۂ مریم) اللہ جسے چاہتا ہے کمال عطا کرتا ہے۔

۴۹۔ ورسولاً الیٰ بنی اسرائیل .....

وہ اسرائیلیوں کے رسول ہوں گے، وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں تقاضائے زمانہ کے مطابق معجزے دکھائیں گے۔ بحکم خدا مٹی کا پرندہ بنا کر، دم کر کے قوتِ پرواز بخشیں گے۔ مادرزاد نابینا اور برص جس کا علاج لوگ نہ کرسکیں گے ایسے ہاتھ سے مس کر کے بینا وحسین بنا دیں گے۔ مردے کو زندہ کر دکھائیں گے۔ وہ تمہارے اندر باہر کی بات بتائیں گے۔ مگر دیکھنا ہے کہ ایمان کون لاتا ہے۔

۵۰۔ ومصدقاً لما بین یدیّ ......

عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام انہیں سمجھائیں گے، تم لوگ یہ دیکھو میں آسمانی کتاب کی تائید کر رہا ہوں، اللہ کے حلال وحرام پہنچا رہا ہوں۔ اس کے بعد کہتا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرو۔ اور میرے تعلیمات کے پابند رہو۔

۵۱۔ انّ اللہ ربّی وربکم ......

سورۂ فاتحہ کے چار بنیادی نکتے ایک آیت میں آگئے، یہ معجزہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ "صراطِ مستقیم" کے داعی تھے لہٰذا ان کا پیام یہ تھا کہ "اللہ" ہمارا تمہارا رب ہے، صرف اسی وحدہ لاشریک کی عبادت ہی صراطِ مستقیم ہے۔ بھلا بتاؤ، عیسیٰؑ نے اپنی ابنیت کا دعویٰ کہاں کیا اور اپنی عبادت کی دعوت کب دی۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ
اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۞ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۞ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۞

ترجمہ:

پھر جب عیسیٰؑ نے ان لوگوں کا کفر معلوم کر لیا، تو کہا: اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ اور ہم اللہ پر ایمان لائے۔ اور آپ گواہ رہیں کہ ہم فرماں بردار (مسلمان) ہیں (۵۲) اے ہمارے رب! جو بھی تو نے نازل کیا، ہم اس پر ایمان لائے اور رسول کی پیروی کی تو ہمیں (حق کے) گواہوں کے ساتھ لکھ لینا (۵۳) اور ان یہودیوں نے ایک منصوبہ بنایا پھر اللہ نے بھی منصوبہ بنایا اور اللہ بہترین مدبر ہے (۵۴)

تفسیر:

۵۲۔ فلما احس عیسیٰؑ ....

حضرت عیسیٰ کو بنی اسرائیل کے انکار سے بڑھ کر کفر کا تعین ہو گیا اور ان کو حق کے مٹانے پر کمربستہ دیکھ لیا، تو مخلص و جاں باز ساتھیوں کی تلاش شروع کی۔ آخر انہیں " انصار اللہ" کی ایک چھوٹی سی جماعت مل گئی۔ قرآن نے انہیں "حواری" کہا ہے۔ حواریوں نے اللہ سے وعدہ کیا اور حضرت عیسیٰؑ کو اپنے ایمان و تائید کا تعین دلا دیا، روح اللہ علیہ السلام نے اس مختصری جماعت کو اپنے پیغام کا امین بنا کر عزت بخشی۔

۵۳۔ ربنا آمنا بما انزلت ....

انہوں نے اللہ سے عہد میں کہا کہ ہم تورات کے بعد انجیل کو مانتے ہیں، عیسیٰؑ رسول کی پیروی کرتے ہیں، ہم حق کے گواہ اور کفر بنی اسرائیل کے شاہد ہیں۔ لہٰذا ہمارا نام ان لوگوں کی فہرست میں درج فرما، جو تیری بارگاہ میں "شاهد" کے نام سے معزز ہیں۔

۵۴ - ومکروا ومکر اللہ . . . .

مکر : صَرفُ الغَیرِ عَمّا یَقصِدُہٗ ، یعنی کسی کو اس کے مقصد سے روکنے کی کوشش -

حضرت روح اللہ نے احکام الٰہی کی تبلیغ کے ساتھ رسولِ آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر دی - معجزے دکھائے نرمی کا بے مثال سلوک کیا مگر یہودی زمانے ان کو طرح طرح کے دکھ دیئے ان کے خلاف منصوبے بنائے - آخر جان کے درپے ہوئے ، اللہ نے سب منصوبے خاک میں ملا دیئے -

یہودیوں نے انھیں قتل کرنا چاہا - اللہ نے انھیں آسمان پر اٹھالیا - یہودی فلک کے درپے ہے اللہ نے انھیں بقا عطا کی ، اب وہ قربِ قیامت آسمان سے اتریں گے ، دینِ محمدی کی تصدیق کریں گے اور حضرتِ ولی عصر کے پیچھے نماز ادا کریں گے - یہ ہے یہودیوں کے مکر و منصوبے کا جواب - نجران کے نصرانیوں ، یہ ہے ہمارا پاک عقیدہ -

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ
مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَاللّٰهُ
لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ

وَالذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ ۝

ترجمہ:

وہ دن یاد کرو۔ جب اللہ نے فرمایا، اے عیسیٰؑ تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور کافر لوگوں سے پاک کردوں گا۔ اور تمہارے پیروؤں کو کافروں پر قیامت تک برتر قرار دوں گا۔ پھر تم سب کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ تب جو بھی تمہارے درمیان اختلاف ہوں گے ان کا فیصلہ کروں گا (۵۵) تو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کو اللہ سخت ترین عذاب کرے گا دنیا و آخرت (دونوں) میں اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا (۵۶) اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے ان کو اللہ پورا اجر و ثواب دے گا اور اللہ بے انصاف لوگوں کو پسند نہیں کرتا (۵۷) یہ جو ہم تمہارے لیئے بیان کررہے ہیں حق کی نشانیاں اور حکیمانہ یاد دہانی ہے (۵۸)

تفسیر:۔

۵۵۔ اذ قال اللّٰہ یا عیسیٰ ....

حیاتِ مسیح

مُتَوَفِّیْ: واپس لینے والا۔ لفیف مفروق ہے اور باب تفعّل سے ہے۔ توفّی کے معنیٰ ہیں، تمام و کمال لے لینا۔ استیفا۔ "فامسکوھن فی البیوت حتیٰ یتوفاھن الموت .... " (النساء/۱۵) ان عورتوں کو گھروں میں روکے رہو، یہاں تک موت انہیں اٹھائے۔ فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم " (مائدہ/۱۱۷) پھر جب تو مجھے اٹھائے گا تو تو ہی ان کا نگہبان ہوگا۔" وھو الذی یتوفاکم باللیل .... (انعام/۶۰) وہی ہے جو تم کو گرفت میں لے لیتا ہے رات کو۔ سورۃ النساء میں توفّی کی خبر "رفعہ اللّٰہ" کے لفظوں میں دے کر مزید توضیح فرمادی ہے۔

یہودیوں کی عادت تھی کہ انبیاء سے لڑتے اور انہیں قتل کرتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی انہوں نے ایسا ہی منصوبہ بنایا، اللہ نے انہیں رسوا کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کو اطمینان دلایا اور سب کو اطلاع دی کہ ہم عیسیٰؑ کے دشمنوں کی تدبیر ناکام بنا دیں گے عیسیٰؑ کو زندہ اٹھالیں گے اور اپنی بارگاہ میں قیامت تک زندہ رکھیں گے اور تمہارے پیرو کاروں (کل کے مسیحی اور آج کے مسلمان) ان کو یہودیوں پر برتری دیں گے قیامت تک۔ قیامت سے پہلے زمین پر جاؤ گے پھر آخری بازگشت میرے حضور میں ہوگی وہاں سب ہوں گے اور حق و باطل کی نزاع ہم فیصل کریں گے۔
دیکھیے النساء، آیت ایک سو ستاون، اٹھاون، نیز ہماری کتاب "آخری تاجدار امت"

۵۶ - فاما الذین کفروا فاعذبهم .....

کافروں کو دنیا و آخرت میں سخت سزا ملے گی اور ان کی مدد و سفارش کرنے والا کوئی نہیں ہوگا جو نبی کا منکر ہوگا وہ شفاعت سے محروم رہے گا۔

۵۷ - واما الذین امنوا وعملوا الصالحات ....

ظالم و بے انصاف لوگ مجرم ہیں اور اللہ عادل ہے۔ اس لیے صحیح العقیدہ اور صحیح العمل لوگوں کے صلے اور بدلے میں کسی کمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔

۵۸ - ذالك نتلوه علیك ......

انبیاء کے یہ واقعات اور ہدایت کے یہ نکات، قرآن حکیم کی برحق آیتیں ہیں ان کا مقصد اہل کتاب کی غلط کہانیوں کی تردید اور انبیاء پر افترا پردازیوں کے پردے چاک کر کے حقائق سے آگاہ کرنا ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ
خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ● اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ
فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ●

ترجمہ:

بے شک، عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدم کی مثال، اسے مٹی سے خلق کیا، پھر کہا "ہوجاؤ" وہ ہو گیا (۵۹) حق (بات) تمہارے رب کی

طرف سے (بتائی جاتی) ہے تو شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (۶۰)

تفسیر:-

۵۹۔ ان مثل عیسٰی عند اللہ . . . . .

عیسٰیؑ کے بارے میں گہوارے میں بات کرنا مسلم ہے۔ انھوں نے اللہ کا بندہ، رسول خدا اور صاحب کتاب ہونے کا دعویٰ کیا۔ رب نے مانا عیسٰیؑ بندے تھے، مگر مردے کو حکم خدا سے زندہ کرتے تھے؟ مٹی کی چڑیا بنا کر اس میں پھونکتے تھے وہ مٹی کا کھلونا پرندہ بن کر اڑتا تھا؟ زکریاؑ کی عاجزی اور ان کی اہلیہ کے بانجھ ہونے کے باوجود، یحیٰیؑ پیدا ہوئے؟ ان باتوں کو مانتے ہو۔ مگر عیسٰیؑ بن باپ کے پیدا ہوئے، یہ نہیں مانتے، تو اپنے جدّ آدم کو دیکھو، بس جیسے اللہ نے ان کو پیدا کیا اسی طرح اپنی قدرت کاملہ سے عیسٰیؑ کو پیدا کر دیا، ایک کو مٹی سے بنایا دوسرے کو شکم مادر میں خلق کیا۔ دونوں میں اس نے اپنی قدرت کا مظاہرہ فرمایا۔ اس میں نہ ماننے کی بات کیا ہے۔

۶۰۔ الحق من ربک فلا تکن . . . . . .

من گھڑت افسانے جھوٹے ہیں اور اللہ کی وحی یہی ہے اسی پر یقین رکھنا چاہئے اور شک سے دور رہنا ضروری ہے ورنہ بات کفر والحاد تک پہنچے گی اور انکار خدا کی بات انسانیت کے خلاف اور بندگی کے منافی ہے۔



جناب محمد تقی مصباح
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

معارف قرآن

قرآن کا زبان عربی میں نازل ہونا:۔

قرآن سے متعلق ایک موضوع اس کا عربی زبان میں نازل ہونا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"نزل به الروح الامین علیٰ قلبك لتكون من المنذرین بلسان عربی مبین" (شعراء/۱۹۳ تا ۱۹۵)

(خدا نے) روح الامین (جبرئیل) کے ذریعہ صاف عربی زبان میں اس (قرآن) کو تمہارے قلب پر اتارا ہے تاکہ (اس کے حکمت آفریں پیغامات کے ذریعہ) لوگوں کو (خدا کے عذاب) سے ڈراؤ۔

انا جعلناه قرآناً عربیاً لعلكم تعقلون (زخرف/۳)

ہم نے قرآن کو فصیح عربی زبان میں قرار دیا تاکہ تم (بندگان خدا) اس کے سمجھنے میں عقل و فکر سے کام لو۔

فانما یسرناه بلسانك لعلهم یتذكرون (دخان/۵۸)

ہم نے (اس قرآن کو) تمہاری زبان میں آسان کر دیا تاکہ اس کے حقائق کا اعتراف کر سکو۔

وكذلك اوحینا الیك قرآناً عربیاً لتنذر ام القریٰ ومن حولها... (شوریٰ/۷)

اور اس طرح ہم نے عربی زبان میں قرآن تم پر وحی کیا کہ تم اہل مکہ کو اور جو لوگ اس کے ارد گرد آباد ہیں ان کو (خدا کا) خوف دلاؤ۔

اس سلسلہ میں دوسری آیتیں بھی ہیں جو واضح طور سے اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ پر تلاوت و قرائت و وحی کی صورت میں نازل کی جانے والی کتاب زبان عربی میں نازل کی گئی ہے :۔ سورۂ یوسف کی دوسری آیت، زمر کی ۲۸ ویں آیت، فصلت کی تیسری اور ۴۴ ویں آیتیں، طٰہٰ کی ۱۱۳ ویں، رعد کی ۲۷ ویں، احقاف کی ۱۲ ویں آیت، نحل کی آیت : ۱۰۳، شعراء کی آیت : ۱۹۸، مریم کی آیت : ۹۷ اور سورۂ ابراہیم کی آیت : ۴ اسی ضمن میں وارد ہوئی ہے ۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ آنحضورؐ پر محض معانئے قرآن وحی کر دیئے گئے ہوں اور پیغمبر اسلامؐ نے اس کو اپنی عربی زبان میں پیش کر دیا ہو یا یہ کہ نازل تو کسی اور زبان میں ہوا ہو اور پیغمبرؐ نے اس کو عربی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کر دیا ہو بلکہ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں لفظ بلفظ آپ پر نازل ہوا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

"انا انزلناہ قرآناً عربیاً" (یوسف/۲)

ہم نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا ۔

"انا جعلناہ قرآناً عربیاً" (زخرف/۳) ہم نے قرآن کو عربی زبان کا جامہ پہنایا ۔

"اوحینا الیک قرآناً عربیاً" (شوریٰ/۷)

ہم نے تمہاری طرف اس قرآن کی وحی کی جو عربی زبان میں ہے ۔

اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ایک عرب زبان پیغمبرؐ پر جو کتاب نازل کی جائے وہ عربی زبان میں ہی ہو جیسا کہ مندرجہ ذیل آیتوں میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے :۔

فانما یسّرناہ بلسانک .... (دخان/۵۸)

ہم نے تمہاری زبان میں اس (قرآن) کو آسان کر دیا ۔

"فانما یسّرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ قوماً لدّاً" (مریم/۹۷)

ہم نے تو محض اسی لئے تمہاری زبان میں (قرآنی حقائق) آسان کر کے پیش کئے کہ تم پرہیزگاروں کو بشارت دو اور جھگڑالو قوم کو (خدا کے عذاب سے) ڈراؤ ۔

ویسے اصولی طور پر کسی عرب زبان پیغمبر پر غیر عربی زبان میں قرآن کا نازل ہونا کسی اعتبار سے مناسب

بھی نہ ہوتا چنانچہ سورۂ فصلت میں خود قرآن کا اعلان ہے:

ولو جعلناه قرانا اعجميا لقالوا لولا فصلت اياته ءاعجمي وعربي (آیت/۴۴)

اور اگر ہم اس قرآن کو کسی غیر عرب زبان میں قرار دیتے تو یہ لوگ کہتے کیوں اس (کتاب) کی آیتیں مفصل و روشن (عربی زبان میں) نہیں آئیں (العجب) کیا ایک عجمی (غیر عرب) زبان میں عربی بولنے والے رسول پر کتاب نازل کی جاتی ہے۔

یہاں شاہد کے طور پر اس آیت سے اس احتمال کی بنیاد پر استفادہ کیا گیا ہے کہ "اعجمی" سے مراد ایک غیر عرب زبان اور "عربی" سے مراد خود پیغمبر اسلام کو لیا گیا ہو یعنی ایک غیر عربی زبان بولنے والے شخص سے بھلا کیا مناسبت رکھتی ہے؟ اگرچہ اس سلسلہ میں چند دیگر احتمالات بھی پائے جاتے ہیں:۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ "عربی" سے مراد وہ اہل عرب ہوں جن کے درمیان قرآن نازل ہوا ہے یعنی ایک غیر عرب زبان میں بھیجی جانے والی کتاب کا عرب زبان افراد سے کیا ربط و تعلق ہے؟

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "اعجمی" سے مراد فصاحت سے عاری زبان اور "عربی" سے مراد پیغمبر اسلام کی ذات مبارک ہو یعنی ایک پیغمبر جس کا تعلق فصحائے عرب سے ہے غیر فصیح زبان اس کے شایان شان نہیں۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ "اعجمی" سے مراد زبان غیر فصیح اور "عربی" سے مراد مخالفین قرآن ہوں یعنی فصاحت سے عاری کلام کا فصحائے عرب سے کیا ربط ہو سکتا ہے؟

چوتھا احتمال یہ بھی ہے کہ "اعجمی" سے غیر عربی اور "عربی" سے زبان عربی کو مراد لیا گیا ہو یعنی اگر قرآن کا ایک حصہ عربی زبان میں اور ایک حصہ کسی اور زبان میں نازل کیا جاتا تو لوگ کہتے کہ اس کتاب میں دو زبانیں مخلوط کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟

اسی طرح پانچواں احتمال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ "اعجمی" سے غیر فصیح اور عربی سے زبان فصیح مراد ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ زبان فصیح اور غیر فصیح کو کیوں مخلوط کر دیا گیا ہے؟

بہر حال یہ ایک فطری سی بات ہے کہ ایک پیغمبر جس قوم کے درمیان مبعوث ہوتا ہے اسی قوم کی زبان میں گفتگو بھی کرتا ہے اور خدا کی طرف سے جو کلام اس پر القا کیا جاتا ہے وہ وہاں کے لوگوں کی زبان میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف کی دوسری اور سورۂ زخرف کی تیسری آیتوں

میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

سورۂ شوریٰ کی ساتویں آیت میں بھی اسی نکتہ کی وضاحت ہے :۔

وکذالک اوحینا الیک قرآناً عربیاً لتنذر ام القریٰ ومن حولها۔

اور یہ دین الٰہی کا وہ کلی قاعدہ ہے جس کی طرف سورۂ ابراہیم کی چوتھی آیت میں یوں نشان دہی کی گئی ہے:

"وما ارسلنا من رسولٍ الا بلسان قومه لیبین لهم"

اور ہم نے کسی رسول کو (کسی قوم کے درمیان) نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ اسی قوم کی زبان میں ان کے درمیان (احکام الٰہی) بیان کرے۔

اور اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ پیغمبر اسلام ایک عالمی دین لیکر نہیں آئے تھے، کیوں کہ کسی بھی دوسری زبان کے انتخاب کے سلسلہ میں کوئی وجہ ترجیح نظر نہیں آتی۔ لیکن تبلیغ اسلام کے لئے زبان عربی کا انتخاب فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اس قاعدۂ کلی کے تحت ہے جو انبیاء کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مزید برآں اس انتخاب میں کچھ دوسری خصوصیات بھی مضمر ہیں منجملہ یہ کہ:

وہ افراد جو آغاز میں، دعوت اسلام سے شرفیاب ہوئے وہ اس اعجاز آمیز کلام کی بلاغت کو درک کر سکتے تھے کہ ایسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت سے بالاتر ہے ظاہر ہے اگر کسی دوسری زبان میں قرآن نازل ہوتا تو وہ اس کے مفہوم و معانی بھی نہ سمجھ سکتے چہ جائیکہ وہ اس اعجاز آفریں کلام کی فصاحت و بلاغت کو درک کر سکیں اور اس صورت میں ان کو للکارنے اور قرآن کے مانند کلام پیش کرنے کی دعوت کر کے ان کی عاجزی دنیا پر آشکار کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ بہت سے عرب اپنی قومی عصبیت کی بنا پر ایک غیر عرب رسولؐ اور ایک غیر عرب زبان میں پیش کی جانے والی کتاب کبھی بھی قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے اس صورت میں عربوں کے درمیان پیغمبر کے مبعوث کرنے میں جو حکمت تھی کبھی بھی بارآور نہ ہوتی اور شاید سورۂ مریم کی آیت ۹۷، میں " وتنذر به قوماً لدّاً " سے اسی بات کی طرف اشارہ مقصود ہو (اس حقیقت کے پیش نظر لدّ لفظ الدّ کی جمع ہے جس کے معنی جھگڑالو اور ضدی کے ہیں۔ اسی طرح سورہ شعراء کی آیت ۱۹۸ میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"ولو نزّلناه علیٰ بعض الاعجمین ۔ فقرأہ علیہم مّا کانوا بہ مومنین"

اور اگر ہم اس کتاب کو (جو عربی زبان میں ہے) کسی غیر عرب پر نازل کرتے اور وہ ان کے درمیان اس (عربی) کتاب کو پڑھتا تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔

اس آیت کے ذیل میں ایک دوسرے محتمل معنی کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ : اگر یہ قرآن اسی اعجازی شان کے ساتھ کسی غیر عرب پر نازل کیا جاتا (اور اس کی اعجازی شان مزید بڑھ جاتی پھر بھی یہ) کفار ایمان نہ لاتے۔

نزول قرآن کی کیفیت :۔

اس مقام پر نزول سے متعلق ایک اور بحث قابل ذکر ہے وہ یہ کہ خود قرآن کریم یا مطلق طور پر کسی بھی طرح کی وحی الٰہی کے نزول کا طریقہ کیا رہا ہے ؟ قرآن مجید میں نزول کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے :

- وانّہ لتنزیل رب العالمین ۔ نزل بہ الروح الامین ۔ علیٰ قلبک لتکون من المنذرین ۔ بلسان عربی مبین (شعراء/۱۹۲ تا ۱۹۴)
- "قل نزّلہ روح القدس من ربّک بالحق" (نحل/۱۰۲)
- قل من کان عدوّا لجبریل فانّہ نزّلہ علیٰ قلبک باذن اللہ (بقرہ/۹۷)

ان تینوں آیتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتوں میں بھی نزول قرآن کے طریقہ کار سے بحث کی گئی ہے ۔ سورۂ نجم آیت : ۴ تا ۶ ، سورۂ تکویر : ۱۹ تا ۲۱ ، الحاقۃ : ۴۰ تا ۴۳ ، عبس : ۱۱ تا ۱۶ اور سورۂ بیّنہ : ۱ تا ۳ ۔

درج ذیل آیتیں مطلق طور پر وحی کے نزول کی کیفیت بیان کرتی ہیں ۔

- عالم الغیب فلا یظھر علیٰ غیبہ احداً ۔ الّا من ارتضیٰ من رسولٍ فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً ۔ لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربّھم واحاط بما لدیھم

واحصیٰ کل شئی عدداً ۔ (سورۂ جن / ۲۶ تا ۲۸)

- وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورای حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم (شوریٰ/۵۱)
- رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق غافر/۱۵

اسی طرح سورۂ نحل کی دوسری آیت بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔ سورۂ غافر کی پندرہویں آیت میں انبیاء کی طرف وحی کرنے کو "القاء روح" سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورہ شوریٰ میں اسی چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے:۔

- "وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا" (آیت/۵۲)

مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ "روح" سے مراد قرآن کریم کو لیا گیا ہو۔

سورۂ نحل کی دوسری آیت (ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ) میں نزول روح "ملائکہ کے وسیلہ یا ان کی ہمراہی میں ہونا بیان کیا گیا ہے جبکہ سورۂ جن میں (آیت/۲۶ تا ۲۸) رسولوں پر وحی کا نازل ہونا ان کے اوپر غیب الٰہی کے آشکار کرنے کے عنوان سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم اپنے پیغامات وقت صدور سے لیکر عوام تک پہونچنے تک کی ہر منزل میں اپنے معین کردہ نگہبانوں اور محافظوں کے ذریعہ اس طرح محفوظ رکھتا ہے کہ وہ بغیر کسی تصرف اور شیطانی دخل اندازی کے صحیح وسالم طور پر لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جائے ۔ "لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم" ۔ گویا اس طرح وحی الٰہی جتنک تبلیغی منازل تک پہونچ نہیں جاتی ہر طرح کی آفتوں سے محفوظ و مامون رہتی ہے۔

سورۂ شوریٰ کی ۵۱ ویں آیت میں خداوند عالم کا انسانوں سے ہم کلام ہونا محض تین طریقوں میں منحصر قرار دیا گیا ہے:۔

(۱) براہ راست بلا واسطہ وحی کے ذریعہ (۲) پس پردہ گفتگو کے ذریعہ اور (۳) کسی وسیلے سے وحی کے ذریعہ ۔۔۔ اور جہاں تک قرآن کے نزول کا سوال ہے تمام آیات کو دیکھنے سے چند نکات سامنے آتے ہیں:

(۱) اس کے باوجود کہ پورا قرآن خود خداوند عالم کا کلام ہے (جیسا کہ عناوین قرآن کے ذیل میں ہم

ذکر کر چکے ہیں) خدا کے ان برگزیدہ نمائندوں اور مضبوط و توانا اعصاب و قویٰ کے مالک راست گفتاروں کا کلام بھی ہے، جو خدا کی نظر میں ایک خاص عظمت و مقام کے حامل تھے اور جن کو تمام فرشتوں پر یا بعض ملائکہ پر حاکم و فرمانروا بنایا گیا تھا چنانچہ سورۃ تکویر میں اعلان ہوتا ہے :-

انہ لقول رسول کریم - ذی قوۃ عند ذی العرش مکین - مطاع ثم امین - (آیت/۱۹ تا ۲۱)

بلاشبہ یہ (قرآن) رسول کریم (جبرئیل) کا کلام ہے جو مضبوط و توانا اور عرش کے مالک کی بارگاہ میں بلند رتبہ ہے - تمام فرشتوں کا سردار اور (وحی الٰہی کا) امین ہے)

اسی طرح سورۂ نجم کی آیات :-

ان ھو الا وحی یوحیٰ - علمہ شدید القویٰ - ذو مرۃ فاستویٰ (۴ تا ۶)

میں بظاہر "شدید القویٰ" سے مراد وہی فرشتۂ الٰہی ہے اور شاید حامل وحی فرشتہ کو شدید القویٰ اور مضبوط و توانا جیسی صفت سے یاد کرنے کی وجہ یہی ہو کہ ان شیاطین کے مقابلہ میں مغلوب ہونے کا احتمال بھی نہ پیدا ہو جو وحی الٰہی میں کس طرح کا بھی تصرف کرنے پر ابھاریں چنانچہ 'امین' کی صفت ان کی طرف سے 'وحی' میں خیانت کے امکان کو ختم کر دیتی ہے -

(۲)- قرآن کریم لانے والے یا اس سلسلہ میں ذریعہ و واسطہ بننے والے کو سورۂ بقرہ (آیت/۹۷) میں جبرئیل کے نام سے یاد کیا گیا ہے جبکہ سورۂ شعراء (آیت/۱۹۲ تا ۱۹۵) میں روح الامین، کے لقب سے اور سورۂ نحل (آیت/۱۰۲) میں روح القدس کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے چنانچہ جب ان آیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تطبیق کرتے ہیں، خاص طور پر اسی شباہت کے پیش نظر جو ان دونوں تعبیروں: "نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک" اور "لجبریل فانہ نزلہ علیٰ قلبک" میں پائی جاتی ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ روح الامین اور روح القدس بھی جناب جبرئیل امین کے القاب میں سے ہے - (اگرچہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ القاب جبرئیل سے ہی مخصوص ہیں اور کوئی دوسرا فرشتہ یا کوئی دوسری مخلوق اس لقب سے یاد نہیں کی جاسکتی) سورۂ تکویر کی ۱۹ ویں آیت میں اور شاید سورۂ الحاقہ کی چالیسویں آیت میں بھی حامل وحی کو ہی رسول کریم کے عنوان سے بھی یاد کیا گیا ہے -

اور اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ قرآن کریم میں "وحی" کو "روح" کے نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن میں لفظ روح مشترک لفظی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو اس کا روحِ انسانی پر اطلاق ہوا ہے: "ونفخت فیہ من روحی" (سورۂ حجر: ۲۹) اور دوسری طرف سورۂ قدر میں "الملائکۃ" پر عطف کرتے ہوئے "الروح" کا استعمال بظاہر کرتا ہے کہ شاید اس سے مراد کوئی دوسری مخلوق ہو: "تنزل الملائکۃ والروح..." چنانچہ بعض روایات سے بھی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی سورۂ قدر کی تفسیر کے ذیل میں صاحبِ تفسیر صافی نے پانچویں جلد میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الرّوح اعظم من جبرئیل وان جبرئیل اعظم من الملائکۃ وان الروح ہو خلق اعظم من الملائکۃ الیس یقول اللہ تبارک وتعالی: تنزّل الملائکۃ والرّوح..."

بے شک روح، جبرئیل سے عظیم تر ہے اور جبرئیل تمام ملائکہ سے افضل و برتر ہے۔ بلاشبہ روح ملائکہ سے ایک عظیم تر مخلوق ہے کیا خداوند تبارک و تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے: تنزل الملائکۃ والرّوح۔ اسی طرح صاحب المیزان نے تفسیر برہان سے ابو بصیر کی ایک روایت نقل کی ہے:۔

عن ابی بصیر قال: کنت مع ابی عبد اللہ علیہ السلام فذکر شیئا من امر الامام اذا ولد فقال: استوجب زیادۃ الروح فی لیلۃ القدر فقلت: جعلت فداک الیس الروح ہو جبرئیل؟ فقال: جبرئیل من الملائکۃ والروح اعظم من الملائکۃ الیس ان عزّ وجلّ یقول: تنزّل الملائکۃ والروح

(المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۲۵، مطبوعہ بیروت)

ابو بصیر کہتے ہیں، میں ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ تھا...... میں نے کہا میں آپ پر فدا ہو جاؤں کیا روح سے مراد جبرئیل نہیں ہیں؟ امام نے فرمایا: جبرئیل ملائکہ کی ہی ایک فرد ہیں اور روح، ملائکہ سے عظیم تر ہے کیا خداوند عالم نے نہیں فرمایا ہے: تنزل الملائکۃ والروح

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں "الروح" کا اطلاق ہر مجرد مخلوق پر مشترک معنوی کے طور پر ہوا ہے۔

۳۔ سورۂ بقرہ (آیت/۹۷) اور سورہ شعراء (آیت/۹۴) میں علیٰ قلبک" کی تعبیر سے پتہ چلتا ہے

کہ وحی قرآنی کا نزول قلب پیغمبر اسلام پر جبرئیل امین کے توسط سے ہوا ہے اور چونکہ قرآن کی اصطلاح میں لفظ قلب کا استعمال باطنی ادراکات کے مرکز کے لئے ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ آنحضور سے اپنے باطن میں حقیقت وحی ادراک کر کے اس کے اعلیٰ مطالب سے کامل طور پر واقف ہو جاتے تھے۔

۴۔ سورۂ عبس کی آیتیں (گیارہ تا سولہ) اور سورۂ بینۃ کی آیتیں (اول تا سوم) اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآنی آیات، اللہ کی طرف سے پیغام رسانی کے فرائض ادا کرنے والے سفیروں کو دیئے جانے والے پاک اور مقدس صحیفوں میں پہلے سے رقم ہوتی تھیں چنانچہ سورۂ بینۃ میں "رسول من اللہ یتلو صحفاً مطھرۃ" کا بظاہر یہی مطلب ہے کہ پیغمبر اکرم ان ہی صحیفوں کو دیکھ کر تلاوت کرتے تھے۔

اب ان تمام آیات قرآنی کے پیش نظر جن میں سے بعض اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وحی قرآنی کی پیغمبر اسلام پر تلاوت و قرائت ہوتی ہے (جیسا کہ نزول قرآنی سے متعلق آیات کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے) اور بعض (سورۂ بقرہ : ۹۷ و سورہ شعراء : ۹۴) کہتی ہیں کہ پیغمبر اسلام کے قلب پر قرآن نازل ہوا ہے اور بعض آیتیں خبر دیتی ہیں کہ الٰہی پیغام رسانوں کے ذریعہ بھیجے گئے صحیفوں کو دیکھ کر پیغمبر اکرم وحی الٰہی کی تلاوت فرماتے تھے (سورۂ عبس : ۱۱ تا ۱۶ و سورۂ بینۃ : ۱ یا ۳) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف قسم کی آیتوں کو ان آیتوں کے ساتھ جن میں ایک طرف جبرئیل امین اور دوسری طرف بعض دوسرے فرشتوں اور سفیروں کو حاملین وحی کے طور پر پیش کیا گیا ہے کس عنوان کے تحت ایک ساتھ جمع کیا جائے؟

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن کریم کے مختلف حصے مختلف کیفیتوں کے ساتھ نازل ہوئے ہیں چنانچہ وہ ان تمام بیانات کو مختلف آیتوں سے متعلق قرار دیتے ہیں لیکن ان بیانات کے اجتماع کی ایک دوسری صورت بھی محتمل ہے جس میں اس قسم کے تکلف کی ضرورت بھی درپیش نہیں آتی۔ اور وہ یہ ہے کہ ان تمام بیانات کی روشنی میں ہم تسلیم کریں کہ جب پیغمبر اسلام پر قرآن کی وحی ہوتی تھی آنحضرت کا قلب مقدس اس کی حقیقتوں کو درک کرتا تھا ساتھ ہی ساتھ آپ کے کان صدائے وحی کو سنتے بھی تھے اسی طرح آپ کی آنکھیں وحی الٰہی کی نورانی تحریروں کو دیکھتی اور تلاوت بھی کرتی تھیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں ان مذکورہ کیفیتوں میں کسی طرح کا تعارض و اختلاف نہیں پایا جاتا۔

اور اسی طرح جبرئیل امین کے آنے یا دوسرے نورانی صحیفوں کے حامل فرشتوں یا سفیروں کے آنے میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ غالباً سورۂ تکویر میں (آیت: ۲۱) "مطاع" کی تعبیر اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ یہ سارے وحی کے حامل فرشتے جناب جبرئیل کے تحت فرمان ہیں۔ حتیٰ کہ اس قول کے قبول کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ آنحضرت (کبھی کبھی) بلا کسی واسطہ اور ذریعہ کے بھی وحی حاصل کرتے تھے جیسا کہ بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے۔ [1]

قرآن کب نازل ہوا:۔

قرآن کے ہی الفاظ میں:

- "شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ..... " (بقرہ: ۱۸۵)
- "انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین" دخان/ ۲)
- "انا انزلناہ فی لیلۃ القدر" (قدر/ ۱)

سورۂ دخان کی آیت سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ پر ایک مبارک شب میں نازل ہوا، سورۂ قدر نے اس شب کی تعیین کر دی کہ یہ شب "لیلۃ القدر" ہے اور جب اس کے ساتھ سورہ بقرہ کی آیت کو بھی ضم کیا تو پتہ چلا کہ یہ لیلۃ القدر ماہ رمضان سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسری طرف قرآن کریم کی وہ آیتیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پورا قرآن مجموعی طور سے ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا بلکہ تدریجی طور پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

---

[1] علامہ مجلسیؒ نے بحار میں کمال الدین مرحوم صدوقؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے پیغمبر اسلامؐ پر عارض ہونے والی بے ہوشی کی کیفیت کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ وہ وقت ہوتا تھا جب خداوند عالم حضور صلعمؐ سے بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے براہ راست گفتگو کرتا تھا (بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۶۰)

علامہ مجلسیؒ نے توحید صدوق، امالی شیخ اور محاسن برقی سے نقل کرتے ہوئے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی طرح کی روایت کی ہے ملاحظہ فرمائیں بحار الانوار ج ۱۸ ص ۲۵۶ حدیث ششم اور جلد ۳۰ ص ۲۶۸

- وقرآناً فرقناه لتقرأه على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا (اسراء/۱۰۶)
- وقال الذين كفروا لولا نزل عليه القرآن جملة واحدة كذالك لنثبت به فؤادك ورتلناه ترتيلا (فرقان/۳۲)

اس کے علاوہ بہت سی ایسی آیتیں بھی ہیں جن کے مضامین قرآن کے تدریجی طور پر نازل ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر :-

- واذ غدوت من اهلك تبوئ المؤمنين مقاعد للقتال (آل عمران/۱۲۱)
- غلبت الروم في ادنى الارض وهم من بعد غلبهم سيغلبون في بضع سنين (روم/۲، ۳)
- قد سمع الله قول التي تجادلك في زوجها ..." (مجادلہ/۱)

یہ تمام آیتیں، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس زمانے میں رونما ہونے والے ایک مخصوص تاریخی واقعہ اور حادثہ کی نشان دہی کرتی ہیں جن سے قرآن کا وقتاً فوقتاً نازل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مورخین و محدثین و مفسرین کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن پیغمبر اسلام کی ۲۳ سالہ تبلیغی زندگی (یا بیس سال ابتدائے بعثت کے تین سال کم کرتے ہوئے) میں تدریجاً نازل ہوتا رہا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی صورت ہے جس کے تحت دونوں طریقوں کی آیتیں ایک ساتھ جمع کی جا سکیں؟

مفسرین نے مختلف انداز سے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن میں سے کچھ اہم جوابات ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

پہلا جواب :-

ماہ رمضان میں نزول قرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی ابتدائی آیتیں اسی ماہ میں نازل ہونا شروع ہوئی ہیں (تفسیر المنار، رشید رضا۔ جلد دوم ص ۱۶۱)

دوسرا جواب :-

اصل میں قرآن کا ایک مخصوص حصہ جو اس سال سے متعلق ہوتا تھا ہر سال ماہ رمضان میں آسمان دنیا تک نازل کر دیا جاتا تھا اور پھر تدریجاً سال بھر تک پیغمبر اسلام پر نازل ہوتا رہتا تھا۔

(یہ جواب سیوطی نے بعض قدیم مفسرین کے حوالے سے نقل کیا ہے - اتقان، جلد اول ص ۴۰)

تیسرا جواب :-

ماہ رمضان میں نزول کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا ایک بڑا اور اہم حصہ ماہ رمضان المبارک میں ہی نازل ہوا ہے- (فی ظلال القرآن - سید قطب جلد دوم ص ۷۹)
لیکن مذکورہ تین جوابات اشکال سے خالی نہیں ہیں چنانچہ :-

پہلا قول :-

اس لئے قابل قبول نہیں معلوم ہوتا کہ شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن سے ظاہری طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے کہ پورا قرآن ماہ رمضان میں نازل ہوا ہے نہ کہ صرف ابتدائی قرآنی آیات -

اس کے علاوہ سب سے پہلے نازل ہونے والی قرآنی آیتیں (سورۂ علق کی ابتدائی آیات) بعثت پیغمبرؐ کے وقت نازل ہوئی ہیں اور اس بات پر تمام علمائے شیعہ کا اتفاق ہے کہ حضور صلعمؐ ۲۷ ویں ماہ رجب کو مبعوث بہ رسالت ہوئے ہیں نہ کہ ماہ رمضان المبارک میں[1] - اور یہی خیال بعض علمائے اہلسنت کا بھی ہے یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض نے بعثت کی تاریخ ۱۲، ماہ ربیع الاول اور بعض نے ماہ رمضان میں بھی آپ کا مبعوث ہونا درج کیا ہے -

دوسرا قول :-

اس لیے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اولاً اس کی تائید میں کوئی قطعی دلیل نہیں ہے دوسری دقت یہ ہے کہ سورۂ دخان کی آیت/۳ فی لیلة مبارکة " بھی اس سے موافقت نہیں کرتی -

---

[1] اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ آغاز نزول قرآن سے مراد پیغمبر اسلام کی بعثت کے تین سال کے بعد سے ہے (التمھید فی علوم القرآن - ج اول ص ۸۱)

کیونکہ اس سے قرآن کریم کا کسی ایک مبارک رات میں نازل ہونا پتہ چلتا ہے نہ کہ بیس[۲۰] یا تیئس[۲۳] شبہائے قدر میں (سال بہ سال) قرآن کا نازل ہونا مراد لے لیا جائے (دراصل یہاں لیلۃ تخمیہ مراد ہے نہ کہ لیلۃ نوعیہ)

تیسرا قول:-

تو اور بھی کمزور معلوم ہوتا ہے، چنانچہ گذشتہ دونوں اشکالات اس پر بھی وارد ہیں کیونکہ یہ دعویٰ کرنا کہ نزول قرآن سے قرآنی آیات کے ایک بڑے اور اہم حصے کا ماہ رمضان میں نازل ہونا مراد ہے بلا دلیل دعوے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور اگر اس طرح کی کسی بات کا ثابت ہونا فرض کر بھی لیا جائے تو یہ تصور خود قرآنی آیت" انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ" کے ظاہری مفہوم کے ساتھ کسی طرح بھی میل نہیں کھاتا۔ اس کے علاوہ، اس قول پر ایک اشکال اور وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ نزول قرآن کے معنی اگر اس کے ایک بڑے اور اہم حصے کا نازل ہونا، لیا جائے تو یہ مجاز کے طور پر ہوگا اور بغیر کسی قطعی قرینے کے یہ التزام درست نہیں ہے۔

چوتھا جواب:-

محدثین کی ایک جماعت (مثال کے طور پر شیخ صدوقؒ اور علامہ مجلسیؒ علمائے شیعہ سے نیز طبری اور سیوطی علمائے اہلسنت سے) روایات کو سند بناتے ہوئے اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ قرآن کریم شب قدر میں "لوح محفوظ" سے "بیت المعمور" یا "بیت العزت" یا آسمان دنیا (روایات کے اختلاف کے ساتھ) پر نازل کر دیا گیا اور اس کے بعد تیئس[۲۳] سال تک پیغمبر اسلامؐ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا، شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ پورے قرآن کا علم یکجا طور پر پیغمبر اسلامؐ کو دیا جا چکا تھا چنانچہ شہادت کے طور پر آپ نے قرآن کریم کی اس آیت کا سہارا لیا ہے:-

ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیک وحیہ

(سورہ طٰہ ۱۱۴)

اور (اے ہمارے رسول) تم قبل اس کے کہ وحی قرآن (لفظی طور پر) بہ تمام و کامل تم تک

نہ پہونچ جائے اس کی (تعلیم و تلاوت میں) عجلت نہ کرو۔[1]

پانچواں جواب :۔

جو کافی حد تک گذشتہ جواب سے ملتا جلتا بلکہ قابل تطبیق ہے وہ یہ کہ نزول قرآنی کی دو نوعیتیں ہیں :۔

الف : قرآن کا اپنی نورانی و بسیط حقیقت کے ساتھ قلب مقدس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونا۔

ب : قرآن کا تفصیلی آیات کی صورت میں نازل ہونا۔

پہلی نوعیت کا نزول شب قدر میں اور دوسری نوعیت کا نزول روز بعثت سے لیکر پیغمبر کی آخری عمر تک وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے ۔۔۔ یہ حل علامہ طباطبائی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے پیش کیا ہے۔[2]

لیکن، اس جواب کی گذشتہ جواب کے ساتھ تطبیق اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ مان لیا جائے کہ خداوند عالم کی جانب سے نازل ہونے کا مطلب ایک نقطہ سے دوسرے نقطے کی صرف جسمانی طور پر منتقل ہونا مراد نہیں ہے۔ اس بنیاد پر بیت المعمور تک قرآن کا نازل ہونا ممکن ہے، ایک ایسے مخصوص وجود کی صورت میں ہو جس کو قلب پیغمبر اسلامؐ نے درک کر لیا ہو گو کہ اس نزول کی منزل میں وجود الفاظ سے قرآن بہرہ ور نہ ہوا ہو اور یہ معنوی نزول ممکن ہے اس کا مثالی وجود ہو جو فقط پیغمبر اکرمؐ کی نظر میں ظاہر ہوا ہو۔[3]

---

[1] اعتقادات صدوق : ص ۱۰۱ ، بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۵۳ ، تفسیر طبری جلد دوم ص ۸۵ اتقان سیوطی جلد اول ص ۳۹ و ۴۰ ۔

[2] "تفسیر المیزان" ج دوم (سورہ بقرہ کی آیت : ۸۵ کی تفسیر ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

[3] اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لئے نزول سے متعلق مقالہ ملاحظہ فرمائیں۔ (توحید، جلد ۴ شمارہ ۲ ص ۳۴)

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ولو کسی نوعیت سے بھی سہی اگر قرآن کریم کا ایک ساتھ مجموعی طور پر نازل ہونا قبول کر لیا جائے تو یہ چیز قرآن کی ان آیات کے منافی ہوگی جنمیں قرآن کے یک دفعہ نازل ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ (سورۂ اسراء/ ۱۰۶ ، سورہ فرقان/ ۳۲)

اس سوال کا اس طرح جواب دیا جا سکتا ہے کہ:-

دراصل کفار نے ایک اعتراض وارد کیا تھا کہ کیا بات ہے قرآن کریم مجموعی طور پر ایک ساتھ نازل نہیں کیا گیا جبکہ اس سے قبل، مثال کے طور پر، توراۃ جناب موسیٰؑ پر مکمل صورت میں نازل ہوئی تھی۔ اس وقت قرآن نے جواباً یہ بات کہی کہ "کذلك لنثبت به فؤادك" فرقان/ ۳۲) یعنی قرآن کا تدریجی طور پر نازل کیا جانا پروردگار عالم کی طرف سے ایک خاص لطف کے تحت ہے چنانچہ یہ پیغمبر اسلام کی تقویت قلب کے لئے مسلسل طور پر عنایات ربانی کے جاری رہنے پر دلالت کرتا ہے۔

اور جہاں تک شب قدر میں مجموعی طور پر نزول کا سوال ہے اس کا مطلب تمام تفصیلی آیات کے ساتھ نازل ہونا نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کی حقیقت واقعی کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم کو علم شہودی عطا کئے جانے کی ایک نوعیت ہے۔

اور ان دونوں باتوں میں کوئی منافات و تضاد نہیں پایا جاتا۔

مقصدِ حسین علیہ السلام

... انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی

ارید ان امر بالمعروف وانهیٰ عن المنکر واسیر

بسیرة جدی وابی علی بن ابیطالب فمن قبلنی بقبول الحق

فالله اولی بالحق ومن ردّ علیّ هٰذا اصبر حتی یقضی الله

بینی وبین القوم وهو خیر الحاکمین ...

دراصل میں اپنے جدّ کی امت کی اصلاح کے لئے نکلا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ امت کو نیکیوں کی طرف دعوت دوں اور انھیں برائیوں سے روکوں اپنے جدّ کی سنتوں پر اور پدر بزرگوار کی سیرت پر لوگوں کو گامزن کروں۔ پس جو اس حقیقت کو قبول کرے گا اور میری پیروی کرے گا وہ گویا خدا کی راہ اختیار کرے گا۔ اور جو اس سے انکار کرے گا اور میری پیروی نہ کرے گا تو میں صبر واستقامت کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہوں گا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور وہ بہترین حاکم ہے۔

(مقتل خوارزمی ج ۱ ص۱۸۸، ومقتل عوالم ص۵۴)

جناب علی احمدی میانجی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

ایران کے انقلابی مسلمان خدا و رسولؐ کی نظر میں

حجاز، سعودیہ عربیہ اور اردن میں تفسیر ابن کثیر پر پابندی

[حکومت حجاز و اردن کی خفیہ پولیس نے مشہور عالم اہل سنت ابن کثیر کی گراں بہا تفسیر تمام کتب فروشوں کے یہاں سے ضبط کر کے ان دونوں ملکوں میں اس کتاب کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کر دی ہے۔

عربی زبان کے ہفتہ وار اخبار "لواء الصدر" کے مطابق اس گرانقدر سنی تفسیر کے ساتھ سعودی و اردنی حکومتوں کے اس دشمنانہ اور ظالمانہ رویہ کی وجہ اس کتاب میں درج پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مستند و معتبر روایت ہے جو سورہ محمدؐ کی آیت "یستبدل قوماً غیرکم" کی تفسیر کے ذیل میں پیش کی گئی ہے جس کے مطابق مذکورہ آیت کے مصداق کے سلسلہ میں جب سوال کیا گیا تو رسول اللہ صلعم نے جناب سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی قوم کو نیک الفاظ میں یاد فرمایا۔ چنانچہ، جیسا کہ "لواء الصدر" نے لکھا ہے یہ کام اس روایت کو مخفی رکھنے کے لئے کیا گیا کیونکہ یہ روایت انقلاب اسلامی ایران کے وقوع پذیر ہو جانے اور نصرت اسلام کا پرچم اس امت کی دوش پر بلند نظر آنے کی وجہ سے محقق ہو گئی ہے۔

بہرحال، عالم اسلام کی بصیرت میں اضافہ کی غرض سے اس موضوع سے متعلق آیات و روایات کو جمع کر کے حضرت آیت اللہ احمدی زاد افاداتہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان کی بحث و تحقیق فرمائی ہے جسے ہم اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں]

سورۂ محمدؐ کی ۳۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

ھا انتم ھٰؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ واللہ الغنی وانتم الفقراء وان تتولوا

یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم۔

یاد رکھو! تم لوگ وہی افراد تو ہو کہ (جب) تم کو خدا کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے (تو) تم میں سے بعض لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور جو (راہ خدا میں) بخل دکھاتا ہے خود اپنے ہی حق میں (پہونچنے والے فوائد سے) بخل کرتا ہے (کیونکہ انفاق کا فائدہ اور کنجوسی کا نقصان خود اسی فرد کی طرف پلٹ جاتا ہے اور ہم جو تم سے انفاق کے خواہش مند ہیں اس لئے نہیں کہ خدا اور اس کا رسولؐ تمہارے محتاج و فقیر ہیں بلکہ) خدا تو غنی و بے نیاز ہے تم محتاج اور نیاز مند ہو۔

اور اگر تم (انفاق سے) روگردانی اختیار کروگے تو خداوند تبارک و تعالی ایک دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ عطا کردے گا اور وہ لوگ تمہارے جیسے (بخیل) نہ ہوں گے (اور دشمنوں کے مقابلہ میں صلح کی بات نہ کریں گے)

اس آیت سے قبل کی آیتوں میں خداوند عالم مسلمانوں کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے :۔

ولنبلونکم حتی نعلم المجاھدین منکم والصابرین ونبلوا اخبارکم (آیت/۳۰)

اور ہم حتمی طور پر تم لوگوں کا امتحان لیں گے تاکہ یہ سمجھ لیں کہ تم میں کون لوگ (جان و مال سے) جہاد اور (مصیبتوں پر) صبر کا مظاہرہ کرنے والے ہیں ذرا ہم تم کو پرکھ تو لیں۔

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولاتبطلوا اعمالکم (محمد/۳۳)

اے ایمان لانے والو! (حلال و حرام میں) اللہ کی اطاعت کرو اور (تمام احکام و دستورات میں) اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور (نافرمانی کرکے) اپنے اعمال کو تباہ و باطل نہ کرو۔

فلاتھنوا وتدعوا الی السلم وانتم الاعلون واللہ معکم ولن یترکم اعمالکم (آیت/۳۵)

پھر اسی سورہ محمدؐ میں خدا فرماتا ہے :۔

اور تم (کفار اور دشمنان اسلام سے مقابلہ کے موقع پر) ہمت نہ ہارو صلح کی دعوت دینا

نہ شروع کرو کیونکہ غلبہ و برتری (اور قدرت و کامیابی) تمہارا حصہ ہے (یقیناً) خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال کی جزا میں (کوئی) کمی نہ کرے گا۔

انما الحیٰوۃ الدنیا لعب و لھو و ان تومنوا و تتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم (آیت/۳۶)

یعنی دنیوی زندگی تو بس ایک کھیل تماشہ ہے، اگر تم (خدا پر) ایمان لے آئے اور تقوے و پرہیزگاری سے کام لیتے رہے تو (خداوند عالم) تم کو تمہارے اعمال کی ضرور جزا دیگا اور (اس جزا کے بدلے میں) وہ تم سے کسی مال و منال کا طالب نہیں ہوتا۔

کیونکہ :-

ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا و یخرج اضغانکم (آیت/۳۷)

اگر (خداوند عالم) تم سے تمہارا مال طلب کرے گا اور مال کے اس مطالبہ میں مبالغہ (زور و زبردستی) سے کام لے گا (یعنی سبھی یا زیادہ مال طلب کرے گا) تو تم بخل دکھلاؤ گے اور تمہارا ضغن ضرور ظاہر ہو جائے گا (یعنی خدا، اس کے رسول اور اس کے دین کے متعلق تمہارے دلوں میں جو بغض و عداوت کے شعلہ بھڑک رہے ہیں اس طرح وہ ان کو ظاہر کر دے گا)[1]

ان آیات کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان آیات پر غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ : خداوند عالم راہ خدا میں کوشش و جستجو جاری رکھنے کے سلسلہ میں دئے جانے والے قوانین و احکامات کے ذریعہ مومنین کا امتحان لیتا ہے تاکہ ان کے قلوب میں جلنے والی شمع ایمان کا پتہ چل جائے یا پھر ان کے چہروں پر پڑا ہوا کفر و نفاق کا پردہ اٹھ جائے۔ اور یہ معلوم ہو جائے کہ : آیا مسلمانوں کا دشمنوں کے مقابلہ میں صلح کی آواز بلند کرنا یا ان سے سازباز کی کوششیں کرنا ان کی سستی اور زبوں حالی کی وجہ سے تو نہیں ہے ؟ کیونکہ یہ چیزیں خود اپنی زندگی بچائے رکھنے کی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہیں اور پھر لامحالہ طور پر انسان قربانی و فداکاری اور جہاد و قتال سے جی چرانے لگتا ہے۔ دلوں کے اندر جنگ

---

[1] مجمع البیان ج ۹ ص ۱۰۸ و اقرب الموارد۔

کرنے اور اس کو جاری رکھنے کی طاقت کیوں نہ موجود ہو اور خداوند عالم کی طرف سے اس کی پشت پناہی کیوں نہ کی جا رہی ہو۔ اور وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہو کہ خداوند عالم کو بے چارگی و بے بسی، بخل و کاہلی اور موت سے خوف و فرار سے نفرت ہے اور وہ دشمن کے ساتھ مصالحت یا ساز باز کی گفتگو سے ہرگز راضی نہیں۔

اور اسی طرح ان آیات میں مسلمانوں کی مال دنیا سے شدید محبت و وابستگی کا بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ اگر خداوند عالم تم سے تمہارے مال کا طالب ہو تو تمہارا کینہ و حسد ظاہر ہو جائے گا اور تم اس الٰہی آزمائش سے صحیح و سالم نکل نہیں سکتے۔

ان مطالب کی وضاحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ہم تم کو انفاق کی دعوت دیتے ہیں اور تم ہو کہ بخل سے کام لیتے ہو یاد رکھو اگر تم ہمارے حکم سے سرتابی کرتے رہے (اور مال، راہ خدا میں صرف نہ کیا اور دنیا کی محبت تمہیں راہ خدا میں جہاد کرنے سے مانع ہوئی یا تم نے دشمنوں سے ساز باز کی باتیں شروع کردیں اور ایمان و تقویٰ پس پشت ڈال دیا) تو خداوند عالم ایک دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دیگا اور وہ لوگ نہ تو ماضی میں تم جیسے تھے اور نہ ہی مستقبل میں تمہاری طرح ہوں گے۔

یعنی وہ لوگ نے اپنے منش ہیں تقویٰ اور قربانی و فداکاری ان کا خاصہ ہے وہ جنگ سے خوف زدہ نہیں ہوتے اور خدا کی راہ میں انفاق سے بھی گریز اختیار نہیں کرتے (چاہے ان کو اپنا سارا مال و منال قربان کر دینا پڑے) اور وہ اس صلاحیت کے حامل ہیں کہ خدا کے ہر امتحان سے سربلند و پرافتخار گزر جائیں۔

اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نے خدا و رسولؐ کے اس محبوب و جلیل المرتبت گروہ کی تعیین کے سلسلہ میں متعدد احتمالات پیش کئے ہیں۔

۱۔ بعض کا خیال ہے کہ اس گروہ سے مراد ملائکہ ہیں اور اپنے اس خیال کی بنیاد جنگ بدر میں ملائکہ کے نزول اور شرکت کو قرار دیا ہے۔

۲۔ بعض مفسرین نے اس سے اہل یمن کو مراد لیا ہے۔

۳۔ ایک جماعت کی نظر میں اس گروہ سے مقصود انصار مدینہ ہیں۔

۴۔ کچھ اس بات کے معتقد ہیں کہ اس سے مراد جناب سلمان فارسی اور ان کی قوم

والے ہیں۔[1]

اور ہر ایک نے اپنے اپنے حق میں دلیلیں بھی پیش کی ہیں لیکن فی الحال مجھے آیۂ کریمہ پر ہر رخ اور ہر جہت سے بحث نہیں کرنی ہے میں تو یہاں اپنے قارئین کو صرف ان احادیث کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو اس آیت کے ذیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ہیں اور جو ایران کی بہادر و مجاہد قوم کے لئے یقیناً باعث افتخار ہیں۔ چند حدیثیں حسب ذیل پیش ہیں:۔

۱- عن ابی هریرة قال: تلی رسول الله (ص) هذه الآیة: "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم" فقالوا من هؤلاء یا رسول الله، الذین ان تولینا استبدل بنا قوماً غیرنا ثم لا یکونوا امثالنا؟ فضرب رسول الله علی فخذ سلمان الفارسی ثم قال: هذا وقومه، لو کان الدین معلقاً بالثریا لناله رجال من الفرس۔

ابو ہریرہ نقل کرتے ہیں کہ: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیۂ شریفہ کی تلاوت فرمائی حاضرین نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں جن کو ہمارے اعراض و انکار کی صورت میں پروردگار عالم ہماری جگہ دیدینے کی بات کر رہا ہے اور یہ بھی اعلان ہے کہ وہ ہمارے جیسے (احکام خدا سے روگردانی کرنے والے) نہ ہوں گے (بلکہ زہد و تقویٰ ایمان و فداکاری اور انفاق میں ہم سب سے بہتر ہوں گے؟)

---

[1] اس سلسلہ میں کچھ دیگر احتمالات بھی پیش کئے گئے ہیں محققین مندرجہ ذیل تفاسیر کی طرف مراجعہ فرمائیں:۔
کشاف ج ۴ ص ۳۳۱، بیضاوی۔ مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں، تفسیر قرطبی ج ۱۶ ص ۵۸ ۲، مجمع البیان ج ۹ ص ۱۰۸ (مطبوعہ اسلامیہ) تبیان ج ۹ ص ۳۱۱ (مطبوعہ نجف اشرف)، المیزان ج ۱۸ ص ۲۷۱، ثعالبی ج ۴ ص ۱۷۱، تفسیر فخر رازی ج ۲۸ ص ۷۶، تفسیر کبیر طبری ج ۲۶ ص ۴۲، درالمنثور ج ۶ ص ۶۷، ابوالفتوح ج ۴ ص ۸۳، مجموعۃ من التفاسیر ج ۵ ص ۵۱۷، تفسیر ابی السعود ج ۸ ص ۱۰۳، روح المعانی ج ۲۶ ص ۸۲، تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۶ و ۷، تفسیر شربینی ج ۱ ص ۳۸۲ اور تفسیر گازر ج ۹ ص ۱۲۲۔

پیغمبر اسلامؐ نے سلمان فارسیؓ کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا: یہ اور اس کی قوم والے ہیں (اور پھر مزید وضاحت فرمائی) اگر خدا کا دین ستارۂ ثریا پر آویزاں بھی ہوگا تو اہل فارس یقینی طور پر اس تک پہنچ جائیں گے۔[1]

۲۔ عن ابی ھریرۃ قال تلی نبیّ اللہ (ص) ھذہ الآیۃ: "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم" قال وضع النبی (ص) یدہ علی فخذ سلمان الفارسی قال: ھذا و قومہ، والذی نفسی بیدہ لو کان الدین مناطاً بالثریا لتناولہ رجالٌ من فورس۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیہ کریمہ "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم" تلاوت فرمائی اور پھر سلمان فارسی کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا: "وہ لوگ" یہ اور اس کی قوم ہیں، قسم اس (پروردگار) کی جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے اگر دین (تمام معارف واحکام واخلاق وعبادات) ثریا کی بلندیوں پر آویزاں ہو (اور ان کی دسترس سے دور ہو تو بھی) اہل فارس وہاں تک پہنچ کر اس کو حاصل کرلیں گے۔[2]

۳۔ عن ابی ھریرۃ: انّ اناساً من اصحاب رسول اللہ (ص)، قالوا: یارسول اللہ من ھؤلاء الذین ذکر اللہ فی القرآن؟ وذکر نحوہ۔

---

[1] اس روایت کو ابونعیم نے متعدد اسناد کے ساتھ تاریخ اصبہان، میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ج اول ص ۲ و ۳ تفسیر طبری ج ۲۶ ص ۴۲، تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۳۲۰، بیضاوی۔ اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں، روح المعانی ج ۲۶ ص ۸۲ وجلد ۶ ص ۱۶۳، مجموعۃ من التفاسیر جلد ۵ ص ۵۱۷، شربینی نے السراج المیزان میں ترمذی، حاکم نیز انکی صحیحین سے روایت نقل کی ہے (ج ۴ ص ۳۶)، تفسیر گازر جلد ۹ ص ۱۲۲، درالمنثور نے عبدالرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم سے (ج ۶ ص ۶۷) پر نقل کیا ہے، اوسط میں طبرانی سے، دلائل النبوۃ میں بیہقی نے، المیزان ج ۱۸ ص ۲۷۲، تفسیر نیشاپوری نے طبری ج ۲۶ ص ۴۳ اور ترمذی ج ۵ ص ۳۸۴ کے حاشیہ سے نقل کیا ہے۔

[2] تاریخ اصبہان جلد اول ص ۳، ۴ اور تفسیر طبری جلد ۲۶ ص ۴۲۔

ابوہریرہ نقل کرتے ہیں کہ رسولؐ خدا کے صحابیوں میں سے کچھ لوگوں نے سوال کیا اے اللہ کے رسولؐ: یہ کون لوگ ہیں جن کا خداوند عالم نے قرآن میں (اس آیت کے اندر) ذکر کیا ہے؟
تو رسول صلعم نے وہی جواب دیا جس کا گذشتہ روایت میں ذکر کیا گیا ہے؟ [۱]

۴- عن ابی هریرة قال: لما نزلت هذه الآیة "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم" قالوا: یارسول الله من هؤلاء؟ قال: وسلمانؓ جالس - فقال: هذا وقومه والذی نفسی بیده لو کان الدین منوطاً بالثریا لناله رجالٌ من فارس -
او قال الدین -

ابوہریرہ کہتے ہیں: جس وقت یہ آیۂ مبارکہ "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ...." نازل ہوئی اصحاب رسولؐ میں سے کچھ لوگوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول یہ کون لوگ ہیں؟ جن کا پروردگار عالم نے قرآن میں ذکر کیا ہے اور اس طرح مدح سرائی فرمائی ہے) وہ کہتا ہے کہ سلمان بھی وہاں تشریف رکھتے تھے، پیغمبر اسلامؐ نے ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: وہ اور اس کی قوم والے، خدا کی قسم! دین حق اگر ثریا پر آویزاں ہو تو بھی فارس کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔ [۲]

۵- عن جابر بن عبد الله: ان النبی (ص) تلی هذه الآیة: "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم" فسئل من هم قال: لو کان الدین بالثریا لتناوله رجالٌ من فارس"۔

جابر بن عبد اللہ انصاری روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم" حضور صلعم سے پوچھا گیا یہ کون لوگ ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا یہ لوگ فارس (زبان) ہیں اگر دین ثریا پر بھی ہوتا تو فارس کے افراد اس پر بھی دسترسی حاصل کر لیتے۔ [۳]

[۱] تاریخ اصبہان جلد اول ص ۳، ابوالفتوح جلد ۴ ص ۸۳، مجموعۃ من التفاسیر جلد ۵ ص ۷۱، ۵، مجمع البیان (مطبوعہ اسلامیہ) جلد ۹ ص ۱۰۸ اور نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۲۶۔ [۲] تاریخ اصبہان ج اول ص ۵، تفسیر طبری ج ۲۶ ص ۴۲، تفسیر ابی السعود ج ۸ ص ۱۰۳ درالمنثور — از سعید بن منصور و ابن جریر و ابن منذر و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ جلد ۶ ص ۶۷، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۴۵۸۔ [۳] تاریخ اصبہان جلد اول ص ۷، روح المعانی ج ۲۶ ص ۸۲، درالمنثور جلد ۶ ص ۶۷ از ابن مردویہ اور المیزان ج ۱۸ ص ۲۷۲۔

۶- عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ (ص) اُدنوا یا معاشر الموالی الی الذکر فان العرب قد اعرضت وانّ الایمان لو کان معلقاً بالعرش کان منکم من یطلبہ۔

ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: اے گروہ موالی سے تعلق رکھنے والو! ذکر (یاد الٰہی) سے نزدیک ہو جاؤ کیونکہ عرب (ذکر سے) پھر گئے ہیں۔ (ظاہراً یہ اشارہ اس آیت مبارکہ کے مضمون کی طرف ہے) یقیناً اگر ایمان عرش (الٰہی) پر معلق ہو تو تم میں ایسے بھی ہیں جو اسے حاصل کر لیں[1]

اس حدیث میں لفظ موالی یہاں پر آزاد شدہ غیر عرب غلام[2] کے معنوں میں) مطلق طور ذکر ہوا ہے اور تمام غیر عرب اس میں شامل ہیں لیکن یہ روایتیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور بعض کا آئندہ کریں گے شاید ان روایات کے قرینہ اور مذکورہ حدیث کے ذیل کو دیکھتے ہوئے کہ تقریباً تمام حدیثوں میں بھی یہی مضمون ملتا ہے۔ اس سے صرف اہل ایران مراد ہو سکتے ہیں۔

بہر حال آیت میں "وان تتولوا" جملہ شرطیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس سے کہیں یہ شبہ نہ پیدا ہو کہ ——— جب یہ شرط ہی محقق نہیں ہوئی ہے تو جزاء کا کیا سوال؟ جب کہ تمام روایات خصوصاً آخری حدیث میں اس کے محقق ہونے کا واضح اشارہ موجود ہے بالخصوص احادیث کے ذیلی ٹکڑے: لو کان الدین معلقاً بالثریا ـــ لو کان الدین مناطاً بالثریا ـــ، لو کان العلم ـــ، تحقق شرط کے ظہور بالصراحت کو مشخص کر دیتے ہیں۔ اور اصولی طور پر اس ملت کے فضل و شرف پر حدیث کی دلالت خصوصاً روایات جن کا ہم آئندہ ذکر کریں گے نیز اس تنقید و ملامت کو دیکھتے ہوئے جو عربوں کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے حصول شرط کی احتیاج نہیں رہ جاتی بلکہ اجمالی طور پر اصل فضیلت ثابت ہو جاتی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت طاہرین علیہم السلام سے دوسری حدیثیں بھی نقل ہوئی ہیں جو گذشتہ احادیث کے مضمون کی تائید و تصدیق کرتی ہیں چنانچہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ خود پیغمبر اسلام

---

[1] تاریخ اصفہان جلد ۱ ص ۶ [2] لسان العرب ج ۱۵ ص ۴۰۸

اور آپ کے اہلبیت اطہارؑ ایران کے مسلمانوں سے ایک خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ معصومین علیہم السلام نے ایرانیوں کے تقویٰ وفضیلت، ایثار وقربانی اور اسلامی مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کا جان کی بازی لگا دینا، نیز سازشوں کا شکار نہ ہونا غرض کہ ان کے علم وعرفان اور دین وآگہی وغیرہ کو بڑی تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور سراہا ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے ان میں سے بعض حدیثوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ عن ابی هریرة قال: کنا عند النبی (ص) اذ نزلت علیه سورة الجمعة فلما قرء "وآخرین منهم لما یلحقوا بهم" قیل من هؤلاء یا رسول الله؟ فلم یراجعه النبی (ص) حتی سأله مرتین او ثلاثاً — قال: وفینا سلمان الفارسی — قال: فوضع النبی (ص) یده علی سلمان ثم قال: لو کان الایمان عند الثریا لناله رجال من هؤلاء قال ابوحصین: لناله هذا واصحابه — والحدیث متفق علیه۔

ابوہریرہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: ہم لوگ رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر تھے کہ سورۂ جمعہ نازل ہوا جب نبیؐ نے آیت کا یہ ٹکڑا "وآخرین منهم لما یلحقوا بهم" پڑھا تو نبی سے سوال کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ کون سے لوگ ہیں؟ حضرتؐ نے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ یہی سوال دو یا تین بار دہرایا گیا — ابوہریرہ کہتے ہیں: سلمان بھی ہمارے درمیان موجود تھے۔ پس نبی صلعم نے اپنا دست مبارک سلمان فارسی پر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: اگر ایمان ثریا کی بلندیوں پر بھی ہو تو یقیناً ان میں سے کچھ لوگ اس تک پہنچ جائیں گے۔

ابوحصین[1] نے (اس آیت کے آخری ٹکڑے کو) یوں نقل کیا ہے کہ یہ اور اس کی قوم والے اس کو حاصل کر لیں گے اور یہ حدیث متفق علیہ ہے[2]

---

[1] ابوحصین وادئ حدیث کے راویوں میں سے ہے۔ [2] تاریخ اصبہان ج ۱ ص ۲ (متعدد اسناد کے ساتھ) درمنثور ج ۶ ص ۲۱۵، روح المعانی ج ۲۸ ص ۹۴، قرطبی ج ۱۸ ص ۹۳، طبری ج ۲۸ ص ۶۲، مجمع البیان ج ۶ ص ۶۹ (اور طبع اسلامیہ ج ۱۰ ص ۲۸۳)، کشاف ج ۴ ص ۵۳۰۔ ابن کثیر ج ۷ ص ۷، ثعالبی ج ۴ ص ۲۹۸، بخاری ج ۶ ص ۱۸۹، عمدۃ القاری ج ۱۹ ص ۲۳۵، صحیح مسلم ج ۴ حدیث ۱۹۷۲ و ۲۵۴۶، ترمذی ج ۵ ص ۲۱۳ و ۴۱۲ اور فتح الباری جلد ۸ ص ۴۹۲ و ۴۹۳

ایک دوسری نص میں اس طرح منقول ہے :-

عن ابی هریرة قال: کنا جلوسا عند النبی (ص) فانزلت علیه سورة الجمعة "وآخرین منهم لما یلحقوا بهم" فقال رجل: من هؤلاء یا رسول الله فلم یجبه حتی سأله ثلاث مرات وفینا سلمان الفارسی فوضع رسول الله یده علی سلمان وقال: لو کان الایمان بالثریا لناله رجل من هؤلاء -

قرطبی کہتا ہے: آخرین، کی بہترین تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد ایرانی ہیں اس لئے کہ دین ان کے درمیان نمایاں ہوا اور علماء کثرت کے ساتھ پیدا ہوئے - یہی وہ چیز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی بہترین دلیل ہے - (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۳۵)

۲- لما نزلت قوله تعالیٰ: "فسوف یأتی الله بقوم یحبهم ویحبونه" سئل رسول الله (ص) عنهم، فضرب بیده علی عاتق سلمان وقال: هذا وذووه ثم قال: لو کان الایمان معلقا بالثریا لناله رجال من ابناء فارس -

جس وقت آیہ مبارکہ "فسوف یأتی الله بقوم یحبهم ویحبونه" نازل ہوئی تو اس قوم کے بارے میں رسول اللہ صلعم سے سوال کیا گیا کہ (یہ کون لوگ ہیں جن کے لئے جانے کا وعدہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے اس طرح مدح سرائی کی ہے) حضرت نے سلمان فارسی کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: یہ اور اس سے نسبت رکھنے والے افراد ہیں، اس کے بعد فرمایا: اگر ایمان ثریا کی بلندیوں پر بھی آویزاں ہوتا تو اہل فارس کی اولاد اس تک پہنچ جاتی۔[2]

اس آیہ کریمہ میں چند بہت ہی اہم صفتیں اس قوم کی ذکر ہوئی ہیں :-

(الف) "یحبهم ویحبونه" خداوند عالم ان کو دوست رکھتا ہے اور وہ بھی خدا کو دوست رکھتے ہیں -

(ب) "اذلة علی المومنین، اعزة علی الکافرین" وہ مومنین کے مقابلہ میں انکساری اور فروتنی کا مظاہرہ کرتے ہیں (لیکن) کافروں کے سامنے اپنی سربلندی اور ان سے ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔

---

[1] سورہ مائدہ/۵۴ [2] ملاحظہ فرمائیں کشاف ج ۱ ص ۶۴۶، بیضاوی۔ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں، فخر رازی ج ۱۲ ص ۹ و ۲۰، مجموعۃ من التفاسیر ج ۲ ص ۳۰۴، [illegible] المعانی ج ۶ ص ۱۶۳، المنار ج ۶ ص ۴۳۶، نور الثقلین ج ۱ ص ۶۳۲، مجمع البیان ج ۲ ص ۱۲۲، تفسیر شبر ج ۱ ص ۳۸۲ اور قرطبی ج ۸ ص ۹۳-

اسی مفہوم کو ایک دوسری آیت میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے" اشدّاء علی الکفار رحماء بینھم (سورۂ فتح آیت/۲۹) کفار کے مقابلہ میں سخت گیر اور آپس میں ہمدرد و مہربان ہیں۔

(ج) "یجاھدون فی سبیل اللّٰہ" (جان و مال و اولاد کے ذریعہ) راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔

(د) "ولا یخافون لومۃ لائم" (راہ دین خدا میں احکام اسلام کے اجراء اور پیغمبر اسلامؐ کے عظیم الشان مقاصد کے احیاء کے وقت) کسی کی ملامت اور سرزنش سے کسی طرح مرعوب و خوفزدہ نہیں ہوتے۔

(ھ) "ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ واسع علیم" اور یہ خداوند عالم کا عظیم فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے بے شک خدا کی رحمتیں بڑی وسیع ہیں اور وہ سب کے حال سے واقف و دانا ہے۔ ان مذکورہ بالا اوصاف و صفات کی خلاف ورزی کا جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ اس آیت: "فسوف یأتی اللّٰہ بقوم..." کی شکل میں ہے جس طرح کہ سورۂ محمدؐ کی ۳۸ ویں آیت سے قبل کی آیتوں میں ذکر شدہ صفات کی خلاف ورزی اور تخلف کا باعث یہ آیت بنی۔

۳۔ الاّ تنفروا یعذبکم عذاباً الیماً ویستبدل قوماً غیرکم ولا تضروہ شیئاً و اللّٰہ علی کل شیء قدیر (سورۂ توبہ آیت: ۳۹)

اگر (راہ دین خدا میں جہاد کے لئے نہ گئے اور) فرار اختیار کیا تو خداوند عالم تم کو دردناک عذاب میں گرفتار کر دے گا اور ایک دوسری قوم کو (جہاد کے لئے) تمہاری جگہ منتخب کرے گا اور تم (اپنی اس ذلیل حرکت سے) خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس "قوم" کی تعیین کے سلسلہ میں بہت سارے احتمالات میں سے ایک احتمال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ ممکن ہے اس سے مراد قوم فارس ہو۔[1]

۴۔ عن ابن عباس قال: الی قوم اولی بأس شدید بفارس۔

یعنی سورۂ مبارکہ الفتح کی ۱۶ ویں آیت کے اس حصے "قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اولی بأس شدید..." کہ جس میں خداوند تبارک و تعالیٰ تخلف اور نافرمانی کرنے والوں کی تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جلد ہی تم کو ایک ایسی قوم کے ساتھ جنگ کی دعوت دیں گے جو بہت زیادہ قدرت

---

[1] کشاف جلد ۲ ص ۲۷۰ اور قرطبی جلد ۸ ص ۱۴۲

وطاقت کی مالک ہے، اس کی تفسیر میں ابن عباس کہتے ہیں کہ اس بہادر قوم سے مراد اہل فارس ہیں۔[1]

۵۔ ابشروا یا بنی فروخ فلو کان الایمان معلقا بالثریا لا تنالہ العرب، لنالتہ العجم

اے فرزندان فروخ! تم کو بشارت دی جاتی ہے اگر ایمان ثریا ستارے پر آویزاں ہو تو عرب اس تک نہیں پہنچ سکتے، ہاں عجم (غیر عرب) اس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔[2]

۶۔ اتقربوا یا بنی فروخ الی الذکر ان منکم لرجالاً لو ان العلم معلق بالثریا لتناولوہ

اے فروخ کی اولاد! ذکر (الٰہی) سے قریب ہو جاؤ خدا کی قسم یقیناً تم میں ایسے لوگ ہیں کہ اگر علم ثریا ستارے پر آویزاں ہو تو اس تک دسترسی حاصل کر لیں گے۔[3]

۷۔ اعظم الناس نصیبا فی الاسلام، اھل فارس، لو کان الاسلام فی الثریا لتناولہ رجال من اھل فارس۔

اسلام کا ایک بڑا حصہ اہل فارس کی دین ہے اگر اسلام ثریا ستارے کی بلندیوں میں ملے تو فارس کے یہ لوگ اس کو حاصل کر لیں گے۔[5]

۸۔ لو کان الدین معلقا بالثریا لتناولہ من فارس۔

اگر دین ثریا ستارے پر معلق ہو تو اہل فارس کے افراد اس پر دسترسی حاصل کر لیں گے۔[6]

۹۔ یا سلمان لو کان الدین معلقا بالثریا لتناولہ ناس من اھل فارس یتبعون سنتی ویتبعون آثاری ویکثرون الصلوٰۃ علیّ یا سلمان احبّ المجاھدین واحبّ المرابطین واحب الغزاۃ۔[7]

---

[1] در منثور جلد ۶ ص ۷۳، طبری جلد ۲۶ ص ۵۲ [2] ابن اثیر نے نہایہ میں لکھا ہے، فروخ جناب ابراہیم کے فرزند[ان] میں سے تھے جن کو اللہ نے کثیر الاولاد بنایا تھا، غیر عرب ان ہی کے فرزندوں کی اولاد ہیں (نہایہ جلد ۳ ص ۲۵ ۴ باب الفاء مع الراء)
[3] تاریخ اصبہان جلد ۱ ص ۵ [4] ایضاً ج اول ص ۴ [5] ایضاً و میزان الحکمۃ ج ۷ ص ۲۳۰ بہ نقل از کنز العمال۔
[6] تاریخ اصبہان جلد اول ص ۴۔ اسی کتاب میں ابو نعیم سے اس مضمون کی بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں ملاحظہ فرمائیں از ص ۲ تا ص ۱۴ مزید اطلاع کے لئے دیکھیں، بخاری ۶ ص ۱۸۹، عمدۃ القاری ج ۱۹ ص ۲۳۵، صحیح مسلم ج ۴ ص ۱۹۷۲ الرقم ۲۵۴۶، فتح الباری ج ۸ ص ۴۹۲ و ۴۹۳، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۴ و ۶۵، میزان الحکمۃ ج ۷ ص ۲۳۰ بہ نقل از کنز العمال [7] تاریخ اصبہان ج ۱ ص ۷

اس حدیث میں جس کے راوی خود جناب سلمان فارسی ہیں پیغمبر اسلام نے جناب سلمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔
اے سلمان! اگر دین ثریا میں معلق ہو تو اہل فارس کی ایک جماعت اس تک پہنچ جاتی۔ اس کے بعد ان کی کچھ خصوصیات بیان فرماتے ہیں۔

- یہ لوگ پیغمبر اسلام کی سنت پر عمل پیرا رہتے ہیں (رائے، قیاس اور استحسان پر عمل نہیں کرتے۔
- یہ لوگ رسول اللہ صلعم کے آثار تلاش کر کے انھیں زندہ کرتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔
- یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت زیادہ درود و صلوات بھیجتے ہیں (آج یہ شیعیان محمد وآل محمد کے شعار میں داخل ہے) اس کے بعد نبی اکرم سلمان فارسی کو حکم دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے تین گروہوں کو ہمیشہ دوست رکھنا:۔

۱۔ مجاہدین — جو اپنے جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔
۲۔ سرحدی محافظین — جو اسلامی سرحدوں کی حفاظت میں ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔
۳۔ سپاہیان اسلام — جو میدان جنگ میں دشمنان خدا سے نبرد آزمائی کرتے ہیں۔

یہ تینوں خصلتیں (مذکورہ بالا تینوں اوصاف کے ساتھ) ایران کے سرفروش مجاہدین کے اندر مشاہدہ کی جا سکتی ہیں شاید اس قوم کے اوصاف کا ذکر کرنے کے بعد ان تینوں گروہوں سے محبت رکھنے کا حکم اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ قوم ان تینوں خصلتوں سے بھی متصف ہے۔

۱۰۔ عن ابن عباس وذكرت عنده فارس فقال فارس عصبتنا اهل البيت[۱]

ابن عباس سے نقل ہے کہ جس وقت ان کے سامنے اہل فارس کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ: اہل فارس ہم اہلبیت کے وابستگان میں سے ہیں۔

۱۱۔ "... ان اسعد العجم بالاسلام اهل فارس..."

غیر عرب عجمیوں میں سب سے زیادہ اسلام کے ناصر اہل فارس ہیں[۲]

۱۲۔ ذكرت الموالى او الاعاجم عند رسول الله (ص)، فقال: والله لانا اوثق بهم منكم او من بعضكم[۳]

۱۔ تاریخ اصبہان ج ۱ ص ۱۲
۲۔ تاریخ اصبہان ج اول ص ۱۲، میزان الحکمۃ جلد ۷ ص ۴۳۰ بہ نقل از کنز العمال۔
۳۔ تاریخ اصبہان جلد اول ص ۱۲ (مختلف سندوں کے ساتھ)

رسولؐ اسلام کے سامنے موالی یا غیر عرب افراد کی گفتگو آئی تو حضرتؐ نے فرمایا: خدا کی قسم مجھے ان پر اس سے زیادہ اعتماد ہے جتنا تم لوگوں پر یا تم میں سے کچھ لوگوں پر ہے۔

۱۳۔ عن ابی هریرة عن النبی (ص) ذکرت عنده فارس فقال: وهل الناس الا اولئك؟

ابوہریرہ نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے سامنے اہل فارس کا تذکرہ ہوا تو نبیؐ نے فرمایا: کیا انسان ان کے علاوہ بھی لوگ جواں مرد ہیں؟

۱۴۔ لمّا ورد بسبی الفرس الی المدینة اراد عمر ان یبیع النساء وان یجعل الرّجال عبید العرب وعزم علی ان یحمل العلیل والضعیف والشیخ الکبیر فی الطّواف وحول البیت علی ظهورهم، فقال امیر المومنین علیه السلام: إنّ النبی صلی الله علیه وآله قال: اکرموا کریم قوم وان خالفوکم وهؤلاء الفرس حکماء کرماء فقد القوا الینا السلام ورغبوا فی الاسلام۔ الحدیث۔

جس وقت ایرانی قیدی مدینہ میں وارد ہوئے حضرت عمر نے ان کی عورتوں کو بیچ دینے اور مردوں کو عربوں کی غلامی میں دینے اور اس طرح طواف خانہ کعبہ کے وقت بیماروں اور کمزوروں کو ڈھونے کا کام لینے کی خواہش ظاہر کی، اس وقت امیر المومنین علی علیہ السلام نے کہا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ہر کریم قوم کا احترام کرو چاہے وہ تمہارے مخالف ہی کیوں نہ ہوں اور یہ ایرانی اہل حکمت اور کریم ہیں خود کو ہمارے حوالے کر چکے ہیں اور اسلام قبول کرنے پر بھی تیار ہیں ....[1]

۱۵۔ یخرج ناس من المشرق فیوطئون للمهدی سلطانه۔

سرزمین مشرق سے لوگ اٹھیں گے اور امام مہدی علیہ السلام کی سلطنت کے مقدمات فراہم کریں گے۔[2]

۱۶۔ امیر المومنین علیہ السلام نے ایران اور عرب کے درمیان مستقبل میں پیش آنے والی مقابلہ آرائی کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے اس تاریخی بیان میں ایرانیوں کے حق پر ہونے اور عربوں کے باطل پر ہونے کی خبر دی ہے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:۔

---

[1] تاریخ اصفہان جلد اول ص ۱۱ ۔ [a] بحار الانوار جلد ۴۵ ص ۳۳۰ (مناقب کے حوالے سے)

[2] المعرفة والتاریخ جلد ۲ ص ۲۹۷ اور ابن ماجہ (فتن) ص ۳۴۔

جاء الاشعث بن قیس الی امیر المومنین علیہ السلام یتخطی رقاب الناس وعلیٌ علیہ السلام علی المنبر۔ فقال: یا امیر المومنین غلبتنا ھٰذہ الحمراء علی قربك ــ یعنی العجم ــ قال: فرکض علیٌ المنبر برجلہ فقال: صعصعة بن صوحان: مالنا ولھٰذا ــ یعنی الاشعث ــ لیقولنّ امیر المومنین الیوم فی العرب قولا لا یزال یذکر۔

فقال رضی اللہ عنہ: من یعذرنی من ھٰؤلاء الضیاطرة یتمرّغ احدھم علی فراشہ تمرّغ الحمار یھجر قوم (للذکر: کامل) فیأمرنی ان اطردھم، ماکنت لاطردھم فاکون من الجاھلین والذی فلق الحبة وبرء النسمة لیضربنکم علی الدین عوداً کما ضربتموھم علیہ بدءاً۔

اشعث بن قیس لوگوں کے پیچھے پیچھے امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں جا پہنچا، اس وقت حضرت منبر پر تشریف فرما تھے۔ اشعث نے آواز دی یا امیر المومنین! یہ سرخ پوست (یا سفید پوست)[1] افراد ہیں آپ کے قریب آنے سے روکتے ہیں۔ مولائے کائنات نے اپنا پاؤں منبر پر مارا، صعصعہ بن صوحان نے عرض کی ہم کو اشعث سے کیا کام، آج تو امیر المومنین عربوں کے بارہ میں وہ بات کہنے والے ہیں جو تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جائے گی ــ اس وقت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: کون ہے جو ان خیاطرہ سے مجھے نجات دے، (یعنی ان خیر سے عاری لئیم افراد کو مجھ سے دور کرے) ان میں سے ایک گدھے کی طرح اپنے مقام پر پڑا اینڈ رہا ہے اور ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ذکر و موعظہ سننے کے لئے سخت گرمی برداشت کرتا ہے (اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے) اب آپ مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ان کو خود سے دور کر دوں اور ان کم فہموں کے درمیان رہوں۔

قسم اس خدا کی جو دانہ کو شگافتہ کرتا ہے اور انسانوں کا خالق ہے یہ لوگ (غیر عرب) تم

---

[1] ہر دو احتمالات کا لغت میں ذکر ملتا ہے۔

(عربوں) کو دین خدا کے (تحفظ) کے لئے شکست دیں گے تاکہ دوبارہ اسلام کا احیاء ہو سکے اسی طرح جیسے کہ تم نے ان کو شکست دی تاکہ وہ اسلام قبول کریں"[1]

"الحمراء" موالی کو کہتے ہیں جن کا تعلق روم و فارس سے ہے مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت منبر امیر المومنین کے اردگرد فقط ایرانی افراد ہوتے تھے۔

گفتگو کے اختتام پر چند نکتوں کی طرف متوجہ کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ ان تمام احادیث میں خصوصاً آیۂ کریمہ "وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم" کی تفسیر کے ذیل میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت میں ذکر شدہ اوصاف کے علاوہ اس قوم کے علم و دانش کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے شاید اس عنوان سے اس قوم میں پیدا ہونے والے علمائے دین اور علمی شخصیتوں نے دین کی جو علمی و قلمی خدمتیں انجام دی ہیں ان کو یاد دلانا مقصود ہو اور تاریخی طور پر یہ حقیقت بالکل روشن و واضح ہے۔

چنانچہ ظاہری علوم دینی کے علاوہ چونکہ یہ لوگ اہلبیت علیہم السلام کے دامن سے متمسک رہے ہیں اور حاملان علم لدنی سے براہ راست کسب فیض کرتے رہے ہیں لہٰذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے منبع وحی سے حقیقی اسلام حاصل کیا اور حقیقی علوم کے مالک ہوئے اور دین خدا کو ہر طرح کے انحرافات سے محفوظ رکھا گویا حضور صلعم نے یہ جملے ایرانیوں کی اہلبیت علیہم السلام سے عقیدت و پیروی کے پیش نظر ان کی اہمیت و عظمت واضح کرنے کے لئے خاص طور پر جناب سلمان فارسی کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: یتبعون سنتی ویتبعون آثاری ویکثرون الصلواۃ علیّ (اور یہ نکتہ بہت زیادہ قابل توجہ ہے)

اس حقیقت سے قطع نظر خود آیت میں اس قوم کی جن خصوصیات کا ذکر ہے ان کا بھی علم و ایمان

---

[1] "الکامل" للمبرد ج اول ص ۲۸۴ اور ایک نسخہ میں ج ۲ ص ۶۲ - نثر الدرر، مولفہ آبی ج اول ص ۲۹۹ و ۳۰۰، ابن ابی الحدید جلد ۱۶ ص ۱۲۴ و جلد ۲۰ ص ۲۸۴، بحار جلد ۴۱ ص ۱۱۸، غارات ثقفی پر مرحوم محدث کے حواشی جلد ۲ ص ۸۲۹ بنقل از کامل مبرد جلد دوم ص ۵۳، تہذیب الکامل سہامی جلد ۲ ص ۱۱۶ و ۱۱۷، شرح کامل مرصفی جلد ۴ ص ۱۹۴ - ابی عبید کی غریب الحدیث جلد ۳ ص ۴۱۷، لسان العرب اور نہایہ ابن اثیر در ضطر، قاموس الرجال ج ۲ ص ۹۹ اور مجمع الصیانۃ ج ۱۳ ص ۴۰۰ - ۴۰۱

ے گہرا ربط ہے بالکل ویسے ہی جیسے ان کی مخالف صفتیں جہل و نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کیونکہ بعض وقت خداوند تبارک و تعالیٰ نے ایک عمل کی ملامت کرتے ہوئے اس کو کار جاہلانہ سے تعبیر کیا ہے مثال کے طور پر جب جناب موسیٰ سے ان کی قوم نے کہا: "اتتخذنا ھزوا" کیا تم ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو تو موسیٰ کا جواب خداوند عالم نے یوں نقل فرمایا: ۔ "اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین" [۱] خدا نہ کرے کہ میں جاہلوں کی سیرت پر عمل کروں یعنی بجائے اس کے کہ کہدیتے میں مذاق و تمسخر کی باتیں نہیں کرتا اس بیہودہ عمل کو ہی جاہلانہ قرار دیدیا ہے۔ اسی طرح جناب نوحؑ سے ان کے بیٹے کے سلسلہ میں یہ کہتے ہوئے کہ فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم" (اس امر کا مجھ سے سوال نہ کرو جس کے حال سے تم آگاہی نہیں رکھتے)

خداوند عالم فرماتا ہے: انی اعظک ان تکون من الجاھلین (سورہ ہود/۴۶) میں تم کو نصیحت کرتا ہوں اس کو سنو اور جاہلین میں خود کو شامل نہ کرو۔ ایک دوسری جگہ کفار پر مسلمانوں کی فتح و کامرانی کی علت بیان کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے:... ان یکن منکم مأة یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون" (سورہ انفال/۶۵) اور اگر تم میں ثابت قدم رہنے والے سو افراد ہوں گے تو ہزار کفار پر غالب آجائیں گے کیونکہ یہ لوگ (کفار) عقل سے کورے ہیں۔ ایک مقام پر کفار کے خوف کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے: لانتم اشد رھبۃ فی صدورھم من اللہ ذالک بانھم قوم لا یفقھون (حشر/۱۳) ان کے دلوں میں تمہاری ہیبت خدا سے بھی زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ یہ لوگ اس قوم سے ہیں جو عقل سے عاری ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا قول یوں نقل کیا گیا ہے: اصب الیھن و اکن من الجاھلین (یوسف/۳۳) .... تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور جاہلوں میں شمار کیا جاؤں۔

یہی وجہ ہے کہ قوم ایران کی فضیلت بیان کرتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ لوگ صفات رذیلہ سے پاک ہیں یہ کہدیا ہے کہ یہ لوگ علماء سے ہیں۔

۲۔ قارئین کرام اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ ان احادیث میں مختلف لفظیں استعمال ہوئی ہیں مثلاً بعض روایات میں "لو کان الایمان" اور بعض میں "لو کان الدین" ایک جگہ "لو کان العلم" یا "لو کان ھذا العلم" اور ایک دوسری جگہ "لو کان الاسلام" آیا ہے، کہیں "لو کان الدین یا الخیر" وارد ہوا ہے۔ چنانچہ اگر یہ تمام کے تمام جملے صادر ہوئے ہوں پھر بھی ان کے مضامین باہم تفاوت نہیں رکھتے۔

---

[۱] بقرہ/۶۷

۳۔ اہلبیت علیہم السلام سے مروی روایتوں میں ایران کے بعض شہروں کو خصوصی طور پر مورد تعریف و تمجید قرار دیا گیا ہے مثال کے طور پر قم اور طالقان وغیرہ، اور یہ تعریفیں تمام ایرانیوں کی مدح سرائی سے منافات نہیں رکھتیں کیونکہ بعض وقت تمام ایرانیوں کی تعریف بیان کرنا مقصود ہے لیکن ان کے درمیان کچھ لوگ خاص عظمت و اہمیت کے حامل ہونے کی بنا پر خصوصی عنایتوں کے مستحق قرار دئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر افراد کے صفات و خصوصیات کی پوری قوم کی طرف نسبت دیدی جائے۔ لیکن پہلی صورت نظر میں زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔

اس بات کی تائید کے لئے مندرجہ ذیل دو حدیثیں کافی معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ رجل من اهل قم یدعو الناس الی الحق یجتمع معه قوم کزبر الحدید لاتزلهم الریاح العواصف ولا یملّون من الحرب ولا یجبنون وعلی الله یتوکلون والعاقبة للمتقین"

اہل قم سے ایک شخص لوگوں کو حق کی طرف دعوت دے گا اور اس کے ارد گرد قوم کے لوگ اکٹھا ہوں گے جو آہن و فولاد کی مانند ہوں گے اور حوادث کی تیز و تند آندھیاں ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں گی وہ جنگ سے خستہ نہوں گے (اس کو جاری رکھیں گے) خداوند عالم پر توکل کریں گے اور آخرت کی بھلائی متقین کے لئے ہے۔[1]

۲۔ کنت عند ابی عبد الله علیه السلام جالساً اذ قرء هذه الآیة "فاذا جاء وعد اولیهما بعثنا علیکم عباداً لنا اُولی باس شدید فجاسوا خلال الدیار وکان وعداً مفعولا" فقلنا جعلنا فداک من هؤلاء؟ فقال (ثلاث مرات) وهم والله اهل قم۔

میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے قریب بیٹھا تھا کہ یہ آیت پڑھی گئی "جب وقت انتقام آپہنچے گا تو ہم تم پر اپنے جنگجو بہادر بندوں کو مسلط کر دیں گے۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے گھروں میں گھس گھس کر تلاشیاں لیں گے اور بخدا کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا (سورہ اسراء/۵) ہم نے عرض کی مولا! ہماری جانیں آپ پر فدا ہو جائیں یہ کون لوگ ہیں؟ امامؑ نے تین مرتبہ فرمایا خدا کی قسم یہ قم کے لوگ ہیں۔[2]

اور یہ بات مسلّم ہے کہ یہاں تنہا اہل قم مراد نہیں ہیں لیکن ایک تو قم کو مرکزیت حاصل ہے دوسرے چونکہ خود قائد رہبر کا تعلق قم سے ہے اس لئے امام علیہ السلام نے "وهم والله اهل قم" فرمادیا ہے۔

۱ و ۲۔ بحار الانوار جلد ۵۷ ص ۲۱۶ و سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۴۴۶

ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

زائرین بیت اللہ الحرام کے نام امام خمینی کا تاریخی پیغام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ومن یخرج من بیتہ مہاجراً الی اللہ و رسولہ، ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ[1]

الحمد للہ علی آلائہ والصلوۃ والسلام علی انبیائہ سیما خاتمہم وافضلہم وعلی اولیائہ وخاصۃ عبادہ سیما خاتمہم وقائمہم ارواح العالمین لمقدمہ الفداء۔

خالق کونین کی ان لامتناہی نعمتوں کے شکر سے جن سے ساری دنیا فیضیاب ہوتی رہی اور ہو رہی ہے لوگوں کے قلم اور زبانیں تحریریں اور تقریریں عاجز ہیں وہ خالق جس نے عالم غیب اور عالم شہادت، عالم ظاہر اور عالم باطن ہر ایک کو اپنے سربسر نورانی جلووں سے نواز کر زیور وجود سے آراستہ و پیراستہ کر دیا اور پھر اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ ہمیں پیغام معرفت دیا کہ: اللہ نور السموٰت والارض (زمین سے لیکر آسمانوں تک اللہ کا ہی نور پھیلا ہوا ہے) اور اپنے ظہور جمیل کے ذریعہ جمال الٰہی کی حقیقت آشکار کر دی کہ "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" (وہی اول بھی ہے اور آخر بھی وہی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی) وہ جس نے غیب سے آدم صفی اللہ سے لیکر ابراہیم خلیل اللہ تک اور پھر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد حبیب اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ علیہم وسلم تک اپنے

---

[1] اور جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ کی راہ میں وطن چھوڑ کر ہجرت اختیار کرتے ہیں اور پھر (اس راہ میں) موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں ان کا اجر خدا کے ذمہ ہے ـــ (سورۂ نساء/۱۰۰)

نبیوں پر اپنی طرف سے مقدس آسمانی کتابیں نازل فرما کر ہمیں کمال و عرفان کی راہ پہ چلنے اور ذات کمال مطلق میں فنا ہوجانے کا درس دیا۔ خدا کی جانب سیر و سلوک کی راہیں طے کرنے کے لئے نغمۂ قرآنی میں ڈھال کر یہ آواز ہمارے کانوں تک پہنچادی "من یخرج من بیتہ مہاجراً الی اللّٰہ ....." اور یہ بھی بتادیا کہ کس طرح اپنے دوستوں اور مومنوں سے ملا جائے اور کس طرح اپنے دشمنوں، ملحدوں اور مستکبروں سے پیش آیا جائے محمد رسول اللّٰہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلہ میں نہایت ہی سخت لیکن آپس میں بہت ہی مہربان ہیں)

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم کو خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں قرار دیکر تمام موجودات پر شرف و برتری عطا کی اور اپنی تمام مقدس کتابوں میں اشرف و اعظم اس قرآن مجید کی پیروی کا اعزاز بخشا جس کو غیبی ہاتھوں نے جمیع کمالات سے مزین کر کے کتبی طور پر ایک مجموعہ کی شکل میں نازل فرمایا اور اس کی حفاظت کی ضمانت لے کر اسکو تمام شیاطین جن وانس کی دستبرد سے محفوظ رکھا: "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) وہ قرآن جس میں نہ تو ایک حرف کی زیادتی اور نہ ہی ایک حرف کی کمی ہوئی ہے، وہ مکرم و مقدس کتاب جس نے ہمیں آگاہ کیا کہ تاریخ کے اس طویل دور میں کس کس طرح خدا کے برگزیدہ انبیاء دنیا کی بڑی بڑی استکباری قوتوں کے ساتھ پیش آئے۔ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے وقت کے ظالم و ستمگر کفار و مشرکین خصوصاً منافقین کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا، اس سے مطلع کیا — اور یہ طریقۂ معاشرت ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ایک زندہ نمونہ ہے۔

اسی زندہ و جاوید کتاب میں اس نے فرمایا: قل ان کان اباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللّٰہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتیٰ یاتی اللّٰہ بامرہ واللّٰہ لا یہدی القوم الفاسقین (اے ہمارے رسولؐ!) کہہ دو کہ اگر تم لوگوں کو تمہارے آباء و اجداد، فرزند و برادر، ازواج قرابتدار اور وہ مال و منال جو تم نے کما کر رکھ چھوڑے ہیں یا وہ تجارت جس کے ٹھنڈا پڑ جانے کا تم کو خوف کھائے جا رہا ہے اور وہ (عالیشان) محل جس پر تم لوگ لہالوٹ ہو رہے ہو، خدا اور اس کے رسول کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں۔ تو ٹھہرو! یہاں تک کہ پروردگار اپنا حکم (عدل و داد) نافذ کر دے یقیناً خدا فاسق (و فاجر) قوموں کی ہدایت نہیں کرتا۔ (توبہ/۲۴)

اس میں مفاد پرستوں، دشمن سے سازباز کرنے والے منافقوں سے خطاب کرتے ہوئے جوانوں کی شہادت، جان و مال کے فقدان نیز دیگر خسارات دنیوی کا ذکر کیا گیا ہے اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت کے بعد دیگر تمام احکام الٰہی میں سے صرف جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر کرکے اس بات سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ تمام احکام میں سرفہرست خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے کیونکہ اسی پر تمام اصول اسلام کی حفاظت کا دارومدار ہے۔ یہاں اس چیز سے بھی ہوشیار کر دیا گیا ہے کہ جہاد سے روگردانی اور بیٹھے رہنے کی صورت میں تمہیں اس کے نتائج کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ ذلت و غلامی کی زندگی، انسانی وقار اور اسلامی اقدار کی تباہی و پامالی، نیز وہی ساری چیزیں جن کے بارہ میں تم خوف زدہ (ہوکر جہاد سے گریز اختیار کرنا چاہتے) ہو چاہے وہ تمہارے صغیر و کبیر کا قتل ہو یا ازدواج و خاندان کی اسیری اور غلامی ہو، ترک جہاد کا نتیجہ بہرحال اسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے خصوصاً اس وقت جبکہ دفاعی جہاد کی منزل ہو جس میں کہ آج ہم (اہل ایران) گرفتار ہیں — چنانچہ قرآنی آیت: فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم (وہ لوگ جو اس کے حکم سے گریز (یا مخالفت) کرتے ہیں ان کو اس بات سے ڈرتے رہنا چاہئے کہ (کہیں ایسا نہ ہو) ان پر کوئی مصیبت آپڑے یا کسی دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائیں — نور/۶۳) اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر کون سی مصیبت و بلا ممکن ہے جو دشمنان اسلام، خصوصاً موجودہ دور میں، اسلام کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے اور ظلم و ستم پر مبنی شاہی حکومتیں قائم کرنے نیز استعماری اشاروں پر ناچنے والے لٹیرے شیروں کو دوبارہ واپس لا کر نسل اور پیداوار کو تباہ و برباد کر دینے کے سلسلہ میں کر رہے ہیں وہ فتنے اور بلائیں جن سے آج ملک ایران اور اس کی غیور قوم دوچار ہے، وہ مصیبتیں اور بلائیں جن میں ادھر چند برسوں سے ملک عراق اور اس کے مظلوم عوام گرفتار ہیں۔

بے انتہا حمد و شکر اس بزرگ و عظیم ذات احدیت کا جس کی عنایتوں کے صدقہ میں آج جبکہ ایران کے محترم حجاج عشق و معرفت کے معبد اور محبت و ارادت کے مرقد کی طرف عازم ہیں خداوند متعال کی بارگاہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آرام گاہ کی جانب ہجرت پر کمربستہ ہیں، آوازہ اسلام سے کائنات کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے۔ اسلام کا معنوی پرچم دنیا کے چپہ چپہ پر لہرا رہا ہے، ساری دنیا کی نظریں ولی امر بقیۃ اللہ الاعظم ارواحنا لمقدمہ الفداء کے ملک پر جمی ہوئی ہیں، وہ بدخواہ و منحرف عناصر غم میں بیٹھے ہوئے ہیں جن کی ذلت و رسوائی کا ڈھول مجمع عام میں پیٹا جا چکا ہے، وہ جنھوں نے اپنے دوستوں اور آقاؤں سے تین ماہ یا زیادہ سے زیادہ سال بھر کے اندر اندر جمہوریہ اسلامی کے خاتمہ کا وعدہ کیا تھا ان کے تمام خواب خرگوش ہوا ہو گئے اور اس کے برخلاف آج کئی برس

گزر جانے کے بعد بھی مملکت اسلامی ایران ہمیشہ سے زیادہ پائدار و مستحکم، اس کے عوام پہلے سے زیادہ پر وقار و سرفراز اس کی فوجی طاقت پہلے سے زیادہ منظم و با اختیار، اس کے جوان اور بوڑھے پہلے سے زیادہ پُر عزم و باحوصلہ اور اسکی مقدس علمی درسگاہیں، مراجع عظام و علمائے اعلام کی نگرانی میں پہلے سے زیادہ مشغول و بارونق نظر آرہی ہیں۔ دینی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے درمیان ایک محکم و استوار ہم آہنگی وجود میں آچکی ہے، ملک کے تینوں شعبہ نظام، عدلیہ، مجریہ اور مقننہ پہلے سے زیادہ متحرک و فعال ہیں، سیاسی، ثقافتی اور فوجی جدوجہد ترقی و ارتقا کی طرف گامزن ہے۔ اس کے تمام دشمن، جو دراصل اسلام اور ملک کی آزادی و استقلال کے دشمن ہیں پہلے سے کہیں زیادہ کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں۔ مستکبرین عالم کے محل لرزاں ہیں کاخ سیاہ" (وائٹ ہاوس) کی ذلت و رسوائی برملا ہو چکی ہے محل نشینوں کی بے چینی اور اضطراب عروج پر پہنچ چکا ہے۔ آج عالمی ذرائع ابلاغ کی حیرانی و پریشاں فکری، جو خود ان محل نشینوں کی حیرت و پراگندہ ذہنی کی آئینہ دار ہے، پہلے سے کہیں زیادہ روشن و آشکار ہو چکی ہے۔

ضروری ہے کہ اس وقت کی موجودہ فضا اور حالات سے دنیا کی تمام کمزور قومیں پوری بیداری و آگاہی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں، نیز سبھی اسلامی فرقوں اور کمزور و محروم قوموں کو ہاتھ میں ہاتھ دیکر خود کو بڑی طاقتوں کی غلامی اور اسیری سے نجات دلانی چاہئے۔ چنانچہ چند باتیں تذکر کے طور پر یہاں عرض کرنی ہیں:۔

۱۔ مشرکین سے اعلان برائت — چونکہ یہ عقیدۂ توحید کا ایک اہم رکن اور حج کے سیاسی فرائض میں سے ہے، لھذا ایام حج کے دوران یہ کام بہتر سے بہتر طور پر پوری شان و شوکت کے ساتھ عظیم مظاہرے اور جلوس کی صورت میں انجام دیا جانا چاہئے۔ تمام ایرانی و غیر ایرانی حجاج کرام میرے نمائندہ جناب حجۃ الاسلام آقای کروبی نیز دیگر تنظیمیں حج سے بھرپور تعاون کرتے ہوئے تمام مراسم حج میں شرکت فرمائیں اور مرکز توحید، جوار خانۂ خدا میں تمام شرک و ملحد عالمی استکبار کی طاقتوں خاص طور پر جرائم پیشہ امریکہ کے خلاف ذہنوں کو جھنجوڑ دینے والے "برائت" کے نعرے لگائیں اور یاد رکھیں کہ کسی وقت بھی، خدا اور اس کے بندوں کے دشمنوں کے خلاف اپنے غیظ و غضب کے اظہار سے غافل نہ ہوں۔

کیا جب تک حق کی نسبت اعلان محبت و وفاداری اور باطل کے خلاف اظہار نفرت و بیزاری نہ کی جائے کسی اور طریقہ سے دین و دیانت متحقق ہو سکتی ہے؟ موحدین کا عشق و خلوص مشرکین و منافقین سے مکمل طور پر نفرت و بیزاری ظاہر کئے بغیر ہرگز میسر نہیں آسکتا اور اس کے لئے مرکز امن و طہارت، مرجع عالم، خانہ کعبہ سے زیادہ

کروائی
کون سی جگہ سزاوار و مناسب ہوسکتی ہے۔ جہاں ہر طرح کے ظلم و زیادتی، استحصال و غلامی، رذالت و پست
سے انسان قول و عمل ہر دو اعتبار سے منہ پھیر لیتا ہے جہاں ایک نئے عہد و میثاق "الست بربکم" کے ذریعہ
جھوٹے خداؤں اور تفرقہ پھیلانے والے آقاؤں کے بت ٹوٹ جاتے ہیں پیغمبر اسلامؐ کی اہم ترین و عظیم ترین سیاسی
جدوجہد کی یادیں "واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر" کی شکل میں زندہ ہوکر دہرائی
جانے لگتی ہیں۔ کیونکہ رسول اکرم کی سنت و سیرت "اعلان برائت" پر کہنگی و قدامت کی مہر نہیں لگائی جا سکتی اور
نہ صرف یہی بلکہ یہ اعلان برائت مراسم حج تک محدود نہیں کیا جا سکتا مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ذات حق کے تئیں اپنے
عشق و محبت اور دشمنان خدا کے تئیں عملی طور پر اپنی بیزاری و نفرت سے کائنات کو لبریز کردیں۔ شیطانی خناسوں کے
وسوسوں اور متعصب و منحرف استعمار کے جھوٹے پروپیگنڈوں پر بالکل کان نہ دھریں ایک لمحہ کے لئے بھی
توحید کے مقدس نغمے اور اسلام کے آفاقی پیغام سے غفلت نہ برتیں اس لئے کہ یقینی طور پر دنیا کو ہڑپ کر جانے
کی نیت رکھنے والے دشمنان قوم و ملت اب اس کے بعد ہرگز چین سے نہ بیٹھیں گے کسی نہ کسی حیلے اور مکر و فریب
کے ذریعہ مختلف چہروں میں ظاہر ہوں گے کبھی روحانی علماء کے لبادہ میں کبھی درباری منقیتوں کے لباس میں کبھی
سلطنت کے نمک خواروں کی صورت میں اور کبھی قوم پرستی اور نفاق کی شکل میں غلط فلسفوں، تفسیروں اور
تاویلوں کے ذریعہ دنیا کو منحرف کرنے کی کوششیں کریں گے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ان کے اسلحے چھین لینے
اور امت محمدی کی شان و شوکت اور قدرت و اقتدار پر ضرب وارد کرنے کے لئے وہ کسی بھی کام سے ہرگز
دریغ نہ کریں گے۔

بہت ممکن ہے کہ جاہل و تنگ نظر افراد یہ آواز اٹھائیں کہ اپنی نعرہ بازی جلسوں و مظاہرے اور اعلان
برائت کے ذریعہ خانۂ حق کعبۂ معظمہ کے وقار و احترام کو توڑنا درست نہیں ہے حج عبادت و ذکر کا مقام
ہے نہ کہ یہاں جنگ اور صف آرائی کی جائے، اور یہ بات بھی بعید نہیں کہ ضمیر فروش علماء لوگوں کو یہ باور کرانے
کی کوشش کریں کہ جہاد و برائت اور جنگ و پیکار دنیا داروں اور دنیا طلبوں کا کام ہے۔ سیاسی معاملات میں
دخل اندازی اور وہ بھی ایام حج میں علماء اور روحانیوں کی شان کے منافی ہے۔ دراصل یہ تبلیغات خود عالمی
استعمار کی خفیہ سیاسی کوششوں اور سرگرمیوں کی دین ہے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام تر ضروری
امکانات و وسائل کا سہارا لیکر اس کا مقابلہ کریں اور اقتدار اسلامی کے تحفظ نیز منافع مسلمین کے دفاع
کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں صفوف مجاہدین میں شامل ہوکر اپنے مقدس دفاعی محاذ کو محکم و مستحکم بنائیں اور ان

غفلت و بے خبری میں مبتلا مردہ دل شیاطین کے اشاروں پر چلنے والوں کو اب اس سے زیادہ مسلمانوں کے عقائد و افکار اور عزت و وقار پر حملہ کرنے کی اجازت نہ دیں۔

ہر جگہ اور ہر سرزمین سے خصوصاً کعبۂ حق سے الٰہی فوج میں شمولیت اختیار کریں اور زائرین محترم بہترین و مقدس ترین سرزمین عشق و جہاد و آگہی سے ایک بالاتر کعبہ کی طرف پیش قدمی کریں، شہیدوں کے سید و سالار حضرت ابی عبد اللہ الحسین علیہ السلام کی طرح احرام حج سے احرام حرب، طواف کعبۂ و حرم سے طواف صاحب بیت کی طرف قدم بڑھائیں اور آب زمزم سے وضو کے بعد غسل شہادت و خون کی طرف رخ کریں، سیسہ پلائی دیوار اور ناقابل شکست ملت میں تبدیل ہو جائیں تاکہ شرق و غرب کی کوئی بھی بڑی سے بڑی طاقت ان سے مقابلہ کی ہمت و جرأت پیدا نہ کر سکے کیونکہ یقینی طور پر حج کی اصل روح اور پیغام اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ یہاں آکر دنیا بھر کے مسلمان جہاد بالنفس کے دستور پر بھی عمل کریں اور کفر و شرک سے مقابلہ کے لئے منصوبہ بھی بنائیں۔

بہر حال حج کے دوران اعلان برائت، انقلاب و جہاد کے لئے تجدید عہد نیز کفر و شرک اور بت پرستیوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے مجاہدین کو منظم کرنے کی ایک مشق ہے اور یہ صرف نعرے لگا دینے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ جہادی منشور کے اعلان کا موقع نیز ابلیس اور ابلیس صفت افراد کے لشکروں کے مقابلہ میں ایک الٰہی لشکر کی تشکیل کا ابتدائی مرحلہ ہے اور اس کا توحید کے اولین اصولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر مسلمان "خانۂ ناس" اور "خانۂ خدا" میں دشمنان خدا سے اظہار برائت نہ کریں تو پھر کہاں وہ اس کا اظہار و اعلان کریں۔ اگر حرم و کعبہ اور مسجد و محراب خدا کے جانبازوں نیز حرمت انبیا اور عظمت حرم کے پاسبانوں کے لئے حفاظتی مورچے نہیں بن سکتے تو پھر ان کا مأمن و پناہ گاہ اور کہاں ہے۔

مختصر یہ کہ اعلان برائت، جہاد کا پہلا مرحلہ ہے اور اس کو دیگر مراحل تک پہنچانا ہمارا فریضہ ہے۔ ہر عصر اور ہر زمانہ اپنے مطابق حال مخصوص طریقۂ و روش اور منصوبہ سازی کا طالب ہوتا ہے۔ آج کے جیسے دور میں جبکہ سربراہان کفر و شرک کے ہاتھوں توحید کا اصل وجود ہی خطرہ میں پڑا ہوا ہے اور یہ لوگ ملتوں کی قومی، ثقافتی، دینی و سیاسی نشانیوں کو اپنی ہوس و شہوت رانی کا ایک کھلونا بنائے ہوئے ہیں ایسے میں ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہمارا کیا فرض ہے۔ آیا گھروں میں بیٹھ کر حالات کا ایک غلط جائزہ پیش کر کے انسانی عظمت و وقار کی پرواہ کئے بغیر مسلمانوں میں عاجزی و ناتوانی کے جذبات پیدا کر کے شیطان اور شیطان زادوں کو برداشت

کرتے رہنا چاہئے اور کیا معاشرہ کو کمال کی آخری منزل اخلاص تک پہنچنے سے روک دینا چاہئے ؟

کیا آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام نے بتوں اور بت پرستوں کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں وہ محض بے جان پتھروں اور لکڑی کے کندوں تک منحصر ہے ؟ نعوذ باللہ جناب ابراہیم علیہ السلام جیسے پیغمبران خدا نے بے جان بتوں کے توڑنے میں تو پیش قدمی دکھائی لیکن جب ستمگروں سے مقابلہ کی نوبت آئی تو میدان چھوڑ کر الگ ہٹ گئے ؟!

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تمام بت شکنی اور نمرود یوں نیز ماہ و خورشید و ستارہ پرستوں سے لڑی جانے والی تمام جنگیں اور مقابلہ آرائی ایک عظیم ہجرت کا مقدمہ تھیں۔ وہ ہجرت پر ہجرت اختیار کرنا مصیبتوں کو برداشت کرتے رہنا اور ایک وادی غیر ذی ذرع میں جاکر سکونت اختیار کر لینا اور پھر بیت خدا کی تعمیر اور جناب اسمٰعیل کی قربانی یہ سب کچھ اس بعثت و رسالت کا مقدمہ ہے کہ جہاں آخری پیغامبر، خانہ کعبہ کے پہلے اور آخری بانیوں اور موسسوں کا کلام دہراتے ہوئے اپنی ابدی رسالت کے ابدی پیغام : انني بری مما تشر کون (تم جن چیزوں کو (خدا کا) شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار و متنفر ہوں - انعام/ ۱۹) کی تبلیغ کرتا نظر آتا ہے اور اگر اس تجزیہ و تحلیل کے علاوہ ہم کچھ اور رائے پیش کریں تو ماننا پڑے گا کہ موجودہ دور میں اصنام اور بت پرستی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے ۔ سچ بتایئے وہ کون سا عاقل انسان ہے جو بت پرستی کے جدید اور ماڈرن انداز جو مختلف شکلوں، نیرنگیوں اور ذاتی حیلہ و مصلحت کی بنیاد پر ڈھال لئے جاتے ہیں ان کو نہ پہچانتا ہو اور استعمار کے تعمیر کردہ "کاخ سیاہ" جیسے ان بت خانوں سے بے خبر ہو جو تیسری دنیا کے اسلامی ممالک اور ان میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کے خون اور ناموس پر تسلط اختیار کئے ہوئے ہیں۔

آج مشرکوں اور کافروں کے خلاف ہمارا نعرۂ برائت ظالموں کے ستم کے خلاف لگایا جانے والا نعرہ ہے ایک ایسی ملت کا نعرہ ہے جسکی جان شرق و غرب خصوصاً امریکہ اور اس کے جرگے کی دست درازیوں کی بدولت لبوں پر آچکی ہے جس کا گھر، وطن اور سرمایۂ حیات غارت کر دیا گیا ہے ۔

ہمارا نعرۂ برائت افغانستان کی مظلوم و ستم رسیدہ قوم کا نعرہ ہے مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ روسی حکومت نے میرے تنبیہ اور خبر دار کرنے کے باوجود افغانستان کے سلسلہ میں میری بات پر عمل نہ کیا اور اس اسلامی مملکت پر حملہ کر دیا ۔

میں بارہا کہہ چکا ہوں اور آج پھر خبر دار کر رہا ہوں کہ ملت افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دو

افغانی عوام اپنی قسمت کا خود ہی فیصلہ کر کے اپنے ملک کو استقلال عطا کر سکتے ہیں وہ کریملن کی نگرانی و سرپرستی یا امریکہ کی مدد و تحفظ کے محتاج نہیں ہیں وہاں کے مسلمان بیرونی افواج کے اخراج کے بعد کسی دوسری طاقت کا تسلط برداشت نہیں کریں گے اگر امریکہ نے ان کے ملک میں گھسنے اور دخالت کرنے کا ارادہ کیا تو وہ اس کے پاؤں بھی توڑ سکتے ہیں۔

ہمارا نعرۂ برائت، افریقہ کے مسلمان عوام کا نعرہ ہے ہمارے ان بھائیوں اور بہنوں کا نعرہ ہے جن کو صرف سیاہ فام ہونے کے جرم میں غیر مہذب، نسل پرست، سیاہ بختوں کے تازیانۂ ستم برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ ہمارا نعرۂ برائت لبنان و فلسطین کے عوام بلکہ ان سبھی ملتوں اور ملکوں کا نعرۂ برائت ہے جن کی طرف شرق و غرب کی بڑی طاقتیں خصوصاً امریکہ اور اسرائیل اپنی لالچی نظریں گڑائے ہوئے ہیں جن کے قیمتی سرمائے غارت کئے جا رہے ہیں جن کے سر پر اپنے جی حضور کرنے والے چاکروں کو انھوں نے مسلط کر دیا ہے اور ہزاروں کلو میٹر کے فاصلہ سے جن کی زمینوں پر اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں جن کے ملک کی آبی و خاکی سرحدوں پر لوگوں نے اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔

ہمارا نعرۂ برائت ان تمام لوگوں کا نعرۂ برائت ہے جو امریکہ کی فرعونیت اور اس کے توسیع پسند وجود کو برداشت کرنے کی طاقت کھو چکے ہیں، جو یہ نہیں چاہتے کہ ان کی غیظ و نفرت کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گلوں میں گھٹ کر خموشی کی نذر ہو جائے جنھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ آزادی کے ساتھ زندہ رہیں گے اور آزادی کے ساتھ ہی مر جائیں گے اور اپنی فریادوں سے نسلوں کو بیدار کر دیں گے۔

ہمارا نعرۂ برائت مکتب و نظریات اور اصول و مقدسات سے دفاع کا نعرہ ہے۔ قدرتی ذخیروں، سرمایوں اور ثروتوں سے دفاع کا نعرہ ہے، ان ملتوں کی دردمند فریاد ہے جن کے قلوب خنجر کفر و نفاق نے پارہ پارہ کر دیئے ہیں۔ ہمارا نعرۂ برائت ان بھوکوں محروموں اور غریبوں کی فقر و تنگدستی کی فریاد ہے جن کی عرق ریزیوں اور دن رات کی محنتوں کا پھل بین الاقوامی لٹیروں اور زر اندوزوں نے لوٹ کر اپنی تجوریوں میں بھر لئے ہیں اور اپنی حریصانہ پیاس بجھانے کے لئے سرمایہ داری، سوشلزم اور کمیونزم کے نام سے غریب قوموں، کسانوں، مزدوروں اور زحمت کشوں کا خون دل پی رہے ہیں۔ جنھوں نے پوری دنیا کی معیشت کی شہ رگ حیات اپنے ہاتھوں میں جکڑ رکھی ہے اور لوگوں کو ان کی محنتوں کی کم سے کم اجرت سے بھی محروم کر رکھا ہے۔

ہمارا نعرۂ برائت اس امت کا نعرہ ہے جس کی موت کی تاک میں پوری دنیائے کفر و استکبار کمین گاہوں

میں چھپی بیٹھی ہے اور اپنے تیروں، کمانوں اور نیزوں سے عظمتوں کے مالک قرآن و عترت کو نشانہ بنائے ہوئے ہے۔

شرم سے ڈوب مرنے کی بات ہے! اگر امت محمدی جو کوثر عاشورہ سے سیراب ہو چکی ہے اور وراثت صالحین پر فائز ہونے کی لو لگائے ہوئے ہے اپنا تن شرق و غرب کی غلامی اور ذلت آمیز موت کے حوالے کر دے ممکن نہیں کہ حریم قرآن کریم و عترت رسول خدا، سالکان راہ محمدؐ و پیروان ابراہیم حنیف پر دیو سیرت کفار و مشرکین کے مذموم حملے ہوتے رہیں اور خمینی! خاموشی سے مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا تماشا دیکھتا رہے۔

میں اپنا ناچیز خون اور جان، فریضۂ حق کی ادائیگی اور دفاع مسلمین کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں قربانی کے لئے تیار کر چکا ہوں اور شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہونے کا منتظر ہوں۔

تمام قوتوں، بڑی سامراجی طاقتوں اور ان کے گرگوں کو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ مطمئن رہیں اگر خمینی تنہا اور اکیلا بھی رہ گیا تو وہ اپنی راہ، نیز کفر و ظلم اور شرک و بت پرستی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کو جاری رکھے گا اور اپنے خدا کی مدد، عالم اسلام کے رضا کار دستوں کی معیت اور آمرانہ قوتوں کے غیظ و غضب کے شکار غریب و محروم عوام کی حمایت سے عالمی لٹیروں اور ظلم و ستم کی روش سے باز نہ آنے والے ان کے نمک خواروں کی آنکھوں سے عیش و راحت کی نیندیں سلب کر لے گا۔

جی ہاں! ہمارا نعرہ "نہ شرقی نہ غربی" دنیا کے بھوکوں اور کمزوروں کے لئے انقلاب اسلامی کا ایک اصولی نعرہ ہے اور ان تمام اسلامی و غیر اسلامی ملکوں کے لئے غیر وابستگی کی حقیقی سیاست کا ضامن ہے جو مستقبل قریب میں اسلام کو خدا کی مدد سے، عالم بشریت کو نجات عطا کرنے والے واحد مکتب کے طور پر قبول کریں گے ہماری اس سیاست اور پالیسی میں رتی برابر بھی فرق پیدا نہ ہوگا۔ اسلامی ملکوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو نہ تو یورپ و امریکہ کے مغربی سامراج سے وابستہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی روس کے شرقی سامراج سے ہاتھ ملانے کی حاجت ہے کیونکہ انشاء اللہ وہ، خدا، اس کے رسول اور امام زمانہؑ سے وابستہ ہو چکے ہیں اور میں پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کی اس بین الاقوامی سیاست سے انحراف کا مطلب مکتب اسلام کے مقاصد کو پامال کرنا اور رسولؐ خدا و ائمہ ھدیٰ کے ساتھ خیانت کرنا ہے اور جس کا آخری نتیجہ نہ صرف ہمارے ملک و ملت بلکہ تمام اسلامی ممالک کی موت ہے۔

کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ یہ نعرہ ایک وقتی اور عارضی نعرہ ہے، اس لئے کہ یہ پالیسی ہمارے عوام

ہمارے ملک جمہوریہ اسلامی اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے عمل کی کسوٹی ہے۔ کیونکہ صراط نعمت حق پہ ورود کی شرط ہی صراط ضالین، سے برائت و دوری ہے جس کا اسلامی معاشرہ میں ہر سطح پر بروئے عمل لایا جانا لازمی و ضروری ہے۔

جلوس برائت میں شرکت اور ایران کی دلیر ملت سے اپنی وابستگی کا اعلان کرنے کے بعد مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے ملکوں اور اسلامی سرزمینوں سے "رمی استعمار" کی فکر کریں اور اپنے ملکوں سے لشکر ابلیس کو نکال باہر کرنے نیز شرق و غرب کے فوجی اڈوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کریں۔ دنیا کو ہڑپ کر جانے کا خواب دیکھنے والوں کو ہرگز اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ ان کے وسائل و امکانات خود لے لینے فوائد حاصل کرنے اور اسلامی ملکوں کو تباہ و برباد کر دینے کے سلسلہ میں استعمال کریں کیونکہ اسلامی ملکوں اور ان کے سربراہوں کی اس سے بڑی ذلت و رسوائی تصور نہیں کی جا سکتی کہ غیروں کا مسلمانوں کے خفیہ اڈوں اور فوجی مرکزوں میں عمل دخل پیدا ہو جائے مسلمانوں کو ظالموں کی چیخ پکار اور ان کے کھوکھلے پروپیگنڈوں سے نہیں گھبرانا چاہئے اس لئے کہ یہ عالیشان محل اور عالمی سامراج کی سیاسی و فوجی طاقتیں بس مکڑی کے جال کی مانند ہیں جواب اور تب کی حالت پر پہنچ چکی ہیں دنیا کے مسلمانوں کو بعض ملکوں کے بکے ہوئے حکمرانوں کی اصلاح و تربیت کی فکر کرنی چاہئے ان کو اپنی نصیحتوں یا دھمکیوں کے ذریعہ اس خواب غفلت سے بیدار اور ہوشیار کریں جس میں ڈوب کر وہ خود کو بھی اور مسلمان ملتوں کے مفاد کو بھی بادِ فنا کے حوالے کئے دے رہے ہیں۔ ان ضمیر فروش ایجنٹوں کو بھی خبردار کریں اور خود بھی پوری بصیرت سے کام لیتے ہوئے منافقوں اور عالمی سامراج کے دلالوں کے خطرات سے غافل نہ رہیں اور ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے اسلام کی شکست اور مسلمانوں کے خزانوں نیز اصول و اقدار کی غارتگری کا تماشہ نہ دیکھتے رہیں۔

ملت اسلام کو فلسطینیوں کی نجات کی فکر کرنی چاہئے اور ان تمام ذلیل و خود غرض، بکے ہوئے قائدین کی سازشوں اور مفاہمت کے خلاف اپنے سخت غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کرنا چاہئے جنھوں نے فلسطین کے نام پر مقبوضہ علاقوں میں بسنے والے عوام کی آرزؤوں کو اور اس خطہ کے مسلمانوں کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ وہ ان خائنوں کو ہرگز اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ مذاکرہ کی میزوں پر بیٹھ کر یا ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر کے فلسطین کی بہادر قوم کی عزت و آبرو اور حیثیت و اعتبار کو چکنا چور کر دیں کیونکہ خود کو انقلابی ظاہر کرنے والے یہ ذلیل و بے مایہ افراد قدس کی آزادی کا بہانہ بنا کر خود کو امریکہ اور اسرائیل کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جیسے جیسے فلسطین پر قبضہ کے خونی حادثہ کا دن گزرتا جا رہا ہے ممالک اسلامی پر حاکم سربراہوں

کی خموشی اور سازش نیز مختلف بہانوں سے غاصب اسرائیل کے ساتھ رفاقت و دوستی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب بیت المقدس کی رہائی کے سلسلہ میں بلند کئے جانے والے نعرے اور پروپیگنڈے بھی سنائی نہیں دیتے بلکہ اگر ایران جیسی کوئی حکومت اور اس کے عوام جو کہ خود بھی ظالمانہ حملے اور جنگ کے دفاع میں مبتلا ہیں فلسطینی عوام کی پشت پناہی اور قبلۂ اول کی آزادی کے نعرے لگاتے ہیں تو اس کی مذمت کی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ لوگ قدس کے نام پر ایک دن منانے سے بھی وحشت کھاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ اس تصور میں مبتلا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ اسرائیل اور صہیونیت کی شکل وماہیت اور اس کے خبیث و مکروہ ارادوں میں تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اور صہیونزم کے خونخوار بھیڑیوں نے دریائے نیل سے فرات تک پھیلی ہوئی سرزمین پر زبردستی قبضہ کر لینے کے منصوبہ کو ترک کر دیا ہے ؟!

حکومت ایران کے ذمہ دار افراد، اس کے عوام اور مسلمان قومیں ان خونخواروں سے مقابلہ کرتے ہوئے اس شجرۂ خبیثہ کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ پھینکے بغیر اپنی مہم ہرگز ترک نہ کریں گے اور خداوند متعال کی مدد کے سہارے پیروان اسلام کے بکھرے ہوئے قطرات جمع کر کے امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنوی طاقت اور اسلامی ممالک کے امکانات و ذرائع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری دنیا میں حزب اللّٰہی دفاعی فورس کے مراکز تشکیل دے کر نہ صرف یہ کہ اسرائیل کو اپنی گذشتہ مجرمانہ غلطیوں کے سلسلہ میں پشیمان ہونے پر مجبور کر دیں گے بلکہ غاصبانہ طور پر تھیائی گئی مسلمانوں کی مقبوضہ زمینیں بھی ان کے ظالمانہ پنجہ سے آزاد کرائیں گے۔

جیسا کہ میں گذشتہ برسوں میں بارہا اسلامی انقلاب سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی خبردار کر چکا ہوں، دوبارہ ممالک اسلامی میں صہیونزم کے اس زہریلے کینسر کے پھیل جانے کے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ اور آزادیٔ قدس کے سلسلہ میں اسلامی ملتوں اور جوان و غیور مسلمانوں کی تمام تر مجاہدانہ جدوجہد کی اپنی طرف سے بھی اور ایرانی حکومت، عوام اور ذمہ داران مملکت کی طرف سے بھی بے دریغ حمایت کا اعلان کرتا ہوں، ساتھ ہی ساتھ میں اپنے عزیز لبنانی جوانوں کا شکر گزار بھی ہوں جو ملت اسلام کی سرفرازی اور عالمی استعمار کی ذلت و خواری کا سبب بنے ہیں نیز اپنے ان تمام عزیزوں کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں جو مقبوضہ علاقوں میں داخلی طور پر یا غصب شدہ ملک کے اطراف و جوانب میں ایمان و جہاد کے اسلحوں سے لیس ہو کر اسرائیل اور اس کے مفاد پر ضرب کاری لگانے میں مشغول ہیں، میں اطمینان دلاتا ہوں کہ ملت ایران تم کو کبھی اکیلا نہ چھوڑے گی۔

خدا پر بھروسہ رکھو اور مسلمانوں کی معنوی طاقت کا فائدہ اٹھاؤ اور جہاد و تقویٰ نیز صبر و استقامت کے اسلحوں سے دشمنوں پر حملہ کرو۔ "ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم و یثبت اقدامکم" (اگر تم خدا کی مدد کرو گے

تو خدا بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو ثبات عطا کرے گا — سورۂ محمد / ۷)

۲ ۔ ایران عراق جنگ — چونکہ اس وقت ہمارے ملک کے مسائل اور منصوبوں میں سرفہرست جنگ کا مسئلہ ہے عفلقیوں کے زوال پذیر فرسودہ نظام کے مقابلہ میں ملت ایران کی یقینی کامیابی کو دیکھتے ہوئے سامراجی طاقتوں کی طرف سے بڑے وسیع پیمانے پر عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں یہاں تک کہ صدامیوں کے تمام غیر انسانی جرائم اور زیادتیوں، نیز بین الاقوامی اداروں کی خاموشی اور سکوت کے باوجود ہم کو جنگ طلب کے طور پر پہچنوایا جارہا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ سیدھے سادھے بے خبر افراد اس نئے حربہ سے متاثر بھی ہو رہے ہوں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان افواہوں میں محصور ملتوں خصوصاً زائرین محترم کے ذہن کو روشن کرنے کے لئے چند نکتوں کی طرف متوجہ کردوں ۔

دنیا نے آغاز جنگ سے لیکر آج تک ہم جن تمام دفاعی مرحلوں سے گزر رہے ہیں کبھی بھی عدل و انصاف کے ساتھ غیر جانب دار ہو کر ہم سے گفتگو نہیں کی ہے۔ جس روز صدام اور عراق پر حاکم بعث پارٹی نے غرور و نخوت میں چور ہو کر جنون آمیز طور پر ہمارے عزیز ملک ایران پر یہاں قائم تازہ بہ تازہ اسلامی جمہوری نظام کو ساقط کرنے کی غرض سے حملہ کیا، بین الاقوامی معاہدوں کو پارہ پارہ کیا، خود شخصی طور پر صدام نے ہوائی، دریائی اور زمینی فوجوں کو کمانڈ کرتے ہوئے نہ صرف ایک شہر یا دیہات کے متعدد گھروں کو بلکہ آبادیوں سے پُر دسیوں شہر اور سیکڑوں دیہاتوں کو خاک کا ڈھیر بنادیا، ہماری قوم کے معصوم بچوں کو ماؤں کی گودیوں میں شہید کردیا اور اپنی بربریت اور وحشی گری کو اس منزل پہ پہونچا دیا کہ قلم اس کے لکھنے اور زبان اس کے بیان کرنے سے بھی شرم محسوس کرتی ہے ۔

اس روز بھی جبکہ صدام نے اس شعلہ بار جنگ کی پہلی چنگاری تمام ممالک اسلامی اور خلیج فارس کے خرمنِ امن و سلامتی میں ڈالی ہے، صلح کے کسی بھی دعویدار نے اس کا ہاتھ نہ پکڑا کہ تم یہ آگ کیوں بھڑکا رہے ہو۔ اس وقت کسی بھی طرح کے مؤثر ذرائع اور دباؤ یا قرارداد کے ذریعہ اس کو کنٹرول کرنے اور لگام لگانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی کوئی عراق و ایران کے مظلوم و ستم رسیدہ عوام کا دفاع کرنے کو آگے بڑھا۔ کسی نے بھی اس جنگ کا آغاز کرنے والے صدام سے سوال نہ کیا کہ یہ کس جرم اور کس گناہ کے بدلے میں ملت ایران کا خون بہایا جارہا ہے کون سا گناہ کیا ہے کہ لاکھوں مرد، عورت، بوڑھے اور جوان بے گھر کئے جارہے ہیں اور ان کے گھروں اور ٹھکانوں کو ویران کیا جارہا ہے۔ آخر ایرانیوں نے کون سا گناہ اور جرم کیا ہے کہ دسیوں سال کی زحمتوں، کوششوں اور سرمایہ گزاریوں کا نتیجہ صنعتی و زرعی کارخانے اور کھیتیاں برباد کردی گئیں کیا ہمارا ایرانی ہونا، ہمارا جرم ہے؟ ہمارا فارسی ہونا، ہمارا جرم ہے؟ کیا ہمارے گذشتہ سرحدی اختلافات و تنازعات ہمارے جرم ہیں؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آج اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ سامراجی طاقتوں اور حملہ آوروں

کی نظر میں ہمارا اصلی جرم اسلام کا دفاع کرنا اور ظلم وستم پر مبنی شاہی طاغوتی نظام کا خاتمہ کرکے علانیہ طور پر اسلامی جمہوری حکومت قائم کر دینا ہے ہمارا جرم وگناہ پیغمبر اسلامؐ کی سنتوں کا احیاء کرنا، قرآن کریم کے قوانین پر عمل کرنا، عالمی کفر و استکبار کی سازشوں سے مقابلے کے لئے بلا کسی شیعہ سنی تفریق کے مسلمانوں کے درمیان وحدت کا اعلان کرنا، مظلوم ومحروم فلسطینیوں، افغانیوں اور لبنانیوں کی پشت پناہی کرنا، ایران میں اسرائیلی سفارت خانہ کو بند کرکے اس کینسر کے موذی پھوڑے پر نشتر لگانے کے لئے عالمی صیہونزم کے خلاف جنگ کا نعرہ بلند کرنا، نسلی امتیازات کے خلاف افریقہ کے محروم عوام کا دفاع کرنا نیز عالمی سامراج کے سرغنہ امریکا اور ذلت وکثافت پر مبنی پہلوی حکومت کے مابین معاہدوں کو لغو کر دینا ہے۔ ظاہر ہے عالمی سامراج اور اس کے دست بستہ ایجنٹوں کے نزدیک اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی اسلام اور اس کی حاکمیت کی باتیں کرے اور مسلمانوں کو جارحیت کرنے والوں کے ظلم وستم کے خلاف عزت واستقامت اور استقلال وآزادی کی دعوت دے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ نکتہ ہم نے صرف مسلط کی جانے والی جنگ کے دوران درک کیا ہو بلکہ اپنی انقلابی مہم کے روز اول ۱۵ خرداد (۵ جون ۱۹۶۳ء) سے لیکر ۲۲ بہمن (۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) کے دوران ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ہم بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ اپنے اس عظیم ومقدس، اسلامی والٰہی مقصد وآرزو کی تکمیل کے لئے ہمیں بڑی عظیم قیمتیں چکانی پڑیں گی اور اس راہ میں بڑے ہی گرانقدر شہداء نذر کرنے پڑیں گے۔ یہ عالمی استعماری طاقتیں ہم کو راحت وآرام سے رہنے نہ دیں گی اپنے زرخرید داخلی وخارجی ایجنٹوں کے ذریعہ شب خون مار کر ہماری گلیوں، سڑکوں اور بازاروں نیز سرحدوں کو ہمارے نوجوانوں کے خون سے لال کر دیں گی اور ایسا ہی ہوا بھی، جس وقت ۱۵ خرداد کو ملت ایران کا یہ نعرہ کہ "ہم اسلام چاہتے ہیں" امریکہ کے کانوں سے ٹکرایا اور جس روز پہلی بار امریکہ کے غرور واقتدار اور ایک بڑی طاقت' ہونے کا نشہ چکنا چور ہوا اور ایران میں اس کے ایجنٹوں کا عمل دخل خطرہ سے دوچار ہوا نیز امریکہ، علمائے اسلام کی رہبری، روحانیت کے اقتدار اور آزادی واستقلال کے حصول نیز نظام عدل اسلامی کے قیام کے لئے ملت ایران کے عزم وجزم اور فولادی ارادے کی طرف متوجہ ہوا اس نے فوراً اپنے ذلیل ووطن فروش غلام' محمد رضا خان کو حکم دیا کہ ہماری ملت کی اسلام خواہی کی آواز کو خاموش کر دے' پہلوی خائن سے باقاعدہ عہد لیا گیا کہ وہ امریکہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے تمام افراد کو نیست ونابود کر دے اور ہم سب نے دیکھا کہ ان بے غیرت خائنوں نے اس شرمناک منصوبہ پر عمل کرنے میں ایک لحظہ کے لئے بھی گریز نہ کیا۔ ترقی وآزادی کے نام پر 'دروازہ تمدن' تک رسائی کے بہانے اس ملت کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے گئے ہمارے ملک کے در ودیوار' مدرسہ فیضیہ سے دانشگاہ تک' دانشگاہ

کے گلیوں سڑکوں اور بازاروں تک اور سڑکوں سے مسجد و محراب تک نعرۂ تکبیر بلند کرنے والے خدا و رسولؐ کے پیرو ایرانی جوانوں کے خون سے رنگین کر دیئے گئے اور ان حالات میں جبکہ شاہی حکومت کے جلاد ستمگر مرغِ آزادی کے پروبال اور شجرۂ طیبۂ استقلال کے برگ و شاخ کاٹنے میں مصروف تھے دنیا کی تمام استعماری طاقتیں بین الاقوامی سطح پر ایک مشترکہ پروپیگنڈہ مشن کے تحت شاہ کو مہذب و متمدن، ترقی پسند آزادی کا خواہاں اور مسلمانوں کو رجعت پسند و بنیاد پرست نیز ان کے اسلامی مطالبات کو "سیاہ ارتجاع" کے نام سے پیش کر رہی تھیں۔ اسی سرکچل دینے والی سیاست کا نتیجہ تھا کہ یزیدیوں کے دست ظلم نے دسیوں مرتبہ خون سے رنگین کر دیا ہے ایران میں نویں اور دسویں محرم کو سفاکانہ جرائم کا اعادہ کرتے ہوئے ہماری مملکت کو امریکیوں کے لئے راحت و آرام کا جزیرہ اور خود ایرانی عوام کے لئے قبرستان اور خرابے میں تبدیل کر دیا چنانچہ میں نے اپنے عزیز وطن ایران میں ورود کے وقت "بہشت زہرا" میں بھی اعلان کیا تھا کہ شاہ نے ہمارے ملک ایران کو ویران کر کے قبرستانوں میں تبدیل کر دیا" اور آج پھر اسی جملے کی تکرار کر رہا ہوں کہ شاہ نے ہمارے ملک کو تباہ کر کے قبرستانوں میں بدل دیا مگر سوال یہ ہے کہ شاہ کون تھا؟ اس نے کس کے حکم پر عمل کیا تھا؟ کیونکہ اگر اس نے اپنی ذاتی ذلیل و فاسد فکر پر عمل کیا ہوتا تو اس کے چلے جانے کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا ہوتا لیکن کون ایسا شخص ہے جو نہیں جانتا کہ شاہ امریکہ کا غلام اور کارندہ تھا اور اسی کے اشاروں پر ہمارے تمام شہیدوں اور عزیزوں کو اپنے خون سے ایران کی آزادی کی قیمت چکانی پڑی ہے۔ شاہ کو جن کاموں پر مامور کیا گیا تھا اس نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے اسے عملی جامہ پہنایا اور جس طرح بھی ممکن ہو سکا اسلام اور مسلمانوں سے امریکہ کا انتقام لیا گیا چنانچہ اس پورے ماجرا کا اصل کرتا دھرتا یعنی امریکہ پس پردہ باقی رہ گیا ۔ امریکہ جو سچے اسلام سے خائف و مرعوب اور اس انقلاب کے نتیجہ میں قائم ہونے والی حکومت عدل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا وہ اس خیال میں مبتلا تھا کہ قوم پرست، منافقین اور دائیں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے عناصر بہت جلد انقلاب کی سیاست اور ملک پر حاکم نظام کا رخ اس کے مفادات کے حق میں موڑ دیں گے لہٰذا کچھ دنوں تک تو وہ بیم و امید کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے فوجی بغاوت کے منصوبے بنا کر اس کو عملی جامہ پہناتے، سیاسی دباؤ ڈالتے، امریکہ سے وابستہ چہروں کی ترویج کرنے نیز انقلاب اور انقلابی شخصیتوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر میدان سیاست سے دور کر دینے میں لگا رہا لیکن پروردگار عالم کی طرف سے دوبارہ لطف و کرم کی بارش ہوئی اور نہایت ہی نازک مراحل میں ایرانی عوام نے جاسوسی کے اڈے پر قبضہ کر کے نئے سرے سے امریکا اور اس کے ایجنٹوں کے تئیں اپنی نفرت و برائت کا اعلان کر دیا۔

صدام کے جرائم ۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب امریکہ نے وہ تیغ، جو انقلاب سے قبل محمد رضا خان کے سپرد کر رکھی تھی، اس مست و مغرور غلام صدام کے حوالے کر دی۔ صدام نے کیا کیا؟ کیا صدام نے وہی کام نہیں کئے جو انقلاب سے قبل شاہ نے انجام دئے تھے؟ کیا شاہ نے ہمارے قبرستانوں کو بلند و بالا سرو آزادی سے پر نہیں کیا؟ اور کیا صدام نے جو جتنا زیادہ قدرت کا مالک تھا اس کے علاوہ کچھ اور کیا؟ کیا شاہ خائن نے ہمارا ملک امریکہ کے ہاتھ بیچ نہیں دیا تھا؟ اور کیا صدام نے ایران کو امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دینے کی ایک دوسری چال نہیں چلی ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اگر مہلت نصیب ہوئی، نیز ملت اور اس کے تمام ارکان مل جل کر کوشش کریں تو بھی شاہ نے ایران میں جو تباہیاں مچائی ہیں ان کا آباد کرنا بیس سال کے اندر بھی ممکن نہ ہوگا۔ کیا صدام نے جو تباہی مچائی ہے، بیس سال سے کم میں ان کو آباد کرنا ممکن ہے؟

ہم ایران کے شریف عوام کو مسلمانوں کو اور دنیا کے تمام حریت پسندوں کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ دائیں اور بائیں بازو سے وابستگی اختیار کئے بغیر اور کسی بڑی سامراجی قوت سے خود کو ملحق کئے بغیر مستقل حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی خواہش رکھتے ہیں تو اس استقلال و آزادی کے لئے انھیں بڑی بھاری قیمتیں چکانی پڑیں گی۔ ایران میں اسلامی انقلاب کا تجربہ ہزاروں شہیدوں اور مجروحوں کے خون سے قیمت ادا کر کے حاصل ہوا ہے اس کے لئے گھروں کا اجڑنا، کسانوں کے خرمن حیات کو شعلوں کی لپٹوں میں دیکھنا، جگہ جگہ بموں کے دھماکوں سے بے گناہوں کی جانیں تلف ہونا، فرزندان اسلام و انقلاب کا عراق کے بعثی درندوں کے ہاتھوں اسیری اور شکنجہ کی صعوبتیں برداشت کرنا نیز ہزاروں طرح کی دھمکیوں، اقتصادی بندشوں اور جانی و مالی نقصانوں سے گزرنا پڑا ہے۔

ملت ایران نے عالمی کفر و استکبار پر کامیابی کا یہ تجربہ اپنے سوئے ہوئے بچوں کے سروں پر مکانوں کے ڈھا دئے جانے کے بعد حاصل کیا ہے جہاد اور قربانیوں کے ذریعہ اپنے انقلاب اور ملک کا بیمہ کرایا ہے۔

ہم اپنا یہ تجربہ ساری دنیا تک پہنچائیں گے اور کسی پاداش کی یا امید کے بغیر ظالموں سے مقابلہ کا انجام، حق کی راہ میں جہاد کرنے والوں تک منتقل کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ یقینی طور پر دوسروں تک ان تجربات کے پہنچانے کا نتیجہ محصور و محروم ملتوں کے اندر استقلال و کامیابی کا جذبہ بیدار کرنے اور احکام اسلام کے نفاذ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ملت اسلام کے تمام روشن خیال افراد کو پورے علم و آگاہی کے ساتھ نشیب و فراز سے معمور اس راستہ

کو طے کرتے ہوئے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے ناپاک عزائم کو مسمار کر دینا چاہتے۔ میں تمام آزادی پسند دانشوروں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنی دانائی اور ہوشیاری کو بروئے کار لاکر تیسری دنیا کے مظلوم و محروم اسلامی ملکوں میں ظلم کے طمانچوں کا نشانہ بننے والے عوام کو تمام بڑی طاقتوں خصوصاً امریکہ کو بھرپور طمانچہ کے ذریعہ جواب دینے کا طریقہ بتائیں۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام بڑی طاقتوں کو خاک مذلت پر بیٹھنے پر مجبور کر دے گا۔ اسلام اپنی وسعت کی راہ میں حائل تمام بڑی سے بڑی داخلی و خارجی رکاوٹوں کو یکے بعد دیگرے برطرف کر دے گا اور کلیدی حیثیت کے حامل دنیا کے تمام مورچوں کو فتح کرے گا۔

ملت ایران کو اس بات پر ہمیشہ توجہ رکھنی چاہئے کہ وہ کام جو مردوں اور عورتوں نے انجام دیا ہے اتنا قیمتی اور بے بہا ہے کہ اگر سیکڑوں بار ایران خاک کا ڈھیر بنا دیا جائے اور ہمارے نوجوانوں کو از سر نو تعمیر و ترقی کی فکر و جستجو کرنی پڑے تو بھی نہ صرف یہ کہ یہ کوئی ضرر و نقصان کی بات نہیں بلکہ اس صلہ میں تم نے خود کو اولیاء اللہ کے ساتھ زندگی گزارنے کا مستحق بنا لیا ہے، تم ابدی اور سرمدی ہو چکے ہو دنیا تم پر رشک کرے گی۔ کتنے خوش نصیب ہو تم!

مستکبروں کے خلاف اعلان جنگ ، آج میں پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اگر سامراجی طاقتیں ہمارے دین کی راہ میں روڑے بننا چاہتی ہیں تو ہم ان کی پوری دنیا سے مقابلہ کے لئے تیار ہیں اور جب تک ان سب کو نیست و نابود نہ کر لیں چین سے نہ بیٹھیں گے یا تو ہم سب آزاد ہو جائیں گے یا اس سے بھی بڑی آزادی، شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہو جائیں گے۔ اسی طرح جیسے غربت و تنہائی کے عالم میں، کسی ملک، ادارہ یا بین الاقوامی تنظیم کی رضا و خوشنودی یا تعاون و مدد کے بغیر ہم نے انقلاب کو کامیابی کی منزلوں تک پہنچا دیا اور ویسے ہی جیسے اتنی جنگ میں انقلاب سے بھی زیادہ مظلومی و کس مپرسی کے عالم میں دشمن سے لڑتے رہے اور کسی بیرونی ملک کی مدد کے بغیر حملہ آوروں کو شکست سے ہمکنار کیا۔ خداوند متعال کی مدد سے نشیب و فراز سے بھرپور باقیماندہ سفر بھی خدا ہی کے سہارے اکیلے طے کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ہم اپنا فریضہ ہے ادا کرتے رہیں گے یا تو اس پوری گیتی پر جہان اسلام کی کامیابی پر خوشی سے ایک دوسرے کے گلے ملیں گے یا ہم سب شہادت اور حیات ابدی کی طرف بڑھتے ہوئے عزت و شرافت کی موت کو گلے لگا لیں گے اور دونوں صورتوں میں کامیابی و کامرانی ہمارا حصہ ہے ــــ ہم دعا سے بھی غافل نہیں رہتے۔

پروردگار! ہم پر احسان و کرم فرما اور ہمارے اسلامی انقلاب کو جبر و ستم کے محلوں کو مسمار کر دینے اور دنیا کے چپہ چپہ سے ظلم و زیادتی کرنے والوں کے ستارۂ عمر کو غروب کر دینے کا مقدمہ قرار دے اور تمام ملتوں کو مظلوم و محروم مستضعفین کی وراثت و امامت کے ثمرات اور برکتوں سے بہرہ ور فرما۔

جنگ افروزوں کی زبان پر صلح کا نعرہ ــــ اب ان حالات کی روشنی میں جنگ کے بارہ میں فیصلہ کرنا

خود مسلمانوں کا کام ہے وہ عقل وفکر کے آئینہ میں غور کریں کہ ہم پر کس مقصد اور آرزو کی تکمیل کے جرم میں حملہ کیا گیا ہے اور ہم نے کیوں گرانقدر شہداء کا نذرانہ بارگاہ حق میں پیش کیا ہے؟ صدام پلید نے کن مقاصد کے تحت ہم پر حملہ کیا؟ اور دنیا کن ارادوں سے ضمناً یا علی الاعلان اس کی حمایت کر رہی ہے کہ آج تک حملہ آوروں کو جنگی اسلحوں یا فوجی واقتصادی وسیاسی میدانوں میں بھی کسی طرح کی پریشانی اٹھانی نہیں پڑی ہے دنیا اسے کسی نہ کسی بہانہ سے بہترین اور جدید ترین اسلحوں سے مسلح کرتی چلی آرہی ہے اس کے برخلاف کسی طرح کے بھی امکانات جو ہماری ملت کا حق ہیں حتی جنگی قیمتیں بھی ہم سے وصول کی جا چکی ہیں ہم کو فراہم کرنے سے خودداری کی جا رہی ہے پھر بھی ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اس طولانی اور غیر متوازن جنگ میں فقط ایمان کے اسلحہ، خدا پر توکل، حضرت بقیۃ اللہ الاعظمؑ کی دعا، نفس پر اعتماد اور اپنے دلاور مردوں اور شیر دل خواتین کی میدان کارزار میں موجودگی کے سہارے ہم کو یہ کامیابی نصیب ہوئی ہے ہم خدا کے شکرگزار ہیں کہ اس جنگ میں کسی بھی ملک یا چھوٹی بڑی طاقت کا احسان ہماری گردن پر نہیں ہے۔ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھنے والے ہمارے آزمودہ کار عوام احکم الحاکمین کی مدد سے یکہ وتنہا مظلومانہ طور پر بہت سی مشکلات کو حل کرتے ہیں چاہے وہ جنگی حکمت عملی اور منصوبہ سازی کی منزل ہو یا فوج کی تعلیم وتربیت اور اسلحوں کی فراہمی کا مسئلہ ہو ہر میدان میں کامیاب رہے ہیں۔ معجزانہ طور پر اپنے اسلامی ملک کا دفاع کرنے اور حملہ آوروں کو ہزاروں کلومیٹر پیچھے ڈھکیل دینے کے سلسلہ میں حاصل ہونے والی کامیابیوں سے قطع نظر ہماری ملت نے صنعتی اور تکنیکی میدانوں میں بھی قابل قدر کامیابیاں حاصل کی ہیں کارخانوں کا کھولا جانا، پیداوار میں انقلابی اضافہ، دسیوں ترقی یافتہ جدید فوجی وسائل کی ساخت اور اختراع اور وہ بھی بغیر کسی بیرونی مدد اور مشورے کے یقیناً ایک قابل رشک کارنامہ ہے اور اب جبکہ ہم یقینی کامیابی کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ہمارے قدم اپنی آخری منزل کے بہت قریب ہیں صلح طلبی کی غیر مانوس آوازیں اور وہ بھی خود جنگ کے شعلے بھڑکانے والے ستمگروں کی زبان سے بلند کی جا رہی ہیں اور دنیا میں ایک شور وغوغا مچا رکھا ہے بلکہ صلح طلبی کی صف ماتم بچھا رکھی ہے انسانوں کی آزادی اور امن وسلامتی کے دفاع کا کھوکھلا نعرہ نوجوانوں کے خون اور عراق وایران کے سرمائے اور مادی ومعنوی نقصانات کا مرثیہ پڑھا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیا ہو گیا ہے کہ عالمی سامراجی طاقتیں، جنہیں سب سے آگے امریکہ نظر آتا ہے، حلقوں کی اس قدر ہمدرد ہو گئی ہیں ؟ ! جنگ بھڑکانے اور معرکہ آرائیوں کو ہوا دینے والے اس صدی کے بڑے بڑے جلاد انسانی احترام اور صلح ومسالمت کے ساتھ زندگی گزارنے کی باتیں کرنے لگے ہیں؟ اپنی کبھی نہ مٹنے والی پیاس اور خونخواری کی عادت جو سرمایہ داری

اور اشتراکیت کا طرۂ امتیاز ہے، اس سے منحرف ہو گئے ہیں؟ قوموں کے قلب و جگر میں پیوست برچھیاں، خنجر اور تلواریں غلافوں میں رکھدی ہیں؟

آیا یہ حقیقت ہے یا فریب؟ آیا یہ وہی شب خون مارنے اور بے انصافیوں کو ہوا دینے کا ایک دوسرا رخ نہیں ہے کہ جب مصلحت دیکھو خاموش بیٹھے رہو اور جب رخ بدلتا نظر آئے تو صلح صلح کا نعرہ لگانا شروع کر دو؟ کیا یہ ہماری آخری ضرب سے محفوظ رہنے کی استعماری کوشش نہیں ہے؟ اس طرح وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے سیاست جنگ اور عالمی صلح کو اپنی بوسیدہ شیطانی فکروں اور پر فریب دگراموں کے جال میں اسیر کرنا چاہتے ہیں اور عملا دنیا کی امنیت اور جان و مال و مملکت کو اپنے قبضۂ قدرت میں کر لینا چاہتے ہیں؟ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ استعماری طاقتوں کی جانب سے یہ خوشامد و اصرار اور ملت ایران پر صلح تھوپنے کی کوشش اسی فرسودہ فکر اور شیطانی فلسفہ کی دین ہے اور اگر ان تمام چیزوں سے صرف نظر کر لیں پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ کون واقعی صلح کا طالب ہے اور کون جنگ کے درپے ہے؟

صدام کیوں صلح چاہتا ہے؟ کیا واقعی صدام اپنی گذشتہ حرکتوں، زیادتیوں، ستم کاریوں اور ظالمانہ حملوں سے شرمندہ اور پشیمان ہے اور اب ندامت کا اظہار کر رہا ہے؟ دونوں ملتوں اور اسلامی مملکتوں کے ساتھ اس نے جو خیانت کی ہے اور ملل اسلامی کی دفاعی بنیادوں کو جس طرح کمزور کیا ہے کیا اس سلسلہ میں اپنی خطاؤں کی معافی چاہتا ہے؟ کیا صدام کی صلح طلبی کو اس کی دلسوزی یا بیداری و آگاہی کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا واقعی ان تمام جرائم و غارتگری کے بعد بھی صدام کے یہاں وجدان و شعور یا رحم و عطوفت کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ یا یہ کہ یہ زخمی اژدہا اپنی تہی دستی اور دربدری کے خوف سے صلح طلبی کا نعرہ لگا رہا ہے؟ تعجب ہوتا ہے کہ بعض عقل و سیاست اور دوراندیشی کے مدعی کس کس طرح کی رائے پیش کرتے ہیں یہ لوگ کتاب خدا کی آیتوں میں تحریف کر کے سنت نبوی سے غلط استنباط کرتے ہوئے مسلمانوں کو عزت و شرافت کی راہ سے منحرف اور ہمارے عوام کو جہاد سے دور کر دینا چاہتے ہیں مگر ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ملت ایران کو اپنی رشد و آگہی سے نوازدیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ان جھوٹی اور من گڑھت تفسیروں اور تاویلوں سے متاثر نہ ہوئے بلکہ ان بچکانہ فکروں اور خامہ فرسائیوں کو خود تحلیل و تفسیر کرنے والوں کے عقیدہ و فکر کی کمی اور کمزوری پر محمول کرتے ہوئے ان پر خندہ زن رہے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ہزاروں عظیم سے عظیم قربانیاں پیش کر چکنے کے باوجود جبکہ تمام حالات سازگار ہو چکے ہیں اور ہر طرح کے ضروری مقدمات فراہم ہیں تو اپنے دم توڑتے ہوئے دشمن سے جنگ نہ کریں اپنے ملک اور مکتب و معاشرہ

سے چشم پوشی اختیار کر کے اس کو موقع و مہلت دیدیں کہ وہ اپنی طاقت مضبوط کر کے کسی مناسب موقع پر دوبارہ ہمارے ملک پر حملہ آور ہو سکے۔ آیا اس خفت و حقارت کے بعد چند روز کی حکومت و ریاست کی کوئی وقعت و حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ صدام نے جب حملے شروع کئے اور ہمارے ملک کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہو گیا تو دنیا نے ہمارے سامنے یہ پیشکش رکھی تھی کہ اپنے ملک پر مزید حملوں سے بچنے کے لئے صدام کی حاکمیت اور مطالبات کو قبول کریں اور صدامیوں کی جارحیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور آج بھی اسی سیاست پر عمل کرتے ہوئے جبکہ ہماری آبادی پر بمباری ہو رہی ہے، ہمارے خلاف کیمیاوی ہتھیاروں کا استعمال کیا جا رہا ہے، تیل بردار کشتیوں، غیر جنگی جہازوں اور مسافر گاڑیوں پر حملے جاری ہیں ایک دوسرے انداز سے صدامیوں کی ظالم و جابر حکومت کو قبول کر لینے کی دعوت دی جا رہی ہے ـــ اب اس کو دنیا کے تمام باخبر افراد درک کر چکے ہیں کہ صدام نے نہ صرف یہ کہ اپنی خونخوار سرشت اور درندگی سے ذرہ برابر عدول نہیں کیا ہے بلکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ استعماری طاقتوں کی حمایت اور بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کی بے جا خاموشی کی وجہ سے کسی زخم خوردہ بھیڑیے میں تبدیل ہو چکا ہے اور چاہتا ہے کہ اس آگ کے شعلوں اور جنگ کو علاقائی ممالک خصوصاً خلیج فارس میں پھیلا دے۔

بڑی طاقتوں اور خلیجی ممالک کو انتباہ ـــ میں ان حالات کے باوجود خلیج فارس میں واقع ممالک کے سربراہوں، شرق و غرب کی تمام بڑی طاقتوں خصوصاً امریکہ و روس کو خبردار اور متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں کس طرح کی دخالت، رخنہ اندازی یا عاجلانہ اقدام سے باز رہیں اور امریکی عوام جنہوں نے اپنی عقل و ارادے نیز اہم ترین سیاسی و بین الاقوامی مسائل کے فیصلے کا اختیار ریگن جیسے افراد کے ہاتھوں میں دے رکھا ہے ان کو بھی ہوشیار کر رہا ہوں کیونکہ ریگن اب کسی کام کے لائق نہیں رہ گئے ہیں۔ خصوصاً سیاسی مسائل میں کسی فیصلہ تک پہونچنے میں معذور و ناتواں ہیں دیگر عقلا اور دانشمندوں کے محتاج ہیں۔ ایسی صورت میں کہیں وہ ان کو تباہی کے گڑھے میں نہ کھینچ لے جائیں۔ میں خلیج فارس میں واقع ممالک کے سربراہوں سے بھی مشورہ کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ ذلت و حقارت سے معمور سیاسی، فوجی و اقتصادی پالیسی کے ذریعہ اب اس سے زیادہ خود کو اور اپنے عوام کو حقیر و ذلیل نہ بنائیں نہ تو امریکہ کے دامن میں جا کر اپنی کمزوری و ناتوانی کا ڈھنڈورا پیٹیں اور نہ ہی صرف اپنے فائدوں پر نظر رکھنے والے درندوں اور بھیڑیوں کو اپنی رکھوالی اور حفاظت کی ذمہ داری سونپ کر خود کو خطرہ میں مبتلا کریں۔

ان بڑی طاقتوں کے مفادات جب بھی متناقض ہوتے ہیں تم کو اور تمہارے جیسے قدیم ترین وفاداروں اور دوستوں کو قربان کر دیتے ہیں ان کی نظر میں دوستی و دشمنی یا غلامی و وفاداری کوئی حقیقت و مفہوم نہیں رکھتی انھوں نے بس اپنے فائدہ کو بنیاد و معیار قرار دے رکھا ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ ہمیشہ اور ہر جگہ اسی کی باتیں کرتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر ممالک اسلامی کے ان بکے ہوئے سربراہوں میں سے کچھ لوگ اپنے زر و زور و تزویر کی بنیاد پر خدائی کرنے والے آقاؤں کے کانوں میں ذرا سنجیدگی کے ساتھ یہ بات ڈالتے کہ اتنا زیادہ خلیج فارس میں اپنے مفادات کی باتیں نہ کیا کریں۔ اس لئے کہ یہی وہ چیز ہے جس نے اس علاقہ کے عوام میں شدید حساسیت پیدا کر دی ہے کہ آخر خلیج فارس میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے وہ کون سے مفادات ہیں جن کی حفاظت کے لئے یہ لوگ فوجی اور جنگی اقدامات تک کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ البتہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے شروع سے اب تک خلیج فارس کے سلسلہ میں ہماری پالیسی بالکل صاف اور واضح رہی ہے جمہوری اسلامی ایران کی نظر میں خلیج کے امن کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ تمام تر بحری، فضائی اور زمینی اسلحوں کی موجودگی کے باوجود آبنائے ہرمز کو بند کرنے یا تیل بردار کشتیوں، ٹینکروں، تیل خارج کرنے والے مرکزوں اور اس علاقہ میں واقع تیل صاف کرنے والی ریفائنریوں اور بندرگاہوں کو نقصان پہنچانے سے گریز برتا ہے، اور اب تک صبر و انتظار کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے جنگ کے شعلوں کو مزید پھیلنے سے روکتے چلے آرہے ہیں اب تک ہم نے تمام اقدامات جوابی کارروائی کے طور پر محض اپنی صلاحیت و طاقت کا ایک ہلکا سا نمونہ پیش کرنے کے لئے کئے ہیں۔ آج ساری دنیا اس حقیقت سے واقف ہو چکی ہے کہ خلیج فارس میں کسی طرح کی بھی بد امنی صرف ایران کے نقصان پر منتہی نہیں ہو سکتی بلکہ طاقتور ترین حکومتیں اور بڑی بڑی طاقتیں بھی اگر امریکہ کی طرح اپنی اور اپنے حلیف ملکوں کی تمام تر ہوائی دریائی اور جاسوسی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئیں اور کوشش کریں کہ صرف ایک کشتی کی حفاظت اس کے ہمراہ حفاظتی جنگی دستوں (ESCORT) کو خطرہ میں ڈالے بغیر کر لیں تو اس خطرہ اور ضرر سے محفوظ و مصئون نہیں رہ سکتے۔ اس ناامنی کے گرداب میں ان کا غرق ہو جانا یقینی ہے۔ ان تمام مقدمات و تمہیدات اور چیخ پکار کے باوجود جن سے امریکہ نے دنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے اور دسیوں خبرنگاروں اور فلم برداروں کو اس علاقہ میں اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ امریکہ کے شرم انگیز منصوبوں کی کامیابیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں لیکن خداوند عالم امریکہ کی تباہی اور رسوائی کا سامان خود فراہم کر رہا ہے اس کے غیبی ہاتھ پرچم کفر پر پرچم لا الٰہ الا اللہ کے معنوی اقتدار کو ظاہر و نمایاں کر کے اپنے مخلص بندوں کے

دلوں کو شادمانی عطا کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر امریکہ اور ریگن بادودی سرنگوں سے بھرے ہوئے خلیج فارس کی اس سیاست کو ترک کر دیتے جس نے ان کی ذلت و رسوائی کا نقارہ بجا دیا ہے، کاش وہ دوبارہ ادھر سے عبور کرنے کی حماقت نہ کریں اور غرور و جہل کی اس سواری پر سوار نہ ہوں جو اب تک دسیوں بار اپنے سوار کو زمین کی دھول چاٹنے پر مجبور کر چکی ہے اور کم سے کم اپنی طاقت نمائی کا ہوّا اپنے کویت جیسے غلاموں کے سامنے محفوظ رکھیں۔ اب اس سے زیادہ اپنی خفت اور شکست کا سامان فراہم کر کے ان لوگوں کو شرمسار اور شرمندہ نہ کریں۔ وہ اس بات کا یقین کر لیں کہ خلیج فارس میں ان کی جولانی کا جاری رہنا اس علاقہ میں خود ان ہی کے لئے خطرے اور بحران کا سبب بنے گا۔ اگر دنیا خود کو تیل کے بحران اور ہر طرح کے اقتصادی تجارتی و صنعتی توازن کے مختل و معطل ہو جانے کے لئے تیار کر چکی ہے تو ہم بھی تیار ہیں اپنی کمر ہمت محکم طور پر باندھ چکے ہیں جنگی آپریشن کے لئے ساری چیزیں آمادہ ہیں۔ امریکہ حتمی طور پر اس نکتہ پر غور کر لے کہ خلیج فارس میں کسی بھی طرح کی فوجی مداخلت صرف ایک تجربہ اور آزمائش کی نوعیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک بہت بڑا اجال ہے اور خطرناک کھیل ثابت ہو سکتا ہے خلیج فارس کے ہم تمام مسلمان خلیج فارس میں بڑی طاقتوں کی فوجی موجودگی کو ممالک اسلامی اور جمہوری اسلامی کے خلاف ایک سازش اور ایک زبردست حملے کا مقدمہ نیز صدام کی کھلی ہوئی حمایت تصور کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایران کے اسلامی جمہوری نظام کے ساتھ مل کر اپنے عزم و ارادے کو بلند و مستحکم کریں تاکہ وہ امریکہ کا دنداں شکن جواب دے کر پیغمبر اسلامؐ کے گلشن نبوت میں آزادی و استقلال اور توحید و امامت کے شگفتہ پھولوں کا نظارہ کر سکیں۔ البتہ خلیج فارس کے اردگرد واقع تمام اسلامی ممالک کے سربراہوں کو میں بار بار یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس علاقہ میں واقع ممالک کو، اسلام، انقلاب اور جمہوریہ اسلامی ایران کی جانب سے مفروضہ خطرات کا خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا جانا تمام قدیم و جدید استعماری طاقتوں کا دھندا رہا ہے اور رہے گا وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح پیدا ہونے والے تفاہم و تعاون کے مسالمت آمیز پودے کو پھلنے پھولنے سے روک دیں تاکہ یہ ممالک ہمیشہ شرق و غرب کے محتاج بنے رہیں۔ جبکہ جمہوری اسلامی ایران اس بات پر مائل ہے کہ وحدت کے تحفظ اور تمام اسلامی ملکوں اور ملتوں کے مفاد کی حمایت کی بنیاد پر ان کی مشکلات میں مدد کرے اور عالمی استعمار کی طرف سے مسلط کئے جانے والے فوجی و سیاسی حوادث کا اپنی طاقت اور نفوذ کے ذریعہ دفاع کرے نیز ایک ایسا مضبوط و مستحکم منصوبہ پیش کرے جو شرق و غرب کے سیاسی تسلط کو ختم اور کنٹرول کر سکے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ صدام اور عراق پر حاکم افلقی بعث پارٹی کے ہوتے ہوئے یہ مسئلہ سست رفتاری سے آگے بڑھے گا۔ کیونکہ جس قدر

دنیا کی بڑی طاقتیں ملت اسلام کی وحدت اور اتفاق و مشارکت سے خوف زدہ ہیں اتنا ہی صدام بھی ایران کے ساتھ دیگر ممالک اسلامی کے تعاون و ہم بستگی سے ہراساں ہے۔

زوال صدام تک جنگ جاری رکھنا شرعی فریضہ ہے — بہرحال جتنک عراق سے صدام اور بعث پارٹی کا خاتمہ نہ ہوجائے جنگ جاری رکھنے اور اپنے حق و عدالت پر مبنی شرائط کے قبول کرانے پر ہمارا اصرار ایک شرعی ذمہ داری اور واجب الٰہی کی ادائگی ہے جس سے ہم قطعی انحراف نہیں کرسکتے۔ کیونکہ انشاء اللہ یہی چیز ممالک اسلامی میں ایک پائدار و مستحکم سیاست نیز تمام ملکوں اور ملتوں کی بنیادوں کو استحکام و دوام عطا کرے گی۔ اسی کے پرتو میں لوگوں کے منافع، حملہ آوروں کی دست درازیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں وہ تمام لوگ جو اسلامی ممالک کو ہڑپ کرجانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں صدام کے انجام سے عبرت حاصل کرتے ہوئے خود کو ملتوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنانے سے پرہیز کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تمام ملتوں اور اسلامی ملکوں کی قسمتیں اس جنگ کے انجام سے وابستہ ہیں۔ جمہوریۂ اسلامی ایران اس مرحلہ میں ہے کہ اس کی کامیابی پوری ملت اسلام کی کامیابی ہے اور اگر خدا نخواستہ اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو یہ تمام مومنین کی ذلت و شکست کے مترادف ہوگی۔ ایک ملت، ایک ملک اور ایک مکتب کو کامیابی کے آدھے راستہ پر پہنچا کر بے سہارا چھوڑ دینا نہ صرف خدا و رسول بلکہ خود انسانی آرزوؤں کے ساتھ خیانت ہے لہٰذا ہمارے ملک میں جنگ کا بخار صدام کے سقوط اور اس کا خاتمہ کئے بغیر ہرگز ٹھنڈا نہ پڑے گا اور انشاء اللہ اس مقصد تک پہونچنے میں کوئی خاص فاصلہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم خداوند عالم کے شکر گزار ہیں کہ ہماری پوری ملت، حکومت، تنظیمیں، فوجیں، رضاکار دستے بلکہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے بہادر و جانباز مرد و عورت پورے طور پر آمادہ ہیں یہ سب کے سب جنگ آزما ہیں انھوں نے مدرسۂ عشق و شہادت سے تربیت حاصل کی ہے، بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعماری سازشوں، جاسوسی ایجنٹوں اور ان کی منافقانہ سرگرمیوں کا سر کچل چکے ہیں اور خداوند عالم کی مدد سے کامیابی و کامرانی کے آخری دریچے بس کھولنا ہی چاہتے ہیں۔ خود خلیج فارس نیز دیگر جزیروں، ساحلوں اور جنوبی و مغربی علاقوں میں اپنی برتری و موجودگی کے علاوہ عراق کے ستم زدہ عوام کو بھی باقاعدہ منظم و مرتب کرکے فوجی دستے تشکیل دینا شروع کردیا ہے اور یہ چیز ہمارے اہم ترین مقاصد میں سے ہے کیونکہ ہم نے ابتدائے جنگ سے ہی واضح طور پر اعلان کردیا ہے کہ ہم عراق کی ایک بالشت زمین پر بھی نظر نہیں رکھتے، عراقی عوام اپنی حکومت کے انتخاب اور فیصلوں میں بالکل آزاد ہیں ہماری نظر میں اس سے بہتر کیا بات ہوسکتی تھی کہ قبل اس کے

کہ میدان جنگ میں دلاوران اسلام کے ہاتھوں عراق پر حاکم موجودہ بعثی حکومت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو، عراقی عوام اپنی پسند اور نظر کے مطابق حکومت کا انتخاب کریں اور بحمد اللہ اس عظیم جدوجہد کے آثار ظاہر و آشکار ہوچکے ہیں چنانچہ ہم تمام بڑی طاقتوں نیز عراق کی رو بزوال بعثی حکومت کے حامیوں کو یقین دلا دینا چاہتے ہیں کہ اس جنگ کو بین الاقوامی مقابلہ آرائی بنانے کی کوشش کرنا اور عالمی سطح پر جمہوریۂ اسلامی ایران کے خلاف جنگی، سیاسی اور تبلیغاتی دباؤ یا ڈپلومیٹک پریشر ڈالنا یا خلیج فارس میں فوجی و غیر فوجی مداخلت کرنا، موجودہ مشکلات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرنا نیز اپنے اندھے اور بے فائدہ تجزیہ و تبصرہ کے ذریعہ اختلاف و انتشار کی فضا پیدا کرنا ہم کو صدام اور اس کی بعث پارٹی کا سر کچلنے نیز حملہ آوروں کو ان کے مناسب حال سزا دینے سے ہرگز باز نہیں رکھ سکتا۔ ہم اب تک خدا کے لطف و کرم سے ہر طرح کے عالمی دباؤ اور محاصرے، اپنے اس عظیم مقصد تک پہنچنے کے لئے برداشت کرتے چلے آرہے ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے کبھی تھکاوٹ محسوس نہیں کر سکتے، یہ ملت ایران ہے جو پوری بلند قامتی کے ساتھ جام شہادت و ایثار پر صبر و استقامت کے ساتھ ڈٹی ہوئی ہے اور اس راہ پر بڑھتے رہنے کے سلسلہ میں اس کے جوش و نشاط سے بھرپور نعروں میں مزید شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے، ممکن ہے بعض مغرب زدہ ذہن رکھنے والے جو شروع سے ہی میدان دفاع سے جان چراتے رہے ہیں اور جنھوں نے آج تک نہ تو اپنے وطن عزیز کی حفاظت اور محاذ آرائی میں کسی طرح کی خدمت انجام دی ہے نہ ہی آئندہ الٰہی سپاہ میں شامل ہو کر راہ خدا میں سربازی کی صلاحیت و لیاقت رکھتے ہیں اپنے آقاؤں کی خوشنودی اور ان کی حوصلہ افزائی کی غرض سے اس تھوپی ہوئی جنگ کو ایک تھکا مارنے والی اندھی راہ کہکر چیخ پکار مچاتے رہیں اور اس خام خیال میں گرفتار رہیں کہ اس طرح عوام کے افکار کو جنگ سے منحرف کر لیں گے اور وہ لوگ جو ایرانی سرحدوں سے باہر بیٹھے ہوئے ہیں یقین کر لیں گے کہ ایرانی عوام، حکومت کے ذمہ دار افراد نیز تمام فوجی، حفاظتی اور رضاکار دستے اب جنگ جاری رہنے سے عاجز آچکے ہیں اور ان کے درمیان اس موضوع پر اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ بہ لطف خداوندی، جمہوریۂ اسلامی ایران میں، ذمہ داران حکومت کے درمیان کسی بھی بنیادی و اصولی نظریاتی موضوع پر کسی طرح کا اختلاف نہیں پایا جاتا ہر ایک اپنی جگہ مصمم ہے کہ اسلامی ملتوں کے درمیان مکمل وحدت و ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے دشمنوں کا سر کچل کر چور چور کر دے تاکہ آئندہ، جس میں اب کچھ بھی دیر باقی نہیں رہ گئی ہے، پوری دنیا میں اسلام کو کامیاب و رستگار دیکھ سکیں۔ الحمد للہ آج رسول خدا

کا یہ ملک ایسے لاکھوں جوانوں کو تربیت دے چکا ہے جو جنگ اور شہادت کے شیدائی ہیں ہماری ملت کے دل اور آنکھیں سوائے رضائے الٰہی کے کسی شئے سے پُر نہیں ہو سکتیں، یہی وجہ ہے کہ اپنی جان و مال اور فرزندوں کی قربانیاں پیش کرنے میں ان کو لذت و راحت محسوس ہوتی ہے چنانچہ تقوائے الٰہی اور جہاد میں سبقت ان کی نظر میں بزرگی و برتری کا معیار بن چکا ہے وہ جاہلیت کی تمام قدیم و جدید خود نمائیوں اور فرعونی خصلتوں سے متنفر ہو چکے ہیں خود میں اپنے آپ کو ایسی عظیم ملت کا خادم سمجھتا ہوں اور میں اس خدمت پر فخر محسوس کرتا ہوں میری نظر میں ساری معنوی برکتیں پیغمبر اسلام رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی توجہ کی مرہون منت ہیں۔ میں ممالک اسلامی کے تمام افراد خصوصاً نوجوانوں کو فضیلت و تقویٰ کے اس مظہر کا ادراک و شناخت حاصل کرنے نیز آپس میں گہرے برادرانہ تعلقات برقرار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے اس موقع پر اپنے ملک کے تمام ذمہ داروں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ فضیلت و برتری کے جتنے بھی معیار ہیں ان میں جو عظمت و اہمیت تقوے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کو حاصل ہے وہ کسی بھی اور چیز کو میسر نہیں ہے اور اسی الٰہی معیار کی بنیاد پر ملک کے نظام نیز اس کے مختلف اداروں میں افراد کے انتخاب و امتیاز اور ذمہ داریوں کی تقسیم و نگرانی کا کام انجام دیا جانا چاہیئے، اس کے علاوہ لوگوں کو ایک دوسرے پر مقدم کرنے یا ان کے درمیان امتیازات برتنے کے جتنے بھی مادی اور نفسانی غلط اور غیر منصفانہ طریقے ہیں ان کو ختم کر کے اسی اصول کو اپنا لینا چاہیئے چاہے جنگ کا زمانہ ہو یا صلح کا چاہے آج کی بات ہو یا کل کی کیونکہ خداوند عالم نے اسی کی وجہ امتیاز قرار دیا ہے۔ اور اس امتیاز کا محض زبانی یا لفظی طور پر رواج پا جانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو قوانین و دستور کی عبادتوں کے ساتھ ہی ساتھ عقیدہ و عمل اور معاشرتی زندگی کے روزمرہ میں بھی رائج کیا جانا چاہیئے۔ قید و بند کی مصیبتیں جھیلنے والوں، محاذ جنگ پر جانے والوں، شہید و اسیر و مجروح و مفقود پیش کرنے والوں، مختصر یہ کہ غریبوں، محتاجوں، مظلوموں اور محروموں کو عیش و عشرت اور اطمینان و راحت کی زندگی بسر کرنے والوں نیز میدان جنگ اور جہاد و تقویٰ سے گریز اختیار کرنے والوں پر اسلامی نظام میں ترجیح و برتری دی جانی چاہیئے اور اس مقدس جدوجہد میں پیش قدم رہنے والوں کی شرافت و عظمت، نیز غربت و امارت کے درمیان ہونے والی اس جنگ کو نسل بہ نسل اور سینہ بہ سینہ محفوظ رہنا چاہیئے اور اس بات کی پوری کوشش کی جانی چاہیئے تاکہ دین کو دنیا کے ہاتھ فروخت کر دینے والے آرام طلب افراد کی فقر و کفر کو دور کرنے والی ہماری واضح پالیسی کو مخدوش نہ کر سکیں اور ہمارے انقلاب کے روشن چہرے کو داغدار نہ بنا سکیں

اور خدا کو بھلا بیٹھنے والے مالداروں کا دفاع کرنے کا بدنما داغ ہماری حکومت کے ذمہ داروں پر نہ لگنے پائے ۔ وہ لوگ جو عیش و عشرت کے محلوں میں راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور انقلاب کے محکم واستوار ستون غریبوں اور محروموں کو پیش آنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں سے کنارہ کش رہ کر ان کے جانفرسا حالات کا دور سے تماشہ دیکھتے رہے ہیں حتی کہ کبھی دور سے بھی ان کے مصائب و آلام کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی ہے وہ کسی بھی کلیدی عہدہ کے ہرگز مستحق نہیں ہیں کیونکہ اگر ایسے لوگ اہم مقامات پر پہنچ گئے تو کوئی بعید نہیں کہ ایک ہی شب میں وہ اس انقلاب کو بیچ دیں اور ملت کی ان تمام زحمتوں کا ثمرہ تباہ و برباد کر دیں ۔ کیونکہ ان لوگوں کو اس راہ میں جن گہری کھائیوں سے گزرنا پڑا ہے اس کا قطعی اندازہ نہیں ہے یہ لوگ کیا جانیں کہ خدا کی طرف سے غافل خود فراموشوں کے ہاتھوں اس نظام اور ملت کے سر اور سینے کس کس طرح شگافتہ کئے گئے ہیں ۔ اس راہ میں انقلابیوں نے کیسے کیسے شکنجے سہے ہیں کیسے کیسے غربت و جلا وطنی کے دن گزارے ہیں، مجاہدوں کو کس بے قراری اور درد و کرب کی منزلوں سے گزرنا پڑا ہے اور غیروں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم کو ختم و نابود کرنے کے لئے پریشانی اور بلا کے کتنے دریا عبور کرنے پڑے ہیں، یہ لوگ اس سے قطعی غافل و بے خبر ہیں ۔

علماء سے گذارش ـــــ حج کے لئے جانے والے تمام علماء اور حج کاروانوں کے ذمہ داروں کو، جنھوں نے زائرین محترم کی رہنمائی کی عظیم ذمہ داری قبول کی ہے جمہوریۂ اسلامی ایران کی موجودہ استثنائی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی پوری ہمت و کوشش سے کام لے کر صحیح اور منظم انداز سے مراسم حج منعقد کرنے کی کوشش کریں ۔ انھیں وسعت قلب کا مظاہرہ کرتے ہوئے زائرین خانۂ خدا سے کسی طرح کی بھی توقع اور امید لگائے بغیر حج کے تمام مناسک و مسائل میں ان کی ہمراہی اور رہنمائی کرنی چاہیئے۔ مختلف گروہوں کے مناسب حال چاہے پڑھے لکھے افراد ہوں یا جاہل باقاعدہ لائحۂ عمل ترتیب دینا چاہیئے اور کسی منزل میں بھی اپنی ذمہ داری اور اس عظیم تاثیر سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے جو حج کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے انسان کے نصیب میں آتی ہے ۔ چونکہ اس معنوی ماحول اور فضا میں لوگوں کے قلوب تحول و انقلاب اور قبول حق کے لئے آمادہ ہوتے ہیں لہٰذا امور حج کی ادائیگی خصوصاً مناسک و مسائل کے سلسلہ میں تشخصی اور ذاتی نظریۂ و عمل سے بالکل پرہیز کریں ۔ حج کے مسائل پورے علم و یقین کے ساتھ اور ضروری موارد میں مطلع افراد یا فقہی کتب سے مراجعہ کر کے بیان کیجئے کیونکہ حج کے اعمال و مناسک میں جدید اور مبتلا بہ مسائل کی کمی نہیں ہے خدانخواستہ

کہیں کوئی مسئلہ ناقص یا غلط بیان کر دینے کی وجہ سے عمل باطل ہو جائے یا حجاج کرام کے لئے دشواری اور عسر و حرج کا سبب بن جائے۔

علمائے کرام اگرچہ مسائل بڑی وضاحت اور دقت نظر کے ساتھ بیان کرتے ہیں پھر بھی اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ مشکل تراشی یا اس طرح کے وسوسے پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے جس کے تحت زائرین محترم شک و شبہات یا بلاوجہ کی احتیاط کے چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کیونکہ کسی طرح کے پروگرام اور مراسم نیز عبادتوں اور دعاؤں میں وسوسے پیدا ہو جانا واجب کی ادائیگی میں کاہلی اور بے توجہی کا سبب بن جاتا ہے۔

حج کا اجتماع علمائے کرام کے لئے نہایت ہی مناسب اور زرین موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ دیگر ممالک اسلامی سے تعلق رکھنے والے صاحب نظر علماء اور دانشوروں سے ارتباط قائم کریں، اگرچہ دنیا کی بڑی طاقتوں بلکہ بعض اسلامی ممالک کے سربراہوں کی نظر میں بھی اس طرح کے روابط اور ملاقاتیں خوف و ہراس کا باعث بنتی ہیں اور ان کی طرف سے بڑی شدت کے ساتھ اس کی روک تھام کی جاتی ہے پھر بھی ایک صحیح منصوبہ بندی کے تحت اس مناسب ترین موقعیت سے استفادہ کرتے ہوئے افکار و نظریات کے تبادلے اور اسلامی معاشرہ میں پائی جانے والی دشواریوں کا حل تلاش کرنا جمہوریہ اسلامی ایران کی دیرینہ خواہش رہی ہے چنانچہ اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ہمارے علمائے عظام اور تبلیغات حج کے ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کے تجربات دوسروں تک پہونچائیں اور احکام قرآنی کے آئینہ میں ایک سیاسی لائحہ عمل پیش کریں نیز عوام اور معاشرہ کی قیادت و رہبری کے سلسلہ میں علماء اسلام کا کیا عظیم رول رہا ہے اس کو پیش کر کے اپنی عظیم ذمہ داری کو پورا کریں۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ نہ صرف عوام بلکہ اسلامی ملکوں کے اکثر علماء بھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ روزمرہ کے مسائل سے لیکر بین الاقوامی سیاست کے میدان تک کس اہمیت اور وقعت کے حامل ہیں وہ ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں کیا رول ادا کر سکتے ہیں اس کا احساس بھی نہیں رکھتے۔ مادی افکار و نظریات سے متاثر ہو کر وہ یہ سوچنے لگے ہیں کہ اس دور تمدن میں جس کو صنعت اور ٹکنک کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ علمی تحولات اور مادی ترقیوں کے سبب علماء کا اثر کم ہو گیا ہے۔

اور نعوذ باللہ اسلام ملکوں کا نظام چلانے سے قاصر ہو چکا ہے جبکہ الحمد للہ علماء کی رہبری میں

انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی نے ان تصورات کا باطل ہونا ثابت کر دکھایا ہے اور ہر طرح کی بداندیشیوں رخنہ اندازیوں، شرق و غرب کی شاطرانہ سازشوں اور ان کے زرخرید ایجنٹوں کی حسادت اور کینہ توزیوں کے باوجود علماء اسلام کا اقتدار و صلاحیت اور اس کے اثرات دنیا پر آشکار کر دیئے ہیں۔ میں عالم اسلام کے تمام مفکروں، دانشوروں اور علماء کو چاہے کسی بھی خطۂ ارض سے تعلق رکھتے ہوں، دعوت دیتا ہوں کہ کسی مناسب موقع سے مملکت اسلامی ایران کا سفر کریں اور دیکھیں کہ وہ ملک جو کل شاہنشاہی نظام کے تحت ایک غرب زدہ مملکت میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں اسلامی اقدار سرے سے پامال کی جا چکی تھیں، وہ ایران جو اسلام کو مٹانے اور آثار رسالت کو محو کرنے کا ایک مرکز بنتا جا رہا تھا جہاں تاریخ و ثقافت سے لیکر تمام اسلامی ظواہر فنا کے گھاٹ اتار دینے کی فکریں کی جا رہی تھیں آج وہی ایران کتنا تبدیل ہو چکا ہے آئیں اور خود اپنی آنکھوں سے حالات کا مشاہدہ کریں۔

آج اس ملک کے قوانین و دستور کی اساس و بنیاد وحی و اسلام پر قائم ہے اور تمام کفر و شرک کے مظاہر مٹا کر حتی المقدور علانیہ گناہ کے اڈے ختم کئے جا چکے ہیں اور وہ تمام شرمناک نغمے جو انقلاب کی کامیابی کے اوائل میں کبھی دہریت کے ماروں کبھی دائیں اور بائیں محاذ کے فداکاروں اور کبھی قومیت کے علم برداروں کی طرف سے ملت ایران کے افکار کو متأثر کر کے حکومت پر قبضہ جمانے کی غرض سے سنائی دیتے تھے خداوند عالم کے فضل و کرم سے ان سب کی سازشوں کا پردہ چاک ہو گیا اور آج پورے ملک میں اسلامی قوانین اور منصوبے بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ میدان نبرد و کارزار سے لیکر علمی و تحقیقاتی مراکز، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس تک قانون ساز مجلسوں اور ملکی و فوجی آئین و اصول سے لیکر ملک کی مجلس انتظامیہ تک جو ایران جیسے ایک بڑی جنگ اور محاصرے سے دوچار ملک میں ۵ کروڑ سے بھی زائد آبادی کے اہم ترین مسائل کے حل و فصل میں مشغول ہے اور نظام عدلیہ سے لیکر، جو حدود و احکام الٰہی کے اجرا کی ذمہ داری کے علاوہ امن و امان قائم رکھنے کا سنگین ترین بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے اور ایک انقلابی معاشرہ میں لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا فریضہ ادا کر رہی ہے، فوجی و انتظامی قیادت تک جو سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ہی ساتھ اندرون ملک طرح طرح کی رنگ برنگی سازشوں کو ناکام بنانے، منافقوں اور انقلاب دشمنوں کے جرائم اور تخریبی کارروائیوں پر نظر رکھنے، فحشاء و منکرات، قتل و غارت گری، چوری اور ڈکیتی نیز منشیات پر کنٹرول کرنے کے عظیم فرائض انجام دے رہی ہے اور یہ سب کچھ پابند شریعت علماء کی رہبری، اسلام کے نورانی احکام اور

پیغمبر اسلام حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب نیز ائمہ ھدیٰ علیہم السلام
کی پیروی کا نتیجہ ہے ہم خداوند عالم کا شکر ادا کرتے ہیں کہ آیات وحی اور کتاب خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے
ملک کو دوسروں کی وابستگی سے نجات دلانے میں کامیاب ہو چکے ہیں، البتہ ابھی معاشرہ میں ہر سطح پر مکمل طور
سے تمام اسلامی احکام و قوانین بروئے عمل لانے کے سلسلہ میں بڑی طویل راہ طے کرنی ہے پھر بھی خداوند عالم کی
مدد کے سہارے ہم اپنی کوشش و جستجو جاری رکھیں گے اور اس طرح احساس کمتری کا شکار وہ تمام افراد جن کے
ذہنوں میں مشرق و مغرب کا ایسا ہوّا سمایا ہوا ہے، وہ اسلامی نعروں کو پیش کرنے اور قرآن پر اعتماد کرنے
سے بھی ہراساں ہیں ان سب کو دکھا دیں گے کہ کس طرح ایک معاشرہ کو اسلام کی رہبری میں سرچشمۂ معارف
قرآن کریم کے ذریعہ سیراب کیا جاتا ہے، بحمد اللہ یہ سب کچھ علمائے اسلام کے میدان سیاست میں ورود کی
برکتوں اور پیش آنے والے جدید مسائل کے سلسلہ میں احکام اسلامی کے استنباط کی وجہ سے ہے آج ملک
ایران میں علماء فقط خطابات، وعظ و نصیحت اور روزمرہ کے فقہی مسائل بیان کرنے تک محدود نہیں ہیں بلکہ
اہم ترین ملکی و بین الاقوامی سیاسی مسائل میں اپنی دخالت و شرکت کے ذریعہ علماء کی توانائی انتظامی صلاحیتوں
کو ساری دنیا پر واضح کر چکے ہیں اور اس طرح تمام سکوت و خاموشی کا دم بھرنے والے سازشی ذہن کے حامل
علم فروشوں کے لئے آخری حجت تمام کر دی ہے تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والے
بہت سے علماء نے اپنے عظیم تاریخی نقوش اور الٰہی پیغام رسانی کے فرائض سے ایسے دور میں بھی آنکھیں
بند کر رکھی ہیں جبکہ دنیائے بشریت اسلام کے معنوی و نورانی احکام کی پیاسی ہے یہ لوگ ملتوں کی پیاس
کا احساس نہیں کرتے انھیں وحی الٰہی کے تئیں انسانی معاشرہ میں پائی جانے والی بے چینی اور شوق و رغبت
کی قطعی خبر نہیں ہے اپنی حیثیت اور روحانی اثر و رسوخ کو بہت کم اور حقیر تصور کر رکھا ہے جبکہ ان
زرق برق حالات اور نسل معاصر پر مادی علوم و تمدن کی حاکمیت و غلبہ کے باوجود علماء خطباء، ائمہ جمعہ و
جماعت اور اسلامی روشن خیال افراد اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اگر وحدت و ہم آہنگی پیدا کریں
اور ہدایت و رہبری کے سنگین فریضہ کو عملی جامہ پہنائیں تو دنیا پر قرآن کی حاکمیت برقرار کر کے ان تمام
برائیوں، دست درازیوں، مسلمانوں کے استحصال اور ذلت و رسوائی کی روک تھام کر سکتے ہیں۔ کسی بھی
چھوٹے بڑے شیطان خصوصاً امریکہ کو ممالک اسلامی میں اپنے اڈے قائم کرنے کی ہرگز اجازت نہ دیں اور
فضول و لاطائل تحریر و تقریر کے ذریعہ تفرقہ اندازی کے بیج بونے، حکام جور کی تعریف و توصیف کے پل باندھنے

محروم و مظلوم عوام کو مسائل اسلامی کی طرف سے بیزار و بدبیں بنانے اور صفوف مسلمین میں نفاق پیدا کرنے کے بجائے اسلام کے روشن احکام بیان کرنے کی جرأت پیدا کریں اور اس بے کراں سمندر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لئے بھی اور ملت اسلام کے لئے بھی عزت کی زندگی فراہم کریں۔ نیز امت محمدی کا اعتبار بڑھائیں۔ کیا علمائے اسلام کے لئے یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ ان کے ہاتھوں میں قرآن کریم اور اسلام کے زریں احکام و قوانین موجود ہوں، پیغمبر اسلام کی سنت اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت سامنے ہو پھر بھی ان کے زیر اثر اسلامی ملکوں میں دنیائے کفر و شرک کے دستور و احکام کی حکمرانی ہو؟ اسلام کے حقیقی دشمنوں کی جانب سے صاحبان زر و زور و تزویر کے ذریعہ مسلط کئے جانے والے فیصلوں پر عمل درآمد کیا جا رہا ہو، کرملین یا واشنگٹن کے سیاست مداروں کی طرف سے ممالک اسلامی کے لئے دستور العمل صادر ہو رہا ہو!!

تمام اسلامی ملکوں کے علماء کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی پریشانیوں اور مشکلوں کا حل تلاش کرنے اور ان کو حکومت جور کے تسلط اور دست ظلم سے نجات دلانے کے سلسلہ میں باہم بیٹھ کر بحث و مشورہ اور تبادلۂ نظر کریں اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہو جائیں، شرق و غرب کی گندی اور بیہودہ تہذیب و ثقافت جو ملت اسلام کی نسلوں اور کھیتیوں کو تباہ و غارت کر دینا چاہتی ہے اس کی روک تھام کریں اور اپنے اپنے ملکوں کے عوام کو، شرق و غرب کی ظاہری زرق برق کے مقابلہ میں احساس کمتری و خود فراموشی کا شکار ہو جانے کے برے نتائج سے آگاہ و خبردار کرتے ہوئے مسلمان عوام اور حکومتوں کو بڑی استعماری طاقتوں کی نئی شیطانی چالوں اور خطرناک ترین منصوبوں سے مطلع کریں جنھوں نے مختلف اسلامی ملکوں میں جنگ و خونریزی کا بازار گرم کر کے پوری دنیا میں مسلمانوں کے قتل عام کی پالیسی پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ میں پھر تاکید کرتا ہوں کہ دنیا آج اسلام کے نورانی احکام و حقائق کی پیاسی ہے اور تمام علماء کے لئے اللہ کی طرف سے حجت تمام بھی ہو چکی ہے کیونکہ اس وقت جبکہ ممالک اسلامی کے نوجوان اپنے مقدس دینی اقدار کے دفاع کے لئے خود کو شہادت کی حدوں تک پہنچا چکے ہیں اور اپنے اوپر چڑھائی کرنے والوں کو نکال باہر کرنے کے لئے حوادث و بلا کے سمندر میں چھلانگ لگا چکے ہیں، اپنے لئے قیدخانوں اور شکنجوں کی زندگی مول لے رکھی ہے، لبنان کے شجاع و بہادر حزب اللّٰهی دلیروں نیز دیگر تمام ملکوں کے انقلابی مسلمانوں کے مانند مقابلہ پر ڈٹے رہنے اور جارحیت کرنے والوں کے خلاف میدان جہاد میں آجانے کے بعد بھی اب اس سے بڑی حجت کیا ہوگی؟ گھروں میں بیٹھ کر خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہنے یا بلاوجہ تقیہ اختیار کر لینے کا اب کون سا بہانہ تراشا جا سکتا ہے؟ اسلام کے متعہد و وفادار

علماء نے اگر میدان عمل میں اترنے سے تاخیر دکھائی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یقیناً ہم کو ایسے بعض متعہد علمائے دین کے درد تنہائی کا احساس ہے جو اپنے ملکوں اور شہروں میں بند و قوں کے محاصرہ اور ڈرپوک درباری علماء کے غیر مشروع فتوؤں اور بے بنیاد تجزیہ و تحلیل کے دباؤ میں مصائب کی زندگی بسر کر رہے ہیں پھر بھی میں اپنے ان تمام عزیزوں کو جو ظالموں کے فشار میں مبتلا ہیں خداوند عالم کی نصیحت یاد دلاتا ہوں کہ: "اَن تقوموا للّٰہ مثنیٰ و فرادیٰ ثم تتفکروا" (تم لوگ خدا کے لئے ایک ایک اور دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور خوب غور کرو) لہٰذا خدا کی راہ میں قیام کیجئے اور غربت و تنہائی سے نہ گھبرائیے۔

درباری ملاؤں سے خبردار — مسجدیں بہترین مورچے ہیں، جمعہ کے اجتماع اور جماعتیں لوگوں کو منظم کرنے اور مصالح مسلمین سے باخبر کرنے کے مناسب ترین ذریعہ ہیں آج اگرچہ حکومتیں اور بڑی طاقتوں کے اشاروں پر ناچنے والی سلطنتیں مسلمانوں سے جنگ پر کمربستہ ہیں اور حکومت ہند کی طرح بے گناہ و بے پناہ حریت پسند مسلمانوں کا قتل عام کر رہی ہیں پھر بھی ہرگز ان میں اتنی جرأت و طاقت نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی مسجدوں اور عبادت گاہوں کو بند کر سکیں۔ وہ کروڑوں مسلمانوں کے نور عشق و معرفت کو ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں کر سکتیں اس کے باوجود اگر وہ مسجدوں اور مذہبی و سیاسی محفلوں پر پابندی لگا دیں حتیٰ کہ علمائے اسلام کو شاہراہ عام پر تختہ دار پہ آویزاں کر دیں تو یہ خود مسلمانوں کی مظلومیت ثابت کرنے اور مسلمانوں کے علماء اسلام کی طرف متوجہ ہونے نیز ان کی پیروی کرنے کا سبب بنے گی۔ کیا خداوند عالم نے علماء سے عہد نہیں لیا ہے کہ وہ ظالموں کے ظلم اور ستمگروں کی زیادتی کے مقابلہ میں آرام کے ساتھ خاموش بیٹھے نہیں رہیں گے کیا علماء اس زمین پر پیغمبروں اور معصوموں کی حجت نہیں ہیں؟ اور جب ایسا ہے تو عالموں، روشن خیالوں اور محققوں کو اسلام کی مدد کرنی چاہئے، وہ آگے بڑھیں اور آج اسلام جس غربت سے دوچار ہے، اس کو اس سے نجات دلائیں اور اب اس سے زیادہ ذلت و رسوائی برداشت نہ کریں اور عالمی استعمار کے مسلط کردہ پندار قیادت کو توڑ دیں اور سیاسی بصیرت سے کام لیکر اپنا روشن و تابناک و باوقار چہرہ آشکار کر دیں۔ اس سلسلہ میں دو رنگی سے کام لینے والے منافق چہروں، علماء کا بھیس بدل کر دین کو دنیا کے ہاتھ فروخت کر دینے والوں اور قیل و قال کرنے والے عالم نماؤں کو اپنے اردگرد اور ماحول سے نکال باہر کریں اور اس بات کی اجازت نہ دیں کہ ظالموں اور ستمگروں کی خوشامد کرنے والے جھوٹے اور فریبی علماء خود کو امت اسلامی کے معنوی پیشواؤں اور رہبروں کی حیثیت سے مسلمانوں پر مسلط کر کے علمائے اسلام کی روحانی و معنوی وقعت و حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔

اسلام کے تمام متعہد و ذمہ دار علماء کا فرض ہے کہ وہ کھل کر لوگوں کو اس عظیم خطرہ سے آگاہ کریں جو آج اسلامی معاشرہ کو ضمیر فروش علماء اور درباری ملاؤں کی طرف سے درپیش ہے کیونکہ یہاں ہی بے خبروں کی کارستانی ہے کہ ظالم و جابر استعمار کی غلام حکومتوں کی حمایت و توجیہ کرتے ہوئے مظلوم و محروم ملت کو اپنے جائز حقوق سے دستبردار ہو جانے نیز وقت ضرورت آزادی و استقلال کے طالب مجاہدین راہ خدا کے خلاف تکفیر و تفسیق کا حکم لگاتے رہتے ہیں۔ خداوند عالم تمام اسلامی ملتوں کو ان نا اہل مذہب فروشوں کے ظلمت خیز وجود اور شر سے نجات عطا کرے۔

الحادی ثقافت کے خلاف جہاد ۔ علماء فقہاء کی ذمہ داریوں میں سے ایک بہت ہی اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اقتصادی میدان میں مشرق و مغرب کی دونوں ظالمانہ ثقافتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں جن کا مقصد معاشرہ میں سرمایہ داری اور اشتراکی اقتصادی سیاست کو رواج دینا ہے اگرچہ ان بلاؤں سے دنیا کی تمام ملتیں دوچار ہیں یہ نئی قسم کی غلامی عملی طور سے تقریباً سبھی ملتوں پر مسلط کی جا چکی ہے اور انسانی معاشرہ کی اکثریت اپنی روزمرہ کی زندگیاں اربابان زر و زور سے وابستہ کر چکی ہے عالمی اقتصادی مسائل میں فیصلے کرنے کا حق ان سے چھین لیا گیا ہے دنیا بھر میں بے پناہ قدرتی ذخائر، زرخیز زمینوں، دریاؤں، جنگلوں اور خزانوں کی موجودگی کے باوجود فقر و تنگدستی میں گرفتار کر دیئے گئے ہیں۔ کیمونسٹوں، زراندوزوں اور سرمایہ داروں نے عالمی لٹیروں سے گہرے روابط استوار کر کے عوام الناس سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور حق زندگی سلب کر لی ہے۔ کثیر الاقوامی و انحصاری مراکز قائم کر کے عالمی اقتصاد پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے تمام کے تمام ارسال و اخراج، تقسیم، سپلائی اور ڈیمانڈ حتیٰ کہ قیمتوں کی تعیین اور بینکنگ وغیرہ بھی اپنے ہاتھوں میں محدود کر رکھا ہے اور خود ساختہ تفکرات و تحقیقات کا پروپیگنڈہ کر کے محروم و کمزور عوام کو یہ باور کر دیا ہے کہ تمہیں ہماری سرپرستی میں زندگی گزارنی چاہیئے ورنہ ان غریبوں کے سامنے زندہ رہنے کے لئے خود کو فقر و فاقہ کے حوالے کر دینے کے علاوہ کوئی دوسری راہ ممکن نہیں ہے۔ یہ انسانی معاشرے اور خلقت کا تقاضا ہے کہ ان کی اکثریت بھوک سے تڑپ تڑپ کر ایک لقمہ روٹی کے لئے ترس ترس کر مر جائے اور دوسری طرف کچھ لوگ شکم پری، اسراف اور عیش پرستی میں غرق رہیں۔ بہرحال یہ وہ مصیبت ہے جو استعماری طاقتوں نے دنیائے انسانیت پر مسلط کر رکھی ہے کمزور قیادت اور وابستگی کی پالیسی نے اسلامی ممالک کو تو قابل رحم حالات میں گرفتار کر رکھا

ہے۔ اب یہ علمائے اسلام اور اسلامی محققین و ماہرین کا فریضہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا پر حاکم اس غیر منصفانہ اقتصادی نظام کی جگہ ایسے جامع اور چارہ ساز منصوبے تشکیل دیں جس میں محروم و محتاج افراد کے مفادات محفوظ رہیں، محروموں، کمزوروں اور مسلمانوں کو فقر و بدحالی کے تنگ و تاریک دروں سے باہر نکال لائے

البتہ دنیا میں اسلامی مقاصد کا بروئے کار لانا خصوصاً مغرب و مشرق کے بیمار و مضمحل سرمایہ داری و اشتراکی نظام کے مقابلہ میں اسلام کے منصفانہ اقتصادی منصوبوں کا نفاذ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہر رخ سے اسلام کی مکمل حاکمیت تسلیم نہ کرلی جائے۔ چنانچہ بہت ممکن ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام اور نظام عدل کے استقرار و استحکام کے باوجود جمہوریہ اسلامی ایران کی طرح، ممالک اسلامی سے اس کے تخریبی آثار مٹانے کے لئے ایک مدت درکار ہو پھر بھی اقتصاد اسلامی میں اصولی طور پر محروموں کے مفادات کی حفاظت اور ان کی عمومی مشارکت کو جو وسعت عطا کی گئی ہے اس کی بنیاد پر ایک اقتصادی لائحہ عمل پیش کرکے زراندوزوں کے خلاف اسلامی جدوجہد کی شرح و توضیح فقر و تہی دستی میں گرفتار انسانیت کی آزادی کے لئے ایک عظیم ہدیہ و بشارت سے تعبیر کی جاسکتی ہے علماء اور دانشوروں کا اس حقیقت کو واضح کر دینا کہ اسلامی حکومت میں دولت و ثروت کی بنیاد پر صاحبان مال و منال، غریبوں اور محتاجوں پر کسی طرح کا امتیاز اور برتری نہیں رکھتے اور ان کو دوسروں پر اولویت ہرگز حاصل نہ ہوسکے گی یقیناً معاشرہ کے کچلے ہوئے غریبوں اور محتاجوں کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور پھلنے پھولنے کی راہیں فراہم کرے گا اور اس نکتہ کی یاد دہانی کہ مملکت اسلامی میں مالی طور پر قدرت و تمکن حاصل کر لینے کی وجہ سے دولت مندوں کو حکومت میں یا حکومت کے ذمہ داروں کے درمیان ہرگز کسی طرح کا اثر و رسوخ پیدا کر لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنے مال و ثروت کو افتخار و مباہات کا ذریعہ قرار دیں نیز غریبوں، محتاجوں اور زحمت کشوں پر اپنی خواہشات و افکار مسلط کر سکیں، لوگوں کی عام امور میں دخالت و دلچسپی کا بہت بڑا سبب بنے گی اور لوگ اعلیٰ اسلامی اقدار اور اخلاق کریمانہ کی طرف مائل ہوں گے نیز خوشامد اور چاپلوسی سے اجتناب کیا جائے گا۔ حتی کہ یہ چیز ایسے دولتمندوں کو بھی ہوش میں لے آئے گی جو اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ ان کی دولت و ثروت بارگاہ خداوندی میں ان کے اعتبار و اعتماد کی دلیل ہے۔

مختصر یہ کہ اس واقعیت کا بیان کہ اسلامی حکومت میں قدر و قیمت کے اعتبار سے صرف اس شخص کو اہمیت و شرف حاصل ہے جو تقوائے الٰہی سے مالا مال ہو یہاں مال و ثروت و اقتدار کی کوئی حیثیت نہیں

ہے۔ اس عادلانہ نظام حکومت کے تمام ذمہ داروں، خدمت گزاروں، قائدوں اور علماء کا فریضہ ہے کہ وہ دولتمندوں مالداروں اور امیدوں کے بجائے غریبوں، فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نشست و برخواست معاشرت و آمد و رفت، رفاقت و آشنائی پیدا کریں اور ان کے ہر حال میں شریک رہیں کیونکہ قدرت و اختیار اور آسودہ حالی کے باوجود غریبوں اور محتاجوں کے درمیان رہنا اور خود کو ان ہی کے مانند سمجھنا اور قرار دینا ایسی ہی فخر و افتخار کی چیز ہے جو اولیائے خدا کو نصیب ہوتی ہے۔ منحرفین کے معاندانہ پروپیگنڈوں کے ذریعہ پیدا کئے جانے والے شک و شبہات کا خاتمہ کردے گا۔ بحمداللہ جمہوریہ اسلامی ایران میں یہ فکر اور نقطۂ نظر پروان چڑھ رہا ہے اور اس کا نفاذ شروع ہو چکا ہے۔ ایران کے ذمہ داران حکومت شدید ترین اقتصادی محاصرے اور آمدنی میں کمی کے باوجود معاشرے سے فقر و غربت کا خاتمہ کرنے کے سلسلے میں بھرپور کوشش و جستجو کر رہے ہیں۔ ہماری پوری ملت، حکومت اور ذمہ داران مملکت کی تمام تر یہی آرزو اور تمنا ہے کہ ہمارے معاشرے سے فقر و تنگدستی کا نام و نشان مٹ جائے اور ہمارے ملک کے تمام غیور و صابر عوام اپنی مادی و معنوی ہر دو زندگی میں رفاہ و فلاح حاصل کرلیں۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ ہماری یا ہمارے ملک کے ذمہ داروں کی سیاست غریبوں اور محروموں کے دفاع سے رخ موڑ کر سرمایہ داروں کی حمایت پر کمربستہ نظر آئے یا امیروں اور مالداروں کو زیادہ مورد عنایت و اعتبار قرار دیا جانے لگے۔ پناہ بخدا کیونکہ یہ بات تمام انبیاء و مرسلین، امیرالمومنین نیز دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت و روش کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی علماء کا پاک و پاکیزہ دامن اس سے قطعی منزہ ہے اور تاابد اس کو پاک و منزہ رہنا چاہئے اور یہ چیز ہمارے علمائے ملک اور انقلاب کے افتخارات و برکات میں سے ہے کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کی حمایت کے لئے اٹھے ہیں اور کمزور و محروم عوام کے حقوق کا دفاع کرنے والے نعروں کو زندگی عطا کر دی ہے چونکہ محرومیت کے خاتمہ کے لئے کوشش کرنا ہمارا شیوہ بن چکا ہے اسی لئے استعماری طاقتیں اس سلسلہ میں ہم کو سکون و آرام سے رہنے دینا نہیں چاہتیں انھوں نے ہمارے ملک کی حکومت اور فعال شخصیتوں کو کمزور و ناتواں بنانے کے لئے اپنے محاصرہ کا حلقہ تنگ سے تنگ تر کر دیا ہے۔

اس عوامی و تاریخی جدوجہد کو روکنے کے لئے ہزاروں سیاسی و اقتصادی سازشیں رچ کر ان لوگوں نے اپنے کینہ و حسد اور وحشت و تشدد کا بھرپور ثبوت پیش کر دیا ہے اور یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ہماری ملت کے شہادت طلبی اور ایثار دوستی پر مبنی بلند و بالا حوصلوں کو دیکھ کر استعماری طاقتیں

خوف و بیم کی کیفیت سے دوچار ہیں بالکل اسی طرح محتاجوں اور بے کسوں کے دفاع اور حمایت کی طرف اسلامی اقتصاد کا رجحان، ان کی راتوں کی نیندیں حرام کئے ہوئے ہے اور یہ ایک مسلّم کی بات ہے کہ ہمارا ملک جیسے جیسے غربت کا خاتمہ کرنے اور محروموں کا دفاع کرنے کی طرف پیش قدمی کرے گا ہماری طرف سے تمام استعماریوں کی امیدیں منقطع ہوتی جائیں گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی ملتوں کی نظر میں اسلام کی عظمت بڑھتی چلی جائیگی لہٰذا علماء اسلام کو اس بنیادی حقیقت کی طرف پورے طور سے متوجہ رہنا چاہئے اپنے اس تاریخی افتخار اور محرومی کی زندگی بسر کرنے والوں کی اس ہزار سالہ پناہ گاہ کو محفوظ رکھیں اور تمام ذمہ داران حکومت اور عوام کو سمجھائیں کہ ہمیں انقلاب کے تئیں محروموں اور مظلوموں کے دلوں میں پایا جانے والا رجحان اور خالص محبت نیز ان کی طرف سے اسلام کی بے دریغ حمایت کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے ہمیں اس کا مثبت جواب دینا چاہئے یقیناً یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کا چپہ چپہ اس انقلاب میں سہیم و شریک رہا ہے اور سبھی اس کو ایک وظیفۂ الٰہی سمجھ کر صرف اور صرف خدا کے لئے میدان میں اترے ہیں اور جب مقصد خدا ہے تو ہرگز اپنی بلند و بالا الٰہی آرزوؤں کو مادی مسائل کے ساتھ آلودہ نہیں کریں گے وہ کبھی کبھی مادی وسائل کی کمی سے گھبرا کر میدان نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ جو خدا کے لئے اپنی جان اور مال فدا کرتا ہے دنیا کی آسائش یا پیٹ کی فکر میں اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹاتا پھر بھی ہمارا اور تمام متعلقہ افراد کا فریضہ ہے کہ وہ عوام کی خدمت پر کمربستہ رہیں ان کی خوشی اور غم میں، ان کی راحت اور مشکلوں میں برابر کے شریک رہیں کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عبادت محروموں اور مظلوموں کی خدمت سے بالاتر ہو۔

غرباء اپنا امتحان دے چکے ہیں ـــــ سچ بتائیے جب ہمارے معاشرے کے مفلوک الحال، غریبی کی زندگی بسر کرنے والے نچلے طبقوں سے متعلق افراد، احکام اسلامی کی پیروی کرتے ہوئے ہر طرح کا امتحان اور قید و بند کی منزلیں برداشت کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ اپنے عزیزوں، جوانوں اور زندگی کی تمام بہاروں کو قربان کردیا ہے تمام میدانوں میں موجود رہے ہیں اور انشاء اللہ موجود رہیں گے تو ہم کیوں راہ خدا میں اپنے سر و جان کی بازی لگا دینے والے تاریخ انسانیت کے ان شجاع و بہادر خدا کے خالص بندوں کی خدمت پر فخر نہ کریں؟ ہم پھر کہے دیتے ہیں کہ جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے والوں کو محل نشینوں پر فوقیت و برتری حاصل ہے، ان کا ایک ایک بال ان تمام محل نشینوں اور ان کے محلوں سے بہتر ہے۔ اس منزل میں محروموں اور مظلوموں کے حامی و مددگار علماء اور حکومت کے ذمہ داروں سے

تذکرے کے طور پر مجھے ایک آخری بات اور کہنی ہے اور میں سختی کے ساتھ اس کی تاکید بھی کرتا ہوں، وہ اسلام کے متعہد علماء کا پورے زہد و ورع کے ساتھ سادہ زندگی بسر کرنا ہے اور میں نہایت ہی تواضع کے ساتھ ایک بوڑھے باپ کی حیثیت سے اپنے تمام عزیز روحانی فرزندوں سے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج جب کہ خداوند عالم نے ہر طرح سے علماء کو اپنی منت و عنایت سے نواز رکھا ہے اور ایک بڑے ملک کا نظام اور رسالت انبیاء کی تبلیغ ان کے حوالے کر دی ہے تو اپنی روحانی زندگی اور روش سے خارج نہ ہوں دنیا کی زرق برق اور تجملات کی زندگی جو روحانیت کی شان کے بھی منافی ہے اور نظام جمہوری اسلامی کے اعتبار کو بھی ٹھیس پہنچاتی ہے اپنے قریب نہ پھٹکنے دیں ہر وقت اس بات سے خبردار رہیں کہ دنیا و آخرت میں روحانیت کے لئے اس سے بڑی کوئی دوسری آفت اور خطرہ نہیں ہو سکتا کہ وہ عیش و راحت اور دنیا طلبی کی طرف میل پڑیں۔ الحمد للہ اگرچہ متعہد و صالح علماء اسلام اپنے زہد و ورع کو ورع ثابت کر چکے ہیں پھر بھی وہ لوگ جو اسلام و علماء کی دشمنی کی قسم کھائے بیٹھے ہیں ممکن ہے اس کے بعد نور و ھدایت کی مشعل بلند کرنے والے نورانی چہروں کو داغدار بنانے کے لئے اقدامات کریں اور کسی معمولی ترین شئے کو بہانہ بنا کر ان کے اعتبار کو گزند پہونچائیں کہ انشاء اللہ اس میں وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

اور اب ایران کے محترم زائرین، جنھوں نے حق تو یہ ہے کہ گذشتہ برسوں میں حج کے دوران اپنی شخصیت اور اپنے سیاسی و اجتماعی شعور کا بہترین مظاہرہ کیا ہے اور جمہوریہ اسلامی ایران کے اعتبار اور آبرو کی حفاظت کی ہے انشاء اللہ اس سال بھی پوری توجہ کے ساتھ حج کے اعمال و واجبات کی ادائگی، مکہ معظمہ و مدینۂ منورہ کی عظیم نعمت سے شرفیابی، خانۂ خدا، مرقد پیغمبر اکرمؐ اور بقیع کی زیارت نیز جوار تربت معصومۂ عالم فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا و ائمہ معصومین علیہم السلام میں حاضری کے علاوہ مکمل اتحاد و ہم آہنگی کے ساتھ جلوس برائت میں صف در صف دشمن شکن نعرے لگاتے ہوئے منظم انداز سے شرکت کریں گے اور اس عبادی و سیاسی مقدس اجتماع سے جو دراصل تمام مسلمانوں اور جمہوریہ اسلامی ایران کے اقتدار کی نشان دہی کرتے ہیں ان سے بھرپور طور پر بہرہ مند ہوں گے اور تمام مراسم حج خصوصاً جلوس برائت کے دوران مختلف ملکوں سے آنے والے عوام نیز سعودی حکومت کے کارندوں کے ساتھ تعمیری، اخلاقی اور صحیح و سالم برتاؤ کریں بلکہ ان لوگوں کو ان اجتماعات میں شرکت کی ضرورت سے آگاہ بھی کر دیں گے اور ہر طرح کی انفرادی روش، نیز خودسرانہ اقدامات سے پرہیز کریں گے کہ

خدانخواستہ کہیں کوئی بات اس عظیم اجتماع کی ہتک کا باعث نہ ہوجائے۔ انشاءاللہ ایرانی زائرین ہر طرح کی مقابلہ آرائی جنگ و جدل اور ایک دوسرے کی اہانت سے قطعی احتراز کریں گے۔ اگرچہ زائرین محترم اپنی عقل و آگہی سے کام لیکر ہر طرح کی سازشیں اور چالیں ناکام بنادیتے ہیں پھر بھی ہوسکتا ہے بعض افراد حج کے ان عظیم و پرشکوہ اجتماعات کو منتشر کردینے اور انقلاب کے چہرے کو بدنما ظاہر کرنے کی غرض سے کوئی خودسرانہ اقدام کر بیٹھیں۔ ویسے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ سعودی حکومت یا ان کے کارندے جنھیں خانہ خدا اور حرم رسول اکرمؐ کے زائرین کی میزبانی کا دعویٰ ہے کفر و شرک کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کے شوکت و اقتدار کے مظاہروں اور عالم اسلام کو سربلندی عطا کرنے والی ملت ایران کا یہ عملی و سیاسی اقدام ناگوار خاطر ہوگا اور وہ اس راہ میں حائل ہوں گے۔ ایرانی زائرین کو حج کے تمام ترمرحلوں میں اپنی ذمہ داری پر پوری توجہ رکھنی چاہیئے۔ ان کے ہر عمل اور ہر اقدام پر انقلاب کے دوست اور دشمن ایک کی بڑی گہری نظر رہتی ہے ایک طرف دشمنان انقلاب اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی معمولی ترین بہانہ بھی ان کو ہاتھ آجائے تو اسے بنیاد بناکر ایرانی عوام کے تقدس اور ان کے الٰہی اعتبار کو ضرر پہونچائیں دوسری طرف انقلاب کے دوستوں اور طرفداروں میں اس ملت کی خصوصیات اور سیرت و کردار سے زیادہ سے زیادہ آشنائی پیدا کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے جس نے خداوند عالم کی مدد کے سہارے اپنا شہرہ دنیا کے کونے کونے میں پھیلادیا ہے اور حج اسلامی ملتوں کے درمیان تعلقات و آشنائی پیدا کرنے کے لئے بہترین وعدہ گاہ ہے جہاں دنیا بھر کے مسلمان اپنے دینی و اسلامی بھائیوں اور بہنوں سے متعارف ہوتے ہیں اور اس گھر میں جو حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف پر چلنے والے پورے اسلامی معاشرہ کا مرکز نظر ہے ایک ساتھ اکٹھا ہوتے ہیں اور پھر ہر طرح کے ذاتی تشخصات قومی تعصبات نسلی و نژادی مناظرات اور رنگ و زبان کے امتیازات مٹا کر اپنے اصلی اور پہلے گھر کی جانب پلٹ کر آتے ہیں اور اسلام کے اخلاق کریمانہ کی مراعات کرتے ہوئے لڑائی، جھگڑے اور زینت و آرائش سے اجتناب کرتے ہوئے ہیں نیز دنیا کے سامنے اسلام کے پاکیزہ بھائی چارگی کے اصول پر امت محمدی کے درمیان پروان چڑھنے والے اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ایرانی زائرین محترم، دنیا کے دوسرے خطوں سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں سے ملتے وقت جمہوریۂ اسلامی ایران کو حاصل ہوتے والی سیاسی و معنوی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کریں گے وہ مختلف عنوان سے اسلامی ملتوں پر مسلط مشکلات اور گرفتاریوں سے واقف ہونے کے بعد مختلف پہلوؤں سے اس انقلاب کو حاصل ہونے والی عظمتوں میں خداوند عالم کی جانب سے اس ملت پر خصوصی عنایت اور امام زمانہ ارواحنالہ الفدا کی نظر توجہ کو بہتر طریقہ سے

سمجھ سکیں گے اور ان کی نظر میں اس انقلاب کی برکتوں کی قدر و منزلت اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی اور اس وقت ملک کی خدمت میں منہمک ذمہ داران حکومت کی کوشش و جستجو اور دن رات کی محنت کا انھیں صحیح طور پر اندازہ ہوگا۔ نیز اس کے زیر اثر دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والی ملتوں اور جوانوں میں پیدا ہونے والی بیداری و تحول جس نے ان کو عظمت و ہیبت عفت و حیا، شرافت و آزادی اور جہاد و پامردی کی جنت کی راہ دکھائی ہے اس کے لئے خدا کا شکر ادا کریں گے۔

پروردگارا! یہ عظیم نعمتیں ہم سے اور ہماری امت سے سلب نہ فرما، خداوندا! ہم کو اپنی بے انتہا برکتوں سے مزید آشنائی عطا فرما، پروردگارا! ہماری عبادت، ہمارے خلوص اور اپنے مقابلہ میں ہماری ذلت و عاجزی کی توفیق میں اضافہ فرما، پروردگارا! ہم کو صبر و توکل، استقامت و رضا اور تیری عنایتوں کے حاصل کرنے کی توفیق کرامت فرما، پروردگارا! ہماری مدد فرما کہ ہم اپنی امت کے خالص بندوں کی خدمت کرتے رہیں حتیٰ کہ اس راہ میں اپنی اور اپنے فرزندوں کی جانیں قربان کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔

زائرین محترم! ایسا نہ ہو کہ اپنے انقلاب کی عظمت و اہمیت کا احساس کر کے دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ لوگ غرور میں مبتلا ہو جائیں اور خدانخواستہ دیگر مسلمانوں کے اعمال و رفتار کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مکہ معظمہ میں محبان خدا کی انس و محبت اور اپنائیت و قربت سے محروم ہو جائیں دراصل اپنے دینی بھائیوں اور کمزور و محروم مسلمانوں کے سامنے تواضع کا اظہار خود پروردگار کی ایک بڑی نعمت ہے آپ لوگ اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنا نہ بھولیں، خانۂ خدا اور قبر پیغمبر اسلام کے جوار میں پہونچ کر خوش آئند مستقبل کے لئے مسلمانوں سے دوستی و محبت کے عہد و پیمان مزید مستحکم کیجئے۔ انقلاب اور لطف الٰہی کے واقعات بیان کیجئے میری طرف سے اور تمام ملت ایران کی طرف سے تمام مسلمانوں کو اطمینان دلا دیجئے کہ جمہوری اسلامی ایران ملت اسلام کی پشتپناہی کے لئے ہمہ وقت آمادہ ہے، ظلم و زیادتی کے خلاف جہاں جہاں بھی مسلمان برسر پیکار ہیں ہر محاذ پر ملت ایران ساتھ دینے کو تیار ہے آپ کے ماضی، حال اور مستقبل کے حقوق کا دفاع کرنے کے لئے ہم آج بھی تیار ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی تیار رہیں گے۔ آپ ان لوگوں کو بتا دیجئے کہ جمہوریہ اسلامی ایران کا اقتدار و اعتبار دراصل پوری ملت اسلام کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے اور ایران کی غیور و بہادر قوم کا دفاع کرنا درحقیقت تمام ستم دیدہ ملتوں کا دفاع ہے اور خدا کی مدد شامل حال رہی تو انشاء اللہ ہم تمام ممالک اسلامی میں ظلم و زیادتی کرنے والے ستمگروں کے ہاتھ قطع کئے بغیر خاموش نہ بیٹھیں گے اور اپنے انقلاب کی لہر جو درحقیقت سچے انقلاب اور حقیقی اسلام اور احکام محمدیؐ کی ترویج و اشاعت ہے تمام اسلامی ملکوں تک پہنچا کر اسلامی دنیا سے عالمی استعماریت کے مظالم کا

نام و نشان مٹا دیں گے اور ان شاء اللہ خداوند بزرگ کی مدد سے منجی بشریت، مصلح کل، امامت مطلقہ کے حقیقی وارث امام زمانہ ارواحنا لہ الفداء کے ظہور کے لئے راہ ہموار کر دیں گے۔

اس منزل میں چند نکتوں کی طرف تمام حجاج کرام کو متوجہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، یاد رکھئے! کہ خانہ کعبہ اور مشاہد مشرفہ انبیاء علیہم السلام اور پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی جدوجہد سے متعلق بڑے ہی عظیم حوادث کے آئینہ دار ہیں یہ وہ سرزمین ہے جہاں جگہ جگہ جلالت مآب انبیا اور حامل وحی جبرئیل امین نازل ہوتے رہے ہیں یہاں ان صعوبتوں اور مصیبتوں کی یاد تازہ ہوتی ہے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور نجات بشریت کے لئے کئی برسوں تک پیغمبر اسلام صلعم کو برداشت کرنی پڑی ہیں۔ ان مشاہد مشرفہ اور اماکن متعدسہ پر پہنچ کر جب انسان پیغمبر اسلامؐ کی بعثت اور اس وقت کے روح فرسا حالات کا چشم تصور سے مشاہدہ کرتا ہے تو اس تحریک کے مفادات اور الٰہی پیغام کی حفاظت کے تئیں ذمہ داریوں کا احساس بڑھ جاتا ہے کہ واقعاً پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کس غربت و تنہائی کے عالم میں حق کے پھیلانے اور باطل کے فنا کرنے کے سلسلہ میں صبر و استقامت کا حق ادا کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کس طرح بغیر کسی خوف و ہراس کے ہر طرح کی تہمتیں، اہانتیں اور ابولہبوں و ابوجہلوں و ابو سفیانوں کی تیغ زبان کے ناقابل تحمل زخم سہے ہیں، سخت ترین اقتصادی محاصرے اور سماجی بائیکاٹ کے باوجود شعب ابوطالب میں رہ کر اپنی راہ پر گامزن رہے ہیں اور کبھی بھی ظلم کے آگے سر تسلیم خم نہیں ہونے دیا پھر ہجرتوں اور مشقتوں کو برداشت کرتے ہوئے حق کی دعوت اور پیغامات الٰہی کی تبلیغ نیز یکے بعد دیگرے ہونے والی مسلسل جنگوں میں اپنی قلت کے باوجود ڈٹے رہے، ایسی ہزاروں ہمت شکن سازشوں اور رخنہ اندازیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے راہ رشد و ہدایت میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے رہے جو مکہ و مدینہ کے ذروں اور کوہساروں، بیابانوں اور ریگزاروں، کوچوں اور بازاروں کے سینوں پر آج بھی نقش ہیں اگر ان کو زبان و سخن کی طاقت مل جائے اور "فاستقم کما امرت" کے مستحق ہونے کے راز و رموز سے پردہ اٹھاتے تو اللہ کے محترم گھر کی زیارت کو آنے والے حاجیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں کی ہدایت و رہبری اور ان کو بہشت کے قابل بنانے کے سلسلہ میں کیا کیا صعوبتیں برداشت کی ہیں اور رسولؐ کی تاسی کا دعویٰ کرنے والوں کی ذمہ داریاں کتنی سنگین ہیں۔

اگرچہ شہداء کا نذرانہ پیش کرنے والی ملت ایران نے جنگ و مبارزہ کے اس طویل دور میں نیز حوادث انقلاب کے دوران بے انتہا مظلومیت کے عالم میں ناقابل بیان سختیاں اور درد و رنج برداشت کئے ہیں، راہِ خدا

میں اپنے گرانقدر عزیزوں اور جوانوں کی قربانیاں پیش کی ہیں پھر بھی یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس مظلومیت اور سختی کے دور سے ہمارے رہنماؤں کو گزرنا پڑا ہے وہ ہماری مشکلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ حجاج محترم ہماری غیور ملت تلاش و جستجو میں سرگرم ذمہ داران حکومت کی اور شہیدوں، جانبازوں، اسیروں اور مفقودوں کے اہل خاندان کی طرف سے پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی ذریت طاہرہ علیہم السلام کی بارگاہ میں مخلصانہ سلام پہنچاتے ہوئے نہایت ہی عاجزی کے ساتھ ان سچے پیروؤں پر مزید نظر رحمت کی درخواست کریں اور درگاہ رب العزت میں التماس کریں کہ وہ عالمی کفر سے لڑی جانے والی اس جنگ میں ہماری ملت کو بہترین کامیابی سے ہمکنار کرے۔ حجاج کرام کو چاہئے کہ وہ اس مناسب ترین موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام مسلمانوں کے سروں سے ان کی پریشانیوں کے دور ہونے کی دعائیں کریں۔

پروردگارا! اگر کوئی نہ جانتا ہو، تیری ذات تو خوب واقف ہے کہ ہم نے تیرے دین کے پرچم کو سربلند رکھنے کے لئے انقلاب برپا کیا ہے، ہم تیرے رسولؐ کی اطاعت و پیروی کرتے ہوئے عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے شرق و غرب کی خونخوار طاقتوں سے مقابلہ پر کمربستہ ہوئے ہیں اور اس راہ کو طے کرنے میں ایک لحظہ کے لئے بھی تامل نہیں کرتے۔ تو خوب جانتا ہے کہ اس سرزمین کے سپوتوں نے اپنی ماؤں اور باپوں کی معیت میں تیرے دین کی عزت کے لئے جام شہادت نوش کیا ہے اور اپنے شوق و امید سے مملو دل ہتھیلیوں پہ رکھ کر مسکراتے ہوئے تیرے لامتناہی جوار رحمت میں پرواز کر جاتے ہیں۔ پروردگارا! تو جانتا ہے کہ تیرے رسولؐ کی امت اس مملکت میں ہر طرح کی سازشوں سے دوچار ہے، داخلی و خارجی شیطانی ایجنٹ کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیتے اس ملت کے لئے روز بروز اقتصادی بندشوں اور پریشانیوں کا دامن تنگ سے تنگ تر کرتے رہتے ہیں۔ پروردگارا! تو جانتا ہے کہ ہماری ملت نے یہ مشکلات بہ رضا و رغبت مول لی ہیں اور سوائے تیری ذات کے کسی چیز کا بھی خوف ان کے دلوں میں نہیں پایا جاتا وہ ہر طرح کے شکنجے اور درد و کرب برداشت کر رہے ہیں، انھیں یقین ہے کہ اسے حاصل ہونے والی تمام کامیابیاں تیری ہی عنایتوں کا نتیجہ ہیں لہٰذا اپنی عنایتیں مزید ہمارے شامل حال فرما، ہماری ملت کے دلوں کو اپنی طرف سے مزید نصرت و مدد کی امیدوں کا مرکز بنا دے محاذ جنگ پر سرفروشی کا مظاہرہ کرنے والے مجاہدوں کو اپنے مخفی ہاتھ اور غیبی امداد کے ذریعہ غلبہ اور کامیابی عطا فرما، ہمارے اندر سختیوں اور مشکلوں کو برداشت کرنے کی قوت اور صبر و استقامت کی طاقت میں اضافہ فرما۔ پروردگارا! کامیابی شکست ہر دو صورت میں اپنی رضا و خوشنودی کی نعمتوں سے سرفراز

فرما، وہ لوگ جنہوں نے تیرے دین کے لئے شہید و مجروح اور اسیر و مفقود پیش کئے ہیں اور تیری رضا و لقاء کے عشق میں اپنے عزیزوں کی جدائی برداشت کی ہے ان کے دلوں کو مسرور و شادمان فرما۔ ہم سب کو اپنی بندگی کی راہ میں کیفیت عشق و درد سے آشنائی عطا کر اور ہمارے شہیدوں کو خدا و رسول ؐ اور ائمہ ھدیٰ کی ولایت و محبت کے صاف و شفاف کوثر سے سیراب کر اور ہمارے انقلاب کو مصلح کل امام زمانہ عج کے انقلاب سے متصل فرما۔ انک ولی النعم۔

روح اللہ الموسوی الخمینی

اوّل ذی الحجۃ الحرام سنہ ۱۴۰۷ھ قمری

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

پاسبان حرم یا غاصبان حرم؟

مکۂ مکرمہ میں سعودی پولیس کے ہاتھوں حجاج بیت اللہ الحرام کے قتل عام کے سلسلہ میں ایرانی حجاج کے سرپرست اور امام کے نمائندہ جناب حجۃ الاسلام مہدی کروبی کے پیام تعزیت کے جواب میں بیت اللہ الحرام کے زائرین کو خطاب کرتے ہوئے امام خمینی مدظلہ العالی کا پیغام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقاً حسناً و ان اللہ لھو خیر الرازقین۔

جناب حجۃ الاسلام حاج شیخ مہدی کروبی دامت افاضاتہ!

جوار کعبۂ مظلوم اور خون آلود حرم سے آپ کا اور جان سے زیادہ عزیز زائرین کرام کا پیغام نظر نواز ہوا۔ میرا اور تمام ملت ایران کا پرخلوص سلام ان تمام عزیزوں تک پہنچا دیجئے جو خانہ کعبہ کی آغوش اور حرم امن خدا میں شیطان بزرگ ظالم امریکا کے ایجنٹوں کے حملوں ظلم و ستم اور سنگدلیوں کا شکار ہوئے ہیں۔

اس عظیم حادثہ نے نہ صرف ملت ایران کے احساسات کو مجروح کیا ہے بلکہ پوری دنیا کے آزادی پسند افراد اور تمام اسلامی قوموں کے دلوں کو زخمی و غمزدہ بنا دیا ہے لیکن ہمارے عزیز ملک کی عظیم اور بہادر ملت کے لئے جو انقلاب کے کئی سال کے تجربہ سے آشنا ہے اور جس نے حسینی عزاداروں پر حملے، قرآن کریم اور مسجدوں کو نذر آتش کرنے والے خائن و ظالم شاہ اور "صدام" جیسے امریکی ایجنٹوں کے چہروں سے مکر و فریب کی نقاب نوچ کر پھینک دی، یہ حادثات غیر متوقعہ و حیرت انگیز نہیں ہیں بلکہ ایک بار پھر امریکا اور اسرائیل کا کثیف اور خون آلود ہاتھ سعودی عرب کے ریاکار اور حرمین شریفین کے خائن حکام کی آستینوں سے برآمد ہوا تاکہ عہد کے بہترین مسلمانوں اور خدا کے عزیز ترین مہمانوں کے دلوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے اور "سقایت حاج" و "عمارت مسجد الحرام" کے

دعویدار مکہ مکرمہ کی سڑکوں اور گلی کوچوں کو مسلمانوں کے خون سے سیراب کریں۔

ہم اگرچہ امت حضرت محمدؐ اور ابراہیم حنیفؑ کے نقش قدم پر چلنے والوں اور قرآن کریم کے احکام پر عمل کرنے والے مسلمانوں کے اس بہیمانہ قتل عام پر شدید متاثر اور غمزدہ ہیں لیکن اس کے باوجود خدائے بزرگ و برتر کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمارے دشمنوں اور ہماری اسلامی سیاست کے مخالفوں کو کم عقل، بے خرد اور بے وقوف قرار دیا ہے۔

کیونکہ یہ خود اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ ان کی بے مقصد اور ظالمانہ حرکتیں ہی ہمارے انقلاب کی قوت و تبلیغ اور ہماری قوم کی مظلومیت کے اظہار کا سبب بنی ہیں۔ انہوں نے اپنے ظلم کے مرحلے میں ہمارے مکتب فکر، انقلاب اور ہمارے ملک کی ارتقاء کے اس قدر اسباب فراہم کئے ہیں کہ اگر ہم حقیقی اسلام اور امریکی اسلام کے درمیان امتیازی خط کو مشخص کرنے، نیز حکومت عدل اور اسلام کے دعویداران دین فروشوں کی حکومت کے فرق کو واضح کرنے کے لئے سیکڑوں تبلیغاتی وسائل کا سہارا لیتے اور ہزاروں مبلغوں اور علماء کو دنیا کے گوشے گوشے میں روانہ کرتے پھر بھی اس فرق کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ واضح نہ کر پاتے اور اگر ہم امریکہ کے ان مہروں کے کریہہ چہروں کو بے نقاب کرنے کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے کہ اسلام کشی اور مخالفت قرآن کے سلسلہ میں محمد رضا خان، صدام عفلقی اور عربستان کے رجعت پسند سعودی حکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب امریکہ کے ایجنٹ ہیں اور مسجدوں اور محرابوں کے ڈھانے اور حق کے لئے اٹھائی جانے والی آوازوں کا گلا گھونٹنے پر مامور کئے گئے ہیں تو ہم اتنی خوبصورتی سے ثابت نہ کر پاتے۔ اسی طرح اگر ہم عالم اسلام کے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتے کہ کعبہ کے موجودہ کلید دار اللہ کے سپاہیوں اور اس کے مہمانوں کی میزبانی کی لیاقت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ سوائے امریکہ اور اسرائیل کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اپنے ملک کے منافع ان کی جھولیوں میں ڈالنے کے علاوہ کوئی اور کام ہی نہیں کر سکتے، تو اس قدر خوبی سے نہ کہہ پاتے اور اگر ہم دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتے کہ یہ حکومت آل سعود، یہ پست و ذلیل اور خدا سے غافل وہابی، ایسے خنجر کے مانند ہیں جو ہمیشہ پشت سے مسلمانوں کے دلوں میں اتارا گیا ہے اور جس کا ثبوت سعودی حاکمیت کے ناتجربہ کار و بے ارادہ آلہ کاروں نے اس قساوت اور بے رحمی میں فراہم بھی کر دیا ہے، تو ہم اس میں کامیاب نہ ہو پاتے۔ حق تو یہ ہے کہ ان ابوسفیان اور ابولہب کے وارثوں اور یزید کے نقش قدم پر چلنے والوں نے اس اقدام کے ذریعہ اپنے بزرگوں کو سرخرو کیا ہے۔

الحمد للہ کہ جمہوری اسلامی ایران نے خانہ خدا کے زائروں میں مختلف قوموں، ملتوں، نژادوں اور مختلف ممالک، یہاں تک کہ خود سعودی عرب میں ایسے بے شمار طرفدار، سچے اور وفادار دوست پیدا کئے ہیں

جو ہماری خفانیت کے سچے گواہ اور "خادم الحرمین" کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے اور حادثہ کے تلخ حقائق کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے میں ہمارے بہترین مددگار ثابت ہوں گے اور کیا خوب جبکہ ابھی ہمارے عزیزوں کے لاشے زمین پر پڑے ہوئے ہیں، عراق کے صدام، اردن کے حسین اور مراکش کے حسن آل سعود کے ان بہیمانہ مظالم پر ان سے ہمبستگی کا اعلان کر رہے ہیں۔

گویا سعودی عرب نے کوئی بہت بڑا مورچہ فتح کر لیا ہے، سیکڑوں نہتے اور بے گناہ مسلمانوں کو مشین گنوں اور آٹومیٹک رائفلوں کے دہانوں سے برسنے والی گولیوں کی باڑھ پر رکھنے اور ان کی پاکیزہ لاشوں کو قدموں تلے روندنے کی شکل میں گویا بہت بڑی فوجی کامیابی حاصل کر لی ہے جبھی یہ لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ساری دنیا اس ظلم پر سوگ میں بیٹھی ہے اور قلب پیغمبر اسلام شکستہ ہے اور کون نہیں جانتا کہ خانۂ حق کے محترم زائروں کو ظلم کا شکار بنانا، ان کو سنگینوں کی نوک پر رکھنا ان پر فوج کشی کرنا ان کے قتل عام کی پہلے سے منصوبہ بندی کرنا، بے گناہ عورتوں، مردوں، جانبازوں اور شہیدوں کی ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے قتل عام کے لئے مختلف بے بنیاد اور لچر بہانے تراشنے کا نتیجہ، امریکا کی بیخ کنی اور اس کے غلاموں کی ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

یقیناً امریکہ اور سعودی عرب نے، حرم خدا میں مسلمانوں کے نہتے آنے، مومنین کے قرآنی احکام کا احترام کرنے اور خانۂ خدا کے نزدیک جنگ وجدال سے پرہیز کرنے کا بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے اور پہلے سے فراہم کردہ جنگی وسائل اور روباہ صفت مکارانہ چالوں کے ذریعہ پہلے سے ہی مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ، اچانک نہتے مردوں اور عورتوں کی صفوں پر حملہ کیا ہے۔

سعودی حکومت مطمئن رہے کہ امریکا نے اس کے دامن پر رسوائی و ذلت کا ایسا داغ لگا دیا ہے جو صبح قیامت تک زمزم و کوثر کے پانی سے بھی صاف نہیں ہو سکتا اور وہ خون جو ہماری ملت کے قلب سے سرزمین حجاز پر جاری ہوا ہے صحیح معنی میں اسلام کی صاف ستھری اور پاکیزہ سیاست کے تشنگانوں کے لئے ہدایت کے ایسے زمزم کی مانند ہے جس سے آئندہ کی نسلیں اور قومیں سیراب ہوتی رہیں گی اور اہل ستم اس میں غرق و ہلاک ہوتے رہیں گے۔ ہم نے ان تمام مظالم کو امریکا کے کھاتے میں ڈال رکھا ہے۔ انشاءاللہ خدا کی مدد سے کسی مناسب موقع پر ان ظالموں کا حساب بھی چکتا کریں گے اور فرزندان ابراہیم کا انتقام عہد حاضر کے ان نمرودوں، شیطانوں اور قارونوں سے لیکر رہیں گے۔

میں پھر تاکید کرتا ہوں کہ یہ مظالم و قربانیاں ہماری "نہ شرقی نہ غربی" سیاست، استقلال و آزادی اور اسلام خواہی کی گراں مایہ قیمتیں ہیں۔ یہاں موقع سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن کریم کی ایک آیت کی جانب اشارہ کرتا ہوں جس میں خداوند عالم فرماتا ہے۔

"اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن آمن باللہ والیوم الآخر وجاھد فی سبیل اللہ لا یستوون عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔"

لگتا ہے جیسے یہ آیت کریمہ اسی عہد میں نازل ہوئی ہے۔ اور گویا اس طول تاریخ میں آل سعود، اس کے ہم نشینوں اور عہد حاضر میں ایران کی عظیم مجاہد قوم و حجاج بیت اللہ اور ہر عہد میں ان کے مثل افراد کے لئے ہی نازل ہوئی ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: (اے کور دلو) کیا تم نے حاجیوں کو پانی پہنچانے، مسجد الحرام کی آبادی اور تعمیر کی قدر و قیمت کو ان لوگوں کی قدر و قیمت کے برابر سمجھ رکھا ہے جو خدا و روز جزا پر ایمان لائے اور راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک تو یہ لوگ برابر نہیں ہیں اور نہ اللہ ظالموں کی ہدایت کرتا ہے۔

کیا سعودیوں اور ان کے جیسے ظالم حاکموں نے تاریخ میں حج کے موقعوں پر پانی کا انتظام کرنے اور مسجد الحرام کی زرق برق تعمیرات کو خداوند عالم اور روز جزاء پر ایمان لانے والوں، اپنا اور اپنے نوجوان مجاہدوں کا خون خدا کی راہ میں نثار کرنے والوں اور حرم خدا و حریم اسلام سے دشمنان اسلام کو دفع کرنے والوں سے موازنہ و مقابلہ نہیں کیا اور عصر حاضر کے سعودیوں نے اپنے آپ کو ان سے افضل قرار دیتے ہوئے مسلمانوں پر اپنی برتری اور افتخار کا اظہار نہیں کیا؟ اور کیا راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کے ساتھ ہر وہ سلوک روا نہیں رکھا جس سے عالمی درندہ امریکا اور اپنے دوسرے آقاؤں کو خوش کر سکیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے اس آیت کریمہ میں اللہ اور روز جزاء پر ایمان کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی اور انسانی تمام اقدار کے درمیان، دشمنان خدا اور دشمنان انسانیت سے، اللہ کی راہ میں جہاد کو منتخب فرمایا ہے اور اس انتخاب کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اسلام میں جہاد سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اور کیا خداوند عالم "واللہ لا یھدی القوم الظالمین" کے ذریعہ یہ نہیں فرمانا چاہتا کہ وہ عصر حاضر اور ہر عہد کے سعودیوں کو ایسا ظالم و ستمگار سمجھتا ہے جو قابل ہدایت

نہیں ہیں اور نہ خدا ان کی ہدایت ہی کرنے والا ہے۔

آل سعود کی جانب سے خدا، خلق خدا، رسول خدا اور حضرت خاتم المرسلین کی باعظمت امت پر توڑے جانے والے مظالم جو اس نے کعبۂ محترم، حرم امن الٰہی اور اپنے محبوب و معبود و اسلام کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے والے مجاہد زائروں پر روا رکھے ہیں کیا ان کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

حکم خدا کے مطابق مکہ میں مشرکین سے برائت و بیزاری کا اعلان و اظہار کرنے والے ان مجاہد زائروں کا جرم اس کے علاوہ اور کیا تھا کہ وہ اس برائت کے ذریعہ آل سعود، عصر حاضر کے سعودیوں نیز شاہ حسین، شاہ حسن و مبارک نامبارک و صدام عفلقی کے خداؤں سے اظہار بیزاری کر رہے تھے؟

اس بہیمانہ ظلم وستم کے سلسلہ میں جسکی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، سکوت اختیار کرنے کو کیا اس ظلم پر راضی رہنے اور ظالموں و ستمگاروں کے ساتھ اس ظلم وستم میں شرکت کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ کہا جا سکتا ہے؟

آل سعود بہر حال خانۂ کعبہ اور حج کے انتظام کی لیاقت و صلاحیت نہیں رکھتے لہٰذا علماء اسلام، مسلمانوں اور روشن فکر حضرات کو اس کی چارہ جوئی پر غور کرنا ہوگا۔

ایران کے شریف و مظلوم زائروں نے اس سال مشرکین سے بیزاری اور انقلاب کا پیغام اپنے خون کی سرخی کے ساتھ ساری دنیا اور امت اسلام تک پہنچا یا ہے اور خداوند عالم کی بارگاہ میں اپنے عظیم شہداء کی قربانیاں پیش کر کے کعبۂ مقدس کی لاشرقی و لاغربی سیاست کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اور ایران کی عظیم قوم و ملت نے بھی اپنی روز افزوں عظمت کے ساتھ شہداء کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں مظاہرے میں شریک ہو کر عالم کفر اور خصوصیت سے آل سعود سے اپنی بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے اپنے انقلابی و الٰہی فریضہ کو ادا کیا ہے لہٰذا میں اس موقع پر اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے ان بھائیوں اور بہنوں کے انبوہ کثیر کی خدمت میں شکریہ ادا کروں۔

اب یہ دوسرے ممالک کے حاجیوں اور زائروں خصوصاً علماء و روشن فکر افراد کا فریضہ ہے کہ ہماری مظلومیت کا پیغام ساری دنیا تک پہنچائیں۔ ایران کے محترم زائرین انشاء اللہ پوری استقامت و صبر و سکون کے ساتھ اپنے بقیہ اعمال بجالائیں اور محکم و استوار قدموں، پرسکون دل، اپنی مظلومیت پر رضایت سے سرشار قلب، تبسم برلب، تلوار پر خون کی فتح کی خوشی کے ساتھ خانۂ خدا کی آغوش میں

شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہونے کا جشن منائیں ۔ اور جو افراد مدینۂ منورہ کی زیارت سے مشرف ہونے والے ہیں وہ راہ کعبہ کے ان شہیدوں اور حرم امن خدا کے ان مجروحوں کا سلام رسول خداؐ اور ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی خدمت میں پیش کریں اور اس عظیم کامیابی کی مبارکباد ان بزرگواروں کی خدمات میں تقدیم کریں ۔ پورے استحکام واطمینان کے ساتھ اپنے مقاصد طے کریں اور امریکہ وسعودی حکومت نے انھیں جن مشکلات ومصائب میں مبتلا کر رکھا ہے اسے خدا اور پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے دفاع قرار دیں ۔

خداوند عالم نے اپنے گھر کے نزدیک اس ملت بزرگ کی ہاجرہ صفت واسماعیل گونہ ہدیوں اور قربانیوں کو جو شرف قبولیت بخشا ہے اس پر اس کے شکر گزار رہیں کہ انشاء اللہ خداوند عالم ہمارے ان بزرگ شہیدوں کو صدر اسلام کے شہداء کے ساتھ محشور فرمائے اور ان کے اعزا واقارب کو صبر واجر عطا فرمائے زخمی اور مجروح افراد کو شفا عنایت کرے، ظالموں کے شر کو انہی کی طرف واپس پلٹا دے اور انھیں سخت ترین عقاب وعذاب میں مبتلا کرے ۔

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں جب کہ تمام دنیائے کفر وشرک متحد ہو کر پورے عزم کے ساتھ امت اسلام کو شکست دینے کا فیصلہ کئے بیٹھی ہے اور ہم پر چاروں طرف سے ہر طرح کی ضرب لگا رہی ہے ۔ خداوند عالم اپنے محکم حصار اور اپنے لطف وکرم کے پرچم کے سائے میں ہماری حفاظت فرمائے ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روح اللہ الموسوی الخمینی

۷، ذی الحجۃ الحرام ۱۴۰۷ھ

جناب ہاشمی رفسنجانی

ترجمہ: جناب ممتاز علی

المیہ مکّہ، کیوں اور کیسے؟

بیت اللہ الحرام میں، سعودی پولیس کے ہاتھوں حجاج کرام کے بہیمانہ قتل عام کے خلاف ایک عظیم مظاہرہ سے خطاب کرتے ہوئے، اسلامی پارلیمنٹ کے اسپیکر حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ہاشمی رفسنجانی نے اس المیہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا، اور اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی - ہم ذیل میں آپ کی اس فکر انگیز تقریر کے خلاصہ کو قارئین کی نذر کر رہے ہیں

— ادارہ —

میں نے بہت غور و فکر کیا کہ تاریخ میں اس حادثہ اور اس جرم کا کوئی نمونہ مل جائے مگر مجھے کوئی ایک مثال نہیں مل سکی۔ بلا شک و شبہ میں اس حادثہ کو تاریخ بشریت کا منفرد حادثہ شمار کرتا ہوں اور اس دردناک حادثہ کا منصوبہ اور پلان بنانے والوں کو جو مغربی استکبار، خاص کر امریکہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا نیز اس پر عمل درآمد کرنے والوں کو جو خبیث آل سعود ہیں، قساوت قلبی اور جرم کے اعتبار سے تاریخ بشریت کے ستمرانوں اور مجرموں میں سرفہرست سمجھتا ہوں۔

جناب ہاشمی رفسنجانی نے اس حادثہ کو اور اس جرم کی اس داستان کو اپنی تمام خصوصیتوں کے اعتبار سے تاریخ انسانی کا بے نظیر حادثہ قرار دیتے ہوئے ساری دنیا کے مسلمانوں کو اس جرم کی گہرائی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو اس سلسلہ میں ضروری اقدام کرنے کی تاکید فرمائی۔

جناب ہاشمی رفسنجانی نے اس المیہ کی کیفیات اور اس کا تقابل دوسرے ان حادثات سے کرتے ہوئے جو تاریخ بشریت میں رونما ہوئے ہیں فرمایا کہ "اگر ساری دنیا کے خبر رساں سامراجی ادارے اس حادثہ کو چھپانا چاہیں تو بھی اس واقعہ کو نہیں چھپا سکتے اس لئے کہ یہ حادثہ لاکھوں انسانوں کی نگاہوں کے سامنے پیش آیا ہے۔

جس وقت انسان اس المیہ کا موازنہ تاریخ کے بڑے بڑے مجرموں جیسے ہٹلر منگولوں اور آج کی دنیا کے نشہ زور حاکموں کے جرائم سے کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ خود امریکہ کے وہ دوسرے جرائم بھی جو اس نے ویتنام اور دوسرے ملکوں میں کئے ہیں یہ المیہ اپنی خصوصیتوں کی بنا پر ان سب سے آگے ہے۔

اس حادثہ میں جن لوگوں پر یلغار کی گئی وہ زائرین بیت اللہ اور جائے امن خانۂ خدا میں مہمان خدا تھے۔ اور جو لوگ اس حادثہ کو جنم دینے والے تھے وہ اپنے کو خادم الحرمین کہتے ہیں اور خود کو میزبان، مہمانِ خدا سمجھتے ہیں۔ لاکھوں انسان مکہ کی چلچلاتی دھوپ تپتی زمین، گرم سڑکوں پر شدید گرمی میں اس علاقہ میں موجود تھے جہاں اس کثیر مجمع کو رنج و تعب میں مبتلا کرنے کے لئے سارے اسباب موجود تھے۔

یہ مجمع جن باتوں کا اظہار کر رہا تھا اس کا سعودی حکام سے بحیثیت حاکم مملکت کوئی تعلق نہ تھا البتہ ان کے آقاؤں کے خلاف باتیں کہی جا رہی تھیں جو خبریں سعودیوں کی طرف سے پھیلائی جا رہی ہیں وہ غلط ہیں وہاں امریکہ مردہ باد، اسرائیل مردہ باد استکبار مردہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ خود سعودی حکمرانوں کے خلاف ایک نعرہ بھی نہیں لگایا گیا حتیٰ کہ رجعت پسند مردہ باد کے نعرے بھی نہیں لگائے جا رہے تھے کہ سعودی حکمران اسے کو جس کا نمونہ سمجھتے ہیں۔

گفتگو استکبار، اسرائیل صیہونزم اور جنگ بھڑکانے والوں کی تھی نعرے اسلامی اور انسانی تقاضوں کے مطابق لگائے جا رہے تھے۔ مجمع ہر طرح کے حملہ و اسلحوں سے عاری تھا منتظمین مکہ اور زائرین کی پذیرائی کرنیوالے حکام آل سعود سے بھی کوئی چھیڑ خانی نہیں کر رہا تھا۔

مجمع کی اکثریت ایرانی، افریقی، ایشیائی مستضعف افراد خاص کر مسلم ملکوں کے دیندار مظلوموں اور مہاجر افغانیوں پر مشتمل تھی۔ مظاہرہ ہر قسم کی تلخی، تندخوئی سے پاک پُرسکون اور پُرامن مظاہرہ تھا۔ مظاہرہ سے پہلے امام خمینی کا جاویدانہ پیغام پڑھا گیا تھا جس میں آپ نے زائرین بیت اللہ کو نظم و ضبط برقرار رکھنے کی اپیل کی تھی اور فرمایا تھا کہ کوئی بھی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے شرانگیزوں کو فتنہ انگیزی کا موقع ملے . . . . مظاہرہ نمائندہ امام خمینی مدظلہ، آقائے کروبی کی تقریر سے شروع ہوا تھا جس میں انہوں نے لوگوں کو نظم و ضبط سنبھالے رکھنے اور پُرسکون رہنے کی دعوت دی تھی۔ رفتہ رفتہ مجمع بیت اللہ کی طرف نماز مغرب کے لئے بڑھ رہا تھا۔

آپ اس منظر کو پیش نظر رکھیں اور غور کریں کہ سعودی حکام نے اس مجمع پر آخر کیوں حملہ کیا، وہ اس مجمع سے کیا چاہتے تھے اور آخر انہوں نے اس پُرسکون مجمع سے قساوت قلبی کا کیوں سلوک کیا ؟؟؟

پارلیمنٹ کے اسپیکر جناب ہاشمی رفسنجانی نے اس بات کی تاکید کرتے ہوئے کہ ہم اس جرم کو جنم دینے والے

حکام آل سعود کے ہاتھوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں فرمایا:" یہ حادثہ اس علاقہ میں سوپر طاقت امریکہ کی خواہش اور حکم کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔"

انہوں نے کہا۔۔۔" سعودیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ حادثہ ان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیگا اور تاریخ میں انہیں اس طرح رسوا کرے گا کہ وہ اپنا سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہ جائیں گے اور امریکہ کے لئے تو کسی وقت بھی اپنے نوکروں اور ایجنٹوں کو بدل دینا معمولی بات ہے۔"

ہاشمی رفسنجانی نے اس کے بعد اس بات کی تاکید کرتے ہوئے کہ اس جُرم کی تہ میں جس کا بھی ہاتھ ہو لیکن سعودی حکام اس حادثہ کے جنم داتا کے عنوان سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے، کہا کہ "ہم تو انتقام کے لئے اصلی جڑ کا انتخاب کریں گے، لیکن سعودی جرائم سے بھی کسی طرح چشم پوشی نہیں کرسکتے۔"

پارلیمنٹ کے اسپیکر نے اپنی تقریر میں جمعہ کے خون چکاں حادثہ کا تقابل "۱۷ شہریور" کے خون آلود جمعہ سے کرتے ہوئے فرمایا" دربار پہلوی کی سنگدلی اور فہد کی انسان کشی میں بڑا گہرا ربط ہے۔ لیکن فرق کے ساتھ، یہاں لوگ شاہ اور دربار پہلوی سے براہ راست "ٹکرانے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ شاہ اگر لوگوں سے مدمقابل ہوا تھا تو وہ اس لئے کہ لوگ بھی اس سے مدمقابل تھے اس نے اگرچہ جرائم کئے، سنگدلی کا مظاہرہ کیا اور لوگوں نے اس کے مدمقابل جو کچھ کیا وہ لوگوں کا حق تھا لیکن پھر بھی دونوں حادثوں میں بڑا فرق ہے۔

وہاں مکہ میں جن لوگوں پر حملہ ہوا وہ ان کے مہمان تھے، خدا کے مہمان تھے وہاں لوگ جو نعرے لگا رہے تھے خود سعودی بھی ایسے نعرے لگاتے ہیں چاہے ان کے نعرے جھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔

اسرائیل کے خلاف نعرے لگانا، صیہونزم مردہ باد کہنا، لوگوں کو اتحاد کی دعوت دینا، یہ وہ نعرے ہیں جن کو سعودی بھی بظاہر لگاتے ہیں۔

یہاں شاہ نے جو جرائم انجام دیئے وہ اس لئے کہ لوگ براہ راست" شاہ مردہ باد" کے نعرے لگاتے تھے لوگوں نے شاہ سے مقابلہ کیا ایک طرف حق تھا دوسری طرف باطل، اس نے بھی سنگدلی کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیدیا۔ لیکن سعودیوں کے پاس لوگوں کے ساتھ یہ ناروا سلوک کرنے کی کیا دلیل ہے؟ سعودیوں نے آخر کیوں لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ چھتوں سے لوگوں کے سروں پر بڑے بڑے پتھر، اینٹیں اور دوسری وزنی چیزیں گرائیں، آخر یہ دونوں واقعے کیوں کر قابل تقابل ہوسکتے ہیں؟

اس کے بعد آپ نے سعودی جرائم کا فلسطین کے " دیر یاسین " کے حادثہ سے موازنہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

دیر یاسین کے حادثہ اور اس حادثہ میں بڑا فرق ہے ۔ دیر یاسین میں اسرائیلیوں نے جب فلسطین کے ایک بڑے حصہ کو غصب کیا تو وہ اس لئے تھا کہ فلسطینیوں کو وہ ڈرانا چاہتے تھے ۔ لوگوں کو ایک دیہات میں انہوں نے جمع کیا، عورتوں کو مردوں سے الگ کرلیا اور ایک میدان میں ان عورتوں کے سامنے مردوں کو نذر آتش کر دیا پھر عورتوں کو گاڑیوں پر سوار کر کے شہروں شہروں پھرایا۔ آپ توجہ فرمائیں کہ وہاں ایک طرف آدم کش اسرائیلی حکام ہیں اور دوسری طرف فلسطینی عوام ہیں جو دہشت گردوں سے لڑ رہے ہیں وہ مسلہ جنگ کا تھا ___ تمام پابندیوں اور سنسر کے باوجود دیر یاسین کے حادثہ نے اس وقت دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ایک مدت تک اسرائیل کے حامیوں کو پشیمان رکھا تھا لیکن کیا مکہ کا خون آلود حادثہ بھی ایسا ہی ہے ؟

مکہ میں جو لوگ تھے وہ خدا کے مہمان تھے سعودی حکام کے مہمان تھے ان لوگوں کے مہمان تھے جو اپنے کو ریاکارانہ طور پر خادم الحرمین کے نام سے پکارتے ہیں ۔ یہاں وہ لوگ تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری سعودی حکام نے اپنے سر لی تھی، وہ لوگ تھے جن کے رفاہ عام کیلئے سعودی حکام نے ان سے پیسے وصول کئے تھے ، ایسے لوگ تھے جو نجات فلسطین ، نجات ممالک عرب ، نجات افغانستان اور نجات اسلام کیلئے بظاہر حکام سعودی اور عرب رجعت پسندوں کے جھوٹے اور ریاکارانہ نعروں کے ساتھ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا یہ حادثہ دیر یاسین کے حادثہ سے تقابل کے لائق ہے ؟

یہاں کی سنگدلی کے مظاہر کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے سے بنائے ہوئے پلان کے تحت صرف زائرین کے وسیع پیمانہ پر قتل کے لئے کیا گیا تھا ۔

اس کے بعد پارلیمنٹ کے اسپیکر جناب ہاشمی رفسنجانی نے اپنی تقریر میں اس دردناک سعودی جرائم کی حاضرین کے سامنے منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا :۔ " آنے جانے کے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے تاکہ کوئی کسی راستے سے اس مہلکہ سے جان بچا کر بھاگ نہ سکے ۔

جب حملہ شروع ہوا تو صرف دو طرف سے بھاگ کر جان بچانے کے امکانات تھے ۔ سعودی جلاد ان ہی اطراف سے آدھمکے ۔ ایک تو مجمع کے آگے سے جہاں زیادہ تر عورتیں اور جنگ کے مجروحین و معذور افراد پہیلے والی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرے پیچھے جہاں منتظلین اور ذمہ دار افراد موجود تھے ۔

حملہ شروع ہوا اور بلند و بالا عمارتوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے جہاں سعودی درندے پہلے سے کمین گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے جہاں تک اور جیسے ممکن تھا نہتے مجمع پر حملہ کرتے رہے ۔ سعودی کارندوں نے پتھروں ، لکڑیوں ، بوتلوں حتی کہ مشین گنوں سے لوگوں پر حملہ کیا ، یہانتک کہ آنسو گیس سے مجمع کو منتشر کرنے سے بجائے دم گھونٹ دینے والی زہریلی گیسوں

کا بھی استعمال کیا گیا جس کا استعمال ایسے مجمع میں کسی بھی طرح اور کسی بھی جگہ نہیں ہوا ہے۔

انہوں نے دونوں طرف سے راستہ بند کر رکھا تھا تاکہ لوگ منتشر نہ ہونے پائیں۔ ایسے میں دم گھونٹ دینے والی گیس کا استعمال صرف اس لئے کیا گیا تاکہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ خوف پھیلایا جاسکے اور کچھ لوگ اس گیس سے متاثر ہو کر دم توڑ دیں۔ جو مجروحین زمین پر گر پڑے تھے یا جو افراد لوگوں کے پیروں سے کچل گئے تھے جب ذرا میدان صاف ہوا اور امدادی دستہ ان کی مدد کے لئے پہنچا تو انہیں راستہ دینے کے بجائے ان کی گاڑیوں کو بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور اس دستہ کو بھی ان ہی کے پہلو میں زمین پر ڈھیر کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ بعض قریبی گھروں میں رہنے والے ساکنین مکہ کا رحم جب جوش زن ہوا اور انہوں نے اپنے گھروں کے دروازے پناہ لینے کے لئے کھول دئے تو ظالموں نے ان گھروں پر حملہ کیا اور دم گھونٹ دینے والی گیس گھروں کے اندر بھی پھینکی گئی نیز گھروں کے اندر گولی بھی چلائی گئی۔

ہاشمی رفسنجانی نے زائرین کے قتل عام کو پہلے سے بنے ہوئے پلان کا نتیجہ بتاتے ہوئے کہا " ایسا حادثہ بھلا کہاں دیکھنے کو ملے گا؟ سعودی عرب اور امریکہ جو اس حادثہ کے منصوبہ ساز ہیں آخر ان کا مقصد کیا تھا جو اس سنگدلی پر اتر آئے؟

ایک بات جو سب کے لئے واضح ہے وہ خلیج فارس میں امریکہ کی شکست فاش، امریکہ کے ایک وفد کی چوروں کی طرح ایران آنے کی ناقابل جبران رسوائی، "اسٹارک" کشتی والے واقعہ میں امریکہ کی ذلت اور امریکہ کی فوجی تاریخ میں بدترین رسوائی س وقت ہوئی جب اس کا محافظ جہاز کویت کے تیل بردار جہازوں کی محافظت کر رہا تھا اور کویت کے جہاز امریکی پرچم لگا کر جا رہے تھے جس کا آخری پردہ اس وقت فاش ہوا جب امریکہ کا فوجی ہیلی کاپٹر نہایت ذلت کے ساتھ خلیج فارس میں گر گیا۔

امریکہ نے اس رسوائی کی جھینپ مٹانے کیلئے جمہوری اسلامی اور انقلاب اسلامی کے خلاف اس المیہ کو جنم دیا۔ ایسا المیہ جو خلیج فارس کے دامن میں ظہور پذیر ہوا۔

امریکہ اس المیہ کو وجود میں لانے کا محتاج تھا۔ لیکن جو منصوبہ امریکیوں نے تیار کیا ہے اس سے ان کو کوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے اب ہم کو بھی دیکھنا ہے کہ ان کے سروں پر کیا مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا کہ "امریکہ اس حادثہ کا محتاج تھا اور اس کے لئے سعودی عرب مکہ مکرمہ اور خانہ کعبہ کے علاوہ کوئی جگہ ان کے واسطے زیادہ مناسب بھی نہیں تھی۔ وہاں ڈیڑھ لاکھ نہتے زائرین جو اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتے تھے نیز ایرانی مسلمانوں کے حامی ہزاروں نہتے مسلمان سعودی جلادوں اور درندوں کے قبضہ میں تھے۔ ایسی جگہ پر ایسے حادثہ کا پلان بخوبی بنایا جاسکتا ہے۔ ان کے لئے جگہ اور وقت بھی مناسب تھا۔ ایرانیوں اور دنیا کے دوسرے انقلابی مسلمانوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ سعودیوں کے دست ظلم وا تھے وہ جو چاہتے کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس کے نتیجہ پر غور نہیں کیا اور یہ سوچ لیا کہ بس آج ہی کا دن ہے۔

دُنیا کے عمومی افکار کا رُخ امریکہ کو ہونے والی رسوائی سے موڑنے کے لئے ـــ امریکہ نے طبس، لبنان، خلیج فارس اور بین الاقوامی میدان سیاست میں انقلاب اسلامی ایران کے ہاتھوں جو چوٹ کھائی ہے اس زخم کو مندمل کرتے اور اسلامی انقلاب کو نقصان پہنچانے کے لئے ـــ رہبر انقلاب کے اس عظیم اور تاریخ ساز پیغام کا عملی جواب دینے کے لئے جس نے استکباری اور رجعت پسند حکومتوں کی چولوں کو ہلا کر رکھدیا تھا یہ اس بات کے محتاج تھے کہ ایسے حادثہ کو جنم دیں لیکن اور دوسرے موقعوں کی طرح انہوں نے بڑا احمقانہ کام کیا اور بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے بعد جناب ہاشمی نے آل سعود اور وہابیوں کے جرائم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ "سعودیوں نے اپنی مختصر سی تاریخ میں اس طرح کی بڑی خونریزیاں کی ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے مکہ، مدینہ اور اطراف مکہ و مدینہ کے دیہاتوں، خیبر، مشرقی حجاز، کربلا اور نجف میں بڑے کشت وخون کئے ہیں۔ انہوں نے مراکز ثقافت کو تاراج کیا، کتب خانوں کو جلایا، تاریخی عمارتوں کو ڈھادیا، وہ گھر جو پیغمبرؐ کے زمانہ سے اسلامی اور ثقافتی آثار قدیمہ کے حامل تھے انہیں مسمار کر دیا۔

آپ نے فرمایا، سعودی حکام نے اپنی پوری زندگی میں اس بات کی کوشش کی ہے سنگدل وہابیوں نے جو نعرے اپنی فوج کو دیئے ہیں ان کی بنا پر وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں دنیا سے گذارش کروں گا کہ آج کے بعد سے انکی منحوس تاریخ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تحقیق ہونی چاہیئے اور یہ پتہ لگنا چاہیئے کہ یہ تاریخ کے کتنے منحوس عناصر ہیں۔

جناب ہاشمی رفسنجانی نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا "امریکیوں نے ان کو اس کام کے لئے بڑا مناسب سمجھا ان کے علاوہ اور کوئی دوسرا کبھی اس بات کے لئے تیار نہ ہوتا کہ مہمان خدا کو مکہ مکرمہ میں خانۂ خدا کے پاس اس طرح مظلومیت سے اپنے مجرمانہ حملوں کا نشانہ بنائے۔ ایسا حادثہ امریکہ جیسے متکبر کے بنائے ہوئے منصوبہ کے تحت فقط ان کے ہاتھوں ہو سکتا ہے جن کے پس پشت ایسی گھناؤنی اور سیاہ تاریخ موجود ہو۔

جناب ہاشمی نے کہا کہ "وہابیوں اور آل سعود کا یہ پہلا اور آخری جرم نہیں ہے لیکن یقیناً ایک بہت بڑا جرم ضرور ہے اب دنیا سوچ رہی ہے، دنیائے اسلام، آزاد دنیا، دنیا کے روشن فکر، دنیا کے صاحبان قلم، دنیا کے مراکز خبر، عالمی کانفرنسیں، حقوق بشر کے مراکز، اقوام متحدہ اور دوسرے وہ افراد کیا کرتے ہیں جو عوام کو فریب دینے کے لئے ایسے ہی نام رکھ کر لوگوں کے سروں پر مسلط ہیں اور دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ انکا رویہ کیا ہوتا ہے ؟

کل شب سے سعودی عرب نے جو پروپگنڈا شروع کیا ہے اس سے ان کا ارادہ ظاہر ہے۔ دنیا کی خبر رساں ایجنسیاں اس واقعہ کا رُخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ چونکہ ایرانی زائرین نے تمام حجاج کا راستہ بند کر رکھا تھا اس لئے سعودی فوج حفاظت کے لئے آگے بڑھی اور اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا جارہا ہے کہ اسمیں غیر ایرانی زائرین بھی

ے گئے ہیں۔۔۔۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ایرانیوں نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مجروح اور شہید نے والوں میں اکثریت عورتوں کی ہے۔ چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں اپنا دفاع نہیں کر سکتی تھیں۔ شہید اور مجروح نے والے وہ افراد جو ہاتھوں اور پیروں سے معذور بھی تھے جو پہیئے والی کرسیوں پر جلوس میں مجمع کے آگے تھے۔

سعودی عرب بڑی بے شرمی، جھوٹ اور خباثت سے یہ اعلان کر رہا ہے کہ اس کے بھی چند افراد مارے گئے ہیں اور ابھی پروپیگنڈا بھی کیا جا رہا ہے اور دنیا میں شاہ حسین، شاہ حسن اور صدام جیسے بھی ہیں جو ان کے جرائم کی تائید کر رہے ہیں اور اس سنگدلی کے مظاہرہ پر مبارکباد بھی دے رہے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کی خبر رساں ایجنسیاں کیا کرتی ہیں۔۔۔۔ مکہ میں ہزاروں افراد نے، حاجیوں نے حادثہ کو اپنی ھوں سے دیکھا ہے۔ یہ سب اپنے شہروں کو لوٹ کر جائیں گے انہوں نے حادثہ کا ایک ایک منظر دیکھا ہے انہوں نے ایرانی بیوں کے مجروح اور کچلے ہوئے جسم زمین پر پڑے دیکھے ہیں۔ انہوں نے شہید ہونے والوں کی چادر، اسکارف اور لباس کو رکوں پر بکھرا دیکھا ہے انہوں نے خون آلود سڑکیں دیکھی ہیں۔ انہوں نے کئی بار گولیوں کے چلنے کی آوازیں سنی ہیں۔ اس کے بعد سعودی بزدل یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہم نے گولی نہیں چلائی ہے۔ صحیح ہے، جب کسی انسان کی سنگدلی اور بے رحمی سے گزر جاتی ہے تو وہ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔۔۔۔ ہمیں اب دیکھنا ہے کہ دنیا اس مسئلہ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب سعودی بینک پوری دنیا میں اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دنیا کے قلم فروش مزدوروں کو سامنے اپنے خزانہ کا دہانہ کھول دیں گے تاکہ اس تصویر کی اصلاح ہو جائے۔

آج تمام خبر رساں اور پروپیگنڈا ایجنسیوں کے امتحان کا دن ہے، دنیا کے خبر نگاروں، اخباروں، رسالوں، پیگنڈا ایجنسیوں، مقرروں اور صاحبان سخن کے لئے امتحانی مرحلہ ہے اب دیکھنا ہے کہ تم لوگ اس کثیف اور مکروہ چہرہ میک اپ کرتے ہو یا اس میں سے کچھ حقائق اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ لوگوں تک پہونچاتے ہو۔

جناب رفسنجانی نے کہا۔ ممکن ہے تم لوگ جو ان سے خراج لیتے ہو اس کی بنا پر اس جرم کے چھپانے کی کوشش و لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہزاروں افراد نے اس واقعہ کو دیکھا ہے وہ جب لوٹ کر جائیں گے تو خاموش نہیں بیٹھیں ، سوائے ان لوگوں کے جن کو امریکہ خرید لے یا ڈرا دھمکا کر ان کی زبانیں بند کر دے۔ یہ ماجرا ایسا نہیں ہے جس پر پردہ لا جا سکے۔ اس سال کے بعد عید قربان سے پہلے مکہ کا خون آلود جمعہ ہر سال کے لئے مکہ میں مظاہرہ کرنے والے شہداء کی یادگار عنوان سے سعودی حکام کے خلاف ایک آزاد اور عالمی آواز بن جائے گا۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ سامراج کے خبر رساں مراکز نے اس واقعہ کو چھپانے کا پلان بنا لیا ہے لیکن پھر بھی ہمیں اطمینان

ہے کہ پوری دنیا اور اسلامی مراکز میں شریف انسانوں نے ان تمام خبروں کو سنا ہے اور ان کے کان ہماری آواز پر لگے ہوئے ہیں وہ حقیقت کو ہماری زبان سے سُنیں گے وہ تاریخ میں اس حقیقت کا چہرہ مسخ نہیں ہونے دیں گے۔

اس کے بعد جناب رفسنجانی نے سعودیوں کی طرف سے ایرانی وفد کو واپس کر دیئے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "سعودی حکام بے شرمی یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ انہوں نے ایران سے جانے والے وفد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر آپ لوگ مکہ جانا چاہتے ہیں تو پہلے سعودی حکام سے ملاقات کریں ــــ یہ ہمیں کس سے ملاقات کرنے کے لئے کہتے ہیں ہم ان لوگوں سے کیا باتیں کریں جنہوں نے اتنے فرزندان اسلام کو قتل کر دیا ــــ ہم تو حادثہ میں مجروح ہو جانے والوں کی مزاج پُرسی کے لئے آئے تھے لیکن یہ بے حیا اس ڈر سے کہ کہیں یہ واپس جا کر حقائق کو واضح نہ کر دیں ــ کہتے ہیں کہ ہم اجازت نہیں دیں گے اور پھر ہمارا وفد واپس لوٹ آتا ہے ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

حج کرنے کے لئے جانیوالوں کے عزیزوں کے غمزدہ، بپھرے ہوئے مجمع نے کل کویت اور سعودی سفارتخانہ پر جو مظاہرہ کیا اس کو سامراجی خبر رساں ایجنسیوں نے شور و غل مچانے کا بہانہ بنا لیا ہے اور دنیا کے سامنے چیخ رہے ہیں کہ ایرانی سفارت خانہ کی عمارت میں در آئے۔ کاغذوں کو پھاڑ ڈالا اور فلاں شخص کو اغوا کر لیا۔ درآں حالیکہ اگر ہمارے منتظمین نے ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچا نہ لیا ہوتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے سر پر کیا آفت آتی۔ لیکن اب ان کو محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا ہے ـ ـ ـ ـ اس وقت خبر رساں ایجنسیوں نے اس کو بنیادی مسئلہ بنا ڈالا ہے ـ

انہوں نے ایسی خبر رساں ایجنسیوں کے بارے میں فرمایا کہ "یہ بے غیرت تو تم ان سیکڑوں افراد کے بارے میں زبان نہیں کھولتے جو مکہ میں اپنے خون میں آلودہ اور مجروح ہیں۔ علاج و معالجہ کے بجائے انہیں پیروں تلے روندا اور کچلا گیا ہے۔ لیکن ذرا سی بات پر اتنا شور مچاتے ہو، اے دنیا کے گستاخ، بے رحم اور مردہ ضمیر انسانو! اب وہ زمانہ گزر گیا جب دنیا کے تاریخی حقائق کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس وقت ساری دنیا اس بات کی منتظر ہے کہ اقوام متحدہ انسانی حقوق کے تمام نہاد محافظ، اسلامی کانفرنس اور ساری دنیا کے علماء اسلام کیا کرتے ہیں؟ یہ چند ایرانیوں، افغانیوں اور لبنانیوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ خانۂ خدا کی ہتک حرمت کا مسئلہ ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک مچھر کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کیا جا سکتا جو سلوک تم نے کیا ہے۔ یہاں کسی کے بدن پر ایک خراش بھی نہیں لگائی جا سکتی۔ لوگ یہ دیکھنے کے منتظر ہیں کہ اسلام کے مقدس مقامات کی جو بے حرمتی ہوئی ہے۔ یہ ہتک حرمت جو تاریخ میں ظہور پذیر ہوئی تاریخ کعبہ میں پہلی بار اس سنگدل سے ہزاروں کیمروں کے سامنے جو المیہ رونما ہوا، اس کا کیا جواب دیا جاتا ہے۔ خبر رساں ایجنسیاں، سیاسی جماعتیں، کانفرنسیں، خلیج فارس کی منحوس تعاون کمیٹی، اگر یہ اپنا دامن اس جرم میں شریک ہونے سے

نہ چھڑائیں تو سبھوں کو جواب دینا پڑے گا۔

چند بادشاہ فہد کی تشویق کے لئے آگے بڑھے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انہوں نے مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ اس مسئلہ کو تو مسلمان حل کریں گے کعبہ صرف سعودیوں اور عربوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق سارے مسلمانوں سے ہے۔ جناب رفسنجانی نے امام خمینی اور عوام کو تعزیت پیش کرتے ہوئے اس حادثہ میں کام آجانے والے شہیدوں کے وارثوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

" آپ نے بہت بڑا افتخار حاصل کیا۔ آپ کی ماں بہنیں، آپ کے بچے اور آپ کے شوہر خانۂ خدا کی زیارت کے لئے گئے تھے وہ گھر کی زیارت سے پرے صاحب خانہ کی زیارت کے لئے جا چکے ہیں۔ گرم اور تپتی ہوئی سڑکوں سے پرواز کرکے انبیاء و اولیاء کے جوار اور شہداء کی صف میں خدا کی ضیافت میں فردوس بریں کو سدھار چکے ہیں۔ یہ خدا کے عظیم اور چہیتے مہمان ہیں ان کا خون جہاں کہیں بھی ہو مستقبل کی تاریخ کو الہام عطا کرتا رہے گا۔ یہ واقعی حاجی ہیں، ان کا حج اور ان کی زیارت قبول ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے خون کا بدلہ خدا ضرور دے گا۔

آپ نے فرمایا۔ میرے خدا، تو جانتا ہے کہ امریکیوں اور سعودیوں نے تیرے گھر کی حرمت کو پامال کیا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ جس ظلم سے تو نے منع کیا تھا یہ اسی کے مرتکب ہوئے ہیں، تو جانتا ہے کہ وہ مسلمان جو امریکہ مردہ باد اور اسرائیل مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے وہ اس گرم ہوا میں تیری رضا کے علاوہ اور کسی چیز کے طالب نہ تھے! خدایا تو نے جو وعدہ فرمایا ہے اس کے مطابق ان شہیدوں، ان عزیزوں اور ان ستم رسیدہ مسلمانوں کے خون کا بدلہ لینا۔

اس کے بعد جناب ہاشمی رفسنجانی نے فرمایا کہ ہم سپاہ خدا کی حیثیت سے اور اس عنوان سے کہ ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو احکام خدا کا اجرا کرنے والے ہیں۔۔۔ امریکہ اور سعودیہ دونوں سے اس خون کا انتقام لینا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں ان شہیدوں کے خون کا انتقام یہ نہیں ہے کہ ان کے بھی اتنے ہی آدمی قتل کئے جائیں بلکہ ان کا انتقام یہ ہے کہ سعودی حکام کو اس علاقہ سے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ ان کے مقدس خون کا انتقام یہ ہے کہ مکہ، مدینہ اور بقیع مقدس کو ان کے شریر اور خبیث وجود سے پاک کر دیا جائے۔ ان شہیدوں کے خون کا انتقام یہ ہے کہ دنیائے اسلام کی عظیم دولت اور جزیرۂ عرب اور خلیج فارس کے جنوب میں زیر خاک خوابیدہ ہے اس دولت کو ان عالمی استعماری طاقتوں کے ہاتھ سے لے کر اسلام اور مسلمانوں پر خرچ کیا جائے اور اسلامی دنیا کی عظمت کے لئے اس دولت کو کفر، الحاد اور استکبار سے نبرد آزمائی کے لئے صرف کیا جائے۔

اگر دنیا والے کم ہمت ہیں تو سپاہیان و رہروان راہ خدا کو چاہیئے کہ صبر و متانت سے کام لے کر ایک منظم

پروگرام کے تحت اسلام کے مقدس مقصد تک پہونچ جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو راستہ ان شریروں اور خبیثوں نے کھول رکھا ہے اسی اندھے راستے پر ان کو دھکا دے کر ہم انشاء اللہ انہیں یقینی موت اور پھر جہنم تک پہنچا دیں گے ۔

آخر میں آقائے ہاشمی رفسنجانی نے سارے ملک کے خدا دوست مسلمانوں اور سعودی حکام کے خلاف نکلنے والے جلوسوں میں شرکت کرنے والے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ غازیان اسلام نے سعودی حکام، صدام اور امریکہ کو جواب دینے کے لئے کامیاب حملے کر دیئے ہیں ۔

جناب سید احتشام عباس زیدی

خون کی ہولی!

اللہ اکبر کے نعرے اور گولیوں کی بوچھار، لاالہ الا اللہ کی صدائیں اور پتھروں کی بارشیں، اہل اسلام کو دعوت اتحاد اور دم گھونٹنے والی گیس کعبہ کی راہ میں جانوں کی بازیاں اور شرک کے فتوے جلوہ گاہ توحید پر شرک نفاق کے کالے سایے، ہابیل کی حق پسند اولاد کی لاشوں پر قابیل صفت شیاطین کی درندگی کا دہشت انگیز اقدام، ارض کعبہ خون سے رنگین ہو گئی۔ معذور اور مجروح افراد، عفت مآب خواتین اور منظم شکل میں رواں دواں مسلمانوں کے پرامن جلوس پر مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے گئے اور دیکھتے دیکھتے سرزمین مکہ ہزاروں بے گناہوں کے خون میں نہا گئی اور شاہراہ حرم دور تک لاشوں سے پٹ گئی آخران بے چاروں کا قصور کیا تھا جو پرچم لاالہ بلند کئے ہوئے زمانہ کے مشرکین سے برائت کا اعلان کر رہے تھے؟ کیا وہ مسلمان تھے جو گولیوں اور زہریلی گیسوں سے کلمہ لاالہ الا اللہ کا گلا گھونٹنا چاہتے تھے۔ یا یہ وہی شرک و نفاق کے تپلے تھے جو اسلام کی نقاب چہروں پر ڈال کر بزعم خود صدائے توحید کو ایک بار پھر صدا بہ صحرا بنا دینا چاہتے تھے؟

خدایا! کیا یہ وہی سرزمین مکہ نہیں ہے جہاں توحید و الوہیت کا سب سے عظیم پیامبر جب اس شہر کی راہوں، بازاروں، گلیوں اور کوچوں میں صدائے لاالہ بلند کرتا تھا تو اسے پتھروں سے مار مار کر زخمی کر دیا جاتا تھا کہ وہ خود اپنے خون میں نہا جاتا تھا؟ آج اسی نبی اعظمؐ کا کلمہ پڑھنے والے مسلمان اسکی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نہ صرف اپنے خون میں نہا گئے بلکہ جان آفرین سے بھی گذر گئے۔

سرزمین حرم پر ماہ ذی الحجہ الحرام کی ۶ تاریخ اور جمعہ کا دن تھا جب شام کے ۶ بجے دنیا کے مسلمانوں کے لبوں سے نکلنے والے اللہ اکبر، اللہ اکبر، یا ایھا المسلمون اتحدوا اتحدوا، الموت لامریکا، الموت لاسرائیل الموت لروسیہ کے فلک شگاف نعروں سے مکہ کی فضا مرتعش ہو رہی تھی، اور کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا آفاقی

آہنگ ایک بار پھر بیت اللہ کی فضا کو مسحور کئے دے رہا تھا عالم کے مسلمان "مشرکوں سے بیزاری" کے عنوان سے نکالے جانے والے ایک عظیم الشان جلوس میں انبوہ در انبوہ شریک ہو کر اللہ سے کئے ہوئے اپنے عہد و پیمان کی تجدید کر رہے تھے۔ یہ جلوس جسمیں لاکھوں مسلمان ملکی اور جغرافیائی حدود سے آزاد یک زبان ہو کر امت واحدہ کی شکل میں لا الہ الا اللہ کی آواز بلند کرتے ہوئے قبلۂ عالم یعنی مسجد الحرام کی جانب بڑھ رہے ہیں اللہ کے محترم مہینہ، اسکے محترم شہر مکہ اور محترم دن یعنی جمعہ، عصر کے وقت اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ یہ جلوس جسکا ہتھیار فقط جذبۂ ایمانی اور سپر فقط صبر و استقامت تھے، زمانہ کے مشرکین سے برائت کا کھلا اعلان کر رہا تھا۔ یہ جلوس صبر و سکون، شرافت و سادگی اور حلم و بردباری کے آئینہ میں اسلامی ڈسپلن کا لاجواب مرقع تھا اسمیں سب سے آگے عالم اسلام پر دنیائے استکبار کی جانب سے توڑے جانے والے مظالم کی زندہ مثالوں کی شکل میں ایران و افغانستان کے جنگ زدہ مجروح و معذور افراد کا کارواں تھا اس کے بعد مسلمان پردہ پوش خواتین کی ایک کثیر تعداد حرکت میں تھی اور اس کے بعد لاکھوں کی تعداد پر مبنی مسلمانوں کا وہ عظیم مجمع تھا، جو تمام عالم کے مسلمانوں کو کفر و نفاق کے خلاف اتحاد کی دعوت دے رہا تھا حکومت سعودی کی جانب سے معین کردہ راہوں کو طے کرتا ہوا یہ جلوس ابھی اپنے سفر کی آدھی منزلیں طے نہ کر کے پل حجون سے گزر کر مسجد جن کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ سب سے پہلے سعودی فوجی دستوں نے جلوس کی راہ میں گاڑیاں کھڑی کر کے اس کا راستہ مسدود کر دیا اور ڈنڈے ہلاتے ہوئے مجمع کی جانب بڑھے ساتھ ہی سڑک سے متصل چھ منزلہ کار پارکنگ کی عمارت سے خفیہ سادہ لباس میں ملبوس پولیس کی ایک بڑی تعداد نے جلوس پر بڑے بڑے پتھروں شیشوں اور لوہے کے ٹکڑوں اور گیس کیپسولوں کی بارش شروع کر دی۔ لاٹھی چارج، پتھروں، شیشوں اور لوہے کے ٹکڑوں کی بارش نے آن کی آن میں سیکڑوں افراد کو زخمی کر دیا۔ جنمیں اکثریت بے دست و پا معذور جوانوں اور عورتوں کی تھی یہ افتاد اچانک ہی شروع ہوئی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے شدت اختیار کر لی۔ یہ سب مغرب کی اذان سے صرف دس منٹ پہلے اور مسجد الحرام یعنی کعبہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر شروع ہوا ابھی مجمع اس سنگین صورت حال سے سنبھل نہ پایا تھا کہ سڑک کے اطراف کی عمارتوں اور بلند جگہوں پر خودکار مشین گنوں اور رائفلوں سے لیس مورچہ بند فوج کی ایک بڑی تعداد نے ایک دم نہتے جلوس پر گولیوں کی بوچھار کر دی مسجد جن کے امام کی آواز مسجد کے مائک پر بار بار سنائی دے رہی تھی "اقتلوا المجوس" "ان مجوسیوں کو قتل کر ڈالو"۔ اور

حیرت سے سوچتا رہ گیا کہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کی صدا پر اپنا خون بہانے والے یہ مسلمان مجوسی کیسے ہو گئے ؟

سڑک پر دور تک خون ہی خون پھیلا ہوا تھا اور سینکڑوں مقتول و مجروح افراد خاک و خون میں لوٹتے
رآ رہے تھے، مجمع میں پراگندگی اور پسپائی کے آثار رونما تھے حکم شریعت اور حرم خدا کے تقدس کے پیش نظر کسی
ح کی جوابی کاروائی سے گریز کرتے ہوئے باہوش جوان صرف دسترس میں آنے والے مجروحین و مقتولین کو اٹھا کر پیچھے لانے لگے
ئے مکہ پر شام کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور مسجدوں کے میناروں سے اللہ اکبر اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں
د ہونے لگی تھیں جو گولیوں کی مسلسل آوازوں میں گھٹ گھٹ کر ابھر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ سعودی مسجدوں سے
نے والی یہ اذانیں کس اللہ کی گواہی دے رہی ہیں یہی آوازیں گولیوں سے چھلنی سینوں سے بھی ابھر رہی تھیں جنھیں اللہ
ر اللہ کے گھر کا دشمن کہہ کر ان کا قتل عام کیا جا رہا تھا۔

"برائت المشرکین" کا یہ جلوس جسمیں ایرانی مسلمانوں کے ہمراہ خلیجی ممالک، پاکستانی، افغانی، ہندوستانی
یطینی، لبنانی، شامی، مصری، برطانوی اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اسکے علاوہ جلوس کے
رانے میں اور پل جو ن پر تماشائی حاجیوں کی کثیر تعداد بھی تھی جلوس پر برستے والی گولیوں اور پولیس کے ڈنڈوں کے شکار ایرانی
یلج کے علاوہ بہت سے دیگر ممالک کے افراد بھی ہوئے پل کے نیچے جلوس میں شریک مقتول و مجروح افراد کی تعداد میں
مسلسل اضافہ تو ہو تا ہی جا رہا تھا، ساتھ ہی فوجیوں نے تماشائیوں کو بھی بری طرح نشانہ بنایا میں نے خود اپنی آنکھوں سے
یکھا کہ کتنے ہی افراد گولیوں کا نشانہ بنکر یا پل پر ہی گر رہے تھے یا پل کے نیچے مجمع پر اور سڑک پر گرتے جا رہے تھے شام
ی گہرائی شب کی تاریکی میں بدلتی جا رہی تھی گولیوں کی بوچھار کا سلسلہ جاری تھا۔ مجمع تیزی سے پیچھے ہٹتا جا رہا تھا یا نعش
ن بنتا جا رہا تھا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ طے تھا کہ اگر جلوس مغرب کی اذان سے پہلے منزل مقصود تک نہ
نچ پایا تو راستہ میں جہاں بھی اذان ہو جائیگی جلوس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جائےگا اور اللہ کے بندے اپنے معبود کی
رگاہ میں سڑکوں پر ہی استادہ ہو کر نماز قائم کر دینگے لیکن نام نہاد مسلمان سعودی فوجیوں نے نہ صرف ان مسلمانوں
ر اللہ کی عبادت سے محروم کیا بلکہ سینکڑوں مسلمانوں کو ان کی زندگیوں سے بھی محروم کر دیا۔

مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن گولیوں کی بوچھار، پتھروں کی بارش اور پولیس کے لاٹھی
بارج کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ سعودی فوجیوں کی جانب سے برسائی جانے والی یہ گولیاں دو قسم کی تھیں ایک تو
سم میں سوراخ کرتی ہوئی گزر جاتی تھیں اور دوسری جسم کے کسی سخت حصہ پر پڑتے ہی پھٹ جاتی تھیں جس سے جسم

کا ایک بڑا حصہ اڑ جاتا تھا۔ گویا ان میرے ذاتی اندازہ کے مطابق پچاس سے پچپن منٹ تک چلتی رہیں جس کا میں عینی شاہد ہوں۔

یہ سب محشر خیزی ابھی تک جلوس کے اگلے حصہ پر تھی۔ نہتے مسلمان تیزی سے پیچھے ہٹنے کے علاوہ اور کیا کرتے کسی طرح کی جوابی کارروائی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ زمین حرم کے تقدس کا پاس انکو کسی بھی اقدام سے روک رہا تھا اسی بناء پر جلوس میں بار بار یہ آواز اٹھائی جا رہی تھی کہ اپنی طرف سے کوئی اقدام نہ کیا جائے مجمع کو تیزی سے پیچھے ہٹتے دیکھ کر فوجی دستوں نے انہیں پیچھے سے بھی گھیرنا شروع کر دیا اور مجمع پر لاٹھیوں کی مار اور کھولتے ہوئے پانی کی بوچھار سے جان بچانے کے لئے فرار کی یہ راہ بھی مسدود کر دی شب کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی اور سرزمین امن وامان پر اللہ کے بے گناہ بندوں کا قتل عام جاری تھا دونوں سمت کئی فرلانگ تک سڑک اور فٹ پاتھ اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کی آواز بلند کرنے والے بے گناہ مسلمان عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگین نظر آ رہے تھے سینکڑوں لاشیں بکھری پڑی تھیں اور ہزاروں زخمی جانکنی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رہے تھے اور سعودی فوج اور پولیس کے دلوں کی تاریکی رات کی تاریکی سے سینکڑوں گنا بڑھی ہوئی تھی جو شخص بھی زمین پر پڑے اپنے کسی زخمی یا مقتول عزیز یا دوست کی جستجو میں واپس پلٹتا تھا تو یا اسے زخمی حالت میں کسی نہ کسی صورت واپس ہونا پڑتا تھا یا وہ بھی زمین پر پڑے ہوئے مقتولین و مجروحین کے انبوہ کا جزو بن جاتا تھا۔

دم گھونٹنے والی زہریلی گیس اور کھولتا ہوا پانی۔

رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا عمل رہا ہو گا کہ سعودی فوجی دستوں اور پولیس نے لاٹھی ڈنڈے، چاقو اور لوہے کی چھڑوں کے ذریعہ سڑک کے دونوں جانب سے بری طرح زد و کوب کرنا شروع کر دیا جسے جدھر راہ ملتی تھی نجات کی فکر میں تھا پھر بھی ایک بڑا مجمع ان دستوں کے حصار میں محصور ہو کر رہ گیا تھا میں بھی اس مجمع میں موجود تھا دیکھتے دیکھتے ان بوڑھے، جوان، مردوں اور عورتوں کا مجمع اسقدر سمٹ گیا کہ لوگوں کو سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی اور ہڈیوں کے جوڑ دکھنے لگے تھے۔ جلوس کے عقبی سرے سے جو فوجی اور پولیس مجمع کو زد و کوب کر رہے تھے انہوں نے ایک نیا حربہ آزمایا، کھولتے ہوئے پانی کی بوچھار بھی مجمع پر مارنی شروع کر دی جس سے یہ حصار کچھ اور سمٹ گیا حالت یہ تھی کہ جو اس مجمع میں دھکے کھا کر گر پڑتا تھا اسے پھر اٹھنا نصیب نہ ہوتا تھا اور وہ زندہ ہی قدموں تلے روند ڈالا جاتا

بہرحال یہ مجمع اس شاہراہ حرم پر ایک دس منزلہ طویل و عریض عمارت کے سامنے آکر رک گیا جس میں اردنی و فلسطینی حجاج ساکن تھے، چاروں طرف چیخ پکار، آہ و نالہ و فریاد سے فضا گونج رہی تھی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایسے شدید گھٹن اور بیچارگی کے ماحول میں بپھرے ہوئے فوجی دستوں نے ظلم کا ایک اور پہاڑ ان مسلمانوں پر توڑ ڈالا اور وہ یہ کہ اس عالم میں مجمع کو دم گھونٹنے والی زہریلی گیس کا شکار ہونا پڑا قیامت کا منظر رونما ہو گیا کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ نہ جانے کتنے قدموں کے نیچے روند ڈالے گئے اور نہ جانے کتنے افراد اس گیس کا شکار ہو کر موت کی نیند سو گئے میں اس منظر کی عکاسی لفظوں کے ذریعہ کسی طرح بھی نہیں کر سکتا خود میرا حشر یہ تھا کہ دوبارہ اپنے ہوش و حواس کی بحالی، آنکھوں کی بصارت کی واپسی اور ایک نئی زندگی پر مجھے خود حیرت ہو رہی تھی مجمع بری طرح منتشر ہوا کچھ دلیر نوجوان نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے ان ہتھیار بند فوجی دستوں اور پولیس کی طرف بڑھے ایک غول کو اپنی طرف آتا دیکھکر ان فوجیوں کے قدم بھی اکھڑ گئے جس سے تھوڑی دیر کے لئے کچھ راستہ کھلا اور لوگ گلیوں اور کوچوں کے مکانوں میں پناہ لینے کے لئے بھاگے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کئی مکانوں پر پولیس نے دھاوا بول کر پناہ لینے والوں کو بری طرح زد و کوب کیا یا جان سے مارا ان میں سے ایک مکان جس میں خاصے لوگ پناہ لئے ہوئے تھے ان خونی درندوں نے ظلم و ستم اور بربریت کی وہ انتہا کر دی کہ مکان مالک کے بیان کے مطابق اسمیں سے چالیس بے گناہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی لاشیں برآمد ہوئیں اس حشر کے ہنگامہ میں مجھے ہزاروں پردہ دار مسلمان خواتین حقیقتاً بے مقنع و چادر اور سر و پا برہنہ نظر آئیں کسی کو اس کا ہوش نہ رہا کہ ان کی چادریں کب اور کہاں ان کے سروں سے اتر گئیں اور پیروں کے جوتے کہاں رہ گئے یہ دلدوز منظر میں نہ جانے کس طرح دیکھتا رہا اور اپنے آپ سے کہتا رہا اللہ کیا یہ ایک نئی کربلا نہیں ہے یہاں تو مردوں کے ہمراہ عورتیں گولیوں کا نشانہ بھی ہو رہی ہیں اور بے ردا بھی کی جا رہی ہیں۔

فلسطینی اور اُردنی مسلمانوں کی ہمدردیاں۔

شاہراہ حرم پر کھڑی وہ دس منزلہ طویل و عریض عمارت جسمیں فلسطینی اور اردنی حجاج مقیم تھے ان مسلمانوں پر ڈھائی جانے والی قیامت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے چنانچہ جب مجمع عمارت میں پناہ لینے کے لئے بڑھا تو انہوں نے ان مظلوموں پر عمارت کے دروازے یہ کہکر کھول دیے کہ اب چاہے سعودی پولیس ہمیں اس عمارت سے نکلنے پر مجبور بھی کر دے لیکن ہم آپ کو پناہ دینے سے گریز نہیں کریں گے ہم بڑی دیر سے آپ کی بے گناہی اور آپ

پر توڑے جانے والے ظلم وستم کو دیکھ رہے ہیں اور اب ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے نیچے کے تین طبقے خالی تھے دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں عورتیں مرد اس عمارت میں پناہ لینے کے لئے گھس گئے اور نوجوان رضاکارانہ طور پر جلدی جلدی دسترس میں آنے والے سیکڑوں زخمی، کچلے ہوئے نیم جاں افراد اور لاشوں کو اسمیں منتقل کرنے لگے۔ سعودی درندوں سے آخر کار اس عمارت کے مکینوں کا ترحم بھی نہ دیکھا گیا اور انہوں نے اس عمارت اور اسکے اطراف کی بجلی کی لائن بھی کاٹ دی مکہ کی گرمی، ہنگامہ کی دہشت اور ماحول کی گھٹن اور بر وقت طبی امداد کے فقدان نے ایک بار پھر کتنے ہی زخمیوں کی جانیں لے لیں۔

مسیحاؤں کی درندگی :

باہر سڑک پر اس قتل عام کا بازار اب رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ اگرچہ لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے نہتے مسلمانوں پر مظالم اب بھی جاری تھے بچا کھچا مجمع اب بھی پولیس اور فوج کے گھیرے میں تھا ہر طرف زخمی نظر آرہے تھے ۹ بجے کے بعد پولیس کے لاٹھی اور ڈنڈے بھی رک گئے اور سب کو اس جگہ سڑک پر بیٹھنے پر مجبور کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سعودی ہلال احمر کی ایمبولینس کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا مجمع سے لاشوں اور زخمیوں کا مطالبہ کیا جانے لگا سڑک پر پڑی ہوئی لاشوں اور زخمیوں کا ایک انبوہ تو تھا ہی نوجوانوں نے اس عمارت سے لا لا کر زخمیوں اور لاشوں کو ڈھیر کرنا شروع کر دیا لیکن عام طور سے لوگوں کو ایمبولینس تک جانے کی اجازت نہ تھی فقط معدودے چند افراد ہی انہیں ایمبولینس تک پہنچا رہے تھے یا پھر خود ہلال احمر اور فوج کے کچھ سنگ دل اور سفاک افراد تھے جو لاشوں اور زخمیوں کو بلا تفریق مرد و زن جانوروں کی مانند ایمبولینس میں ٹھونستے جاتے تھے اور یہ ایمبولینس لا معلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتی تھیں شاید سعودی ہسپتالوں کی طرف ۔۔۔۔ اسی دوران اور ہنگامہ کے درمیان بھی جمہوری اسلامی ایران کی ہلال احمر کی ایمبولینس اور گاڑیاں زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر اپنے طبی مراکز میں لے جانے کی کوششوں میں معروف تھیں لیکن انہیں اپنے اس مقصد میں جان پر کھیلنا پڑ رہا تھا۔ ان ایمبولینسوں پر پتھر اور ڈنڈے برسائے جاتے، زخمیوں کو کھینچ لیا جاتا اور ڈرائیوروں کو زخمی یا قتل کر ڈالا جاتا تھا۔ بہت سی نگاہوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک ایمبولینس کا ڈرائیور جب زخمیوں کو لیکر ہسپتال کی طرف روانہ ہونے لگا تو اسکی گاڑی کے آگے ڈرم ڈال دیئے گئے اور ڈرائیور کو بری طرح زخمی کر دیا گیا لیکن اس حالت میں بھی جب وہ زخمیوں کو لیکر ایک ہسپتال کے قریب پہنچا تو ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے ہی اسے گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔

یہ خبریں بعد میں خود ان زخمیوں سے معلوم ہوئیں جو قسمت سے بچ گئے تھے کہ سعودی ہسپتالوں میں بھی زخمیوں

کے ساتھ ہر طرح کا حیوانی سلوک روا رکھا گیا انہیں پیاس کی شدت میں پانی کے لئے تڑپانا اور گھنٹوں طبی امداد نہ پہنچانا یا بلا بے ہوش کئے ہوئے زخموں کی چیر پھاڑ اور ٹانکے لگانا ہسپتال کے درندہ صفت ڈاکٹروں کا محبوب مشغلہ بنا رہا۔

میں اس محشر خیز ہنگامہ کے خاتمہ کے بعد کافی رات گئے اس سڑک پر موجود رہا میرے احساسات سن ہو چکے تھے نہ جانے کن جذبوں کے تحت زخمیوں اور لاشوں کو ایمبولینس تک پہنچانے والوں میں شریک رہا پھر جب فوجی دستے اور پولیس ڈنڈے مار مار کر مجمع کو بھگانے اور منتشر کرنے لگی تو میں بھی وہاں ٹھہر نہ سکا اور کئی اٹھے ہوئے ڈنڈوں سے بچتا بچاتا اس گلی میں داخل ہوا جس میں میرا وقتی قیام تھا میرے احباب میرے لئے پریشان تھے اور جب انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک خون سے رنگین کپڑوں میں دیکھا تو بہت گھبرائے کہ کہیں میں بھی زخمی تو نہیں ہو گیا اچانک مجھے اپنا لباس دیکھنے کا خیال آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں زخمی تو نہیں ہوں، ہاں میرے کپڑے ضرور خون سے تر اور رنگین ہو چکے ہیں۔ آہ۔ یہ ان مسلمان اور باایمان شہیدوں اور زخمیوں کا خون ہے جنہوں نے کعبہ اور رب کعبہ کی راہ میں اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کی ہیں یہ ان بے گناہ مسلمانوں کا خون ہے جنہوں نے کلمۂ لاالٰہ الا اللہ اور روح اسلام یعنی اتحاد کی راہ میں سینوں پر گولیاں کھائیں اور زہریلی گیس کا شکار ہوئے۔ کیا سرزمین مکہ پر اللہ کے مہمان بندوں کا یہ خون رائگاں ہو جائے گا؟ کیا "امریکا" اور اس کا آلہ کار "فہد" اپنے دامن پر لگے ہوئے اس دھبہ کو صبح قیامت تک دھو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں یہ جابر و ظالم سلاطین اور ارباب اقتدار جان لیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی نیندیں حرام کر لی ہیں۔

رات بھر اس شاہراہ حرم کی صفائی، لاشوں کی منتقلی اور سڑک کی دھلائی کا کام کیا جاتا رہا۔ اس علاقہ میں پولیس کا سخت پہرہ رہا اور اس شب کی تاریکی میں بھی غیر ملکی حجاج کرام کو جگہ جگہ شناخت کر کے یا سواریوں سے اتار دیا جاتا یا زد و کوب کیا جاتا رہا سڑک کی صفائی کے باوجود راہ کعبہ میں شہید ہونے والے ان مسلمانوں کا مقدس خون میلوں تک شاہراہ حرم اور اس کے فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ نظر آتا رہا جسے ۱۳ ذی الحجہ کو ہونے والی بارش نے باران رحمت بن کر اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔

منظم قتل عام۔

اب یہ بات کسی سے مخفی نہیں رہ گئی کہ سعودی حکومت نے اپنے آقا امریکا کو خوش کرنے کے لئے امریکی پرچم کے جلائے جانے اور امریکا مردہ باد کے نعروں کے جواب میں منظم طور پر قتل عام کا منصوبہ پہلے سے ہی بنا رکھا تھا۔

چونکہ امریکا نے ایران کے مقابلے میں مختلف محاذوں پر مسلسل زک اٹھائی ہے۔ لہٰذا ان غلام نما نام نہاد مسلمان سلاطین کو اپنے آقا کو خوش کرنا ہی تھا، چاہے اسمیں اسلامی تقدس اور عظمت کعبہ کو قدموں تلے کیوں نہ روندنا پڑے لہٰذا اسلامی جمہوری ایران کی دعوت پر اٹھائے جانے والے "برائت المشرکین" کے اس جلوس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے کا سنہری موقع ان کے ہاتھ آیا جس میں تقریباً ساری دنیا کے باہوش اور اسلامی فکر رکھنے والے حجاج کرام نے شرکت کی تھی ان اندھوں کو اس کا بھی احساس نہ رہا کہ کسی ایک ملک سے اپنے آقاؤں کا انتقام لینے کے چکر میں پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

جمہوری اسلامی ایران کے حجاج چونکہ بہت منظم طور پر حج میں شرکت کرتے ہیں لہٰذا ان کے مقتولین و مجروحین اور لاپتہ حاجیوں کی تعداد تو مشخص ہوگئی جنہیں اب تک چار سو کے قریب شہید اور پانچ ہزار سے زائد افراد زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ فلسطینی، اردنی، شامی، برطانوی، پاکستانی، ہندوستانی، مصری، کویتی، بحرینی اور دیگر ممالک کے شہید و مجروح ہونے والے افراد کی خبریں اب مختلف اخبارات میں چھپ رہی ہیں ایک اندازہ کے مطابق اس خونی واقعہ میں عالم اسلام کے تقریباً ایک ہزار افراد جاں بحق اور پانچ ہزار سے زائد زخمی ہوئے ہیں۔

سعودی حکومت نے عالم اسلام کے اس پر امن جلوس کو روکنے، اسے پا کرنے اور اسکے قتل عام کے لئے پانچ طرح کی فوجی اور نیم فوجی طاقتوں کا استعمال کیا تھا۔

۱۔ "الامن العام" یعنی خفیہ پولیس جنہیں "رجال الامن" بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ "الشرطۃ العامۃ" یعنی عام پولیس۔

۳۔ "القوات الطواری الخاصۃ" یعنی شورش اور بغاوت کو کچلنے والی فوج۔

۴۔ "الحرس الوطنی" یعنی نیشنل گارڈ۔

۵۔ "الجیش العربی السعودی" یعنی عرب سعودی فورس۔

پولیس کی شرمناک حرکتیں۔

سعودی پولیس نے اس پر امن اسلامی جلوس کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے بعد مسلمان مردوں اور عورتوں کی لاشوں اور زخمی ہونے والے افراد کی بے حرمتی میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

حادثہ کے بعد سڑک پر بکھری ہوئی لاشوں اور زخمیوں کی کمر کی بیلٹوں سے روپئے اور ان کی گھڑیاں، عورتوں کے گلے اور ہاتھوں سے زیورات کھینچ کھینچ کر جھولیاں بھری جاتی رہیں۔ کیونکہ سکوں پر بکے ہوئے درباری ملاؤں نے جلوس میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کا خون بہانا جائز، عورتوں کو مباح اور ان کے مال کو مال غنیمت قرار دیا تھا یہ بات کچھ ایسی تھی جس پر مجھے غیر معمولی حیرت ہوئی لیکن کئی زخمیوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا اور میں عہد جاہلیت کے تصور میں گم ہو کر رہ گیا۔

جھوٹ کی پوٹ:۔

یوں تو حادثہ کے دوسرے دن سے ہی سعودی حکومت اور اس کے حلیفوں نے اپنے دامن پر لگنے والے اس شرمناک داغ کو دھونے کی کوشش میں کذب و افترا پردازی کا طومار باندھنا شروع کر دیا تھا واقعہ کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے یہ غیر مطمئن شیاطین اسقدر گھبرائے کہ اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے جو سمجھ میں آیا کہتے چلے گئے سب سے پہلے تو ان کے سرغنہ امریکہ نے حادثہ کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے چیخنا شروع کر دیا کہ اس قتل عام میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے جبکہ آج ہر با ہوش انسان جب ایران کے مقابلے میں امریکا کی پے درپے سیاسی شکست اور خلیج فارس کے مسائل پر غور کرتا ہے تو اسکی نگاہ میں اس قتل عام کا اصل مجرم سب سے پہلے امریکا ہی قرار پاتا ہے جس نے اپنے سعودی ایجنٹوں کے ذریعہ اپنی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے مکہ کے برائت المشرکین کے اس جلوس کو سب سے بہتر شکار تصور کیا لیکن اس قتل عام کے ذریعہ اس نے یہ محسوس کیا کہ اسکی یہ بازی بھی پہلے کی بازیوں کی طرح الٹی پڑ گئی ہے چنانچہ اس نے اپنی بے گناہی اور لاتعلقی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا اور سارا قصور سعودی حکومت کے کاندھے پر لاد دیا۔

سعودی حکومت نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے خود ایرانیوں کو اس سلسلے میں مورد الزام ٹھہرانا شروع کر دیا اور اس کے اخبارات و رسائل حکومت کو بے گناہ اور معصوم ثابت کرتے پر تل گئے ۔ ۹ ذی الحجہ کے روزنامہ "عکاظ" اخبار کے اردو ایڈیشن نے جلوس کے بانیوں کے خلاف یہ الزام لگائے کہ :۔

۱۔ ایرانیوں نے یہ جلوس شورش برپا کرنے کے لئے اور مکہ کا تقدس برباد کرنے کے لئے نکالا تھا اور یہ بھول گئے کہ یہ جلوس گذشتہ چند برسوں سے ہر سال پُر امن طریقے سے خود سعودی حکومت کی اجازت سے اٹھایا جا رہا ہے اور دلیل یہ دی کہ چونکہ ایرانی حاجیوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے ۔ لہٰذا وہ اس کے ذریعہ شورش و فساد برپا کرنا چاہتے تھے ، نہیں معلوم کسی مسلمان اور اسلامی ملک سے حاجیوں کی تعداد

میں اضافہ کا مطلب شورش برپا کرنا کہاں سے ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ بتایا کہ ایرانی حاجی اپنے ساتھ جنگی اسلحے اور آتش گیر مادے لیکر آئے تھے نہیں معلوم جدہ ایرپورٹ اور پورے ملک میں سعودی پولیس اور فوج کے زبردست انتظامات اور شدید ترین تلاشیں اور قدم قدم پر موی کیمرے کیا کر رہے تھے۔

۳۔ ایک مضحکہ خیز الزام یہ لگایا کہ ایرانی کعبہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور اسے منہدم کرکے قم کو قبلہ عالم بنانا چاہتے تھے یہ اندھے یہ بھول گئے کہ ردرح کلمہ لاالہ کو سارے عالم میں بیدار کرنے والے اور اسلام کو بڑی اور مستحکم طاقت کی شکل میں سارے عالم میں روشناس کرانے والے خود اپنے قبلہ کی توہین کا تصور کیسے کر سکتے ہیں۔ جو کعبہ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانوں کی بازی لگادیں وہ تو کعبہ کے دشمن بن جائیں اور جو کعبہ کے تقدس کو اپنے قدموں تلے روندڈالیں وہ کعبہ کے محافظ و شیدائی قرار پائیں کتنی بڑی ستم ظریفی ہے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سعودی وزیر حج کے نمائندہ کی طرف سے جلوس کی منزل آخر شاہراہ حرم پر موجود ٹیلیفون ایکسچینج کی عمارت کی انتہا تھی جو کعبہ مکرمہ سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے جبکہ اس کے پہلے ہی فوج اور پولیس نے جلوس کا راستہ روک کر بلا سبب اس پر حملہ شروع کر دیا تھا کعبہ تک جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ جمعہ کا دن تھا اور مغرب کے قریب کا وقت، جب یہ قتل عام شروع ہوا تھا حالانکہ اس درباری اخبار نے الزام لگایا کہ ظہر کا وقت تھا، جلوس والے کعبہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور ان کے مطابق مجمع جمعہ کی نماز پڑھکر مسجد الحرام سے باہر نکل رہا تھا کہ ان دونوں گروہوں میں تصادم ہوگیا اور اتنے حاجی جاں بحق ہوگئے۔ گویا سعودی ظالم اس حادثہ کے بعد اسقدر گھبرا گئے کہ انہیں وقت کا احساس بھی نہ رہا۔

۵۔ ایک جھوٹ تو سفید داغ بنکر سعودی حاکم کے چہرہ پر ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ اس کے فوجیوں نے جلوس پر آٹومیٹک رائفلوں اور مشین گنوں سے اندھادھند گولیاں چلائیں، سیکڑوں مسلمانوں کو قتل کر ڈالا اور پھر صاف مکر گئے کہ ہم نے سرے سے گولی ہی نہیں چلائی جبکہ یہ بات پوری دنیا کے حاجیوں نے نقل کی ہے کہ سعودی پولیس نے جلوس پر فائرنگ کی تھی اس سلسلہ میں زیادہ نہیں صرف ایک مثال آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ بمبئی کے ایک مشہور اخبار "انقلاب" میں مکہ کے قتل عام کے دوسرے ہی دن یعنی ۳ اگست مطابق ۵ ذی الحجہ (جبکہ اس روز سعودی عرب میں ذی الحجہ کی ۷ تاریخ تھی) کو

اس خونی حادثہ سے متعلق دو متضاد خبریں چھپی ہیں، پہلی خبر تو یہ ہے کہ "حادثہ کے بعد شاہ فہد نے حکام اور فوجی سربراہوں کا ہنگامی اجلاس طلب کیا جس کے بعد سرکاری طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا کہ فوجی دستوں اور پولیس نے مسلمانوں کے اس جلوس پر ایک بھی گولی نہیں چلائی اور دوسری خبر یہ ہے کہ حادثہ کے دوسرے روز ہندوستانی حج کمیٹی کے چیرمین جناب "امین کھنڈوانی" نے بذریعہ ٹیلیفون یہ اطلاع ہندوستان بھجوائی کہ گذشتہ شب مکہ میں جلوس پر ہونے والی فائرنگ میں ہندوستان، یوپی کے ایک صاحب زخمی ہوئے جنکو فوری طبی امداد پہنچائی گئی"۔
سچ ہے "دروغ گو را حافظ نباشد"۔

درباری علماء کا دین فروش کردار۔

اسی اخبار "عکاظ" کے اگلے شمارہ میں مکہ مکرمہ کے چند دین فروش علماء کا بیان بھی شایع ہوا جس میں انہوں نے جلوس میں شریک ہونے والے ان مسلمانوں کی تکفیر کی جو کلمہ توحید کو زبان پر جاری رکھتے ہوئے اپنے معبود کی راہ میں یا شہید ہو رہے تھے یا خون کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

ساتھ ہی مصر کی جامعہ ازہر یونیورسٹی کے بھی چند ایمان فروش علماء نے اس حادثہ کو B.B.C کی طرح شیعہ سنی رنگ دے کر مسلمانوں کے ایک فرقہ کی تکفیر اور اس جلوس کی بھی تکفیر کی اور یہ علماء یہ بھول گئے کہ "برائت المشرکین" کے جلوس کی تکفیر کرتے ہوئے وہ حمایت المشرکین کا اعلان بھی کر رہے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ اسلام کے "علماء کبار" کا ٹائیٹل بھی لگائے ہوئے ہیں۔

مصر کے یہ "علماء کبار" یہ بات بھی بھول گئے کہ ابھی چند سال قبل مصر کے مفتی اعظم اور شیخ الجامعہ شیخ شلتوت رہ جیسی عالمی شہرت یافتہ شخصیت نے عالم اسلام میں شیعیت کو ایک مستند مذہب اسکی فقہ کو فقہ جعفری کے عنوان سے مستقل و مستحکم اسلامی فقہ تسلیم کیا ہے۔ اصل میں سعودی حکومت کا حکومتی مذہب عالم اسلام کو کبھی متحد دیکھ ہی نہیں سکتا وہ تو شروع سے افتراق اور پھوٹ کی طرف دعوت دیتا رہا ہے کیونکہ اس مذہب کی بنیاد ہی عالمی استکبار نے اسلئے رکھی تھی کہ مسلمان کسی عہد میں بھی متحد نہ ہونے پائیں۔

خیانت کار عرب حاکموں کا کردار۔ ادھر خدا کی پرامن سرزمین پر مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا اللہ

کے سیکڑوں مہمان، سعودی مہمان کشتوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر موت کی نیند سو چکے تھے اور ہزاروں کشمکش موت و حیات میں مبتلا تھے ادھر عرب ممالک سعودی حکومت کو اس قتل عام پر مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ آخر کیسی مبارکباد؟ مکہ میں نہتے مسلمانوں کے پرامن جلوس پر اندھا دھند گولیاں چلائی جائیں اور عراق، مصر اردن اور مراکش کے حاکم نہ صرف اس قتل عام کی موافقت کریں بلکہ دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے بے گناہ مسلمانوں کے بلا قصور اجتماعی قتل پر شاہ فہد کو مبارکباد بھی دیں کہ آپ نے بہت اچھا اور قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے گویا شاہ فہد نے کوئی بہت بڑا ملک فتح کر لیا ہے۔

؎ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

امریکا اور اسرائیل کی مبارکبادی۔

اس خونی حادثہ کا نتیجہ بڑی تیزی سے سامنے آنے لگا ہے اور ان بے قصور مسلمانوں کا خون زمین پر گرتے ہی اصل قاتلوں کے سر چڑھ کر بولنے لگا ہے دوسرے ہی دن ساری دنیا کی خبروں میں امریکا کے وزیر خارجہ جارج شولز کا بیان پوری آب و تاب کے ساتھ نشر کیا گیا کہ "مکہ میں جلوس اٹھانے والے اسلام کے خلاف عمل انجام دے رہے تھے دراصل حج میں مشرکین سے برائت کوئی اسلامی عمل ہی نہیں ہے اور حقیق اسلام تو صحیح معنٰی میں صرف سعودی عرب کا اسلام ہے" دنیا کے تمام مسلمانوں کو اس بات سے یقیناً بڑی خوشی ہوئی ہوگی کہ ایک عیسائی اور وہ بھی دنیا کی خونخوار عالمی طاقت کا وزیر خارجہ "صحیح اسلام کی تشخیص کرے" اور مشرکین سے ایام حج میں برائت کا اعلان تو قرآن کی ایک محکم تعلیم ہے ورنہ قرآن کے ایک مستقل سورہ اور اسکی تاریخ سے انکار کرنا پڑے گا۔ اب مسلمان خود غور کر لیں کہ وہ جارج شولز کے نظریہ والے مسلمان ہیں یا قرآنی نظریہ والے مسلمان۔ سب تو سب اسرائیل کے وزیر خارجہ شیمان پریز نے بھی اس جلوس کے بانی ایران کی مذمت کرتے ہوئے اس قتل عام کو سراہا اور شاہ فہد جیسے "عظیم مسلمان" کو اس خونریزی کی مبارکباد دی ظاہر ہے جب عیسائی کسی "مسلمان حاکم" کو کسی عمل کی مبارکباد پیش کریں تو یہودی کیوں پیچھے رہیں۔ عرب کے ایک ملک پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے صہیونی یہودی آج ایک "مسلمان بادشاہ" کے مداح کیسے ہو گئے؟ یہ وہ نکتہ ہے جس پر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے اور قرآن کریم کی اس آیت کو بار بار غور سے پڑھنا چاہیئے یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصارٰی اولیاء (سورۃ مائدہ آیت نمبر ۵۱)
ترجمہ: اے ایمان والو، یہود اور نصارٰی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

آخر میں ہم استکباری طاقتوں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ایک دین ہے ایک خدا کی عبادت کا حکم دیتا ہے اور اتحاد کی دعوت دیتا ہے آج مسلمانوں میں اتحاد کی لہر بہت تیزی سے پھیل رہی ہے عنقریب جب ہر مسلمان کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی روح کو سمجھ لے گا تو نہ تمہارا متکبرانہ وجود باقی رہے گا اور نہ تمہارے کٹھ پتلی نما حلیف۔ مسلمانوں نے ایمان اور یقین کی سب سے مقدس اور محترم زمین پر اتحاد بین المسلمین اور برائت المشرکین کے شجر کی آبیاری اپنے خون سے کردی ہے اب سرزمین حرمین شریفین بھیڑیا صفت نام نہاد "خادم الحرمین" سے نجات پا کر رہے گی۔ انشاء اللہ۔

کردارِ حسین علیہ السلام

ایہا الناس ان رسول اللہ (ص)، قال من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحرام اللہ، ناکثاً عہدہ مخالفاً لسنۃ رسول اللہ یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان فلم یغیّر علیہ بفعل ولا قول، کان حقاً علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ

اے لوگو! پیغمبر خدا (ص) نے فرمایا ہے اگر کوئی مسلمان کسی ظالم و جابر بادشاہ کو دیکھے کہ وہ حرام خدا کو حلال قرار دے رہا ہے۔ عہد و پیمان الٰہی کو توڑ رہا ہے، سنت رسول اللہ کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا ہے۔ بندگان خدا کے ساتھ گناہ و معصیت سے پیش آتا ہے اور ان سے عداوت کا سلوک کرتا ہے۔ اس کے باوجود مسلمان اگر اپنے عمل یا قول سے اس کی مخالفت کا اظہار نہیں کرتا تو خداوند عالم کو اس کا حق ہے کہ وہ ایسے ساکت و صامت شخص کو اس ظالم بادشاہ کے ہمراہ جہنم میں ڈال دے۔

تاریخ طبری ج ۷، ص ۳۰۰، کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۲۸۰ بنقل خوارزمی ج ۱ ص ۲۳۴
انساب الاشراف ج ۳ ص ۱۷۱

جناب ولی الحسن اعظمی

لہو کی آواز

کعبۂ امن و اماں تجھکو مرا لاکھوں سلام — اف! لیا ہے ظالموں نے تجھ سے کیسا انتقام
پاسباں بنکر کیا پامال تیرا احترام — تیری ہی گودی میں تیرے حاجیوں کا قتل عام

سامنے تیرے چلا یوں دور خوں کے جام کا
اٹھ گیا گویا جنازہ غیرت اسلام کا

قبلۂ اول پہ قابض ہو گئی قوم یہود — ملت اسلام پہ چھایا رہا پھر بھی جمود
کھل رہا تھا کافروں کو تیرا پاکیزہ وجود — کر کے سازش تجھ پہ قابض ہو گئی آلِ سعود

مرکز توحید سے بدعت کا طوفاں چل پڑا
بھیس میں نجدی وہابیت کے شیطاں چل پڑا

عالم اسلام میں وہ تفرقہ پیدا ہوا — بھائی اپنے بھائی کا ہنس کر لہو پینے لگا
گھونٹ ڈالا جھوٹے فتووں نے حقائق کا گلا — پٹرو ڈالر کے عوض بکنے لگا دینِ خدا

رفتہ رفتہ بن گیا یورپ کی اک منڈی حجاز
حد یہ ہے مذہب بھی ان کا ہو گیا امریکہ ساز

الاماں! کھلتی ہے اب ان کو صدائے لا اِلٰہ — مانگتے ہیں نعرۂ اللہ اکبر سے پناہ
کہتے ہیں مشرک سے اعلان برأت ہے گناہ — محترم ہے خانۂ کعبہ سے بھی کاخِ سیاہ[1]

جبر و استبداد کا پرچم جلانا ظلم ہے
"مردہ باد امریکہ" کا نعرہ لگانا جرم ہے

[1] وائٹ ہاؤس (White House)

انبیاء کی یادگاریں محو کرتے ہیں تمام — قبرِ معصومینؑ پہ قبہ بنانا ہے حرام
ہے منافئِ شریعت ان کی تعظیم و سلام — کوڑے کھاتے ہیں جو لے لیں بوسہ حجاج کرام

اولیاء سے تو شفاعت اور توسل ہے گناہ
خود لئے بیٹھے ہیں امریکہ کے دامن میں پناہ

جشنِ میلادِ نبیؐ کہتے ہیں بدعت بد نہاد — ہیں مخالف نغمۂ وحدت کے یہ اہلِ فساد
ڈرتے ہیں کھا جائے گا ان سب کو دینی اتحاد — آگئی ملت اگر میدان میں بہرِ جہاد

قصرِ استعمار جل جل کر دھواں ہو جائیں گے
ظلم کے ایوان بے نام و نشاں ہو جائیں گے

سیکڑوں پیراهن احرام ہیں جو خوں سے تر — دیتے ہیں آواز او بو لہب کے خونی پسر!
تختِ ظلم و جور نیس ہونے کو ہے زیر و زبر — مل نہیں سکتی تجھے ڈھونڈے سے بھی راہ مفر

ہو گئی بیدار ملت اب کہاں جائے گا تو؟
رائیگاں جایا نہیں کرتا شہیدوں کا لہو!

ملت اسلام اب دھوکے میں آسکتی نہیں — جھوٹی تبلیغیں تری حق کو چھپا سکتی نہیں
آنکھوں نے دیکھے ہیں جو منظر بھلا سکتی نہیں — آگ سینوں میں جو روشن ہے بجھا سکتی نہیں

لیں گے قطرہ قطرۂ خوں کا تجھ سے اب ہم انتقام
چھین لیں گے ہم ترے ہاتھوں سے کعبہ کا نظام

ہے نہیں یہ ملت ایراں کا تنہا مسئلہ — بلکہ پورے عالم اسلام کا ہے حادثہ
ہو وہ مکہ یا مدینہ یا نجف اور کربلا — رکھتا ہے ہر اک مسلمان ان سے گہرا رابطہ

احترام ان کا ہمارا دین ہے ایمان ہے
ان کا جو دشمن ہے وہ انسان نہیں شیطان ہے

❖

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفت خدا

لا یجری علیہ السکون والحرکۃ

اس پر حرکت و سکون نہیں طاری ہوتے

خدا کی صفتوں میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ حرکت و سکون سے متصف نہیں ہوتا۔ حرکت، وجود تدریجی کے معنی میں ہے اس کے مقابل میں سکون ہے اور یہ حرکت و سکون جو ایک دوسرے کے مقابل میں ہیں ان کی حیثیت "عدم وملکہ" کی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں حرکت کی استعداد اور قابلیت تو پائی جاتی ہے مگر حرکت نہیں ہوتی ایسی چیزوں کو ساکن کہا جاتا ہے۔ خدا کے سلسلہ میں حرکت و سکون کا یہ تصور درست نہیں ہے اس لئے کہ اگر خدا کی ذات میں سکون نہیں پایا جاتا تو حرکت کی استعداد بھی نہیں پائی جاتی یہ اس لئے ہے کہ خدا جسم و جسمانیات سے منزہ ہے اور حرکت و سکون جسم کی خاصیت ہے ـــــ یہ تو حرکت و سکون کا اجمالی مفہوم تھا ـــــ مگر بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے حرکت و سکون کے بارے میں مزید گفتگو ضروری ہے، البتہ ہماری کوشش ہے کہ ہم مفہوم کو سادہ اور قابل فہم بنا کر پیش کریں۔ اس کے باوجود اگر بعض حضرات کو سمجھنے میں دشواری ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں اس لئے کہ جو مطالب ہم پیش کرنے جا رہے ہیں وہ ذرا غور طلب ہیں۔

حرکت:- دنیا کے سارے موجودات نہ تو ہر رخ سے "بالفعل" ہیں اور نہ ہر جہت سے "بالقوۃ" ہیں بلکہ بعض جہت سے بالقوۃ اور بعض رُخ سے بالفعل ہیں۔ بعض رخ سے بالفعل اور بعض جہت سے بالقوۃ ہونے والے موجود کو دو چیزوں سے مرکب ہونا چاہئے تاکہ ایک کی وجہ سے بالقوۃ اور دوسرے کے سبب سے بالفعل ہو اور رفتہ رفتہ بالقوۃ کے

حصار سے خارج ہو کر بالفعل کے حلقہ میں آجائے ـــــ بالقوہ سے بالفعل تک کی منزل کو طے کرنے کا نام حرکت ہے، فلاسفہ حرکت کی تعریف میں کہتے ہیں۔ "الحرکۃ کمال اول لما بالقوۃ من حیث أن قد لا بستہ قوۃ"
کمال اول کا نام حرکت ہے اس کے بعد جو فعلیت اسمیں پیدا ہوتی ہے، اسکو کمال دوم کہا جاتا ہے ـــــ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ حدوث تدریجی اور قوت سے فعل کی جانب سفر کو حرکت کہتے ہیں [1] ـــــ
بات کو ذہنوں سے اور زیادہ قریب نیز مطلب کو واضح کرنے کے لیئے میں ایک مثال کا سہارا لینا چاہتا ہوں۔

فرض کیجئے آپکی موٹر آپکے قم کے گیرج GARAGE میں کھڑی ہے، اسمیں یہ استعداد پائی جاتی ہے کہ اصفہان کے گیرج میں کھڑی ہو، لیکن اصفہان کے گیرج میں اسوقت کھڑی ہو سکتی ہے جب قم سے اصفہان تک کی مسافت طے کر کے وہاں پہونچے، اس تدریجی مسافت کے طے کرنے کا نام "حرکت" ہے لہٰذا یہ مسافت تدریجی پہلے طے ہوگی یعنی موٹر وہاں تک جائیگی تب اصفہان کے گیرج میں کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس تدریجی مسافت کا طے کرنا کمال اول ہے اور اصفہان کے گیرج میں موٹر کا موجود ہونا کمال دوم ہے۔

معلوم ہوا کمال اول اس چیز سے متعلق ہے جسمیں دوسری چیز بن جانے کی قوت اور استعداد ہو ـــ اور اس قوت و استعداد کو "فعلیت" تک پہونچنے کے لئے راستہ کا طے کرنا ضروری ہے اس راستہ کے طے کر لینے کو "حرکت" کہتے ہیں جیسے ایک سیب جو درخت پر لگا ہوا اور سبز (کچا) ہوتا ہے کھانے کے قابل نہیں ہوتا، لیکن اس میں پک کر، سرخ ہو جانے کی استعداد موجود ہوتی ہے مگر پک کر، سرخ ہونے تک اس کو ایک مخصوص زمانہ میں تدریجاً ایک مرحلہ کو طے کرنا پڑتا ہے ـــــ سیب کے پکنے تک کے اسی مرحلہ کو "حرکت" کہتے ہیں، اسی لئے اشیاء کے وجود تدریجی کو حرکت کہا جاتا ہے۔

مقولات خمسہ اور حرکت :-

صدر المتألہین سے پہلے کے فلسفی چار مقولات عرضی (کم، کیف این، وضع) میں حرکت کے قائل تھے اور مقولہ "جوہر" میں حرکت کو محال سمجھتے تھے۔ لیکن صدر المتألہین فرماتے ہیں کہ "ذات اشیاء اور جوہر میں بھی حرکت موجود ہے" بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ "اعراض کی تمام حرکتیں، ذات اور جوہر کی حرکت کا معلول (نتیجہ) ہیں" یعنی جب تک کسی چیز کے "جوہر" میں کمال نہیں ہوتا اس وقت تک اس کے "اعراض" میں بھی کمال نہیں پیدا ہوتا۔ سیب کی جو مثال ہم نے اوپر بیان کی ہے اسمیں اگر اس کے رنگ و حجم اور اس کی کیفیت میں ہر زمانہ میں

تبدیلی آتی ہے تو یہ تبدیلی اس وجہ سے ہے کہ سیب کے جوہر ذات میں کمال حاصل ہوتا ہے اگر یہ تدریجی ترقی اسکی ذات میں نہ ہو تو اعراض (رنگ، حجم کیفیت وغیرہ) بھی نہیں بدل سکتے۔

حرکت کیف :۔

اس حرکت کا مطلب یہ ہے کہ شئے کی کیفیت بدل جاتی ہے لہٰذا اگر سیب کا رنگ بدلتا ہے اور اسکی سبزی زردی میں اور زردی سرخی میں تبدیل ہوتی ہے تو اسکو "حرکت کیف" کہتے ہیں [۲]

حرکت کم :۔

چیزوں کی مقدار میں تدریجی تبدیلی کو "حرکت کمی" کہا جاتا ہے جیسے سیب کا چھوٹے سے بڑا ہو جانا [۳]

حرکت وضعی :۔ جیسے زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور اس طرح اس کا رخ بدلتا جاتا ہے اگر دن موجود ہو تو زمین کا کچھ حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے لیکن جب زمین حرکت کرتی ہے اور اس کا وہ حصہ سورج کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو تاریکی چھا جاتی ہے۔ زمین کی اس حرکت کو "حرکت وضعی" کہتے ہیں [۴]

حرکت اینی :۔ یعنی حرکت مکانی، جیسے کوئی چیز اپنی جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جائے جیسا کہ موٹر کی مثال میں بیان کیا جا چکا ہے کہ موٹر کی قم سے اصفہان تک کی حرکت کو "حرکت اینی" کہتے ہیں [۵]

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ وجود تدریجی اور ایک کمال سے دوسرے کمال کی طرف منتقل ہو جانے کو "حرکت اینی" کہتے ہیں۔

متعلقات حرکت :۔ حرکت کو خارج میں متحقق ہونے کے لئے چھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے

۱۔ ما بہ الحرکۃ ۲۔ ما عنہ الحرکۃ ۳۔ ما فیہ الحرکۃ ۴۔ ما منہ الحرکۃ
۵۔ ما الیہ الحرکۃ ۶۔ ما علیہ الحرکۃ

موٹر کی جو مثال پہلے بیان کی گئی ہے اسمیں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے تب حرکت متحقق ہو گی۔

۱۔ مابہ الحرکۃ یا موضوع حرکت:۔ موٹر کی مثال میں موضوع حرکت خود موٹر ہے جس کے توسط سے حرکت انجام پا رہی ہے۔

۲۔ ماعنہ الحرکۃ یا فاعل حرکت۔ جس فاعل کے ذریعہ حرکت ہو رہی ہے وہ ڈرائیور ہے اسکو فاعل حرکت یا "ماعنہ الحرکۃ" کہتے ہیں۔

۳۔ مافیہ الحرکۃ۔ یعنی جسمیں حرکت ہو ــــ اسکو "حرکت اینی" کی مثال میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "مافیہ الحرکۃ" وہی قم سے اصفہان تک کا راستہ ہے جس میں موٹر چل رہی ہے۔

۴۔ مامنہ الحرکۃ۔ آغاز اور مبدأ حرکت کو "مامنہ الحرکۃ" کہتے ہیں یعنی جس جگہ سے حرکت شروع ہوئی ہے، اس مثال میں وہ جگہ "قم" ہے۔

۵۔ ماالیہ الحرکۃ۔ جس جگہ حرکت ختم ہو جائے اس جگہ کو "ماالیہ الحرکۃ" کہتے ہیں، مثال مذکور میں چونکہ حرکت کی انتہا اصفہان پر ہو رہی ہے اسلئے اصفہان "ماالیہ الحرکۃ" کہا جائیگا۔

۶۔ ماعلیہ الحرکۃ یا زمانہ حرکت۔ حرکت زمانہ سے ہم آہنگ بلکہ حرکت زمانہ ساز ہوتی ہے یعنی بغیر زمانہ کے حرکت ممکن ہی نہیں اسلئے کہ جب موٹر حرکت کرتی ہے یعنی تدریجاً راستہ کو طے کرتی ہے تو یہ تدریج جزو زمانہ ہی ہوتی ہے لہٰذا موٹر کی (قم سے اصفہان تک) حرکت کے لئے جتنا وقت گزرتا ہے اس وقت کو زمانہ حرکت یا "ماعلیہ الحرکۃ" کہا جاتا ہے۔

مرحوم ملّا ہادی سبزواری نے "منظومہ" میں ان چھ امور کو دو شعر میں نظم کر دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

دعت مقولۃ وعلتین والوقت ثم متقابلین

مایہ، مامنہ، ماالیہ مافیہ، ماعنہ وعلیہ

حرکت ان مقولوں کو چاہتی ہے جن میں حرکت جلوہ گر ہوتی ہے، دو علت، زمان اور ان دو چیزوں کو چاہتی ہے جو ایک دوسرے کے متقابل ہیں۔

اس شعر میں ملّا سبزواری مقتضائے حرکت چھ چیزوں کو سمجھتے ہیں۔

۱۔ مقولہ۔ آغاز بحث میں ہم نے یہ بات کہی تھی کہ حرکت پانچ مقولوں میں موجود ہے ان میں سے چار عرضی اور ایک جوہری مقولہ ہے۔ مثال مذکور میں وہی مقولہ "این" ومکان مقولہ تھا۔

۲۔ علتین ۔ یعنی دو علتیں، ایک کو "فاعل" اور دوسری علت کو علت "قابل" کہتے ہیں۔ گذشتہ مثال میں فاعل حرکت وہی ڈرائیور تھا جس نے حرکت کو ایجاد کیا تھا اور علت قابل وہ موٹر تھی جو حرکت کو قبول کر رہی تھی اس موٹر کو ما بہ الحرکۃ یا موضوع حرکت بھی کہتے ہیں۔

۳۔ وقت ۔ زمانہ حرکت اور ما علیہ الحرکۃ ہے جس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ بغیر زمانہ کے کوئی حرکت انجام نہیں پاتی۔

۴۔ المتقابلین ۔ یہ دو امور ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں یعنی آپس میں تضاد رکھتے ہیں ایک کو مبداء حرکت (ما منہ الحرکۃ) اور دوسرے کو مقصد اور منتہائے حرکت (ما الیہ الحرکۃ) کہتے ہیں گذشتہ مثال میں قم وہ جگہ ہے جہاں سے حرکت کی ابتدا ہوتی ہے (مبدأ حرکت) اور اصفہان وہ جگہ ہے جہاں حرکت ختم ہوگئی ہے (منتہائے حرکت)

یہ بحث کا اجمالی خاکہ تھا جو میں نے "حرکت" کے سلسلہ میں مقدمہ کے طور پر پیش کیا اس لئے کہ حضرت امیر المومنینؑ کے کلام میں (ابتدائے بحث میں یا اس کے بعد کے جملوں میں) یہ جملہ موجود ہے آپ نے فرمایا "خدا پر نہ سکون طاری ہوتا ہے اور نہ حرکت" ــــــــ البتہ اگر سکون کے معنی عدم حرکت مطلق ہوتے یعنی جو چیز کسی رخ سے بھی حرکت نہیں کر سکتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ خدا ساکن ہے!! لیکن عدم حرکت مطلق کا نام سکون نہیں ہے بلکہ سکون اس عدم حرکت کو کہتے ہیں جس میں حرکت کی استعداد اور صلاحیت موجود ہو (عدم الحرکۃ عما من شانہ ان یکون متحرکاً) اور خدا میں استعداد و قابلیت حرکت نہیں ہے اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے اور حرکت اجسام سے مخصوص ہے۔

"وکیف یجری علیہ ما ھو اجراہ"

بھلا خدا پر وہ چیز کیسے جاری ہو سکتی ہے جس کو خدا ہی نے جاری کیا ہو۔

تمام نظام وجود کی حرکت، خداوند عالم کی ذات سے ہے وہی حرکت کا خالق اور ایجاد کرنے والا ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ جس چیز کا وہ خالق و موجد ہو وہ چیز اس کی ذات پر جاری ہو جائے۔

"ولیعود فیہ ما ھو ابداہ ؟"

اور وہ چیز اس کی طرف کیوں کر عائد ہو سکتی ہے جس کو اس نے ایجاد و اختراع کیا ہو ؟

خدا خود ہی فاعل اور مبدأ حرکت ہے لہٰذا جو چیز اسکی مخلوق ہے وہ اسمیں کیوں کر اثر کر سکتی ہے

"وكيف يحدث فيه ما هو أحدثه؟"

اور جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے وہ چیز خود خدا میں کیسے پیدا ہو سکتی ہے ؟

اگر مخلوق، خدا کی ذات میں اثر کرنا چاہے تو خدا محل حوادث ہو جائیگا اور جو چیز محل حوادث ہو حادث ہوتی ہے اور ذات اقدس الہٰی کے لئے حادث ہونا محال ہے اس لئے کہ وہ محل حوادث نہیں ہے۔

یہاں ممکن ہے کوئی کہے کہ حرکت، مخلوق خدا اور ایجاد خدا ہونے کے بعد بھی خدا میں اثر کرے تو کیا حرج ہے ؟

ـــــ تو ایسے سوالات اور اعتراضات کا حضرتؑ نے الگ الگ جواب بیان فرمایا ہے

"اذاً لتفاوتت ذاته"

ایسی صورت میں اسکی ذات تغیر پذیر قرار پائیگی

جیسا کہ پہلے بھی یہ تذکرہ آچکا ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا حرکت کی خصوصیات میں سے ہے لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ جسم حرکت جوہری کا حامل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو ہر ذات ناقص ہے اور تدریجاً کمال کی طرف حرکت کرتا ہے جیسے نطفہ میں حرکت جوہری ہے اس لئے کہ نطفہ تدریج نقص سے کمال کی طرف بڑھتا ہے پہلے نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ پھر انسان بنتا ہے۔

لہٰذا نطفہ کے اندر پائی جانے والی حرکت کا مطلب یہ ہے کہ اسکی ذات میں تفاوت ہے اب اگر یہ تفاوت اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال خدا کی ذات پر بھی صادق آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا عیاذاً باﷲ ناقص ہے اور تدریجاً کمال حاصل کرتا ہے !! اسلئے کہ ذات کے بدلنے کا مطلب نقص سے کمال کی طرف جانا ہوگا اور یہ بات خدا کے لئے کسی بھی صورت سے مقصود نہیں ہے اس لئے کہ وہ کمال محض ہے اسکی ذات میں کسی طرح کا بھی نقص نہیں پایا جاتا۔

اس جگہ ایک اہم نکتہ بیان کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ حضرتؑ نے جو اپنے کلام میں ذات کی طرف تفاوت و تغیر کی نسبت دی ہے تو تفاوت کی ذات کی طرف نسبت حرکت جوہریہ کی دلیل ہے اور صدر المتألہین کے زمانہ تک فلاسفہ، حرکت جوہریہ کے قائل نہیں تھے فلاسفہ صرف عرض کے چار مقولوں میں حرکت کے قائل تھے لیکن ـــــ صدر المتألہین فرماتے ہیں کہ اگر اعراض میں (جو ذات کے جلوے ہیں) حرکت ہوتی ہے تو ذات اور جوہر اشیاء میں بھی حرکت کا ہونا لازمی ہے جبتک جوہر ذات میں تدریجی کمال پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک اعراض بھی (جوہر کے جلوے ہیں) کمال تک نہیں پہونچ سکتے۔ نطفہ کی ذات و جوہر میں جبتک کمال نہیں پیدا ہوگا اس وقت تک اس کے اعراض میں تبدیلی ہو کر

انسان نہیں بن سکتا بلکہ بلا شبہ ذات نطفہ میں بھی تبدیلی پیدا ہوگی۔

"ولتجزّا کنهه"

"اور اس کی کنہ وحقیقت جزء جزء ہو جائیگی"

اگر خدا کی ذات میں حرکت کا گزر ہو جائے تو اس کی ہستی قابل تجزیہ ٹھہر گی یعنی مرکب ہو جائیگی اس لئے کہ حرکت جسم سے مخصوص ہے جس جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے وہ جسم نقص سے کمال کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور اگر کوئی موجود مجرد ہو تو اسمیں ارتقاء کا کوئی سوال ہی نہیں ہے لہٰذا اگر خدا کی ذات میں بھی حرکت کا وجود فرض کر لیا جائے تو اس کا جسم ہونا لازم آئیگا اور تجزیہ وتقسیم جسم کی خصوصیت ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جائے کہ اگر خدا کی ذات میں بھی حرکت فرض کرلی جائے تو موجودات کے ساتھ وہ اس جہت سے شریک ہوگا درآں حالیکہ خدا کو موجوات عالم سے الگ ہونا چاہئے۔ اس طرح وہ ما بہ الاشتراک اور ما بہ الامتیاز سے مرکب ہوگا یعنی ایسے دو جزء سے مرکب ہوگا جس میں کا ایک جزء تو خود اسکی ذات سے مخصوص ہوگا اور دوسرے جزء میں سارے عالم کا شریک ہوگا اس طرح مرکب ہونے کے بعد محتاج اور ناقص ہو جائیگا لیکن خدا کی ذات کے لئے ایسا ہونا محال ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ حرکت اعراض میں ہوتی ہے اگر خدا اعراض میں حرکت رکھتا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کم وکیف ووضع واین (چار مقولات عرضی) کا بھی حامل ہو تو ایسی صورت میں وہ ذات و اعراض سے مرکب ہوگا اور اسکی ذات میں تعدد لازم آئیگا اور وہ قابل تجزیہ ہو جائیگا۔

۱۔ شیخ الرئیس حرکت کے معنی کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ــ "الحركة تقال على تبدل حال قارة في الجسم يسيراً يسيراً على سبيل اتجاه نحو شيء والوصول بها اليه هو بالقوة لا بالفعل"

اور اخوان الصفا فرماتے ہیں کہ "ان الحركة هي النقلة من مكان الى مكان في زمان ثان وضدها السكون" ایک مکان سے خارج ہو کر دوسرے مکان اور دوسرے زمانہ میں منتقل ہو جانا حرکت ہے ــــ ملا صدرا فرماتے ہیں کہ قوت سے فعل کی طرف خروج شئی کا نام حرکت ہے۔ وہ چیز حرکت نہیں ہے جس کے ذریعہ شئی قوت سے فعل کی طرف منتقل ہوتی ہے

۲۔ الحركة في الكيف، انتقال الجسم من كيفية الى كيفية اخرى على التدريج مع بقاء

الصورة النوعية کتسخن الماء وتبرّده وتسمّی هذه الحرکة استحالة ایضاً لانتقال الجسم من حال الی حال »، کیف میں حرکت سے مراد جسم کی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تدریجی تبدیلی ہے، وہ بھی اس طرح کہ صورت نوعیہ باقی رہ جائے جیسے پانی کا ٹھنڈا اور گرم ہونا اس حرکت (کیف میں حرکت) کو استحالہ بھی کہتے ہیں اس لئے کہ جسم اس صورت میں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے۔

۲۔ « الحرکة فی الکم هی الانتقال من کمیة الی کمیة اُخری تدریجاً کالنمو والذبول» کم اور مقدار میں حرکت سے مراد جسم کا ایک مقدار سے دوسری مقدار میں تدریجاً تبدیل ہونا ہے جیسے کسی چیز میں نمو یا پژمردگی کا پیدا ہو جانا۔ نمو اور پژمردگی کے علاوہ بھی دو چیزیں ہیں جو حرکت کمی کی صف میں آتی ہیں انکو تخلخل اور تکاثف کہتے ہیں۔ تخلخل یعنی اجزاء جسم کا جدا ہو جانا ـــــ تکاثف یعنی اجزاء جسم کا آپس میں مل جانا یہ دونوں بھی حرکت کم میں داخل ہیں۔

۴۔ « الحرکة فی الوضع هی انتقال الجسم من هیئة وضعیة الی اخری علی سبیل التدریج کما اذا کان للجسم حرکة علی الاستدارة وکما ان القائم اذا قعد فانه ینتقل من وضع الی آخره »، ـــــ وضع میں حرکت کا مطلب جسم کی تدریجی تبدیلی ہے جب جسم ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں بدل جائے تو یہ حرکت وضع ہے جیسے افلاک کی حرکت مستدیرہ ـــــ یا کھڑے ہونے کی ہیت سے بیٹھنے کی ہیت میں آجانا۔

۵۔ « الحرکة فی الاین هی انتقال الجسم من این الی این علی سبیل التدریج او هی انتقال الجسم من مکان الی مکان آخر وهذا هو الذی یطلق علیه الحرکة فی العرف العام »،
حرکت اینی وہی حرکت ہے جسکو عرف عام میں حرکت کہا جاتا ہے، اس حرکت میں جسم ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

جناب سید علی خامنہ ای
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد

سید سجادؑ کے لئے طریقہ کار کیا تھا؟

اپنے مقصد تک رسائی کے لئے امامؑ نے اپنے دوش پر تین ذمہ داریاں محسوس کیں:۔

۱۔ پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ امام لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کرائیں۔ اگر اسلامی حکومت تشکیل کرنا چاہیں تو یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ عوام کے اندر دینی تعلیمات سے آشنائی پیدا نہ ہو جائے بغیر اس کے اس طرح کی حکومت کی امید ہی فضول ہے لہذا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو دینی تعلیمات سے مزین کیا جائے۔

۲۔ دوسری ذمہ داری یہ تھی کہ خاص طور سے مسئلہ امامت، جس کو ایک مہجور و متروک مسئلہ کی نوعیت دے کر لوگوں کے ذہنوں سے دور کر دیا گیا تھا یا اس کو غلط معنی پہنا کر پیش کیا جانے لگا تھا اس کی حقیقت کی وضاحت کر کے لوگوں کے ذہنوں کی صفائی کی جائے یعنی یہ بتایا جائے کہ امامت کا کیا مفہوم ہے؟ کون امام ہو سکتا ہے؟ امام ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں؟ کیوں کہ بہر حال معاشرہ میں امامت کا دعویدار موجود تھا اور وہ عبدالملک ابن مروان تھا جسکو لوگ اپنا امام تصور کرتے تھے اسلامی معاشرہ کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی ــــ بعد میں ہم امام کی بحث میں عرض کریں گے کہ امامت کا وہ تصور جو ادھر چند آخری صدیوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے اس تصور سے قطعی مختلف ہے جو صدر اسلام میں رائج تھا دراصل اس زمانہ میں ائمہ علیہم السلام کے موافقین و مخالفین سب اس کا وہی مفہوم لیتے تھے جو آج جمہوریہ اسلامی ایران میں سمجھا جا رہا ہے: امام امت، رہبر ملت یعنی حاکم دین و دنیا ادھر آخری دو تین صدیوں میں ہمارا تصور امام مسئلہ میں کچھ اور ہی ہو چکا تھا ــــ ہم سمجھ بیٹھے تھے کہ معاشرے میں ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو عوام سے ٹیکس وصول کرتا ہے عوام کو محاذ جنگ کے لئے آمادہ کرتا ہے ان کو صلح کی دعوت دیتا ہے ان کے مسائل کا ذمہ دار و نگراں ہوتا ہے حکومتی ادارے درست کرتا ہے گویا حکومت

کی تشکیل اس کا نظم و نسق سب کچھ اسکے ہاتھ میں ہے اور اسکو حاکم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص اور ہوتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ لوگوں کی آخرت سنوارے عقائد میں درستی پیدا کرے لوگوں کی نماز اور قرأت ٹھیک کرے یا اس طرح کے دوسرے امور (جسکے اندر جیسی ہمت و صلاحیت ہو) انجام دیتا رہے اور اس کا نام عالم رکھ دیا گیا۔

امام کو بھی اپنے زمانہ میں تقریباً وہی حیثیت حاصل تھی جو بعد کی صدیوں میں عالم کی رہی ہے خلیفہ اپنے کام انجام دیتا ہے وہ بھی لوگوں کے دین اور اخلاق درست کرتا ہے ادھر صدیوں سے امام کے بارہ میں ہمارا یہی تصور رہا ہے جبکہ صدر اسلام میں امام کے متعلق اس سے قطعی مختلف تصور پایا جاتا تھا امام کو اسلامی معاشرہ کا قائد اور دین و دنیا کا حاکم سمجھا جاتا تھا خلفائے بنی امیہ اسی بات کے مدعی تھے، بنی عباس بھی اسی طرح کے منصب کا ادعا کرتے تھے شراب کے نشہ میں چور دنیا بھر کے لہو و لعب میں ڈوب کر اسی قسم کی امامت کے دعویدار بنے بیٹھے تھے وہ خود کو امام سمجھتے تھے چنانچہ اگر موقع ملا تو اس سلسلہ میں بھی گفتگو آئے گی ــــ اس وقت تو صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ اسلامی معاشرہ امام سے خالی نہیں تھا عبدالملک امام بنا ہوا تھا ــ اور جناب سید سجادؑ کے سامنے یہی مسئلہ تھا کہ لوگوں کو کیسے امامت کے صحیح معنی، جہت و مقصد اور شرائط تعلیم دیئے جائیں آپ کی ذمہ داری، عوام کے سامنے ان چیزوں کی نشان دہی کرنا تھا جو امامت کے لئے ناگزیر و ضروری ہیں وہ چیزیں جس کے بغیر کسی شخص کا امام ہونا ممکن نہیں ہے امام علیہ السلام کو ان تمام باتوں کی تشریح و توضیح کرنی تھی۔

۳۔ تیسری اور آخری منزل یہ تھی کہ امام لوگوں کو بتائیں کہ میں امام ہوں، یعنی وہ شخص جو ان خصوصیات کا حامل ہے، میں ہوں۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے سامنے یہ تین امور تھے جنھیں آپ کو انجام دینا تھا چنانچہ امامؑ کی بیشتر ین جد و جہد پہلے مسئلہ پر مرکوز رہی کیونکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ابھی آپ کے دور کا ماحول "میں امام ہوں" سننے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے امام کو لوگوں کے دین کی اصلاح کرنی تھی انہیں اخلاق اسلامی سے سنوارنا تھا لوگوں کو فسق و فساد کے گڑھوں سے باہر نکالنا تھا معاشرہ میں روحانیت و معنویت جو دین کا لب لباب اور اصل روح ہے دوبارہ زندہ کرنی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں امام اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت زہد کی نہ صرف قولی بلکہ عملی تعلیم میں صرف کرتے ہیں زہد اور خالص زہد حتی کہ اپنی ایک سیاسی مہم سے متعلق گفتگو کا آغاز بھی ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"ان علامة الزاهدين في الدنيا الراغبين عنها في الآخرة....."

یا اپنے ایک مختصر سے پیغام میں دنیا اور اس کی مادی ترک بھڑک جو اچھے اچھوں کا دل اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں :-

"اولاحر يدع هذه اللماظة لاهلها فليس لانفسكم ثمن الا الجنة الا فلا تبيعوها بغيرها -"

امام کے بیشتر کلمات زہد کے آئینہ دار اور اسلامی تعلیمات و معارف کے مظہر ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ ان معارف کو آپ نے دعا کا جامہ پہنا دیا ہے کیونکہ ہم عرض کر چکے ہیں اس وقت کا گھٹن کا ماحول اور نامساعد حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ امام سید سجادؑ عوام الناس سے کھل کر صاف لفظوں میں رابطہ قائم کر سکیں نہ صرف یہ کہ حکومت کے ایجنٹ اس سلسلہ میں رکاوٹ تھے بلکہ عوام بھی اس کے لئے تیار نہ تھے - اصل میں موجودہ معاشرہ تباہی اور بربادی کی آخری ڈگر پر پہنچ چکا تھا اور اس کی نئے سرے سے تعمیر و اصلاح ضروری تھی - امام کی زندگی کے ۳۴ - ۳۵ سال (۶۱ھ سے ۹۵ھ تک) اسی کوشش میں صرف ہو گئے چنانچہ آپ کی جدوجہد رائگاں نہیں گئی دھیرے دھیرے حالات سدھر رہے تھے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی اسی حدیث میں جہاں یہ فرمایا تھا کہ "ارتد الناس بعد الحسین" آگے بڑھ کر آپ فرماتے ہیں :-

"ثم ان الناس لحقوا وكثروا"

یعنی پھر لوگ (اہلبیتؑ سے) ملحق ہوتے گئے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی اور یہی حقیقت بھی ہے چنانچہ جب امام محمد باقر علیہ السلام کا زمانہ آتا ہے (جسکی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی) حالات بدل چکے ہوتے ہیں اور سید سجادؑ کی ۳۵ سال کی زحمتوں کا ہی نتیجہ ہے -

افراد کی تربیت -

امام علیہ السلام کے کلمات میں کچھ خاص افراد کی تربیت اور اعوان و انصار کی فراہمی پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے - صاحب تحف العقول نے اپنی کتاب میں امامؑ کے چند طویل بیانات نقل کئے ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں اس طرح کے نمونے دوسری کتابوں میں بھی تلاش کرنے کے لئے وقت نہ نکال سکا

ممکن ہے کہیں مل جائے ویسے میرا گمان یہی کہتا ہے کہ ملنا مشکل ہے اور ہوئے بھی تو زیادہ نہ ہوں گے البتہ چھوٹے چھوٹے فقرے کافی مل جائیں گے۔ ایسی طویل اور مفصل حدیثیں جن کو صاحب تحف العقول نے امام سجادؑ سے نقل کیا ہے اور جن کی تعداد دو تین تک پہونچتی ہے میں نہیں سمجھتا کہ کہیں اور مل سکے گی۔
ان احادیث کا لب ولہجہ اور انداز خطابت خود اس بات کی نشاندہی کر دیتا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کیا کام انجام دے رہے تھے، ان میں سے ایک حدیث یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے مخاطب عوام ہیں چنانچہ اس کا آغاز "ایھا الناس" (اے لوگو!) سے ہوا ہے اور اس میں لوگوں کو معارف اسلامی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے اس مفصل حدیث میں حضرت فرماتے ہیں کہ جب انسان کو قبر کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو اس سے اس کے رب کے بارہ میں سوال ہوتا ہے۔ اس کے پیغمبرؐ کے بارہ میں سوال ہوتا ہے، اس کے دین کے بارہ میں سوال ہوتا ہے اس کے امام کے بارہ میں سوال ہوتا ہے۔ دراصل امام علیہ السلام کا یہ ہلکا پھلکا طرز تخاطب اپنے حلقۂ تبلیغ میں آنے والے عوام کے لئے ہے۔ لیکن ایک دوسری حدیث اس سے بالکل مختلف افراد میں شروع ہوتی ہے اور اس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مخصوص افراد سے تعلق رکھتی ہے چنانچہ وہ ان الفاظ میں شروع ہوئی ہے: "کفانا اللہ و ایاکم کید الظالمین وبغی الحاسدین و بطش الجبارین لایفتننکم الطواغیت
یہ لب ولہجہ عام لوگوں سے مربوط نہیں ہو سکتا ہے اس کے مخاطب کچھ مخصوص افراد ہیں۔
ایک تیسری نوعیت کا بھی کلام ہے جس کے مطالب کے بعض حصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخصوص ترین و برگزیدہ ترین اشخاص سے متعلق ہے ایسا لگتا ہے کہ اس کے مخاطب وہی افراد ہیں جو امام کے اسرار و رموز و اہداف و مقاصد سے آگاہی رکھتے تھے اور جن کا جناب سید سجادؑ کے محرمان راز میں شمار ہوتا تھا چنانچہ اپنے ان ہی مخصوص دوستوں سے خطاب فرماتے ہوئے امام علیہ السلام کہتے ہیں:۔

ان علامة الزاھدین فی الدنیا الراغبین عنھا فی الآخرۃ ترکھم کل خلیط وخلیل ورفضھم کل صاحب لا یرید ما یریدون"

ان تمام کلمات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امام نے اس طویل مدت میں یا تو ادوار کے اختلاف کے ساتھ یا مخاطبین کی صلاحیت کے اعتبار سے تعلیمات کے دو تین مرحلے یا انداز رکھے ہیں کبھی اس انداز میں گفتگو کرتے ہیں کبھی اس انداز میں کبھی حکومت کی مشینری اور وقت کے طاغوتوں

رہ بس اظہار رائے فرماتے ہیں اور کبھی محض دین اسلام کے کلی و بنیادی مسائل بیان کرنے پر اکتفا کر دیتے ہیں:
یہ حضرت امام سجادؑ کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت اپنی عمر کے آخری ۲۵ برسوں
ں آہستہ آہستہ ایسے تاریک و ظلمت زدہ ماحول کے مارے ہوئے افراد کو ایک طرف تو حیوانی شہوات کے
نگل سے نجات دلاتے ہیں، دوسری طرف ظلم و جبر کے تسلط اور دربار سے وابستہ علمائے سوء کی کمندوں سے
زادی عطا کرتے ہیں چنانچہ مجموعی طور پر ایک ایسی صالح اور مخلص مومنین کی جماعت آمادہ و تیار کر دیتے ہیں جو مستقبل
ں ذمہ داریوں کو اپنے دوش پر سنبھال سکے۔ امام چہارم کی زندگی کی جزئیات سے بحث کے لئے مستقل
ور پر کئی گھنٹے درکار ہیں اور میں گھنٹوں اس موضوع پر گفتگو کر بھی چکا ہوں لہٰذا اس وقت اس سے
زیادہ بحث کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

امام باقرؑ کا عہد۔

اب ہمارے پانچویں امام محمد باقر علیہ السلام کا دور آتا ہے حضرت کی زندگی بھی امام چہارم کے خطوط
پر ہی کاربند نظر آتی ہے جناب سید سجادؑ نے اپنا کام جس منزل پر چھوڑا تھا آپ اسی کام کو مزید آگے بڑھاتے
ہیں فرق اتنا ہے کہ اب نسبتاً حالات کچھ بہتر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ امام باقرؑ بھی معارف اسلامی اور تعلیمات
محمدیؐ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور چونکہ اب لوگ خاندان پیغمبرؐ کی طرف سے پہلے جیسی بے اعتنائی
و سرد مہری نہیں برتتے لہٰذا جب امام وارد مسجد ہوتے ہیں کچھ لوگ ان کے ارد گرد حلقہ کر کے بیٹھ
جاتے ہیں اور آپ کے وجود ذی جود سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ
میں نے امام باقر علیہ السلام کو مسجد مدینہ میں اس عالم میں دیکھا کہ " وحولہ اھل خراسان
وغیرھم" خراسان نیز دیگر دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد آپ کے چاروں طرف جمع تھے
اس سے پتہ چلتا ہے کہ تبلیغات کا اثر اب کسی موج کی مانند پوری اسلامی دنیا میں پھیلاؤ پیدا کر رہا تھا۔
دور دور کے لوگ اہلبیتؑ سے نزدیک ہو رہے تھے۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں:۔
احتوشہ اھل خراسان" یعنی اہل خراسان آپ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور حضرت
ان لوگوں سے حلال و حرام سے متعلق مسائل بیان فرماتے رہتے تھے۔ اس وقت کے بڑے بڑے
علماء آپ کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے۔ عکرمہ جیسی مشہور و معروف شخصیت جو ابن عباس کی شاگردوں

میں سے بھی جس وقت امام کی خدمت میں پہونچی تاکہ آپ سے حدیث سنے (اور شاید امام کا امتحان لینا بھی مقصود رہا ہو!) تو ہاتھ پاؤں میں ایک تھرتھری سی پڑ گئی اور بے تحاشہ طور پر خود کو امام کی آغوش میں گرا دیا۔ بعد میں اپنی حالت پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے عکرمہ کہتے ہیں: میں نے ابن عباس جیسے بزرگ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے حدیث بھی سنی مگر اے فرزند رسولؐ! آپ کی خدمت میں پہونچکر میری جو کیفیت ہوئی اس حالت سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ آپ ملاحظہ فرمائیں جواب میں حضرتؑ کتنی وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

ویحک یا عبید اھل الشام انك بین یدی بیوت اذن اللہ ان ترفع و یذکر فیھا اسمہ۔

اے حکومت شام کے بندۂ بے دام! اس وقت تو ایک معنوی عظمت کے روبرو کھڑا ہے یہی وجہ ہے کہ تیرے ہاتھ پاؤں تیرے قابو میں نہیں ہیں۔

امام کی خدمت میں ابو حنیفہ جیسی شخصیت، جن کا اپنے دور کے صاحب نظر فقہا میں شمار ہوتا ہے، احکام دین اور معارف اسلام کی تحصیل کے لئے حاضری دیتی نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے بڑے بڑے علماء کے نام حضرت کے شاگردوں کی طویل فہرست میں نظر آتے ہیں۔ حضرتؑ کا علمی شہرہ اطراف واکناف عالم تک پہنچ چکا تھا اسی وجہ سے آپؑ باقر العلومؑ کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ معاشرے کی حالت اور لوگوں کے دلوں میں ائمہ علیہم السلام کے تئیں احترام و محبت کا جذبہ امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں اس حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی مناسبت سے امامؑ کی سیاسی جدوجہد میں بھی تیزی نظر آتی ہے یعنی جناب سید سجادؑ عبد الملک بن مروان کے مقابلہ میں کبھی کوئی سخت اور درشت لب ولہجہ اپنانا بھی چاہتے تو اس وقت کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اگر عبد الملک سید سجادؑ کو کسی موضوع پر خط لکھتا ہے اور حضرتؑ اس کا جواب دیتے ہیں تو اگرچہ فرزند نبیؐ کا جواب ہمیشہ ہر رخ سے محکم و متین اور دنداں شکن ہوتا ہے پھر بھی اس میں کوئی صریحی مخالفت اور تعرض کا انداز نہیں نظر آتا۔ لیکن امام محمد باقر علیہ السلام کا مسئلہ دوسرے ہی انداز کا ہے آپ کی جدوجہد کا طریقہ کار اتنا واضح ہے کہ اسے دیکھ کر ہشام بن عبد الملک خوف وہراس کا احساس کرتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امام پر نظر رکھنا ضروری ہے چنانچہ وہ

آپ کو شام لے جایا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سید سجاد کو بھی آپ کی امامت کے دوران (حادثۂ کربلا اور اسیری اہل حرم کے بعد دوبارہ) قید کرکے پابہ زنجیر شام لے جایا گیا ہے لیکن وہ دوسری نوعیت تھی اور سید سجاد ہمیشہ بڑے ہی احتیاط کے ساتھ اقدامات کیا کرتے تھے جبکہ امام محمد باقر علیہ السلام کی گفتگو کا لہجہ سخت تر نظر آتا ہے۔ یہی چند روایتیں دیکھی ہیں جن میں امام باقرؑ اپنے اصحاب سے مذاکرہ فرماتے ہوئے ان کو حکومت و خلافت اور امامت و رہبری کی دعوت ہی نہیں بلکہ مستقبل قریب میں اس کے قیام کی خوشخبری دیتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک روایت بحار میں اس مضمون کے ساتھ نقل کی گئی ہے :-

حضرت ابی جعفر (امام باقرؑ) کا بیت الشرف جمعیت سے پر ہے ایک بوڑھا شخص عصا پر تکیہ کئے ہوئے آتا ہے اور سلام و اظہار محبت کے بعد حضرت کے بغل میں بیٹھ جاتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے : فو اللہ انی لاحبکم واحب من یحبکم فو اللہ ما احبکم واحب من یحبکم لطمع فی دنیا وانی لابغض عدوکم وابرء منہ فو اللہ ما ابغضہ وابرء منہ لوتر کانت بینی وبینہ واللہ انی لاحل حلالکم واحرم حرامکم و انتظر امرکم فھل ترجولی جعلنی اللہ فداک۔

خدا کی قسم میں آپ کو دوست رکھتا ہوں اور اس کو بھی دوست رکھتا ہوں جو آپ کو دوست رکھتا ہے اور خدا کی قسم یہ دوستی دنیاوی مفادات کی لالچ کی خاطر نہیں ہے۔ اور بے شک میں آپ کے دشمنوں سے بغض رکھتا ہوں اور ان سے برائت چاہتا ہوں اور خدا کی قسم یہ دشمنی ان سے ذاتی عداوت یا بدلہ کے باعث نہیں ہے، خدا کی قسم میں نے اس شئے کو حلال سمجھا ہے جس کو آپ نے حلال قرار دیا اور اس کو حرام سمجھا ہے جس کو آپ نے حرام قرار دیدیا ہے میں آپ کے امر کا منتظر ہوں پس میں آپ پر فدا ہو جاؤں کیا آپ کی کامیابی کے دن میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

اس روایت میں آخری جملہ غور طلب ہے، آنے والا امامؑ سے سوال کرتا ہے کہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی کامیابی کے دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا ؟ کیونکہ میں آپ کے امر، یعنی آپ کی حکومت کے دیکھنے کا منتظر ہوں۔ اس دور میں "امر" یا "ہذا الامر" یا "امرکم" کی تعبیر حکومت کے معنی میں ہے۔ اس طرح کی تعبیریں کیا ائمہ اور ان کے اصحاب اور کیا ان کے مخالفین ہر ایک کے درمیان ان ہی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ مامون رشید سے گفتگو کرتے ہوئے ہارون کہتا ہے :-

"واللہ لو تنازعت معی فی ھذا الامر"

ظاہر ہے یہاں "ھٰذا الامر" سے خلافت و امامت ہی مراد ہے۔ لھٰذا انتظار امر کا مطلب امام کی حکومت و خلافت کا انتظار ہے۔ بہر حال وہ شخص سوال کرتا ہے کہ مولا! کیا آپ کو امید ہے کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا اور آپ کی حکومت اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا؟

"فقال ابو جعفرؑ : الیّ الیّ حتیٰ اقعدہ علیٰ جنبہ" امامؑ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور اپنے بغل میں جگہ عنایت فرمائی ۔ "ثم قال: ایھا الشیخ ان علی بن الحسینؑ اتاہ رجل فسالہ عن مثل الذی سئلتنی عنہ" یعنی امامؑ فرماتے ہیں بعینہ یہی سوال امام زین العابدینؑ سے بھی کیا گیا تھا۔ البتہ مجھے سید سجادؑ سے مروی روایتوں میں اس طرح کی عبارت نہ مل سکی۔ چنانچہ اگر سید سجادؑ کے سامنے بھی اس قسم کی گفتگو مجمع عام میں ہوئی ہوتی تو دوسرے بھی اس سے واقف ہوتے اور بات ہم تک بھی ضرور پہونچتی لھٰذا گمان غالب یہ ہے کہ امام سجادؑ نے جو بات پردۂ راز میں رکھتے ہوئے فرمائی ہے۔ یہاں امام محمد باقر علیہ السلام نے وہی بات علی الاعلان ارشاد فرمائی ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:۔

"ان تمت ترد علیٰ رسول اللّٰہ وعلیٰ علی والحسن والحسین وعلیٰ علی بن الحسین ویثلج قلبک ویبرد فؤادک وتقرّ عینک وتستقبل الروح والریحان مع الکرام الکاتبین وان تعش تری ما یقرّ اللّٰہ بہ عینک وتکون معنا فی السنام الاعلیٰ۔"

امامؑ اپنے اس صحابی کو مایوس نہیں کرتے فرماتے ہیں: اگر موت آگئی تو پیغمبر اسلام اور اولیاء کرام کی معیت سے شرفیاب ہوگے اور اگر زندہ رہے تو ہمارے ساتھ رہوگے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے کلام میں اس طرح کی تعبیرات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام اپنے شیعوں کو مستقبل کے بارہ میں امید رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسری روایت جو کافی میں نقل کی گئی ہے وقت قیام کی بھی نشاندہی کرتی ہے اور بظاہر یہ چیز بڑی عجیب سی لگتی ہے:۔

"عن ابی حمزۃ الثمالی بسند عالٍ" قال سمعت ابا جعفر (ع) یقول: یا ثابت، ان اللّٰہ تبارک وتعالیٰ قد وقّت ھٰذا الامر

فی السبعین فلما ان قتل الحسین (ع) اشتد غضب اللہ تعالیٰ علی اهل الارض فاخره الی اربعین و مائة وحدثناکم فاذعتم الحدیث فکشفتم قناع الستر ولم یجعل اللہ له بعد ذالک وقتاً عندنا. و یمحوا اللہ مایشاء و یثبت و عنده ام الکتاب۔"

ابو حمزہ ثمالی امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

خداوند عالم نے ۷۰ھ حکومت علوی کی تشکیل کے لئے مقدر فرمایا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام کے قتل نے خداوند عالم کو لوگوں کی طرف سے اتنا خشمگیں کر دیا کہ اس نے اس وقت کو ۱۴۰ھ تک ملتوی کر دیا پھر ہم نے تم کو اس وقت کی خبر دی اور تم نے اس کو افشا کر دیا اور پردۂ راز میں نہ رکھ سکے لہٰذا اب پروردگار عالم نے ہم کو اس وقت کی کوئی خبر نہیں دی ہے خدا کسی بھی چیز کے بارہ میں جیسا چاہتا ہے محو یا اثبات کر دیتا ہے دفتر تقدیر اسی کے پاس ہے۔

ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں:۔

"فحدثت بذالک ابا عبد اللہ (ع) فقال قد کان کذالک"

میں نے امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا: ہاں ایسا ہی تھا۔

۱۴۰ھ امام صادق علیہ السلام کی زندگی کا آخری دور ہے اور یہ وہی چیز ہے جو اس حدیث مبارکہ کے دیکھنے سے قبل ہی ائمہ علیہم السلام کے حالات زندگی سے میں نے ماخوذ کر لی تھی چنانچہ میری نظر میں وہ ممکنہ حکومت جس کے لئے امام سجادؑ نے اس انداز سے اور امام محمد باقرؑ نے اس انداز سے جد و جہد کی اصولی طور پر امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں قائم ہو جانی چاہئے تھی کیونکہ امام صادقؑ کی شہادت ۱۴۸ھ میں ہوئی ہے اور خدا کی طرف سے تاسیس حکومت کا وعدہ ۱۴۰ھ کے لئے تھا اور ۱۴۰ھ کی اہمیت ۱۳۵ھ کے بعد کے دنوں کی اہمیت کے ذیل میں پیش کئے گئے ہمارے معروضہ سے ظاہر ہے، یعنی یہی وہ وقت ہے جب عباسی خلیفہ منصور بر سر اقتدار آیا ہے۔ اگر منصور بر سر اقتدار نہ آتا اور بنو عباس کا حادثہ تاریخ میں رونما نہ ہوتا تو حالات یقیناً کچھ اور ہوتے۔ گویا حالات کے تحت تقدیر الٰہی یہی تھی کہ ۱۴۰ھ میں ایک الٰہی اسلامی حکومت قائم ہو جانی چاہئے تھی اب یہ ایک دوسری

بحث ہے کہ آیا اس آمد کے سلسلہ میں خود ائمہ علیہم السلام کی بھی توقعات بندھی ہوئی تھیں اور وہ اس دن کے منتظر تھے یا کہ وہ پہلے سے جانتے تھے کہ قضاء الٰہی کچھ اور ہی ہوگی ؟ فی الحال ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے ممکن ہے ایک مستقل موضوع کے تحت اس پر بحث کی جائے۔

ابھی تو ہماری بحث امام محمد باقر علیہ السلام کے حالات کے سلسلہ میں ہے کہ آپ واضح الفاظ میں تصریح کر دیتے ہیں کہ سنہ ۱۴۰ھ نظام الٰہی کی تشکیل کے لئے معین تھا لیکن چونکہ ہم نے اس کی تم کو خبر دے دی اور تم اس کو پردۂ راز میں نہ رکھ سکے لہٰذا خداوند عالم نے اس میں تاخیر کر دی ۔ اس طرح کی امید بندھانا اور وعدے کرنا امام محمد باقرؑ کے دور کا اہم امتیاز ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے سلسلہ میں بھی گھنٹوں بحث کئے جانے کی ضرورت ہے تاکہ آپ کی زندگی کے مختلف گوشے اجاگر کئے جا سکیں میں اس سلسلہ میں بھی طولانی بحثیں کر چکا ہوں مختصر یہ کہ حضرت کی زندگی میں سیاسی جدوجہد کے عنصر بالکل واضح ہیں اگرچہ آپ مسلحانہ مبارزہ کے حق میں نظر نہیں آتے ۔ چنانچہ آپ کے بھائی زید ابن علی جب آپ سے مشورہ کرتے ہیں تو حضرتؑ فرماتے ہیں: "قیام نہ کرو" اور جناب زید آپ کی اطاعت کرتے ہوئے خاموش ہو جاتے ہیں ـــــ اور یہ جو دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ لوگ جناب زید کی اہانت پر اتر آتے ہیں کہ امامؑ نے قیام سے منع کیا تھا پھر بھی جناب زید اٹھ کھڑے ہوئے اور امام کی اطاعت نہیں کی یہ ایک غلط تصور ہے ۔ امام باقر علیہ السلام کے منع کرنے کے بعد جناب زید نے امام کی اطاعت کی اور قیام نہ کیا اور جب امام صادق علیہ السلام کا دور آیا تو انھوں نے دوبارہ امام صادقؑ سے مشورہ کیا ۔ امام نے قیام سے منع نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی بھی کی یہی وجہ ہے کہ جناب زید کی شہادت کے بعد بھی امام صادقؑ آرزو کرتے ہیں کہ کاش میں بھی زید کے ساتھیوں میں ہوتا ۔ لہٰذا کسی بھی طرح جناب زید کے ساتھ یہ اہانت آمیز برتاؤ درست نہیں ہے۔

بہرحال ، امام محمد باقر علیہ السلام نے مسلحانہ قیام قبول نہ کیا لیکن آپ کی زندگی میں سیاسی مبارزہ واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ اور آپ کی سیرت کا مطالعہ کرتے وقت بخوبی اس کا احساس کیا جا سکتا ہے جبکہ سید سجادؑ کی زندگی میں سیاسی مبارزہ اس صراحت کے ساتھ نظر نہیں آتا ۔

جب اس عظیم ہستی کا دور حیات آخری منزلوں پر پہونچنے لگتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ اپنے سیاسی مبارزہ کو میدان منیٰ میں عمومی عزاداری کا رنگ دیکر جاری رکھنے میں آپ وصیت کرتے ہیں

کہ دس برس تک منیٰ میں سوگ کے طور پر آپ پر گریہ کیا جائے (تندبنی النوادب بمنیٰ عشر سنین) یہ دراصل اسی سیاسی جدوجہد کے جاری رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ امام محمدؑ باقر پر گریہ کیا جانا اور وہ بھی منیٰ میں آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ائمہ علیہم السلام کی زندگانی میں عام طور پر امام حسین علیہ السلام پر گریہ کے سلسلہ میں ضرور حکم ملتا ہے۔ چنانچہ اس ذیل میں یقینی روایات موجود ہیں لیکن اور کسی کے سلسلہ میں مجھے یاد نہیں کہ اس طرح کا حکم دیا گیا ہو، الّا یہ کہ امام رضا علیہ السلام کے بارہ میں اتنا ملتا ہے کہ آپ جب وطن سے رخصت ہونے لگے تو اپنے اہل خاندان کو جمع کیا تا کہ آپ پر گریہ کریں اور یہ اقدام مکمل طور پر سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ امام کی رحلت سے قبل کا واقعہ ہے۔ امام حسینؑ کے بعد یہ محض امام محمد باقر علیہ السلام کے سلسلہ میں شہادت کے بعد اس طرح کے گریہ کا حکم نظر آتا ہے امام وصیت کرتے ہیں اور آٹھ سو درہم اپنے پاس سے دیتے ہیں کہ یہ کام منیٰ میں انجام دیا جائے۔ منیٰ، عرفات و مشعر بلکہ خود مکہ سے بھی فرق رکھتا ہے۔

مکہ میں حاجی متفرق رہتے ہیں ہر شخص اپنے اپنے کام میں مشغول رہتا ہے عرفات کا قیام زیادہ سے زیادہ صبح سے عصر تک رہتا ہے صبح جب لوگ پہونچتے ہیں تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور عصر کے وقت واپسی کی جلدی رہتی ہے تا کہ اپنے کام انجام دے سکیں۔ مشعر میں شب کے وقت چند گھنٹوں کا قیام رہتا ہے۔ منیٰ جاتے ہوئے اس کی ایک گزرگاہ کی حیثیت ہے لیکن منیٰ میں مسلسل طور پر تین راتیں گذارنی ہوتی ہیں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس درمیان اپنے دن مکہ میں اور راتیں منیٰ میں گزارتے ہوں۔ زیادہ تر لوگ وہیں ٹھہرتے ہیں خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ وسائل سفر بھی آسانی سے مہیا نہ ہوتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد تین شبانہ روز ایک ہی جگہ جمع رہتے تھے ہر شخص بآسانی درک کر سکتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ تبلیغات کے لئے نہیں مل سکتی جو پیغام بھی پورے عالم اسلام میں پہونچانا مقصود ہو یہاں سے بخوبی نشر کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایک ایسے دور میں جبکہ آج کی طرح ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار یا اسی طرح کے دوسرے وسائل ابلاغ موجود نہ تھے۔ جب کچھ لوگ اولاد پیغمبرؐ میں سے ایک فرد پر گریہ وزاری کرتے نظر آتے، اصولی طور پر لوگوں کے دلوں میں سوال اٹھتا کہ ان لوگوں کی اشک ریزی کا کیا سبب ہے؟ ہر ایک مرنے والے پر اتنی مدت تک اس شدت کے ساتھ گریہ وزاری

نہیں ہوتی مگر یہ کہ اس پر ظلم ہوا ہو یا اس کو ظالموں نے قتل کیا ہو؟ کس نے آل محمدؐ پر ظلم کیا؟ ان پر کیوں ظلم کیا گیا؟ اس طرح کے بے پناہ سوالات پیدا ہوتے اور یہ وہی سیاسی جدوجہد ہے جس کا بہت ہی دقیق طور پر اندازہ کرتے ہوئے امام کی طرف سے حکم دیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ کی طرف میری توجہ مبذول ہوئی وہ یہ کہ اپنی خلافت کے حق میں استدلال کا جو طریقہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں اہلبیت علیہم السلام کی زبان پر جاری رہا ہے امام علیہ السلام بھی اسی کی تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ طریقۂ استدلال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے عرب ہونے کی بنیاد پر عرب عجم پر فخر کرتے ہیں۔ قریش، غیر قریش پر فخر کرتے ہیں۔ اگر ان کا فخر کرنا صحیح ہے تو ہم تو پیغمبرؐ کے خاندان اور اولاد سے ہیں لہٰذا سب پر اولویت رکھتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم کو اس حق سے محروم کر کے دوسرے اپنے آپ کو پیغمبر کی حکومت کا وارث قرار دیئے بیٹھے ہیں اگر پیغمبر کی قربت قریش کو غیر قریش پر اور عرب کو غیر عرب پر ممتاز و مفتخر قرار دیتی ہے تو یہ دوسروں پر ہماری برتری اور اولویت کو بھی ثابت کرتی ہے۔ یہ وہ استدلال ہے جو ابتدائی دور میں بارہا اہلبیت علیہم السلام کی زبان پر جا بجا جاری ہوا ہے اور اب دوبارہ ۹۵ھ سے ۱۱۴ھ کے درمیان امام محمد باقرؑ اپنے عہد امامت میں ان کلمات کی تکرار فرماتے ہیں اور اپنی خلافت کے لئے اس طور پر استدلال کرنا بڑی معنویت رکھتا ہے۔

اب امام صادقؑ کا دور آتا ہے:۔

۱۱۴ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد صادق اہلبیت طہارت امام جعفر صادقؑ مسند امامت پر متمکن ہوتے ہیں اور ۱۴۸ھ تک (تاحیات) اس سیاسی جدوجہد کو جاری رکھتے ہیں البتہ وقت اور حالات کے اعتبار سے آپ کے دور کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا مرحلہ: ۱۱۴ھ تا ۱۳۲ھ یا ۱۳۵ھ یعنی تا غلبۂ بنی عباس یا تا خلافت منصور دوانقی

دوسرا مرحلہ: ۱۳۵ھ تا ۱۴۸ھ یعنی تا آخر لمحۂ حیات۔

پہلا دور نسبتاً اطمینان و سکون کا دور کہا جا سکتا ہے دراصل یہی وہ دور ہے جس کے بارہ میں مشہور ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے درمیان نزاع و چپقلش کی وجہ سے ائمہ علیہم السلام کو اس بات کا موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ معارف تشیع کھل کر بیان کر سکیں اور یہ اسی دور سے مخصوص ہے

چونکہ امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں یہ صورت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ اس وقت بنو امیہ پورے اقتدار میں تھے اور ہشام بن عبدالملک کی حکومت تھی جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں: "وکان هشام جلجم" چنانچہ شاہان بنو امیہ میں عبدالملک بن مروان کے بعد طاقتور ترین شخصیت ہشام بن عبدالملک کی ہی گزری ہے لہٰذا امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں کسی کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا اختلاف و تنازعہ بظاہر رونما نہیں ہوا کہ اس کا ائمہ علیہم السلام فائدہ اٹھا کر اپنی سیاسی سرگرمی کو تیز تر کرسکتے تمام داخلی جنگیں اور سیاسی اختلافات امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور سے مخصوص ہیں اور وہ بھی اس ابتدائی دور سے جب آہستہ آہستہ بنو عباس کی سرگرمی تیز تر ہوتی ہے اور ان کی دعوت میں پھیلاؤ پیدا ہونا شروع ہوتا ہے اور دوسری طرف علوی شیعوں کی دعوت بھی پوری اسلامی دنیا میں اس اوج پر نظر آتی ہے۔ فی الحال اس کی تشریح کا موقع نہیں ہے۔

جس وقت امام صادق علیہ السلام مسند امامت پر متمکن ہوتے ہیں پوری اسلامی دنیا — افریقہ، خراسان، فارس، ماوراءالنہر — غرض یہ کہ مختلف اسلامی علاقوں میں جنگ اور مقابلہ آرائی کا بازار گرم تھا بنو امیہ کی حکومت شدید مشکلات سے دوچار تھی امام علیہ السلام نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی تبلیغ کے لئے وہی تین نقطے، جن کا سید سجاد کی زندگی کے ذیل میں اشارہ کیا جاچکا ہے، محور و مرکز قرار دیئے یعنی معارف اسلامی، مسئلہ امامت نیز اس کا اہلبیت علیہم السلام سے منصوص ہونا، خصوصاً یہ تیسرا عنصر پہلی مرتبہ اس دور میں امام صادق کی زبان سے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے —

جس کا ایک نمونہ عمرو بن ابی المقدام کی یہ روایت ہے جس میں وہ کہتے ہیں: رأیت اباعبداللہ یوم عرفة بالموقف وهو ینادی باعلیٰ صوته — حضرت عرفات میں لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر عظیم اجتماع سے بآواز بلند خطاب فرماتے ہیں اور ایک ہی جملہ کبھی اس طرف رخ کرکے اور کبھی اس طرف رخ کرکے ہر چہار طرف تین تین مرتبہ تکرار فرماتے ہیں اور وہ جملہ یہ تھا۔

ایها الناس: ان رسول اللہ کان هو الامام (اس میں کلمۂ امام کا استعمال قابل توجہ ہے اور یہ اس حقیقت کی طرف نشان دہی کرتا ہے کہ امام اس طرح عوام کے ذہن کو امامت کی حقیقت سے روشناس کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیا وہ لوگ جو برسر اقتدار ہیں امامت کے سزاوار ہیں یا نہیں؟)

ثم کان علی ابن ابی طالب ثم الحسن ثم الحسین، ثم علی ابن الحسین ثم محمد بن علی ثم ھہ فیناوی ثلاث مرات لمن بین یدیہ ولمن خلفہ و عن یمینہ وعن یسارہ اثنا عشرۃ صوتاً ۔"

یعنی اے لوگو! یقیناً امام رسول خداؐ تھے پھر آپ کے بعد علی ابن ابی طالبؑ اور پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علیؑ ابن الحسینؑ پھر محمدؑ ابن علیؑ اور اس کے بعد "ھاہ" (یعنی میں) . . . . مجموعاً بارہ مرتبہ آپ نے ان جملوں کی تکرار فرمائی ۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا کہ اس (ھاہ) سے کیا مراد ہے ؟ کہتے ہیں: بنی فلاں کی لغت میں یعنی میں، اس سے کنایہ خود حضرت کی طرف ہے یعنی محمد بن علی علیہ السلام کے بعد میں امام ہوں ۔

دوسرا نمونہ :

قال قدم رجل من اھل الکوفۃ الی خراسان فدعا الناس الی ولایۃ جعفر بن محمد ۔ ایک شخص مدینہ سے خراسان پہونچتا ہے اور لوگوں کو امام جعفر ابن محمد کی ولایت یعنی حکومت کی طرف دعوت دیتا ہے ۔

آپ ایران میں اسلامی انقلاب کی تحریک کا مطالعہ فرمائیں وہ وقت جبکہ ہم کھل کر جمہوری اسلامی یا حکومت اسلامی کی بات کر سکیں کب پیدا ہوا ؟ ہم لوگ اس پوری تحریک اور جدوجہد کے دوران برسوں تک زیادہ سے زیادہ حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نظریات کی گفتگو کرتے تھے یعنی بہت ہوا تو یہ کہہ دیا کہ حکومت کے بارے میں اسلام نے کیا اصول وضوابط پیش کئے ہیں اور حاکم کو کن شرائط کا حامل ہونا چاہئے ۔ پس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے تھے حکومت اسلامی کی تشکیل کی دعوت دینے یا کسی خاص شخص کا حاکم کے طور پر نام لینے کی نوبت نہیں آسکی تھی ۱۹۷۸ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۷۷ء میں اور وہ بھی خاص محفلوں میں ہمارے لئے ممکن ہو سکا تھا کہ اپنی جدوجہد کو حکومت اسلامی کی دعوت کے ساتھ مشخص کر سکیں اور اس وقت بھی کسی کو اس کے حاکم کے طور پر معین نہیں کر سکتے تھے ۔۔۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ لوگ مملکت اسلامی کے دور دراز علاقوں میں امام صادق علیہ السلام کی حکومت کی طرف عوام کو دعوت دیتے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں ؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب وعدہ پورا ہونے کا وقت قریب

آچکا ہے؟ یہ وہی ۱۴۰ھ کا سال ہے ۔ یہ وہی چیز ہے جو ائمہ علیہم السلام کی مسلسل جد و جہد کا فطری تقاضہ ہے اور حکومت اسلامی کی تشکیل کی خوش آئند ساعت کی نشان دہی کرتی ہے ۔

لوگوں کو امام جعفر ابن محمدؑ کی ولایت و حکومت کی طرف دعوت دی جاتی ہے ۔ آج ہم ولایت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے ہیں، پہلے ولایت کا مطلب محبت کرنا بتایا جاتا تھا ۔ لوگوں کو امام صادقؑ کی ولایت یعنی محبت کی طرف دعوت دینا؟ اس میں دعوت دینے کا کیا مطلب ہے؟ محبت کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں جس کی معاشرہ کو دعوت دی جائے! اس کے علاوہ اگر ولایت کا مفہوم محبت لیا جائے تو حدیث کے بعد کے فقرے بے معنی ہو جاتے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے: "ففرقۃ اطاعت و اجابت" ایک فرقہ نے اطاعت و قبولیت کا ثبوت دیا ۔ "وفرقۃ جحدت و انکرت" اور ایک فرقہ نے انکار کیا اور قبول نہ کیا (اسلامی دنیا میں محبت اہلبیتؑ سے کون لوگ انکار کرتے تھے؟!!) "وفرقۃ ورعت و وقفت" اور ایک فرقہ نے ورع اختیار کرتے ہوئے خاموشی سادھ لی ۔ تورع اور توقف کا بھی کسی طرح محبت اہلبیتؑ کے ساتھ کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا ۔ یہ خود اس بات کا قرینہ ہیں کہ ولایت سے مقصود کچھ اور ہے ظاہر ہے وہ حکومت ہی ہو سکتی ہے ۔ حدیث کے آخری فقرے کچھ اس طرح ہیں: "فخرجت من کل فرقۃ رجل فدخلوا علی ابی عبد اللہؑ" ہر طرف سے لوگ امامؑ کی خدمت میں آتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں ۔ حضرتؑ ان میں سے ایک سے جس نے خاموشی اختیار کی تھی فرماتے ہیں: تم نے اس سلسلہ میں جو توقف و تورع اختیار کیا اس وقت یہ تورع کیوں نہ اپنایا جب فلاں نہر کے کنارے فلاں روز فلاں مخالف اسلام کام انجام دے رہے تھے؟! یہ ارشاد بخوبی اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ شخص جس نے خراسان میں امامؑ کی ولایت کی طرف دعوت کا فریضہ انجام دیا تھا امام کی رضا کے بعد یہ کام انجام دیا تھا بلکہ ممکن ہے کہ خود امام علیہ السلام نے ہی اس کو اس بات پر مامور کیا ہو ۔

یہ گفتگو امام صادق علیہ السلام کی زندگی کے پہلے مرحلہ سے تعلق رکھتی تھی اور آپ کی زندگی میں ایسے نشانات ملتے ہیں کہ غالباً اس طرح کی تمام چیزیں اسی پہلے دور سے مربوط ہیں یہاں تک کہ منصور عباسی کی خلافت کا دور شروع ہو جاتا ہے منصور کے برسر اقتدار آتے ہی پھر مشکلات کا دور شروع ہو جاتا ہے اور تقریباً امامؑ کے لئے وہی حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی دوچار تھی طرح طرح کے دباؤ آپ پر پڑنے لگتے ہیں حضرتؑ کو بار ہا حیرہ، واسطہ، ربذہ نیز دوسری جگہوں پر طلبی اور جلا وطنی کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے کئی مرتبہ حضرتؑ کو خلیفہ کی طرف سے سخت لب و لہجہ میں مورد خطاب اور غم و غصہ کا نشانہ بننا پڑتا ہے ایک دفعہ خلیفہ یہاں تک کہتا ہے کہ "قتلنی اللہ ان لم اقتلک" خدا مجھے زندہ نہ رکھے اگر میں آپ کو قتل نہ کروں، ایک دفعہ

حاکم مدینہ کو حکم دیتا ہے کہ: "ان احرق علی جعفر بن محمد دارہ" (یعنی حضرت کے ساتھ آپ کے گھر میں آگ لگا دو) حضرت جلتی ہوئی آگ کو عبور کرتے ہیں اور بڑے ہی توکل و اعتماد کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے دلوں کو چھید دینے والے لب ولہجہ میں یہ الفاظ بیان فرماتے ہیں: "انا ابن اعراق الثریٰ انا ابن محمد المصطفیٰ"[۳]۔

جس نے دشمنوں کو اور بھی ذلیل و خوار کیا ــــ ایسا لگتا ہے کہ امام صادق علیہ السلام اور منصور کے تعلقات نہایت کشیدہ رہے ہیں چنانچہ منصور نے بارہا امام کو دھمکیاں بھی دی ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی روایات بھی ملتی ہیں جن میں امام کو منصور کے سامنے اپنی حقارت و عاجزی (معاذ اللہ) کا اظہار کرتے ہوئے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:! اور تعینی طور پر ان میں سے ایک روایت بھی درست و قابل اعتماد نہیں ہے میں نے ان روایات کا جائزہ لیا اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔ ان کا سلسلہ زیادہ تر ربیع حاجب تک پہونچتا ہے جس کا فاسق ہونا قطعی و یقینی ہے اور وہ منصور کے قریبی لوگوں میں سے ہے تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں "ربیع شیعہ اور دوستدار اہلبیت[۴] تھا"! ربیع کہاں اور شیعہ ہونا کہاں؟ ربیع ابن یونس منصور کا مطیع فرمانبردار اور حکم کا غلام ہے اور ان افراد سے ہے جو بچپن سے بنی عباس کے نوکروں میں سے تھے اور بعد میں منصور کا حاجب ہو گیا اور بے پناہ خدمتوں کے عوض بالآخر منصب وزارت پر فائز ہو گیا جس وقت منصور مرا ہے اگر ربیع نہ ہوتا تو خلافت منصور کے خاندان سے باہر چلی گئی ہوتی اور شاید اس کے چچاؤں کا خلافت پر قبضہ ہو جاتا۔ یہ ربیع ہی تھا جو مرتے وقت منصور کے سرہانے موجود تھا اور اس نے منصور کے بیٹے مہدی کے حق میں جعلی وصیت پیش کر دی اور مہدی کو تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ فضل بن ربیع جو بعد میں ہارون اور امین کے دربار میں وزارت پر فائز ہوا، اسی ربیع کا بیٹا تھا۔ یہ خاندان ان خاندانوں میں سے ہے جو بنی عباس کی نمک خواری و وفاداری میں کافی مشہور ہے ان کے دلوں میں اہلبیت علیہم السلام کے تئیں کسی طرح کی ارادت و محبت نہیں پائی جاتی اور جو کچھ ربیع نے امام صادق علیہ السلام کے سلسلہ میں کہا ہے سراسر جھوٹ اور جعل ہے اور ان تمام کوششوں کے پس پشت اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ موجودہ اسلامی معاشرہ کو یہ باور کرایا جائے کہ حضرت جیسی شخصیت بھی منصور کے سامنے عاجزی اور تذلل کا اظہار کر چکی ہے تاکہ دوسرے افراد اپنی حیثیت کے بارہ میں خود ہی فیصلہ کر لیں۔

منصور اور امام صادق علیہ السلام کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے جو ۱۴۸ھ میں امام کی شہادت پر منتہی ہوتے ہیں۔

اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

توحید

جلد ۴، شمارہ ۶، ربیع الاول - ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ / نومبر - دسمبر ۱۹۸۷ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

- قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

اربابِ نظر و صاحبانِ قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۲½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

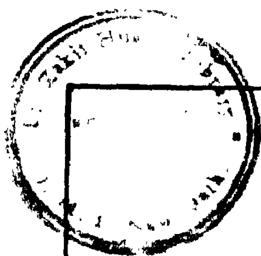
اکاونٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی، نبش فرصت
تہران - جمہوری اسلامی ایران

توحید

اسلامی، علمی، فکری ذوماہی رسالہ

جلد (۴) شمارہ (۶)

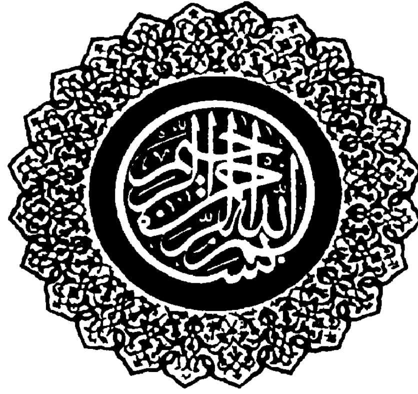
ترتیب



مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۳۴۵۵ـ۳۷۱۸۵
قم، جمہوری اسلامی ایران
فون نمبر ۲۴۵۸۴



ل ـ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ/ نومبر ـ دسمبر ۱۹۸۷ء



نوٹ:-

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

تعلیمات رسولؐ اور ہمارا عمل!

ماہ ربیع الاول، خوشی ومسرت، جشن وشادمانی کا مہینہ ہے، بانی اسلام رسول اکرمؐ اور مبلغ اسلام حضرت امام جعفر صادقؑ کی ولادت کا مہینہ ہے، یہی وہ مہینہ ہے جس میں تاریخ اسلام کے انتہائی اہم باب کا آغاز ہوا، مرسل اعظمؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اور اسلام کی آفاقیت کا دور شروع ہوا۔ اسلامیان عالم متحدہ طور پر — شیعہ سنی کی تفریق کے بغیر — اس مہینہ کا احترام کرتے ہیں اور جگہ جگہ پر جشن میلاد مناتے ہیں، سیرت النبیؐ کے جلسے اور محفل میلاد کا انعقاد ہوتا ہے، شمع رسالت کے پروانے نظم ونثر میں سرور دو عالمؐ کی بارگاہ میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں، سیرت رسولؐ کے تذکرے ہوتے ہیں کیونکہ رسولؐ کی سیرت ہمارے لئے نمونہ عمل و چراغ راہ ہے، لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

سیرت رسولؐ، اس اولوالعزم پیغمبرؐ کی داستان حیات ہے جس کا دل، بنی آدم کے مصائب وآلام سے لبریز تھا، جو انسانوں کے درد کو اپنا درد سمجھتا تھا، جس نے انسانوں کے درمیان محبت واخوت کا رشتہ قائم کیا، انہیں اپنے جیسے انسانوں کی غلامی وبندگی سے آزاد کر کے مالک حقیقی، خدا کا بندہ بنایا۔ بشریت کو درپیش خطرات سے نجات دلائی۔ عدل وانصاف اور آزادی وحریت کا پرچم بلند کیا، نسلی برتری اور رنگ وزبان کے امتیاز کو ختم کر کے علم وتقویٰ کو فضیلت وبرتری کا معیار قرار دیا — لیکن — افسوس — آج ہم جشن میلاد اور سیرت النبیؐ کے جلسے ضرور منعقد کرتے ہیں مگر سیرت رسولؐ سے یکسر غافل ہیں۔ ہم حیات طیبہ کا تذکرہ سننے اور سنانے کے لئے یقیناً اکٹھا ہوتے ہیں لیکن زلف وگیسو، عارض ورخسار اور بعض خارق العادہ معجزات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہماری بزموں میں اس انسان ساز سیرت کا تذکرہ شاذونادر ہی ہوتا ہے

جس کی خاطر حضورؐ نے صعوبتیں برداشت کیں مصیبتیں اٹھائیں، اذیتیں سہیں یہاں تک کہ حضورؐ کو کہنا پڑا: ما اوذی نبیٌّ قط کما اوذیت ـــ جتنی اذیتیں مجھے پہنچائی گئیں اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچائی گئی۔

ہم اپنے کو پیرو رسول کہتے تو نہیں تھکتے لیکن ہماری زندگی، ہمارا عمل تعلیمات رسولؐ سے کوسوں دور ہے۔ ہم نے نہ صرف احادیث و سیرت رسولؐ کو فراموش کر دیا بلکہ آپؐ کے لائے ہوئے، قرآن اور آپ کی تعلیمات کی بنیادی کتاب کو بھی عملی زندگی سے خارج کر دیا، اسے خوش الحانی سے تلاوت اور ایک سانس میں متعدد طریقوں سے ایک ہی آیت کی قرائت کو بہت بڑا ہنر سمجھا، اس کی اکسیری خاصیت کو اپنانے کے بجائے اپنی غنا پسندی کی پیاس بجھانے کا ذریعہ بنا لیا اور اسے اتنا بے اثر بنا دیا کہ حتی آج اسرائیل امریکہ اور برطانیہ جیسے دشمن قرآن ـــ "جس کا وزیر خارجہ "ایڈن" برطانوی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ جب تک مسلمانوں کے درمیان یہ قرآن موجود ہے ہم ان پر غالب نہیں آ سکتے" ـــ بھی اپنے ریڈیو سے ان تاجر پیشہ قاریوں کے کیسٹ نشر کرتے ہیں۔ آج ہم راہ حق اور نجات مستضعفین کے لئے جہاد، اسلامی مقاصد کے حصول کی راہ میں صبر و استقلال اور اعلیٰ اسلامی اخلاق پر مبنی قرآنی تعلیمات کو یکسر بھلا چکے ہیں، قرآن ہمارے ذہنوں کو جھنجوڑ رہا ہے:

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان . . . . . . (نساء/ ۷۵)

تم راہ خدا میں مظلوم و مستضعف مردوں اور عورتوں کی نجات کے لئے جہاد کیوں نہیں کرتے؟

لیکن ہم اس آیت پر عمل تو درکنار اگر کوئی غیرت مند مسلمان اس پر عمل پیرا ہو کر نجات مستضعفین کا پرچم بلند کرتا ہے اور ظالم و سفاک طاقتوں سے لوہا لیتا ہے تو ہم اپنی پوری طاقت سے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے تمام وسائل اور قدرتی خزانے دشمن قرآن و اسلام، ظالموں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں، نجات مستضعفین، بیداری مظلومین، اتحاد مسلمین اور سرکوبی ظالمین کے لئے بلند ہونے والی آواز کا گلا گھونٹنے کے لئے سرزمین الٰہی، مکہ پر خون کی ہولی کھیلنے، اور بے گناہ و بے دفاع حاجیوں کے قتل عام سے بھی نہیں چوکتے۔

قرآن کہتا ہے:۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار (ہود/ ۱۱۳)

ظالموں اور ستمگروں کی طرف مت جھکو، لیکن ہم حکم قرآنی کی بھرپور مخالفت کرتے ہوئے انھیں سے

دستی کی پینگ بڑھا رہے ہیں، نام نہاد عرب سربراہ کانفرنس منعقد کر کے ظالم صہیونی حکومت کو خوش کرنے تیز
ں کے آقا امریکہ کی غلامی کا قلادہ پہننے کے لئے اسلام و مسلمین سے خیانت کرنے والوں کو خوش آمدید کر رہے ہیں
ئک لٹی عورتوں، کو کھ اجڑی، ماؤں اور یتیم فلسطینی بچوں کی فریاد مظلومیت کو بھلا کر اپنا ہی تھوکا چاٹ رہے ہیں۔

قرآن کہتا ہے :

یاایها الذین آمنوا لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیهم بالمودة وقد کفروا بما جاءکم من الحق ۔ (ممتحنہ/۱)

"میرے اور اپنے دشمن کو دوست و ناصر و مددگار نہ بناؤ، ان کو اپنا سرپرست مت سمجھو"، لیکن ہمارا عمل ؟! ہم قرآن کی صریحی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں، ہم نے نہ صرف یہ کہ دشمنان خدا کو اپنا دوست سمجھا ہے بلکہ خود اپنے مسلمان بھائیوں اور ایک اسلامی حکومت کو نیست و نابود کرنے کے لئے انہیں اپنا آقا و مولا بنا رکھا ہے اور پرچم کفر و طاغوت کے نیچے ذلت آمیز زندگی گذار رہے ہیں۔ سچ بتائیے جس وقت کویتی حکمرانوں نے امریکی جھنڈے تلے زندگی گذارنے اور ایران کی اسلامی حکومت کو اپنے زعم ناقص میں نقصان پہنچانے کے لئے امریکی جنگی جہازوں کو اس اسلامی علاقہ میں آنے کی دعوت دی ہے، سرکار دو عالم کے دل پر کیا گزری ہوگی کیا انہوں نے اپنے پروردگار سے شکایت نہ کی ہوگی۔

یارب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجوراً (فرقان/۳۰)

پروردگارا ! میری قوم نے اس قرآن کو بھلا دیا ہے۔ کیا کویتی حکمرانوں نے اس عمل کے ذریعہ قرآن مجید، رسول اکرمؐ اور خدا کا مذاق نہیں اڑایا ہے ؟ کیا وہ اپنے کو پیرو رسولؐ کہہ سکتے ہیں ؟

قرآن کہتا ہے :

فقاتلوا اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا (نساء/۷۶)

شیطان کے ہواخواہوں سے جنگ کرو، اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اس کی چالیں اور اس کا مکر و فریب نہایت کمزور ہے۔ لیکن، ہم ؟! ہم نے اس کے برعکس بڑے چھوٹے شیطانوں اور ان کے ہواخواہوں کو اپنے سر پر بٹھا رکھا ہے، ان سے جنگ و جہاد تو دور کی بات ہے، ہم ان کے اشاروں اور ان کے مفادات کی خاطر اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹنے کے لئے تیار ہیں۔ خود اپنی دشمن اور اپنے دین و مذہب پر حملہ آور طاقتوں کو، فوجی اڈے، امکانات اور وسائل فراہم کرتے ہیں۔ آج خلیج فارس

ہیں بڑے شیطان امریکہ کی اسلام دشمن فوج کی موجودگی، اس کی شر انگیز حرکتیں اور اس کے ساتھ کویت و حجاز جیسے نام نہاد مسلمان ملکوں کا تعاون اس کی واضح مثال ہے۔

قرآن ہم مسلمانوں کو ان اوصاف کا عامل دیکھنا چاہتا ہے:

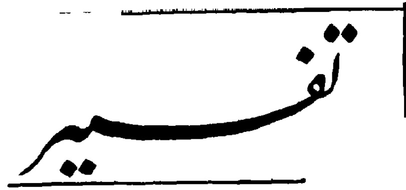
اشداء علی الکفار رحماء بینھم (فتح/۲۹)

غیروں اور کافروں پر بڑے سخت لیکن آپس میں رحم دل و شفیق، لیکن ہم! ؟ کیا آج ہمارا عمل اس کے سو فیصد خلاف نہیں؟ ہم کافروں کے معاملہ میں نرم مگر مسلمانوں کے سلسلہ میں انتہائی سخت ہیں، ان کے آگے دریوزہ گری کر سکتے ہیں، لیکن اپنے بھائیوں سے، اپنے ہم مسلکوں سے ہرگز مفاہمت نہیں کر سکتے، ہم اپنے بھائیوں کو صرف اس جرم میں صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے اپنے دیرینہ دشمنوں کو بھی گلے لگانے پر تیار ہیں کہ انھوں نے اسلامی اقدار کو زندہ کرنے اور الٰہی قوانین کی مادی قوانین پر بالادستی قائم کرنے کا نعرہ بلند کیا ہے اور اسے جامہ عمل پہنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اردن میں منعقد ہونے والی عرب سربراہ کانفرنس اس کا بولتا ثبوت ہے، جہاں بیت المقدس کے غاصب، دشمن اسلام صہیونیوں کے دست ظلم سے بیت المقدس کو آزاد کرانے اور فلسطینی و لبنانی مسلمانوں کو نجات دلانے کے سلسلہ میں سوچ بچار کے بجائے کلمہ توحید و توحید کلمہ کی داعی ایران کی اسلامی حکومت کا تیا پانچہ کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

قرآن ہمیں حکم دیتا ہے:

واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران/۱۰۳)

اختلاف و تفرقہ سے بچو، اور توحیدی بنیادوں پر اتحاد و اتفاق کا محل تعمیر کرو۔ لیکن جیسے ہم نے طے کر رکھا ہے کہ قرآن کے ہر حکم کی مخالفت کریں گے، آج مسلمانوں کے درمیان اختلاف و تفرقہ کا بیج بونے میں ہم سے آگے کون ہے؟ پیٹرو ڈالر اور شیطانی ایجنسیوں کے سہارے نام نہاد شیعہ سنی افراد کو خرید نا اور امت اسلامی کا خون کرنا ہمارا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ کہیں سے "ناموس صحابہ" کا جھوٹا نعرہ لگایا جا رہا ہے اور کہیں سے "اہانت اہلبیت" کی من گھڑت فریاد بلند ہے ــ جبکہ گہری نظروں سے دیکھا جائے تو نہ انھیں صحابہؓ سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ انھیں اہل بیتؑ سے کوئی محبت بلکہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے اور انھیں بن گھٹ سے سیراب ہوتے نظر آئیں گے۔



- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

ـــ مرتضیٰ حسین ـــ

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝

ترجمہ:

جب آپ کے پاس اس بارے میں علم (استدلال صحیح) آچکا، تو اس کے بعد بھی اگر کوئی آپ سے حجت کرے تو کہہ دیجئے، آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے لائیں، تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو تم اپنی عورتوں کو ہم اپنی جانیں تم اپنی جانیں۔ پھر التجا کریں (اللہ سے) اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں (۶۱)

تفسیر: آیۂ مباہلہ کی خصوصیت:

آیۂ مباہلہ، دو زاویوں سے قابل غور ہے ۱۔ بہت دنوں سے آئے ہوئے عیسائی رہنماؤں کی آخری بحث کا عملی و فیصلہ کن جواب ہونے کی بنا پر ۲۔ پنجتن پاک کی دینی عظمت اور ان کی عصمت و سرداری امت کی جہت سے۔

مباھلہ: حضرت روح اللہؑ کے پرستار، دینی زعماء اور نجرانی لیڈر بہت عرصے سے اسلامی تعلیمات و عقائد پر وحی کی زبان سے اپنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حقائق سن رہے تھے اس مدت میں وہ اپنے خیالات کی صحت ثابت نہ کر سکے۔ ان کا زور اسی پر رہا کہ "عیسیٰ" ابن اللہ ہیں۔ انھیں دلائل دیئے کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ مگر وہ نہ مانے۔ اس بحث میں ایک مدت گذر گئی۔ رسول اللہؐ انسان دوستی اور تبلیغ کے جذبے کی بنا پر اس کا حل چاہتے تھے اور اس کا سب سے اچھا موقع یہی تھا، نجران کے پادریوں اور عیسائیوں کی مکمل نمایندگی کرنے والوں کا وفد بات مان جاتا تو قصہ تمام تھا۔ حکم خدا ہوا کہ اچھا، بس جتنے دلائل تمہیں دیئے جا چکے وہ کافی ہیں اگر یہ لوگ نہ مانیں تو میدان میں نکل کر گڑگڑا کر دونوں فریق دعا مانگیں کہ جو حق پر ہو اللہ اسے فتح دے اور جو بھی جھوٹے ہوں اللہ ان پر لعنت نازل کرے۔ اس اجتماع میں بگل، ناقوس، چرچ کے آدمی یا ایرے غیرے نہ ہوں، دونوں مدعی اپنے جگر کے ٹکڑے، اپنے دین کے محافظ، اور صدق و صفا، روحانیت

ت کے مجمع لے آئیں۔ بیٹے اور عورتیں۔ اور جائیں۔

صحیح مسلم و مسند احمد ابن حنبل جیسے بیسیوں محدثین اور طبری و کشاف جیسے درجنوں مفسرین نے لکھا ہے۔
شیخ الہند محمود حسن و علامہ شبیر احمد عثمانی: " وفد نجران نے مہلت لی، کہ ہم آپس میں مشورہ کرکے جواب دیں گے
لس مشاورت میں ان کے ہوشمند، تجربہ کار، ذمہ داروں نے کہا کہ اے گروہ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ
کہ محمدؐ نبی مرسل ہیں کہ اللہ نے بنی اسمٰعیلؑ میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں بس
بی سے مباہلہ و ملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب
سے نہ بچے اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے، بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کرکے اپنی بستیوں
ف روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں۔ یہی تجویز پاس کرکے حضورؐ
دمت میں پہنچے۔

کا مباہلہ: پنجتن پاک :

آپ آنحضرت حسنؓ حسینؓ، فاطمہؓ و علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لیے باہر تشریف لا رہے تھے، یہ نورانی
یں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی
سے سرکا سکتی ہے۔ ان سے مباہلہ کرکے ہلاک نہ ہو۔ ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا۔ آخر انھوں نے
لہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا، اور صلح کرکے واپس چلے گئے۔ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
فرمایا کہ اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا۔ ایک
ل کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔" (قرآن مجید، عکسی مترجم و محشی، شیخ الہند مولانا محمود
ن و علامہ شبیر احمد عثمانی۔ طبع نور محمد۔ کراچی، ۱۹۶۴ء)

اسی کے دربار اور مباہلے میں مماثلت۔

عصمت و صدیقیت و حجیت اہل بیت پر اس سے جو استدلال ہوتا ہے۔ وہ اپنی جگہ مسلم ہے وہاں

رسوی نے روح البیان میں اس ہوشمند کا نام "عبد المسیح" بتایا ہے۔
روح البیان میں ہے، حسینؓ کو گود میں لیے حسنؓ کا ہاتھ تھامے فاطمہؓ آنحضرت کے اور علیؓ فاطمہؓ کے پیچھے وہو یقول اذا انا دعوت
نوا" اسقف نجران (یعنی اپنے علوم میں سب سے بڑے عالم) ابو حارثہ نے کہا ....

حبشہ میں حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ کی فتح اور نجاشی کا زبانِ جعفرؑ سے سورۂ مریم سن کر اسلام لانے اور یہاں نجران کی فتح اور حریرح کے بڑے سربراہ کا ان کی حقانیت کے اقرار میں مماثلت قابلِ توجہ ہے۔

عیسیٰ روح اللہ کو ماننے والے جس قسم کے عرفانی و روحانی تصوّرات رکھتے تھے اصحاب کساءؑ تصوّر حقیقت بن کر مجسم نہ ہوتے تو صاحبان کلیسا کبھی نہ جھکتے۔

تبلیغ دین کی بڑی مہم میں عورت کا حصہ

خواتین کا اسلام میں کتنا حصہ اور دین میں عورت کی فضیلت کے لیے حضرت مریمؑ کے واقعات اور حضرت فاطمۃ زہرا سلام اللہ علیہا کا مباہلے میں مردوں کے ساتھ آنا فتح اسلام میں برابر کی شراکت نہیں تو اور کیا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۞ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ۞

ترجمہ:

یقیناً، یہ سب سچے واقعات ہیں۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک اللہ ہی غالب و صاحب حکمت ہے (۶۲) پھر اگر وہ لوگ منہ پھیر لیں تو اللہ فسادیوں کو خوب جانتا ہے (۶۳)

تفسیر:

۶۲۔ انّ ھٰذا لھوالقصص الحق ....

عیسائیوں نے حضرتِ مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو قصے گڑھے پھر انھیں خدا کا بیٹا یا خدا بنایا قرآن مجید ان کی تردید کرتا اور واقعات و حقائق کو اصل صورت میں پیش کرتا ہے اور اللہ چونکہ عزیز و حکیم ہے۔ لہٰذا وہی یہ کر سکتا تھا۔ ورنہ پروپیگنڈہ حقیقت کو مسخ کر چکا تھا۔ اور نئے معبود بنائے جا چکے تھے۔

۶۳۔ فان تولّوا فانّ اللہ .....

دلیل قدرت و وحدانیت واصل واقعہ معلوم ہونے یا مباحلے کے چیلنج کے بعد اگر لوگ حق کو پھر نہ مانیں تو سمجھ لو کہ جو یائے حق ہونے کے بجائے فسادی ہیں یہ لوگ، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

قُلْ

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝

ترجمہ :

کہہ دیجئے، اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں برابر (نقطۂ اشتراک) ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب نہ مانیں۔ پھر اگر وہ روگرداں رہیں تو تم کہدو، گواہ رہنا ہم مسلمان (اللہ ہی کے فرماں بردار) ہیں (۶۴)

تفسیر :

اہل کتاب آؤ ہم تم اتحاد کرلیں، تم بھی آسمانی کتاب کو مانتے ہو ہم بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں، تم بھی عقیدۂ توحید کے مدعی ہو تو بس اسی عقیدہ پر متفق ہو جائیں غیر اللہ کی پرستش چھوڑ دیں، عزیز و مسیح، یا بی اور پوپ کو فرزند خدا اور رب نہ مانیں۔ آنحضرت ؐ کی یہ دعوت اتحاد عام تھی اور مصر کے مقوقس یا روم کے قیصر کو جو خط لکھے ان میں بھی اللہ کا یہ پیغام لکھا تھا۔ اس سیاسی و دینی پیش کش سے نطرانیت بہت متاثر ہوئی۔ لیکن ان کے مفسد، اسقف اور مذہبی ٹھیکے دار لے نہ مانے۔ قرآن نے اعلان کیا کہ اگر یہ اصول نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مسلمان، اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کے فرمان بردار ہیں۔

پھر ہمارے تمہارے درمیان اتحاد نہیں ہو سکتا۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِىٓ إِبْرَٰهِيمَ
وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوْرَىٰةُ وَٱلْإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعْدِهِۦٓ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝
هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ
فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ ۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ مَا
كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا
وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝

ترجمہ:

اے اہل کتاب! ابراہیمؑ کے بارے میں بحث کیوں کرتے ہو، تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی، کیا تم عقل استعمال ہی نہیں کرتے (۶۵) تم وہی تو ہو کہ جس کا علم تھا اس میں جھگڑ چکے۔ اب اس بات میں کیوں بحث کرتے ہو جس سے تم واقف نہیں ہو اور (حقائق) اللہ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے (۶۶) ابراہیمؑ یہودی یا نصرانی نہیں تھے۔ وہ "حنیف" و "مسلم" خالص حق پرست اور بندۂ فرماں بردار تھے، اور مشرکوں سے بھی نہ تھے (۶۷)

تفسیر:

۶۵۔ یا اھل الکتٰب لم تحآجون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حجاز کے ہر معاشرے میں، خصوصاً یہود و نصاریٰ میں بہت محترم تھے، دونوں انھیں اپنے اپنے مذہب کا پرستار بتاتے تھے۔ اسلام نے اس کا جواب دیا کہ یہودا کے ماننے والے یہودی اور مسیح کے ماننے والے نصرانی کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ سب بعد کے جھگڑے ہیں ابراہیم کے زمانے میں نہ تورات تھی نہ اہل تورات، نہ انجیل تھی نہ اہل انجیل۔ البتہ، اسلام چونکہ توحید خالص اور اللہ کے حضور سپردگی

ل کا داعی ہے اس لئے خلیل اللہ کو "مسلم حنیف" کہنا صحیح ہے۔ انھوں نے کب شرک کیا؟ وہ نمرود کو رب
نے کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے، انھوں نے بتوں کو توڑا۔ ان کا تم مشرکوں سے تعلق ہی کیا۔

۶۶۔ ھاانتم ھؤلاء، حاججتم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ھاانتم ھؤلاء ہاں ہاں تم لوگ۔ یہ تنبیہ براہ راست تمہیں ہے، اسلاف کی بدکاریوں کی
جہ سے نہیں خود تمہارے کرتوت قابل نفرت ہیں۔
تم جانتے ہو کہ عیسیٰؑ نبی تھے، الوہیت کا دعویٰ انھوں نے نہیں کیا، پھر بھی بحثیں کر رہے ہو۔ تو دعوت
ابراہیمؑ پر گفتگو کا تمہیں کیا حق ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ابراہیم موحد تھے۔ خواہ مخواہ اپنی جہالت کا مقابلہ وحی
الٰہی اور علم حقیقی سے کر رہے ہو۔ ۔ ۔

۶۷۔ ماکان ابراھیم یھودیا ۔ ۔ ۔ ۔

اللہ کے حضور میں ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ باطل کی راہیں چھوڑ کر راہ حق پر جمنے اور سراپا اطاعت و سپردگی
پر فائز نبی کا مرتبہ ہے۔ تعمیر بیت اللہ کے لئے مہاجرت، بیٹے کی قربانی، بت شکنی، نمرود کی طاغوتیت
کا انکار دیکھو اور یہود و نصاریٰ کی تاریخ پر نظر ڈالو، بھلا تم دونوں کا ابراہیم سے کیا رابطہ رہ جاتا۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ:

یقیناً، ابراہیمؑ سے زیادہ خصوصیت ان لوگوں کو تھی جو ان کی پیروی کرتے تھے، پھر یہ تعلق
اس نبی (خاتمؐ) اور مومنوں کو حاصل ہے۔ اور اللہ مومنوں کا ولی ہے (۶۸)

تفسیر:

ابراہیم علیہ السلام کے نام لیوا تو سب ہی ہیں مگر ان سے حقیقی رابطہ ان لوگوں کا مانا جائے گا جو ان کے
تعلیمات و نصب العین کے پیرو کار رہے ہوں، تو ان میں اولیت تو خود ان کے دور میں ان کی امت کو حاصل ہے
پھر نبی آخر الزمانؐ اور مومنوں کو، جو اسی طرح توحید کے علم بردار اور خانۂ کعبہ کے خدمت گذار اور ان کی

دعا کا نتیجہ ہیں۔ یہ لوگ وارثِ خلیل اللہ ہیں اور اللہ ان کا مولیٰ ہے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۞ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۞ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞

ترجمہ:

اہل کتاب کے ایک گروہ کی تمنا ہے کہ تمھیں منحرف کردیں، حالانکہ وہ اپنے تئیں ہی گمراہ کررہے ہیں مگر وہ (اس حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے (۶۹) اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو، حالانکہ تم (ان کے) قائل ہو (۷۰) اے اہل کتاب! تم حق کو باطل میں کیوں ملاتے اور حق کو چھپاتے ہو! حالانکہ (اصل حقیقت) جانتے ہو (۷۱)

تفسیر:

۶۹۔ ودت طائفۃ من ....

آج کی طرح ماضی بعید میں بھی یہودی اور عیسائی مسلمانوں کو فکری اور عملی راہ اسلام سے بھٹکانا چاہتے تھے، لیکن جو مسلمان اللہ کی ولایتِ مطلقہ کے معتقد ہیں وہ ان کے پھندوں میں نہیں پھنستے۔ لیکن ان دشمنوں کو شعور نہیں۔ نیز دیکھیے سورۃ النساء آیت ۱۱۳۔

۷۰۔ یااھل الکتاب لم تکفرون ....

یہود و نصاریٰ، وحی کے قائل ہونے کے بعد آیات کے منکر اور دلائل آسمانی کو جانتے بوجھتے قبول نہیں کرتے، کتنی حیرت خیز بات ہے۔ خود دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں؟

۷۱۔ یااھل الکتاب لم تلبسون الحق ....

توراۃ و انجیل کے ماننے والے حق و صداقت جاننے کے باوجود حقائق بیان کرتے ہوئے

مغالطے پیدا کرنے اور حق کو چھپانے کے عادی ہیں اس لئے ان کی بات ناقابل اعتبار ہے۔

وَقَالَتْ

طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى

اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ

رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ

الْعَظِیْمِ ۝

ترجمہ:

اور اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہا مسلمانوں پر جو (دین) اترا ہے اس پر صبح صبح ایمان لاؤ (اعلانِ اسلام کرو) اور دن کے آخر میں (اعلانیہ) انکار کر دو۔ ہو سکتا ہے وہ (مسلمان) لوگ بھی پلٹ جائیں (۷۲) اور جو تمہارے دین کی پیروی کرے اس کے علاوہ کسی کی بات نہ مانو (ایمان نہ لاؤ)۔ آپ کہہ دیں۔" کہ ہدایت فقط اللہ کی ہدایت ہے۔ (اور یہ دشمنی اس لیے ہے کہ) جیسا تم کو ملا ہے کسی اور کو کیوں مل گیا، یا وہ (مسلمان) تمہارے رب کے حضور، تم پر کیوں غالب ہوئے۔ آپ کہہ دیں، فضل (و کرم) اللہ کے ہاتھ ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ صاحبِ وسعت و علم ہے (۷۳) وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کرتا ہے اور اللہ، بڑے فضل کا مالک ہے۔ (۷۴)

تفسیر:

۷۲۔ وقالت طائفۃ من اھل الکتٰب ......

بارہ یہودیوں نے پروگرام بنایا۔ چلو صبح کو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں۔ اس سے مسلمان خوش ہوں گے اور عام لوگوں کی توجہ ادھر مڑے گی، جب ہر طرف یہ چرچا پھیل جائے تو آٹھ دس گھنٹے بعد مشہور کر دیں کہ ہم سب اپنے دین پر واپس آ گئے کیونکہ اسلام کو قریب سے دیکھا تو اس میں کوئی سچائی نظر نہ آئی۔ اس طرح ممکن ہے کہ مسلمان ہماری طرف لوٹ آئیں اور اسلام چھوڑ دیں۔

اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نام نہاد اہل کتاب کی اس حرکت سے با خبر کر کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ یہ قوم مکمل طور پر فریب کار بن چکی ہے ان کی باتوں پر بھروسہ نہ کرنا۔

۷۳۔ ولا تؤمنوا الا لمن تبع ......

یہود نے جان بوجھ کر اپنے معلومات کو چھپانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے تاکید کرتے ہیں کہ خبردار تمہاری کتابوں میں رسول اسلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اپنے معلومات کا اظہار نہ کر دینا، اگر اس کا اظہار کرنا بھی ہو تو آپس میں قابل اعتبار یہودی سے اظہار کرنا تاکہ مسلمان اس سے فائدہ نہ اٹھائیں، ہرگز یہ نہ کہنا کہ کسی پر حضرت موسیٰ جیسی شریعت اور تورات جیسی کتاب نازل ہو سکتی ہے۔ اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جس سے وہ خدا کے سامنے تم پر اتمام حجت کر سکیں۔ (دیکھئے سورۂ البقرہ آیت ۷۶ و ۷۷)

پیغمبر! آپ پہلی بات کے جواب میں کہہ دیجئے اور مسلمان اسے سمجھ لیں کہ ہدایت ان کے اشاروں کی پابند نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی دیتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہیے کہ بزرگی و فضل کا مالک اللہ ہے۔ اللہ کی قدرت کا پھیلاؤ اور اس کے علم کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

۷۴۔ یختص برحمتہ ...

اللہ نے حضرت موسیٰ کو نبوت و کتاب سے نوازا تو اب اسے کون روک سکتا ہے کہ وہ عیسیٰ کو رسالت نہ عطا کرے۔ وہ اس کے بعد اگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمتہ للعالمین و خاتم النبیین بنا دے تو اسے حق ہے۔ وہ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کر لے۔

آج کے اہل کتاب بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو دین سے منحرف کرنے کی خاطر نئے نئے

ثقافتی، سائنسی، نفسیاتی اور تاریخی فلسفے گڑھ کر اسلام و پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بدظن
کرنے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کی سعی پیہم میں مصروف ہیں۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ
يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ
إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا
فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ
يَعْلَمُونَ ۝ بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا
قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ
اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ترجمہ: کچھ اہل کتاب ایسے ہیں کہ ان کے پاس دولت کا انبار امانت رکھو تو وہ واپس کر دیں۔
اور کچھ ایسے ہیں اگر ان کے پاس ایک دینار امانت رکھ دو تو اس وقت تک نہ ادا کریں۔
جب تک ان کے سر پر کھڑے نہ رہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا قول ہے کہ ہم امی
لوگوں کے بارے میں جواب دہ نہیں۔ حالانکہ وہ لوگ جان بوجھ کر اللہ پر بہتان باندھتے
ہیں (۷۵) ہاں جو شخص اپنا عہد پورا کرے اور پرہیزگار رہے، تو اللہ پرہیزگاروں
سے محبت کرتا ہے۔ (۷۶) بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑے

سے معاوضے پر بیچتے ہیں۔ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ ان سے بات نہ کرے گا نہ قیامت کے دن ان پر نظر (رحمت) کرے گا، نہ ان کو بری (پاک) کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے (۷۷)

تفسیر:

۷۵۔ من اھل الکتب من ان تأمنه . . . . .

اہل کتاب کہے جانے والوں کا کردار یہ ہے۔

۱۔ امانت دار اور روپے پیسے کے معاملے میں کھرے، جو چیز انھیں امانت دو وہ اسی طرح واپس کر دیتے ہیں۔

۲۔ بدنیت و بدمعاملہ۔

فکری رویہ جس سے ان کی رفتار بگڑتی ہے وہ ہے:

" امی لوگ کچھ نہیں جو کچھ ہیں ہم ہیں" اُمیوں" کو اہل کتاب سے کسی مطالبہ کا حق نہیں۔ گویا اہل کتاب آقا اور سب غلام ہیں۔

اہل کتاب جان بوجھ کر اللہ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں۔

۷۶۔ بلیٰ من اوفیٰ بعهده . . . . .

اللہ عز اسمہ نے عہد کی پابندی اور پرہیزگاری کو پسند کیا ہے۔ تقوے پہ زور دیا اور متقی کو عزت بخشی ہے۔

۷۷۔ ان الذین یشترون بعهد اللہ . . . . .

عہد شکنی بدترین صفت ہے جو لوگ عہد الٰہی کو سستا جانتے اور اپنی قسم و حلف کو چند ٹکوں پر بیچتے ہیں وہ قیامت کے دن رحمتِ خدا سے محروم ہوں گے۔ دردناک عذاب ان کا مقدر رہے۔ (دیکھئے بقرہ/۱۷۴)

امانت و وفا اچھے آدمی اور منضبط نظام اور معقول انسانی معاشرے کے لئے انتہائی ضروری صفات ہیں۔ ہمارے نبی معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبل بعثت اسی کردار کی تبلیغ فرمائی۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے تو یہاں تک فرمایا: علیکم باداء الامانات فوالذی بعث محمداً بالحق نبیا لو ان قاتل ابی حسین بن علی ابن ابی طالبؑ ائتمنی علی السیف الذی قتله به

لا دیتہ الیہ (امالی صدوق) یعنی ادائے امانت کے پابند رہو۔ قسم اس خدا کی جس نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی برحق مبعوث فرمایا، اگر میرے والد کا قاتل وہ تلوار مجھے امانت میں دیتا جس سے حضرت کو شہید کیا تھا جب بھی میں اسے واپس کر دیتا۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ:

ان میں کچھ لوگ زبان یوں گھماتے (ایسا لہجہ بناتے) ہیں کہ تم سمجھو جیسے کتاب الٰہی کا حصہ ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے باوجودیکہ، اللہ کی طرف سے وہ نہیں ہے اور وہ لوگ اللہ پر جان بوجھ کر بہتان باندھتے ہیں (۷۸)

تفسیر:

یہ اہل کتاب پیسوں کی خاطر آیتیں اور تفسیریں بدل ڈالتے ہیں۔
عبرانی کی تحریر کچھ ایسی تھی کہ لہجہ بدلنے سے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے، پھر نیک نیت لوگوں کے سامنے اپنے طور پر زبان کو یوں موڑتے اور توراۃ و انجیل سے ملتے جلتے آہنگ میں یوں پڑھتے کہ لوگ اسے آسمانی کلام سمجھنے لگتے تھے۔ پھر اس کی شرح میں اللہ کا حوالہ دیتے تھے۔ آج بھی کم و بیش ان لوگوں کا حال یہی ہے۔ نہ کوئی کتاب قطعی ہے نہ ان کا مفہوم قطعی ہے۔

مگر مذہبی رہنما جب چاہتے ہیں آسمانی خداوند پر بہتان طرازی سے کام چلاتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشن گوئی سے احکام تک ہر مرحلے میں ان کی بدنیتی ایک طرح رہی۔

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفت خدا

فقیہ عالیقدر حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ نے کچھ عرصہ سے نوجوان نسل کے لئے بعض اہم موضوعات پر مشتمل، نہج البلاغہ کے شہپاروں کی تشریح و توضیح کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ پیش نظر مقالہ "معرفت خدا" کے موضوع پر آپ کے درس کا ترجمہ ہے جس میں مولائے کائنات کے خطبہ ۱۸۶ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی نویں قسط ملاحظہ فرمائیے۔

حرکت و سکون

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۸۶ سے، معرفت خدا کی بحث چل رہی تھی۔ ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے خداوند عالم کو پہچنوانے کے لئے زیادہ تر صفات سلبیہ یا صفات اضافیہ سے بحث کی ہے اس لئے کہ صفات حقیقیہ، اس کی عین ذات ہے اور ذات حق تعالیٰ کا احاطہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔

اس خطبہ کے ایک حصہ میں حرکت و سکون کی بحث تھی حضرتؑ نے فرمایا تھا کہ "حرکت و سکون خدا کی ذات میں نہیں ہیں ——— حرکت کی تعریف میں ہم نے کہا تھا کہ نقص سے کمال کی طرف وجود تدریجی کو حرکت کہتے ہیں جس کا خدا کی ذات میں گزر نہیں ہے۔ اور سکون کے بارے میں یہ عرض کیا تھا کہ مطلقاً حرکت نہ ہونے کو سکون نہیں کہتے بلکہ حرکت کی صلاحیت پائی جانے والی چیزوں میں حرکت کا نہ ہونا سکون ہے، ظاہر ہے کہ خدا کے بارے میں اس کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اور اب مزید توضیح، نیز یہ بتانے کے لئے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے بعض آیتوں کے ظواہر سے تمسک

کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا میں حرکت پائی جاتی ہے۔ ہم اس جگہ ایک روایت پیش کر رہے ہیں۔

امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم علیہما السلام کے زمانہ میں یہ بات لوگوں میں مشہور تھی کہ خداوند عالم آسمان سے نیچے اتر کر اپنی مخلوق کو دیکھتا ہے اگر بُرے کام دیکھتا ہے تو ناراض ہوتا ہے اور اگر نیک کام دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے!! العیاذ باللہ۔

نظام وجود پر خدا کا احاطہ

اصول کافی میں یعقوب جعفری سے یہ روایت منقول ہے کہ "۔۔۔ ذکر عند ابی ابراھیم علیہ السلام قوم یزعمون ان اللہ تبارک و تعالیٰ ینزل الی السماء الدنیا" امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے سامنے بیان کیا گیا کہ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا آسمان سے زمین پر آتا ہے اور اپنے بندوں کو دیکھتا ہے ـــ تو حضرت نے فرمایا " ان اللہ لا ینزل ولا یحتاج الی ان ینزل "خدا نہ تو زمین پر آتا ہے اور نہ اس کو نیچے آنے کی حاجت ہے۔

خدا نیچے نہیں اترتا کیوں کہ وہ اوپر نہیں ہے جو نیچے آئے بلکہ خدا تو ہر جگہ ہے اس لئے نیچے اترنا اس کے لئے سوچا نہیں جا سکتا، اس لئے کہ وہ نیچے آتا ہے یا اوپر جاتا ہے جو مکان اور جگہ کا محتاج ہو اور خدا جسم والا نہیں ہے جو مکان اور جگہ کا محتاج ہو۔

" انما منظرہ فی القرب والبعد سواء " اس کی نظر نزدیک اور دور پر یکساں ہے دور اور نزدیک خدا کے لئے یکساں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ " ھو معکم اینما کنتم " تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ آپ بلا تشبیہ اس کو روح اور جان کی طرح سمجھ سکتے ہیں جو جسم کے ہر حصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اگر آنکھیں دیکھتی اور دماغ کام کرتا ہے، اگر ہاتھوں میں حرکت اور پیروں میں جنبش ہے اگر جسم کا ہر حصہ جنبش کرتا ہے تو روح اور جان ہی کی بدولت جنبش کرتا ہے، جان ہی پورے بدن کو سنبھالتی ہے جسم کے تمام حرکات و سکنات جان ہی سے وابستہ ہیں وہی پورے بدن کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی کوئی مخصوص جگہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ جان ایک مجرد چیز ہے اور یہ شئے مجرد، مادّہ نہیں ہے جو جگہ والی ہو لیکن اس کے باوجود پورے نظام جسم کے قیام و بند و بست کی ذمہ دار ہے۔ اسی وجہ سے ایک شاعر نے کہا ہے۔

"حق جان جہان است و جہان جملہ بدن"

یہ تشبیہ فقط ذہن کو قریب کرنے کے لئے شاعر نے دی ہے۔

لہٰذا خداوند عالم تمام نظام وجود پر محیط ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ آسمانوں سے نزدیک ہو تاکہ زمین پر آنے کی ضرورت پڑے جس طرح انسان کی روح وجان تمام بدن کا احاطہ کئے ہوتی ہے اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جو اس کے دست تدبیر میں نہ ہو اسی طرح خدا بھی پورے نظام وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

لم یبعد منہ قریب ولم یقرب منہ بعید

کوئی قریب اس سے دور نہیں ہوتا اور نہ کوئی دوری اس سے قریب ہوتی ہے۔

ولم یحتج الی شئی بل یحتاج الیہ وھو ذوالطول

وہ کسی چیز کا نیازمند نہیں ہے بلکہ ساری چیزیں اسکی محتاج ہیں وہی صاحب فضل وعطا ہے۔

۔طول کے معنی فضل وعطا کے ہیں اسی طرح اسکے معنی بے نیازی کے بھی ہیں۔

عزیز حکیم

"لاالہ الاھو العزیز الحکیم" اس غالب وحکیم خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نکتہ کو بار بار ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآن وروایات میں جہاں کہیں لفظ "عزیز" آیا ہے اس کے بعد "حکیم" بھی آیا ہے (عزیز غالب کو کہتے ہیں اور جو غالب ہوتا ہے لوگ اس سے کچھ زیادہ خوش نہیں رہتے) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ دنیا کے دوسرے غالب افراد کی طرح نہیں ہے۔ جو غلبہ پانے کے بعد اپنی من مانی کرنے لگتے ہیں بلکہ وہ حکیم ودانا بھی ہے وہ ہر کام حکمت ومصلحت کے مطابق انجام دیتا ہے اور اپنے غلبہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا۔

متحرک محتاج ہوتا ہے۔

"اما قول الواصفین انہ ینزل تبارک وتعالیٰ فانما یقول ذالک من ینسبہ الی نقص او زیادۃ" جو یہ کہتے ہیں کہ خدا نیچے اترتا ہے" تو یہ ان لوگوں کی باتیں ہیں جو خدا سے کمی وزیادتی کی نسبت دیتے ہیں۔

"وکل متحرک یحتاج الی من یحرکہ او یتحرک بہ" ہر متحرک ایک حرکت دینے

والے کا محتاج ہے یا ایسے وسیلہ کا محتاج ہوتا ہے جس کے توسط سے وہ حرکت کرے۔
غرضکہ ہر متحرک ایک ایسے محرک کا محتاج ہے جو اس کو حرکت پر آمادہ کرے۔ اب چاہے وہ محرک موجود نفسانی ہو جیسے انسان کا نفس جو انسان کے بدن کو حرکت دیتا ہے ۔۔۔ یا صورت نوعیہ ہو جس کے توسط سے اجسام میں حرکت پیدا ہوتی ہے ۔۔۔ یا اس قوت کی مانند ہو جو پتھر میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ وہ محرک صاحب عقل و شعور ہو یا صاحب عقل و شعور نہ ہو جیسے وہ قوت جو پتھر میں پیدا ہو جاتی ہے یا قوت جاذبہ جو اجسام کو جذب کرتی ہے۔
"فمن ظن باللّٰہ الظنون ھلک" جو خدا کے بارے میں ایسے گمان کرتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

فاحذروا فی صفاتہ من ان تقفوا لہ علی حد تحدونہ بنقص او زیادۃ او تحریک او تحرک او زوال او استنزال او نھوض او قعود۔ لہٰذا خدا کی ایسی صفتوں کے ساتھ تعریف کرنے سے پرہیز کرو کہ جیسے اس کو کسی حد میں محدود کر دو یا وہ تعریف کمی زیادتی، حرکت دینے، حرکت کرنے، اترنے، اٹھنے، بیٹھنے اور زوال سے متعلق ہو (اس لئے کہ یہ تمام صفتیں اجسام سے مخصوص ہیں)

فان اللّٰہ جل و عز عن صفۃ الواصفین و نعت الناعتین و توھم المتوھمین بیشک خدا وصف بیان کرنے والوں کے وصف سے نعت بیان کرنے والوں کی نعت سے اور گمان کرنے والوں کے گمان سے برتر و بزرگ تر ہے۔

و توکل علی العزیز الرحیم اور اپنے کاموں میں اس خدا پر توکل کرو جو غالب اور مہربان ہے۔

الذی یراک حین تقوم و تقلبک فی الساجدین[1] وہی خدا جو تمہیں اس وقت دیکھتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو یا سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ کرتے ہو۔
اب یہاں سے ہم پھر خطبہ کے بقیہ حصّہ کو بیان کریں گے ارشاد ہوتا ہے۔

---

[1] اصول کافی جلد اکتاب التوحید باب الحرکۃ والانتقال۔

"ولا امتنع من الازل معناہ"

(اگر خدا میں حرکت ہوتی) تو وہ ازلی نہ ہوتا۔

حرکت، خدا کیلئے محال ہے۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ حرکت کیلئے چھ چیزیں لازمی ہیں۔ ان میں سے ایک مبدأ ہے (یعنی جہاں سے حرکت شروع ہوتی ہے) اس جملہ میں حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر خدا میں حرکت ہوتی تو وہ ازلی نہ ہوتا اس لئے کہ اس کی ذات کے لئے مبداء فرض کرنا پڑتا حالانکہ اس کے ازلی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی ابتداء نہیں ہے۔

لہٰذا اگر "معناہ" میں "ہ" کی ضمیر خدا کی طرف پلٹے تو مذکورہ جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا ازلی ہونا محال ہو جائے گا اور ازلیت کا اس کے بارے میں پھر کوئی مفہوم نہ رہ جائے گا ـــــ اور اگر ضمیر ازلیت کی طرف پلٹے تو جملہ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ معنائے ازل ازلی ہونے سے ممتنع ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ازلیت اپنے معنی کو کھودیگی۔ یعنی وہ خدا جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ ازلی ہے اگر اس میں حرکت پائی جائیگی تو وہ ازلی نہیں رہ جائیگا اس لئے کہ مبداء پیدا ہو جائیگا۔

"ولکان لہ وراء اذ وجد لہ امام"

اگر اس کے لئے سامنے کی جہت ہوگی تو پیچھے کی جہت بھی اس میں پائی جائے گی ارکان حرکت میں سے ایک چیز انتہا ہے، حرکت میں جیسے ابتدا ہوتی ہے ویسے ہی انتہا بھی ہوتی ہے۔ موٹر والی مثال جو گذشتہ بحث میں ہم پیش کر چکے ہیں، آپ اس پر غور فرمائیں تو اندازہ ہوگا کہ اصفہان اس موٹر کے سفر کی آخری منزل ہے جو قم سے اصفہان کی طرف جا رہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اصفہان اس موٹر کے آگے کی سمت میں اور قم پیچھے کی جہت میں ہوگا، لہٰذا اگر حرکت کرنے والی چیز کیلئے آگے کی سمت فرض ہوگی تو پیچھے کی سمت بھی ضرور فرض ہوگی ـــــ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اگر خدا حرکت کرنا چاہے تو جسم کا ہونا ضروری ہے اسلئے کہ بغیر جسم کے اگلی اور پچھلی سمت نہیں ہو سکتی اور جب وہ جسم ہو جائے گا تو مرکب ہوگا اور ہر مرکب محتاج ہوا کرتا ہے درآں حالیکہ خدا کی ذات میں احتیاج کا کہیں سے گزر نہیں ہے۔

"ولا لتمس التمام اذ لزمہ النقصان"۔

اگر اس میں کمی پیدا ہو جائے تو وہ تکمیل کا محتاج ہو گا۔

کمال کی طرف پیش قدمی حرکت کا لازمہ ہے۔

یہ جملہ پہلے والے جملہ "اذاً لتفاوتت ذاتہ" کا بیان ہے۔ معنائے حرکت اور اس کا لازمہ نقص سے کمال کی طرف بڑھنا ہے بلکہ حرکت تدریجی ترقی کے سوا اور کچھ نہیں! وہ موٹر جو قم سے اصفہان تک کی مسافت طے کر رہی ہے وہ حرکت ا یعنی " میں رو بہ تکمیل ہے ۔۔ یا ۔۔ وہ سیب جو ابھی سبز ہے اور بعد میں زرد ہو گا یا ابھی چھوٹا ہے بعد میں بڑا ہو گا اس کی "حرکت کیفی" میں تدریجی ترقی ہو گی حضرت کے ارشاد میں جو "لا لتمس التمام" کا جملہ آیا ہے وہ تدریجی ترقی کے معنی میں ہے۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو خدا حرکت کرتا ہے وہ ناقص ہے اور کمال چاہتا ہے درآں حالیکہ خدا ناقص نہیں ہو سکتا، دراصل خدا کی معرفت کا راستہ بس یہی ہے کہ ہم اپنے کو ناقص اور اس کا محتاج سمجھیں جو کمال محض ہے جب ہم اپنے کو ناقص سمجھ لیں گے تو یہ سمجھ میں آجائیگا کہ ہم مخلوق ہیں ہم کو کوئی رزق دیتا ہے وغیرہ.... یہیں سے ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ ہمارا کوئی خالق، رازق اور بنانیوالا ہے، لہذا پتہ چلا کہ جس خدا میں حرکت ہو گی وہ ناقص اور رو بہ کمال ہو گا اس لئے خدا میں حرکت کا پایا جانا محال اور ناممکن ہے۔

"واذاً لقامت آیۃ المصنوع فیہ"

ایسی صورت میں اسمیں مخلوق کی علامتیں پیدا ہو جائیں گی۔

جو خدا نقص سے کمال کی جانب بڑھ رہا ہو گا اسمیں مخلوق اور مصنوع کی علامت پیدا ہو جائے گی اور مخلوق میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ خالق ہو جائے۔

ولتحوّل دلیلاً بعد ان کان مدلولاً علیہ

ایسی صورت میں جبکہ سارا عالم اسکی ذات پر دلیل ہے وہ کسی اور کی ذات پر دلیل بن جائے گا۔

سارا عالم خدا کی ذات کی دلیل ہے۔

ساری دنیا خدا کے وجود کی دلیل ہے یعنی دنیا کی ہر چیز اس کی ذات پر دلالت کر رہی ہے، اس لئے کہ تمام موجودات عالم ناقص ہیں ایک ایسے خالق کی محتاج ہیں جسمیں کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔

اگر خدا حرکت کرنے والا ہو تو وہ "مدلول علیہ" (یعنی ایسا جس پر دلالت ہو سکے) نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ایسی صورت میں وہ ناقص ہو جائے گا اور ناقص "دال" (دلالت کرنے والا) ہوتا ہے، "مدلول علیہ" (جس پر دلالت ہو رہی ہو) نہیں ہوتا — یعنی ناقص اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی کامل نے اس کو ایجاد کیا ہے، وہ ناقص اس وجود کامل کا نیازمند ہوتا ہے۔ لہٰذا عالم جو ناقص ہے، حرکت والا ہے اور رفتہ رفتہ کمال کی طرف بڑھ رہا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی خدا کا وجود ہے جو اس عالم کو عدم کے پردہ سے نکال کر میدان وجود میں لایا ہے — اب اگر وہ خدا جس کو یہاں فرض کیا گیا ہے حرکت والا ہو تو وہ دوسرے خدا پر دلیل بنے گا جس کا وہ نیازمند ہے، اور ایسا فرضی خدا جو دوسرے خدا پر دلیل ہو ناقص ہے ناقص اور دلیل ہونے کے بعد وہ خدا نہیں رہ جائیگا۔ پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عالم اس کے وجود کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ وہ خود ہی اس دوسرے خدا پر دلیل ہے جس نے اس کو وجود کا لباس پہنایا ہے۔ درآں حالیکہ کوئی ایسا خدا فرض ہی نہیں کیا جا سکتا جو ناقص اور محتاج ہو اس لئے کہ خدا کامل اور بے نیاز ہے۔

"وخرج بسلطان الامتناع من ان یؤثر فیہ ما یؤثر فی غیرہ"

اس امر مسلم کی رو سے کہ اس میں مخلوق کی صفتوں کا ہونا ممتنع ہے۔ اس لئے وہ اس سے بری ہے کہ اس میں وہ چیز اثر انداز ہو جو ممکنات میں اثر انداز ہوتی ہے۔

خدا محل حوادث نہیں

مذکورہ بالا جملہ کس جملہ پر عطف ہے اس سلسلہ میں شارحین نہج البلاغہ نے بہت بحث کی ہے یہاں دو احتمالات بیان کئے گئے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔

۱۔ ایک احتمال تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ جملہ میں "واو" واو عاطفہ نہیں ہے بلکہ "واو حالیہ" ہے۔ اس بنا پر مذکورہ فقرہ کے معنی یہ ہوں گے کہ "وہ خدا جس کو تم نے فرض کیا ہے اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ دوسرے خدا کا محتاج ہو درآں حالیکہ خداوند عالم دلیل امتناع کے ذریعہ اس بات سے بالا تر ہے کہ اس میں وہ چیز اثر انداز ہو جو اس کے غیر (تمام ممکنات) میں اثر انداز ہوتی ہے، یعنی یہ حرکت جو موجودات عالم میں اثر انداز ہوتی ہے خدا کی ذات میں اس کا کوئی اثر نہیں ہے اس لئے کہ خدا کا وہ بلند مقام ہے جہاں کوئی چیز اس کی ذات پر اثر نہیں ڈال سکتی یعنی یہ محال ہے کہ کوئی چیز جو دوسری

تمام چیزوں پر اثر ڈالتی ہے اسکی ذات پر اثر انداز ہو۔

۲۔ دوسرا احتمال : ممکن ہے کہ "واو" واو عاطفہ ہو اور مذکورہ بالا جملہ " لایجری علیہ السکون والحرکۃ " پر عطف ہو یعنی ان دو جملوں کے درمیان جو دو جملے ہیں وہ پہلے جملہ سے مربوط ہوں اور یہ جملہ بھی اسی پہلے جملہ پر عطف ہو۔ حضرت نے وہاں فرمایا تھا کہ سکون و حرکت خدا پر طاری نہیں ہوتے اس کے بعد جو جملے آئے ہیں وہ اس بات کو بیان کر رہے ہیں کہ خدا میں حرکت و سکون کیوں نہیں ہیں اور پھر یہ جملہ حضرت نے بیان فرمایا کہ "خداوند عالم امتناع کی دلیل سے اس بات سے بالاتر ہے کہ وہ چیز اس پر اثر کرے جو اس کے غیر پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان دونوں جملوں کے ربط سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا حرکت و سکون کا حامل نہیں ہے اس لئے کہ کسی چیز کا اس کے اندر اثر کرنا محال ہے یعنی وہ ایسا ہے جس پر کوئی چیز اثر نہیں کر سکتی، واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خدا محل حوادث نہیں ہے، اگر وہ محل حوادث ہوتا تو اس کا لازمہ یہ تھا کہ وہ خود بھی حادث ہوتا اور یہ محال ہے۔

شہید مظلوم آیت اللہ ڈاکٹر بہشتی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

حج اور قرآن

حج کا اجتماعی پہلو

معاشرہ کے دو نظام

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ معنویت و روحانیت سے سرشار معاشرتی نظام اور اس سے بے بہرہ نظام دو الگ الگ اجتماعی نظام ہیں۔ یا یہ کہ دنیا میں انسانی زندگی کی گاڑی یا ایمان نظام کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ ہاں یہ ضرور کہتے ہیں کہ معاشرہ کا غیر ایمانی نظام اور وہ نظام جس میں ایمان کی روح کارفرما ہو انسان کی زندگی کو دو الگ الگ رخ عطا کرتے ہیں۔ ایک رخ منظم تو ہے لیکن بے روح اور بے جان گسل جبکہ دوسرا معاشرہ ایک باروح نظام سے منظم ہے۔ گویا پہلا نظام مشینی ہے اور دوسرا انسانی۔ یہ صحیح ہے کہ انسان بھی ایک مشین ہے (کون کہتا ہے کہ انسان مشین نہیں ہے؟) عالم خلقت کی تمام پیچیدہ سے پیچیدہ ترین مشین اور آجکل بنائے جانے والے پر پیچ کمپیوٹر بھی انسان کے صرف اعصاب اور دماغ کے پیچیدہ نظام کی برابری نہیں کر سکتے (میں فکر و اندیشہ سے مربوط نظام کی طرف اشارہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اس سے بھی پیچیدہ ہے) دنیاوی مشینیں تو خون کی گردش اور اس کے کنٹرول کے نظام کے برابر بھی پیچیدگی و ظرافت نہیں رکھتیں۔ حتی انسان کے مغز کی ایک باریک سی جھلی انسان کی زندگی میں جو اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ویسی نزاکت بھی دنیا کی مشینوں میں نہیں ہے۔ بہرحال انسان ایک بہت پیچیدہ مشین ہے۔ لیکن وہ نازک و پیچیدہ ہونے کے علاوہ ایک اور اہمیت کا حامل ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ مشین ہونے کے ساتھ ہی روح بھی رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ مشین کی طرح ایک نظم کا محتاج ہے لیکن اسے ایک باروح نظم چاہئے ایسا نظم جس میں ایمان اس کی روح کی طرح اس کی زندگی کی رگ و پئے میں سرایت کئے ہوئے ہو۔ یہی انسانی نظام ہے۔ ایمان سے الگ نظام زندگی کا

انسانی نظام ہونا محال ہے۔ ایسا انسان فقط مشینی کردار ادا کر سکتا ہے۔ کہ وقت پر تنخواہ حاصل کرے بجٹ کے مطابق خرچ کرے بچت کرے۔ مناسب موقع پر چھٹی لے، یا موقع پر سیر و تفریح کو جائے، وقت سے کھانا کھائے، بروقت نہائے، وقت پر اپنی خواہشات کو پورا کرے، وقت سے سوئے اور جاگے۔ وقت سے کھیل تماشوں میں شریک ہو، وقت سے خوشی و غم کا اظہار کرے اور حالات فراہم ہوں تو آدم کشی پر بھی اتر آئے یا کبھی جان بوجھ کر یا نا سمجھی میں حیوانوں سے بھی زیادہ بدتر افعال کا مرتکب ہو گویا گھڑیوں میں قید ہو کر لمحوں اور حالات کا غلام بن جائے، یہ سب بھی ایک نظام کے تحت ہے لیکن کیا اسے انسانی نظام کہا جا سکتا ہے؟

حج کے سفر میں انسان کو اس بار دوح معاشرہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ نظر آتا ہے۔ میں نے خود اس سفر کے دوران یہ بات محسوس کی اور بعد میں لوگوں سے دریافت بھی کرتا رہا ہوں کہ مسافروں کی اتنی کثرت کے باوجود اتنے مختصر سے دنوں میں مسافروں کے اس قدر مسافت طے کرنے کے دوران عام دنیا کے اجتماعات کے مقابلے میں سڑک کے حادثوں اور ایکسیڈنٹ کی شرح بہت کم نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہاں ڈرائیور اور مسافر دونوں ان چند دنوں میں روحانی طور پر خدا کی رحمت کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں درحقیقت ایمان کی حکومت کے تحت یہ چند روزہ زندگی ایک خاص کیفیت رکھتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں کوئی ایکسیڈنٹ ہی نہیں ہوتا اور کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا ـــ ہوتا ہے، لیکن جو بات قابل دید ہے یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے اجتماعاتی حادثات اور یہاں کے حادثات میں کتنا فرق ہے۔ اگر یہ حادثات دو گنے یا سہ گنے فرق کے ساتھ بھی ہوتے تو کوئی خاص بات نہ ہوتی لیکن یہاں تو بڑا فرق ہے اور یہ فرق حقیقتاً مشینی نظم اور بار وح نظم کا فرق ہے۔

عرفات میں ظہر سے پہلے کا وقت تھا۔ کچھ لوگ مجھ سے دینی مسائل دریافت کرنے آئے تھے ان میں سے بعض لوگ باہر کے ملکوں سے اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے ایران واپس ہوتے ہوئے حج سے مشرف ہوئے تھے۔ اور بعض ایران سے آئے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ گویا منہ کا مزہ بدلنے اور تنوع کی خاطر اس سفر پر آئے تھے لیکن بعد میں خود ان سب نے اعتراف کیا کہ ہم نے اپنی زندگی میں بہت سے سفر کئے لیکن اس سفر سے زیادہ کسی سفر نے ہمیں متاثر نہیں کیا۔ بہرحال ہم لوگ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ میں ان سے فلسفۂ حج کے موضوع پر باتیں کر رہا تھا اور اس گفتگو کو بھی یادِ خدا شمار کر رہا تھا۔ میں اگرچہ ان سے کہتا کہ چار ہی دنوں کے لئے یہاں آیا ہوں لہٰذا چاہتا ہوں کہ اس گفتگو کے بجائے زیادہ تر "یا اللہ یا اللہ" کا ورد کروں تو اس وقت میرا ذکرِ خدا کرنا بھی غلط ہوتا۔ میں اس گفتگو کو بھی یادِ خدا سمجھتا رہا اور یہ بات میں نے ان لوگوں سے بھی کہی کہ ہماری یہ گفتگو ان چند دعاؤں کی ہم پلہ ہے جنہیں ہم اس وقت پڑھنا

جاتا تھا۔ اب یہی میرے لئے دعا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے لئے بھی بمنزلہ دعا ہوگی۔ میں ان سے حاجیوں پر اس عبادت کے مثبت اور سازگار اثرات کو بیان کر رہا تھا کہ منجملہ ان میں سے ایک اثر یہ بھی ہے کہ اس عبادت میں انسان اپنے آپ میں آجاتا ہے اور اپنی حقیقت کا احساس کر لیتا ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ ابھی جب یہاں آرہا تھا تو اتفاق سے راستے میں مجھے اس خودشناسی کا ایک چھوٹا سا اور جزئی نمونہ نظر آیا۔ ایک خیمہ میں میں نے فلاں فوجی جنرل کو دیکھا جو بہت ہی سادہ سا لباس پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس جنرل کو میں نے پہلے بھی اکثر دیکھا ہے۔ یہ جیسے ہی میدان میں داخل ہوتا تھا اس قدر کڑکتا بھڑکتا اور شور مچاتا تھا کہ خدا کی پناہ دوسروں سے بھی وہ اسی کی توقع کرتا تھا نتیجہ میں جب وہ فوجیوں کی صف کے قریب پہنچتا تھا تو میدان میں ایک مصنوعی ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ میں آگیا ہے اور سمجھ گیا ہے کہ اصل میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تمام مصنوعی ترک بھڑک جو اس کے جسم و جان پر طاری کر دی گئی ہے اصل میں فنا اور نابودی کی بنیادیں اور علامتیں ہیں اور وہ ان کا اسیر ہے۔ چار دنوں کے لئے یہاں آیا ہے تاکہ ان سب سے دور ہو کر یہاں کی آزاد فضا میں سانس لے سکے۔ اس شخص نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں نے دیکھا کہ وہ جنرل بیٹھا ہوا دعائیں پڑھ رہا ہے اور ذکر خدا میں مشغول ہے اس کی ساری جرنیلی اور ترک بھڑک ہوا ہو گئی ہے اور ان چند دنوں میں اس کے چہرے پر پائے جانے والے فرعونیت کے آثار بھی غائب ہو چکے ہیں۔ ان دنوں وہ ایسی جگہ آیا ہوا ہے جہاں اسے ایمان کی ایک جھلک نظر آگئی ہے۔ اس سے زیادہ کی اس میں صلاحیت بھی تو نہیں ہے۔ اگر ایمان اس سے زیادہ اسمیں نفوذ کر جائے تو یہاں سے واپسی پر اسے بدل جانا چاہئے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو حج کے ایک ہی سفر میں پورے طور سے بدل گئے، لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ حضرت بھی ان خوش قسمت افراد میں سے ہوں۔

میں اس جنرل سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی اس کا نام جانتا ہوں لیکن یہ وہ واقعہ ہے جو اس جوان نے بیان کیا۔ اس نے ایک اچھی بات کہی کہ وہ جنرل یہاں چند دنوں کے لئے آیا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے ایمان کی بنیاد پر اپنی زندگی کو ایک دم سے بدل ڈالا اب اس کا قیافہ بھی میدان میں نظر آنے والے دیو جیسا نہیں ہے۔" اب اگر وہ جنرل مجھ سے آکر یہ سوال کرتا کہ اگر میں فوج میں جنرل ہونے کی حیثیت سے اپنے ماتحت سپاہیوں سے بلا وجہ باتیں کروں یا ان سے ہنسی مذاق کروں تو کیا میں ایک با ایمان سپہ سالار کہلا سکتا ہوں؟ تو میں اس سے کہتا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم لیے ہو جاؤ بلکہ تم اپنی حیثیت پر غور کرو۔ تم ایک مسلمان، شیعہ ہو اور علیؑ تمہارے پیشوا ہیں جو خود میدان جنگ کے عظیم سپہ سالار تھے۔ یا ان سے بڑھ کر پیغمبر اسلامؐ کے سلسلے میں غور کرو کہ یہ دونوں سپہ سالار میدان جنگ میں اپنے ماتحتوں سے کیسا سلوک کرتے تھے۔ کیا شدید نظم و ضبط تھا اور کتنی محکم سپہ سالاری تھی لیکن ساتھ ہی جب پیغمبر اسلامؐ یا حضرت علیؑ

یہ احساس کرتے تھے کہ فلاں سپاہی یا افسر نرم روی یا مہربانی کا سزاوار ہے جس سے میدان جنگ کے نظام میں بھی کوئی خلل واقع نہ ہوگا تو ایسے میں وہ حضرات کیا کرتے تھے؟ مجھے یقین ہے کہ ایمان کے سایہ میں خدا سے قریب ہونے والا ایک سپہ سالار اپنے اس مختصر سے فریضہ میں کبھی بھی غفلت سے کام نہ لیتا۔ اور تم بھی اگر قطعی اور فیصلہ کن روش کے ساتھ جس میں فرعونیت کا اظہار نہ ہوتا ہو اپنے ماتحتوں کے ساتھ پیش آؤ تو تم پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اتفاق سے آج کل سماج کے اداراتی نظام میں یہی صورت حال نظر آتی ہے کہ اداروں کے ذمہ دار فرعونیت میں تو پیش پیش نظر آتے ہیں لیکن کام میں بڑی ڈھیلی ڈھالی اور غیر مستحکم روش پر عمل کرتے ہیں جبکہ ہونا اس کے برعکس چاہئے کہ کام میں تیز ہوں اور انسانیت کا مجسمہ بھی نظر آئیں۔

اس چھوٹی سی بزم میں ایک انجینئر صاحب بھی تھے جنھوں نے اپنے بارہ میں اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا میں ادھر بھی سخت مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہوں ابھی حال ہی میں مجھے ایک جگہ کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ امید ہے وہاں آپ بہتر طور پر خدمت انجام دیں گے، وہ صاحب بولے یہی تو مصیبت ہے کہ کام نہیں کرنے دیتے اور ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ پریشان بھی کرنا شروع کر دیا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا میرے دوسرے ہم رتبہ ساتھی کہتے ہیں کہ تمہارا افسر اعلیٰ تم سے بہت ناراض ہے۔ میں نے پوچھا آخر کیوں؟ تو وہ کہنے لگے کہ آپ ادارہ کے اصول کی پابندی نہیں کرتے، میں حیرت زدہ رہ گیا: کیا پہلے سے کام تیز اور خوش اسلوبی سے نہیں ہو رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: کام تو پہلے سے بہتر ہو رہا ہے لیکن آپ اپنے ماتحتوں کو چھٹیاں بہت زیادہ دیتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی آپ تو ابھی کہہ رہے تھے کہ کام پہلے سے تیز انجام پا رہا ہے اب ایسے میں اگر میں کسی ملازم کو تھوڑی دیر کی چھٹی دیتا ہوں تو بلاوجہ نہیں دیتا بلکہ اس کی احتیاج وضرورت کی وجہ سے اجازت دیتا ہوں۔ کہنے لگے آپ کا یہ عمل دوسروں کے لئے زحمت کا سبب بنتا ہے۔ میں نے کہا دوسرے بھی اسی طرح اپنے ماتحتوں کو اجازت دیں اور کام کی رفتار تیز کریں۔ وہ بات ٹالتے ہوئے بولے اور دوسری باتیں بھی ہیں مثلاً فلاں روز آفس کی میٹنگ میں جیسے ہی افسر اعلیٰ کی باتیں ختم ہوئیں آپ فوراً اٹھے اور روانہ ہوگئے نہ آپ نے افسر کی دلجوئی کی نہ اس کا احترام بجالائے یہ تو ماتحت کی طرف سے مافوق کا حق ہوتا ہے۔ اس پر میں نے ان سے کہا بھائی میں اس کا اہل نہیں ہوں اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری طرف سے ان سے عرض کر دیں کہ اگر میرا طرز کار ان کے مذاق ومزاج پر پورا نہ اترتا ہو تو مجھے اس خدمت سے معاف ہی رکھیں تاکہ آئندہ آپ کے لئے باعث زحمت نہ بن سکوں۔

میرے اس انجینئر دوست کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایمان رچا بسا ہوا ہے میں اسے عرصہ سے جانتا ہوں

یہ درحقیقت اس کا ایمان ہے جو اسے یہ کہتا ہے کہ اگر آفس کے کارکنوں میں سے کسی کو گھنٹہ دو گھنٹہ چھٹی کی ضرورت ہے جس سے ادارہ کے نظام میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا تو کارکن اس کا مستحق ہے۔ وہ بہترین طرز اور ایمان داری کے ساتھ آفس کو چلانا چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ ایمانی نظام صرف مشینی نظام ہی نہیں ہے بلکہ ایسا نظام ہے جسمیں پیچ در پیچ مشینی نظام کے علاوہ بھی ایک نظم پایا جاتا ہے اور اس میں مشینی نظام کی بھی پوری رعایت لازم و ضروری ہے۔ ایک افسر کو یہ سوچنا چاہیئے کہ ایک کارکن جس کی بیوی بیمار ہے اور وہ اسے تھوڑی دیر کے لئے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا ہے۔ اگر اسے ادارہ میں روکے تو کسی طرح بھی سود مند نہ ہوگا۔ وہ الجھن میں گرفتار ہو کر کام ہی نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس افسر ایسے ہی پریشان حال کارکنوں کو اجازت نہیں دیتے جس کے نتیجہ میں کام کی رفتار کند ہو کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ یہ انجینیئر لوگوں کو نہیں روکتا پھر بھی پورا کام انجام پا جاتا ہے۔ دراصل ان افسروں کا نظم و ضبط بے روح ہے اور اس انجینیئر کا نظم با روح ہے بے روح نظام اپنے سے متعلق لوگوں کی ضروریات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جبکہ با روح نظام دفتری نظم و ادارہ کی بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپسی محبت و احساسات کا بھی خیال رکھتا ہے، لہٰذا وہ اپنے کارکن سے کھرا کام بھی لیتا ہے ساتھ ہی محبت کا برتاؤ بھی کرتا ہے لہٰذا کارکن بھی اس سے خوش رہتا ہے اور کام میں دلچسپی لیتا ہے۔ غور کیجئے کہ خاندان اہلبیتؑ سے محبت اور ان کے روحانی کمالات کے معترف شاعر فرزدق نے امام چہارم حضرت سجاد علیہ السلام سے متعلق کیا کہا؟ امام سجادؑ وہ ہیں کہ جب کوئی شخص ان کے روبرو ہوتا ہے تو احترام کے پیش نظر ان سے نگاہیں ملانے کی جرأت نہیں کرتا۔ دراصل یہ احترام ان کے خوف کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ یہ امام کی روحانی عظمت ہے جو مقابل کو ان کے احترام پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ان کا مقابل فطری طور سے انکا احترام کرتا ہے دوسری طرف انکا حکم بجالانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ امام اسے دوست رکھتے ہیں لہٰذا وہ بھی ان کو دوست رکھتا ہے۔ یہی روحانی نظام ہے۔ ایسا نظام ہے جس میں قاطعیت بھی پائی جاتی ہے اور محبت بھی۔

اصل میں یہ بحث ولایت کا ایک حصہ ہے۔ ولایت اسلامی اور حکومت اسلامی ایک ایسی حکومت ہے جہاں حاکم و مدبر، رعایا اور عوام سب ایک دوسرے سے الفت رکھتے ہیں۔ ولایت کے معنی ہی اپنے "تسلط" و حاکمیت کے ہیں جس میں "محبت" کا جذبہ برابر سے کارفرما ہو۔ یہاں اداری اور قلبی رشتے باہم یکساں ہوتے ہیں اور ایک دوسرے الہام و کسب فیض کرتے ہیں۔ بنابریں سفر حج کے آثار میں ایک اثر یہ بھی ہے کہ انسان وہاں ایک ایسی اجتماعی زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے جس میں ایمان کا نفوذ اور اس کی تجلی پائی جاتی ہے۔

سفرِ حج کی ایک سبق آموز یادداشت :۔

اس بات کے ثبوت میں اپنے سفر کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں یہ ایک سعودی افسر اور دو ایرانی تاجروں کا واقعہ ہے۔ ایک روز دوپہر کے وقت ہوا معمول سے زیادہ گرم تھی ۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مسجد الحرام میں موجود تھا اور وہاں سے واپسی میں اپنے دو ایرانی دوستوں کے یہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ ملاقاتیں بھی دراصل حج کی سنتوں کا ایک حصہ ہیں۔ ٹھیک بارہ بج چکے تھے اور ہم روانگی کے لئے تقریباً آمادہ تھے کہ نماز پڑھ کر دوپہر کے کھانے کے لئے روانہ ہو جائیں گے ۔ اچانک میں نے دیکھا کہ مسجد الحرام کے نزدیک کچھ لوگ کسی کا احاطہ کئے ہوئے کھڑے ہیں ۔ میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ دو ایرانی جو میرے لئے ناآشنا تھے وہاں موجود ہیں ۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر فوراً اندازہ لگایا کہ میں بھی ایرانی ہوں ۔ میرے قریب آئے اور سلام وعلیک کے بعد مدد کی درخواست کی ۔ میرے دریافت حال پر انہوں نے بتایا کہ ہم یہاں سے گذر رہے تھے کہ دیکھا ایک حاجی یہاں گرا پڑا ہے ۔ نہیں معلوم کون ہے اس کے چند بے ربط جملوں سے اندازہ ہوا کہ عراقی ہے۔ اس پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے اور اس کی جان خطرہ میں ہے۔ ہم ایرانی ڈاکٹروں کے کیمپ میں گئے اتفاق سے یہی کیمپ یہاں سب سے زیادہ نزدیک ہے لیکن انہوں نے کہا کہ چونکہ اس وقت ہمارا انچارج موجود نہیں ہے اس لئے ہم کسی غیر ایرانی مریض کو قبول نہیں کر سکتے ۔ میں نے پوچھا کہیں اور نہیں گئے ؟ کہنے لگے زبان سے ناواقفیت کی بنا پر کہیں اور نہیں گئے ۔ میں نے کہا ذرا ٹھہرو ابھی آتا ہوں ۔ واپس آکر میں نے اپنی اہلیہ سے کہا تم ابھی یہیں رکو اس وقت نماز جماعت سے اہم کام در پیش ہے ۔ واپس آیا اور ایرانی کیمپ میں جا کر ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ میں نے سنا ہے آپ نے ان لوگوں کی درخواست کا انکار میں جواب دیا ہے۔[1]

اس نے جواب دیا ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے لہٰذا ہم مجبور ہیں ۔ اگر یہ مریض یہاں فوت کر جائے تو مجھ سے بازپرس کی جائے گی کہ تم نے اسے کیوں قبول کیا تھا ۔ میں نے اسے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا آپ اسے نوٹ کر لیں اور کوئی بھی پوچھے اس سے کہہ دیں کہ اس کی ذمہ داری میرے سر ہے ۔ اس وقت کچھ دیر کے لئے اس مریض کو یہاں رکھ لیجئے ایک ذرا اپنے قوانین سے ہٹ کر بھی فرائض کا احساس کیا کیجئے ۔ یہ بیچارہ موت و حیات کی کشمکش میں ہے

[1] یہ واقعہ انقلاب سے پہلے کا ہے ۔ (مترجم)

تھوڑی دیر کے لئے اسے آفتاب کی تپش سے نجات دیدیجئے، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آدھے گھنٹے بعد اسے دوسری جگہ منتقل کر دوں گا۔ یہ آدھے گھنٹے میں تو نہیں مرے گا۔ بالآخر اس ڈاکٹر نے میری بات مان لی مریض کو لاکر اوپر کے کمرہ میں بستر پر لٹا دیا گیا اور ان دو ایرانیوں میں سے ایک کو اس کی دیکھ بھال پر مقرر کرکے دوسرے شخص کے ہمراہ ایک مستقل راہ حل کی جستجو میں باہر آیا۔ اپنی اس یادداشت کو میں نے اس لئے بیان کیا کہ اگر کوئی شخص اس منظر پر غور کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ وہ دو ایرانی مومن کہ جب تک انہوں نے اس بیمار کو ایمبولینس تک نہ پہنچا لیا اس تپتی ہوئی دوپہر میں چین سے نہ بیٹھ سکے۔ میں نے اگرچہ ان دونوں سے پوچھا بھی، تمہیں کوئی اور کام تو نہیں ہے۔ وہ بولے اس وقت یہ کام سب پر مقدم ہے جب تک یہ مریض ہسپتال نہ پہنچ جائے ہمیں سکون نہ ہوگا۔ سوچئے ان دونوں حاجیوں کا احساس فرض کتنا لذت بخش ہے۔ اور ایمان کی روشنی سے منور اجتماعی زندگی کا یہ پہلو انسان کی نگاہ میں کس قدر مجسم کرتا ہے انسان اگر دس روز کے لئے بھی اس اجتماعی زندگی کا مشاہدہ کرے تو یہ چند دن ہی دنیا کے نام نہاد جہنم نما اجتماعی نظام کے مقابلے میں بہت موثر ثابت ہوں گے۔ وہ جہنم نما نظام جو ہپی ازم کی شکل میں مغربی یورپ اور امریکا وغیرہ میں وہاں کے جامد و خشک ماحول میں گناہ و عصیان بنکر پھیل چکا ہے اور انسانیت رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرقی ملک میں اگر رواج دیا جائے تو عصیان کہاں تک پھیل سکے گا۔ میں نے جرمنی کے اخبارات میں اس کے نمونے تو دیکھے ہیں لیکن معلوم نہیں مشرقی ملک کا مزاج بھی مغرب کی طرح عیاش پسند ہے کہ نہیں۔ بہرحال جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ ایک خشک نظام، چاہے وہ سوشلسٹ ہو یا کیپٹلسٹ انسانی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ انسان اصل میں نظام چاہتا ہے۔ ہرج مرج اور ناہم آہنگی، زندگی کے لئے مفید و بہتر ثابت نہیں ہوسکتی۔ بغیر اجتماعی نظام اور حکومت کے زندگی، زندگی نہیں۔ لیکن یہ حکومت و نظام بھی انسانی ہونا چاہئے۔ ایسا نظام ہونا چاہئے جس میں ایمان متجلی ہو اور انسان انہیں ایام حج میں ایمانی روشنی سے منور اجتماعی زندگی کے ایک نمونہ کا مشاہدہ کرتا، اس سے لذت حاصل کرتا اور اس ماحول میں اس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ اب اگر وہ حقیقت شناس و حقیقت پسند ہے تو ایک بہتر و اعلیٰ اجتماعی نظام کی تشخیص بھی کر سکتا ہے۔

حج کے سماجی فائدے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ہمیں حج سے دو نتائج حاصل کرنے چاہیں۔ ایک سماجی فلاح و بہبود کے نتائج اور دوسرا اس فریضۂ حج کے تعمیری نتائج اور ہر انسان مراسم حج کے دوران اجتماعی نظام کی نمود میں ایمان کے موثر کردار کا

مشاہدہ کر سکتا ہے۔ حج کے دوران لوگوں کے ایک دوسرے سے روابط ہر لحاظ سے ایسے روابط ہیں جن میں ایمان جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اور اس روشنی کے تحت انسان کی رفتار و گفتار میں ظلم و تعدی، خود خواہی و خود بینی کے آثار بہت ہی کم پائے جاتے ہیں (میں یہ نہیں کہتا کہ ہوتے ہی نہیں بلکہ بہت کم نظر آتے ہیں) وہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان خود اپنی جگہ پر غور کرنے لگتا ہے، کاش اگر ایک عظیم عالمی سماج پورے سال بھر اسی ایمانی تاثیر کے تحت زندگی گذارتا اور باہمی محبت و برادری کا برتاؤ کرتا، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

میرے ایک عزیز دوست جو ڈاکٹر ہیں اور مجھ سے محبت سے ملتے ہیں دین دار ہیں اور کافی حد تک با عمل بھی ہیں، مجھ سے ایک روز کہنے لگے مجھے اپنے ہم عمر و ہم نشین دوستوں سے شکوہ ہے۔ میں نے پوچھا، کس بات کا کہنے لگے دراصل انسان کسی بھی اجتماعی نظام میں زندگی گذارے اور کسی بھی حکومتی سسٹم کے تحت رہے لیے معاشرتی اصولوں کا پابند ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہمفکر دوست یہ بہانہ کرتے ہوئے کہ یہ نظام ہمارے لئے نامناسب ہے۔ ان کلی و عموی نظاموں کے قوانین سے سرپیچی کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف غیر عادل نظاموں کو قبول نہیں کرتے بلکہ اپنی عادت کے تحت عادل نظام کو قبول کرنے پر بھی آمادہ نہ ہوں گے۔ مثال کے طور پر میرے ایک دوست جو اجتماعی اور سماجی اصلاح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور انہوں نے اس سلسلہ میں کافی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں، ایک روز میں نے انہیں دیکھا کہ یک طرفہ ٹریفک والی سڑک پر مخالف سمت سے اپنی کار میں بہت تیزی سے چلے آرہے ہیں۔ اس دن تو میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ بعد میں جب میں ان سے ملا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اس دن ٹریفک کے قانون کی رعایت کیوں نہیں کی؟ کہنے لگے، جناب یہ شہنشاہی نظام سر سے پاؤں تک غلط ہے۔ اس کے کسی بھی قانون کی پابندی نہیں کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا آخر آپ اس طرف سے آرہے تھے جدھر ساری گاڑیاں یکطرفہ روڈ خیال کر کے بڑی تیزی سے جا رہی تھیں ایسے میں فطری طور پر حادثہ کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہاں یہ تو ہے۔ میں نے عرض کیا، کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے جا ٹکرائیں جن کی فلاح و نجات کے لئے آپ نے مدتوں آلام و شدائد برداشت کئے ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ میری باتیں میرے دوست کے لئے اس قدر عجیب تھیں کہ وہ صرف حیرت سے مجھے دیکھتے رہے۔ لیکن اسے قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔ وہ مجھ سے اس بات کا شکوہ کر رہے تھے کہ ہم نے اپنی اور اپنے ہم فکر افراد کی تربیت کے لئے صحیح قدم نہیں اٹھایا ہے کیونکہ صحیح تربیت و خدمت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود منظم ہوں نظم

پابند رہیں اور اس کوشش میں لگے رہیں کہ ایک بہتر نظام وجود میں لائیں۔

اجتماعی نظام اور نظم وضبط کا باہمی تعلق

ہمارا نظریہ ہے کہ اصولاً اجتماعی نظم وضبط کے پابند اور اسے اہمیت دینے والے افراد ہی کی عملی مساعی اور کوششیں بارآور اور مفید ثابت ہوئی ہیں۔ طرز حکومت چاہے کسی بھی قسم کا ہو، اجتماعی نظام کا وہ حصہ جو عمومی ضرورت کی حد میں آتا ہے اس کی بہرحال پابندی کرنی چاہئے۔

سڑک پر آمدورفت کے قوانین معمولاً ایسے قوانین ہیں جن کا اقتصادی وسیاسی نظام سے بہت کم تعلق ہوتا ہے اگرچہ کبھی کبھی (ایک یا دو فی صدی) سیاست یا اقتصاد بھی اسمیں دخیل ہو جاتے ہیں لیکن یہ فی صد بھی اس قدر کم ہے جس کو دیکھتے ہوئے یہ جائز نہیں کہ اصول پسند باعمل افراد ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کریں۔ بلاشبہ اس طرح کے مسائل کا ایک حصہ اجتماعی نظام وحکومت سے مربوط ہوتا ہے۔

جرمنی کا ایک نوجوان جو بڑی کمسنی میں (شاید ۱۴ یا ۱۵ برس کے سن میں) بعض حالات سے دوچار ہو کر اسلام سے متاثر ہوا پہلے تو وہ خط وکتابت کے ذریعہ اسلام سے متعلق معلومات فراہم کرتا رہا بعد میں خود میرے پاس آیا اور مسلمان ہوا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ایران آیا۔ پہلے روز جب وہ میرے پاس آیا، میں نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس سے کہا میں خوش ہوں کہ مدتوں سے ایران کو دیکھنے کی تمہاری خواہش بھی پوری ہوئی۔ ان چند گھنٹوں میں تم نے کیا دیکھا۔

اس نے جواب دیا کہ آپ کے گھر تک کا کچھ راستہ میں نے گاڑی میں اور کچھ جان بوجھ کر پیدل طے کیا ہے جب میں سڑکوں سے گذر رہا تھا تو مجھے احساس ہوا یہاں پیدل چلنے والے، آدمیوں ہی کی فہرست میں نہیں ہیں۔ کیونکہ پیدل چلنے والوں کیلئے کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔ نہیں معلوم یہ لوگ ان سڑکوں پر سے صحیح سلامت کیسے گذرتے اور ٹریفک کے حادثوں سے کس طرح محفوظ رہتے ہیں؟ بہرحال یہ تو نظام کی خرابی ہے لیکن یکطرفہ سڑک پر اس کی مخالف سمت میں سفر نہیں کرنا چاہئے۔ اگر اسمیں آپ حادثہ کا شکار نہ بھی ہوئے تو کم از کم اس سڑک کی وسعت میں کمی اور کچھ افراد کے دیر سے کام پر پہنچنے کا باعث ضرور ہوں گے۔ یہ تو نظام سے مربوط نہیں بلکہ اس کا تعلق ہم سب سے ہے اور ہمیں بہرحال اسکی رعایت کرنی چاہئے۔ اگر ہم اس کی رعایت نہ کریں تو مطمئن رہئے کہ اس نوجوان کی طرح باہر سے آنے والا ہر شخص ہماری اس روش کو دیکھ کر ہمارے نظام کی خرابی سے پہلے ہمارے دین کی خرابی شمار کرے گا۔

میں نے اکثر غور کیا ہے کہ اس طرح کے حالات میں سب سے پہلے ہمارے دین اور دینی واجتماعی تربیت پر ہی

تان توڑی جاتی ہے، حکومت پر الزام عاید نہیں ہوتا۔ اگر ایک مسلمان گندا ہے میلے لباس پہنے ہے، صفائی کا خیال نہیں رکھتا تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اسکی کثافت کو نظام کی خرابی کہا جائے۔ بلکہ سیدھے سیدھے بات اس کے دین پر آپڑتی ہے کہ مسلمان گندا ہوتا ہے ۔۔۔) یقیناً صحیح تربیت کا زیادہ تعلق معاشرہ کے اقتصادی وسیاسی نظام سے ہوتا ہے۔ لیکن ہم بہر حال یہی پوچھا جاتا ہے کہ آپ جو اسلام کے پیرو ہیں اگر ایک صحیح وسالم اجتماعی نظام وجود میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ خود کو درست اور مہذب کرلیں ؟ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ مخصوص ماحول کے تحت معاشرہ کے مسلط کردہ نظام کے اس قدر اسیر و پابند ہوتے ہیں کہ کسی دوسرے بہتر نظام کی جانب متوجہ ہی نہیں ہوتے، ہمیں ان سے کوئی شکوہ نہیں، لیکن لوگ اسلام سے آشنائی کا دعویٰ کرنے والوں اور اسی بنا پر ایک عادل وصالح اجتماعی نظام کو وجود میں لانے کے دعویداروں سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسا نظام وجود میں لانا تو بعد کی بات ہے، تم نے تو ابھی وہ امور بھی انجام نہ دیئے جنھیں تم خود کر سکتے ہو، معلوم ہوا کہ ہمارا یہ نظریہ آئیڈیالوجی، اور ہمارا عقیدہ جسے درحقیقت عملی نشو نما کی بنیاد ہونا چاہیئے خود ہمارے اندر ابھی تک کوئی عملی تحریک پیدا نہیں کر سکا۔

مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت، اسلامی معاشرہ کے لئے ایک صالح نظام کو وجود بخشنے میں اس وقت تک کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا جب تک اسکی انفرادی یا اجتماعی عملی زندگی کسی حد تک اسلامی مصالح سے ہم آہنگ نہ ہو۔ جو شخص اپنی ذاتی زندگی میں تعلیمات اسلامی کا پابند نہ ہو وہ میری نظر میں اجتماع ومعاشرہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میری نظر میں اجتماع کیلئے مددگار افراد کے انتخاب کا جو معیار ہونا چاہیئے اور جس کا میں سختی سے پابند ہوں، یہ ہے :

ایک مسلمان کے لئے چاہے وہ مرد ہو یا عورت یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسی نظام میں جس میں وہ زندگی گذار رہا ہے ان امور کا خود سختی سے پابند ہے جس کے لئے وہ سماج میں تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ یہی ایک بنیاد ہے جس پر وہ سماج کے لئے ایک مثبت کردار ثابت ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ ذرا غور کریں۔ کیا اس سے بہتر کوئی عملی، اسلامی اور منطقی ضابطہ ہو سکتا ہے ؟ ؛ چنانچہ حج کے اجتماعی آثار کا ایک فائدہ یہ بھی ہونا چاہیئے کہ حج پر جانے والے مسلمان ان تمام اجتماعی نظامات کی پوری رعایت اور پابندی کریں جنھیں وہ بہر حال صحیح جانتے ہیں۔ اور حج سے واپس آکر اپنے دلچسپ مشاہدات لوگوں سے بیان کریں تو یوں بیان کریں، ہم نے دیکھا کہ نماز کے وقت لوگوں نے اپنی دکانیں کھلی چھوڑ دیں اور نماز کے لئے چلے گئے۔ کسی کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ پہلے دکان بند کرلیں پھر جائیں۔ یہ بات ایک معاشرہ کے کس پہلو کو ظاہر کرتی ہے ؟ [1]

[1] شہید بہشتی نے یہاں خود اپنے ساتھ گذرے ہوئے متعدد واقعے ذکر کئے جن کا خلاصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ ←

ہمارا سامان وہاں یوں ہی کھلا پڑا رہتا تھا لیکن کوئی اسے چھوتا تک نہ تھا۔ یہ بات کس رخ کو ظاہر کرتی ہے؟
یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ایک اجتماعی نظام میں تبدیلی لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس تبدیلی کے لئے ہم خود غلط روش اختیار کریں۔ میں نہیں سمجھتا کہ غلط روش اختیار کرنے سے کوئی کام سدھر بھی سکتا ہے۔
معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کرنے والے ایک محنت کش شخص پر یہ الزام عائد ہوا کہ وہ تجارت میں دھوکا دھڑی سے کام لیتا ہے غلط اور خراب مال لوگوں کو فروخت کرتا ہے اور اس نے اپنا قرض بھی وقت پر ادا نہیں کیا۔ اس کی اس روش کو دیکھ کر لوگ طعنہ دینے لگتے ہیں کہ: دیکھئے ایسے لوگ معاشرہ کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں! اس طرح کے طعنے میرے لئے کافی تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ ذرا بتایئے کہ جب آپ ایسے طعنے سنتے ہیں تو آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ آپ بہرحال یہ کوشش کرتے ہوں گے کہ کسی نہ کسی طرح ان سے نجات حاصل کریں۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے۔
بھلا کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی میں خود تو ضعیف و کمزور ہوں اور مثبت تبدیلیوں کی توقع بھی رکھیں؟
خدا کی راہ میں صرف وہی لوگ کچھ کر سکتے ہیں جو سماجی جنگ سے پہلے خود اپنے آپ کو فتح کر چکے ہوں۔ اور حج کے مراسم، اس کے اعمال اور حاجیوں کے اس عظیم اجتماع میں وہ سب کچھ ہے جو ہمارے سامنے اپنے دلچسپ و قیمتی آثار نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ ان کو اپنانے اور ان کا پابند بنانے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ ہمارے اندر اتحاد

الف۔ ۱۳۴۵ ھ شمسی یعنی اب سے ۲۱ سال پہلے۔ جب ہم جدہ کے ایرپورٹ پر اترے تو وہاں کسٹم کا نظام ایسا تھا کہ مسافروں کا سامان لا کر میزوں پر ڈھیر کر دیتے تھے اور لوگ اپنا اپنا سامان پہچان کر اٹھا لے جاتے تھے۔ کوئی روک ٹوک وغیرہ نہ تھی۔ اتفاق سے میرا ایک بیگ جس میں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں موجود تھیں کسی حاجی یا قلی کے ہاتھ پڑ گیا۔ تلاش کے دوران میں نے اپنے ایک دوست سے بھی اس کا ذکر کیا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں وہ بیگ کہیں گیا نہیں ہے یہیں کہیں ہوگا۔ بہرحال صرف دس منٹ سے کم کی مدت میں وہ بیگ ایک جگہ کنارے پر رکھا ہوا ملا اور ہم نے بغیر پولیس وغیرہ کی مدد کے اسے ڈھونڈ لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اٹھانے والے کو جیسے ہی یہ احساس ہوا کہ یہ اس کا بیگ نہیں ہے فوراً وہاں لا کر رکھ گیا۔ ایسے دلچسپ واقعات لوگوں کی دین سے دلچسپی اور اس کے قوانین کی پابندی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔
ب۔ ترکیہ کے ایک سفر میں جب انقرہ کی طرف جا رہا تھا ایک رات جنوبی ترکیہ کے ایک شہر میں رکا صبح وہاں سے جلدی روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سفر اپنی ذاتی گاڑی سے طے کر رہا تھا۔ میرے بیٹے کو پیاس محسوس ہوئی، میں نے اس کے لئے ایک دوکان سے کوکا کولا کی ایک بوتل خریدی اور جلدی میں اپنا پرس جس میں کچھ پیسے، سفر اور کار کے اہم کاغذات موجود تھے وہیں

تحرک اور دینی معاشرے سے متعلق لذت و خوشی کا احساس جگاتا اور ایک ایسے ہی وسیع اور جامع نظام کو عملی شکل بخشنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

یہ حج کے اجتماعی آثار کا ایک نمونہ ہے۔ یہ ساری تمثیں اور بار بار کی یاد دہانیاں اسی لئے ہیں کہ عمل کا پیش خیمہ اور مقدمہ قرار پائیں۔ اگر اس کے بعد بھی ہم میں عملی تحرک پیدا نہ ہو تو ان فکری آثار کی اہمیت شک و شبہات کا شکار ہو جائیں۔ بنابریں ہمیں اپنی زندگی کو مصمم، پر اعتماد، منظم، پاکیزہ اور مکمل بنانا چاہیئے۔

حج اور زن و مرد کے باہمی روابط :

حج کے اجتماعی آثار کا ایک پہلو، مکہ میں حج کے دوران زن و مرد کے درمیان خصوصی تعلقات و روابط بھی ہیں۔ یہاں دو اہم اور دلچسپ نکتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ جیسا کہ آپ نے فقہی رسالوں میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ احرام کے واجبات میں سے ایک وجوبی امر یہ بھی ہے کہ عورت حالت احرام میں اپنا چہرہ نہ ڈھانکے اس بنا پر عورتیں حج میں اس طرح شریک ہوتی ہیں کہ ان کے بال چھپے ہوئے ہوں اور چہرے کھلے رہیں۔ (یہاں ایسی نقاب کا ڈالنا جو چہرے سے ملی ہوئی نہ ہو واجب، مستحب جائز یا مکروہ ہے یہ ایک دوسری بحث ہے) بہر حال یہ ایک اسلامی حکم ہے کہ عورتیں حالت احرام میں کھلے

بھول کر روانہ ہو گیا۔ تقریباً ۲۵۰ کیلو میٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد ناشتہ کے لئے ایک جگہ رکا۔ پرس کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ یاد آیا کہ میں اسے فلاں جگہ بھول آیا ہوں۔ فوراً واپس ہوا بار بار یہ خیال آتا کہ کاش اسمیں پیسے نہ ہوتے۔ میں اصل میں ان اہم کاغذات کے لئے فکر مند تھا کہ اگر گم ہو گئے تو سفر ہی ملتوی کرنا پڑے گا۔ جلدی جلدی میں اس دکان تک پہنچا وہ دکاندار بہت خوش روئی کے ساتھ میرے پاس آیا لیکن وہ ترک تھا اور میں اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ بہر حال اس نے کسی طرح مجھے سمجھایا کہ آپ کے جانے کے بعد میں نے آپ کا پرس دیکھا لیکن آپ دور جا چکے تھے میں نے راستے کی چوکیوں کو ٹیلیفون کیا لیکن چونکہ آپ کی گاڑی کا نمبر معلوم نہیں تھا اس لئے آپ تک خبر نہ پہنچا سکا۔ اس نے پرس لا کر مجھے دیا۔ اسمیں ساری چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں میں نے اسے کوئی تحفہ یا انعام دینے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بار بار ایک لفظ کی تکرار کرتا رہا، حرام، حرام۔ ایک اسلامی ملک میں پیش آنے والے اس واقعہ نے میرے لڑکے کو بہت متاثر کیا۔ اتفاقاً اس سے کچھ پہلے جرمنی کے "ہامبرگ" شہر میں میرا کچھ سامان غائب ہوا اور نہیں ملا۔ وہ کہنے لگا۔ بابا اس مسلمان ملک میں کتنا اچھا ہے کہ ہماری گمشدہ چیزیں واپس مل جاتی ہیں۔

چہرہ کے ساتھ شرکت کریں۔ دوسری طرف اسلام نے ان دنوں میں ہر طرح کی جنسی لذت سے استفادہ کو حرام قرار دیا ہے۔ یعنی احرام کی حالت میں زن و مرد کو ہر طرح کی جنسی لذت سے (چاہے وہ حلال طریقے سے ہی کیوں نہ ہو) پرہیز کرنا چاہیئے۔ فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج (سورہ بقرہ/۱۹۷) "نہ عورت کے پاس جائے، نہ کوئی اور گناہ کرے اور نہ لڑائی جھگڑا کرے۔"

اس کی حرام نوعیت کو تو ہمیشہ ہی حرام قرار دیا گیا ہے (جس طرح خدا و رسول سے متعلق جھوٹی بات کہنا ہمیشہ حرام ہے لیکن روزہ کی حالت میں حرام در حرام ہے) اسی طرح حج کے دوران حالت احرام میں حلال نوعیت کی جنسی لذت یابی حرام ہے، لیکن حرام طریقے سے حرام در حرام ہے۔ بہرحال مراسم حج میں اس روک اور بندش کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے ذہن سے جنسی تلذذ کے تصور کو ہی ان چند دنوں کے لئے دور کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر انسان ان چند دنوں میں اپنی روح کی صحیح تربیت و اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اسے خود ان افکار سے کنارہ کش ہونا چاہیئے تاکہ روحی و فکری اعتبار سے اس کی زندگی کے یہ چند دن پاکیزہ اور صحیح و سالم قرار پائیں۔

حج کے دوران عورتوں کی عفت و پاک دامنی کی تربیت اور اجتماعی طور پر عورتوں و مردوں کے درمیان بہتر اور منظم روابط و تعلقات کے پر وقار انداز اس اجتماعی عبادت کا بہترین اور موثر نمونہ ہیں۔ یہ وہ مجرب روش ہے جو ہر سال دہرائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں بڑھتے اور پھیلتے ہوئے جنسی سیلاب کو روکنے کے لئے بہت سے دوسرے اجتماعی نظاموں سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے، لیکن اس سلسلہ میں ایمان اور اس کے معنوی و روحانی اثر اور باایمان عفت و پاکیزگی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایک عورت معاشرہ کے سامنے اس طرح آئے جس سے اس کی ہوس انگیزی کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ ایک عورت جس کا سر، سر کے بال، ہاتھ، پاؤں اور جسم ڈھکا ہوا ہو، اس میں اور نیم عریاں یا جسم کو ظاہر کرنے والے چست لباس جو برہنگی سے بھی بدتر ہے، پہن کر معاشرہ کے سامنے آنے والی عورت میں بڑا فرق ہے (عورت کو اپنا جسم چھپانا ضروری ہے چاہے چادر کے ذریعہ یا جسم کو چھپانے والے لباس وغیرہ کے ذریعہ)۔ حجاب اسلامی کی یہ رعایت و پابندی اگرچہ جنسی و اخلاقی فساد کو روکنے میں بہت موثر ہے اور اس کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے، معاشرتی برائیوں اور اخلاقی انحطاط کو دور کرنے کا ایک اہم طریقہ یہ بھی ہے کہ مسلمان مرد اور عورتوں کی اس طرح سے تربیت کی جائے کہ دو اجنبی مرد و زن ملاقات کے دوران اپنی رفتار و گفتار کا لحاظ یوں رکھیں کہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں! ۔ قرآن حکیم نے ایک مقام پر مرد اور

عورتوں دونوں کو حجاب کی رعایت کا حکم دیا ہے (سورۂ نور/ ۳۰ و ۳۱) اور دوسری جگہ خاص کر مسلمان عورتوں کو پردہ داری کا لحاظ کرنے کی تاکید کی ہے (سورۂ احزاب/ ۵۹) اور متعدد مقامات پر مسلمان مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کی جانب نگاہ کرنے سے روکا ہے۔ ذیل میں ہم حجاب سے متعلق ایک آیت کا مفہوم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

"اے پیغمبرؐ صاحبان ایمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ عورتوں سے ملاقات کے وقت اپنی نگاہیں ان پر نہ گاڑیں (یعنی نظروں کو جھکائے رہیں) اور مسلمان عورتوں سے فرما دیجئے کہ مردوں سے ملتے وقت ان سے آنکھیں نہ ملائیں۔ گویا ایک دوسرے پر نگاہ نہ کریں ان کی ملاقات اور ان کی نگاہیں پاک ہونی چاہئیے۔۔۔۔" (سورۂ نور/ ۳۰)

یہ ایک بہت اہم تربیت ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب معاشرہ کے ایک طبقہ میں کم از کم اس تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اور اب رفتہ رفتہ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں حجاب اور تہذیب کے یہ سارے آثار مٹتے چلے گئے۔ ذرا غور کیجئے ہم نے کتنا بڑا نقصان اٹھایا۔

حج میں ہم عفت کی "حفاظت" کے اس اثر کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں کہ کس طرح ایک عورت مردوں کے درمیان سے گذر جاتی ہے اور مرد ایک نگاہ غلط انداز سے بھی اسے نہیں دیکھتے۔ تہران کا ایک مسلمان جو تجارت کے سلسلے سے جرمنی گیا ہوا تھا اور ہیمبرگ شہر میں مقیم تھا۔ ایک روز دوران گفتگو میں نے اس سے دریافت کیا۔ اب آپ ایران کب تک پلٹیں گے؟ اس ایرانی تاجر نے عجیب جواب دیا۔ کیا عرض کروں، سمجھ میں نہیں

آتا کیونکہ خود میرا نظریہ یہ ہے کہ جس کام سے جہاں گیا ہوں، جب تک کام ہے۔ وہاں رکنے کا متعقد رہوں، کام ختم ہونے کے بعد اپنے معاشرہ میں واپس پلٹ آؤں۔ اور فلاح و ارتقا کا جو بھی کام انجام دوں اپنے ہی معاشرہ میں انجام دوں۔ یہی توقع میں وہاں موجود ایرانی و غیر ایرانی مسلمان طلبہ و تجار سے رکھا کرتا تھا۔ ان سے کہا کرتا تھا، اگر تم یہاں کے اجتماعی نظام کو پسند کرتے ہو تو کرو لیکن یہاں تمہاری حیثیت ایک ناخواندہ مہمان سے زیادہ کی نہیں ہے۔ آخر تم نے یہاں اس نظام کو انجام دینے میں کون سا کردار ادا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ گویا اس طرح تمہاری زندگی ایک طفیلی زندگی ہو کر رہ گئی کہ دوسرے اپنی محنت و کوشش کے ذریعہ ایک نظام وجود میں لائے جو تمہاری نظروں میں خوش آیند ثابت ہوا۔ اس طرح تو تمہاری انفرادیت خاک میں مل گئی۔ اگر تم خود ایک بہترین نظام کی آرزو رکھتے ہو تو اپنے ماحول و معاشرہ میں واپس جاؤ اور وہاں ایک اچھا نظام رائج کرنے کی کوشش کرو۔ !!

آنا کہاں جاؤں؟ یہ حقیقت ہے کہ یہاں کا ماحول بہت خراب ہے، خصوصیت سے عورتوں اور مردوں کے روابط بہت غلط ہیں لیکن یہ خرابی اور فساد اسی حد تک ہے کہ جب تک ایک عورت خود منحرف اور غلط نہ ہو، اس معاشرہ میں مرد اس سے چھیڑ چھاڑ یا دست درازی کی ہمت نہیں کر سکتا (اور اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو بہت ہی شاذ و نادر) گویا یہاں اس قدر امن و امان کی فضا برقرار ہے کہ جب میری بیوی گھر سے باہر جاتی ہے تو سڑک پر نہ تو جلدی کوئی اس کا پیچھا کرتا ہے، نہ ہی مذاق کی کوشش کرتا ہے اور نہ اغوا کی ہمت کر پاتا ہے، جبکہ ہمارے تہران میں (شاہی دور میں) حال یہ تھا کہ اگر غروب آفتاب کے صرف تین گھنٹہ بعد میری بیٹی گھر سے گلی میں جاتی تو میں اس کے لئے فکرمند ہو جاتا ہوں۔ جبکہ وہ یہاں رات کے بارہ بجے بھی گھر سے باہر جائے تو میں پریشان نہیں ہوتا۔

خود اپنے معاشرہ کے لئے یہ طعنہ مجھے بہت زیادہ کھلا۔ درحقیقت یہ بہت بڑا عیب ہے۔ مسلمان معاشرہ کی اخلاقی عفت اور اجتماعی امن و امان کو ہر حال میں برقرار رہنا چاہئے۔ اور حکومت اس سلسلہ میں بہرحال ایک اہم اور مضبوط قدم اٹھا سکتی ہے۔ حقیقتاً ایک مسلمان معاشرہ کو ایسا ہونا چاہئے کہ ایک عورت آدھی رات کے وقت بھی سنسان سڑک پر پورے امن و امان کے ساتھ راستہ طے کرے۔

ایک پیغمبر اور ایک جاہ طلب حاکم کے اخلاق کا فرق:۔

آپ یہ نہ سوچئے کہ میری یہ باتیں صرف ایک آرزو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "ابن اثیر" نے اپنی تاریخ "کامل" میں لکھا ہے کہ "عدی بن حاتم" جو عیسائی مذہب تھا، اسلام کی روز افزوں وسعت کو دیکھ کر بیوی بچوں کے ہمراہ اپنے قبیلہ سے شام کی جانب کوچ کر گیا، اور اپنی بہن کو وطن ہی میں چھوڑ گیا۔ اس وقت شام میں عیسائی "غسانیوں" کے نام سے ایک بڑی اقلیت کی صورت میں موجود تھے۔ چنانچہ جب "عدی" کا علاقہ بھی دیگر علاقوں کی طرح لشکر اسلام کے زیر نگین آ گیا تو اس کی بہن بھی اسلامی نظام کے زیر اثر زندگی گذارنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے اپنے بھائی عدی کو خط لکھا اور اس میں اسے بڑی ملامت کی کہ تم مجھے یہاں چھوڑ کر چلے گئے اور میرا کچھ خیال نہ کیا۔ اگر تمہارا جانا بہتر تھا تو مجھے بھی اپنے ہمراہ کیوں نہ لے گئے اور اگر برا تھا تو یہاں سے کیوں گئے ؟ اب وہاں کیا پڑے ہوئے ہو؟ واپس آؤ اور اس نظام اور اس کے رہبر کے بارہ میں معلومات فراہم کرو۔ تمہارا آنا دو حال سے خالی نہیں۔ اگر

لہ الکامل فی التاریخ۔ ابن اثیر ج ۲ ص ۲۸۵ طبع بیروت ۱۹۶۵ء

تم نے اس نظام کو پسند کر لیا اور اسلام لے آئے تو کیا کہنا اور اگر یہ دین تمہیں پسند نہ آیا پھر بھی کوئی حرج نہیں ہے اس صورت میں بھی تم اپنے قبیلہ میں رہ کر ایک باعزت زندگی گذار سکتے ہو۔ (کیونکہ اسلامی نظام یہ اجازت دیتا تھا کہ عیسائی "جزیہ" ادا کرنے کی صورت میں اپنے طور پر آزادانہ زندگی گذار سکتے تھے) یہ خط پڑھ کر "عدی" بہت متاثر ہوا۔ اس نے دل میں سوچا، چلوں، چل کر دیکھوں آخر محمدؐ کیا کہتے ہیں اور یہ جدید دین جس کی وہ تبلیغ کر رہے ہیں واقعاً کیا ہے۔ عدی مدینہ آیا، پیغمبرؐ اسلام اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس نے وہاں پہنچ کر پیغمبرؐ سے ملاقات کی پیغمبرؐ اسلام نے اسے اپنے ہمراہ گھر چلنے کی دعوت دی۔ بالآخر دونوں افراد گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ راستہ میں "عدی" کو پیغمبرؐ کی اجتماعی و سماجی زندگی کے دو ایسے پہلو نظر آئے جنہوں نے اسے بے حد متاثر کیا۔ "عدی" نے چونکہ پہلے یہ سن رکھا تھا کہ قریش کے طایفہ سے محمدؐ نام کے ایک شخص نے اپنی قوت و اقتدار کا پرچم بلند کرنا چاہا لیکن لوگ اس کے مخالف ہو گئے چنانچہ وہ مدینہ چلا آیا اور چونکہ حالات اس کے لئے سازگار تھے لہذا وہ وہاں کا حاکم و فرمانروا ہو گیا تاکہ ایک بڑی حکومت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکے۔ یہ وہی تصویر ہے جسے آج بھی مغربی قلمکار پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت میں دیکھنے کی ناکام کوششیں کرتے ہیں۔ لیکن عدی نے راہ میں جن دو باتوں کا مشاہدہ کیا اس سے اس کے خیالات میں انقلاب برپا ہو گیا۔ اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ اخلاق کسی حکومت و جاہ و سلطنت کے طلبگار کا نہیں ہو سکتا۔ پہلی بات جو اس نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ راستہ میں ایک ضعیفہ نے پیغمبرؐ کو آواز دی اور آپ اس کے لئے ٹھہر گئے۔ ذرا سا بھی اس بات کا خیال نہ کیا کہ میرے ساتھ ایک مہمان ہے اور وہ بھی دنیاوی اعتبار سے کوئی معمولی شخص نہیں، بلکہ اشراف قریش کا ایک حاکم ہے۔ مجھے تو رکنا بھی نہیں چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب کچھ نہ تھا بلکہ پیغمبرؐ کمال بردباری کے ساتھ کھڑے رہے۔ عدی نے دیکھا کہ اس ضعیفہ نے آنحضرتؐ سے بہت معمولی اور سطحی سے سوالات کئے اور آپ نے کمال حلم و متانت اور محبت کے ساتھ اس کے جوابات دیئے۔ یہ وقفہ کچھ اتنا طویل ہوا کہ عدی کو خستگی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے غور کیا کہ اگر اسے کوئی عورت اس طرح اتنی دیر تک روکتی تو وہ اسے ضرور سزا دیتا۔ اس نے پیغمبر اسلامؐ کے چہرہ کا بغور جائزہ لیا کہ کہیں وہ اپنی اس حالت پر کبیدہ خاطر تو نہیں ہیں؟ لیکن اسے احساس ہوا کہ یہ اس قدر عالی طبع شخصیت ہے کہ اس کے چہرہ سے کسی طرح کی تلخ کامی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اس نے اپنے دل سے کہا، میں نے بہت سے بادشاہ اور حاکم دیکھے اور میں بھی جو ایک قوم کا رئیس و حاکم ہوں اپنے دست نگر افراد سے اس طرح ملنا ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ ایک پیغمبرؐ کا اخلاق تو ہو سکتا ہے ایک جاہ طلب بادشاہ و حاکم کا اخلاق نہیں ہو سکتا۔ دونوں اس وقت تک کھڑے رہے جب تک

اس ضعیفہ کی باتیں ختم نہ ہوگئیں۔ آخر کار وہاں سے روانہ ہو کر گھر تشریف لائے۔ اس وقت جبکہ مسلمانوں کے حالات عموماً بہتر ہو چکے تھے پیغمبر اسلامؐ کے گھر میں صرف ایک توشک تھی جس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے۔ اور بقیہ کمرہ میں پا چٹائی بچھی ہوئی تھی یا خالی زمین تھی۔ پیغمبرؐ نے اس توشک پر عدی کو بٹھایا اور خود چٹائی پر تشریف فرما ہوئے۔ ارے یہ کیسا حاکم و بادشاہ ہے؟ یہ شخص تو بڑی قدرت و طاقت کا حامل ہے۔ بہت سی جنگوں میں فتحیاب ہو چکا ہے۔ بے شمار اصحاب اور اس کے پیرو اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ بڑے شکوہ و جلال کا مالک ہے۔ اسلامی سلطنت سے باہر جب بھی محمدؐ کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ آج یہی پیشوا اور قدرت مند رہبر اپنے ایک غیر مسلمان، عیسائی مہمان کی ایسی مہمان نوازی کر رہا ہے کہ اپنی جگہ پر اسے بٹھا رہا ہے اور خود پورے اطمینان کے ساتھ بوریا نشین ہے۔

عدی نے اپنے دل سے کہا۔ یہ خلق بھی کسی جاہ و ملک، دنیا و سلطنت طلب بادشاہ یا حاکم میں نہیں پایا جا سکتا۔

پیغمبر اسلامؐ نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔ اب تک کردار پیغمبرؐ نے اس کی روح کو بیدار کر ہی دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پیغمبرؐ نے جو باتیں شروع کی ہیں وہ عام خود غرض حاکموں جیسی نہیں ہیں (کہ عدی تم اپنے علاقہ میں واپس جا کر من مانی حکومت کرو، حاصل شدہ ٹیکس کا ایک حصہ میرے پاس بھیج دو اور بقیہ اپنے مصرف میں لاؤ، مجھے اس سے کوئی غرض نہ ہوگی کہ تم لوگوں پر کیا ظلم و ستم کرتے ہو) بلکہ عدی نے محسوس کیا گفتگو میں سیاست کے بجائے فکر کی استواری اور انسان سازی کی ترغیب ہے۔ وہ در اصل آدمی کو انسان بنانا چاہتے ہیں اور یہی ان کی تحریک بھی ہے۔ عدی پیغمبرؐ کی گفتگو سے پوری طرح متاثر تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کے شوق میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا: اس وقت ہمارے حالات تمہارے پیش نظر ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہمارے حالات ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ جلد ہی ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اسلامی قلمرو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی وسیع حدیں طے کرے گی۔ اور اس قلمرو میں بہترین اجتماعی و حکومتی نظام کے تحت لوگ اس قدر امن و سکون کی زندگی گذاریں گے کہ اگر ایک عورت تن تنہا عراق سے مکہ کا سفر طے کرنا چاہے گی تو اسے راہ کے بیابانوں اور صحراؤں میں بھی کسی طرح کا خوف و ضرر اس محسوس نہ ہوگا۔ اور اگر تم زکات دینے کے لئے پوری مملکت اسلامیہ میں کوئی مستحق تلاش کرنا چاہو گے تو بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوگا۔ یعنی اسلامی معاشرہ اقتصاد اور امن و امان دونوں لحاظ سے پوری طرح مستغنی اور کامل ہوگا۔

پیغمبر اسلام نے عدی بن حاتم سے اسلامی معاشرہ کی جن آیندہ ترقیوں اور خوبیوں کی جانب اشارہ فرمایا اور جن کے ذریعہ سے اسلام کی طرف دعوت دی، انہیں کی ایک اہم خوبی معاشرہ کا امن و امان ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ایک عورت عراق سے مکہ یا مدینہ کا سفر طے کرے اور چوری یا لوٹ مار سے ہراساں نہ ہو۔ دراصل معاشرہ کو امن و امان کی اس حد تک پہنچانے کے لئے پہلے معاشرہ کو انسان سازی کی ضرورت ہے یعنی خود انسانوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ اپنے نفس کی ہوا و ہوس پر مکمل قابو پاچکے ہوں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس معاشرہ میں ہوس کش و ہوس پرست انسان موجود ہوں، چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں اس معاشرہ کے تئے ایسے تابناک مستقبل کا تصور بھی محال ہے۔ "عدی" بعد میں مسلمان ہوا۔ وہ کہتا ہے خدا کی قسم پیغمبر نے جس طرح کے امن و سکون کی پیشین گوئی فرمائی تھی، یعنی "ایک عورت تنہا عراق، بین النہرین سے حجاز تک بے خوف و خطر سفر کرے" اسے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جہاں تک اقتصادی بہبود کا سوال ہے اسمیں بھی ایسی روز افزوں ترقی ہے کہ مستقبل قریب میں دوسری پیش گوئی بھی حقیقت میں بدل جائے گی اور اسلامی معاشرہ میں زکات کا مستحق بڑی تلاش کے بعد مل سکے گا۔

مراسم حج، اسلامی معاشرہ کا عملی نمونہ :-

ایک اور چیز جو حج میں انسان کے لئے لذت بخش ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں مختلف رنگ و نسل، ملک و قوم کے لوگ ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مصریوں نے اور ان دنوں ایرانیوں نے بھی حج کی مخصوص کیفیت کو درہم برہم کردیا۔ نتیجہ میں حج جیسی عبادت بھی کمتر درجہ، درمیانی درجہ، فرسٹ کلاس، ڈیلکس اور ممتاز درجوں میں بٹ کر رہ گئی[1]۔ جو حضرات حج سے مشرف ہوچکے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ حج میں آنے والوں کی ایک بڑی تعداد غریبوں کی ہوتی ہے۔ چونکہ اکثر حجازی اور مکہ کے اطراف میں رہنے والے غریب ہیں اور حج میں انھیں کی اکثریت شریک ہوتی ہے۔ لہٰذا حج کے اس بڑے اجتماع میں بھی زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس زندگی کے بہت مختصر وسائل ہوا کرتے ہیں۔

---

[1] اب بحمد اللہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایرانی حجاج میں اس طرح کے مسائل نہیں رہے۔ پھر بھی شہید بہشتی کی فرمائش کے مطابق علماء اور مسئولین حج کو اس امتیاز طلبی کا تا حد امکان مقابلہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے حج کی روح مردہ ہوتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ حج صرف مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ پھر بھی اسلامی معاشرہ کا نمونہ ہونے کے ساتھ اسی کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کی اقتصادی کیفیت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ان غربت کی زندگی گذارنے والوں میں کوئی برہنہ یا بھوکا نہ رہے۔ اور اگر بعض قارون صفت اور دولت نواز حاجیوں کا گروہ اس کی مہلت دے تو عمومی طور سے مسلمانوں کو کم از کم سال میں ایک ہی مرتبہ حج کے دوران اسلام کے اقتصادی نظام کا عملی نمونہ نظر آسکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ خود ہم نے ذاتی طور سے نہ کبھی اس کی رعایت کی اور نہ کرتے ہیں۔

جس سال میں حج سے مشرف ہوا، خیال تھا کہ رفقاء کے ساتھ ایک ایسے گروہ کے ہمراہ ہو جاؤں گا جو کسی حد تک ان بنیادی امور کی رعایت کو پیش نظر رکھتا ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہیں ایک "قافلہ" کے ساتھ ملحق ہو گیا۔ قافلہ کا رئیس مجھ سے محبت سے پیش آیا۔ دوران گفتگو اس نے کہا میرے پاس آرام و آسائش کے تمام وسائل موجود ہیں۔ میں آپ اور آپ کے رفقاء کے لئے ہر طرح کی سہولت فراہم کر سکتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا، جناب عرض ہے کہ میں حج کے لئے آیا ہوں، یعنی ایسے سفر پہ آیا ہوں کہ اگر عیش پرستی اور آرام طلبی و امتیاز پروری کی یہ بیماری میرے مزاج میں موجود ہو تو یہاں اس کا علاج ہو جائے۔ اور آپ مجھے اس مرض میں اضافہ کی ترغیب دلا رہے ہیں؟ میں آپ سے صاف لفظوں میں عرض کردوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں کہ بغیر کسی وسیلہ کے صرف اپنی عبا کے ذریعہ حج کے ایام گذار سکتا ہوں۔ اس "قافلہ" میں صرف اس وجہ سے آگیا ہوں کہ ایک تو مجھے یہاں کے راستوں سے آگاہی نہیں۔ دوسرے میری اہلیہ بھی میرے ہمراہ ہیں، ڈرتا ہوں کہیں میری وجہ سے ان کے حقوق و فرائض میں کوتاہی نہ ہو۔ ورنہ "قافلہ" میں ہرگز شریک نہ ہوتا۔ اس کے بعد میں نے اس سے کہا اگر آپ کسی حاجی کی خدمت ہی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اس کی صحیح رہنمائی فرمائیں کہ وہ اعمال کس طرح بجالائے۔ یہاں اس کے کیا فرائض ہیں اور کہاں کہاں اس کا جانا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے دوسرا سفر اس کے نصیب میں نہ ہو یا پھر ایسا موقع اسے نہ مل سکے۔ اور اگر ہم سے بہترین محبت کا سلوک کرنا چاہتے ہیں تو یوں کیجئے کہ خصوصیت سے ہمارا احترام نہ کیجئے، کیوں کہ اس سرزمین پر سب برابر ہیں اور سب اللہ کے بندے ہیں۔

بعد میں میری نگاہوں سے وہ تاسف بار مناظر بھی گذرے کہ بعض بزرگوں نے بھی اس سفر میں اپنے افعال و کردار کے ذریعہ غریبی اور امیری کے امتیاز کو ختم کرنے کے بجائے اسے اور فروغ دیا۔ حد تو یہ ہے کہ کچھ لوگ ایک بزرگوار کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے اور درود و سلام کے سایہ میں ان کو مسجد نبیؐ اور حرم

پیغمبرؐ میں لا رہے تھے اور میں حیرت سے دیکھتا رہا کہ اس حرم معظم میں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اور یہ کون سا کردار پیش کیا جا رہا ہے؟ اگر ہم اپنے معاشرہ سے جانے والے حاجیوں اور ان کے رہبروں کو انفرادی، اجتماعی طور پر صحیح عملی تربیت نہیں دے سکتے اور انھیں کم از کم ایام حج میں تصنعات اور ظاہری شان و شوکت سے نہیں روک سکتے تو اور کیا کر سکتے ہیں۔؟

حج، ایک متوازن اجتماعی نظام:-

حج کا اجتماع مختلف بیش قیمت اور انسان ساز پہلوؤں کا حامل ہے۔ ان میں سے ایک اہم پہلو یہ ہے کہ حج امت اسلامی اور اجتماع میں ایک حد تک اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے حج کے اجتماع میں کافی حد تک اسلامی اخوت و برادری اور مساوات اسلامی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔
مختلف مکاتب فکر کے مسلمانوں کے درمیان فاصلے یا کم ہو جاتے ہیں یا ایکدم ختم جاتے ہیں سب یکساں اور یک رنگ زندگی کا طرز اپنا لیتے ہیں یا کم از کم ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں۔ سب کے لباس ایک جیسے یا ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ اگر حاجی ظاہری شان و شوکت اور ترک بھڑک سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ یعنی روح حج کو اپنے چند روزہ آرام پر قربان نہ کریں تو تقریباً تمام افراد ایک ہی جیسی زندگی گذاریں اور عالم اسلام کا یہ اجتماع کم از کم سال میں ایک بار ایمان و الفت، اخوت و محبت سے بھرپور اور کدورت و نخوت، نفرت و عداوت سے دور زندگی کے مزہ سے ضرور آشنا ہو جائے۔ اور اگر اسلامی معاشرہ کے شعور و آگہی کو صحیح طور پر بیدار کرنے کی کوشش کی جائیں تو ایک مرتبہ حج سے مشرف ہونے والے افراد بھی ایک مستقل متوازن اجتماعی نظام کے طرفدار بنائے جا سکتے ہیں کیونکہ اسی نظام کی ایک جھلک وہ حج کے دوران دیکھ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں حج کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

حج کے مثل کون سا عمل؟

اکثر احباب یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر انسان حج کے مخارج کو کسی فقیر اور بے بضاعت خانوادہ کے حوالہ کر دے یا اس سے ان کی مدد کر دے اور خود حج نہ جائے تو کیا یہ بہتر نہیں ہے؟ اگر انسان جستجوگر ہے اور موضوع کا ہر رخ سے جائزہ نہیں لیتا تو جواب میں یہی کہے گا کہ حج کے سفر پہ جانے کے بجائے

سلامی معاشرہ کے ایک غریب و فقیر خانوادہ کی مدد کرنا حج جانے سے زیادہ بہتر ہے۔ جبکہ وہ اس بات کو بھول گیا کہ سب سے پہلے ہمیں معاشرہ میں اس حد تک سدھار لانا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے حج کرنے نہ جاسکے تو اس کے پیسے کو خرافات اور غلط امور میں خرچ نہ کرڈالے، یورپ و امریکا کی تفریح میں اڑا نہ ڈالے۔ باڈانس اور کلب وغیرہ کی نذر نہ کردے۔ چنانچہ اگر معاشرہ اس قدر بے روح ہو تو کیا ایسے میں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ میں حج پہ جاؤں یا فلاں خانوادہ کی مدد کروں؟ یاد رکھیئے جب تک ہم انفرادی و اجتماعی طور پر معاشرہ کی روح کو مثبت اور سازگار طریقہ پر بیدار نہیں کرلیتے اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ حاصل ہی نہیں کرسکتے۔ ایسے میں اگر آپ کسی کو ایک نیک کام سے روکیں تو وہ اضافی پیسوں کو دوسرے نیک کام میں بھی نہیں لگائے گا۔ یعنی اگر آپ اسے حج سے روکیں گے تو وہ کسی غریب کی مدد سے بھی رک جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہم اسے حج جانے سے روکیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اس کے عوض کسی غریب خانوادہ کی کمک ضرور کرے گا؟

کیا ایمان اور معنویت سے معمور قلب اور حق پرستی کے جذبات کے علاوہ بھی کوئی چیز ان تعلیمات کے اجرا کی ضمانت لے سکتی ہے؟ در اصل دینی جذبہ اور ایمان کی تقویت ہی نیک اعمال کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر ہم مراسم حج کو اس کے صحیح عنوان سے ادا کریں تو حج سے واپس آنے والا ہر شخص حج کے خرچ کی دوگنی اور سہ گنی رقم بھی کار خیر میں صرف کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیونکہ اس کی روح وہاں دینی قالب میں مکمل طور پر ڈھل چکی ہوگی۔ آپ میری بات کا ثبوت چاہتے ہیں تو سو عام حاجیوں (نہ بہت زیادہ پیسے والے اور نہ بہت زیادہ غریب) پر جو ایک ذرا شعور و ادراک رکھتے ہوں یہ عمل یوں آزما کر دیکھئے کہ پہلے پورے سال کے دوران ان سے رجوع کیجئے اور امور خیر کے لئے مدد کی درخواست کیجئے پھر حج کے بعد ان سے یہی سوال کیجئے آپ دیکھیں گے کہ وہ پچھلے سال سے دوگنا انفاق کرتے ہیں یہ اضافہ کس چیز کی نشاندہی کرتا ہے؟ اگر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو پیسہ حج کی ادائیگی میں صرف ہوا ہے۔ اس نے پہلے سے کہیں زیادہ فقرا کی مدد کی ہے۔ اس کے علاوہ حج کی اہمیت سے متعلق صریحی روایتیں بھی ہم تک پہنچی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ روایتیں نہ ہوتیں تو انسان کو اکثر دوسرے موضوعات کے مقابلے میں حج کی اہمیت کو تشخیص دینے میں مشکل پیش آتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی مکرر روایتیں حج کی اہمیت کا احساس دلاتی ہیں بلکہ اکثر راویوں نے ان حضرات سے ایسے

سوالات کیے ہیں جو دوسرے اعمال کے مقابلے میں حج کی اہمیت کو روشن کرتے ہیں۔ ہم یہاں چند روایتیں پیش کرتے ہیں۔

"سماعہ" سے روایت ہے کہ: امام جعفر صادقؑ نے مجھ سے فرمایا: تم اس سال حج کو کیوں نہیں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا مجھے چند اہم امور و معاملات درپیش ہیں جن میں شاید اس سے زیادہ خیر و خوبی پوشیدہ ہو۔ امامؑ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم خداوند عالم نے ان حالات و شرائط میں تمہارے لئے کوئی خیر و خوبی معین نہیں فرمائی ہے۔ یاد رکھو کوئی بندہ حج کی سعادت سے محروم نہیں ہوتا جب تک کہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو اسے حج سے محروم کر دے۔[1]

امام صادق علیہ السلام سے ہی دوسری روایت ہے۔ آپؑ نے فرمایا: اگر لوگ حج سے کنارہ کشی اختیار کریں تو حاکم مسلمین انھیں حج بجا لانے کے لئے مجبور کرے چاہے وہ اس سفر کے لئے دل سے راضی ہوں یا نہ ہوں۔ کیونکہ خانہ کعبہ حج کے مراسم ادا کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔[2]

یہی راوی امام محمد کاظمؑ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے حضرتؑ سے دریافت کیا کہ: کیا کوئی شخص حج کے سفر پر جانے کے لئے قرض لے سکتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا اگر قرض بیجا نہ ہو اور قرض لینے والا کوئی ایسی چیز رکھتا ہو کہ اگر وہ راستے میں دنیا سے اٹھ جائے تو اس کے ورثاء اس چیز کے ذریعہ اس کا قرض ادا کر دیں، تو حج کے لئے قرض لینا درست ہے۔[3]

فروع کافی، باب "فضل در نفقہ حج" میں امام صادق علیہ السلام اپنے ایک دوستدار کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: کتنا اچھا ہو اگر تم میں سے کوئی شخص جو سال بھر کسب و کار میں مشغول ہو اور آمدنی رکھتا ہو۔ اپنے مصارف میں کفایت شعاری سے کام لے اور اپنے منافع کا کچھ حصہ حج کے لئے جمع کرتا رہے یہاں تک کہ حج کا زمانہ آنے تک وہ حج کا خرچ بھی اکٹھا کرے اور سفر حج اختیار کرنے پر اسے اپنی اصل پونجی سے کچھ خرچ کرنا نہ پڑے۔ اسی باب میں ایک دوسری روایت میں امامؑ فرماتے ہیں کہ: حج کے مخارج میں کم سے کم پیسہ صرف کرو اور کم خرچ والا سفر اختیار کرو تاکہ ہمیشہ حج کے سفر میں ایک نشاط و خوشی کا

---

[1] فروع کافی۔ ج ۴۔ کتاب الحج، باب انہ لیس فی ترک الحج خیرۃ ... ص ۲۷۰

[2] فروع کافی۔ ج ۴۔ کتاب الحج، باب الاجبار علی الحج۔ ص ۲۷۲

[3] فروع کافی۔ ج ۴۔ کتاب الحج، باب الرجل یستدین و یحج، ص ۲۷۹

احساس باقی رہے۔[1]

کلینی نے "سعید سمان" سے ایک روایت نقل کی ہے۔ چونکہ اس کا متن بہت مفصل ہے لہٰذا ہم صرف اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں :۔

"میں ہر سال حج کے لئے مکہ معظمہ جاتا تھا۔۔۔ ایک سال قحط کے آثار پیدا ہوگئے اور لوگوں کی زندگی دشوار ہوگئی۔ میرے دوستوں نے مجھ سے کہا۔ اگر تم اس سال حج جانے کے بجائے اس کا پیسہ صدقہ کے عنوان سے مستحق لوگوں کے درمیان تقسیم کر دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے دریافت کیا کیا تم سب دوستوں کی رائے یہی ہے؟ سب نے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ میں نے بھی حج کا ارادہ تبدیل کر دیا۔ سعید کہتا ہے کہ میں نے اس سال شب عرفہ ایسا خواب دیکھا جس نے مجھے پریشان کر دیا اور میں نے طے کر لیا کہ آئندہ کبھی حج سے منہ نہ موڑوں گا اور ہر سال سفر حج پر جایا کروں گا۔ دوسرے سال میں حج پر گیا اور "منیٰ" میں (جہاں لوگوں سے ملنے جلنے اور ملاقاتوں کے بہترین مواقع فراہم ہوتے ہیں) امام صادق علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوا۔ (ان دنوں عالم اسلام میں بکھرے ہوئے امامؑ کے دوستداروں کو یہیں امام سے ملاقات اور مسائل کے دریافت کرنے کا بہترین موقع فراہم ہوا کرتا تھا) لوگ امام کے گرد جمع تھے اور کچھ لوگ حضرتؑ کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے میں حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد دریافت کیا کہ صدقہ اور حج میں بہتر اور افضل کون ہے اور اس سلسلہ میں میرا کیا فریضہ ہے؟ امامؑ نے تین مرتبہ فرمایا: فقراء کی مدد کرنا کتنی اچھی بات ہے۔ (تاکہ سوال کرنے والا جان لے کہ ایک عمل کی تعریف سے دوسرے عمل کی تضعیف و تحقیر مقصود نہیں ہے) چنانچہ میں نے دوبارہ دریافت کیا کہ ان دونوں میں بہتر کون ہے؟ آپؑ نے فرمایا اگر تم حج بھی بجالاؤ اور صدقہ بھی نکالو تو کیا حرج ہے؟ میں نے عرض کیا اگر اتنا پیسہ نہ ہو کہ دونوں عمل بجالائے جائیں۔ فرمایا: اگر کسی کے پاس صرف دس درہم ہیں اور اتنا ہی اس کے حج کا مصرف ہے تو اسے اس کے بھی دو حصے کرنے چاہیں۔ یعنی پانچ درہم صدقہ دے اور بقیہ پانچ درہم کے ذریعہ حج کرنے جائے اور اگر ہو سکے تو اس سے بھی زیادہ صدقہ نکالے۔ کوشش کرے کہ سفر کے مخارج سے کاٹ کر صدقہ نکالے اور حج بھی ترک نہ کرے کہ یہ عمل تمہارے لئے بہتر جزا کا سبب بنے گا (سوال کرنے والے نے جب دیکھا کہ امام دونوں عمل میں

---

[1] فروع کافی۔ ج ۴۔ کتاب الحج، باب الفضل فی نفقۃ الحج ص ۲۸۰

کسی کو ترک کرنے پر راضی نہیں بلکہ دونوں کو بجا لانے کی تاکید فرما رہے ہیں تو اس نے امام سے صراحت چاہی) اگر اس طرح دونوں عمل بجالائے جائیں تو صحیح ہے؟ امام نے فرمایا: ہاں۔

اس کے بعد امام نے تین مرتبہ فرمایا: آخر حج کا نعم البدل کونسا عمل ہو سکتا ہے؟ پھر فرمایا: بندۂ خدا جب حج کے ارادے سے قدم باہر نکالتا ہے وہیں سے وہ ثواب الٰہی اور جزا لئے پروردگار کا مستحق ہو جاتا ہے (کیونکہ وہ اپنی ساری دنیا کو چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسمیں ایمان کے نور سے خودسازی کی ساری کیفیات موجود ہیں چنانچہ وہ اس کی جزا کا مستحق بھی قرار پاتا ہے) وہ مسجد الحرام میں آکر طواف واجب بجالاتا ہے، مقام ابراہیمؑ پر نماز ادا کرتا ہے۔ اس وقت ایک فرشتہ اس کے بائیں جانب آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور جب وہ شخص واپس پلٹنے لگتا ہے تو فرشتہ اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے، اے بندۂ خدا تمہاری گذشتہ ساری کثافتیں اور سارے گناہ محو ہو گئے۔ "یا هذا، اما ما مضیٰ فقد غفر لك، واما ما یستقبل فجد" اب تم بہتر مستقبل کی کوشش کرو۔[1]

اصولی طور سے توبہ اسی کو کہتے ہیں (کیونکہ توبہ کے معنی ہیں نیکی کی طرف انسان کی بازگشت) اور یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان واقعی طور پر کجروی کو چھوڑ کر راہ حق کی طرف پلٹ آئے تو گویا وہ پاک ہو جاتا ہے البتہ توبہ کی روایات بتاتی ہیں کہ حق اللہ تو ممکن ہے بخش دیا جائے لیکن حق الناس اس کی گردن پر باقی رہے گا۔ اور جو شخص توبہ کرنے کے بعد پھر کسی کا مال ہڑپ کرنے کی کوشش کرے تو اس کی توبہ، توبہ نہیں کہی جا سکتی، گویا اسمیں گناہ اور کثافت کے جراثیم ابھی پائے جاتے ہیں۔ بہرحال یہ روایت اپنے مفاہیم و مطالب کے اعتبار سے بہترین روایت ہے۔ اس کا ہر گوشہ معنی خیز اور ہر پہلو معاشرہ میں ایک ایسے جامع و کامل رہبر و ہادی کی رہبری کی طرف اشارہ کرتا ہے جو "امام مطلق" میں پائی جاتی ہیں۔ اب چونکہ ہم اس زمانہ میں ایسی رہبری و ہدایت سے محروم ہیں لہٰذا ہمیں دین کے سلسلے میں کم از کم ایسے رہبروں کی پیروی کرنی چاہئے جو نہ تو امام (معصوم) ہیں نہ ہو سکتے ہیں لیکن کم از کم اس نوعیت کی قیادت میں تا حد امکان امام کے جانشین ہونے کی لیاقت رکھتے ہوں۔

فریضۂ حج کی ادائیگی اور ہم

آج کے دور میں اگر ہم حج سے مکمل طور پر بہرہ مند نہیں ہو پا رہے ہیں تو ہمیں آئندہ کے لئے بہرحال اس سلسلے میں غور کرنا چاہئے کہ کس طرح حج سے صحیح طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ یہ کہ ہم اس پہلو کو ایکدم سے

[1] فروع کافی۔ ج ۴۔ کتاب الحج باب: فضل الحج والعمرة وثوابهما روایت نمبر ۲۳، ص۲۵۵

نظر انداز کریں، حج کی افادیتوں کو نظر انداز کرنے سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ یہ درحقیقت ایک ایسا اجتماع ہے جسمیں جتنا زیادہ سے زیادہ لوگوں کا مجمع ہوگا اتنی ہی زیادہ اسلامی معاشرہ کی شان و شوکت ابھر کر سامنے آئے گی۔ جس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں اس طرح کی خبریں نشر ہوا کریں گی کہ لوگوں کا ایک بہت بڑا اجتماع جو دس سے پندرہ لاکھ یا اگر اس سے بھی زیادہ لوگ شریک ہوسکے تو مثلاً بیس لاکھ کی عظیم تعداد پر مشتمل ہے مخصوص ایام اور مخصوص اوقات میں ایک مخصوص جگہ پر ہر سال منعقد ہوتا ہے، ایک ایسا اجتماع جو ایمان کی روح سے معمور اور سرشار ہے، کیا یہ بات اسلام اور امت مسلمہ کی شان و شوکت کا مظہر نہ بنے گی ؟

اس کے علاوہ دشمنان اسلام کو مرعوب کرنے اور ان لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے سلسلے میں جن کے دلوں میں اسلام کے لئے نرم گوشے پائے جاتے ہیں یہ عظیم اجتماع موثر ثابت نہ ہوگا؟؟ البتہ شرط یہ ہے کہ ہم اس عظیم اجتماع کا انعقاد اس طرح کریں جو صحیح اسلامی شان و شوکت کا نمونہ ہو، ہماری رسوائی کا باعث نہ بنے۔

جرمنی میں ایک مرتبہ ٹیلی ویژن پر مناسک حج کے مناظر پر مشتمل ایک فلم دکھائی جا رہی تھی، جس کے بعض حصے واقعتاً دلکش اور باعث فخر تھے لیکن دوسرے ہی سال جب میں خود حج سے مشرف ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ کیمرہ مین کو یا تو اجازت نہیں تھی، یا وہ خود اتنا بدطینت نہیں تھا کہ ان مناظر کے حساس پہلوؤں کو بھی فلم میں اجاگر کرتا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ طواف جیسا رکن جسے بذات خود ایک محور کے گرد گھومنے کے سلسلے میں لوگوں کے نظم و ضبط اور اسلام و ایمان کا بہترین نمونہ ہونا چاہئے، لیکن بے حد افسوس کی بات ہے کہ اس رکن کی یہ گرانقدر خصوصیت بھی درحقیقت جاتی رہی۔ طواف کرنے والے، طواف کے دوران جیسے ہی حجر اسود کے پاس پہنچتے ہیں دو طرف سے نظم خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک تو ان افراد کی وجہ سے جو جہالت اور ناواقفیت کی بنا پر نظم کی پابندی کا خیال ہی نہیں رکھتے اور طواف شروع کرنے کے لئے بلا جہت مجمع کو چیرتے پھاڑتے اسمیں داخل ہوتے ہیں، دوسرے ان لوگوں کی وجہ سے جو حجر اسود کے نزدیک پہنچتے ہی اسکی طرف اس خیال سے بڑھتے ہیں کہ اسے مس کرنا اور بوسہ دینا ضروری اور لازمی ہے ... بہرحال ہمیں اس مسئلہ میں اپنے ائمہ معصومین ؑ کے دور کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس زمانہ میں کیا صورت حال تھی اور امام ؑ نے ہمیں اس مسئلہ کا کیا حل بتایا ہے ؟

ایک شخص نے امام جعفر صادق ؑ سے دریافت کیا کہ: کیا حالت طواف میں ہمیں حجر اسود کا "استلام" کرنا چاہئے یعنی تبرکاً اس سے ہاتھوں کو مس کرنا چاہئے ؟ امام نے جواب میں ارشاد فرمایا: میں جو حجر اسود کو

مس نہیں کرتا ؟ (کیا تمہارا مطلب یہ ہے؟) راوی نے عرض کی : مولا کیا روایت میں یہ وارد نہیں ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ حج کے موقع پر حجر اسود کو مس فرمایا کرتے تھے اور اسے بوسہ دیتے تھے ؟

آپؑ نے فرمایا ، ہاں ، ایسا ہی ہے ۔ لیکن آنحضرتؐ کے لئے لوگ جگہ کشادہ کر دیا کرتے تھے اور نظم و ضبط میں کوئی فرق نہیں آتا تھا ۔ آپ فوراً تشریف لاتے تھے اور اس مستحب موکد امر کو بجا لاتے تھے ۔ لیکن یہ صورت حال میرے ساتھ نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں حجر اسود کے "استلام" (مس کرنے) کو نظر انداز کرتا ہوں اور طواف کی محترم شکل کو مسخ نہیں ہونے دیتا [1]

اب ہمیں امام جعفر صادق علیہ السلام کے شیعوں سے دریافت کرنا چاہئے کہ وہ حج کے مقدس فریضہ سے شرف یاب ہونے کے دوران اپنے اس پیشوا اور عظیم المرتبت امامؑ کی نصیحت اور ان کی تاکید عمل پر کس حد تک توجہ رکھتے اور عمل کرتے ہیں ۔ یا ان کا بھی وہی حال ہے جو عام غیر شیعہ افراد کا ہے ؟ (چونکہ عام طور پر اس طرح کی غلطی زیادہ تر غیر شیعہ افراد ہی سے سرزد ہوتی ہے) کیا وہ لوگ بھی (دوسروں کی طرح) مجمع پر یورش کرتے، صفوں کو درہم و برہم کرتے اور لوگوں کا طواف خراب کرتے ہیں اور وہ بھی محض اس لئے کہ ان کے ہاتھ حجر اسود تک پہنچ جائیں ! یا وہ اسے بوسہ دے سکیں !

میں نے وہاں پر یہ بات محسوس کی کہ اگر کیمرہ مین نے اپنی فلم میں اس منظر کو اجاگر کیا ہوتا تو یہ ہمارے لئے کس قدر شرم و عار کی بات ہوتی ؟ درحقیقت یہ امور لوگوں کی جہالت ، ناواقفیت ، اور حج کے سفر پر جانے سے پہلے ان کی تربیت نہ کئے جانے کا نتیجہ ہیں ۔

بلاشبہ یہ ہمارا قومی و اجتماعی فریضہ ہے کہ ہم جب بھی عازم حج ہوں یا کسی اور کو عازم حج دیکھیں تو ان حساس مسائل کے بارے میں ضرور بضرور اسکی رہنمائی کریں ۔ اور اگر سب کو نہ سہی تو کم از کم ایک ہی فرد کو ان مناظر کی بدنمائی کا سبب بننے سے محفوظ رکھ سکیں ۔

اگر ہم حج کے اس عظیم اجتماع کو اس کے صحیح حق کے مطابق زندہ اور قابل احترام شکل میں محفوظ رکھ سکیں تو کتنا اچھا ہو ؟

---

[1] فروغ کافی ۔ ج ۴ ۔ کتاب الحج باب ، المزاحمۃ علی الحجر الاسود ، روایت ۲ صفحہ ۴۰۴

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ: سید علی الحسن رضوی

دین ــ ایک تقابلی مطالعہ

دینی رجحانات خود انسان کی فطرت و سرشت میں شامل ہیں کیونکہ :۔

الف: دوسرے تمام عوامل سے زیادہ انسان کے اندر پایا جانے والا تجسس و جستجو کا مادہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس دنیا کے نقطۂ وجود اور اس کے اندر کارفرما نظام کو چلانے والے عظیم مدبر، تکیہ گاہ عالم نیز کائنات کی غرض و غایت اور ہدف نہائی وغیرہ کے سلسلہ میں تحقیق و مطالعہ کرے تاکہ اس کی صحیح طور پر معرفت حاصل ہو سکے اور اس پر ایمان لاکر اس کی عبادت کا حق ادا کرے۔

ب: انسان کی بلند پرواز فطرت خود اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ مادّی خواہشات کی تکمیل کے لئے سعی و کوشش کے علاوہ انسان کی واقعی حیثیت و عظمت پر بھی غور و خوض کرے اور ایک اعلیٰ اخلاقی و معنوی مقصد کی خاطر قدم اٹھائے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مدت سے آدمی اس راہ میں کوشاں ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تلاش و جستجو کا سلسلہ تاریخ بشریت کے ساتھ ہی ساتھ رواں دواں رہا ہے چنانچہ انسانی زندگی کے قدیم ترین آثاروں میں بھی مذہبی آداب خصوصاً عبادت و پرستش کے خاطر خواہ آثار موجود ہیں جو ہمارے دعوے کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔

بس فرق یہ ہے کہ جہاں کہیں خود انسان نے اپنی خواہشات و تصورات کے آئینہ میں اپنے اپنے دین تراشے اور ڈھالے ہیں وہاں معبودوں کو بھی کسی نہ کسی صورت میں محدود و محسوس اور خیالی و افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب انسان کا مقصد اور آئیڈیل، حب ذات، نفسانی شہوات اور ذاتی رجحانات کی قید و بند سے آزاد ہو کر آگے بڑھتا ہے تو وہ بتدریج قوم، قبیلہ، ملت، انسانیت، اور ایک اعلیٰ مرحلہ میں

خیر خواہی وعدل وانصاف پسندی کو اپنا آئیڈیل بنالیتا ہے۔

جبکہ سلسلۂ انبیاء، معبود کو خدائے واحد ویکتا، ناقابل ادراک، لامتناہی اور انسانی افکار سے ماوراء بتاتا ہے اور تمام انسانوں کو اسی کمال مطلوب کے انتخاب کی دعوت دیتا ہے جو درحقیقت تمام کمالات وفضائل کا منبع نیز تمام اصولوں اور اقدار کا سرچشمہ اور خدا ہے۔

دین:

اپنے عام معنوں میں تخلیق کائنات کی ایک ایسی تفسیر ہے جس کے ذریعہ کائنات کے مبداء وخالق اور اس کے ناظم ومدبر کے تئیں تعظیم وتکریم کا اظہار نیز ایک بہتر زندگی کی غرض سے کسی راہ کا تعین کیا جا سکے۔ لیکن بمعنائے خاص یہ وہ الہی سنت ہے جو انسان کو خدائے یگانہ کی طرف دعوت دیتی ہے اور اسکی طرف سے مقرر کردہ مخصوص اصول وقوانین کے تحت انفرادی طور پر ہر شخص کو ایک پاک وپاکیزہ زندگی سے آراستہ کرکے راہ کمال وسعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اجتماعی نقطۂ نظر سے ایک عادلانہ نظام، اچھے تعلقات اور معاشرہ کی فلاح وبہبود کے لئے ہمہ جہت ومشترکہ سعی وکوشش کو وجود میں لاتی ہے۔

انبیاء ــــــ

خدا کی طرف سے الہی پیغام کے حامل ہوتے ہیں وہ قوموں اور ملتوں کی رہبری اور اصلاح کے عظیم فرائض انجام دیتے ہیں۔ تاریخ، جہاں تک ہماری رہبری کرتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء: ــــــ

(۱) خود عوام کے درمیان سے ہی مبعوث ہوتے رہے تمام چیزوں سے زیادہ ان کی کوششیں اسی بات پر مرکوز رہیں کہ معاشرہ کے محروم ومظلوم طبقہ کو ان کا حق دلایا جائے۔

(۲) غلط اور فرسودہ عقائد وافکار، انحطاط کے شکار رسوم وآداب نیز خودخواہی وہواپرستی سے نکال کر فکری انقلاب کے ذریعہ لوگوں میں آگاہی وبیداری پیدا کرتے رہے۔

(۳) ہر طرح کے ظلم وستم، خودسری ومطلق العنانی، اختلاف وانتشار، فریب اور دھوکا دھڑی کے خلاف آواز بلند کی اور اس راہ میں قربانیاں پیش کرتے رہے۔

(۴) جن چیزوں کی دوسروں کو تعلیم دیتے خود بھی اس پر یقین و ایمان رکھتے اور سب سے پہلے لوگوں کو اپنے اخلاق و کردار کا گرویدہ بناتے۔

(۵) ان کی باتیں فیصلہ کن، ہر ایک کی سمجھ میں آنے والی نیز کذب و ریا سے خالی ہوتی تھیں۔

(۶) لوگوں کے درمیان ان کی کامیابی اور اثر و رسوخ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت اور افکار کے نقوش کا ایک بڑا حصہ عرصہ دراز تک دنیا میں باقی رہا ہے۔

(۷) اپنے ماحول اور زمانے سے متاثر نہ ہونا نیز اپنی تعلیمات کو دوسروں سے حاصل نہ کرنا ان کی خصوصیت رہی ہے اس کے برخلاف وہ معاشرہ کے موجودہ فکری نظام اور ماحول کو تبدیل کرتے رہے ہیں۔

اگر کوئی دقت نظر کے ساتھ تاریخ اور تعلیمات انبیاء خصوصاً اسلام کا تحقیقی مطالعہ کرے تو یہ بات بخوبی روشن ہو جائے گی کہ :۔

(الف) دین، اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد یا معاشرہ پر حاکم جماعت کی ایجاد کردہ کوئی شے نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں پر ظلم و زیادتی روا رکھی جا سکے اور اس سے انسانوں کا استحصال کرنے کے سلسلہ میں مدد حاصل کی جائے۔ چنانچہ :۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے عظیم نمائندے مثال کے طور پر پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰ علیہما السلام، محروم و مظلوم عوام کے درمیان سے ہی مبعوث ہوئے خود نہایت ہی سادہ زندگیاں گزارتے رہے اور محروم و بے سہارا اقوام کی نجات کے لئے مفاد پرست ظالم و جابر، ستم پیشہ افراد سے مقابلہ کرتے رہے۔

پیروان انبیاء اور ان کے مخالفین کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے اصولی طور پر انبیاء کا اصل مقصد سرکشی کا مقابلہ کرنا رہا ہے : چنانچہ قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے :۔

ولقد بعثنا فی کلّ امۃ رسولا ان اعبدوا اللّٰہ واجتنبوا الطاغوت

(نحل/۳۶)

ہم نے تمام امتوں کے درمیان رسول مبعوث کئے تاکہ وہ لوگوں کو خدا کی پرستش کی طرف بلائیں اور سرکش طاغوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے بچائیں۔

ونرید ان نمنّ علی الّذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم

"ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثین ونمکن لهم فی الارض ......"

(قصص/۵و۶)

"(انبیاء کے بھیجنے سے) ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم کمزور و محروم لوگوں پر لطف و عنایت کریں ان کو معاشرہ کا حکم بنائیں اور روئے زمین کی دولت و ثروت کا ان کو وارث قرار دیکر ان کو قدرت و اختیار عطا کردیں...."

اب اگر عوام نے اس عظیم تحریکی طاقت سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تو اس میں خود ان کی جہالت وناعاقبت اندیشی کا قصور ہے دین کی حقانیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

ب - دین - لوگوں کے غم دروتی کو سرد کرنے یا انصاف طلبی کی حس کو مردہ کرنے کا ذریعہ نہیں ہے کہ انسان کل کی امید لگائے ہر طرح کے ستم و جور کو برداشت کرتا رہے کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ دین نے ہمیشہ ظلم و جبر اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اس کی تعلیمات سے نمایاں ہے - سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے :-

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (آیت/۲۵)

ہم نے انبیاء کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نیز حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی میزان بھی بھیجی تاکہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں۔

ج - دین، لوگوں کی جہل و نادانی کی پیداوار نہیں ہے کیونکہ تمام ادیان خصوصاً اسلام نے لوگوں کو شروع سے ہی علم و دانش کی دعوت دی ہے اور اس سلسلہ میں مسلمانوں نے علم و تمدن کی جو خدمتیں انجام دی ہیں وہ ہمارے دعوے کے بہترین گواہ ہیں -

قوانین فطرت کے انکشاف سے نظام جہان آفرینش کی تفسیر و وضاحت ہوتی ہے۔ خدا پر اعتقاد رکھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم طبیعی علل و عوامل کے منکر ہو جائیں بلکہ ہم خدا کو تمام تر قوانین و روابط کے ساتھ اس کائنات کا خالق مانتے ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ نظم کائنات اور آرائش عالم مکمل طور پر اسی کے امر و ارادے سے وابستہ ہے - سورۂ رحمان میں اعلان ہوتا ہے :-

والسماء رفعها و وضع المیزان الا تطغوا فی المیزان (آیت/۷و۸)

خدا نے آسمان کو بلندی عطا کی اور ہر شئی کے لئے ایک میزان و قانون قرار دیا تاکہ تم لوگ بھی
اپنے میزان و دائرے سے تجاوز نہ کرو۔

(د) "دین" کو خوف و ہراس کا نتیجہ قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے ویسے آئنسٹائن کے قول کے مطابق ممکن ہے خوف ابتدائی دور کے ایک انسان کے لئے مذہبی زمین ہموار کرنے کا ذریعہ بنا ہو لیکن ایک مذہبی جذبہ و احساس ابتدا ئے آفرینش سے ہی ہر ایک کے ذہن میں موجود رہا ہے[1]۔

(ھ)۔ "دین" معاشرہ کو کاہل، نکما، غیر متحرک اور مفلوج نہیں بناتا بلکہ اصولی طور پر یہ وہ آب حیات ہے جو قوموں میں آگاہی و بیداری اور تحرک پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں صبر و قناعت، تسلیم و رضا اور تحمل و توکل کا مفہوم ہی بالکل منفی انداز میں پیش کیا جانے لگا ہے۔ قرآن کا تو اعلان ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم

(انفال / ۲۴)

اے ایمان والو! خدا اور اس کا رسول (جب بھی) تم کو کسی ایسی شئی کے لئے آواز دے جو تمہاری حیات کا سرچشمہ ہے۔ تو تم فوراً لبیک کہو۔

(و)۔ "دین" تو جمود طاری کر دینے کا باعث نہیں ہے کیونکہ اسلام سب کو غور و خوض اور آزاد فکری کی دعوت دیتا ہے۔ اہل خرد و دانش کو دوسروں سے برتر و ممتاز سمجھتا ہے (چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ کیا عالم و جاہل ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں) مگر اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگ عقل و فکر کا صحیح اور مفید استعمال کریں تاکہ گمراہی و تباہی نیز تعصب و خود سری میں گرفتار نہ ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ خود غرض، مفاد پرست عناصر تاریخ میں ایسے بھی مل جائیں جنھوں نے دین سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ذریعہ لوگوں کو غافل اور نکما بنا کر ان کا استحصال کیا ہو، لیکن اس چیز کو دین کی اصل خاصیت میں شمار کرنا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے بلکہ یہ دین کا ایک غلط اور بے جا استعمال ہے۔

(ز) مذہبی احساسات کے اسباب و علل کو، کچلے ہوئے جنسی جذبات میں تلاش کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگرچہ ماہرین نفسیات کے مطابق کچلی ہوئی خواہشات یا غیر محسوس نفسیاتی دباؤ ایک شخص کے کردار و رفتار پر بہت گہرا

---

[1] فصل "مذہب و علوم" (از مجموعہ مقالات و سخن رانی ہائے آئنسٹائن)۔

اثر ڈالتا ہے پھر بھی محض جنسی خواہش کو انسان کے اعمال و عقائد کی علت تصور کرنا غلط ہے بلکہ آدمی کے اندر اور بھی بہت سی خواہشات و رجحانات موجود ہیں۔

(ج) اسی طرح اقتصادی عوامل (خصوصاً طبقاتی کشمکش) کو بھی وجود ادیان و مذاہب کا باعث قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یعنی ہم یہ مان لیں کہ کوئی خیر خواہ، معاشرہ میں موجود مفلوک الحالی کے سبب دین و مذہب کی تبلیغ پر مجبور ہوگیا تاکہ اس طرح دولت مندوں کی زیادتیوں کے خلاف غریبوں، محتاجوں اور بینواؤں کے حق میں اقدامات کرے اور مستقبل میں بعض لوگوں نے اس سے برعکس استفادہ کیا ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

دراصل اس فکر کی بنیاد یہ ہے کہ بعض لوگوں کی نظر میں تمام اجتماعی مسائل محض اقتصادی عوامل کی پیداوار ہیں جبکہ رفتہ رفتہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اجتماعی عوامل متعدد و پیچیدہ ہیں۔ معاشرے محض ایک محرک کے زیر اثر نہیں ہیں انبیاء کی دعوتیں بھی محض محروم و مجبور افراد کی حالت بہتر بنانے تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان کی تعلیمات ہمہ جانبہ تھیں وہ لوگوں کی فکری، اخلاقی، تربیتی، معاشرتی اور اقتصادی ہر رخ سے اصلاح چاہتے تھے۔

ادیان عالم کا تقابلی جائزہ :۔

جب ہم دنیا کے بڑے اور اہم مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے درمیان بہت سی اصولی و بنیادی باتوں میں اشتراک نظر آتا ہے چنانچہ اس اشتراک کی مندرجہ ذیل وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔

(۱) سرچشمہ وجود ایک ہونا : مثال کے طور پر :۔

(الف): وحی الٰہی ــــ جیسا کہ آسمانی مذاہب (دین اسلام، عیسائیت اور یہودیت) کے سلسلہ میں نظر آتا ہے

(ب): انسان کے اندر پائی جانے والی دور اندیشی اور اصلاح پسندی کے جذبات، علاقائی عادات و خصائل کے ہمراہ، جیسا کہ مشرقی ایشیائی ممالک میں وجود پانے والے مذاہب ــــ بودھ، جین، لاؤ (TZE-LAO) وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔

(۲): آمیزش و اقتباس کے تحت ایک دوسرے سے مخلوط ہوجانا : مثال کے طور پر :۔

(الف): عیسائیت : روم و یونان کے فلسفہ و مذہب سے متاثر ہونے کے بعد۔

(ب): بودھوں کے نظریات ہندو مذہب سے مخلوط ہونے کے بعد۔

بہر حال ــــ بہت سے مذاہب کے درمیان اس قسم کا ارتباط پایا جاتا ہے حتی کہ وحشی قبیلوں میں پروان

پڑھنے والے مذاہب بھی کسی نہ کسی حد تک بڑے مذاہب سے مربوط نظر آتے ہیں۔

ادیان کے تقابلی مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان آزادی فکر کے ساتھ تمام ادیان کا ان کے درمیان پائے جانے والے وجہ اشتراک اور امتیازات کا بلا کسی تعصب کے مطالعہ و موازنہ کرے۔ تاکہ جب ادیان کے درمیان روابط اور ہم بستگی کا جائزہ لیا جائے تو مذہب کی عظمت و اہمیت نیز ان میں پیدا ہونے والے خرافات و انحرافات کا بھی علم حاصل ہو جائے اور آخر میں ایک ممتاز و جامع دین کی شناخت کے ساتھ ہی ساتھ مذہب کے سلسلے میں ہمارا ایمان و عقیدہ زیادہ سے زیادہ تحقیقی اور استدلالی ہو جائے ۔ البتہ اس قسم کی آزادانہ تحقیق و مطالعہ کی اجازت کم ہی مذاہب میں دی گئی ہے ۔ جہاں تک اسلام کا سوال ہے باوجود اس کے کہ اسلام خود کو تمام انسانیت کے لئے ایک جامع و کامل و آخری دین کے طور پر پیش کرتا ہے، اس نے :

(الف) : تمام لوگوں کو آزادی فکر کے ساتھ اسلام کے بارے میں غور و فکر اور جانچ پڑتال کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس بات کی خواہش کی ہے کہ لوگ جبر و اکراہ یا اندھی تقلید کے بجائے خوب سوچ سمجھ کر اسلام قبول کریں۔

(ب) : اکثر و بیشتر موارد میں دوسرے آسمانی مذاہب اور پیغمبران الٰہی کے درمیان ہم بستگی کی صراحت کی، اور تمام مسلمانوں کو سختی کے ساتھ تمام انبیاء کے احترام کا حکم دیا ہے۔

(ج) : بعض ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں تمام آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کو ایک مشترکہ اصول "خدا پرستی" کی پیروی اور ہر طرح کے جھوٹے خداؤں (زر، زور اور طاغوت) سے بچنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(د) : اور کبھی، خدا و آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے عمل صالح بجا لانے کو بخشش و نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ یہاں ادیان کے تقابلی مطالعہ کے ذیل میں چند بنیادی باتوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

اول :

وہ مشہور مذاہب جن کا ہم اس بحث میں رفتہ رفتہ مطالعہ و موازنہ پیش کریں گے مجموعی طور پر درج ذیل ہیں :-

(الف) : مشرقی ایشیائی مذاہب ـــ ان کے موسس و بانی حضرات نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا البتہ ماننے والوں نے بعض اوقات ان کو خدا سے بھی اعلیٰ مراتب تک پہونچانے کی کوشش کی ہے : -

(۱) ہندومت :

زمانۂ قدیم میں کسی وقت ہندوستان میں پیدا ہوا اس کے بانی و موسس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ اس کے پیرو

تناسخ وحلول کے قائل ہیں (حتیٰ کہ اکثر جانوروں میں خدا کی روح کے حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں) پیچگانہ طبقاتی نظام[1] (ذات پات) اور ریاضت ان کی خصوصیات میں داخل ہے۔

(۲) : بدھ مت :-

چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں ھندو معاشرہ کی اصلاح کی غرض سے گوتم بدھ نے شمالی ھند میں اس کی بنیاد رکھی، طاقت فرسا ریاضت کی ایک اعتدال پسند راہ نکالی، انسان کو دکھوں سے نجات دلانے اور نروان (مقام فنا - اوج عرفان) تک پہنچانے کے لئے اس مذہب کو ایجاد کیا[2]

(۳) : جین مت :-

اس کی پانچویں صدی قبل مسیح کے آخر اور چھٹی صدی ق م کے شروع میں ھندوستان کے وسط مشرق میں مہاویر جین کے ہاتھوں تاسیس عمل میں آئی ۔ سخت مشقت و ریاضت اور ایثار و قربانی کے ذریعہ نروان حاصل کرنا اور خواہشات نفسانی کو کچل ڈالنا اس کی خصوصیات سے ہے[3]

(۴) : تاؤ ازم :-

اس کا بانی لاؤزے چھٹی صدی ق م چین میں پیدا ہوا ۔ سچائی کے ذریعہ تقویٰ و پرہیز گاری کے اعلیٰ مدارج تک پہونچنا، توحید اخلاص پر مبنی عرفان وسلوک کی راہ طے کرنا اور قدرتی مناظر کے درمیان سادہ و انفرادی زندگی گزارنے کی دعوت دینا اس کے دستور و قوانین میں سے ہے ۔

(۵) : کنفیوشس ازم :-

اس کا بانی وموسس کنفیوشس (۵۰۷ تا ۴۷۸ ق م) چینی فلسفہ کا باوا آدم شمار کیا جاتا ہے ۔ اس آئین میں اخلاقی قوانین کی پیروی، زندگی کو بہتر بنانے پر توجہ، گوشہ نشینی سے پرہیز اور اجتماعی فرائض کی ادائگی پر زور دیا گیا ہے ۔

(ب) ایرانی ادیان :-

(۱) : دین زرتشت :-

مغربی ایران میں تقریباً ۶ سو سال قبل از مسیح، یہ دین رائج ہوا ۔ اس کا آسمانی دین ہونا محتمل ہے اس میں یکتا پرستی پر توجہ دی گئی ہے ۔ نیکی کی دعوت اور آبادکاری پر زور دیا گیا ہے ۔

(۲) : دین مانی :-

حاشیہ [1] و [2] و [3] مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں ۔

مزدک اور خرم دینوں کو اس کے پیروؤں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ (مگر فی الحال اس کا کوئی پیرو نہیں ملتا)

ج : سامی ادیان : یہ سب کے سب الٰہی و آسمانی دین ہیں۔

۱ : دین یہود :-

۱۳ سو سال قبل از مسیح، بنی اسرائیل کی نجات کے لئے مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ پھیلا۔

۲ : دین عیسائیت :

۲ ہزار سال قبل فلسطین میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دین یہود کی اصلاح کی غرض سے بھیجا گیا اس کی بنیاد تقویٰ و محبت پر رکھی گئی۔

۳ : دین اسلام :-

۱۴ سو سال قبل آخری و جاودانی الٰہی دین کے طور پر ساری دنیا کی ہمہ جہت اصلاح کی غرض سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بھیجا گیا۔ جو عرب میں ظہور پذیر ہوا۔

توضیح :-

دوسرے بھی بہت سے انبیاء خدا کی طرف سے مختلف خطہ ہائے ارض پر بھیجے گئے مگر وہ کسی مستقل بڑے مذہب کے بانی کی حیثیت نہیں رکھتے ان میں سے اکثر ان ہی بڑے آسمانی مذاہب کے مبلغ و مروج کے طور پر بھیجے گئے یا کسی مخصوص شہر و قبیلہ کی اصلاح پر مامور کئے گئے تھے۔

دوّم :

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا دنیا کے تمام مشہور ادیان مشرق سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ دین یہود مصر میں، دین عیسیٰ فلسطین میں، اسلام عرب میں، زردشت ایران میں، ہندو اور بودھ وجین ہندوستان میں نیز کنفیوشش چین میں پھلے پھولے اور پھیلے۔

ان میں سے محض عیسائیت کو شہنشاہ روم کنستانتین (۳۱۲ء) کے عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد یورپ میں رواج حاصل ہوا اور پھر اسلام کی پیدائش اور عروج کے بعد عیسائیت کو مشرق سے رخت سفر باندھنا پڑا اس طرح عملی طور پر وہ مغربی دین بن گیا۔ بقیہ ادیان کی مشرقی حیثیت برقرار رہی بظاہر اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عرصۂ دراز سے تہذیب و تمدن اور فکر و فلسفہ کا اصل مرکز سرزمین مشرق ہی رہی ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اصولی طور پر مغرب میں پیدا ہونے والے ایک خاص قسم کے افکار و آداب کے

منکر ہیں بلکہ ہماری گفتگو موجودہ دنیا پر حاکم اہم مذاہب سے متعلق ہے جو سب کے سب یا تو مشرقی ہیں یا کم از کم ان کی جڑیں مشرق سے وابستہ ہیں۔

سوم :۔

مشرق و مغرب کے علوم و افکار اور مذاہب کے درمیان اختلاط و آمیزش کے اب تک کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں مثال کے طور پر :۔

(۱)، حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سیکڑوں سال پہلے مصر و کلدان و ھند کے علوم و افکار مغرب پہ اثر انداز ہوئے اور مشرقیوں نے مغربی فلاسفہ مخجملہ فیثا غورث اور افلاطون کو متاثر کیا۔

(۲) ، مغربی ایشیا پر سکندر کے حملے اور (تقریباً تین سو سال قبل مسیح) ھندوستان سے تمام فلسطین کی طرف بودھ و فود کی روانگی وغیرہ نے دوبارہ مشرقی و مغربی علوم و افکار پر ایک دوسرے کے اثرات مرتب کئے۔

(۳) : ایک طرف اسپین اور مڈیٹرین کے جنوبی سواحل تک دوسری طرف ہند و چین کے وسیع و عریض علاقوں تک پرچم اسلام کا لہرانا اور پھر تین چار سو سال کے بعد صلیبی جنگوں کا سلسلہ دنیا بھر کے علوم و افکار کے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہونے کا باعث بنا اور وسط ایشیا سے لے کر یورپ نیز مشرق بعید تک کے علاقے اس عظیم موج کی لپیٹ میں آگئے۔

(۴): (سولھویں صدی عیسوی میں) یورپ کی نشأت ثانیہ اور مشرقی ممالک پر مغربی تہذیب و ثقافت اور آداب و رسوم کی یلغار۔ (اس اٹھل پتھل کے بارہ میں جہاں تک مذہب کا تعلق ہے آیندہ صفحات میں ذرا تفصیل سے بحث کی جائے گی)

چہارم :۔

مشرق و مغرب کی طرز زندگی میں عرصہ دراز سے بہت بڑا فرق رہا ہے جن میں سے چند بنیادی باتیں قابل توجہ ہیں (البتہ کمزور اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا فی الحال مقصود نہیں ہے۔)

مغربی زندگی :۔

عام طور پر لوگوں میں سعی و کوشش یعنی کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ لوگوں نے زندہ رہنے اور زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اسی دنیوی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ قومی صلاحیت پر توجہ دیتے ہیں، دوسروں سے خود کو نمایاں سمجھتے ہیں، اقتدار کی خواہش، لذت پرستی، نیز تمام محسوس و قابل ادراک چیزوں کو تحت نظم و عمل قرار دیکر اپنے کنٹرول میں کرنے کی کوشش کرنا ان کے امتیازات میں سے ہے۔ اہل مغرب دین کو

عاشرہ کی پیداوار نیز اس دنیوی معاشرت میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لئے ایک (غیر مرئی) محافظ (پولیس) تصور کرتے ہیں۔
حتی کہ یونانی مذاہب زیادہ تر سیاسی پہلو کے حامل ہوتے تھے۔ ان کی نظر میں خدا کو طبیعی طور پر ثابت و مشخص کیا جا سکتا ہے وہ اس کو قابل لمس و مجسم شمار کرتے ہیں (چنانچہ جب عیسائیت یونانی تہذیب و تمدن سے ہم آہنگ ہوئی تو انہوں نے اپنا خدا جناب عیسیٰ کی شکل میں مجسم تصور کرتے ہوئے انسانی شکل کا قرار دے دیا)
یونانیوں کی اخلاقی قدریں قبیلہ پروری تک محدود تھیں۔ یعنی وہ صرف اپنی قوم و قبیلہ اور عزیز و اقارب کے حقوق و احترام کے قائل تھے۔ ان میں اکثریت قوم پرست تھی دوسروں کا احترام صرف دکھاوے کے طور پر ظاہری ادب کی خاطر کرتے تھے وہ انسانی بنیاد پر قائم کسی رشتے کے قائل نہ تھے۔
ان کی نظر میں تقویٰ، تدبیر کا دوسرا نام ہے۔ نظم و ضبط اور تعاون و امداد باہمی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے لیکن مشرق میں (خصوصاً مشرق بعید میں)
حیات دروںی کی تربیت روحانی آزادی، مشقت و تعب پر راہبانہ زندگی (سنیاس)، ظلمت عالم سے نجات حاصل کر کے خدا سے الحاق پیدا کرنا (نیروان) رنج و آلام پر فتح حاصل کر لینا، ہر ایک حتی کہ پست ترین حیوانات تک مہر و محبت، ساری دنیا کو ایک نظر سے دیکھنا آخرت کو مدنظر رکھنا۔ روح کی رستگاری کا عقیدہ رکھنا، عرفان و تفکر ادراکی کا پایا جانا، الفاظ سے زیادہ معانی کو اہمیت دینا، ریاضت سے کام لینا وغیرہ مشرق کے مشخصات میں سے ہے۔
پنجم:-
دین یہود و مسیحی چونکہ مختلف حالات و ادوار میں ظاہر ہوئے لہٰذا باوجودیکہ ایک دوسرے کا مکمل ہے۔ دونوں الگ الگ خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔
دین یہود ایک محروم و ستم دیدہ قوم کی نجات کے لئے فرعونیت کے دست ظلم میں گرفتار افراد کے حقوق کی بحالی نیز ایک نئی زندگی اور حکومت عطا کرنے کی غرض سے ظاہر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دین میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ زندگی اور آسائش زندگی کی طرف تشویق دلاتے ہوئے جہد مسلسل اور جنگ و اصلاح معیشت کی دعوت دی گئی ہے اس میں قانون اور معاشرت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف چونکہ دین مسیحی (عیسائیت) رومی معاشرہ میں ظہور پذیر ہوا جہاں کے لوگ جنگجو، دنیا پرست اور زور آزما ہوا کرتے تھے۔ سامان معاشرت میں غرق، آداب و رسوم میں گرفتار مسلح و آراستہ زندگی گذارنے کے عادی تھے۔ نیز یہ کہ قوم یہود میں زر پرستی و ذخیرہ اندوزی اور حیلہ بازی و دنیا پرستی جیسی عادتیں پیدا ہو چکی تھیں جنکی اصلاح مقصود تھی۔ چنانچہ ان حالات میں جناب عیسیٰ نے ان کو

زہد و پرہیزگاری، برادری و انسان دوستی نیز دنیا سے بے رغبتی اور باطن کی پاکیزگی اور محبت و اخلاص کی بنیاد پڑی۔
غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دین یہود کا جھکاؤ زیادہ تر دنیوی زندگی اجتماع اور مادیت کی طرف ہے اور دین مسیح میں اس دنیا کے بہ نسبت معنوی زندگی کی طرف زیادہ توجہ صرف کرتے ہوئے صفائے نفس اور وارستگی کی دعوت دی گئی ہے۔

ششم :-

صرف اسلام وہ دین ہے جو چند پہلوؤں کا حامل ہے اور پوری دنیا کے لئے الٰہی دین کے طور پر بھیجا گیا (یہی قصہ ہے کہ یہ دین عالمی و جاودانی ہے)
اس کے اندر مشرق و مغرب دونوں کے امتیازات کو بڑے حسین انداز میں یکجا پیش کیا گیا ہے اور بہ تمام و کمال جملہ انسانی پہلوؤں پر توجہ کی گئی ہے اس کے علاوہ یہودیت و عیسائیت کے درمیان توازن و اعتدال قائم کرتے ہوئے ایک مستقل راہ پیش کر دی گئی ہے۔ یہاں صرف نمونے کے طور پر چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا مقصود ہے تفصیلی بحث آیندہ صفحات میں انشاءاللہ پیش کی جائے گی۔
پیغمبر اسلام نے مسجد بھی تعمیر کرائی اور جنگیں بھی لڑتے رہے۔ معاشرتی و اجتماعی زندگی کے لئے نظم و نسق بھی فراہم کئے اور اصلاح و تربیت نفس کے لئے دستور و قانون بھی سپرد کئے۔ تہذیب روح اور صفائے باطن پر بھی توجہ دی اور اجتماعی کار و کوشش کے لئے اصول و لائحہ عمل بھی حوالے کئے۔
اسلام نماز کا بھی حکم دیتا ہے (جس کا مقصد قرب الٰہی، صفائے قلب اور روح کی پاکیزگی ہے) اور جہاد کی بھی دعوت دیتا ہے جو ترقی و آزادی اور دفاع کے لئے جہد مسلسل ہے۔ روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے (تاکہ انسان تصفیۂ روح اور خود پر غلبہ حاصل کر سکے) اور زکوٰۃ نکالنے کو کہتا ہے (تاکہ دوسروں کی بھلائی اور معاشرہ کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو سکے) ایک طرف توبہ و استغفار، غور و فکر، زہد و ورع اور خواہشات نفس کی مخالفت کا مطالبہ کرتا ہے (جس کا مطلب اصلاح نفس اور پاکیزگی ہے) اور دوسری طرف کاروبار، تحصیل و تعلیم مجاہدہ و مبارزہ، ازدواج و آبادکاری نیز اجتماعی حقوق و قوانین کی بات کرتا ہے (جن کا مکمل طور پر معاشرتی زندگی اور اس کے نظم و نسق سے تعلق ہے)۔
چنانچہ قرآن کریم میں ایک طرف تو یہ آیتیں ہیں جن میں ارشاد ہوتا ہے :-
"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (سورۂ رعد/۲۸)
یاد رکھو خدا کے ذکر سے قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

۱۔ "قد افلح من تزکیٰ وذکر اسم ربہ فصلی بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا۔ والاخرۃ خیر وابقی" سورۂ اعلیٰ (آیت/۱۴ تا ۱۷)

جس نے اپنی روح کو پاک و پاکیزہ کر لیا اور خدا کی یاد میں لگ گیا اور نماز گزار بن گیا اسکو فلاح و نجات حاصل ہوئی۔ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو جبکہ آخرت زیادہ پائیدار و بہتر ہے۔

یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً انی بما تعملون علیم (مومنون/۵۱)

اے ہمارے رسولو! ہم نے جس چیز کو پاک و حلال قرار دیا ہے اس سے استفادہ کرو اور اچھے کام (جس میں تمہارے لئے بھلائی ہو) انجام دو (کیونکہ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو ہم اس سے واقف ہیں۔

"واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم" (انفال/۶۰)

اور حتی الامکان سامان حرب کی فراہمی کے ذریعہ اپنی قوت کو اتنا مستحکم کرو کہ تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن تم سے ڈرتے رہیں (اور حملے کی ہمت نہ کر سکیں)

"ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا" (بقرہ/۲۹)

یہ اسی (خدا) کی ذات ہے جس نے اس روئے زمین پر پائی جانے والی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں۔ (تاکہ تم ان سے مستفید ہو سکو)

.... وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون (نحل/۷۸)

اور تم کو آنکھ، کان اور عقل و ہوش عطا کیا تاکہ تم اس کو کام میں لاؤ۔

یہ ان بے شمار تعلیمات اسلام کا ایک محدود و مختصر حصہ ہے جن کے ذریعہ اسلامی روح کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ دیگر ادیان کے مقابلہ میں اس کی جامعیت کا ایک ہلکا سا اندازہ لگایا جا سکے۔

۱۔ ہندو مذہب کی قدیم کتابوں میں انسانی معاشرہ کو چار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ قدیم ترین مذہبی کتاب "رگوید" میں کہا گیا ہے کہ برہمن برہما کے بالائی حصے سر سے، چھتری برہما کے شانوں سے، ویش برہما کے سینہ اور شودر برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تقسیم ابتداً طور پر پیشہ و عمل کی بنیاد پر ہوئی تھی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں مستقل نسلی طبقہ بندی کی حیثیت حاصل کرلی ۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ہندوؤں کی قانونی کتاب "منوشاستر" کا مطالعہ فرمائیں ۔

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر نے اس کو "پنجگانہ طبقاتی نظام" سے شاید اس لئے تعبیر کیا ہے کہ تاریخی کتب میں ان چار طبقات کے علاوہ ایک اور طبقے کا وجود ملتا ہے جن کو غیر طبقاتی افراد (OUT CASTE PEOP) کے نام سے یاد کیا گیا ہے

(ملاحظہ فرمائیں ۔ مقدمہ تاریخ ہند مرتبہ ایلیٹ و ڈاؤسن جلد سوم ۔۔ از پروفیسر محمد حبیب) ملی الحسن

۵ بدھ ، سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی بیدار ، ہوشیار ، دانا اور حامل نور کے ہیں ۔ بدھوں کی اصطلاح میں یہ لفظ اس شخص پر منطبق ہوتا ہے جس نے معرفت الٰہی کے ذریعہ دنیا کی تاریکی سے نجات حاصل کرلی ہو اور دوسروں کو بھی ظلمت سے نکال کر روشنی کی طرف بلا رہا ہو ۔ اس لئے اس مذہب کا بانی سدھارتھ جس کا خاندانی نام گوتم تھا ، گوتم بدھ کے نام سے مشہور ہوا ۔ گوتم بدھ شمالی ہند کے علاقے کپل وستو میں پیدا ہوئے (۵۶۸ ق م) اوائل عمر شاہی تربیت میں گذری ، ۲۹ سال کی عمر میں شاہی محل سے نکل کر عوامی زندگی کا مشاہدہ کیا اور پھر کربناک حقیقتیں سامنے آئیں تو حق کی تلاش میں نکل پڑے آخر کار نفس امارہ پر فتح و کامرانی حاصل ہوئی ، زندگی کا عقدہ کھل گیا اور گوہر مقصود پالیا ۔۔۔ گوتم بدھ نے زندگی کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا ہے ان کے خیال میں جب چار ارفع و اعلیٰ اصول تکلیف ، اسباب تکلیف ، انسداد تکلیف اور طریقہ انسداد تکلیف معلوم ہو جاتے ہیں تو عرفان کی منزلیں سر ہو جاتی ہیں ۔ عرفان کے لئے صدق وعقیدت ، صدق ارادت ، راست بازی ، حلال روزی ، عزم صمیم ، صدق نیت اور صدق تصور کی ضرورت ہے یہ دو انتہاؤں تن پروری اور تعذیب نفس کی درمیانی راہ ہے ۔

ملی الحسن (از رہنمایان ہند ، بابو نراین پرشاد ورما)

۶ جین ، کے لفظی معنی فاتح یعنی اپنی نفلی خواہشات پر فتح پا لینے کے ہیں اس مذہب کا بانی مہاویر جین ایک چھتری خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ ۳۰ سال کی عمر میں متاہلانہ زندگی ترک کردی ۔ ۴۲ سال کی عمر میں گیان (علم کی روشنی) حاصل ہوئی اور ایک نئے نرگرنتھ مذہب کی بنا ڈالی جو بعد میں جین مت سے تعبیر کیا گیا ۔ اس کی نظر میں قلبی مسرت و راحت کا حصول ہی نروان ہے جس کے دو طریقے ہیں ایجابی اور سلبی ۔ ایجابی طریقہ عقائد و علم و عمل کی درستگی کا نام ہے جس کی بنیادیں پانچ اصولوں پر رکھی گئی ہیں ۱۔ اہنسا (عدم تشدد) ۲۔ ستیم (سچائی) ۳۔ استیام (چوری سے اجتناب) ۴۔ برھمچاریم (راہبانہ مجرد زندگی) اور ۵۔ اپری گرہہ (مادی خواہشات و احساسات پر قابو حاصل کرلینا ۔)

(ملی الحسن)

جناب سید علی خامنہ ای
ترجمہ: جناب ممتاز علی

فریاد مظلومیت

اقوام متحدہ کے بیالیسویں عام اجلاس میں صدر جمہوریہ اسلامی ایران حجۃ الاسلام والمسلمین جناب سید علی خامنہ ای نے ایک تاریخی تقریر کے دوران، دنیا بھر سے آئے ہوئے نمائندوں کو حقیقت اسلام، انقلاب اسلامی کے خلاف استکباری طاقتوں کی سازشیں، مظالم اور ایران پر مسلط کی گئی سات سالہ جنگ کے واقعات سے روشناس کرایا۔ اس کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

خداوندا! میں تیرے نام سے شروع کر رہا ہوں اور تجھ ہی سے ہدایت و مدد چاہتا ہوں، میری زندگی، موت، میری حاجتیں اور دعائیں سب تجھ ہی سے متعلق ہیں، تو ہی میری گفتگو کو حق کی جاذبیت اور تابناکی عطا فرما اور اس کو ان کروڑوں انسانوں کے دلوں کے لئے "پیک حقیقت" قرار دے جو بے قراری سے اس کا انتظار کر رہے ہیں، میرا پیغام ان اربوں انسانوں تک پہونچا جو آئندہ ایسی ہی تڑپ رکھنے والے ہوں گے —— بارالٰہا! تیرے پیغمبروں کی روح پر میرا اور میری قوم کا مخلصانہ درود و سلام ہو خاص کر جناب ابراہیمؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ اور محمد مصطفیٰ صلوٰۃ اللہ علیہم پر جنہوں نے انسانوں کے پیغام آزادی اور آگاہی کو جان کی بازی لگا کر اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ دنیا میں پھیلایا اور اسے ابدی بنا دیا اور میرا سلام باکرام ان پاک اور روشن دلوں پر، جنہوں نے اس پیغام کو سنا۔ خاص کر ان لوگوں پر سلام جنہوں نے اس سلسلہ میں جان کی بازی لگا دی۔

میں ایران سے آرہا ہوں

جناب صدر! جناب سیکریٹری جنرل! حاضرین محترم!

میں اس ملک کا صدر ہوں جو تاریخ کے نازک اور اعلیٰ دور میں گہوارہ تمدن اور مرکز تہذیب انسانیت رہا ہے اور آج بھی ایک ایسے نظام کا حامل ہے جو اپنی قدیم ثقافت اور بے نظیر تہذیبی سرمایہ پر استوار ہے اور اسلامی بیداری نے اسے مزید جلا بخشی ہے۔ میں اس ایران سے آرہا ہوں جہاں سے ایک ایسا انقلاب ابھرا ہے جو مشہور ترین ہونے کے باوجود دنیا کے لئے ناآشنا ہے۔ وہ انقلاب جس کی بنیاد دین خدا پر ہے۔ جو پیغمبروں اور عظیم الٰہی مصلحین کے مقاصد

کی ایک کڑی ہے ... یہ وہ راستہ ہے جو بشریت کی طویل تاریخ پر محیط ہے ۔ اس انقلاب کی مضبوط جڑیں اور فکری بنیاد "اسلام کا توحیدی تصور کائنات" ہے ۔

تعبیر انسان، تفسیر تاریخ، ماضی، حال اور مستقبل کے حوادث کا تجزیہ، تشریح کائنات؛ ان تمام مسائل کی تفسیر جو انسان کو اس کے باہر کی دنیا، انسانوں اور کائنات کی تمام چیزوں سے مربوط کرتے ہیں، نیز انسان کے اپنے وجود کا ادراک؛ غرضکہ وہ تمام چیزیں جو معاشرہ کے نظام اقدار کو تشکیل دیتی ہیں اور اس نظام کو اپنی خواہش کے مطابق چلانے پر قدرت عطا کرتی ہیں وہ سب کی سب اسی "الٰہی تصور کائنات" کی رہین منت ہیں ۔

انسان خدا کا نائب ہے ۔

اسلامی فکر کے مطابق پوری کائنات، خدا کی پیدا کی ہوئی اور اس کے علم و قدرت کی جلوہ گاہ نیز اسی کی طرف پلٹ جانے والی ہے ۔ انسان اس کی بہترین مخلوق اور اس کا نائب ہے ۔

انسان اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کے خزانہ سے اگر چاہے تو اپنے آپ کو، ساری دنیا کو ۔۔۔ جو اسی کیلئے پیدا کی گئی ہے ۔۔۔ بہترین انداز سے بنا سنوار سکتا، نیز علم و ایمان کی بدولت مادی اور معنوی بلندیوں پر فائز ہو سکتا ہے ۔ ان ہی صلاحیتوں کو برباد اور منحرف کر کے دنیا کو ظلم و فساد کا جہنم بھی بنا سکتا ہے ۔ انسان کی ہدایت کا چراغ خدا پر ایمان اور امر و نہی الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور موت زندگی کے خاتمہ کا نام نہیں بلکہ موت ابدیت کا دروازہ اور نشأۃ نو کی ابتدا ہے ۔

اسلام کے الٰہی نقطۂ نظر سے افراد بشر ایک دوسرے کے بھائی، بہن ۔ اور سب خدا کے بندے ہیں انسانوں کے درمیان رنگوں، نسلوں اور علاقوں کے سبب کوئی فرق نہیں ہے ۔ رنگ و نسل وغیرہ کسی شخص یا قوم کی برتری کا سبب نہیں ہیں ۔ انسانیت متحد اور مرتبط ہے، کسی ایک انسان سے تعرض تمام انسانیت پر جارحیت کے مترادف ہے ۔ اس میں کسی قسم کی جغرافیائی اور نسلی تفریق کو دخل نہیں ہے ۔

اقتدار پرستی اور اجارہ داری نے بھائی کو بھائی کی جان کا دشمن بنا دیا اور جو خون جاری ہوا وہ رک نہ سکا۔ اس طرح کے جذبوں نے خون کے دریا بہا دیئے، اقتدار پرستوں اور ان کی ہوس اقتدار کا نشانہ بننے والوں کے درمیان خون کا سمندر حائل ہو گیا ۔ اس طرح انسانوں کا آرام اور چین چھن گیا ۔

عشقِ خدا

پیغمبروں نے انسانوں کو خدا کی اس بندگی کی دعوت دی ہے جو خود غرضی اور اقتدار پرستی کے جذبوں پر ضرب کاری ہے۔ انبیاءؑ نے اس آئین کی طرف لوگوں کو بلایا ہے جو آخرت کی جنت سے پہلے سکون و اطمینان کی جنت انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انبیاءؑ نے جاہ طلبی اور ہوس پرستی کے غریزہ کو مہار کرنے کی تشویق دلائی ہے۔ صلاحیتوں کے تباہ و برباد ہو جانے اور اخلاقی برائیوں کے کیچڑ میں غلطاں ہونے سے ڈرایا ہے۔ پیغمبروں نے فضیلت، سچائی، محبت، محنت، اختراع اور دانش و آگاہی کے سرچشموں کو انسانوں کے اندر جاری کیا اور یادِ خدا نیز عشقِ خدا کی تلقین کی جو ان تمام چیزوں کا ضامن اور روح کو بلندی عطا کرنے والا ہے۔

انبیاء نے انسانوں کو ایسا درس دیا ہے جس کے ذریعہ انسان اگر چاہے تو ان اقدار کی حفاظت کے لئے اپنے بازوؤں کو توانا اور مضبوط بنا لے، شر و فساد برپا کرنے والے، نیز تنزلی پیدا کرنے والے شیطانوں کا راستہ روک دے، جہل و غلامی سے نبرد آزما ہو جائے، عدل و علم و آزادی کی حفاظت کرے۔ انبیاء نے انسانوں کو یہ درس دیا ہے کہ نہ ظلم کرو اور نہ ظلم سہو۔ عدل و انصاف قائم کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہو۔ انسانی فلاح و بہبود کے لٹیروں کو پناہ نہ دو فلاح و بہبود و عدالت و فضیلت کے دشمنوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا، ان اقدار کو فنا کر دینے کی اجازت دینے اور ظلم و فساد و ذلت قبول کر لینے کے مترادف ہے۔

دین اور اجتماعی نظام

اسلام کے الٰہی نظریہ کے مطابق دینِ خدا، فقط فرقِ انسانی کا گوہر آبدار ہی نہیں بلکہ وہ پیکرِ انسانی زندگی کی شکل و صورت بھی ہے۔ دین، فقط چند عبادت اور آداب و رسوم کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ دین انسانوں کو ایک اجتماعی نظام کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ ہر چند کہ یہ عبادتیں اور آداب و رسوم بھی رواج زندگی سے معمور اور اسی نظام سے مربوط ہیں یہ اجتماعی نظام اسی تصورِ کائنات پر مبنی ہے اور اسے اسی شکل میں ڈھالا گیا ہے۔ آزادی، مساوات، اجتماعی انصاف، معاشرہ کے افراد کی خود شناسی، انحرافات اور برائیوں سے جنگ، انفرادی آرزوؤں پر اجتماعی تمناؤں کو ترجیح دینا، شیطانی طاقتوں کو نیست و نابود کر دینا، اور اسی طرح کے نظامِ اسلامی کے دوسرے اصول نیز انفرادی اخلاق و عادات اور سیاسی عمل کے میدان میں تقویٰ، یہ تمام کی تمام چیزیں اسی تصورِ کائنات اور انسان و عالم کے متعلق نظریہ کی دین ہیں۔

اسلام طاقت اور خودسری پر مبنی نظام، نیز ان نظاموں کو غلط سمجھتا اور رد کرتا ہے، جن کی بنیاد، ظلم و جہل گھٹن،

استبداد، انسانوں کی تحقیر اور رنگ و نسل و قوم و زبان کے امتیاز پر ہو، اور اس شخص یا نظام سے شدت کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے جو نظام اسلامی سے برسرپیکار ہو۔ اور سوائے ایسے افراد کے بقیہ تمام انسانوں سے محبت و ہمدردی کا حکم دیتا ہے۔ چاہے وہ ہم مشرب ہوں یا نہ ہوں۔

انقلاب یا نور کی بارش

ایسی بنیادوں پر اور ایسے مقاصد کے ساتھ ایران میں اسلامی انقلاب نمودار ہوا اور اس نے "اسلامی جمہوریہ" کی بنیاد رکھی۔ بہت سے لوگوں نے بہمن سنہ ۱۳۵۷ (فروری سنہ ۱۹۷۹ء) میں رونما ہونے والے انقلاب اسلامی کی بنیادیں تلاش کرنے کی کوشش کی اور بہت سے افراد اس کو سمجھنے میں خطاء سے دوچار ہوئے۔ میرے خیال میں اس عظیم انقلاب کا ایک سبب دنیا کے موجودہ نظاموں کا نقص اور ان کی طرف سے بلند کئے گئے ڈیموکریسی، مساوات اور آزادی کے نعروں کا کھوکھلا پن ہے۔ اسلام ایسی خوفناک تاریکی کا سینہ چاک کر کے چند صدیوں سے پڑے ہوئے توہم اور تحریف کے گرد و غبار کو صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایران میں یہ روشنی چمکی اور پھر انجام کار طوفان بن گئی اور ابھی دنیا کے مختلف خطوں میں حوادث کا منتظر رہنا چاہیئے۔

اسلامی تحریکیں

بہت سے اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی بیداری کی تحریکیں انقلاب اسلامی کے فرزند نہیں جیسا کہ سوچا اور پروپیگنڈا کیا جاتا ہے بلکہ انقلاب اسلامی کے بھائی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ دنیا کی اسلامی تحریکیں انقلاب اسلامی ایران کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے دست و بازو ہیں۔

ایران، جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے ایک اہم ترین خطہ میں واقع ہے۔ نیز علمی و ثقافتی میدان میں درخشاں ماضی کا حامل اور کم نظیر قدرتی ذخائر کا مالک ہے۔ ایران کا اسلامی انقلاب اس حکومت کے خلاف برپا ہوا جس نے ان تمام ذخیروں کو دنیا کی بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا، خاص کر آخر کے ۲۵ برسوں میں یہ تمام ذخائر متحدہ امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔ خود ایرانی قوم سے زیادہ کوئی بھی اس معنوی اور مادی ذخیرہ کا محتاج نہیں تھا لیکن ان ذخیروں سے ایرانی قوم کو محروم کر دیا گیا تھا۔ ان کے لمبے چوڑے دعوے جھوٹے اور پُرفریب تھے، اگرچہ مغربی پروپیگنڈا ایجنسیوں نے خاص کر ان ذرائع ابلاغ نے ان دعوؤں کو خوب خوب ہوا دیا جو صیہونیت سے وابستہ

توحید بھی

تھے۔ انقلاب اسلامی ایسی حکومت کے خلاف اعلیٰ مقاصد کے ساتھ رونما ہوا اس انقلاب کو ۹ سال گزر چکے ہیں پھر بھی اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے بارے میں اور ہمارے انقلاب ہمارے اصول اور نظریات کے بارے میں معمول سے زیادہ غرض مندانہ اور جلبلانہ باتیں کی گئی ہیں۔

انقلاب ایران کی خصوصیتیں

ہمارے انقلاب میں چند مخصوص نکتے ہیں جو دنیا کے عام انقلاب سے جدا شمار کئے جا سکتے ہیں۔ میں پہلے ان نکتوں کو بیان کروں گا پھر آخر میں اپنا پیغام آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

عوامی انقلاب

(۱) یہ اسلامی انقلاب اپنے ابتدائی مرحلہ میں بھی صد فی صد عوامی انقلاب تھا۔ نہ کوئی چھاپہ مار مسلح گروہ تھا، نہ کوئی سیاسی اور فوجی پارٹی تھی، نہ آزادی پسند انقلابی افسروں کا گروہ اور نہ دنیا میں انقلابی تحریک برپا کرنے والوں کی طرح کوئی جماعت تھی۔ ہمارے انقلاب میں ان میں سے کسی کی بھی کوئی موجودگی اور کارستانی نہ تھی۔ صرف عوام تھے عوام اور وہ بھی بالکل نہتے۔ انہوں نے تہران اور دوسری جگہوں کو اپنی موجودگی اور اپنے نعروں سے سڑکوں، میدانوں اور فضاؤں کو ایسا پر کر دیا کہ حاکم گروہ اور اس کی حکومت کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اور وہ لوگ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ایک ایک کر کے یا مل جل کر اپنے محلوں اور اقتدار کے مرکزوں اور پھر ملک سے باہر نکل جائیں۔ شاہ، وزیر اعظم، فوج کے اعلیٰ افسر، وزراء اور دوسرے صاحبان اقتدار، جو بھی بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے۔

سیاسی اور فوجی طاقت کی شکست

ان کی یہ شکست ایسے عالم میں رونما ہوئی جبکہ وہ ایک سال تک اپنی سیاسی، فوجی اور پولیس کی پوری طاقت کو بروئے کار لا کر عوام کو منتشر کرنے کی بھرپور کوشش کر چکے تھے۔ کہ عوام اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور اپنے اپنے کام میں لگ جائیں۔ اس مدت میں ہزاروں افراد ایک دوسرے کی نگاہوں کے سامنے سڑکوں، مسجدوں یونیورسٹیوں اور کارخانوں میں قتل کر دیئے گئے لیکن عوام کا مجمع دن بدن بڑھتا رہا، انقلاب کے آخری مہینوں میں حکومت کی

سختیاں جب بہت زیادہ بڑھ گئیں تو مومن کے مجمع میں بھی اسی طرح اضافہ ہوتا گیا۔ حکومت، جو جانباز عوام کے غیظ و غضب اور جوش و خروش کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی ایک بڑی شکست کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئی، شاہ ملک سے چلا گیا۔ پھر اس کے بعد شاہ کی پسپائی میں تیزی آتی گئی۔

انقلاب کے ۲ دو اہم عنصر: خدا پر اعتماد اور عوام کی مرضی

رہبر انقلاب نے ــــ جن کے بیان کا ہر لفظ قوم کی ہر فرد میں روح پھونکتا نیز انھیں درس آگہی دیتا تھا۔ اس خدا کے بھروسہ تمام طاقتیں جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور ان عوام کے ناقابل شکست اور عظیم ارادوں پر اعتماد کرتے ہوئے حکومتِ انقلاب کو تشکیل دیا۔ ستم شاہی حکومت کے لئے ترک اقتدار کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا لہٰذا اس نے مسند اقتدار کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کیا۔ آخری مورچے اور چھاؤنیاں فوجوں اور افسروں سے خالی ہو چکی تھیں...... وہ بھی بھاگ چکے تھے یا پھر ان میں سے بہت سے افراد عوام میں آکر مل گئے تھے۔ آخری لحظات میں چند فوجی کیمپوں نے کچھ مقابلہ بھی کیا لیکن وہ بیکار رہا وہاں بھی عوام موجود تھے...... عوام کی کامیابی اس انقلاب کا معجزہ تھا..... جب کیمپ خالی ہو گئے تب عوام کو اسلحہ ملا، اس وقت تک شہنشاہی نظام دم توڑ چکا تھا۔ یہ اسلحے نہال انقلاب کی حفاظت کے کام آئے، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور مردوں پر مشتمل عوام ہی تھے جنہوں نے اس پہلوی حکومت کو چکنا چور کر دیا باوجودیکہ وہ مستحکم اور مسلح تھی، جسے بڑی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اور پھر اس قوم نے نظام جمہوری اسلامی کی بنیاد رکھی۔ ایمان، قوی ارادہ اور ان کا خون ان کا اسلحہ تھا..... آخر کار خون تلواروں پر غالب آگیا۔

ناقابل شکست سیاست

خون کی شمشیر پر کامیابی کی سیاست وہی مظلومانہ مقاومت کی پالیسی ہے۔ جس کا اعلان ہمارے رہبر نے انقلاب کی کامیابی سے پہلے کر دیا تھا۔ اس پالیسی کا اولین معجزہ سر سے پیر تک مسلح، شاہ کی حکومت پر کامیابی ہے جسے امریکہ اور مغرب کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی..... اور اس کے بعد بھی کچھ کامیابیاں ملیں جن میں سے بعض تو شاہ کی حکومت پر غلبہ سے بھی بڑی کامیابی تھی۔

یہ کم از کم اس صدی کا بے نظیر تجربہ ہے۔ بہتر ہے کہ اس پر غور و خوض کیا جائے۔ اس پر ان ملکوں کو

کو بھی غور کرنا چاہیئے جو کسی کے زیر تسلط ہیں اور انہیں بھی اس کا جائزہ لینا چاہیئے جو ساری دنیا کو ہڑپ لینے کی فکر میں ہیں۔

اسلام۔ انقلاب کی اساس

(۲) اس انقلاب کا بھروسہ دین پر تھا، اس کا اعتماد اسلام پر تھا۔ دنیا میں بہت سے انقلاب ایسے ہیں جنکی جڑیں دین ہی سے سیراب ہوئیں یہ اور بات ہے کہ انقلاب کی شکل وصورت بنانے میں پھر ایمان کو کوئی خاص دخل نہیں رہ گیا یا پھر اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ لیکن ہمارا انقلاب ایسا ہے جس نے ہر چیز، مقصد، اصول یہاں تک کہ اپنی تحریک کے طریقوں کو نیز نئے نظام کی تشکیل اور اس نظام کو چلانے کا ڈھنگ بھی اسلام ہی سے سیکھا ہے۔

اسلام، انقلاب کو تعجب خیز روح عطا کرتا اور اس کی کامیابیوں کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے چونکہ اسلام ایسی عظیم تعمیری اور انقلابی صلاحیتوں کا مالک ہے اس لئے کم از کم ڈیڑھ سو سال سے استعماری طاقتوں، رجعت پسند اور برے عناصر کا نشانۂ ظلم بنا رہا ہے اس کے علاوہ، اسلام پچاس ملکوں اور ایک ارب سے زائد انسانوں کے درمیان ایک مقدس ایمان اور دین الٰہی مانا جاتا ہے۔

احساس کامیابی

اس انقلاب کی کامیابی جس کی روح اور اساس اسلام ہے۔ درحقیقت ان تمام حملہ آوروں پر غلبہ اور ایک ارب مسلمانوں کی کامیابی کے مترادف ہے۔ کروڑوں مسلمانوں نے دسیوں ملک میں اس انقلاب کی کامیابی کی وجہ سے اپنی کامیابی کا احساس کیا۔

انقلاب کی یہ خصوصیتیں عوام، رہبر انقلاب اور ذمہ داران انقلاب کے سامنے شکست، ضعف اور خاموش بیٹھ جانے کا راستہ بند کر دیتی ہیں۔ خدا کی راہ میں شکست ہے ہی نہیں۔ لہٰذا کمزوری، خوف اور پسپائی کا تصور بے جا ہے۔

ناوابستگی

(۳) اس انقلاب کی ایک خصوصیت یہ تھی اور اب بھی یہ فیصلہ کن سیاست ہے کہ وہ مشرق اور مغرب سے وابستہ نہیں ہے اور یہ عدم وابستگی، اجتماعی اور انفرادی زندگی میں خدا پر ہمارے اعتقاد اور اعتماد کا مظہر ہے۔

آج ساری دنیائے سیاست پر جو فکر مسلط ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی بڑی طاقت سے وابستگی کے بغیر موجودہ سیاست کے میدان میں زندہ رہنا ممکن نہیں ! ممکن ہے کہ اس وابستگی میں کمی اور زیادتی کے اعتبار سے اختلاف نظر ہو لیکن اصل نظریہ میں کوئی اختلاف نہیں، حتیٰ کہ وہ افراد جنہوں نے نظریاتی اعتبار سے عدم وابستگی کو قبول کیا ہے، وہ بھی اس بات کے معتقد ہیں کہ عملی میدان میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

خدا پر یقین، مشرق اور مغرب کی نفی کا سرچشمہ ہے۔

ہمارے انقلاب نے ایسی فضا میں ایک جدید فلسفہ کو پیش کیا اور آج تک اس کا پابند ہے۔ اس انقلاب نے ثابت کر دیا کہ توسیع پسند طاقتوں سے وابستگی کے بغیر زندہ رہا جا سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان خود سر طاقتوں کو بے حقیقت سمجھا جائے اور انہیں خراج نہ ادا کیا جائے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ تمام مادی طاقتوں سے بالاتر ایک طاقت پر اعتماد کیا جائے۔ یعنی خدا پر۔

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس عقیدہ اور اس راہ کے لئے ہمیں بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اور ہم نے اس کے لئے اپنے کو آمادہ بھی کر لیا ہے۔

اس تجربہ کو اقوام کی حقیقی اور ناقابل شکست آزادی نیز عالمی استبدادی طاقتوں کے مکمل زوال کیلئے رہنما بننے دیجئے۔ کیوں کہ طاقت کی موجودہ تقسیم سے بشریت کو مزید تلخ مستقبل کا خطرہ ہے۔

عداوتیں

(۴) ہمارے انقلاب کی ایک انفرادی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسے منفرد عداوتوں اور حملوں سے دوچار رہنا پڑا۔ دنیا کا کوئی بھی انقلاب توسیع طلب نظام کی دشمنی سے محفوظ نہیں رہا۔ لیکن ۹ سال کے عرصہ میں جس طرح کی عداوت اور دشمنی ہمارے ساتھ کی گئی اس کی حکایت انفرادی اور سننے کے قابل ہے۔

ابھی انقلاب کامیابی کی منزل میں قدم نہ رکھ سکا تھا کہ اس کے ساتھ دشمنی شروع ہو گئی اور اسمیں زیادہ تر دشمنی امریکہ کی طرف سے تھی۔ ..... ایسے کام میں ملوث افراد جو زمانہ گزر جانے کے بعد اپنے دبے ہوئے راز کو فاش کر دینا درست سمجھتے ہیں۔ آج وہ اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ امریکی صدارت کی پوری مشینری، صدر کے سلامتی امور کے مشیر اور خود صدر، شاہ کی حکومت کے آخری زمانہ میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے

اور سخت رویہ اپنانے کا مشورہ دیتے تھے! اس سخت رویہ سے مراد وہی چیز ہے جو بعد میں جنرل ہائزر کی ذاتی گفتگو
میں واضح طور پر سنی گئی۔ جنرل ہائزر وہ شخص ہے جو مخصوص طور پر امریکی صدر کی طرف سے مامور ہو کر تہران آیا
تھا۔۔۔۔ اس کے خیال میں اور جو کچھ اسے کہا گیا تھا، اس کے مطابق ہزاروں افراد کی جان کی قیمت دیکر بھی شاہ
کی حکومت کو باقی رہنا چاہئے تھا۔۔۔۔۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ ابھی ہزاروں افراد کا قتل ہو جانا اس سے بہتر
ہے کہ بعد میں اس سے کئی گنا زیادہ افراد قتل کئے جائیں۔۔۔۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نگاہ میں یہ نظریہ غلط
تھا کہ ' اگر وہ ایران کے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کرتا تو اس دن دسیوں ہزار اور پھر اس کے بعد اس سے
کئی گنا زائد افراد کا خون نہ بہتا'۔

دشمنانِ اسلام کی شکست

جنرل ہائزر کی ناکامی، تہران سے اس کا فرار اور ان تمام افراد کا جن کے بارے میں امریکہ کو امید تھی کہ وہ
اس منحوس منصوبہ پر عمل درآمد کر ڈالیں گے۔ گرفتار ہو جانا یا بھاگ جانا۔ یقیناً انقلابی لہر کی توانائی اور ہماری عظیم قوم کی
طاقت کے سوا کچھ نہ تھا جس نے خدا کیلئے انقلاب برپا کیا تھا اور وہ آج بھی خدا کے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں
ہوتی۔ یہ دشمنانِ انقلاب نہ تھے جو اپنی دشمنی سے باز آگئے یہ تو انقلاب تھا جس نے ہر دشمن کو میدان سے بھگا دیا۔
دشمن تو شاہ کے ذریعہ جتنا دباؤ ڈال سکتے تھے پہلے ہی اتنا دباؤ ڈال چکے تھے۔

انقلاب کی کامیابی کے بعد دوسری شکل میں معاندانہ سازشیں شروع ہوئیں۔ پہلی کوشش یہ کی گئی کہ ذمہ داران
انقلاب کی صف میں ان لوگوں کا نفوذ ہو جائے جو دشمن کے آدمی ہیں، اس کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ چند دہائیوں کے
دور اختناق کے بعد سیاست کی کھلی ہوئی فضا سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انقلاب مخالف گروہ اور پارٹیاں
بنا دی جائیں ـــــ پہلے مرحلہ کے لئے یہ مثال قابل توجہ ہے کہ ایک خود فروختہ لیکن غیر معروف انسان' جو
انقلاب کے چند ہفتے بعد انقلابی عدالت میں اپنے پورے ثبوت کے ساتھ خائن اور مجرم ثابت ہوتا ہے ـــ
انقلاب کی کامیابی کے ابتدائی زمانہ میں بعض اسباب فراہم کر کے ہوائی فوج کا کمانڈر بن بیٹھا ہے۔ دوسرے
مرحلے کے لئے اتنا کہنا کافی ہو گا کہ سلطنت کا خواب دیکھنے والوں سے لے کر کمیونسٹ تک علیحدگی پسندوں سے لیکر
پان ایرانسٹ ڈیمشنلسٹ تک اس گروہ میں شامل ہو گئے اور یہ بات بھی بھلانے کے لائق نہیں ہے کہ تہران میں
مقیم بعض سفارت خانے ان میں سے بعض گروہ کی حمایت اور رہنمائی کا مرکز تھے۔ جیسے سفارت خانہ امریکہ۔

دہشت گردی

انقلاب کے ساتھ انتقام آمیز دشمنی کی ایک دوسری مثال بے رحم دہشت گردی ہے۔ کچھ لوگوں نے، جن کا عوام میں کوئی اثر نہ تھا اسلحے اور بارود چوری کر کے، جو اس وقت مشکل کام بھی نہ تھا، بیرونی ممالک کی مدد سے ایران میں دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ انفرادی اور اجتماعی قتل، بموں کے دھماکے، ہوائی جہاز اور لوگوں کا اغوا، اذیتیں اور ہولناک قتل، یہ وہ حادثے تھے جو چند دہشت گرد ٹولوں کے ذریعہ انقلاب کے بڑے دشمنوں کی سرپرستی اور حمایت میں رونما ہوئے۔ اس سنگدلی کی بھینٹ چڑھ جانے والوں میں انقلاب کے بڑے بڑے ذمہ داروں سے لیکر عوام، محنت مزدوری کرنے والے، عورتیں، بچے اور بے خبر راہ گیر تک، تقریباً ہر طبقہ کے افراد شامل ہیں۔ آج یہی دہشت گرد اور ان کے سرغنہ جنہوں نے اپنے اکثر جرائم کا اعتراف اور اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ امریکہ فرانس اور بعض دیگر مغربی ممالک میں محفوظ ہیں اور آرام کی زندگی گزار رہے ہیں ——— اور "حزب اختلاف" کے نام سے جانے جاتے ہیں حالانکہ اکثر یہ ممالک جمہوری اسلامی پر دہشت گردی کا الزام عائد کرتے ہیں۔

اندھیر!

سیاست کا بھی عجیب و غریب کھیل ہے کہ اندھی اور بے رحم دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ جانے والے مظلوموں پر دہشت گردی کا الزام عائد کیا جائے! اور یہ اتہام ان لوگوں کی طرف سے لگایا جائے، جنہوں نے ان دہشت گردوں کو دہشت گردی پر اکسانے اور پھر انہیں پناہ دینے میں بڑا رول ادا کیا۔

میں اپنے ملک کے صدر جمہوریہ اور خدمت گزار کی حیثیت سے اور اس شخص کے عنوان سے جو خود بھی اس بے رحم جرم کا نشانہ بنا ——— مگر خدا نے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ ہماری قوم ان سنگدلانہ دہشت گردیوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہی۔ ہماری قوم ایسے سانحوں سے دوچار ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی، جن میں سے ایک سانحہ میں انقلاب کے بلند پایہ خدمت گزاروں اور رہبروں میں سے ۷۲ افراد (جن میں چند وزیر، چند ممبران پارلیمنٹ، کچھ بڑے بڑے عہدہ دار، انقلاب کی بے مثال شخصیت شہید بہشتی بھی شامل ہیں) ایک دوسرے حادثہ میں صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم ایک ساتھ شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔ ان حادثات نے ہماری قوم کے اندر انقلابی ولولہ، اور ایمان و توکل میں اضافہ کر دیا۔

فوجی بغاوت کی سازش

فوجی بغاوت جو بڑی طاقتوں کا دنیا کے انقلابات کے ساتھ قدیم اور خونی تجربہ رہا ہے۔ ایران میں بھی بار بار اس تجربہ کو آزمانے کی کوشش کی گئی اور ایک بار تو یہ سازش انتہائی خطرناک موڑ تک پہنچ گئی تھی۔۔۔ اگر حکومت کے کارگزاروں کی ہوشیاری اور عوام کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو امریکی جنرل کی پیشین گوئی سامنے آجاتی یعنی: خون کا حمام، لاکھوں افراد کا قتل اور وہ بھی متعدد بار۔۔۔۔۔

بدترین دشمنی

ہمارے دشمنوں کی سب سے بڑی دردناک اور الم انگیز ناخواستہ دشمنی جنگ کا آغاز ہے۔ انہوں نے ایک ہمسایہ کی جاہ طلبی کے حس کو بھڑکا دیا۔ اسے حملہ کرنے کے لئے اکسایا اور پھر مدد و نصرت کے ذریعے اطمینان دلاتے رہے۔۔۔ آج سات سال گزر جانے کے بعد ہر شخص بہ آسانی یقین کر سکتا ہے کہ جمہوری اسلامی کی تشکیل کے انیس مہینہ بعد ۳۱ شہریور ۱۳۵۹ ہش (۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء) میں دس ڈویژن فوج اور سیکڑوں لڑاکا طیاروں کی مدد سے بری، بحری اور فضائی حملہ کا مقصد توسیع پسندی اور ایران کے کچھ حصہ کو ہڑپ کر لینے (یہ وہ بات ہے جس کی تصریح عراقی و غیر عراقی زلہ خواروں کی کتابوں اور مطبوعات میں بار ہا ہو چکی ہے) کے علاوہ انقلاب کی شکست اور جمہوری اسلامی کو نیست و نابود کر دینا بھی تھا۔ انہوں نے ان دونوں مقاصد کو بار ہا واضح لفظوں میں بیان کیا ہے۔

بڑی کامیابی کی امید میں

داخلی حالات کی پائیداری کے علاوہ جو اہم نتائج اس حملہ کی کامیابی سے عراق حاصل کر سکتا تھا وہ یہ ہے کہ وہ اس علاقہ میں یہاں تک کہ عرب دنیا میں ایک مضبوط طاقت کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوتا اور یہ بات عراق کے بے سروپا حاکم کے لئے ایک بڑی بات ہے۔۔۔۔۔۔ نیز خلیج فارس کی بہت ہی اہم اور قابل توجہ سرحد پر تسلط بھی اس کامیابی کا نتیجہ ہوتا۔

اس حملہ کی کامیابی جو ناگزیر طور پر ایران کی شکست، اس کی تقسیم اور نظام جمہوری اسلامی کے خاتمہ کو اپنے ساتھ لاتی اس سے بڑی طاقتوں کا مقصد بھی پورا ہوتا وہ نظام نیست و نابود ہو جاتا جو اپنے ساتھ سیاسی

اور اقتصادی توازن میں تبدیلی لایا تھا جس نے استکبار کے دست ظلم، خصوصاً امریکہ کے ہاتھوں کو کاٹ دیا تھا۔ ہماری شکست کی صورت میں امریکہ اور بعض دوسرے ممالک کا کھویا ہوا اقتدار واپس مل جاتا اور سیاسی و معاشی دباؤ کی دائمی کہانی پھر سے دہرائی جاتی۔

مدد

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم حملے سے غافل تھے۔ ملک کے اندر انقلاب کے بے شمار مسائل میں سرگرمی اور زیادہ تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ جنگ ہم پر مسلط کردی گئی ..... لیکن ہمارے انقلاب کی خصوصیتوں نے ہماری مدد کی.....
چند مہینوں کے اندر عوام اور ہماری مسلح فوج نے اپنی کوشش سے شجاعت اور دلیری کا ایک عظیم نمونہ پیش کیا، چنانچہ غصب شدہ زمین کا ایک اہم حصہ آزاد ہوگیا ..... لیکن اس مدت میں جو حادثہ پیش آیا، حقیقتاً وہ ناقابل بیان ہے...
خرم شہر، آبادان، ہویزہ اور قصر شیریں جیسے بارونق شہر خاک کا ڈھیر بن گئے، صرف دیزفول پر ۱۷۳ سے زیادہ زمین سے زمین پر مار کرنے والی میزائلیں پھینکی گئیں۔ سیکڑوں دیہاتوں کو اس طرح تہس نہس کیا کہ مکانوں کے نشان تک باقی نہ رہ گئے، کارخانے لوہے کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئے۔ لہلہاتے کھیتوں نے خشک صحرا کی شکل اختیار کرلی گرانقدر تہذیبی آثار کو نقصان پہونچا اور ان سب سے زیادہ عزیز وہ بے گناہ انسان تھے جنھیں بے دردی سے قتل کر ڈالا گیا۔

جارح کے وعدوں پر بھروسہ کیسے کیا جائے؟

غیر فوجی علاقوں پر وحشیانہ حملے سے لیکر ہزاروں نہتے بچوں، عورتوں کے بے رحمانہ قتل، عراقی فوج کے مقبوضہ راستوں پر عام مسافروں کی گرفتاری (جنگ کے ابتدائی ہفتوں میں) معاہدوں اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کیمیاوی اسلحوں کا استعمال، تجارتی کشتیوں، غیر فوجی مسافر بردار جہازوں اور ٹرینوں پر حملہ تک یہ وہ مشہور و معروف جرائم ہیں جو جنگ کی اس مدت میں عراق سے ہمیشہ سرزد ہوتے رہے ہیں۔
ملت ایران نے جنگ کی ابتداء سے اب تک کے حادثات کو جمع اور اس پر غور کرکے جس تلخ حقیقت کا پتہ لگایا ہے وہ یہ ہے کہ، جنگ کی آگ روشن کرنے والے جارح کے وعدوں کی بنیاد پر امن و سلامتی کی عمارت ریت کی دیوار ہوگی اور ایسے امن و سلامتی پر یقین کرلینا سادہ لوحی و بے عقلی کی بات ہے۔

دفاع کا مقصد

عراقی حکمراں صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ ۱۹۷۵ء میں ایران کے ساتھ ہونے والے "الجزائر معاہدہ" پر اب عمل کرنا ضروری نہیں ہے اس لئے کہ وہ معاہدہ اس وقت ہوا تھا جب عراق کمزور تھا۔ اس نے اس معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک ڈالا اور اس کے بعد چند ہی دنوں میں حملہ کا آغاز کر دیا۔ یہ حادثہ ہماری قوم کے لئے بڑا ہی تلخ اور سبق آموز تھا۔۔۔۔۔ اس وقت سے ہماری بیدار اور انقلابی قوم نے اپنے ارادہ اور اپنے مقصد کو معین کر لیا ــــ اور وہ مقصد فقط مقبوضہ علاقوں کو واپس لینا یا جنگی خسارہ وصول کرنا نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ دونوں ہماری ملت کا مسلم حق ہیں، ہر چند کہ بعض نقصانات ناقابل تلافی ہیں ــــ بلکہ ہماری قوم کا اہم مقصد جارح کی تنبیہ اور بساط جارحیت کو الٹ دینا ہے۔

"نورن برگ عدالت" کا تجربہ

تنبیہ جارح کی تجویز پیش کر کے، نہ صرف یہ کہ ہم نے اپنی قومی تحفظ و سلامتی کے لئے مطمئن ذریعہ ڈھونڈ لیا ہے بلکہ یہ تجویز تمام علاقوں کے امن و سلامتی کی ضامن بھی ہے اور اگر ایک بار بین الاقوامی معاشرہ کی طرف سے جارح کو اس کی جارحیت کی سزا مل جائے تو اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ کچھ برسوں تک یہ فتنہ ــــ جو شرارت پسند اور ابن الوقت عناصر میں ہمیشہ قابل جستجو ہے ــــ دوبارہ ہیں ہوگا۔ یہ علاقہ اور شائد پوری دنیا جارحانہ اور بے بنیاد جنگ سے محفوظ رہے گی۔

"نورن برگ عدالت" چالیس سال سے زیادہ عرصہ سے جنگ خیز یورپ میں امن و سلامتی قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہے، پھر کیوں نہ اسی تجربہ سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

فلسطینی عوام کی سرگذشت، ایک سبق

بڑی طاقتوں نے زبردست پروپیگنڈے کے ذریعہ اس وقت ہم پر دباؤ ڈالا کہ ہم جنگ بندی قبول کریں جب ہماری ہزاروں مربع کیلو میٹر زمین جارحین کے قبضہ میں تھی اور اس کے ساتھ یہ وعدہ تھا کہ ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے گی جو جارح کو بین الاقوامی سرحدوں پر لوٹ جانے کی ہدایت کرے گی: اس کا مطلب یہ تھا ہم اپنے وجود اور شرف کے کچھ حصہ کو دشمن کے ہاتھوں میں رہنے دیتے اور پھر اس کے بعد اس کی واپسی کے لئے بین الاقوامی کمیشن

کی دریوزہ گری کرتے ۔ ایک عظیم، پر افتخار اور انقلابی قوم کے لئے اس سے بڑی کوئی اہانت نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا بیوقوف ترین انسان بھی ایسی ظالمانہ تجویز کو رد کرنے کے لئے فلسطینی عوام کی غم انگیز اور خونبار سرگذشت کو بہترین اور زندہ ثبوت کے طور پر اپنے سامنے رکھتا ہے ..... اگر اجباری جنگ بندی، بے حقیقت اور مکارانہ وعدے، فلسطینی قوم کو ان کا مسلم الثبوت حق دلا سکے ہیں تو دوسری قوموں کو بھی ان کا حق دلا سکتے ہیں ۔

جارح کی تنبیہ ـــ اصل مقصد

آج بھی جبکہ ہم نے اپنی مقبوضہ زمین کے بہت سے حصوں کو اپنی قوم کی دلیرانہ کوشش سے اور ہزاروں عزیزوں کی جان نچھاور کرنے کے بعد آزاد کر لیا ہے ـــ اگرچہ کچھ حصہ جیسے نفت شہر ابھی بھی جارح کے قبضہ میں ہے ـــ جارح کی تنبیہ کو اپنا اہم ترین مقصد شمار کرتے ہیں ۔ آج ہم اس عظیم و ناقابل جبران سرمایہ کو نظر میں رکھتے ہوئے، جسے اس ناخواستہ جنگ نے ہم سے چھین لیا ہے، ہمیشہ سے زیادہ جارح کی تنبیہ کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کے بغیر ہر نتیجہ کو اپنی قوم کا نقصان تصور کرتے ہیں .... ہم جو، سات سال سے اس اجباری جنگ کے بوجھ کو اپنے دوش پر سنبھالے ہوئے ہیں ۔ ہر شخص سے زیادہ تشنۂ صلح ہیں ـــ لیکن صلح کے ـــ اور پائیدار صلح صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب جارح کو اس کے بے شمار جنگی جرائم کے ساتھ ساتھ جارحیت کی سزا دی جائے ۔

۱۹۷۵ء کی طرح آج بھی عراق کمزور ہے، اسے ساری دنیا جانتی ہے، آج جو صلح اس کی طرف سے قبول ہوگی چند سال کے بعد جب وہ اپنے کو طاقتور سمجھنے لگے گا تو یہ صلح ایک لحظہ میں دھواں بن جائے گی اور یہ زمین دوبارہ جنگ کے شعلوں میں لپٹ جائے گی ۔ آئندہ امن و امان قائم رہنے کی فقط ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ جارح کو اس کی سزا دی جائے ۔

عدل و انصاف، صلح سے اہم

بے نمک صلح، خوبصورت اور پرکشش لفظ ہے اور اس حد تک کہ بین الاقوامی آتش جنگ بھڑکانے والے اور عالم سوز اسلحے بنانے والے بھی اس لفظ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے اور ریاکارانہ صلح کا دم بھرتے ہیں ۔ لیکن ہماری نظر میں "عدل و انصاف" وہ لفظ ہے جس کی طرف طاقتور اور جارح افراد ہمیشہ خوف اور احتیاط سے نگاہ ڈالتے ہیں ـــ یہ صلح سے بالاتر اور اہم ہے ۔

اقوام متحدہ کا فریضہ

بہت سے مظلوم ایسے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی، رفاہ اور صلح کو انصاف تک پہونچنے کے لئے فدا کردیا ایسے لوگ ہمیشہ شجاع اور دلیر کے نام سے پہچانے گئے ہیں۔ یورپ کے شہر آج بھی ہٹلر کی جارحیت کے مقابلہ میں اپنی مقاومت پر ناز کرتے ہیں۔ لنن گراد، جس نے اپنی خودسوزی سے نپولین کی فوج کو ناکام اور مبہوت بنا دیا تھا اور چار سال تک نازی حملہ آوروں کے محاصرہ میں مقاومت کا ثبوت دیا تھا۔ آج بھی اپنے اس عمل پر ناز کرتا ہے۔

اقوام متحدہ کا خاص کر اس کے منشور کی پہلی دفعہ کے مطابق، یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ عدل وانصاف کو اپنی خاص شکل میں قائم کرے۔ یعنی حملہ آور اور جارح سے مقابلہ کرے دنیا اور اقوام متحدہ سے ہمارا یہی مطالبہ ہے۔

بڑی طاقتیں ریاکارانہ، ہمارے اوپر لادی گئی جنگ کو "بے معنی" کہتی ہیں۔ حالانکہ بڑی طاقتوں نے ہمیشہ پہل کرنے والے جارح کی، فوجی، سیاسی اور اقتصادی حمایت کی ہے۔

شک نہیں کہ ایسی جنگ چھیڑنا ہمیشہ "بے معنی" ہے۔ لیکن بڑی طاقتیں اس جنگ کو اس وقت تک بے معنی و لاحاصل نہیں کہتی تھیں جب تک انہوں نے یہ نہ دیکھ لیا کہ حملہ آور اپنے منحوس مقصد میں کامیاب ہونے سے مایوس ہوچکا ہے۔

اہم اور بامقصد جنگ

لیکن آج یہ جنگ ہماری قوم کیلئے بہت ہی بامعنی بن گئی ہے، یہ جنگ جارحیت کی جڑوں کو ہلا دینے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ایک ملت اس بات پر قادر ہے کہ بڑی طاقتوں کی تمناؤں کے خلاف اپنے انقلاب، پائداری اور شرف کا دفاع کرسکتی ہے۔ ایثار وفداکاری وجہاد سے بھرپور ایک کوشش ہے ہماری قوم اپنی جانبازی اور ایثار کے ذریعہ اس اصول کو توڑنے کے درپے ہے جو ہمیشہ جارحیت وجنگ کا شوق دلاتا رہا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ "ترقی یافتہ اسلحوں پر بھروسہ اور بڑی طاقتوں کا سہارا کامیابی کا ضامن ہے"۔

گناہ اور خاموشی

ایرانی قوم نے اس سات سال کی مدت میں ایک بڑے سوال کا جواب ڈھونڈ لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس

اسٹیج سے اس سوال کو پیش کروں اور وہ سوال یہ ہے کہ ان حکومتوں نے اس بڑے جرم اور بین الاقوامی گناہ کے سلسلہ میں کیوں سکوت اختیار کیا ؟ جنھیں پوری وضاحت اور یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ عراقی حکومت جارح اور آتش جنگ بھڑکانے والی ہے اور ایسے لوگ کم نہیں ہیں جو اس حقیقت سے واقف ہیں ـــــ دنیا کی خبر رساں ایجنسیوں نے اپنی عظیم ذمہ داری کو ضمیر انسانی کے سامنے تاریخ کے اس سوال کو کیوں بھلا دیا ؟ آج کی دنیا میں سیاسی تعلقات اور بڑی طاقتوں کے اقتدار و غلبہ کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط سے آگاہی اس معمہ کو حل کرنے میں شاید مددگار ثابت ہو اور یہ بات ہماری قوم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔

اب رہا وہ سوال جس کا کوئی اطمینان بخش جواب نظر نہیں آتا۔ یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور وہ تنظیمیں جو جارحیت سے مقابلہ اور بین الاقوامی امن برقرار رکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں اس جارحیت کے سلسلہ میں انہوں نے اپنے فریضہ کو کیوں بھلا دیا ؟ بلکہ اس کے برخلاف کیوں عمل کیا ؟

سلامتی کونسل کی خاموشی

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سلامتی کونسل نے عراقی حملہ کے ابتدائی مرحلہ میں جو ہزار کیلومیٹر عرض میں پھیلا ہوا تھا، کسی بھی ردعمل کا اظہار نہیں کیا ..... عراقی فوج نے ایک ہفتہ کے اندر بین الاقوامی سرحدوں کو توڑ کر بعض علاقوں میں ۷۰ ـ ۸۰ اور ۹۰ کیلومیٹر اندر تک قابض ہو گئی اور جیسا کہ بعض عراقی ذمہ داروں نے کہا کہ اس قبضہ کا مقصد یہ ہے کہ اب ہمیں اس علاقہ سے باہر نہیں نکلنا ہے!

سلامتی کونسل کی پہلی قرارداد

سلامتی کونسل کی پہلی قرارداد عراقی جارحیت کے ایک ہفتہ بعد ۲۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کو جاری ہوئی۔ اس میں نہ تو کہیں جارحیت کی طرف اشارہ تھا، نہ زبردستی قبضہ کر لینے کا ذکر تھا، نہ اس میں بین الاقوامی سرحدوں پر واپس لوٹ جانے کو ضروری قرار دیا گیا تھا ...... بلکہ اس کے بجائے ـــ کمال تعجب کے ساتھ ـــ طرفین کو طاقت کے مزید استعمال سے روکنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس طرح کی تعبیر در حقیقت اس وقت تک کے عراقی فوج کے زبردستی قبضے سے چشم پوشی تھی۔ اور اس سے صرف یہ چاہا گیا تھا کہ اس سے زیادہ آگے نہ بڑھے اور ایران سے یہ مطالبہ تھا کہ جارح کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش نہ کرے۔

سلامتی کونسل کا یہ پہلا اقدام تھا جس میں اس کے اصلی فرائض "بین الاقوامی امن وسلامتی کی حفاظت" کو خود اسی کے ذریعہ بہت ہی برے اور افسوسناک انداز سے پامال کیا گیا تھا۔

اس کے بعد سلامتی کونسل پر موت کی خاموشی چھا گئی۔ اور خرم شہر کی آزادی تک ــــ وہ حملہ جس نے جارح کی کمر توڑ دی اور اس میں دشمن کے ہزاروں افراد نہایت ذلت کے ساتھ اسیر کئے گئے ــــ سلامتی کونسل نے اس خون آلود اور مستقل جنگ کو یکسر فراموش کر دیا جو دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخیاں تھیں۔ ایسی صورت میں ہماری قوم کی دلیری اور ہمارے جنگجو سپاہیوں کی تنظیم نے ایک جوان انقلابی فوج کو تشکیل دیا اور عالمی طاقتوں کو ان کے اس منحوس مقصد میں کامیابی سے مایوس کر دیا جسے وہ عراق کے ایران پر حملہ میں تلاش کر رہے تھے۔

بڑی طاقتوں کی مایوسی اور سلامتی کونسل کی بیداری

اس مایوسی کے بعد سلامتی کونسل کو پھر دوسری بار ایران عراق جنگ کی یاد آئی۔ فتح خرم شہر کے چند ہفتہ بعد ۱۲ جولائی ۱۹۸۲ء کو سلامتی کونسل کی دوسری قرارداد پاس ہوئی۔ اس قرارداد میں "بین الاقوامی سرحدوں کی طرف واپسی" کی درخواست کی گئی تھی۔ یعنی اس چیز کے بارے میں درخواست کی گئی جس کا بڑا حصہ ہماری قوم کی فداکاری اور ہمارے سپاہیوں کی بے نظیر شجاعت کی بدولت حاصل ہو چکا تھا! اس قرارداد میں بھی نہ جارحیت کے سلسلے میں کوئی بات تھی، نہ حملہ آور جارح کا تذکرہ تھا، نہ ہی جنگی خسارہ اور اس کے جبران کے طریقہ کی طرف کوئی اشارہ تھا، نہ امن وسلامتی اور حقیقی پائدار کا کوئی ذکر تھا اور نہ بدامنی پھیلانے والوں کے لئے کوئی تنبیہ تھی۔

دوسری دفعہ بھی ہم نے احقاق حق کی کوشش میں اپنے کو تنہا پایا۔ اور آج تک سلامتی کونسل کا موقف اس جنگ کے سلسلہ میں جو ہمارے اوپر لادی گئی ہے، ایسا ہی رہا ہے۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی ذاتی کوششوں سے ایک راستہ نکلا تھا جس پر چل کر اقوام متحدہ اپنے مقصد تک پہونچ سکتی تھی۔ لیکن ان امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ میں اس جگہ سکریٹری جنرل کی کوششوں کے سلسلہ میں اپنی مسرت کا اظہار کر دینا لازم سمجھتا ہوں اور اسی طرح میں سوئیڈن کے وزیر اعظم آنجہانی "اولاف پالمہ" کی کوششوں کو بھی سراہتا ہوں جنہوں نے سکریٹری جنرل کے نمائندہ کی حیثیت سے ہمدردانہ کوششیں کیں۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کا سفر تہران اور قرارداد نمبر ۵۹۸ کے بارے میں ہونے والے مفید

مذاکرات اس راہ کا دوسرا قدم تھا۔ ہم ان مذاکرات کو جیسا کہ سلامتی کونسل میں جنرل سکریٹری کی رپورٹ بھی تقریباً اس کی حکایت کر رہی ہے، حقیقت پسندی پر مبنی اور مشکلات کا حل سمجھتے ہیں۔

غیر جانب داری

نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ سلامتی کونسل کے بعض با اثر ممبر اس حقیقت کو چھپانا چاہتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے جمہوری اسلامی پر دباؤ ڈالنے کے لئے شروع ہی سے اس قرار داد کو پاس کرانے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں اپنا واضح نظریہ سکریٹری جنرل کو پیش کر دیا ہے۔ اور ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ سلامتی کونسل اپنے فرائض کا خیال کرتے ہوئے ان وسائل کو صحیح طریقہ پر استعمال کرے جو اس کے سپرد کئے گئے ہیں۔

کیا سلامتی کونسل کے پاس اپنے اس پہلے فریضہ یعنی "جارح سے مقابلہ" کی خلاف ورزی کے لئے کوئی دلیل موجود ہے؟ جسے اس کے منشور کے دفعۂ اول میں تمام مقاصد سے زیادہ اہم شمار کیا گیا ہے۔

صلح کو خطرے میں ڈالنے اسے پامال کرنے" نیز "طاقت کے استعمال" کے جرم میں (اقوام متحدہ کے منشور کی ساتویں فصل ملاحظہ ہو) سلامتی کونسل نے عراق پر کتنا دباؤ ڈالا؟

جمہوری اسلامی خوں ریز اور تباہ کن جارحیت کی بھینٹ چڑھ گئی، اسے سلامتی کونسل سے کم سے کم جس چیز کی توقع ہونی چاہئے وہ "غیر جانب داری" ہے۔ اس لئے کہ سلامتی کونسل کا فریضہ صرف غیر جانب داری ہی نہیں بلکہ جارحیت کے نذر ہو جانے والوں کی حمایت اور جارحیت سے مقابلہ بھی ہے۔ جارحیت کا مقابلہ تو درکنار کیا سلامتی کونسل اس بات کا دعویٰ بھی کر سکتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں غیر جانب دار رہی ہے؟

ہمارا خیال یہ ہے کہ سلامتی کونسل نے بڑی طاقتوں خصوصاً امریکہ کے زیر اثر ناشائستہ اور قابل مذمت موقف اختیار کیا ہے۔ ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سلامتی کونسل کی بنیاد پر استوار امن و سلامتی کی عمارت زرق برق کاغذی محل کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ عالم خاص کر تیسری دنیا کی قومیں بالاخص وہ لوگ جو بڑی طاقتوں سے مکمل طور پر آزاد رہ کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی کونسل کو اپنے امن و سلامتی کا محافظ ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔

امریکہ کی دوہری چال

عراق کو جارح قرار دینے سے امریکہ کے گریز نے، نہ صرف اس جنگ کی آگ کو بھڑکنے دیا ہے۔ بلکہ اسے

مزید ہوا دی ہے۔

امریکی فوج اور شیطان بزرگ کے ایما اور اصرار پر اس کے پیچھے پیچھے دوسری فوجوں کی موجودگی نے اس وقت خلیج فارس کو خطرناک بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا ہے۔

میں ضروری سمجھتا ہوں اقوام متحدہ کے عام اجلاس نیز امریکی قوم کی رائے عامہ کی توجہ اس بڑے اور قریبی خطرہ کی طرف مبذول کراؤں، جو امریکہ کے آخری اقدام سے نہ صرف ہم کو بلکہ پوری دنیا کو لاحق ہو گیا ہے۔ کل امریکی بحریہ نے "ایران اجر" نامی ایرانی تجارتی جہاز پر حملہ کر کے ۵ افراد کو قتل اور ۴ افراد کو مجروح کر دیا، کشتی پر قبضہ کر کے چند افراد کو گرفتار اور انہیں یرغمال بنالیا ہے۔ امریکی ٹیلی ویژن نے اس حرکت کو "بارودی سرنگیں بچھانے والی کشتی پر حملہ" کے عنوان سے پیش کیا اور حسب معمول دنیا کے عوام کے سامنے جھوٹ بولا لیکن میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تند رو جنگی کشتی نہیں بلکہ "ایران اجر" نام کا ایک تجارتی جہاز تھا ـــ یہ ان حادثات کا آغاز ہے جن کا تلخ نتیجہ فقط خلیج فارس تک محدود نہیں رہ جائیگا اور بعد میں پیش آنیوالے تمام حادثہ کی ذمہ داری شروع کرنے والے یعنی امریکہ کے سر جائے گی۔

خلیج فارس میں صلح برقرار کرنے کے بے تابانہ امریکی دعوؤں کو باور کیا جائے یا اس واضح و آشکار جنگی اقدام کو ؟

میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ امریکہ کو اس برے اقدام کا جواب مل کر رہیگا۔

یہ، فقط اجباری جنگ اور عراقی جارحیت کے مقابلہ میں سلامتی کونسل کی ناتوانی کا ایک منحوس نتیجہ ہے۔ اگر سلامتی کونسل نے جنگ شروع کرنے، شہروں، آبادیوں اور کشتیوں پر حملہ کرنے کے جرم میں عراق کی مذمت کی ہوتی، تو آج امریکہ کو عالمی رائے عامہ حتیٰ خود امریکی عوام کی مرضی کے خلاف عالمی صلح و سلامتی کو خطرے سے دوچار کرنے کی جرأت نہ ہوتی اور وہ بھی بلا فاصلہ قرارداد نمبر ۵۹۸ کے خلاف جس کا بانی اور جاری کرنے والا درحقیقت خود امریکہ ہی ہے۔

کیا قرارداد نمبر ۵۹۸ فقط جمہوری اسلامی ایران پر دباؤ ڈالنے کے لئے پاس کی گئی ہے ؟

امریکہ کے خلاف ہماری قوم کا استغاثہ

میں پوری دنیا خصوصاً امریکی عوام کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ خلیج فارس میں امریکی فوج کی خطرناک موجودگی ہماری قوم کے ساتھ حکومت امریکہ کی کھلی ہوئی دشمنی کا صرف ایک نمونہ ہے۔

ہماری قوم کی تاریخ کا ایک سیاہ، تلخ اور خوں چکاں باب حکومت امریکہ کی دشمنی و کینہ توزی سے پر ہے۔ ۲۵ سال تک اس جلاد پہلوی ڈکٹیٹر حکومت کی ان تمام جرائم کے باوجود حمایت جس کا ارتکاب اس نے ہماری

قوم کے ساتھ کیا۔ شاہ کے ساتھ مل کر اس قوم کے سرمایہ کو لوٹنا، شاہ کی حکومت کے آخری دنوں میں انقلاب کا بھرپور مقابلہ اور لاکھوں انسانوں پر مشتمل مظاہرہ کی سرکوبی کے لئے شاہ کی حوصلہ افزائی، انقلاب کی کامیابی کے ابتدائی برسوں میں مختلف ذریعے سے انقلاب کو توڑنے کی کوشش، مخالف انقلاب عناصر سے سفارت امریکہ کا اشتعال انگیز رابطہ، فوجی سازش کے ذریعہ تختہ الٹ دینے کی کوشش کرنے والوں کی مدد، ملک سے باہر مخالف انقلاب اور دہشت پسندوں کی مستقل امداد، ایران کے سرمایہ کو منجمد کردینا اور ان چیزوں کو نہ دینا جنکی قیمت مدتوں پہلے ادا کی جاچکی ہے، شاہ نے بیت المال کے جس سرمایہ کو اپنے نام سے امریکہ کے بینکوں میں جمع کردیا تھا اس کا واپس نہ کرنا اقتصادی محاصرہ کی کوشش اور ہمارے خلاف مغربی ممالک پر مشتمل متحدہ محاذ کھولنا۔ ہمارے خلاف جنگ میں عراق کی کھلی ہوئی اور مؤثر حمایت اور آخر میں خلیج فارس پر بے دلیل اور آمرانہ لشکر کشی، نیز اس علاقہ کی امن و سلامتی کو خطرہ میں ڈال دینا ـــ یہ ہیں ہماری قوم پر امریکہ کے بعض مظالم۔ یہ وہ مظالم ہیں جو اس حکومت کے سربرآوردہ افراد کی صلح طلبی اور جمہوری اسلامی سے حسن نیت رکھنے کے دعوؤں کو مسترد کرتے ہیں ـــ ان کے ان دعوؤں کا مقصد، بظاہر خود ان کی داخلی مشکلات کو حل کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مکہ کا المیہ

ہماری قوم کے ساتھ امریکہ کی دشمنی کا آخری نمونہ وہ المیہ ہے جو حرم امن الٰہی اور مکہ کی مقدس سرزمین پر نہتے اور مظلوم حاجیوں کے ساتھ پیش آیا۔ اس حادثہ میں تقریباً چار سو ایرانی اور غیر ایرانی افراد شہید ہوگئے جن میں اکثریت عورتوں کی تھی اور اس سے کئی گنا زیادہ افراد مجروح اور زخمی ہیں، چند قرائن کی بنا پر اس تاریخی المیہ میں امریکہ کا بہت بڑا اور مؤثر ہاتھ تھا۔

کیا حکومت امریکہ اور اس کے سعودی آلہ کار ان مظلوم اور بے گناہ عورتوں، مردوں کے قتل عام کا کوئی قابل اطمینان جواب دے سکتے ہیں؟

بے شک حادثہ کو جنم دینے والے اپنے عمل کو حق بجانب قرار دینے کے لئے اس بات پر مجبور ہیں کہ الزام تراشی اور بہانہ بازی سے کام لیں لیکن حادثہ کی نوعیت ہر حیلہ کی راہ کو مسدود کردیتی ہے جس میں ایک طرف تقریباً چار سو مقتول مسافر ـــ جن میں زیادہ تر عورتیں ہیں ـــ اور دوسری طرف مشین گنوں، ڈنڈوں اور زہریلی گیس سے مسلح سعودی پولیس ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جو خون ظلم اور سنگدلی سے ناحق بہایا جاتا ہے وہ خون صرف ایک زمانہ ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لئے پیغام رسانی کا ذریعہ بن جاتا ہے اور قاتل کے خون آلود ہاتھوں کو نمایاں کر دیتا ہے۔ لیکن یہ حادثہ مکہ چونکہ رجعت پسند عرب کے ساتھ امریکہ کے سیاسی گٹھ جوڑ کا پتہ دیتا اور خلیج فارس میں ان دونوں کے پوشیدہ کرتوت کا پردہ فاش کرتا ہے، لہٰذا عالمی اہمیت کا حامل ہے اور اس لائق ہے کہ عالمی معاشرہ میں اسی پر خاص توجہ کی جائے۔

ہمیں امریکی عوام سے شکایت نہیں

یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارا استغاثہ امریکی حکمرانوں کے خلاف ہے، ان امریکی عوام کے خلاف نہیں ہے جو یہ جان لینے کے بعد کہ ان کی حکومت نے ایک قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا، ہمارے استغاثہ کی حمایت کریں گے۔

ہماری قوم نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے مقاصد پر یقین رکھتی ہے اور اس کی راہ میں جان نثاری کے ساتھ گامزن رہے گی۔

ایسی قوم امریکہ یا کسی اور طاقت سے نہیں ڈرتی اور خدا کی مدد سے یہ بھی ثابت کر دیگی کہ کامیابی حق کی اور حق پر ایمان لانیوالوں کی ہے۔

واضح ترین پیغام

جناب صدر! جناب سکریٹری! حاضرین محترم!

یہ تھی ہمارے انقلاب کی سرگذشت، اس انقلاب نے جہاں استبدادی طاقتوں کے ہاتھوں رنج والم سہنے والی قوموں میں بے پناہ امیدوں کی لہر پیدا کر دی وہیں اس نے بین الاقوامی بڑی طاقتوں کے درمیان اسی وسعت کے ساتھ مخالفت کی لہر بھی پیدا کی ہے اور یہ مخالفتیں ہر چند کہ واقعیت، گہرائی اور تنوع کی حامل تھیں لیکن پھر بھی روز بروز مضبوط ہونے والے ان پودوں کو نہ اکھاڑ سکیں جن کی جڑیں بہت گہرائیوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ درآں حالیکہ اس کی طرف بہت پتھر پھینکے گئے اور اس کو بڑے زخم لگائے گئے۔

آج ساری دنیا دیکھ رہی ہے، بلکہ وہ دیکھ ہی رہی ہے کہ ہم بڑی طاقتوں کی مرضی کے خلاف زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ تاریخ نے یہ فیصلہ لکھ دیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارا زندہ اور واضح ترین پیغام ہے۔ مکمل شکست توسیع پسند طاقتوں نے ہمیشہ سے یہی چاہا ہے کہ اس کے برعکس ثابت کیا جائے اور یہ طاقتیں اپنے اس ارادہ کو

تیسری دنیا کے ملکوں اور عوام کے لئے تقدیر ساز سمجھتی ہیں۔ ہم نے اس کو غلط ثابت کر دیا ۔ہمیں کوئی شک نہیں ہے کہ توسیع پسند نظام، جمہوری اسلامی کی حیات اور بقا نہیں چاہتا تھا لیکن ہمارا ارادہ غالب رہا۔

ان تمام قوموں اور ملکوں کے لئے جو عالمی استبدادی طاقتوں کا کھلونا بننا پسند نہیں کرتے بلکہ آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارا پیغام ہے کہ ان سے ہرگز خوف نہ کھائیں اور اپنے آپ پر نیز اپنی قوم پر اعتماد کریں۔

توسیع پسند نظام کی نفی

ہمارا انقلاب دنیا میں توسیع پسند طاقتوں کی نفی کو اپنا سب سے بڑا پیغام تصور کرتا ہے ....آج دنیا عملی طور پر بڑی اور توسیع پسند طاقتوں کے درمیان بٹ کر رہ گئی ہے اور بڑی طاقتیں اپنے کو دنیا کا ٹھیکیدار سمجھتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دنیا دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی ہے کچھ فرماں روا ہیں اور کچھ فرماں بردار۔ پہلا طبقہ اپنے کو دوسرے طبقہ کا مالک اور کاتب تقدیر سمجھتا ہے۔ دنیا کے انہیں دو طبقوں کے درمیان غیر منصفانہ تعلق کو توسیع پسند نظام کہتے ہیں۔

توسیع پسند نظام، اپنے منشاء کے مطابق انقلاب کی نفی کرتا نیز انقلابی حکومتوں کے لئے مشکلیں کھڑی کر دیتا ہے۔ نکاراگوا اور جنوبی افریقا کے انقلابی ممالک اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔

توسیع پسند نظام، قوموں پر ان کی مرضی کے خلاف اپنے فیصلوں کو مسلط کرتا ہے۔ اس حقیقت کا کامل نمونہ مظلوم فلسطین اور دوسری مثال افغانستان ہے۔

توسیع پسند نظام، اپنی مرضی کے مطابق "مفاہیم" سے کھیلتا ہے، نیز ان کو اپنی مصلحتوں کے مطابق بدل دیتا ہے۔ اور ان بدلے ہوئے مفاہیم کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اپنی تمام توانائیوں کو بروئے کار لاتا ہے ـــ "دہشت گردی" اور "حقوق بشر" کے بدلے ہوئے مفاہیم ان کی دست برد کا نمونہ ہیں۔

توسیع پسند نظام، جن ملکوں پر قبضہ نا ک ہوتا ہے ان پر براہ راست حملہ سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کا آخری نمونہ لیبیا اور گرینیڈا پر امریکہ کا حملہ ہے۔

توسیع پسند نظام، پوری دنیا کے لئے تمام قوموں کے بجائے خود فیصلے کرتا ہے۔ اس کی کالی مثال ہیروشیما ہے اور آج بھی صدر امریکہ اپنے اسلاف کے خوفناک کارناموں پر اس استدلال کے ساتھ فخر کرتا ہے۔ "اگر ہم ان چند ہزار افراد کا قتل نہ کرتے تو ممکن تھا کہ اس کے بعد تمام دنیا میں اس سے زیادہ افراد قتل کئے جاتے"۔

اور اس طرح ساری دنیا پر امریکہ اپنی چودھرانہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

تم ٹھیکدار نہیں ہو

توسیع پسند نظام، فاشیسٹ اور نسل پرست، اسرائیل اور جنوبی افریقہ جیسی حکومتوں کی حمایت اور اپنے خون ریز وسلح بازو کی حیثیت سے مظلوم قوموں پر انہیں مسلط کرتا ہے۔ اس کا بڑا نمونہ لبنان ہے جس نے نہایت صبر و شکیبائی کے ساتھ صیہونی جارحیت کا مقابلہ کیا — اور جنوبی افریقہ کے سرحدی ممالک اس کا دوسرا نمونہ ہیں۔

توسیع پسند نظام، بین الاقوامی تنظیموں پر دباؤ ڈالنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اسکی موجودہ مثال سلامتی کونسل اور یونسکو پر امریکہ کا دباؤ ہے۔

توسیع پسند نظام، صرف توسیع پسندوں کے مفاد کو اصل اور اس کی خاطر دوسروں کے مفاد کو قربان کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ اس کا نمونہ خلیج فارس میں امریکی بحری بیڑے کی اشتعال انگیز اور خطرناک موجودگی ہے۔ یہ موجودگی اس علاقہ کے دوسرے ممالک کے مفادات کو مدنظر رکھے بغیر صرف "امریکہ کے مفادات کی حفاظت" کے عنوان سے ہے۔ ...... خلاصہ یہ کہ توسیع پسند نظام عالمی پروپیگنڈے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر، تمام حقائق کو الٹ دیتا ہے اور ان تمام شیطنتوں کو خدمت بتاتا ہے، نیز اپنے مقابلہ میں عالمی رائے عامہ کی صف آرائی کا راستہ بند کر دیتا ہے۔

تیسری دنیا کے تمام ملکوں اور قوموں کے لئے، اور ان قوموں کے لئے جن کی حکومت، توسیع پسند نظام کو جنم دیتی ہے۔ ہمارا پیغام ہے کہ دنیا، اس سے زیادہ بری حالت کو برداشت نہ کرے۔ بڑی طاقتوں اور حکومتوں کو سب لوگوں کی طرف سے یہ کہا جائے کہ "تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو اور دنیا کو دنیا کے تمام انسانوں کے سپرد کر دو! تم سب کے ٹھیکدار نہیں ہو۔"

ویٹو — بے جا امتیاز

اقوام متحدہ میں دو بے جا امتیازات ہیں، سلامتی کونسل میں ایک "ویٹو پاور" اور دوسری "دائمی ممبری"۔ ان امتیازات کو اٹھا لیا جائے، فقط یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کو صحیح معنوں میں ایسا مرکز بنایا جا سکتا ہے جس سے تمام قومیں اپنی امیدیں وابستہ کر سکیں اور اپنے درمیان اٹھنے والے مسائل

کو وہاں حل کر سکیں ورنہ سلامتی کونسل آج کی طرح ہمیشہ بے وقعت اور ناقابل عمل احکام صادر کرنے کا مرکز بنی رہے گی، اور قومیں ہمیشہ یہی احساس کرتی رہیں گی کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

تیسری دنیا کی قوموں کے لئے میرا پیغام ہے کہ جب تک توسیع پسند نظام اور موجودہ حالت باقی ہے اپنے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں یہ مضبوط اور مستحکم ہوجانے کا بہترین راستہ ہے، عالمی توسیع پسند طاقتیں سوائے قوت و طاقت کے کوئی اور زبان نہیں سمجھتیں جس طاقت کی زبان سے وہ کام لیتی ہیں ان کے سامنے اسی طاقت کی زبان سے گفتگو کرنی چاہیئے۔

اتحاد: قوموں کی بیداری، توسیع پسند نظام کی ہیبت اور اس کے اثر سے آگاہی تیسری دنیا کی حکومتوں کیلئے بہترین مددگار نیز توسیع پسند طاقتوں کے مقابل حقیقی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ تیسری دنیا کے لیڈروں کے لئے روشن افکار اور اپنی ملت کے مضبوط ارادوں کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہم تیسری دنیا کو جس اتحاد کا مشورہ دے رہے ہیں وہ اتحاد بڑی طاقتوں سے لڑنے کے لئے نہیں، بلکہ وہ اتحاد خود اپنے دفاع اور اپنی حق تلفی سے بچنے کے لئے ہے۔

توسیع پسند طاقتیں برائیاں پھیلانے والی اور ان کی توجیہ کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اخلاقی، جنسی اور اعتقادی تمام برائیاں اپنا اصلی حامی و مددگار ان بڑی طاقتوں کے سیاسی، معاشی اور جاسوسی محرکات میں پاتی ہیں اور اب ایسا ہو چکا ہے کہ آج کی سیاہ اور تلخ دنیا میں یہ بوجھ خود ان بڑی طاقتوں کی قوموں کو بھی اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اخلاقی قدریں برباد ہو چکی ہیں، خانوادہ کی بنیاد کمزور اور متزلزل ہو گئی ہے، شراب اور منشیات کا دیو ہمیشہ سے زیادہ ان پر مسلط ہے، معنوی اور اخلاقی قوتیں ہمیشہ سے زیادہ کم ہو کر رہ گئی ہیں۔

عورتوں کے حقوق اور ان کی قدر و قیمت کی حفاظت

ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے ملکوں میں برائیوں سے حقیقی نبرد آزمائی شروع کر دیں، خانوادہ کی بنیاد کو مستحکم کریں، انسان کی پہلی اور حقیقی پرورش گاہ کو محبت، پاکیزگی، شفقت اور معنویت کا مرکز بنا دیں، ہمیں چاہیئے کہ حقوق کی حفاظت اور عورت کی قدر و قیمت پر توجہ دیں، ہمیں چاہیئے کہ آج کے موجودہ معیار پر، جو ان ہی طاقتوں کا ساختہ پرداختہ ہے، نظر ثانی کریں، ہمیں چاہیئے کہ عورت کو "لذت اندوزی کا ذریعہ" بنا کر مغربی تہذیب نے جن زنجیروں میں عملی طور پر جکڑ رکھا ہے، اس کو ان زنجیروں سے آزاد کرائیں۔ عورت صاحب علم، سیاست داں، منتظم، ایک اہم شخصیت اور اس سے بڑھ کر ایک بیوی اور ایک ماں ضرور ہے لیکن ہوس پرستی کا وسیلہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو نصف انسانیت کو اس کا حقیقی مقام اور خانوادہ کو پائیدار و مقدس بنیاد عطا کر سکتی ہیں۔

یہ ہیں ہمارے انقلاب کے پیغامات، یہ پیغامات فقط ان لوگوں کے لئے نہیں ہیں جو سننے کے لئے تیار ہیں بلکہ یہ پیغام ان تمام افراد کے لئے ہے جو اپنے کانوں سے پردے ہٹا سکتے اور منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔

جناب علی اکبر ہاشمی رفسنجانی
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی

معجزہ؟ مختصر تحقیقی جائزہ

معجزہ اگرچہ تاریخی حیثیت سے ناقابل تردید اور عقل کی روشنی میں مورد تائید ہے اور کم ہی ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی کے روزمرہ مشاہدات و واقعات کے دوران وہ ایک محیر العقول و غیر فطری واقعہ سے دوچار نہ ہوئے ہوں۔ پھر بھی انسان کا واسطہ ایسے افراد سے پڑا کرتا ہے جو نہ صرف معجزہ کے وجود سے انکار کرتے ہیں بلکہ اسے تسریت کے جاہلانہ دور کی خرافات سے تعبیر کرتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ فکر پڑھے لکھے اور جاہل مسلمان نوجوانوں میں بھی پائی جاتی ہے جبکہ وہ مسلمان جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے کسی طرح بھی معجزہ سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ قرآن صاف لفظوں میں انبیاء کرام کی معجزنمائی کا ذکر کرتا ہے۔

معجزہ سے انکار کی بنیاد ان مادہ پرستوں کے افکار سے شروع ہوتی ہے جو عالم میں کسی بھی غیر مادی اسباب و علل کو قبول نہیں کرتے۔ اس بنیاد پر اعجاز کا کوئی وجود باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی فکر مادیوں کے علاوہ دوسرے طبقوں میں بھی رسوخ کرتی گئی یہاں تک کہ لوگ اپنے مذہبی اصول و مسلمات و اعتقادات کے خلاف اس فکر کو قبول کرتے چلے گئے۔ معجزہ سے انکار کرنے والے چند گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

۱۔ مادہ پرست، یعنی وہ لوگ جو سرے سے ماورائے طبیعت کے وجود ہی کو نہیں مانتے۔ اس کے اثر کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے۔

۲۔ وہ افراد جو معجزہ کے معنی اور اعجاز و خرقِ عادت کا صحیح مقصود و مفہوم ہی نہیں سمجھتے بلکہ فکر کرتے ہیں کہ معجزہ سے مراد ایک امر محال ہے۔

۳۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کی قدرت کا اعتراف کرنے کے باوجود مادی افکار کے زیر اثر طبیعی عوامل کے عجیب وغریب اور حیرت انگیز آثار کو دیکھ کر اپنی ناقص عقل کی روشنی میں معجزہ کو فطرت کے نظام میں خلل اندازی شمار کرتے ہوئے اسے ناممکن سمجھتے ہیں ۔

۴۔ وہ لوگ جو خود قوت فیصلہ نہیں رکھتے فقط دوسروں کی اندھی تقلید میں معجزہ کا انکار کرتے ہیں یا پھر کچھ خاص اسباب وعلل کے تحت مذہب کی بنیاد سے بدبین ہو کر خود کو معجزہ کا منکر ظاہر کرتے ہیں ۔

۵۔ کچھ لوگ خدا کی قدرت اور فطرت میں روحانی عمل دخل کو قبول کرنے کے باوجود کہتے ہیں کہ کیا ضروری ہے کہ خدا نظام معمول کے مطابق چلنے والے اس مادی نظام میں کوئی خلل پیدا کرے اور فطری عوامل کو درہم وبرہم کرے۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ در اصل معجزہ کے امکان سے انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے وقوع سے انکار کرتے ہیں اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کی ایسی آیتوں کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں جن کا ان کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے علاوہ اور لوگ بھی معجزہ کے منکر نظر آئیں، لیکن ان گروہوں کے جواب کے بعد دوسرے گروہوں کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی ۔

اس مختصر سے مقالہ میں "مادہ پرستوں" کے لئے مدلل جواب کی گنجائش نہیں ہے بلکہ ان کے جواب میں مبدأ آفرینش اور مادیوں کی رد میں لکھی جانے والی بہت سی مستدل کتابیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن کے مطالعہ کے بعد دوسرے منکروں کے ہمراہ ان کو بھی ایک جواب دیا جا سکتا ہے ۔

چوتھے گروہ کا جواب بھی منطق واستدلال کے ذریعہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ انھیں اندھی تقلید کے نقصانات اور قوت فیصلہ وفکری استقلال نہ رکھنے کی خرابیوں سے آگاہ کرنا چاہئے تاکہ وہ اس روش سے باز آجائیں کیونکہ یہ صفات نوجوانوں اور ناسمجھ بچوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ان بہت سی باتوں میں خود اپنی انتخاب کردہ روش پر گامزن ہوں جن میں وہ دوسروں کی تقلید کا شکار ہیں ۔

اب ہمارے سامنے بقیہ تین گروہ رہ جاتے ہیں جنھیں ہم یہ مقالہ پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں ۔

وہ لوگ جو معجزہ کے معنی سمجھنے میں شبہ کا شکار ہیں ۔

لفظ معجزہ سے اس کے وجود کو ثابت کرنے والوں کی مراد یہ ہے کہ صاحب معجزہ کوئی ایسا عمل کر دکھائے جسے اس زمانہ میں اور اس مقام پر کوئی دوسرا انجام نہ دے سکے اور طبیعی وعادی ذرائع ووسائل سے اسے انجام

نہ دیا جا سکتا ہو۔

معجزہ کی ایک دوسری تعبیر "خرق عادت" ہے یعنی کوئی ایسا عمل ظاہری طور پر مادی اور معمولی سلسلۂ نظام کو درہم و برہم کر دے اور فطری اسباب کے برخلاف انجام پائے۔ چنانچہ اگر کوئی عالم اپنے خاص علم کے ذریعہ فطرت و طبیعت کی کسی قوت سے کام لیتے ہوئے کوئی ایسا عمل انجام دے کہ اس علم سے جاہل افراد، دلیا عمل انجام دینے سے قاصر ہوں تو یہ عمل اصطلاحی اعتبار سے معجزہ نہیں کہلائے گا (البتہ لغوی اعتبار سے ہم اسے معجزہ کہہ سکتے ہیں) کیونکہ جو شخص بھی اس علم کو پڑھے اور سمجھے گا۔ اس عمل کو انجام دے سکتا ہے۔

بہتر ہے کہ اس مطلب کو ہم مثال کے ذریعہ سمجھیں۔ تاریخ کا ایک اہم معجزہ جسے مسلمان، یہود و نصاریٰ سب تسلیم کرتے ہیں اور جس کا ذکر توریت، انجیل اور قرآن تینوں کتابوں میں ملتا ہے، حضرت موسیٰ کا عصا ہے۔ حضرت موسیٰ جب چاہتے تھے وہ خدا کے حکم سے اژدھا بن جاتے تو وہ سالہا سال کی خشک و بیجان لکڑی کا عصا ایک بیک اژدھا بن جاتا تھا۔ لوگوں میں دہشت پیدا کرتا، حملہ کرتا، چیزوں کو نگل جاتا، منہ سے آگ کی لپٹیں پھینکتا تھا۔ اور اپنے سے سیکڑوں گنا بادزن چیزیں ہضم کر جاتا اور دوسرے ہی لمحہ پھر عصا بن جاتا اور وہ تمام چیزیں جو وہ نگل گیا تھا ان کا کوئی پتہ بھی نہ چلتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس عمل میں فطری قوانین کے خلاف بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں اور موسیٰ کے علاوہ کوئی اس عمل کو انجام نہیں دے سکتا اور نہ آج تک یہ عمل، علم کی دسترس میں ہی آسکا۔

اب اگر ہم فرض کر لیں کہ ایک روز سائنس اتنی ترقی کر جائے کہ ایک لکڑی کا ٹکڑا مادی وسائل اور طبیعی عوامل کے ذریعہ بہت ہی مختصر سے وقفہ میں اژدھے میں تبدیل ہو جائے، آگ کی لپٹیں اس کے نتھنوں سے برآمد ہوں، حملہ کرے، چیزوں کو نگل جائے اور جو کچھ بھی نگلے فوراً اپنے اندر پانی پانی کر بخارات میں تبدیل کر دے اور انہی بخارات سے قوت حاصل کر کے آٹومیٹک طور پر اپنا عمل جاری رکھے۔ اگرچہ یہ حضرت موسیٰ جیسا عمل ہے لیکن ہمارے معجزہ کی بحث سے خارج ہے، کیونکہ ہر شخص اسکول میں اس سبق کو پڑھ کر اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ یہ عمل صرف ان لوگوں کے لئے لغوی اعتبار سے معجزہ ہے جو اس علم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ یہیں سے ہم یہ بات بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شعبدہ بازی، سحر اور جادو جیسے اعمال جو محیر العقول اور حیرت انگیز نظر آتے ہیں، معجزہ سے الگ ہیں کیونکہ ان کا ربط مخصوص قواعد و قوانین سے ہے جو پڑھے اور پڑھائے جا سکتے ہیں اصولی طور پر معجزہ ہمیشہ وہاں ظہور میں آتا ہے جہاں علم ہیچ نظر آتا ہے۔ اگر کوئی شخص انبیاء کرام

ذریعہ دنیا میں ظاہر ہونے والے خارق العادہ واقعات کا جائزہ لے، تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ انبیا ہمیشہ ایسے معجزے
بر فرماتے تھے کہ ان کے زمانہ میں خصوصیت سے وہ علم اپنے ارتقائے کمال کو پہنچا ہوا ہوتا تھا۔

مثال کے طور پر جناب موسیٰؑ کے زیادہ تر معجزات سحر اور شعبدہ سے ملتے جلتے ہوا کرتے تھے کیونکہ اس زمانہ میں سحر
جادو کا علم نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ رائج تھا بلکہ اس عہد کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علم تھا۔

حضرت عیسیٰؑ نے ایسے زمانہ میں ظہور فرمایا جب علم طب یونانی نے حیرت انگیز اور نمایاں ترقی حاصل کر لی تھی لہٰذا
دل نے اسی ترقی یافتہ علم کی روشنی میں اپنے معجزہ کا اظہار فرمایا۔

حضرت خاتم الانبیاءؐ کی رسالت چونکہ ابدی اور تمام اقوام و ملل کے لئے ہے لہٰذا ان کے معجزات کسی
ں علم سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ آپؐ ہر موقع پر ایک نیا معجزہ پیش کر سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ آپؐ تمام انبیاء کرامؑ کے معجزات تو
پیش کر ہی سکتے تھے خود آپؐ کے معجزات کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن چونکہ ظہور اسلام کے عہد میں ادبیات خصوصاً کلام
فصاحت و بلاغت اور عبارت آرائی کا بڑا زور تھا۔ لہٰذا قرآن نے اس عہد کے تمام ادبی محاسن کو اپنے
نے گھٹنے ٹیکنے اور شرمندہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

معمولاً انبیاء کرامؑ جو ترقی یافتہ علوم میں اپنے معجزات کا اظہار فرمایا کرتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ فطرتاً چونکہ
م انسانوں کے افکار اپنے زمانہ کے علماء و دانشوروں کے تابع ہوا کرتے ہیں لہٰذا جب بھی کوئی پیغمبر کسی متبحر عالم کے
منے اس کے علم کی روشنی میں اس علم کی وسعت و قوت سے بالاتر کوئی عمل انجام دیتا تھا تو علماء فن اس نکتہ کو مد نظر
رکھتے ہوئے کہ ماضی میں صاحب معجزہ کو اس علم میں کوئی مہارت حاصل نہ تھی اچھی طرح سمجھ جاتے تھے کہ یہ طاقت حصول علم
تجربہ کی نشانی نہیں ہے بلکہ یقیناً اس کا رابطہ کہیں اور سے ہے اس بنا پر وہ اپنی عاجزی کا اعتراف کر کے اسے
قبول کر لیتے تھے۔ اور جب علماء ایمان لے آئیں تو عوام کو راغب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ معجزہ ایک ایسا عمل ہے جو خدا کے اذن و ارادہ سے ظہور میں آتا ہے، جسے خود خدا لاعلوم
پوشیدہ اسباب و علل کے ذریعہ وجود میں لاتا ہے جو بلا کسی رکاوٹ کے براہ راست اثر انداز ہوتا ہے اور
قادر مطلق خدا کی دنیا میں اس شخص کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے جسے خدا نے یہ منزلت و مرتبہ عطا فرمایا ہو۔
ارئین کرام ان مطالب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب معجزہ کے منکرین کو دیئے جانے والے جوابات کا مطالعہ فرمائیں۔

معجزہ محالات کی دنیا میں ممکن نہیں۔

یہاں ایک خاص نکتہ کا تذکرہ ضروری ہے جس میں ایک تو منکروں کے ایک گروہ سے ہمارا اختلاف ختم ہو جائے گا

ساتھ ہی معجزہ کی ایک تعریف بھی بیان ہوجائے گی، وہ یہ ہے کہ حکمائے الٰہیات کے مطابق معجزہ کبھی محالات، غیر ممکن اور ناشدنی امور سے تعلق نہیں رکھتا اور اصولی طور پر محال کا قدرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اس وقت جبکہ میں اپنے کمرہ میں مقالہ لکھنے میں مشغول ہوں ظہر کا وقت شنبہ کا دن اور مثلاً فروری کی ۲۲ تاریخ ہے اگر میں چاہوں کہ اسی وقت اسی کمرہ میں مارچ کی سات تاریخ صبح کے ساڑھے چار بجے ہوں اور میں سویا بھی رہوں یہ محال اور ناممکن ہے اور معجزہ کے ذریعہ سے بھی اسی ایک کمرہ میں روز و شب، فروری اور مارچ اور یکشنبہ و چہارشنبہ اکٹھا نہیں ہوسکتے اور نہ مجھ پر ایک ساتھ خواب و بیداری دونوں طاری ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ سب محالات میں سے ہے۔

یا کاغذ جس پر میں لکھ رہا ہوں ایک ہی وقت میں پورا سیاہ بھی ہو اور سفید بھی اور اس وقت کمرہ میں رہوں اور نہ بھی رہوں یعنی یہ ناممکن ہے کہ میں ہوں بھی اور نہیں بھی یا نہیں بھی ہوں اور ہوں بھی۔

ایسی چیزوں کو محالات عقلی کہتے ہیں اور پیغمبر و ائمہ نہ صرف ایسے اعمال کی قدرت و قوت کے دعوے دار نہیں تھے بلکہ ایسی قدرت کے حامل ہی نہیں ہوسکتے تھے اور نہ صرف انبیاءؑ و ائمہ بلکہ خداوند عالم بھی ایسی قدرت نہیں رکھتا (مطلب یہ ہے کہ خود اس موضوع میں صلاحیت و قابلیت نہیں ہے۔ ورنہ خدا کی قدرت کاملہ میں کوئی نقص نہیں ہے)

اگر کوئی شخص محالات کے بجالانے کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ خود اس کے جھوٹے اور بیوقوف ہونے کی دلیل ہوگا۔ بربنائے فرض اگر معاذ اللہ قرآن میں کوئی ایسی چیز دکھائی دے تو سمجھ لیجئے کہ مجعول اور گڑھی ہوئی ہے۔ یا اگر کوئی یہ کہے کہ خاتم الانبیاءؐ ایک کو اس طرح دو بنا دیتے تھے کہ ایک بھی رہے اور دو بھی تو بلاشبہ یہ جھوٹ ہوگا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ معجزہ کا میدان اگرچہ بہت وسیع ہے لیکن محال کی حد تک پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے۔ محالات کی دنیا میں قدم نہیں رکھتا۔

مردہ کو زندہ کرنا محال نہیں ہے۔ جو جناب عیسیٰؑ کا معجزہ تھا لیکن ایک ہی آن میں مردہ ہونا اور زندہ بھی ہونا محالات میں سے ہے۔ اگر مثلاً جناب عیسیٰؑ یہ فرماتے کہ میں خدا کی قدرت سے ایک ہی آن میں مردہ کو زندہ بھی کرسکتا ہوں اور مردہ بھی رکھ سکتا ہوں تو یہ سراسر جھوٹ ہوتا۔ ہاں اگر انہوں نے فرمایا کہ میں مردہ کو زندہ کرسکتا ہوں تو اس میں عقلی طور پر کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس داں اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ تجدید حیات کی کوئی دوا ایجاد کرلیں۔ اگر پیغمبرؐ یہ دعویٰ کرے کہ میں پتھر میں قوت کلام پیدا

کرسکتا ہوں تو عقل اس سے انکار نہیں کرسکتی لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میں ایسا معجزہ دکھا سکتا ہوں کہ پتھر بولتا بھی رہے اور خاموش بھی رہے تو نہ یہ بات باور کرنے کے قابل ہے اور نہ عقل اسے تسلیم کرسکتی ہے۔ بنا برایں معجزہ کو ایک امر محال تصور کرنے والوں سے ہم کوئی خاص اختلاف نہیں رکھتے۔ لہٰذا اب ہم اسباب و علل کے زیر اثر معجزہ سے انکار کرنے والوں کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

فقط یہاں ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ معجزہ کو محال تصور کرکے مخالفت کرنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ خرق عادت یا معجزہ کے مدعی حضرات کہتے ہیں کہ پیغمبرانِ خدا بلا کسی اسباب و علل کے یہ عمل انجام دیتے ہیں، اسی خیال کے تحت وہ معجزہ کو تسلیم نہیں کرتے۔

اگر حقیقتاً ایسا ہوتا تو وہی لوگ حق پر ہوتے کیونکہ بغیر علت کے معلول کا وجود خود ایک امر محال ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے۔ صاحب معجزہ نہ بلا کسی سبب کے کوئی کام کرتا ہے اور نہ کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان اسباب کا ایک جزو بھی ناقص رہ جائے تو عمل انجام نہیں پاسکتا۔ بہرحال اس گروہ کو مطمئن کرنے کے لئے مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بھی محال کا وجود ہے وہاں معجزہ نہیں ہوسکتا۔

مادی افکار کے تحت معجزہ سے انکار کرنے والوں کا جواب۔

ہم بحث کی ابتدا میں عرض کرچکے ہیں کہ ہمارا روئے سخن ان سے ہے جو خدا اور اسکی قدرت کو تسلیم کرتے اور کسی ایک دین کی پیروی کرتے ہیں۔ بنا برایں وہ کسی بھی مذہب کو مانتے ہوں اس میں یقینی طور پر خوارق عادات یا معجزات کا وجود ضرور ہوگا۔ کیونکہ اصولی طور پر کوئی آسمانی مذہب ایسا نہیں ہے جسمیں اعجاز کا وجود نہ ہو۔

ہم خصوصیت سے ان مسلمانوں سے سوال کرتے ہیں جو قرآن جیسی کتاب پر ایمان رکھتے اور پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ایسے افکار رکھتے ہیں، جناب: قرآن میں بے شمار آیتیں انبیاء کرام کے معجزات کو صاف اور واضح طور سے بیان کرتی ہیں پھر آپ کس خیال کے تحت معجزہ سے انکار کی جرأت کرتے ہیں؟

طوفان نوح کے واقعہ[1]، اور طوفان سے پہلے جناب نوحؑ کے کشتی بنانے، امت کے لئے بددعا کرنے اور دیگر تمام جزوی اخبار کی توجیہ آپ کن قدرتی اسباب و علل کے ذریعہ کرسکتے ہیں؟

---

[1] سورۂ ہود، آیات ۲۴ سے ۴۹ تک

وہ بھڑکتی ہوئی آگ جو بغیر کسی ظاہری مادی سبب کے فقط خدا کے حکم سے جناب ابراہیمؑ خلیل خدا کے لئے سرد ہو گئی اور آگ کے درمیان آرام و سکون کا ماحول قائم ہو گیا۔ یہ باتیں آخر کس فطری قانون کی روشنی میں قابل توجیہ ہیں۔[1]

جناب موسیٰ کا وہ حیرت انگیز عصا[2]، ان کا عجیب و غریب ید بیضا[3]، سطح آب پر عصا کے مارنے سے دریا میں راستہ کا پیدا ہو جانا، موسیٰ کا مع اپنے اصحاب کے اس کے درمیان سے گزر جانا اور فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہو جانا[4]۔ بنی اسرائیل میں خدا کی خلاف ورزی کرنے والوں کا مسخ ہو جانا[5]۔ اور اچانک ان کے کھانوں اور اسباب زندگی میں مینڈکوں اور خون کا ظاہر ہو جانا[6]۔ ان کے علاوہ جناب موسیٰ کے اور بہت سے معجزات جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ کیا آپ نے اتنے سارے معجزات سے انکار کے لئے کوئی طبیعی قانون دریافت کر لیا ہے۔؟

جناب داؤدؑ کے ہاتھوں میں آہن کا موم ہو جانا[7]، جناب سلیمانؑ کی عظیم سلطنت جو جن و انس، حیوانات، پرندوں، ہوا اور فضا سب پر قائم تھی[8]۔ جناب صالحؑ کا عجیب الخلقت ناقہ[9]، جناب یونسؑ کی حیرت انگیز داستان[10]۔ قوم لوط کا عدیم النظیر عذاب[11]، اصحاب کہف کا حیرت زا واقعہ[12]، جناب عزیرؑ نبی کی موت اور دوبارہ زندگی[13]، حصول اطمینان کے لئے جناب ابراہیمؑ کا پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا پھر ان کا زندہ ہو جانا[14] اور بہت سے واقعات جو تحقیق کی روشنی میں طبیعی اسباب و علل کے بالکل برخلاف ہیں اور سب کے سب بغیر کسی تفسیر و وضاحت کے فقط متن قرآن سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ کیا مسلمان ہوتے ہوئے آپ نے ان کے بارہ میں بھی کبھی غور فرمایا، کیا یہ سب واقعات فطری و عادی ہیں؟ ہرگز نہیں۔

کیا آپ نے کبھی بغیر طبیعی وسائل کے جناب عیسیٰؑ کے ذریعہ مردہ کے زندہ ہونے، مادر زاد اندھے کے چشم بینا

---

[1] سورۂ انبیاء/ ۶۹
[2] سورۂ شعراء/ ۳۲
[3] سورۂ شعراء/ ۳۳
[4] سورۂ انبیاء/ ۶۳ سے ۶۷ تک
[5] سورۂ بقرہ/ ۶۵
[6] سورۂ اعراف/ ۱۳۳
[7] سورۂ صافات/ ۱۳۹ سے ۱۴۸ تک
[8] سورۂ نمل جناب سلیمانؑ سے متعلق آیتیں
[9] سورۂ ہود، آیات/ ۶۰ سے ۶۸ تک
[10] سورۂ سبا، آیات/ ۹ سے ۱۲ تک
[11] سورۂ ہود، آیات/ ۷۲ سے ۸۲ تک
[12] سورۂ کہف/ ۹ سے ۲۶ تک
[13] سورۂ بقرہ/ ۲۶
[14] سورۂ بقرہ/ ۲۶۱

کرنے اور مبروص کے صحت یاب ہونے پر غور فرمایا ہے۔ یا جیسا کہ خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے کہ جناب عیسیٰ مٹی کے پرندہ بناتے تھے اور اس میں سانس پھونکتے ہی وہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جاتا تھا[1]۔ کیا آپ نے ان سب باتوں پر غور فرمایا ہے یا یوں ہی آنکھیں بند کرکے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب امور عادی و فطری عوامل کے تحت انجام پاتے ہیں۔ ان سے نظام فطرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟!

قارئین کرام میری گفتگو کے ثبوت میں قرآن اٹھائیے اور شروع سے آخر تک اس کا مطالعہ فرمائیے۔ اگر عربی پر قادر نہ ہوں اس کا ترجمہ ہی بغور پڑھیئے۔ مندرجہ بالا واقعہ کے علاوہ آپ کو کتنے ہی ایسے واقعات نظر آئیں گے جو بلا کسی فطری و عادی اسباب و وسائل کے ظہور پذیر ہوئے ہیں اور مادی افکار کے برخلاف متعدد مرتبہ فطرت کی زنجیریں پارہ پارہ ہو چکی ہیں اور معجزہ یقین کی منزل کو پہنچا ہے۔

وہ لوگ جو عالم طبیعت کے اس منظم نظام کو حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں خود اس عالم کے خالق کی حکمت و کمال پر حیرت کیوں نہیں کرتے اور باور کیوں نہیں کرتے کہ ان عجیب و غریب امور کا خالق اپنی خلق کردہ اشیاء کے اثرات کو سلب بھی کر سکتا ہے اور بے اثر اشیاء کو اثر بخش سکتا ہے۔

منکرین معجزہ کے پانچویں گروہ کا جواب

چوتھے گروہ کے لئے ہماری گفتگو ان کے لئے بھی بہترین جواب ہے جو یہ کہہ کر معجزہ سے انکار کرتے ہیں کہ خداوند عالم نظام عالم میں خلل واقع تو کر سکتا ہے لیکن اس کی کوئی علت نہیں سمجھ میں آتی کہ خدا مادی نظام کائنات میں رخنہ پیدا کرکے کوئی عمل انجام دے۔

لیکن اگر یہ لوگ ایک مرتبہ بھی قرآن، انجیل، توریت یا کم از کم تاریخ انبیاء کا مطالعہ کریں تو یقیناً بغیر کسی بحث کے اپنی بات واپس لے لیں گے۔ کیونکہ اس قدر معجزات جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں ان کے عقیدہ کے برخلاف ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان کے نزدیک معجزہ کا واقع ہونا لازمی اور ضروری نہیں اور یہ عمل بے سود اور بلا وجہ ہے تو ہم ان کے جواب میں معجزہ کے لزوم کی ایک بنیادی علت بیان کرتے ہیں۔

اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ خدا کی جانب سے پیغمبروں کا بھیجا جانا ضروری ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے

---

[1] سورۂ آل عمران/ ۴۹

خدا کا ایک قانون و دستور بیان فرمائیں۔ تو بہرحال ان کی شناخت کی بہترین دلیل یہی معجزہ ہے۔ کیونکہ ہر نبوت کا دعویٰ کرنے والا یہ ادعا کرتا ہے کہ میں عالم بالا سے رابطہ رکھتا ہوں اور میری نبوت کا سلسلہ خدائے خالق و مدبر سے ہے۔ اگر حقیقتاً ایسا ہے تو اس کے پاس اس کا کوئی ایسا ثبوت بھی ہونا چاہیئے جسے بقیہ انسان نہ پیش کر سکیں اس کی رسائی وہاں تک ہو جہاں عام انسان نہ پہنچ سکے یعنی وہ کوئی ایسا کام کر دکھائے جس سے لوگ عاجز ہوں اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔ اور اگر آپ لفظ معجزہ سے گھبراتے ہیں تو اسی کو "سند نبوت" یا ان کے دعوے کی دلیل کہہ لیجئے۔

کسی بھی محکمہ کا کارپرداز جب بھی اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کسی علاقہ میں جاتا ہے تو اپنے محکمہ جاتی اسناد اپنے ساتھ رکھتا ہے، ورنہ لوگ سے پہچاننے سے انکار کر دیں۔ پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص دنیا کے عظیم ترین عہدہ کا دعویٰ کرے اور اپنے ہمراہ کوئی ثبوت یا دلیل نہ رکھتا ہو۔ رسالت تو وہ عظیم درجہ ہے کہ اگر اس کے لئے معجزہ کی احتیاج نہ ہو تو سبھی اس کا دعویٰ کرنے لگیں اور عام انسانوں کے لئے راستگو نبی کا پہچاننا دشوار ہو جائے۔ پھر معجزہ سے بہتر خدا کے ارتباط کی اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے جو درحقیقت خدا کی قدرت و عظمت کا ایک نمونہ بھی ہے۔

ہم یہاں اپنے مطلب کی مزید وضاحت کے لئے دنیا کے ایک عظیم معجزہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو صرف تاریخی حیثیت سے ناقابل تردید ہے۔ بلکہ قرآن حکیم نے بھی صراحت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اور وہ اصحاب فیل کا واقعہ ہے۔

اصحاب فیل

" کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے خدا نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کیا اس نے ان کے سارے منصوبوں پر پانی نہیں پھیر دیا؟ اس نے ان لوگوں کی طرف ابابیلوں (پرندوں) کا ایک لشکر بھیجا۔ جنھوں نے انھیں سنگریزوں سے مار مار کر چبائے ہوئے بھوسے میں تبدیل کر ڈالا" (قرآن کریم سورۂ فیل)

ایام فترت وجاہلیت کا آخری دور تھا۔ یہود و نصاریٰ کے درمیان جنگ و جدال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ یمن کا کٹر یہودی بادشاہ "ذونواس" جس نے یمن کے اطراف میں نجران کے قریہ کے عیسائیوں کو بلا تقصیر جلا کر راکھ کر ڈالا تھا یہودیوں کی قوت و قدرت میں اضافہ کی کوشش میں مشغول تھا۔

قیصر روم اور بادشاہ حبشہ نجاشی جو نصرانی تھے اس واقعہ پر خاموش نہ رہ سکے چنانچہ قیصر روم کے اشارہ پر نجاشی نے ایک بڑا لشکر "ابرھہ بن صباح" کی سرکردگی میں "اصحاب اخدود" (نجرانیوں) کا بدلہ لینے کے لئے روانہ کیا۔

ذونواس، جو روم و حبشہ اور تمام عیسائی علاقوں سے تجارتی رابطوں کے منقطع ہوجانے اور اس کی وجہ سے یمن کی تجارت میں جمود پیدا ہونے کے سبب بالعموم عوام میں اور بالخصوص تجارتی طبقہ میں کافی بدنام ہوچکا تھا، ابرھہ کے ہاتھوں آسانی سے مغلوب ہوگیا۔ یہودی چونکہ پیسہ کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں لہٰذا جب انہوں نے دیکھا کہ ابرھہ کی آمد سے یمن کی تجارت کو فائدہ پہنچے گا تو انہوں نے بھی آسانی سے شکست قبول کرلی اور سپر انداختہ ہوگئے۔ اس طرح یمن، حجاز اور نجد میں یہودی شورشوں سے نجاشی اور ابرھہ کو نجات مل گئی۔ اور ابرھہ نجاشی کے ایماء پر یمن کی ریاست کا حاکم بن بیٹھا۔

جو چیز ان لوگوں کو کھٹکتی تھی وہ اس علاقہ میں بت پرستوں کی ایک بڑی جمعیت تھی۔ خاص کر حجاز کے علاقہ میں وہ ایک بڑی قوت بن کر ابھر رہے تھے۔ خصوصاً مکہ کے سالانہ عظیم و بے نظیر اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی قوت میں پے در پے اضافہ کرتے جارہے تھے۔ اس بنا پر نجاشی و ابرھہ کو برابر یہ خوف رہا کرتا تھا کہ کہیں یہ لوگ ایک بڑی طاقت بن کر علم بغاوت نہ بلند کریں۔

کعبہ اپنے تقدس و احترام کی بنا پر اہل عرب میں مختلف جہات سے کافی اہمیت کا حامل تھا۔ اور جو قبائل اس کی عظمت و احترام کے قائل تھے انھیں سیاسی و اجتماعی اعتبار سے باہمی اتحاد و یگانگت کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ خصوصیت سے اہل مکہ کے لئے کعبہ کا وجود غیر معمولی اقتصادی اہمیت رکھتا تھا۔ لہٰذا یہ اجتماعات دوسروں کی رشک و حسد کی نگاہوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ سبھی کو اس کا اشتیاق تھا کہ کسی طرح ہم بھی کوئی ایسا اجتماعی مرکز بناڈالیں جو معنوی اعتبار سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی، سیاسی و اقتصادی طور پر بھی مفید رہے۔

ایسا کرنا کچھ آسان نہ تھا۔ اس کے لئے صدیوں کی مذہبی تبلیغات کے علاوہ ایک محکم و استوار آسمانی رابطہ کی بنیاد بھی درکار تھی۔ خانۂ کعبہ جناب ابراہیمؑ اور ان کے بڑے فرزند جناب اسماعیلؑ کے ہاتھوں خدا کے حکم سے بنایا گیا تھا اور خود جناب ابراہیمؑ نے اس کی طرف لوگوں کا دل راغب کرنے کے لئے دعا بھی فرمائی تھی۔ لہٰذا خدا نے بھی لوگوں میں اس کے لئے قلبی لگاؤ اور انس پیدا کردیا۔ اگرچہ وہ ایک بت کدہ کی

صورت میں تبدیل ہو گیا تھا پھر بھی اس کی محبت لوگوں کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔

ابرہہ ابن صباحِ اشرم، ان تمام چیزوں کو فراموش کر گیا۔ اس نے لوگوں کو یمن کی طرف راغب کرنے کے لئے "قلیس" یا لغت نامہ دہخدا کے مطابق "اقلیس" نامی ایک عظیم عبادت گاہ کی بنیاد رکھی اور اپنے خیال میں لوگوں کی رغبت و دلکشی کے ہر طریقے اپنائے۔ ظاہری طور سے یہ عمارت بڑی دلکش اور کم نظیر تھی ساتھ ہی اس نے عمارت کی پیشانی پر نجاشی کا نام کندہ کرایا جو لوگوں کی نظر میں کسی حد تک قابل احترام تھا۔ وہ خود اور سربراہان حکومت اس عمارت کا بڑا اکرام و احترام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اس مرکز کی اہمیت و احترام کا سکہ یمن کے باہر والوں کے دلوں میں بٹھانے کے لئے بڑے زبردست مبلغ معین کئے جو عرب و غیر عرب ممالک میں مخصوص طرز پر اس کی تبلیغ کریں۔ آخر کار کچھ لوگ تماشے ہی کی غرض سے وہاں اکٹھا ہونے لگے اس طرح کچھ دنوں کے لئے "قلیس" میں ایک رونق پیدا ہو گئی۔

لیکن بے بنیاد شہرت اور توہمات پر مبنی یہ عمارت زیادہ دنوں استوار نہ رہ سکی اور رفتہ رفتہ گوشہ و کنار سے یہ آوازیں اٹھنے لگیں کہ: یہاں حاجتیں پوری نہیں ہوتیں، خدا یہاں بندوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، کعبہ کا خدا مہربان اور بخشنے والا ہے۔ یہاں کا خدا تو دعا ہی نہیں سنتا، یہ عمارت دل پر اثر نہیں ڈالتی، دل میں خضوع و خشوع نہیں پیدا ہوتا، یہاں انسان خدا کی عظمت کا کوئی احساس نہیں کرتا۔ یہاں انسان بے ادبی سے نہیں ڈرتا۔

قبیلۂ کنانہ کا ایک عرب جو مکہ کا سخت حامی و طرفدار تھا قلیس کے بے حقیقتی کو ثابت کرنے کے لئے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ یمن گیا اور "قلیس" میں ایک شب گزارنے کی اجازت حاصل کی اور اس شب جہاں تک اس سے ہو سکا اس نے معبد کے در و دیوار کو گندہ کیا اور خاص کر معبد کے حساس و قابل احترام مقامات کو نجاست سے زیادہ ملوث کیا اور بڑے سویرے ہی وہاں سے نکل آیا ساتھ ہی راستہ میں لوگوں سے کہتا بھی گیا کہ "سنا ہے کہ رات کچھ لوگوں نے عبادت گاہ کو نجس کر دیا ہے۔"

سویرے آفتاب کے طلوع ہوتے ہی قلیس کے نجس ہو جانے کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ عبادت گاہ میں جمع ہونے لگے اور سب نے نزدیک سے یہ ماجرا دیکھا۔ کچھ لوگ جو رفتہ رفتہ اس کے معتقد ہو رہے تھے یا درحقیقت اس کے متعلق حساس ہو چکے تھے یا جن کے مفادات خطرہ پڑ گئے تھے غم و غصہ اور جوش و خروش کا اظہار کرنے لگے۔

آثار و شواہد یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ کام کعبہ کے طرفداروں نے انجام دیا ہے، اس وجہ سے خانۂ خدا کے خلاف بھی نعرے بلند کئے جا رہے تھے۔

ابرہہ نے مکہ سے اپنی دیرینہ دشمنی اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ماحول کو پوری طرح سازگار پایا اور مجمع کے جوش و خروش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہیں پوری آب و تاب کے ساتھ کعبہ کے انہدام اور کلیسا کے دفاع کا اعلان کر دیا اور اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے نجاشی سے اجازت اور مدد طلب کی اور خاص طور سے "محمود مبارک" نامی ہاتھی کا تقاضہ کیا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں نجاشی کی طرف سے "محمود" نامی ہاتھی مع دوسرے جنگی وسائل کے، جن میں کئی تجربہ کار ہاتھی اور تجربہ کار فیل بان تھے ابرہہ کے پاس پہنچ گئے اب ابرہہ کا لشکر روانگی کے لئے مکمل طور سے تیار ہو گیا یہ لشکر جس میں جنگ کے لئے ساٹھ ہزار افراد تھے ساتھ ہی ہاتھیوں کی ایک لمبی صف جن کے آگے مبارک نامی ہاتھی تھا، خانۂ خدا کو منہدم کرنے اور اس کی خاک اٹھا کر یمن لانے کے لئے روانہ ہوا۔[1] راستے میں کہیں کہیں مکہ کے طرفدار گروہوں سے ٹکراؤ ہوتا رہا۔ سرزمین یمن میں "ذونفر" یا فرید وجدی کی تحریر کے مطابق "ذویقر" اور سرزمین "خثعم" پر "نفیل بن حبیب" نے یکے بعد دیگرے اس کا راستہ روکا لیکن اس عظیم مسلح لشکر کے سامنے ٹک نہ سکے اور جلد ہی شکست کھا کر اسیر ہو گئے۔ ان دو گروہوں کی شکست کے بعد جو تمام قبائل میں زیادہ قوی تھے کسی میں اس سے ٹکرانے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ طائف میں تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا کافی اکرام و احترام کیا گیا اور ابو رغال نامی شخص کو راہنما کے طور پر اس کے ہمراہ کر دیا گیا۔[2] اور اہل مکہ بھی جن سے مقابلہ کی کافی توقع تھی، جب ابرہہ کا ایلچی ان کے پاس یہ پیغام لے کر آیا کہ اگر تم دفاع نہ کرو گے تو ہم تم سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے فقط خانۂ کعبہ کو منہدم کریں گے، تو اہل مکہ نے جواب میں کہا کہ ہم خود جنگ نہیں چاہتے

---

1. یونانی مآخذ کے مطابق انکا عقیدہ یہ ہے کہ ابرہہ لشکر روم کی مدد کے لئے یمن سے روانہ ہوا تھا۔ روم کا لشکر شام کے علاقہ میں ایران سے جنگ میں مصروف تھا۔ اور چونکہ قیصر روم نے ایران کے مقابلے کے لئے نجاشی سے مدد طلب کی تھی لہٰذا نجاشی کے حکم سے ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر لیکر روانہ ہوا۔ وہ مکہ کے راستہ سے گزرنا چاہتا تھا، ساتھ ہی اس کی یہ خواہش تھی کہ کعبہ کو مسمار کرتا جائے۔ یونانیوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے لشکر کا ایک حصہ تو مکہ ہی میں تلف ہوا اور بقیہ تتر بتر ہو کر فرار ہو گیا۔
2. ابو رغال راستہ ہی میں مر گیا اور اسے "مغمس" نامی مقام پر دفن کیا گیا۔ وہاں سے گزرنے والے مسافر اس کی قبر کو مارتے ہوئے گزرتے ہیں۔

نہ ہم میں اس کی استطاعت ہی ہے۔

ابرہہ کے لشکر نے مکہ کے اطراف میں داخل ہوتے ہی اہل مکہ کے تمام اموال لوٹ لئے اور جتنے مویشی ہاتھ آئے ہنکا کرلے گئے۔ ان جانوروں میں صرف جناب عبدالمطلب کے دو سو اونٹ تھے۔ عبدالمطلب جو رئیس قریش اور سردار مکہ تھے۔ کعبہ کے بہت سے امتیازات وافتخارات ان کی ذات سے مخصوص تھے۔

ابرہہ نے حکم دیا کہ اگر مکہ کے لوگ ہم سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تو ان کا سردار ملاقات کے لئے میرے پاس آئے جناب عبدالمطلب نے ظاہری طور پر اپنے اونٹوں کا مطالبہ کرنے اور حقیقتاً اسے کچھ سمجھانے کے لئے اس کے اس تقاضہ کو قبول کرلیا۔ "ذونفر" نے جو جناب عبدالمطلب کو جانتا تھا، ملاقات سے پہلے ابرہہ سے ان کی بڑی تعریفیں بیان کیں۔ اے ابرہہ یہ ایسا شخص ہے کہ صرف اہل مکہ اور مسافرین مکہ ہی اس کے خوان کرم کے رہین منت نہیں ہیں بلکہ حیوانات اور وحشی درندے بھی اس کی نعمتوں سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ غرضکہ جس قدر ان کے فضائل ومحامد بیان کئے گئے تھے ابرہہ کو ان کے دلکش قیافہ میں صاف نظر آئے۔ جناب عبدالمطلب کے صولت و وقار اور رعب وجلال نے ابرہہ اور اہل مجلس کو ان کے احترام پر مجبور کردیا۔

ابرہہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے لشکریوں کے سامنے کسی کی عزت واحترام کرے لیکن جناب عبدالمطلب کی حیرت انگیز جاذبیت نے اسے تخت سے اترنے پر مجبور کردیا اور دونوں سردار صدر مجلس میں پہلو بہ پہلو ایک ساتھ فروکش ہوئے اہل مجلس کی حالت بھی اپنے سردار سے کم دگرگوں نہ تھی۔ سب اس مترجم کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھے جو جناب عبدالمطلب کی ترجمانی کررہا تھا۔

رفتہ رفتہ بات یہاں تک پہنچی کہ ابرہہ سردار قریش کی فرمائشات قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ لشکر کے سردار اور خود ابرہہ اس فکر میں پڑ گئے تھے کہ اگر جناب عبدالمطلب نے کعبہ کی تخریب سے دستبردار ہونے اور یہاں سے چلے جانے کو کہا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور اس قدر زحمتیں اٹھانے کے بعد اب جو ہم اپنے مقصد کے قریب پہنچ گئے ہیں اس سے صرف نظر کیسے کریں گے۔

لیکن عبدالمطلب نے ان سے جو حقیر اور بے حقیقت مطالبہ کیا وہ ان کے ملکوتی قیافہ، فصاحت وبلاغت اور بزرگی وعظمت کو دیکھتے ہوئے قطعی نامناسب تھا۔ چنانچہ جب جناب عبدالمطلب نے فرمایا کہ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ میرے اونٹ واپس کردیئے جائیں" تو مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ چہ میگوئیوں کی صدا عبدالمطلب کے کانوں تک بھی پہنچی۔ لوگ ان کی پست ہمتی کا مذاق اڑا رہے تھے۔

خود ابرھہ بھی اپنی حیرت کو چھپا نہ سکا اور اس نے حقارت آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا: میں آپ کے قیافہ اور ظاہری وقار و تمکنت کے پیش نظر کچھ اور سوچ رہا تھا اور کسی بڑی فرمائش کا منتظر تھا۔ میں آپ کی پیشانی پر مرسوم آپ کی بلند ہمتی اور اعلیٰ ظرفی کو دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ آپ مجھے اس کعبہ کو ڈھانے سے روکیں گے جو آپ کے اور آپ کے خاندان کیلئے مایۂ افتخار اہل مکہ کی روزی روٹی کا واحد سہارا اور آپ کا اجتماعی و سیاسی مرکز ہے۔ لیکن آپ کا مطالبہ میرے خیال سے بہت زیادہ پست و کمتر ثابت ہوا۔

لقد اعجبتنی اذ قد رأیتك وقد زهدت فیك حین کلمتنی

آپ کی شکل و شمائل نے میرے دل میں ایک آگ سی بھڑکا دی تھی لیکن آپ کی کمترین آرزو نے اس پر پانی ڈال دیا۔

ابرھہ کے چشم و ابرو کے اشارے اور اہل مجلس کے سروں کی جنبش ظاہر کر رہی تھی کہ گویا سب عبدالمطلب سے یہی کہنا چاہتے تھے۔

مجلس کا یہ رنگ کچھ ہی دیر تک قائم رہ سکا تھا کہ جناب عبدالمطلبؑ نے پورے اطمینان اور قوت قلب کے ساتھ ایک مختصر جملہ میں اسے ایکدم سے دگرگوں کر کے انھیں ایک نئی فکر میں مبتلا کر دیا۔ سردار قریش نے فرمایا۔ مجھے دوسروں کے مال سے کیا سروکار — میں تو اونٹوں کا مالک ہوں اور ان ہی کے متعلق تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ جس گھر کو تم خراب کرنا چاہتے ہو اس کا بھی ایک مالک ہے جو تمہیں خود ہی اسے خراب کرنے سے روک دیگا۔

انا رب الابل وللبیت رب یمنعه لست اماهته فی شیٔ

یہ جملہ کچھ اس قدر استقلال کے ساتھ ادا کیا گیا تھا کہ بہت سے طنز کرنے والوں کے دلوں کے اندر تک اتر کر گیا۔ خود ابرھہ — بھی کبر و غرور کے باوجود اپنے دل کی سرزنش کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا لیکن اپنی کمزوری کا اظہار کئے بغیر فوراً کہنے لگا۔ "کعبہ میری صولت و سطوت کے مقابلے میں ٹک نہ سکے گا۔" عبدالمطلبؑ نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور فقط اتنا فرمایا "تم جانو اور کعبہ و کعبہ کا مالک جانے" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گئے اور اپنے اونٹوں کی رہائی کا پروانہ لیکر ابرھہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

تمام اہل مکہ عبدالمطلبؑ کے فرمان کے مطابق اطراف کے پہاڑوں پر چلے گئے۔ اور وہ خود اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کعبہ میں تشریف لائے کچھ دعائیں پڑھیں اور زنجیر کعبہ (اور دوسری روایت کے مطابق کعبہ کے پایوں کو تھام کر) بڑے دل گداختہ انداز میں فرمانے لگے:۔

یارب لا ارجو لھم سواکا ✧ یارب فامنع منھم حماکا
ان عدو البیت من عاداکا ✧ انھم لم یقدروا قواکا

اے میرے خدا میں حبشہ کے لشکر کے مقابلے میں تیرے سوا کسی اور سے نصرت کی امید نہیں رکھتا اے میرے پروردگار تو خود ہی انھیں اپنے حرم مطہر و مقدس سے دور فرما دے۔ بلا شبہ اس گھر کے دشمن تیرے دشمن ہیں۔ یہ لوگ یقیناً تیرے قہر و غلبہ کی تاب نہیں لا سکتے اور ضرور فنا ہو جائیں گے۔

یہ فرمایا اور وہاں سے کوہ حرئی یا کوہ ابوقبیس کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے کہ ابرھہ خانۂ کعبہ کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اور خدائے کعبہ ابرھہ کے ساتھ کیسے پیش آتا ہے۔

دوسرے روز سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ابرھہ کا لشکر خانۂ کعبہ کے نزدیک پہنچ چکا تھا، اس عظیم لشکر کی حرکت نے مکہ کی فضا کو غبار آلود بنا رکھا تھا۔ اس لشکر کا سب سے زبردست ہاتھی جس کا نام "محمود" تھا، خانۂ کعبہ کے پاس جا کر رک گیا، وہ فیلبان کی تمام کوششوں کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ جیسے میخ کی طرح اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہوں۔ لوگ اسے آگے سے کھینچتے اور پیچھے سے ڈھکیلتے تھے لیکن وہ کسی چٹان کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ حیرت یہ ہے کہ جب اس کا رخ دوسری جانب موڑ دیا جاتا تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ بالآخر سرداروں نے دوسرے ہاتھیوں کو بھی آزمایا لیکن سب نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جیسے سب کسی غیبی حکم کی اطاعت کر رہے تھے۔

جب لشکر کے سردار اس طرف سے مایوس ہو گئے تو بیلچوں اور کلہاڑوں وغیرہ کے ذریعہ خانۂ کعبہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ یہ لوگ خدا کے گھر پر حملہ کرنے ہی والے تھے کہ اچانک اجنبی و نامانوس پرندوں کے ایک منظم و مرتب غول نے پورے لشکر کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ یہ پرندے آسمان پر اس قدر چھائے ہوئے تھے کہ ان کا سرا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ لشکر کی آنکھیں اس وقت حیرت سے پھٹی رہ گئیں جب پرندے ایک دم نزدیک آ گئے اور لوگوں نے دیکھا کہ سب کے سب اپنی اپنی منقاروں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں لئے ہوئے ہیں اور بعض تاریخوں کے مطابق اپنے پنجوں میں بھی کنکریاں اٹھائے ہوئے ہیں۔ لگتا تھا کہ یہ پرندے کسی اہم کام پر مامور کئے گئے ہیں۔ یک بیک یہ سارے پرندے ایک غیبی فرمان کے تحت ایک تربیت یافتہ فوج کے مانند ٹھیک ابرھہ کے لشکر کے سر پر آ کر تک گئے۔

معتبر تاریخوں اور بے شمار روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ یہ پرندے بالکل آجکل کے جدید ترین بمبار طیاروں کی طرح ہر شخص کے سر پر سنگریزے گراتے تھے جو ان کے سروں میں در آتے اور ان کی سواریوں کے شکم کے نیچے سے برآمد ہوتے تھے۔ گویا پرندوں نے پورے لشکر پر بمباری کر دی کسی بھی تاریخ یا روایت میں نہیں ملتا کہ کسی ایک پرندہ نے اپنے نشانہ سے خطا کی ہو اور پتھر کسی اور جگہ گرا دیا ہو۔

اس طرح خانۂ کعبہ کا مالک (خدا) ایک مختصر اور بے حقیقت مخلوق یعنی پرندوں کے ذریعہ جو چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے مسلح تھے ایک لشکر جرار سے نبرد آزما ہوا جو اس وقت کے بہترین حربوں (کوہ پیکر ہاتھیوں) سے لیس تھا۔ اور شاید ایک منٹ سے بھی کم وقفہ میں پرندوں نے سنگباری کر کے لشکر مخالف کو خاک میں ملا دیا۔ ہر پرندہ ایک شخص پر موکل تھا اور گویا پورے طور سے اپنے کام کو سمجھ کے انجام دے رہا تھا۔

تاریخوں میں ہے کہ جو پرندہ ابرہہ (یا کسی اور شخص) پر مامور تھا۔ اس نے اسے میدان میں اپنا نشانہ نہیں بنایا۔ بلکہ ابرہہ میدان سے بھاگا اور ہزاروں مصیبتیں برداشت کرتا ہوا نجاشی کے دربار میں پہنچا۔ ابھی وہ اس عجیب و غریب واقعہ کو بیان کر رہا تھا کہ اچانک اس نے ویسے ہی ایک پرندہ کو اپنے سر پر موجود پایا۔ اس نے نجاشی کو وہ پرندہ دکھایا اور ابھی اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ اس پرندہ کی کنکری کا نشانہ بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن گیا۔ بعض تاریخوں نے تو عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ ہر سنگریزہ پر مقتول کا نام لکھا ہوا تھا[1]۔

یہ واقعہ اپنی صحت و واقعیت کے اعتبار سے تاریخ عالم خصوصاً تاریخ اسلام کے مسلمات میں سے ہے اور اس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ اہل عرب نے اس سال کو عام الفیل کے نام سے موسوم کیا اور پیغمبرؐ اسلام کی ہجرت

[1] بعض تاریخوں میں یہ لکھا ہے کہ پرندوں کی سنگباری کے بعد کچھ تو فوراً مر گئے اور بقیہ لشکر تتر بتر ہو گیا۔ کچھ راستے میں بھاگتے ہوئے تلف ہوئے اور بہت سے افراد مختلف امراض کا شکار ہوئے۔ یہاں تک کہ ام المومنین عائشہ سے بھی روایت موجود ہے کہ میں نے خود ایسے دو آدمیوں سے ملاقات کی جو اس واقعہ میں شریک تھے اور اندھے ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے اس واقعہ کے جزئیات معلوم کئے لیکن صاحب مجمع البیان نے امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ وہیں تمام لشکر تلف ہو گیا تھا۔ فقط ایک شخص فرار کرنے میں کامیاب ہوا اور جب وہ اس واقعہ کو نجاشی سے نقل کر رہا تھا اسی وقت ایک پرندہ وہاں پہنچا اور وہ اسی کے سنگریزہ کا شکار ہو گیا۔

تک اسے مبداء تاریخ قرار دیتے رہے۔ اس وقت کے عربی ادبیات میں اس واقعہ سے متعلق ہزاروں شعری و نثری شاہکار موجود ہیں۔ لغت نامۂ دہخدا کے مطابق، مستشرقین شروع میں اس قضیہ کو خالص عرب داستانوں میں سے ایک داستان تصور کرتے تھے لیکن بعد میں یونانی ماخذ میں بھی یہ واقعہ دریافت ہوا ہے۔

اس واقعہ کی صحت کے بے شمار دلائل میں سے ایک اہم دلیل یہ ہے کہ آغاز اسلام میں کفار مکہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے تھے کہ پیغمبر کے کسی بھی آسمانی پیغام کی گرفت کریں اور ان کا مذاق اڑائیں لیکن جب یہ عجیب و غریب سورہ پیغمبر پر نازل ہوا تو کسی میں بھی اس واقعہ کے انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ اگر اس سورہ سے متعلق واقعہ میں جھوٹ کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تو کفار پوری قاطعیت کے ساتھ قرآن پر اعتراضات کی بوچھار کر دیتے لیکن کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ ایک شخص نے بھی اس واقعہ سے متعلق شبہ کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ اس سورہ کے نزول کے روز بھی کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو نہ صرف اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے، بلکہ اس واقعہ کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اور اپنے مشاہدات کو لوگوں سے بیان کیا کرتے تھے۔

بعض تاریخوں میں ملتا ہے کہ پرندوں کے گرائے ہوئے کچھ سنگریزے ظہور اسلام کے بعد تک بعض لوگوں کے پاس موجود تھے۔ یہاں تک مخالف (یہود و نصاریٰ کی) تاریخوں نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے جبکہ اس کا اظہار ان کے حق میں نہ تھا۔ ہاں انہوں نے اتنا کیا ہے کہ اسے ایک عادی اور فطری واقعہ کا رنگ دیکر بیان کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ لشکر کے انہدام کو کسی متعدی مرض کا شکار بتائیں۔ لیکن قارئین کرام کو آئندہ تحریر سے معلوم ہو جائے گا در اصل یہ واقعہ معجزہ یا خرق عادت ہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

واقعۂ فیل کا جائزہ۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے قرآن حکیم، اسلامی مؤرخین کے فیصلوں اور مکہ کے طرفدار افراد کی باتوں سے قطع نظر کرتے ہیں کیونکہ یہ سب اس واقعہ کے معجزہ یا خارق عادت ہونے کے دعویدار ہیں۔

صرف عمومی تاریخ کے تجزیہ سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ واقعہ کسی طرح بھی فطری و عادی نہیں اور نہ ظاہری اسباب و علل کے ذریعہ اس کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جب ہم مادی افکار اور فطری و طبیعی اسباب و علل کے تحت اس پورے واقعہ پر غور کریں، تو یہ بات کسی طرح بھی گلے سے نہیں اترتی کہ

اتنے سارے پرندے ملا کسی مقصد کے ایک ساتھ جمع ہو جائیں اور سب کے سب ایک ساتھ تین تین کنکریاں اٹھائے ہوں اور جیسے سب ہم قول و قرار ہو کر ایک مخصوص جانب سے آتے ہوں اور ایک انبوہ کثیر کے اوپر آکر ٹک جائیں۔ اتنا بڑا اور عظیم لشکر جس کے صرف شخص کی آواز سے مانوس ترین پرندے بھی اڑ جائیں چہ جائیکہ سواروں کے نعرے، گھوڑوں کا ہنہنانا، کوہ پیکر ہاتھیوں کی چنگھاڑ، گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور اور کان پھاڑنے والی چیخ پکار کے باوجود یہ پرندے بغیر کسی خوف و ہراس کے پورے اطمینان اور بڑی باریک بینی کے ساتھ اپنے ہدف کو نشانہ بنائیں اور اپنا کام انجام دینے کے بعد ایک ساتھ ہی واپس چلے جائیں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ آخر ایک مختصر سا سنگریزہ جو تھوڑی سی بلندی سے نیچے آرہا تھا کس قدر قوی تھا کہ ایک پورے انسان کو اسی جگہ صاف کر جاتا تھا اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس کا مارا ہوا حیوانوں کے چبائے ہوئے بھوسے کی مانند (عصف ماکول) ہو جاتا تھا۔ آخر ان سنگریزوں میں کیا قوت تھی جو سروں پر پڑتے اور گوشت، پوست اور ہڈیوں کو پھاڑتے ہوئے گھوڑوں یا سواریوں کے پیٹ کے نیچے سے برآمد ہوتے تھے۔

اگر در حقیقت یہ ایک حادثہ ہی تھا تو کوئی کنکری اہل مکہ میں سے کسی شخص پر کیوں نہ گری؟ آخر پرندوں نے آتے ہوئے یا جاتے ہوئے ہی کسی شخص پر کوئی کنکر کیوں نہ گرا دیا؟ آخر یہ پرندے کسی دوسرے شہر کی طرف کیوں نہیں گئے؟ اسی طرف کیوں آئے۔ کسی دوسری جگہ کیوں دکھائی نہیں دیتے؟ اگر اس طرح کی کوئی ایک بات ہی ہوئی تھی تو کسی ایک بھی مورخ نے اسے ذکر کیوں نہیں کیا؟ آخر کیوں، کیوں؟

کیا اب ہمیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ ان مسلمانوں کی کوتاہ فکری کا ماتم کریں جو مادی افکار کے زیر اثر ہر چیز کا رشتہ ماورائے طبیعت سے توڑ کر ہر فعل کو صرف طبیعت کے آئینہ میں دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ بیک ورڈ یا پسماندہ نہ قرار دیدیئے جائیں اور جہالت کا لبادہ اوڑھ کر ان گنتی کے مؤرخوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں جنھوں نے اپنے دین و قوم کی آبرو بچانے کے لئے اس آسمانی اثر یا اعجاز کی توجیہ آبلہ، یا وبا کے امراض کی شکل میں کی ہے اور قرآن کے بیان کردہ پرندوں کو مرض کے جراثیم کا نام دیا ہے۔

کیا یہ بات باور کرنے کے قابل ہے کہ یہ مرض صرف ایک روز کے لئے وہ بھی ایک مخصوص گروہ کے لئے ظاہر ہو اور اہل مکہ میں سے کسی ایک شخص پر اثر انداز نہ ہو۔ آسمان سے بارش کی شکل میں ایک ہی جگہ نازل ہو اور وہیں ختم بھی ہو جائے۔ اور اگر کوئی مرض ایسی کیفیت و خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہو تو وہ بھی

علی التحقیق خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی، معجزہ اور خرق عادت شمار کیا جائے گا۔
اور صرف اس کا سہارا لیتے ہوئے کہ نپولین نے بھی جب ماسکو کا محاصرہ کیا تھا تو ایک وبائی مرض کا شکار ہو گیا تھا یا جب عکا کا محاصرہ کئے ہوئے تھا تو عموماً فوج میں متعدی امراض پھیل گئے تھے مجبوراً اس نے محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ "اصحاب فیل" کے واقعہ میں پائے جانے والے سیکڑوں حساس نکات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ نپولین کے دونوں جگہ، "ماسکو" و "عکا" کے محاصرے کے موقع پر ان شہروں میں بھی وہ امراض موجود تھے لیکن یہاں تو صرف ابرھہ کا لشکر ان امراض کا شکار ہوا تھا۔
آخر میں ہم قارئین کرام سے درخواست کرتے ہیں کہ اس تحریر کے مطالعہ کے بعد ایک بار غور سے اس سورۂ مبارکہ کی تلاوت ضرور فرمائیں۔[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل الم یجعل کیدھم فی تضلیل وارسل علیھم طیراً ابابیل ترمیھم بحجارۃ من سجیل فجعلھم کعصف ماکول۔

[1] اس مقالہ کے لئے حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:
تاریخ حبیب السیر، ناسخ التواریخ، سیرۃ ابن ہشام، قصص قرآن، تفسیر المیزان، تفسیر مجمع البیان، تفسیر برہان، مقدمہ تفسیر البیان، دائرۃ المعارف فرید وجدی، لغت نامۂ دھخدا۔

جناب سید علی خامنہ ای
ترجمہ :- جناب سید علی الحسن رضوی

آخری قسط

ہمارے ائمہ اور سیاسی جدوجہد

امام موسیٰ کاظمؑ کا عہد :

امام موسیٰ ابن جعفرؑ کی زندگی کا مکمل طور پر جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی زندگی غیر معمولی واقعات و حادثات سے پر ہے اور میری نظر میں ائمہ علیہم السلام کی سرپرستی میں جاری سیاسی تحریک آپ کے دور میں پورے اوج پر نظر آتی ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت کی زندگی سے متعلق صحیح اور واضح معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ کہیں کہیں حضرت کی زندگی میں ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو قاری کو مبہوت کر دیتی ہیں مثال کے طور پر بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کچھ دنوں تک عمال حکومت کی نظروں سے چھپ کر مخفیانہ زندگی بسر کرتے ہیں ہارون کی پوری مشینری آپ کی تلاش میں رہتی ہے مگر آپ کا پتہ حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے خلیفہ بعض افراد کو پکڑتا ہے اور شکنجوں میں کس کر سوال کرتا ہے کہ موسیٰ ابن جعفرؑ کہاں ہیں؟ اور یہ ائمہ کی زندگی میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔ منجملہ اس کے ابن شہر آشوب مناقب میں ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ جس سے اسی قسم کا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے :-

"دخل موسیٰ بن جعفر بعض قری الشام متنکراً هاربا"

کسی بھی امام کے بارہ میں اس طرح کی چیز نہیں ملتی۔ اس سے امام علیہ السلام کی زندگی میں پائے جانے والے تحرک کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کو دیکھنے سے آپ کی اس حالت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو حبس دوام کی صورت میں حضرت کو جھیلنی پڑی ہے ورنہ شروع میں جب ہارون تخت خلافت پر بیٹھتا ہے اور مدینہ کا سفر اختیار کرتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے سنا ہوگا، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ اس کا انداز نہایت

ہی لطف و نوازش کا نظر آتا ہے۔ اس وقت اس نے آپ کا بہت احترام کیا ہے چنانچہ یہ داستان جو مامون سے نقل کی گئی ہے بہت مشہور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت ایک دراز گوش (گدھے) پر سوار تشریف لائے اور اس مقام پر جہاں ہارون کا پڑاو تھا، پہونچے۔ آپ نے بہت چاہا کہ سواری سے اتر جائیں لیکن ہارون نے آپ کو ایسا کرنے نہیں دیا اور قسم دی کہ آپ کو میری جائے نشست تک یونہی سوار ہو کر چلنا ہوگا۔ چنانچہ آپ اسی طرح سوار وہاں تک پہونچے۔ سب نے حضرت کا احترام کیا اور باہمی گفتگو ہوئی جب آنحضرت تشریف لے جانے لگے تو ہارون نے مجھ سے اور امین سے کہا کہ ابوالحسن کی رکاب پکڑ لو ..... ایک دلچسپ بات جو اس روایت میں مامون بیان کرتا ہے وہ یہ کہ: میرے باپ ہارون نے تمام لوگوں کو پانچ ہزار دینار اور دس ہزار دینار (یا درہم) عطیہ و بخشش کے طور پر دئے اور موسیٰ ابن جعفر کو دو سو دینار دئے حالانکہ جب ہارون نے حضرت سے احوال پرسی کی تھی تو حضرت نے اپنی سخت پریشانی اور مالی بدحالی کے ساتھ کثرت عیال کا تذکرہ کیا تھا (اب یہ باتیں امام کی زبان سے نہایت ہی دلچسپ اور پر معنیٰ معلوم ہوتی ہیں خود میں نے اور ان لوگوں نے بھی جنھوں نے شاہی دور میں سیاسی سرگرمیوں میں تقیہ کا مزہ چکھا ہے۔ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔ انہیں بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام علیہ السلام کا ہارون جیسے شخص کے سامنے اس طرح اپنی پریشان حالی کا ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ امام کیوں کہتے ہیں کہ میری حالت اچھی نہیں ہے زندگی گذارنا مشکل ہے؟ اس طرح کی باتیں ہرگز ذلت و حقارت کی نشان دہی نہیں کرتیں ہم اور آپ جانتے ہیں کہ جابر و ظالم طاغوتی دور میں جان بوجھ کر ہم لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ انسان اس قسم کی سختیوں کے دور میں دشمن کو اپنی طرف سے غافل و لاپرواہ بنانے کے لئے اس طرح کی باتیں کیا کرتا ہے)

بہرحال اصولی طور پر امام کی اس طرح کی باتوں کے بعد ہارون کو امام علیہ السلام کے لئے کسی بڑی رقم مثلاً پچاس ہزار درہم (یا دینار) کی پیشکش کرنی چاہئے تھی لیکن صرف دو سو دینار دیتا ہے۔ مامون کہتا ہے میں نے اپنے باپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: جو رقم مجھے ان کو دینی چاہئے تھی اگر دیدوں تو مجھے اطمینان نہیں ہے کہ چند دنوں بعد وہ اپنے دوستوں اور شیعوں میں سے ایک لاکھ شمشیر زن میرے خلاف کھڑے نہ کر دیں گے۔ یہ ہارون کا تاثر اور خیال ہے اور میری نظر میں ہارون نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔

بعض لوگ اس تاثر کو سخن چینی پر محمول کرتے ہیں لیکن یہی حقیقت واقعہ ہے وہ زمانہ جبکہ امام علیہ السلام ہارون سے مدمقابل تھے اگر واقعی طور پر امام کے پاس دولت ہوتی تو ایسے بہت سے لوگ تھے جو آپ کی مدد پر

آمادہ تھے اور حضرت کے دوش بدوش تلوار لے کر کھڑے ہوجاتے چنانچہ اس طرح کے نمونہ ائمہ علیہم السلام کے یہاں تو نہیں البتہ دوسرے امام زادوں کے بارہ میں ملتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں امام علیہ السلام یقیناً اپنے گرد زیادہ افراد اکٹھا کر سکتے تھے ــــ لہٰذا امامؑ کا زمانہ اوج کا دور کہا جا سکتا ہے جو آپ کی عمر قید پر منتہی ہوتا ہے

امام رضا علیہ السلام کا دور

جب بات امام رضا علیہ السلام تک پہونچتی ہے حالات دوبارہ بہتر ہوجاتے ہیں امامؑ کو نسبتاً سکون کے ساتھ تبلیغ و اشاعت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے ہر طرف شیعہ پھیلتے نظر آتے ہیں امکانات میں بھی اتنی فراوانی پیدا ہوجاتی ہے کہ مسئلہ امامؑ کی ولی عہدی پر جاکر منتہی ہوتا ہے اگرچہ جتنک ہارون بقید حیات رہا امام ہشتمؑ کو بھی خاموشی اور تقیہ کی زندگی بسر کرنی پڑی پھر بھی آپ کی جدوجہد اور سیاسی مہم جاری رہتی ہے اسلامی تحریک اور تبلیغ و ابلاغ میں خلل پیدا نہیں ہوسکا گو کہ یہ سارے کام مکمل احتیاط کے ساتھ خفیہ طور پر انجام پاتے ہیں ــــ انسان سمجھ سکتا ہے مثال کے طور پر دعبل خزاعی کا حضرتؑ کی ولی عہدی کے دوران ان الفاظ میں مدح سرائی کرنا ظاہر ہے یہ چیز یکایک زمین سے نہیں برآمد ہوگئی تھی ــ وہ معاشرہ جس میں دعبل خزاعی جیسی شخصیت پرورش پا رہی ہو اور ابراہیم ابن عباس جو حضرت کے مداحوں میں سے ہیں یا اسی قسم کے دوسرے کئی افراد جہاں موجود ہوں اس کی ثقافت و معاشرت میں خاندان رسول کے ساتھ محبت و ارادت کا عنصر موجود ہونا ایک بدیہی سی بات ہے ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی بنیاد کے دفعتاً مدینہ، خراسان، اور نیز دیگر دور دراز علاقوں میں لوگ امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا جشن منانے لگتے ہیں سوائے اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ پہلے سے اس طرح کے نقوش مرتب ہو رہے تھے ۔ وہ حالات و واقعات جو امام علیہ السلام کی ولی عہدی کے دوران پیش آتے ہیں (بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور سال گذشتہ اپنے پیغام میں اس کے اسباب و علل کی طرف ایک اشارہ کرچکا ہوں) ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت کی ولی عہدی کے دوران عوام کے جوش و جذبات اہلبیتؑ کی محبت و عقیدت کے سلسلہ میں بڑی اونچی سطح پر پہونچ چکے تھے ۔ بہرحال بعد میں امین اور مامون کے درمیان شدید اختلاف کی وجہ سے بغداد و خراسان کے درمیان پانچ سال تک جنگ و جدال کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور یہ چیز امام رضا علیہ السلام کے لئے اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ولی عہدی کے ساتھ اپنی انتہا کو پہونچ

جاتا ہے افسوس بس اس بات کا ہے کہ یہاں بھی امامؑ کی شہادت کی وجہ سے رشتۂ رشد و ہدایت قطع ہو جاتا ہے اور ایک بار پھر ایک نئے دور سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو اہلبیتؑ کے لئے جانفشانی اور غم و آلام کا دور کہا جا سکتا ہے۔ میری نظر میں امام جوادؑ علیہ السلام اور آپ کے بعد کا دور اہلبیت علیہم السلام کے لئے ہمیشہ سے زیادہ بدتر دور رہا ہے اور اس میں ان حضرات کو سب سے زیادہ محنت و جانفشانی کرنی پڑی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی کا مجموعی خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ میں اپنی بحث کو دو حصوں میں منقسم کر رہا ہوں جس کا ایک حصہ یہی مجموعی سیاسی خاکہ تھا جو اس منزل پر تمام ہو جاتا ہے اب رہی دوسرے حصہ کی بات جو ائمہ علیہم السلام کی اس سیاسی جدوجہد کے نمود و اثرات سے متعلق ہے اس وقت شاید اس سلسلہ میں تفصیلی بحث نہ ہو سکے (کیونکہ اب اس سے زیادہ آپ لوگوں کو زحمت دینا مقصود نہیں ہے) لیکن وہ چیز جو میں نے محسوس کی ہے اور ادھر وقت نکال کر دو ایک روز اس پر کام کر سکا ہوں محض عنوان کے طور پر یہاں ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ ذہن میں رہے کہ تمام قابل بحث عنوانات میں نہیں پیش کر رہا ہوں بلکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے نمونہ کے طور پر صرف چند عنوانات حاضر خدمت ہیں۔

ائمہ کی سیاسی جدوجہد کے نمود و آثار:-

ان میں سے ایک مسئلہ "امامت کا ادعا اور اس کی طرف دعوت" ہے جو ائمہ کی زندگی میں جگہ جگہ نظر آتا ہے، اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کا یہی بنیادی محور ہے۔ در اصل یہ ایک مبسوط فصل ہے جس کے ذیل میں مختلف ابواب کے تحت روایات موجود ہیں منجملہ اس کے کافی کی روایت: "الائمۃ نور اللہ ...." امامت کی معرفی کے ذیل میں امام ہشتمؑ کی روایت، نیز صادق اہلبیت طہارتؑ سے مروی مختلف روایات اور طرح طرح کے مخالفین سے آپ کے اصحاب کے مجادلے اس کے علاوہ اہل عراق کو دعوت دیتے ہوئے امام حسینؑ کی زندگی سے متعلق روایات غرضیکہ اس موضوع پر بہت سی روایتیں موجود ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ کی کوششوں اور دعوؤں سے خلفائے وقت کیا سمجھتے تھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عبد الملک بن مروان کے زمانہ سے لے کر متوکل عباسی کے دور تک مسلسل طور پر ائمہ کے مقاصد اور منصوبوں کے سلسلہ میں ایک ہی فکر و خیال پایا جاتا ہے۔ ہمیشہ خلفاء اور ان کے عمال و کارندے ائمہ علیہم السلام کو

ایک ہی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور قہری طور پر ائمہ کے بارہ میں ان کی طرف سے ایک ہی انداز کا فیصلہ صادر ہوتا رہا ہے۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور با آسانی اس سے عبور نہیں کیا جا سکتا ۔ ائمہ کے سلسلہ میں ان کا ایک ہی نظریہ کیوں ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مثال کے طور پر امام ہفتم موسیٰ ابن جعفرؑ کے سلسلہ میں یہ کہا جانا کہ "خلیفتان یجبی الیہما الخراج". . . . . یا امام ہشتم علی رضا علیہ السلام کے لئے یہ جملہ: ھذا علی ابنہ قد قعد و ادّعی الامر لنفسہ . . . . یا دیگر ائمہؑ کے بارہ میں اسی قسم کے جملے اس بات کی واضح نشان دہی کرتے ہیں کہ خلفائے وقت اور ان کے رفقائے کار ائمہ کی زندگی سے کس قسم کے دعووں کا استنباط کرتے تھے۔ یہ نہایت ہی قابل توجہ اور اہم ترین نکتہ ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ خلفائے وقت کا اپنی امامت پر اصرار اور شیعیان آل محمدؐ کا اس امر کی نزاکت کے پیش نظر مسلسل اس کی مخالفت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ جس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: کثیر جو دور بنوامیہ کے پہلے دور کے صف اول کے شعراء (یعنی فرزدق، جریر، اخطل، جمیل اور نصیب وغیرہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے، شیعہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کے عقیدتمندوں میں سے ہے ایک دن امام پنجم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، امام علیہ السلام شکایت کے لہجہ میں اس سے سوال کرتے ہیں: امتدحت عبد الملک؟! میں نے سنا ہے کہ تم نے عبدالملک کی مدح سرائی کی ہے؟! وہ ایک دم گھبرا کر امام سے عرض کرتا ہے: یابن رسول اللہ ما قلت لہ "یا امام الهدیٰ" اے فرزند رسولؐ میں نے اس کو امام ھدیٰ تو نہیں کہا ہے" وانما قلت لہ اسد والاسد کلب دیا شمس والشمس جماد دیا بحر والبحر موات . . . . " ہاں میں نے اس کو شیر، سورج، سمندر، پہاڑ اور اژدھا جیسے خطابات سے ضرور نوازا ہے اور کسی کے لئے درندہ ہونا یا جماد سے قرار دیا جانا وغیرہ کوئی فضیلت کی بات تو نہیں ہے۔ اس طرح امامؑ کے سامنے کثیر اپنے عمل کی توجیہ پیش کرتا ہے کہ امام کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور تب شاعر آل محمد کمیت اسدی اٹھتا ہے اور اپنا وہ "قصیدہ ہاشمیہ" سناتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

من لقلب متیم مستہام ؛ غیر ماصبوۃ و لا احلام

یہاں تک کہ وہ اس شعر پر پہونچتا ہے:

ساسة لا کمن یری رعیتہ الناس ÷ سواء و رعیة الانعام

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام عبدالملک جیسے کی مدح کے سلسلہ میں کتنے حساس تھے اور دوسری طرف کثیر کے شل آپ کے دوستوں کی حمایت" امام الھدیٰ" پر مرکوز تھی جبھی تو وہ فوراً کہتا ہے کہ مولا! میں نے عبدالملک کو امام الھدیٰ نہیں کہا ہے — اور یہی واقعہ اس بات کی بھی صاف نشان دہی کرتا ہے کہ خلفائے وقت کو اپنے امام الھدیٰ کہے جانے کی کتنی تمنا تھی۔ چنانچہ بنو عباس کے یہاں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لیتا ہے — مروان ابن ابی حفصہ اموی جسکو بنو امیہ اور بنو عباس دونوں درباروں کی غلامی اور مداحی کا فخر حاصل ہے (جی ہاں! یہی تو عجیب چیز ہے یہ شخص بنو امیہ کے زمانہ میں درباری شاعر تھا اور جب بنو عباس برسر اقتدار آئے تو ان کا بھی درباری شاعر بن گیا!! چونکہ اس کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی لہٰذا بنو عباس نے بھی اس کو پیسوں کے ذریعہ خرید لیا) چنانچہ جب یہ بنو عباس کی مدح سرائی پر کمر باندھتا ہے تو یہ ان کی شجاعت و کرم جیسی عامیانہ مدح پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کی پیغمبر اسلام کے ساتھ قرابت داری کی بنیاد پر انہیں اس مقام و مرتبہ تک پہونچا دیتا ہے جس کے وہ دیرینہ متمنی تھے اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:۔

انی یکون ولیس ذاک بکائن ÷ لبنی البنات وراثة الاعمام

یعنی یہ چیز کیسے ممکن ہے کہ دختر زادے چچا کی میراث کے حقدار بن جائیں؟ کیا کہنا! پیغمبر کے چچا عباس کی میراث نہیں معلوم یہ دختر زادے (اولاد فاطمہؑ) کیوں ہڑپ کر لینا چاہتے ہیں!!

آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ سارا جھگڑا، حق خلافت کے مسئلہ پر ہے اور حقیقتاً یہی سیاسی و ثقافتی جنگ رہی ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں مشہور و معروف شیعہ طائی شاعر، جعفر بن عفان کہتا ہے:۔

لم لا یکون؟ وان ذاک لکائن ÷ لبنی البنات وراثة الاعمام

للبنت نصف کامل من مالہ ÷ والعم متروک بغیر سھام

یعنی بیٹی اپنے باپ کی نصف مال کی وارث ہوتی ہے اور بیٹی کی موجودگی میں چچا کا مرنے والے کے ترکہ میں کچھ بھی حق نہیں ہوتا لہٰذا میراث میں تمہارا حق ہی کیا ہے جو طلب کر رہے ہو۔

اس واقعہ سے بھی امامت کے مسئلہ میں شیعیان آل محمدؐ کی حمایت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مسئلہ ائمہ علیہم السلام کی طرف سے خونین جدوجہد کی تائید و حمایت ہے۔

جس کا شمار ائمہ کی زندگی سے متعلق گرماگرم بحثوں میں ہوتا ہے اور ائمہ کی اسی سیاسی جدوجہد کی پالیسی کی حکایت کرتا ہے۔ مثلاً معلی بن خنیس جس وقت داؤد بن علی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں اس وقت کے امام جعفر صادق ؑ کے تاثرات و اظہارات ملاحظہ فرمائیں یا اسی طرح جناب زید شہید، سید الشہداء امام حسین علیہ السلام، شہید فخ نیز بعض دوسرے حضرات کے سلسلہ میں امام علیہ السلام کے ارشادات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے "نور الثقلین" میں ایک عجیب و غریب روایت دیکھی ــــ یہ روایت علی ابن عقبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:۔

ان ابی قال دخلت انا والمعلی علی ابی عبد اللہ (ع) فقال (ع): ابشروا انتم علی احدی الحسنیین. شفی اللہ صدورکم، واذھب غیظ قلوبکم، وانالکم من عدوکم، وھو قول اللہ تعالی: ویشف صدور قوم مؤمنین، وان مضیتم قبل ان یروا ذلک مضیتم علی دین اللہ الذی رضیہ لنبیہ (ص) ولعلی (ع)"

میں اور معلی ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت ؑ نے فرمایا: تم لوگوں کو بشارت ہو کہ دو میں سے ایک نیک ترین انجام (کامیابی یا شہادت) تمہارا منتظر ہے خداوند عالم نے تمہارے سینوں کو شفا عطا کیا (یا کرے) اور تمہارے دلوں کے غیظ و غضب ٹھنڈے کردئے (یا کرے) اور تم کو دشمنوں پر مسلط کر دیا (یا کرے) اور یہی وہ وعدۂ الٰہی ہے جو خدا نے (مومنین سے) کیا ہے "و یشف صدور قوم مومنین" قبل اس کے کہ یہ کامیابی تمہارے قدم چومے اگر تم دنیا سے رخصت ہو جاتے (یا رخصت ہو جاؤ) تو تمہاری قربانی خدا کے اس دین کے لئے ہے (یا ہوگی) جس کو پروردگار نے اپنے نبی (محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور علی (علیہ السلام) کے لئے پسند فرمایا ہے۔

یہ روایت اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جہاد و مبارزہ، کامیابی و کامرانی اور قتل کرنے اور قتل کر دئے جانے کے سلسلہ میں بات کی گئی ہے۔ بالخصوص اسمیں معلی بن خنیس مخاطب ہیں جن کے واقعہ سے ہم سب واقف ہیں۔ امام علیہ السلام بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے بات شروع کر دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ امام ؑ کسی خاص چیز یا حادثہ سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جبکہ کسی کو حادثہ کا علم نہیں ہے۔ ممکن ہے "شفی اللہ صدورکم" تا آخر کی عبارت امام علیہ السلام نے دعا کے طور پر

ارشاد فرمائی ہو اور زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ امام کسی پیش آئے ہوئے واقعہ کی خبر دے رہے ہوں تو آیا یہ دونوں حضرات کسی مہم سے واپس آئے ہوئے تھے جس کی حضرت کو خبر تھی یا ہو سکتا ہے کہ خود امامؑ نے ان کو اس مہم پر مامور کیا ہو ؟!

کچھ بھی ہو حدیث کا لب و لہجہ ان میں سے ہر دو معنی و احتمال کی بنیاد پر واضح طور پر بتاتا ہے کہ امام علیہ السلام اس تیز و تند اور مخاصمت آمیز طریقۂ کار کے حامی تھے جو معلی بن خنیس کی روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے اور یہ چیز بھی توجہ کے قابل ہے کہ معلی امام صادقؑ کے "باب" ہیں اور یہ "باب" کی تعبیر خود اپنی جگہ پر ایک مستقل فکر و تحقیق کا موضوع ہے۔

وہ حضرات جو روایات میں ائمہ علیہم السلام کے "باب" کے طور پر پیش کئے گئے کون لوگ ہیں ؟ جبکہ ان میں سے زیادہ تعداد ان کی ہے جو یا تو مقتول ہیں یا جن کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے ؟ مثال کے طور پر یحییٰ بن ام الطویل، معلی بن خنیس، جابر بن یزید جعفی ...... وغیرہ۔

ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے متعلق ایک اور بحث ان کا قید خانوں میں رکھا جانا، گھر سے دربدر کیا جانا اور انہیں زیر نظر رکھا جانا بھی ہے اور میری نظر میں یہ موضوع بہت زیادہ تحقیق و تدقیق کا طالب ہے کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سے مطالب تحقیق و دقت نظر کے محتاج ہیں اور دامن وقت میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ بحث کر سکوں۔

ایک اور مسئلہ خلفا کے مقابلہ میں ائمہ علیہم السلام کا بے خوف و خطر صاف و صریح اور بے باک رویہ ہے اور اس بحث کے ذیل میں قابل غور و فکر نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ حضرات بھی معاذ اللہ دبو، مفاہمت پسند اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والے ہوتے تو اپنے دور کے دوسرے علماء و زہاد کی طرح کسی مخالفانہ لب و لہجہ کے بجائے نرم و شیریں انداز کلام کا انتخاب کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے علماء و زہاد موجود تھے جن سے خلفا، نہ صرف علاقہ و محبت بلکہ ارادت بھی رکھتے تھے۔ ہارون کہتا تھا:

كلكم يمشي رويد ۞ كلكم يطلب صيد

غير عمرو بن عبيد

یہ لوگ خلفا کو نصیحتیں بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی ان کو رلاتے بھی ہیں پھر بھی یہ حضرات خلفا کو ظالم و جابر اور طاغی و غاصب یا شیطان اور اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ذریعہ یاد کرنے سے احتراز و احتیاط

برتتے ہیں اس کے برخلاف ائمہ علیہم السلام ایسی کوئی رعایت نہیں کرتے حقائق کا برملا اظہار فرما دیتے ہیں ارباب حکومت کے ظاہری جاہ و حشم اور سطوت و ہیبت ان کی زبانیں بند نہ کر سکی۔

ایک اور بحث ائمہ علیہم السلام کے ساتھ خلفائے وقت کی معاندانہ روش ہے مثال کے طور پر امام صادقؑ اور منصور کے درمیان نیز امام کاظمؑ اور ہارون کے درمیان جو حادثات و واقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور جن میں سے دو ایک نمونے ہم نے اشارہ کے طور پر ذکر بھی کئے ہیں۔

امامت کی حکمت عملی

ایک دوسری بحث جو پورے طور پر قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہے ائمہ علیہم السلام کے بے باک دعوے ہیں جن سے امامت کی بنیادی حکمت عملی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں ائمہؑ کے ارشادات و مباحثات میں اس طرح کے دعوے اور بیانات نظر آتے ہیں جو عام انداز سے بالکل مختلف ہیں اور ایک خاص مقصد و راہ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں چنانچہ ان ہی واقعات سے امامت کی صحیح حکمت عملی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایسے ہی موارد میں سے ایک وہ موقع ہے جب حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام سے ہارون، فدک کے بارے میں گفتگو چھیڑتا ہے ـــ

ہارون امام علیہ السلام سے کہتا ہے: حد فدکاً حتی ارد ھا الیک فدک کے حدود معین کر دیجئے تاکہ ہم آپ کو واپس کر دیں۔

اس کا خیال تھا کہ اس طرح فدک کا نعرہ جو ہمیشہ تاریخ میں اہلبیت علیہم السلام کی مظلومیت کے عنوان سے دہرایا جاتا رہا ہے اس کو بے اثر بنا دے اور ذریت رسولؐ سے ان کا یہ ہتھیار چھین لے اور شاید اس طرح شیعوں کے ذہنوں میں اپنے اور غاصبین فدک کے درمیان فرق جتانا بھی مقصود رہا ہو ـــ چنانچہ حضرتؑ پہلے تو اس کی پیشکش کو رد کر دیتے ہیں اور جب اس کی طرف سے اصرار بڑھتا ہے تو امام علیہ السلام فرماتے ہیں: "لا اخذھا الا بحدودھا" اگر فدک واپس ہی کرنا ہے تو اس کی واقعی حدود کے ساتھ واپس کرو۔

ہارون قبول کر لیتا ہے تو امامؑ فدک کے حدود معین فرمانا شروع کرتے ہیں :-

"اما الحد الاول فعدن" اس کی پہلی حد، عدن ہے :

یہ گفتگو مدینہ یا بغداد میں ہو رہی ہے — امامؑ جزیرۂ عرب کی آخری سرحد عدن کو فدک کی ایک حد کے طور پر معین کر رہے ہیں -

"فتغیر وجہ الرشید وقال: ایہا :" ہارون رشید کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے : اوہ ! -

حضرت فرماتے ہیں: "والحد الثانی سمرقند" اس کی دوسری حد سمرقند ہے -

مشرق میں ہارون کی سلطنت یہیں منتہی ہوتی تھی -

"فاربد وجہہ" ہارون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں -

امامؑ فرماتے ہیں : "والحد الثالث افریقیہ" اور اسکی تیسری حد تیونس سے ملتی ہے یہ عباسی حکومت کی مغربی سرحد ہے -

"فاسود وجہہ وقال: ھیہ" ہارون کا چہرہ غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے : اچھا ؟!! امامؑ اپنی بات جاری رکھتے ہیں : "والحد الرابع سیف البحر مما یلی الجزر وارمینیہ" اور اس کی چوتھی سمت سمندر کے کناروں سے ملتی ہے جس کی پشت پر جزیرے اور ارمنستان ہیں - یہ ملک کا آخری شمالی حصہ ہے -

اب ہارون کا پارہ آخری نقطہ پر پہونچ چکا تھا کھسیاہٹ اور غصہ کے عالم میں — کہتا ہے :

"فلم یبق لنا شیٔ فتحول الی مجلسی" !! بس ہمارے لئے کیا بچا ہے اٹھئے اور میری جگہ بیٹھ جائیے - "قال موسیٰؑ : قد اعلمتک اننی ان حددتھا لن تردھا" امامؑ نے فرمایا : میں نے پہلے ہی تجھ سے کہدیا تھا کہ اگر میں نے فدک کی حدیں بیان کر دیں تو کبھی واپس نہ کرے گا -

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں : "فعند ذلک عزم علی قتلہ" یعنی یہی وہ منزل تھی جب ہارون امامؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے -

اس پوری گفتگو میں واضح ترین چیز امام علیہ السلام کا ادعا ہے وہ چیز جس کو ہارون نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قتل پر کمربستہ ہو گیا - اور اسی قبیل کے اظہارات جس سے ائمہ

علیہم السلام کے دعووں کا صاف پتہ چلتا ہے امام باقرؑ امام صادقؑ اور امام رضاؑ کی زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں جن کو اگر یکجا کر دیا جائے تو امامت کا موقف واضح طور پر سامنے آجائے۔

ائمہؑ کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں انکے اصحاب کا نظریہ:

ائمہ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور مسئلہ جس کی تحقیق اور چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ائمہ کے مقاصد ان کے طریقۂ کار اور مدعا کے سلسلہ میں ائمہ کے اصحاب کیا نظریہ رکھتے تھے۔ اس کا جائزہ لیا جائے۔ بدیہی سی بات ہے کہ ہمارے مقابلہ میں اصحاب ائمہ ان بزرگواروں سے زیادہ نزدیک بھی تھے اور ان کے مقصد و مدعا سے زیادہ واقف و آگاہ بھی تھے تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے کیا تاثرات تھے اور وہ اس کی کیا تفسیر کرتے تھے؟ کیا روایات سے اس نکتہ کی وضاحت نہیں ہوتی کہ خود اصحاب بھی قیام و خروج کے منتظر تھے؟ خراسان کے اس شخص کی داستان سے کون ناواقف ہے جو امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ کئی لاکھ مسلح افراد وارد میدان ہونے کے سلسلہ میں آپ کے اشارہ کے منتظر ہیں۔ جب حضرت مذکورہ اعداد و شمار پر تعجب فرماتے ہیں تو وہ پے در پے اعداد میں کمی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ بات کو ختم کرتے ہوئے امامؑ اپنے اصحاب و انصار کے صفات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اگر اس طرح کے اتنے افراد (۱۲، ۱۵ یا .... افراد اختلاف روایات کے ساتھ) مجھے میسر ہوتے تو میں میدان میں آجاتا۔

اس طرح کے بہت سے افراد امام کے پاس آکر قیام کا تقاضہ کرتے رہے ہیں (روایات میں خروج کا لفظ استعمال ہوا ہے) (البتہ بعض موارد میں امامؑ سے قیام کا مطالبہ کرنے والوں میں عباسی حکومت کے جاسوس بھی ملتے ہیں جس کا اندازہ امامؑ کی جانب سے ان کو دئے جانے والے جوابات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے) آخر یہ افراد امامؑ کی خدمت میں اس قسم کا مطالبہ لے کر کیوں حاضر ہو رہے تھے؟ کیا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ اس وقت شیعوں کے درمیان حق و انصاف پر مبنی حکومت کی تاسیس کے لئے قیام و خروج ایک حتمی اور ائمہ کے مقاصد سے ہم آہنگ امر شمار ہوتا تھا چنانچہ ائمہ علیہم السلام کے اصحاب و انصار میں یہ بات مشہور تھی کہ امامؑ کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ روایت نظر سے گذری جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زرارہ ابن

اعین جیسے بلند مرتبہ صحابی بھی اس سلسلہ میں کیا نظریہ رکھتے تھے۔ رجال کشی میں روایت ہے: ایک دن زرارہ امامؑ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص اپنی تلاش میں سرگرم دشمن کے ہاتھوں سے بھاگ نکلا ہے۔ اگر "یہ امر" (حکومت کے لئے قیام) نزدیک ہو تو وہ صبر کرے تاکہ قیام کرنے والوں کے ساتھ خروج کرے اور اگر اس میں تاخیر ہو تو وہ مصالحت کرے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں: وہ وقت آئے گا۔" زرارہ سوال کرتے ہیں: کیا ایک سال کے اندر ایسا ہو گا؟ امام فرماتے ہیں: انشاء اللہ وہ وقت آئے گا" زرارہ پھر پوچھتے ہیں: کیا دو سال لگ جائیں گے؟ امام اپنا جملہ دہراتے ہیں: "انشاء اللہ وہ وقت آئے گا" اور زرارہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ دو سال تک آل علیؑ کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

یقیناً زرارہ، سادہ لوح و بے اطلاع افراد میں سے نہ تھے وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے قریب ترین اصحاب میں سے تھے ان کا اس قدر قریب ترین زمانہ میں حکومت علوی کی تشکیل کا اندازہ لگانا ظاہر ہے بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسری روایت میں ہشام ابن سالم نقل کرتے ہیں کہ ایک روز زرارہ نے مجھ سے کہا: لاتری علی اعوادھا غیر جعفر (ع) مسند خلافت پر امام جعفر ابن محمدؑ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھو گے۔ ہشام کہتے ہیں جب امام صادقؑ نے شہادت پائی تو میں نے زرارہ سے کہا: "کیا تم کو اپنی وہ بات یاد ہے؟" مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھول نہ گئے ہوں مگر زرارہ نے کہا: ہاں! مگر خدا کی قسم میں نے وہ بات اپنے اندازہ کے مطابق کہی تھی (مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ زرارہ نے وہ بات امام علیہ السلام سے نقل کی تھی)

متعدد روایتوں سے اصحاب ائمہؑ کی طرف سے قیام کی درخواست یا اس کے انتظار کا پتہ چلتا ہے اور اس سے اس بات کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ ائمہ علیہم السلام کا ہدف و مقصد یعنی حکومت علوی کی تشکیل اس کے لئے تلاش و جستجو اور اس کا متوقع ہونا شیعیان آل محمدؐ حتی کہ ائمہؑ کے قریب ترین ساتھیوں کے درمیان مسلمات میں شمار ہوتا تھا اور یہ چیز ائمہ کے ہدف و حکمت عملی کا ایک قطعی قرینہ ہے۔

ایک دوسری بحث یہ ہے کہ ائمہ کے ساتھ خلفائے وقت کے بغض و عناد اور خصومت و دشمنی کی علت کیا تھی؟ آیا ان کے حسد کی وجہ محض ائمہ کی معنوی عظمت اور عوام میں ہر دل عزیزی تھی اور ان تمام دشمنیوں کی اصل بنیاد یہی چیز تھی؟ یا حقیقت امر کچھ اور ہے؟ یقیناً اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ائمہ علیہم السلام خلفاء نیز اس طرح کے دوسرے افراد کے حسد کا نشانہ رہے ہیں جیسا کہ قرآن کی اس آیت: ام یحسدون الناس علی ما آتیھم اللہ من فضلہ کی تفسیر کے ذیل

ہیں اس مضمون کی روایت موجود ہے کہ "نحن المحسودون" یعنی وہ لوگ جن سے لوگوں کا حسد کرنا اس آیت میں ذکر ہوا ہے، ہم لوگ ہیں۔ پھر بھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ ائمہ کے ساتھ لوگوں کے حسد کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے علم و تقویٰ سے لوگ حسد کرتے تھے؟ تو یہ بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے علماء و زہاد بھی موجود تھے جو ان ہی صفات کے ساتھ لوگوں میں پہچانے جاتے تھے اور ان کے چاہنے والوں اور دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ابوحنیفہ، ابو یوسف حسن بصری، سفیان ثوری، محمد بن شہاب اور اسی طرح کے دسیوں مشہور و معروف چہرے اس وقت موجود تھے، جن کے بڑی تعداد میں مطیع و خیر خواہ موجود تھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کے درمیان مشہور تھے بلکہ ان کے محبوب بھی تھے۔ اس باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خلفاء نے نہ فقط یہ کہ ان کے ساتھ بغض و حسد کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض خلفا کی محبت و ارادت کے مرکز بھی رہے ہیں۔

لہٰذا ہماری نظر میں ائمہ کے ساتھ خلفاء کی ایسی شدید دشمنی جو گرفتاری، دربدری، قید و بند اور پھر شہادت تک منتہی ہوتی ہے اس کی اصل علت کسی اور ہی چیز میں تلاش کرلی چاہیئے۔ اور وہ خلافت و امامت کے سلسلہ میں ان حضرات کا ادعا ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں نظر آتا۔ یہ ان ہی بحثوں میں سے ایک بحث ہے جس پر تحقیق و تدقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ایک تحقیق طلب موضوع ائمہ علیہم السلام کے اصحاب کا آستانۂ خلافت کے ساتھ تیز و تند مقابلہ اور ٹکراؤ ہے جس کے نمونے ائمہ کی زندگی کے دوران بخوبی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ حضرت سید سجادؑ کے زمانے میں جو سخت خفقان و گھٹن کا دور ہے یحییٰ بن ام طویل جو حضرت کے حوارئین میں سے تھے۔ مسجد مدینہ میں آتے تھے اور ان لوگوں سے جو یا تو دربار خلافت کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے یا خلافت کے کارگزاروں میں سے تھے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی وہ آیت پڑھتے تھے جس میں کفار سے جناب ابراہیمؑ کی گفتگو کا ذکر ہے: کفرنا بکم وبدا بیننا و بینکم العداوة والبغضاء .... اور اسی طرح کناسۂ کوفہ میں مجمع عام میں شیعوں کے ایک گروہ کو خطاب کرتے ہوئے باآواز بلند ایسی تقریر کرتے ہیں جس کا لفظ لفظ حکام وقت کی سیاست کیلئے کھلا ہوا چیلنج تھا۔

معلّیٰ بن خنیس نماز عید کی ادائگی کے لئے جب لوگوں کے ہمراہ صحرا کی جانب جاتے تھے تو نہایت ہی پریشان حال غبار آلود لباس میں غمگین صورت بنائے وہاں پہونچتے تھے اور جیسے ہی خطیب منبر پر جاتا تھا ہاتھوں کو بلند کرکے باآواز بلند کہتے تھے: "اللهم ان هذا مقام خلفائك واصفيائك وموضع امنائك ...... ابتزوها" پروردگارا! یہ منبر اور یہ مقام تیرے منتخب اور برگزیدہ جانشینوں کا ہے جو فی الحال ان سے چھین لیا گیا ہے اور دوسروں نے اس پر اپنا پنجہ مضبوط کرلیا ہے۔

اور مقام افسوس ہے کہ یہ بلند مرتبہ صحابی جس کے قاتل پر امام صادق علیہ السلام لعن و نفرین کرتے ہوئے مقتول

ی تعریف و توصیف فرماتے ہیں بعض افراد کی تقیدو بے مہری کا نشانہ بن کر ثقہ اور امین کی فہرست سے خارج
ردیئے گئے ہیں اور بعید نہیں ہے کہ اس مکر کے پیچھے بھی بنو عباس کا خبیث ہاتھ کارفرما ہو۔

ایک اور مسئلہ جس کے لئے کافی دقت اور بحث عمیق کی ضرورت ہے مسئلہ تقیہ ہے۔ اصل میں تقیہ کا مورد
در عنوان سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام روایات جو کتمان و پردہ داری نیز خفیہ سرگرمیوں سے متعلق ہیں
ان کی چھان بین کی جائے تاکہ ایک طرف تو ائمہ علیہم السلام کے اس ادعا اور ہدف کے پیش نظر جن کا گذشتہ
بحثوں میں ذکر کیا جا چکا ہے اور دوسری طرف خلفائے زمانہ کے اس شدید ردعمل کے پیش نظر جو ائمہ
علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی سرگرمی اور سیاسی فعالیت کے خلاف ظاہر ہوتا رہا ہے ۔ تقیہ کا صحیح
اور حقیقی مفہوم سمجھا جا سکے۔

البتہ ایک چیز جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے وہ یہ کہ تقیہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے
بیٹھے رہنے یا تمام کام اور سعی و کوشش ترک کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ پوشیدہ طور پر حفاظت کا خیال
رکھتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھنے کو تقیہ کہتے ہیں اور یہ بات بھرپور طور پر، روایتوں پر ایک نظر ڈالنے
سے ہی روشن ہو جاتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ سے متعلق ضروری مباحث کا صرف ایک حصہ
ہے ان بزرگان دین کی سیاسی زندگی سے مربوط بہت سی دوسری بحثیں بھی ہیں جن کی فہرست پیش کرنے کی
بھی اب گنجائش نہیں ہے اگرچہ ان سے متعلق ضروری یادداشتیں میرے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔
بندہ نے ان تمام موضوعات پر بڑی تفصیل کے ساتھ کام کیا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس وقت ان تمام چیزوں
کو تدوین کرنے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے۔ اے کاش! ایسے باہمت افراد پیدا ہو جاتے جو اس کام
کو آگے بڑھاتے اور ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی بھی یکجا صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ
جاتی اور ہم ان عظیم ہستیوں کی زندگی کے ان روشن پہلوؤں کو اپنے لئے درس اور نمونے کے عنوان سے
اختیار کرتے نہ یہ کہ صرف ایک زندہ و پائندہ یادگار کے طور پر اس کا ذکر کر لینا ہی کافی سمجھ لیتے

والسلام علیکم و رحمتہ اللہ۔

جناب شیخ حسین نوری
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

معـــاد

(۲)

دنیا آخرت کی کھیتی ہے اسمیں ہم جو کچھ بوئیں گے
دوسری دنیا میں ویسا ہی پھل ہاتھ آئے گا۔ ہماری زندگی اس چند روزہ دنیا میں منحصر نہیں ہے۔ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے جہاں یہ زندگی حیات جاوید کا لباس زیب تن کرے گی۔ ایک جزاء و سزا اور ثواب و عذاب کی زندگی ہمارے انتظار میں ہے۔

یہ نہ صرف دین مقدس اسلام کا ایک مسلّم و مستحکم اصول ہے بلکہ دیگر آسمانی مذاہب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں اور قطعی دلائل سے ثابت و استوار ہے۔ گذشتہ شمارہ ۱۲ میں اس سلسلہ کی پہلی دلیل ذکر ہوئی۔ اب ہم دوسری دلیل پیش کر رہے ہیں۔

برہان دوّم

اس دلیل کا منبع و سرچشمہ خداوند عالم کا عادل ہونا ہے اس عقیدہ کی بنیاد پر بدکاروں اور نیکوکاروں دونوں کا ایک ہی انجام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ دلیل بھی دو مقدموں سے تشکیل پاتی ہے۔

۱۔ توحید سے متعلق مباحث میں محکم دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ خالق کائنات عادل ہے، یعنی اس کا ہر کام نقص و عیب سے منزّہ اور اس کی ذات اقدس ہر طرح کے ظلم و ستم سے پاک اور مبرّا ہے۔

۲۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمام انسان اپنے دور حیات میں خداوند عالم کی طرف سے مقرر کردہ فرائض جو عقل و دانش کے عین مطابق ہیں عمل کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے اور ان کے کردار و افعال میں بہت زیادہ تفاوت پایا جاتا ہے۔

ایک گروہ ان افراد کا ہے جو عقل و شعور اور ایمان و معرفت سے کام لیتے ہوئے پروردگار عالم کی پیدا کردہ

بے حساب نعمتوں کا انکشاف بھی کرتے ہیں اور ان میں سے ہر شئے کی اہمیت و قیمت کا بھی احساس و درک رکھتے ہیں ، چنانچہ مقام شکر میں خود کو حقیر و ناچیز تصور کرتے ہوئے اپنی عاجزی کا یوں اقرار کرتے ہیں :۔ پروردگارا ! "ہماری ہر سانس اندر پہونچ کر ایک نئی حیات بخشتی ہے اور جب باہر آتی ہے تو فرحت و تازگی عطا کر دیتی ہے گویا ہر سانس دوہری نعمتوں سے بہرہ ور کرتی ہے اور ہر نعمت کے لئے شکر لازم ہے ۔" پھر بھی حتی الامکان ان لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو صحیح راہ پر لگا کر خدا کی خوشنودی کا سبب بنیں ۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو ان نعمتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی ان کو ان کی اہمیت کا احساس ہے بلکہ جیسے جیسے نعمت الٰہی کی فراوانی ہوتی جاتی ہے ان کے کفر و طغیان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نگاہ عدل الٰہی میں یہ دونوں گروہ مساوی و یکساں ہوں ؟

ایک جماعت اپنی عمر سیر و تفریح اور ہوس بازی میں صرف کر دیتی ہے اور خدا اور اس کے بندوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے کوئی اقدام نہیں کرتی لیکن اس کے مقابلہ میں ایک جماعت زندگی کی قیمت کا احساس کرتے ہوئے وقت کو غنیمت جان کر اپنے اعتقادی ، ثقافتی ، سیاسی ، معاشرتی اور اخلاقی فرائض ادا کرنے میں منہمک رہتی ہے تو کیا یہ دونوں جماعتیں میزان عدل و انصاف پر برابر اتر سکتی ہیں ؟

انسانوں کا ایک طبقہ اپنی زندگی کا مقصد سوائے ایثار و قربانی ، احسان و بخشش ، خدمت و محبت کے کچھ اور نہیں سمجھتا اور دوسرا طبقہ ذاتی منفعت اور لذت و شہوت کے علاوہ زندگی کا کوئی ہدف تصور نہیں کرتا ۔

کیا یہ دونوں طبقے ایک ہی نظر سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں ؟

کچھ لوگ اپنی راتیں یاد خدا میں نہایت ہی خلوص و اشتیاق اور صفائے قلب و ورع کے ساتھ عبادت اور عارفانہ راز و نیاز میں بسر کرتے ہیں اور اپنے دن راہ اسلام میں جہاد و ایثار و قربانی اور ایمان و دانش و بردباری کے پرتو میں خدمت خلق کرتے ہوئے تمام کر کے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اس ارشاد کا مصداق قرار پاتے ہیں جہاں آپ نے متقین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

اما اللیل فصافون اقدامهم تالین لاجزاء القرآن یرتلونه ترتیلاً یحزنون به انفسهم ویستثیرون به دواء دائهم فاذا مروا بآیة فیها تشویق رکنوا الیها طمعا وتطلعت نفوسهم الیها شوقا وظنوا انها نصب اعینهم واذا مروا بآیة فیها تخویف اصغوا الیها مسامع قلوبهم وظنوا ان زفیر جهنم وشهیقها فی اصول آذانهم فهم حانون علی اوساطهم مفترشون

لجباھھم واکفھم ورکبھم واطراف اقدامھم یطلبون الی اللہ تعالیٰ فی فکاک رقابھم۔
واما النھار فحلماء علماء ابرار اتقیاء"

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۴)

یعنی جب رات آتی ہے نماز و عبادت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پورے غور و خوض کے ساتھ آیات قرآنی کی تلاوت کرتے ہیں جس کے اثر سے ان کے دلوں میں غم و اندوہ تازہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے دردوں کا علاج قرآنی آیتوں میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ جہاں کوئی امید افزا آیت انہیں نظر آگئی ان کی نگاہ شوق اس پر جم کر رہ جاتی ہے بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور بہ عارفانہ روش ایسے محکم یقین و اطمینان پر استوار ہوتی ہے گویا جنت کے دریچے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور صاف طور پر وہ اس کا نظارہ کر رہے ہوں۔

اور جہاں کہیں کسی آیت میں خوف و بیم کی کیفیت کی عکاسی نظر آئی وہ اپنے گوش دل اس کی طرف اس طرح لگا دیتے ہیں گویا اہل جہنم کے نالہ و شیون کی آوازیں ان کے پردہ سماعت سے آکر ٹکرا رہی ہوں۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو پورے قد و قامت کے ساتھ بارگاہ ربوبیت میں رکوع کے انداز سے خم کر دیتے ہیں اور سجدۂ معبود کے لئے اپنی پیشانیاں، ہاتھوں کی ہتھیلی، گھٹنے اور پاؤں کے انگوٹھے زمین بوس کر دیتے ہیں اور درگاہ رب العزت میں عذاب جہنم سے نجات کی دعائیں کرتے ہیں۔

اور جب صبح کا اجالا پھیلتا ہے وہ حلیم و بُردبار اور عالم و پرہیزگار افراد میں نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ اپنے عہد و پیمان اور ذمہ داریوں کو اس طرح بھلا بیٹھے ہیں کہ وہ اپنی راتیں عیش و عشرت اور لہو و لعب و غفلت کی نذر کر دیتے ہیں اور صبح کا سورج ان کے لئے حرص و آز، جمع دولت و ثروت نیز ذخیرہ اندوزی و تکاثر اموال کا پیغام لے کر آتا ہے یا تو تن آسانی کی فکر رہتی ہے یا شہوات نفسانی کی پیروی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

کیا عادل حقیقی کے دربار میں حساب و کتاب کے وقت دونوں طرح کے افراد کا ایک ہی منزل میں قرار پانا ممکن ہے؟

کیا صاحبانِ تحریر وہ ہیں — جو اپنے قلم سے تربیت نفس اور تہذیب اخلاق کا کام لیتے ہیں جن کی تحریریں معاشرے اور افراد کو مادی و معنوی ارتقاء کی راہیں دکھاتی ہیں انسان آزادی اور ترقی کی

راہ میں چل رہی تحریکوں کی صحیح رہنمائی کرتی ہیں جو مفید مطلب مقالے اور کتابیں لکھ کر ایک نمایاں سیاسی، اجتماعی اور ثقافتی انقلاب پیدا کر دیتے ہیں چنانچہ ان کی نگارشات کی قیمت و وقعت کا موازنہ محض شہداء کے پاک خون سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے قلمکار بھی ہوتے ہیں جو اپنی زہر آلود تحریروں سے دلوں میں کینہ و نفاق اور اختلاف و انحراف کے بیج بو کر معاشرہ کو مسموم کر دیتے ہیں جن کے قلم توسیع پسند بڑی استعماری طاقتوں کے ہاتھوں میں گروی ہوتے ہیں۔ باطل کو حق بنا کر پیش کرنا اور حق پر باطل کی نقاب چڑھا دینا جن کا خاص مشغلہ ہوتا ہے۔ آیا ممکن ہے دونوں، معیار حق پر ایک ہی جزاء کے مستحق قرار پائیں ؟

ایک طرف حکمرانوں کی صف میں وہ افراد نظر آتے ہیں جن کی حکومت کا ہدف و مقصد کلمۂ حق بلند کرنے، عدل و انصاف قائم کرنے اور قوانین الٰہی نافذ کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں رہا ہے اور دوسری طرف فرماں رواؤں کی ایک ایسی قطار نظر آتی ہے جنکی سلطنت و فرمانروائی کی غرض و غایت ہی ذاتی عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا اور اپنی مستکبرانہ آتش ہوس کو مزید ہوا دیتے رہنا ہے۔

کیا عدل و داد کی نظر میں دونوں برابر ٹھہر سکتے ہیں ؟

کیا حق و عدالت کی راہ میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے والے مجاہدین اور مستکبرین عالم کے اشاروں پر محروم و مظلوم اقوام کا خون چوسنے والے ظالم گرگے ایک ہی ترازو پہ تولے جا سکتے ہیں ؟ اچھا ان متضاد تصویروں کو جانے دیجئے خود نیکو کاروں کے مابین ایمان و اخلاص، تہذیب اخلاق اور کار خیر کی ادائیگی کے سلسلہ میں درجات و مراتب کے اعتبار سے بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح بدکاروں کے درمیان بھی ان کے جرائم اور ظلم و تعدی کے اعتبار سے بڑا فرق موجود ہے۔ لہٰذا نا ممکن ہے کہ تمام اعمال خیر انجام دینے والے ایک ہی جزاء کے مستحق اور تمام برے کاموں میں ملوث افراد ایک ہی جیسی سزا کے سزاوار قرار دے دیئے جائیں۔

نتیجہ :-

ان دونوں مقدموں سے نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ چونکہ خداوند عالم عادل ہے لہٰذا اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ان دو مختلف گروہوں کو مساوی قرار نہ دے اور بدکاروں کو ان کے اعمال کے مطابق کیفر کردار کو پہونچائے نیز نیکو کاروں کو ان کی کارکردگی کی مناسبت سے جزاء عنایت فرمائے۔

اور یہ بھی ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا میں نہ تو تمام بدکار اپنی بدکاری کی بنیاد پر کیفر اعمال کو

پہنچتے اور نہ ہی تمام نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا پھل حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کے برخلاف اکثر و بیشتر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ یہاں بدکردار زیادہ راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ نیک منش افراد مصائب و پریشانی کا شکار رہتے ہیں بلکہ انھیں راست کرداری کے عوض طرح طرح کی تلخیاں، مصیبتیں اور آلام برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ لازم ہے کہ خداوند عادل، ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرے جہاں نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کی جزاء اور بدکاروں کو ان کی بداعمالی کی سزا دی جائے، یعنی جو کچھ اس کشت زار ہستی میں ان دونوں گروہوں نے بویا ہے ویسا ہی پھل ان لوگوں کے ہاتھ آئے۔

قرآن و حدیث کیا کہتے ہیں:

یہ دلیل جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، عقل کی بنیاد پر استوار ہے لیکن قرآن مجید جو عقل کے دریچے کھولتا ہے اور احادیث معصومینؑ جو مفسر قرآن ہیں اس سلسلہ میں بہت ہی فراوان مطالب کی حامل ہیں جن کی عقل بھی تائید کرتی ہے مثال کے طور پر:۔

قرآن کہتا ہے:۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلا ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار (سورۂ ص آیت/۲۷ و ۲۸)

"ہم نے زمین و آسمان اور ان کے مابین کوئی چیز باطل و لاطائل خلق نہیں کی ایسا وہی لوگ خیال و گمان کرتے ہیں جنھوں نے کفر اختیار کر لیا ہے وائے ہو ان کفار کے حال پر نار دوزخ کی! کیا ہم ان افراد کو جنھوں نے ایمان اختیار کیا ہے اور اچھے اچھے کام انجام دیتے ہیں ان افراد کے زمرہ میں قرار دے دیں گے جو زمین پر فساد پھیلاتے رہتے ہیں یا وہ لوگ جو متقی و پرہیزگار ہیں ان کو فسق و فجور انجام دینے والوں کے ساتھ رکھیں گے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔"

دوسرے مقام پر قرآن آواز دیتا ہے:۔

ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلهم کالذین

آمنوا وعملوا الصالحات سواءً محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون وخلق اللہ السموات والارض بالحق ولتجزیٰ کل نفس بما کسبت وھم لایظلمون"

(جاثیہ / ۲۱ و ۲۲)

آیا وہ لوگ جو برے کام انجام دیتے ہیں اس خیال میں ہیں کہ ہم ان کو عزت و مقام کے اعتبار سے ایمان لانے والوں اور عمل صالح انجام دینے والوں کے مساوی قرار دیدیں گے کہ وہ حیات و مرگ دونوں میں یکساں ہو جائیں (نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا) جو لوگ ایسا سوچتے ہیں (یقیناً زعم باطل میں مبتلا ہیں) انہوں نے بے بنیاد فیصلہ کر رکھا ہے خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کی بنیاد پر پیدا کیا ہے تاکہ سرانجام ہر ایک کو اس کے اچھے اور برے اعمال کا نتیجہ مل جائے اور کسی پر ظلم نہ ہو۔

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

حتی اذا تصرمت الامور وتقضت الدھور وازف النشور اخرجھم من ضرائح القبور واوکار الطیور واوجرۃ السباع ومطارح المھالک سراعاً الیٰ امرہ مھطعین الیٰ معادہ رعیلاً صموتاً قیاماً صفوفاً ینفذھم البصر ویسمعھم الداعی علیھم لبوس الاستکانۃ وضرع الاستسلام والذلۃ قد ضلت الحیل وانقطع الامل وھوت الافئدۃ کاظمۃ وخشعت الاصوات مھینمۃ والجم العرق وعظم الشفق وارعدت الاسماع لزبرۃ الداعی الیٰ فصل الخطاب ومقایضۃ الجزاء ونکال العقاب ونوال الثواب"

یعنی جب کاروبارِ عالم تمام ہوگا کائنات اپنا دامن سمیٹنا شروع کر دے گی ـــــ قیامت برپا ہوگی خداوندعالم تمام انسانوں کو ان کی قبروں، مردار پرندوں کے آشیانوں، درندہ چوپایوں کی کمیں گاہوں (یہاں مراد وہ افراد ہیں جن کا مردہ جسم درندوں اور پرندوں کی غذا بنا ہے) اور جنگ کے میدانوں سے باہر نکالے گا ہر ایک خداوندعالم کے حکم کا منتظر نظر آئے گا۔ لوگ معاد ـــــ یعنی خداوندعالم کی جانب سے مقررہ مقام بازگشت

کی طرف تیزی سے بھاگ رہے ہوں گے پھر ایک مقام پر صف در صف ساکت و جامد کھڑے ہو جائیں گے درحالیکہ یہ ساری خلقت احاطۂ قدرت الٰہی میں ہوگی، ان سب کے کانوں میں منادی کی آواز بھی پہنچ رہی ہوگی۔ سب کے سب خضوع و خشوع اور فرمانبرداری و فروتنی و ذلت کے لبادہ میں ملبوس ہوں گے۔ اس دن مکر و فریب کام نہ آئے گا۔ تمنائیں اپنا دامن سمیٹ لیں گی دل افسردہ و غمگین، آوازیں گھٹی گھٹی اور دہن عرق آلود ہوں گے۔ انجام گناہ کا خوف سروں پر سایہ کئے ہوگا حق کو باطل سے جدا کرتے، اچھے کاموں کی جزا، برے اور شرم انگیز کاموں کی سزا کے لئے سب آمادہ ہوں گے منادی الٰہی کی ہیبت ناک آواز کانوں میں ارتعاش و لرزہ پیدا کر رہی ہوگی۔

دوسرے مقام پر امام علیہ السلام نے روز قیامت کی یوں نقشہ کشی کی ہے:۔

"و ذالک یوم یجمع اللہ فیہ الاولین و الآخرین لنقاش الحساب و جزاء الاعمال۔"

(نہج البلاغہ / خطبہ ۱۰۱)

یہ وہ دن ہے جس دن خداوند عالم حساب و کتاب اور اعمال کی جزاء و سزا کے لئے اولین و آخرین میں کے تمام انسانوں کو ایک مقام پر اکٹھا کرے گا۔

مختصر یہ کہ روز قیامت کا روز جزاء ہونا ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت سی آیتیں روشنی ڈالتی ہیں مجموعی طور پر اس مقدس کتاب میں ۱۵ مقامات پر انسان کے اچھے اور برے اعمال کی بازگشت کو لفظ "جزا" سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ جب ہم خدا کی اس عظیم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس قسم کی بہت سی عبارتیں نظر آتی ہیں جن میں بڑے ہی واضح انداز سے مذکورہ حقائق کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے:۔

الیوم تجزیٰ کل نفس بما کسبت (غافر / ۱۷)

یعنی آج جس نے بھی جو کچھ کیا ہے اس کے انجام کو پہونچے گا۔

کہیں اعلان ہوتا ہے:۔

"الیوم تجزون ما کنتم تعملون" (جاثیہ / ۲۸)

یعنی جو کچھ تم نے کیا ہے آج اس کا نتیجہ مل جائے گا۔

اور آخر میں یہ آیات بھی ملاحظہ فرمائیں جنمیں بڑی وضاحت کے ساتھ کہہ دیا گیا ہے کہ:۔

وکذالک نجزی المجرمین، نجزی الظالمین

نجزی المفترین، سنجزی القوم المجرمین نجزی المحسنین، یجزی اللہ المتقین، لیجزی اللہ الصادقین بصدقہم، لیجزی الذین اساؤا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنیٰ ۔ (نجم/۳۱)

ہم مجرموں، ظالموں اور افترا پردازوں کو ان کے کیفر کردار تک پہونچادیں گے (اسی طرح) نیکی کرنے والوں پرہیزگاروں اور صداقت پرستوں کو بھی جزا مرحمت عطا کریں گے تاکہ وہ لوگ جنھوں نے برے کام انجام دیئے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے اچھے اعمال کا مظاہرہ کیا ہے (دونوں) اپنے اپنے کئے کا نتیجہ پالیں ۔

جناب سید حسین مرتضیٰ

صدر الافاضل

(علامہ حاج سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل، فاضل لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا)

مختصر تعارف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لاھلہ والصلوٰۃ علی اھلھا۔

کبھی کبھی تاریخ کو بھی اپنے تجربات کی کثرت، اور اپنی مہارت کے باوجود ایسے انسانوں کا سامنا کرنا پڑ ہی جاتا ہے، جو ــــ اپنی ذہانت کے سبب اس کی کہن سالی پر سبقت لے جاتے ہیں، ــــ اور ــــ اپنی محنت و مشقت، ہمت و شجاعت اور علم و عمل کے نتیجہ میں اسے نئے نئے تجربات سے آشنا کرواکر، تاریخ کے بھی استاد ــــ بن جاتے ہیں۔

علامہ سید مرتضیٰ حسین مرحوم ــــ کی شخصیت بھی کچھ اسی طرح کی تھی ــــ وہ، ــــ ایک کثیر السمت شخصیت کے حامل تھے، ــــ اور، ــــ اپنے تقویٰ و تدین، علم و عمل، کردار و گفتار، ــــ محنت و مشقت، مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے سبب ــــ اپنے دور کی رگ رگ میں، ــــ ترو تازہ خون اور گرم گرم لہو کی مانند، دوڑتے رہے ــــ اور ــــ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی رحلت ــــ ــــ شہید کی موت ــــ کی طرح، ــــ قوم کی حیات بن گئی ہے۔

وہ، اپنی زندگی میں، ــــ اگر ــــ منارۂ علم کی آخری بلندی پر روشن ہونے والے چراغ تھے، تو، ان کی موت نے ــــ انہیں، اس بلندی سے اتارا نہیں، ــــ بلکہ، یوں سمجھیے کہ: ــــ اس چراغ کے اوپر روشنی کو ریفلیکٹ کرنے والی ایسی قندیل چڑھا دی ہے، ــــ جس کے سبب، یہ روشنی،

کئی گنا بھی ہوگئی ہے، اور ــــ اس کا ــــ دائرۂ نور بھی بڑھ گیا ہے ــــ اب، ــــ یہ ہم پر ہے کہ ہم ــــ آنکھیں موندلیں، یا ــــ ہماری آنکھیں چکا چوند ہوجائیں، یا ــــ ہم، ــــ اس نور سے استفادہ کریں۔

اس قسم کی شخصیتوں پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پھر، علامہ مرحوم پر کچھ لکھنا اس لئے اور بھی مشکل ہے کہ انہوں نے سب پر لکھا۔

شاید ہی کوئی ایسی ہستی ہو جس کی موت پر مولانا نے فوراً اور برجستہ قلم اٹھایا ہو ــــ اسی لئے، ــــ ان کی رحلت پر کسی کی ہمت ہی نہ پڑی کہ کچھ لکھے، اس کے باوجود کچھ حضرات نے لکھا بھی اور چھاپا بھی، اور ان ہی تحریروں کو دیکھ کر شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ؛ ــــ جو لوگ دل کی گہرائیوں سے ان کی شخصیت پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں، ــــ ان کو، ــــ بجا طور پر ایک مستند دستاویز کی ضرورت ہے ــــ اس لئے، ــــ میں اپنے مذہبی، اخلاقی، علمی، سماجی، ملی اور تاریخی فریضہ کے طور پر، ان کی شخصیت کا ایک سرسری مگر مستند تعارف فقط اسی لئے نذر کر رہا ہوں، کہ، ــــ جو حضرات، ــــ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کام کرنا چاہتے ہیں، ان کی ابتدائی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔

وطن : لکھنؤ ــــ ایک شہر کا نام نہیں، ــــ بلکہ، نہ معلوم کتنی، ــــ ملتوں کی تاریخ کی جان، ــــ ثقافتوں کا مرکز، ــــ علمی مرکز، اور ــــ مسلمانوں کے علمی ورثہ کا محافظ و پاسدار، بلکہ، اگر یوں کہا جائے کہ، لکھنؤ ــــ ایک زمانہ میں برصغیر پاکستان و ہند میں اسی حیثیت کا حامل رہا ہے، جو حیثیت مدینہ ــــ کو عرب میں، حلہ و کوفہ و نجف ــــ کو عراق میں، اور قم و مشہد ــــ کو ایران میں، تاریخ کے مختلف ادوار میں حاصل تھی یا ہے، ــــ دوسری لفظوں میں، ــــ لکھنؤ ــــ مسلمانوں کی علمی، تہذیبی، فنی اور مذہبی تاریخ کے ایک بھرپور اور درخشاں دور کا، ــــ اجمالی نام ــــ مخفف ــــ ہے ــــ اور، یہی، ــــ لکھنؤ، ــــ اپنے اسی بھرپور اور درخشاں علمی و مذہبی دور کے آخری مراحل میں، علامہ مرحوم کی، ــــ جائے پیدائش، ــــ ان کا وطن، ــــ ان کی مادر علمی، ان کی پرورش گاہ، اور ــــ ان کے علمی، فکری، مذہبی، سیاسی، ثقافتی، ..... افق کی وسعتوں کی بنیاد تھا۔

پھر، وہ لکھنؤ ہی میں نہیں ــــ بلکہ لکھنؤ کے دل ــــ کٹرہ ابوتراب خاں اور فرنگی محل ــــ کے گلی کوچوں میں پروان چڑھے، ــــ ان کی جائے ولادت، ان جغرافیائی، علمی اور ثقافتی حدود کا ایک نفیس

محلہ تھا جس کا نام، ——"راجہ بازار" ہے۔

خاندان: ایک زمانہ تھا جب لکھنو کے درو دیوار اور ذرے ذرے سے علم و عمل اور فکر و فن کے چشمے پھوٹتے تھے اور وہاں کے جہلا بھی فکری افق کی بلندیوں کو چھوتے تھے۔ اسی زمانہ میں —— لکھنو کے علمی خاندانوں میں ایک خاندان، —— مولانا سید محمد تقوی عرف آغا میرزا مرحوم کا خاندان تھا —— جو اس دور کے باوقار خاندانوں میں سے تھا —— ان کے فرزند، مولانا سید اعجاز حسین نقوی مرحوم —— اور ان کے فرزند، مولانا سید سردار حسین نقوی عرف قاسم آغا مرحوم، اپنے اپنے دور کی باوقار علمی اور ثقافتی شخصیتیں تھیں۔

علامہ مرحوم، اسی خاندان کے چشم و چراغ اور قاسم آغا صاحب مرحوم کے سب بڑے فرزند تھے —— ان کے چھوٹے بھائی سید علی رضا مرحوم تھے۔ جن کو شعر و ادب میں مہارت حاصل تھی اور انہوں نے ایک لغت بھی تحریر فرمایا تھا جو مخطوطہ صورت میں محفوظ ہے۔

علامہ مرحوم کا سلسلۂ نسب، حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے۔[1]

ولادت: مرحوم نے، شہر علم و عمل لکھنو کی تاریخ کے اس دور میں ولادت کا شرف حاصل کیا جب وہاں ایسی بہت سی ہستیاں موجود تھیں جو علمی و فقہی حلقوں میں نجف اشرف اور مکہ و مدینہ تک سند تسلیم کی جاتی تھیں، اور ان شہروں کے اکابر علماء لکھنو کے علمی اداروں اور وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کو شرف اور فضیلت سمجھتے تھے۔

چنانچہ، آج بھی، آیۃ اللہ العظمیٰ سید شہاب الدین نجفی مرعشی مدظلہ العالی، جو قم کے بزرگ علماء میں صف اول کی شخصیت ہیں اور فقہ و حدیث، درایت و رجال، فلسفہ و ہیئت، نجوم و فلکیات اور تاریخ و انساب میں سند کا درجہ رکھتے ہیں، لکھنو، کے اس دور کو یاد فرماتے اور علمار لکھنؤ سے استفادہ کو اپنا شرف بتلاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

علامہ مرحوم نے، اسی علمی و مذہبی و ثقافتی پس منظر میں —— بدھ، کے دن —— عید غدیر

---

[1] مطلع الانوار ص ۱۴۲

کی خوشیوں کے دوران ــــ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۱ ہجری قمری ــ مطابق پہلی اگست ۱۹۲۳ء عیسوی کو ــ محلہ راجہ بازار میں آنکھ کھولی۔

تعلیم: ان کے والد نے انہیں بہت کم سنی سے پڑھانا شروع کیا، اور تربیت کی خاطر بچپنے ہی سے ان کو اکابر علماء کی خدمت میں حاضری دلوانا اور علمی و ادبی محفلوں میں لے جانا شروع کر دیا۔ جس کا بھرپور اثر ان کی شخصیت میں نمایاں طور پر موجود تھا۔

بقول ضیاء عالم سلمہ،[1]

"وہ بعض اوقات مقام فخر میں کہا کرتے تھے: ہمارا محلہ ــ پنجتن پاک ــ کا محلہ کہا جاتا تھا۔ وہاں پانچ بڑے عالم رہا کرتے تھے۔ چاروں طرف علماء کے شریعت کدے تھے ــــ لوگ ہم پر رشک کرتے اور کہتے تھے کہ: تمہاری تو کروٹ کروٹ جنت ہے۔"

گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کٹرہ ابوتراب خان میں ــ مدرسہ عابدیہ ــ میں اپنے تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ جس کے بعد، انہوں نے اس دور کے لکھنؤ کی عظیم دینی درسگاہ ــــ سلطان المدارس ــــ میں قدم رکھا، جو اس عہد میں آج کے ــــ مدرسہ فیضیہ ــ سے ملتی جلتی حیثیت کا حامل تھا۔

انہوں نے سلطان المدارس میں اپنے تعلیمی مراحل بڑی ذہانت اور تیز رفتاری کے ساتھ طے کیے، جس کے نتیجہ میں اساتذہ کی نظر میں ان کا علمی وزن معین ہوا۔

اور علامہ مرحوم، ــــ اپنے مدرسہ میں طالب علمی کے مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ استاد، محقق منطقی، فلسفی اور ادیب کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

سلطان المدارس ــــ کی آخری سند، ــــ صدرالافاضل ــــ تھی، علامہ مرحوم اس سند کے حصول تک علمی اور ادبی دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت بن چکے تھے۔

اس کے باوجود، ایک تو ــــ اس حدیث کے مصداق کے طور پر جس میں ہے کہ:

---

[1] مکتوب ضیاء عالم سلمہ

"طالب علم کی نیت کبھی سیر نہیں ہوتی۔"

ان کی علمی پیاس بھی نہ بجھی۔ دوسرے ـــ بلکہ؛ ـــ مدرسہ ناظمیہ ـــ بھی اس عہد میں، ـــ سلطان المدارس ـــ کا ہم وزن و ہم پلہ مدرسہ تھا، اور، عام طور سے ان دونوں مدرسوں کے طلبہ کے درمیان علمی چشمک رہتی تھی۔ جب کہ علامہ مرحوم مزاجاً اس قسم کے مسائل میں الجھنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے، یہاں سے علمی مراحل طے کرنے کے بعد وہ ـــ مدرسہ ناظمیہ ـــ چلے گئے۔ ناظمیہ آنے پر وہاں کے اساتذہ و طلبہ نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ وہاں بھی انہوں نے طالب علم، استاد، اسکالر اور محقق کی حیثیت سے مقام پیدا کیا اور وہاں کی آخری سند ـــ ممتاز الافاضل ـــ حاصل کی۔

دینی تعلیم کے یہ مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ادب، تاریخ اور ثقافت پر کام کرتے رہے نیز جدید تعلیمی اداروں اور وہاں کے اکابر سے مربوط رہے۔

یوں، علامہ مرحوم نے اس عہد میں آج کے شہید مطہری، شہید ڈاکٹر مفتح اور شہید ڈاکٹر بہشتی کی طرح، "وحدت حوزہ و دانش گاہ" یعنی دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کے اساتذہ و طلبہ کے درمیان فکری و عملی خلاء کو پر کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے کے لئے آمادہ کرنے کی سعی کی۔

اس مقصد کی خاطر انہوں نے مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیمی اداروں کے علمی مراحل بھی طے کئے۔

چنانچہ انہوں نے، الہ آباد بورڈ سے؛

۱۔	مولوی	عربی	
۲۔	عالم	عربی	
۳۔	کامل	فارسی	اور
۴۔	قابل	اردو	

شیعہ عربی کالج سے؛

۱۔	عماد الادب	عربی	اور
۲۔	عماد الکلام	عربی	

لکھنؤ یونیورسٹی سے:

۱۔ فاضل ادب عربی اور

۲۔ دبیر کامل فارسی نیز

پنجاب یونیورسٹی سے:

۱۔ مولوی فاضل عربی

۲۔ منشی فاضل فارسی اور

۳۔ اردو فاضل اردو

کی سندیں بھی حاصل کیں۔

شادی

۳۰ شعبان ۱۳۶۶ھ / ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو علامہ مرحوم کی شادی اس عہد کے انتہائی مقدس، متقی، پرہیزگار محدث اور عالم علامہ سید زاہد حسین بارھویں زیدی عرف آغائے بارھوی ــــــ رحمتہ اللہ علیہ کی سب سے بڑی صاحب زادی: سیدہ خاتون عالم، عرف خاتون عالم ہوئی۔ یہاں سے ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا، جس کے بعد خداوند عالم نے انہیں آٹھ بیٹوں اور ایک بیٹی کی نعمت سے نوازا۔ جن میں سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہیں۔

سفر

علامہ مرحوم نے اپنی علمی پیاس بجھانے اور تحقیقی کاموں کی تکمیل کی خاطر پاکستان و ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بنگلادیش، مشرق وسطیٰ اور امریکا کے سفر بھی انجام دیئے جن کی فہرست یہ ہے:

۱۔ ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء

کویت، عراق، شام، لبنان۔

۲۔ ۱۳۸۹ھ / ۱۹۷۰ء

کویت، سعودی عرب، پہلا حج۔

۰۲۔ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء ــ سعودی عرب، دوسرا حج

۴۔ ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء

جمہوری اسلامی ایران

۵- ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء
جمہوری اسلامی ایران۔

۶- ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء
بنگلادیش۔

۷- ۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۴ء
جمہوری اسلامی ایران۔[1]

۸- ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء
امریکا۔

۹- ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء
ہندوستان۔

ان سفروں میں انہوں نے خاص طور سے صدر اسلام کے جغرافیائی مسائل و معاملات ، سیرت، حدیث، تفسیر اور فقہ کے موضوعات پر اہم تحقیقی کام انجام دیے۔ اکابر علماء و محققین سے علمی مذاکرات و مباحثات کیے۔ تحقیقی و تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کے ساتھ علمی و تحقیقی تعاون کیا اور سیمناروں میں شرکت کی۔

علم و ادب کا امتزاج: علامہ مرحوم زمانہ طالب علمی ہی سے سامراج دشمن اور انگریز دشمن نظریات کے حامل تھے۔ وہ خاص طور سے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں، علماء اور دانشوروں نیز علماء اور سیاست دانوں کے درمیان موجود خلیج اور فاصلہ کو اسلام کے خلاف دشمنانِ اسلام کی سب سے بڑی سازش سمجھتے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ:

دین اور سیاست، ادب اور مذہب میں جدائی کا تصور تو دور کی بات ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتے۔ ہمیشہ اچھا عالم اچھا ادیب اور سچا مومن ماہر سیاست داں ہوتا ہے۔

اسی لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ، یونیورسٹی کی تعلیم بھی حاصل کی بلکہ ان

---

[1] اس سفر میں آپ نے مجلہ توحید کی ادارت کو قبول فرمایا۔ اور ایک سال تک اپنی جامع راہنمائی سے سرفراز فرمایا۔ (ادارہ)

دونوں تعلیمی نظاموں کا فنی و تحقیقی مطالعہ بھی کیا۔ اور ان دونوں نظاموں میں امتزاج پیدا کرنے کے موضوع پر عملی کام کیا۔ چنانچہ — انہوں نے ایک طرف تو — عالم دین ہونے کے باوجود اپنی عملی زندگی کے ایک بڑے حصہ کو سرکاری اور جدید طرز تعلیم کے تعلیمی اداروں میں استاد کی حیثیت سے گذارا اور گھر پر تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، منطق و فلسفہ، صرف و نحو اور تاریخ و ادب کا درس دیتے رہے۔

دوسری طرف انہوں نے — تحریر و تقریر کے میدان میں بھی ادب اور مذہب کو برابر کی اہمیت دی — چنانچہ، — جہاں انہوں نے مذہبی دنیا میں عظیم علمی مرتبہ حاصل کیا اور اکابر علماء سے کسب فیض کیا۔ وہاں ادبی حلقوں میں بھی انہوں نے جو مرتبہ حاصل کیا وہ ان کے ہم عصروں کے لئے قابل رشک ہے۔

ادبی حلقوں میں انہوں نے، حکیم صاحب عالم، پروفیسر مسعود حسن، محشر لکھنوی، تمنا لکھنوی، بے خود موہانی اور مرزا یاس چنگیزی، سے شعر و سخن، لغت و ادب اور زبان و بیان کی باریکیوں کو سمجھا، ان کے تاریخی امور اور ارتقائی مدارج کا مطالعہ کیا، نقد و نظر کی استعداد پیدا کی اور اس میدان میں ایک پختہ شہسوار کی طرح اترآئے اور تیزی سے اپنے بہت سے ہم عصروں پر سبقت لے گئے۔

ادب میں وہ غالبیات کے ماہر تھے، اور غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر روس میں ہونے والے بین الاقوامی تحقیقاتی سیمینار میں — محققین کے بورڈ نے متفقہ طور پر فاضل لکھنوی اور مالک رام کو غالب کے مستند ترین ماہر ہونے کی سند دی اور ان کے تحقیقی کاموں کو نمونہ کا کام قرار دیا۔[1]

لغت و ادب کے میدان میں انہوں نے جو کام کیے ان کے نتیجہ میں وہ اس عہد کے اکابر ادباء و شعراء و ماہرین لغت کی صف اول کے افراد جیسے مولانا غلام رسول مہر، امتیاز علی خان عرشی، مالک رام، امتیاز علی تاج، حمید احمد خان، مولوی محمد شفیع، سید عبد اللہ، نسیم امروہوی اور بابائے اردو مولوی عبد الحق کی صف میں شمار ہونے لگے — ۔ ادب، لغت، لسانیات اور قواعد — پر ان کا کام سند کا درجہ رکھتا ہے اور اسے اردو ادب کی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے۔

مذہب اور ادب کے علاوہ وہ باستان شناسی (آثار قدیمہ کی شناخت) عتیقہ شناسی، تاریخ، جغرافیہ، کتاب شناسی، کتاب داری، فن تحقیق، فلسفہ، منطق، عربی و فارسی ادب، جمالیات، فن تعمیر، رجال،

---

[1] روزنامہ امروز، فاضل لکھنوی، ان کی ادبی شہرت تھی۔

ترجمہ نگاری اور مقالہ نگاری کے علوم و فنون میں وسیع معلومات کے حامل اور صاحب نظر تھے۔

انہوں نے اپنی مہارت کے تمام میدانوں میں ملک اور بیرون ملک کے تحقیقی اداروں، یونیورسٹیوں، تعلیمی بورڈ، لائبریریوں، مدرسوں، میوزیمز اور انجمنوں کو بھرپور تعاون دیا، اور شائقین کی تربیت بھی کی۔

جن اداروں سے انہوں نے تعاون کیا ان کی تعداد سو سے زائد — اور جن شاگردوں کی انہوں نے تربیت کی ان کی تعداد ہزاروں پر محیط ہے۔

سیاست

سیاسی میدان میں وہ ہمیشہ پختہ اور ایمان دار سیاست کو پسند کرتے تھے، تخریبی سیاست، سیاسی سرکشی اور مخالفین کی کردارکشی نیز منفی سیاست سے نفرت کرتے تھے۔ وہ مذہبی اور سیاسی فرقہ واریت کو غیر مخلص قیادت، بے بصیرتی اور ملک دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں نیز سامراجی سازش کا نتیجہ خیال کرتے تھے۔

علامہ مرحوم فقط اتحاد بین المسلمین کے ایک بڑے داعی ہی نہیں تھے بلکہ وہ اس روش کو بھی غلط کہا کرتے تھے جس کے سبب سیاسی مخالفین آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن کر ایک دوسرے پر گھناؤنے الزامات لگا کر ان کو میدان سے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی لئے علامہ مرحوم نے، فرقہ واریت کے خلاف اور اتحاد بین المسلمین کے حق میں زندگی بھر بھرپور جہاد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سنی، شیعہ علمی حلقوں میں وہ برابر کی عزت اور مقام کے حامل تھے اور دونوں مذاہب کے دینی مدارس اور تحقیقی اداروں نیز علماء سے ان کے بہت قریبی اور دوستانہ روابط تھے۔

سماجیات

علامہ مرحوم انتہائی خلیق، ملنسار، مرنجاں مرنج، منکسر مزاج، رازدار، غربا پرور، شفیق، رحم دل، پابند عہد، پابند وقت، منظم اور درد دل رکھنے والے عظیم انسان تھے۔ وہ ہر ایک سے مل جل کر رہتے تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں کو بھی گلے لگا لیتے تھے اور ان کے دکھ درد میں شرکت ضرور کرتے تھے۔

ان کی نصیحت اور ان کا عمل ہمیشہ یہی تھا کہ:

خواہ کسی کی خوشی میں شرکت نہ کرو مگر دکھ درد، بیماری، غمی اور موت میں ضرور شریک ہو خواہ وہ تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو — موت پر سب دشمنیاں اور نفرتیں ختم ہو جانا چاہئیں، اگر باپ کا قاتل بھی مقتول باپ کے جنازے پر آجائے تو اس کو معاف کر دینا اور گلے لگا لینا چاہئیے۔

اس لیئے، ـــ ان کے دشمن اور مخالف بھی ان کا احترام کرتے اور ان سے ملتے رہنے کو اپنے لیے شرف و سعادت سمجھتے تھے۔

علامہ مرحوم کے علمی کارناموں، سیاسی افکار اور سماجی خدمات کے بارے میں انشاء اللہ بعد میں مفصل معلومات نذر کی جائیں گی۔ یہاں ہم آپکے تالیفات کا ایک نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ قارئین کرام "بوستان فاضل" کے نام سے انکی کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتابیں ان کے ان مضامین اور تحقیقی مقالوں کے علاوہ ہیں جو دنیا بھر کے مختلف علمی و تحقیقی اور ادبی و مذہبی رسالوں اور جنرلز میں اردو، فارسی اور عربی زبان میں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئے یا مختلف کتابوں کے مقدموں اور دیباچوں کے طور پر چھپے ہیں ـــ خاص طور سے ۵۵ تحقیقی مقالات جو اردو اور عربی انسائیکلوپیڈیا میں شائع ہوئے ہیں، اور ۵۵ جو اندرون ملک اور بیرون ملک دو سو سے زائد تحقیقی سیمینار اور کانفرنسوں میں پڑھے گئے ہیں۔

تالیفات علامہ مرحوم کے تالیفات کے سلسلہ میں ہمارے معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح مرتب ہوتا ہے:

تقریبی تعداد: ۳۱۰	معلوم: ۲۲۵	مطبوعہ: ۱۰۰	غیر مطبوعہ: ۱۰۲	مفقود: ۲۳

نامعلوم: ۸۵	اردو: ۱۴۴	عربی و اردو: ۲۸	عربی: ۳۲	فارسی و اردو: ۳	فارسی: ۱۲
	عربی و فارسی: ۲				

رحلت یہ عظیم ہستی، ـــ اتوار، ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ، مطابق، ۲۳ اگست ۱۹۸۷ء کو میو اسپتال لاہور کے ایسٹ میڈیکل وارڈ میں، ۹ بجے صبح کے قریب دار فنا سے دار بقا کی جانب پرواز کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ رضا بقضائہ و تسلیماً لامرہ۔

ان کی تشییع جنازہ میں لاکھوں شیعہ سنی علماء و عوام نے شرکت کی اور شیعہ، سنی ـــ دونوں طریقوں کے مطابق نماز جنازہ ادا کی گئی۔

مدفن علامہ مرحوم کو ان ہی کے رہائشی محلہ میں مسجد شاہ کمال کے عقبی دروازے کے قریب ان کے بھائی سید علی مرحوم کے نزدیک قبرستان شاہ کمال میں سپرد خاک کیا گیا ـــ نور اللہ مرقدہ الشریف۔

وصیت سب کے لیئے ان کی وصیت فقط ایک ہی تھی: ولا تموتن الا و انتم مسلمون (قرآن کریم) ـــ صرف اور صرف اسلام پر جان دینا ـــ اللہ جل جلالہ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ، مرحوم کے درجات کو بلند کرے، ان کو اپنے دامن رحمت اور جوار ائمہ اہل بیت و حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مقام بلند عنایت فرمائے ـــ اور، ہمیں اسلام کی راہ میں جان قربان کرنے کی سعادت عطا فرمائے۔

آمین بحق محمد وآلہ الطاہرین۔

جناب مصطفیٰ محقق

ترجمہ: جناب سید احتشام عباس زیدی



مصادر فقہ

عقلی دلیل اور اس کی قسمیں:-

دلیل عقلی کی تعریف ــــ عقل، جو کتاب و سنت کی طرح ایک مستقل مصدر و منبع فقہ ہے۔ اس سے مراد ہر وہ حکم عقل ہے جو کسی شرعی حکم کی قطعیت کا سبب قرار پائے۔ دوسری لفظوں میں ہر وہ عقلی قضیہ جس سے حکم شرع کے سلسلہ میں قطعی علم حاصل کیا جا سکے اسے حکم یا دلیل عقلی کہا جاتا ہے۔

دلیل عقلی کے لئے یہ شرط کہ وہ حکم شرع کے لئے "قطعی علم" کے حصول کا سبب ہو اس لئے ہے کہ وہ طریقے اور وسائل جو صرف ظن اور گمان کا سبب بنتے ہیں، نہ پورے طور سے شبہ کو دفع کر پاتے ہیں اور نہ انسان کو یقین و قاطعیت کی منزل تک پہنچا پاتے ہیں، کسی بھی طرح حجت نہیں بن سکتے اور صرف قطع و یقین ہی ایسی چیز ہے جو بغیر کسی دلیل کی مدد کے خود ذاتی طور پر حجت بن سکتی ہے۔ ظن و گمان کے طریقے جو ذاتی طور پر حجت نہیں ہیں صرف ایک ہی صورت سے دلیل و حجت بن سکتے ہیں اور وہ یہ کہ حجت کہلانے والے مصادر یعنی کتاب و سنت و عقل وغیرہ میں سے کوئی ایک ان کی تائید کر دے۔

دلیل عقلی کی قسمیں:-

مندرجہ بالا تعریف کی بنیاد پر دلیل عقلی کی دو قسمیں ہیں:

۱) مستقلات عقلیہ ۲) غیر مستقلات عقلیہ

یہ دونوں اصطلاحیں اصولیوں کے یہاں رائج ہیں لیکن ان کی مزید وضاحت کے لئے تھوڑی سی تشریح کی ضرورت ہے۔

۱) مستقلات عقلیہ۔

اس سے مراد احکام عقلی کا وہ سلسلہ ہے جس میں عقل خود مستقل طور پر بغیر کسی شرعی مداخلت کے اپنا حکم جاری کرتی ہے مثلاً عدالت کی خوبی یا ظلم وستم کی بدی وغیرہ۔
ایسے موقعوں پر حکم شرع کے ظاہر کرنے کے لئے ایک منطقی قیاس واستدلال اس طرح تشکیل دیا جاتا ہے کہ حکم عقل کو صغریٰ قرار دیتے ہیں اس کے بعد اس پر کلی کبریٰ "(عقل جس چیز کا حکم دیتی ہے شرع بھی اسی چیز کا حکم دیتی ہے)" کا اضافہ کر کے نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ یہ عقلی حکم بھی دراصل شرعی حکم ہے۔
ان تمام مراحل میں حکم شرع کو ظاہر کرنے کے لئے صرف عقل کا عنصر ہی کارفرما نظر آتا ہے یعنی اس منطقی قیاس کا صغریٰ وکبریٰ دونوں ہی حکم عقل سے تشکیل پایا ہے۔ اسی بنا پر ان کو مستقلات عقلیہ کہتے ہیں۔

۲) غیر مستقلات عقلیہ۔

ایسے مواقع کو کہتے ہیں جہاں حکم شرع کو ظاہر کرنے کے لئے صرف عقل ہی موثر عنصر نہ ہو بلکہ شرعی حکم ہو جانے کے بعد عقل کا کام شروع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شرع مقدس نے کسی عمل سے متعلق اپنا حکم جاری کیا اور اسے واجب قرار دیا۔ اب اگر اس عمل کا انجام دینا براہ راست دوسرے عمل کی انجام دہی پر موقوف ہو یعنی اس واجب عمل کے لئے دوسرا عمل ایک مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہو، تو ایسے موقعوں پر اگرچہ شرع مقدس نے مقدمہ کے واجب ہونے کی صراحت نہیں کی ہے لیکن چونکہ ذی المقدمہ یعنی اس عمل واجب کا انجام دینا بغیر مقدمہ پر عمل کے ممکن نہیں ہے لہٰذا ایسی جگہ پر عقل حکم شرعی کی بنیاد پر مقدمہ کے وجوب کا بھی حکم دیتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ شارع مقدس نے حج کے عمل کو مکلفین پر واجب قرار دیا لیکن مکہ معظمہ تک مسافت طے کرنے کی صراحت اپنے حکم میں نہیں کی۔ یہاں عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ چونکہ فریضۂ حج کا انجام دینا اور اس کے لئے مسافت طے کرنا دونوں عقلی طور سے لازم و ملزوم ہیں ۔ لہٰذا ذی المقدمہ (عمل حج) کے وجود کے لئے شارع مقدس کے حکم سے لازمی طور سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مقدمہ (مسافت کا طے کرنا) بھی واجب ہے۔
اس طرح کی عقلی دلیلوں کو غیر مستقلات عقلیہ کہتے ہیں۔ کیونکہ عقل تنہا حکم شرع کے بغیر مقدمہ کے وجوب کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ شارع کے حکم یعنی ذی المقدمہ کے وجوب کی مدد سے اس حکم (مقدمہ) کے وجوب کو ظاہر کرتی ہے۔

اگرچہ علمائے اصول نے غیر مستقلات عقلیہ کی بحث میں گوناگوں عنوانات کو موضوع بحث بنایا ہے مثلاً مقدمۂ واجب، بحث ضد، بحث اجزاء وغیرہ لیکن ہم صرف مقدمۂ واجب کی بحث کا ایک جائزہ پیش کرتے ہوئے قارئین کو دوسری بحثوں کے لئے تفصیلی کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔[1]

مقدمۂ واجب — جب بھی شارع مقدس کی طرف سے عائد کردہ حکم واجب اور دوسرے عمل میں ایسا اٹوٹ ربط پایا جائے کہ بلا دوسرے عمل کے انجام دیئے اس واجب حکم پر عمل کرنا ممکن ہی نہ ہو تو ایسے حالات میں عمل واجب کو ذی المقدمہ اور اس دوسرے عمل کو مقدمہ کہتے ہیں۔

صاحب معالم الاصول فرماتے ہیں کہ: مقدمہ واجب وہ عمل ہے کہ بغیر اس کے واجب انجام نہیں پا سکتا۔[2] علمائے اصول مندرجہ بالا عنوان کے تحت یہ بحث کرتے ہیں کہ شارع کی طرف سے ذی المقدمہ کے حکم کو جاری کرنے کے سبب کیا عقلی و منطقی طور سے اس کے مقدمہ کا وجوب بھی لازمی ہے؟

واضح رہے کہ یہ بحث غیر مستقلات عقلیہ کے مصداقات میں سے ہے کیوں کہ یہاں بحث اس پر نہیں ہے کہ شارع کا حکم، اس عمل کے مقدمہ کے وجوب پر لفظی دلالت کرتا ہے یا نہیں بلکہ دراصل بحث اس بنیاد پر ہے کہ ذی المقدمہ اور مقدمہ دونوں عقلی اعتبار سے لازم و ملزوم ہیں۔ الفاظ کی بحث سے انکا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ موضوع کی وضاحت کے لئے حسب ذیل مسائل کا جاننا ضروری ہے۔ اصولیین نے مقدمہ کی چند قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

مقدمۂ وجوب و مقدمۂ واجب — یعنی کبھی ایک عمل کا وجوب دوسری چیز پر اس طرح موقوف ہوتا ہے کہ اگر وہ چیز وجود میں نہ آئے تو شارع کا حکم، مکلف سے متعلق نہ ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حج کا وجوب، انسان کی مالی استطاعت اور اس کی صحت پر موقوف ہے۔ جب تک اسے یہ استطاعت حاصل نہ ہو حج واجب نہیں ہو سکتا۔ یا دوسری مثال یہ ہے کہ انسان پر عاید ہونے والے تمام واجبات اس کے بلوغ و عقل پر موقوف ہیں اور اس کے بالغ و عاقل ہونے سے پہلے کوئی عمل انسان پر واجب نہیں ہوتا۔ حقوق سے متعلق مسائل میں بھی اکثر یہی بات پائی جاتی ہے۔ مثلاً شوہر پر بیوی کا نفقہ صرف اسی وقت واجب ہے جب بیوی تمکین[3] کرے۔ لیکن اگر بیوی تمکین نہ کرے تو شوہر پر اس کا نفقہ بھی واجب نہ ہوگا۔ اور اس کی کوئی گرفت نہ ہوگی نہ وہ عقاب یا سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ اسی کو اصول کی اصطلاح میں مقدمۂ وجوب کہتے ہیں۔

---

[1] کفایۃ الاصول، محقق خراسانی — تقریرات آقا ضیاء عراقی — تہذیب الاصول (تقریرات حضرت امام خمینی مدظلہ العالی)

[2] معالم الاصول، بحث مقدمۂ واجب

[3] شوہر کی جائز جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے آمادگی۔

مقدمۂ واجب یہ ہے کہ خود واجب کا وجود کسی دوسرے عمل پر موقوف ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اسے مقدمۂ وجود کہا جائے۔ مثلاً خود حج کا وجود پاسپورٹ، ویزا اور مکہ تک کی مسافت طے کرنے پر موقوف ہے ان امور کو مقدمۂ واجب کہا جاتا ہے لہٰذا واجب کا مقدمہ خود واجب کی انجام دہی میں دخل رکھتا ہے نہ کہ وجوب کے تحقق میں ــــ اور ہماری بحث مقدمۂ واجب یعنی مقدمۂ وجود کے موضوع پر ہے نہ کہ مقدمہ وجوب پر۔

مقدمۂ داخلی اور مقدمہ خارجی ــــ جب کوئی عمل واجب چند اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے تو اس واجب کا انجام دینا اس کے تمام اجزاء کے بجالانے پر موقوف ہوگا۔ چنانچہ اس واجب کا اپنے تمام اجزاء سے رابطہ و تعلق "مقدمی" کہلائے گا اور اصطلاح میں خود ان اجزاء کو مقدمۂ داخلی کہتے ہیں مثلاً نماز ایک عمل واجب ہے جس کے اجزاء قیام، رکوع و سجود وغیرہ ہیں۔ اس کے برعکس مقدمۂ خارجی ہے جو واجب کا جزو نہیں بلکہ واجب سے خارج اور بذات خود مستقل ایک عمل ہے۔ مثلاً حج کے فریضہ کو انجام دینے کے لئے مسافت کا طے کرنا۔ یہاں بحث دوسری قسم یعنی مقدمۂ خارجی سے متعلق ہے۔ کیوں کہ مقدمۂ داخلی میں بلا شبہ شارع کا حکم واجب ہے متعلق اس کے تمام اجزاء کو بجالانے کے لئے صادر ہوا ہے۔ مزید یہ کہ علمائے اصول کے بہت سے گروہ کلی طور پر مقدمات داخلی کو مقدمہ کی قسموں میں شمار نہیں کرتے ہیں[1]

مقدمۂ شرعی اور مقدمۂ عقلی ــــ مقدمۂ شرعی وہ عمل ہے جس کے بغیر عمل واجب کو انجام نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن مقدمہ اور ذی المقدمہ میں عقلی طور پر کوئی رابطہ و ملازمہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ شارع مقدس شرعی دلیلوں کے ذریعہ اسے بجالانے کا حکم دیتا ہے۔ مثلاً طہارت اور نماز ــــ یہاں طہارت، نماز کے مقدمات شرعیہ میں سے ہے اور اسے نماز کو صحیح بجالانے کے لئے شرعی حیثیت سے واجب قرار دیا گیا ہے۔ لیکن عقلی طور سے یہ دونوں لازم و ملزوم نہیں ہیں یعنی اگر یہ حکم شرعی نہ ہوتا کہ طہارت نماز کے لئے لازم ہے تو ممکن نہ تھا کہ عقل مستقل طور سے اس کے ــــ وجوب کو درک نہ کر پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر بعض بظاہر مذہبی اجتماعات میں لوگوں نے کوشش شروع کر دی کہ تمام دینی احکام اور شرعی واجبات عقل کی میزان پر پرکھے جائیں۔ اور وہ لوگ اس سلسلہ میں بظاہر علمی لیکن درحقیقت سطحی اور ناقص سعی لاحاصل کرتے ہیں جبکہ ان کی توجیہات شرعی قوانین سے ذرا بھی میل

[1] رجوع فرمائیں۔ کتاب کفایۃ الاصول، محقق خراسانی ج ۱ ص ۱۴۰

نہیں کھاتیں۔ شارع مقدس نے خود یہ اعلان کیا ہے "لاصلوٰۃ الا بطہور" اور اس ذریعہ سے اس نے خود، نماز و طہارت کا تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ اپنی ناقص عقل اور بے سروپا توجیہات و استدلالات سے ان واضح قوانین و احکام کی توجیہ کر ڈالیں۔ ۱۱

مقدمہ عقلی وہ عمل ہے جس میں خود عقل مقدمہ اور ذی المقدمہ کے درمیان ارتباط پیدا کرتی ہے اور اس سلسلہ میں حکم شرعی کا وجود نہیں پایا جاتا۔ مثلاً حج کے فریضہ کے لئے مکہ تک کی مسافت کا طے کرنا کیونکہ اس کے بغیر مناسک حج کا بجالانا عقلی طور پر ممکن ہی نہیں ہے۔

علمائے اصول نے مقدمہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ واجب کی بھی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

واجب نفسی اور واجب غیری ــــ واجب نفسی ایسا واجب ہے جس سے مستقل طور پر شارع کا حکم متعلق ہو۔ یعنی خود وہ عمل ہی شارع کا مقصود ہو۔ مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ یہ اعمال بذات خود واجب ہیں اور شرعی مصلحت کے حامل ہیں لیکن واجب غیری وہ عمل ہے جو دوسرے عمل کی انجام دہی کے سلسلہ میں لازم و ضروری ہوتا ہے۔ اور بذات خود شارع کے حکم کے تحت نہیں آتا۔ مثلاً حج کے لئے پاسپورٹ وغیرہ کا حاصل کرنا۔ یہ اعمال مستقل طور سے خود شارع کا مقصود قرار نہیں پاتے۔ نہ ان میں شارع کی طرف سے کوئی مصلحت پائی جاتی ہے، بلکہ یہ فقط فریضۂ حج کے لوازم شمار کئے جاتے ہیں۔

واجب نفسی کا اثر یہ ہے کہ اس کا ترک کرنا گناہ اور سزا کا باعث ہوتا ہے اور اس کا انجام دینا ثواب و جزا کا سبب بنتا ہے۔ جبکہ واجب غیری چونکہ مستقل طور سے شارع کے حکم کے تحت نہیں آتا لہٰذا اس کا ترک کرنا بھی براہ راست سزا و عقوبت کا سبب نہیں بنتا۔ مثال کے طور پر اگرچہ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے پاسپورٹ لازم و ضروری ہوتا ہے لیکن خود اس کے لئے پاسپورٹ لینا یا نہ لینا شرعی طور سے سزا یا جزا کا موجب نہیں ہوگا اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر حج کے لئے مستطیع شخص اپنے واجب حج کی ادائگی سے منہ موڑے اور اس کے مقدمات مثلاً پاسپورٹ وغیرہ کے امور نہ انجام دے تو وہ شرعی حیثیت سے صرف حج کے ترک کرنے کی بنا پر سزا و عقاب کا مستحق ہوگا۔ اس کے مقدمات فراہم نہ کرنے کی بنا پر گناہ گار نہ ہوگا۔ جس طرح مثلاً وہ فریضہ حج کے ارادے سے اس کے مقدمات بھی بجالائے اور اپنی شرعی تکلیف یعنی حج بھی ادا کرلے تو وہ صرف اصل واجب یعنی فریضۂ حج کی ادائیگی کی بنا پر ثواب کا مستحق ہوگا۔ حج کے مقدمات کی فراہمی کے سلسلہ میں براہ راست اسے کوئی جزا نہ ملے گی۔ چنانچہ واجب غیری یا مقدماتی واجب، اصل واجب کے ساتھ وابستہ ایک ایسا واجب ہے جو صرف اصل

واجب کی بجاآوری کے لئے لازم ہے نہ تو اس کی کوئی مستقل حیثیت ہے اور نہ اس میں کوئی شرعی مصلحت پائی جاتی ہے۔

مقدمات مفوّتہ (فوت ہوجانے والے مقدمات) کیا ہیں؟ - اسلام میں بعض واجبات مخصوص اوقات سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً حج و روزہ جو سال کے خاص دنوں اور معین اوقات میں بجالائے جاتے ہیں۔ اس طرح کے واجب خاص دنوں اور اوقات سے مخصوص ہونے کی بناپر واجبات "موقّتہ" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور ان واجبات کی بجاآوری کے لئے اکثر ایسے "مقدمات" پیش آتے ہیں جنھیں مکلف کو اصل فریضہ کی ادائگی کا وقت آنے سے پہلے بجالانا چاہیئے۔ اصول کی اصطلاح میں ان مقدمات کو "مقدمات مفوّتہ" کہتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں ترک کرنے کی صورت میں اصل واجب انجام نہیں پاسکتا اور فوت ہوجائے گا۔

شرع مقدس میں مقدمات مفوّتہ کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ حج ایک ایسا فریضہ ہے جو موقتی واجبات میں سے ہے جس کی ادائگی مخصوص زمانہ میں ماہ ذی الحجہ کے مخصوص دنوں میں انجام پاتی ہے۔ اب اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے لازمی ہے کہ صاحب استطاعت شخص حج کا زمانہ نزدیک آنے سے پہلے اپنے وطن کو چھوڑ کر مسافرت اختیار کرے اور اپنے آپ کو مکہ تک پہنچائے۔ کیونکہ دوسری صورت میں حج کے ایام گذر جائیں گے اور حج کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا چنانچہ وہ یہ فریضہ انجام نہ دے پائے گا۔

اصولیین نے اس عنوان کے تحت ذی المقدمہ یعنی اصل واجب کے وقت کے پہلے مقدمات کے وجوب کی کیفیت اور ان کی اصل واجب سے وابستگی اور تعلق پر دقیق و عمیق بحثیں کی ہیں۔ منجملہ شیخ انصاری کی کتاب فصول، اور محقق خراسانی کی کفایۃ الاصول وغیرہ میں تفصیلی بحثیں موجود ہیں جس کی اس مختصر سے رسالہ میں گنجائش نہیں۔ صاحبان ذوق مذکورہ مصادر سے رجوع فرما سکتے ہیں۔[1]

نزاعی موضوع : مندرجہ بالا گفتگو کے مطابق اس موضوع پر بحث یہ ہے کہ جب بھی شارع مقدس کے حکم سے کوئی ایسا عمل واجب ہو جس سے متعلق خارجی اور عقلی مقدمات کا ایک ایسا سلسلہ پایا جائے کہ بغیر ان کے انجام دیئے اس واجب عمل کا انجام دینا ممکن نہ ہو۔ تو واجب ہے اس کے مقدمات کی عقلی و منطقی وابستگی کی بناپر اصل واجب کے ساتھ اس کے مقدمات کا بھی انجام دینا عقلاً لازم ہوگا اور عقل اس کا حکم دیتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ عقل کے حکم کی بناپر کیا اس میں ایک "کبریٰ کلی" کے اضافہ سے لازمی طور پر اس مقدمہ کے

---

[1] تہذیب الاصول، تقریرات درس امام خمینی مدظلہ العالی۔ الفصول فی الاصول، شیخ حائری۔ تقریرات شیخ مرتضیٰ انصاری — کفایۃ الاصول، ملا محمد خراسانی - درر الاصول، شیخ عبدالکریم حائری یزدی۔

شرعی وجوب کا نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا؟ مندرجہ بالا مفروضہ کی بنیاد پر جب مقدمہ و ذی المقدمہ دونوں عقلاً لازم و ملزوم ہیں تو عقل کے حکم کے ذریعہ مقدمہ کا بجالانا بھی واجب ہے۔ چنانچہ لوگ جو مقدمہ کے وجوب کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ مقدمہ کا بجالانا عقلاً لازم ہے تو ہم حسب ذیل منطقی قیاس تشکیل دے کر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

صغریٰ = مسافت کا طے کرنا (مقدمۂ حج) عقلاً واجب ہے۔

کبریٰ = تمام عقلی واجبات شرعاً واجب ہیں۔

نتیجہ = مسافت کا طے کرنا (مقدمہ حج) شرعاً واجب ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نتیجہ کے تحت مقدمہ کے وجوب سے متعلق شارع کے حکم سے مراد وجوب مقدمی یا وجوب غیری ہے نہ کہ وجوب اصلی یا نفسی یعنی یہ مقدمۂ واجب خود بطور مستقل واجب نہیں ہے اور نہ کوئی شرعی مصلحت ہی اس پر مرتب ہوتی ہے۔ کیونکہ اصل واجب کا انجام دینا یا ترک کرنا ہی ثواب یا عقاب کا سبب بنتا ہے لیکن اگر مکلف سارے مقدمات کو بجالائے اور کسی ناگہانی سبب کے تحت جو اس کے اختیار سے باہر ہے، اصل واجب کو انجام نہ دے پائے تو ایسی صورت میں وہ مقدمات کے مراحل طے کرنے اور واجب کو بجالانے کی کوشش کے نتیجہ میں جزا و ثواب کا مستحق قرار پائے گا۔

نزاع کا نتیجہ، فقہا، مقدمۂ واجب کو عملی اعتبار سے مفید و پر ثمر نہیں جانتے بلکہ صرف علمی و نظریاتی طور سے اس پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض مقامات پر مثلاً مقدمات مفوتہ میں اس کی تحقیق افادیت سے خالی نہیں بلکہ بعض حقوقی اور شہری مسائل میں بھی یہ نتیجہ خیز اور فائدہ بخش ہے۔ مثال کے طور پر حقوقی اور شہری قانون کے دائرہ میں ایک شخص ایک معاہدہ کے ذریعہ کسی آدمی پر ایک کام کے انجام دینے کو لازم اور ضروری قرار دے اور جس سے معاہدہ کیا گیا ہے وہ اس کام کے لئے آلات و وسائل فراہم کرے اور دیگر مقدمات کو طے کرے لیکن اصل کام شروع ہونے سے پہلے معاہدہ کرنے والا اس کام کو منع کر دے اور معاہدہ بھی منسوخ کر دے ایسی صورت میں یہ شخص جس نے اس کام کے لئے مقدمات و وسائل فراہم کئے تھے اب وہ ان کی فراہمی کی اجرت و مزدوری کا حقدار ہوتا ہے یا نہیں؟ یا پھر وہ بیچارہ گھاٹا برداشت کرے گا؟

متاخرین میں سے آیت اللہ ضیاء الدین عراقی مرحوم نے (ان کے درس کی تقریرات کے مطابق) اس موضوع کو بحث کا ثمرہ اور نتیجہ بتایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم مقدمۂ واجب کو واجب جانیں تو مقدمات بھی اس کے حکم میں شامل ہوں گے۔" ایسی صورت میں چاہے واجب مقدمی اور اس عمل کے تابع کام کا حکم دینے والے کی طرف سے

یہ مقدمات بھی واجب ہوں گے اور حکم دینے والا ان مقدمات کا ضامن ہوگا لیکن اگر مقدمہ واجب نہ ہو تو اصل حکم سے اس کا کوئی ربط نہ ہوگا اور فقط ذی المقدمہ یعنی اصل عمل ہی حکم میں شامل قرار پائے گا مقدمات اس سے خارج شمار کئے جائیں گے" اور معاہدہ منسوخ ہونے کی صورت میں حکم دینے والا ضامن نہ ہوگا اور نہ عمل کرنے والا شخص اجرت کا مستحق ہو سکتا ہے[1]۔

بحث عقل میں نزاعی متعلقات: گذشتہ تقسیم (مستقلات عقلیہ و غیر عقلیہ) میں ظاہری طور سے علمائے اسلام کے درمیان کبریٰ میں کوئی اختلاف و نزاع نہیں پائی جاتی۔ اور اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ اس کے صغریٰ میں ہے۔ مثلاً مقدمۂ واجب کی بحث میں جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں کہ عقل مقدمہ اور ذی المقدمہ کے لازم و ملزوم ہونے کو درک کر سکتی ہے اور اس کا یہ ادراک حجت و دلیل بھی ہے۔ ہاں اگر علمائے اصول کے درمیان بحث ہوتی ہے تو صرف اس کے صغریٰ میں ہے یعنی مقدمہ اور ذی المقدمہ میں تلازم موجود بھی ہے یا نہیں۔

در حقیقت یہ کلی نزاع اور اصلی کشمکش پہلی قسم یعنی مستقلات عقلیہ میں پائی جاتی ہے۔ اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امامیہ مجتہدین اس مسئلہ میں تین محاذ پر نبرد آزما رہے۔ ایک طرف اشاعرہ سے علم کلام کے میدان میں دوسری طرف اخباریین سے اور تیسری طرف خود اپنے ہم مسلک اصولیین سے داخلی ٹکراؤ رہا ہے۔ ذیل میں ہم تینوں محاذوں کے نزاعی نکتوں کی وضاحت و توجیہ کرتے ہیں۔

الف) دلیل عقلی کے موضوع پر جو سب سے پہلی بحث پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ شارع کے ارشادات سے قطع نظر خود انسان کے افعال و کردار کی ذاتی طور پر کیا قدر و قیمت ہے؟ یہ افعال اچھے یا برے ہوتے ہیں یا نہیں؟ ذاتی طور سے ان میں کوئی نیکی یا بدی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یا یہ نیکی و بدی شارع کے نظریہ کے تحت تعیین ہوتی ہے۔ یعنی اچھا کام وہ ہے جسے شارع اچھا کہے اور برا کام وہ ہے جسے شارع برا کہے۔ یہی وہ مشہور نزاعی نکتہ ہے جو امامیہ اور اشاعرہ کے درمیان فکر اسلامی کی تاریخ میں "عقلی حسن و قبح" کے عنوان سے بحث کا موضوع رہا ہے۔ علمائے امامیہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کے افعال میں ذاتی طور پر نیکی و بدی پائی جاتی ہے۔ جبکہ اشاعرہ اسے حکم شارع کا تابع سمجھتے ہیں۔

نزاع کا اہم ترین ثمرہ اس کے ابتدائی ایام میں خداوند عالم کی عدالت کے مسئلہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اشاعرہ چونکہ انسان کے افعال کی ذاتی طور پر کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتے۔ لہٰذا انہوں نے یہ کہنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہ کی کہ ممکن ہے کہ خداوند عالم بعض موقعوں پر اپنے بندوں پر ظلم بھی کرے۔ کیونکہ جو کچھ خدا کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں پائی جاتی۔ لیکن امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ظلم و ستم ایسے اعمال ہیں کہ شارع

[1] بدیع الافکار، ص ۳۹۷

کے ارشادات سے قطع نظر، بذات خود قبیح و زشت ہیں اور عدل و داد مستحسن ہیں۔ نیز خدا وند عالم سے قبیح اعمال کا سرزد ہونا قبیح ہے لہٰذا انھوں نے اس نظریہ کی بھرپور اور کھلی ہوئی حمایت کی ہے کہ خداوند عالم عادل ہے اور ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا[1]
یہی وجہ ہے کہ امامیہ فرقہ کو عدلیہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اور یہ عدل، امامت کے شانہ بشانہ ہے جو دو اصل کی صورت میں ہمارے مذہب کی بنیاد شمار ہوتی ہیں۔

ب) پہلے مرحلہ سے گذرنے کے بعد جب یقین کے ساتھ ہم اس بات کے قائل ہو گئے کہ افعال، بذات خود خوبی یا بدی سے متصف اور مستحسن و قبیح ہوتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عقل، افعال کی اچھائی یا برائی کو بغیر شرع کی مدد کے درک بھی کر سکتی ہے؟ اور کیا مکلف پر یہ بات عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ادراک کے ذریعہ بغیر شارع کے حکم کے صرف عقل کے ادراکات و تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہو یا نہیں؟ بلکہ افعال کی قدر و قیمت اور حیثیت قبول کر لینے کے باوجود، عقل بغیر شرع کی رہنمائی کے افعال کی اچھائی یا برائی کو درک نہیں کر سکتی۔ اور انسان شرع کی مدد سے ہی عقل کے محسوسات و ادراکات پر عمل کر سکتا ہے؟

یہ مسئلہ اصولیوں اور اخباریوں کے ایک گروہ کے درمیان اختلاف کا مرکز بنا ہے۔ اخباریوں کا گروہ مذکورہ دوسرے نظریہ کا قائل ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں اگر پہلے والے مسئلہ یعنی ان کے افعال کی ذاتی و مستقل قدر و قیمت کا صحیح تجزیہ و توضیح کر لی جائے تو شاید عقل کے ذریعہ افعال کی قدر و حیثیت کو پہچاننے اور درک کرنے کے مسئلہ کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت باقی نہ رہے ہم آیندہ تفصیل کے ساتھ اس موضوع کی وضاحت کریں گے۔

ج) افعال کی قدر قیمت۔ اس کے اچھے یا برے صفات کو مان لینے اور یہ بھی تسلیم کر لینے کے بعد کہ عقل خود ان صفات کو محسوس کرتی ہے۔ اب گفتگو یہ ہے کہ کیا عقل، افعال و اعمال کی نیکی و بدی کو محسوس کرنے کے بعد ایسا حکم بھی صادر کر سکتی ہے کہ اس کے اور شرع کے حکم میں باہم ملازمت پائی جائے۔ یعنی عقل جس عمل کو اچھا یا برا کہے شرع بھی محسوسات عقل کے مطابق وہی حکم دے؟ یا پھر ایسی ملازمت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقل ایک عمل کی اچھائی یا برائی کو محسوس کر لے لیکن پورے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہی شارع کا حکم بھی ہوگا۔

---

[1] سورہ نساء / ۴۰

اس مسئلہ میں جسے اصول فقہ میں "ملازمت و تلازم کا مسئلہ" کہتے ہیں علماء اصول کے درمیان اختلاف
ظر پایا جاتا ہے ۔ بہت سے اصولیین حتیٰ کہ صاحب فصول بھی ہیں انہوں نے بھی اخباریوں کی طرح احکام عقل
احکام شرع کی ملازمت و تلازم سے انکار کیا ہے ۔

بیشتر بلکہ اجماع و اتفاق کی حد تک علماء اصول نے مذکورہ بالا تینوں مراتب یعنی افعال انسانی کی
ذاتی و مستقل قدر و قیمت، عقل کا ان اقدار کو درک کرنا اور محسوسات عقلیہ اور حکم شرع کی باہم ملازمیت کو
ابت کرتے ہوئے حکم شارع کے سلسلہ میں علم و یقین کو حجت بھی تسلیم کیا ہے ۔ لیکن اخباریین ان تینوں مرحلوں کو تسلیم
رنے کے باوجود بھی بعض روایات مثلاً "ان دین اللّٰہ لا یصاب بالعقول" یعنی صرف عقل کے ذریعہ
مدا کے دین کو حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔ پر تکیہ کر کے مذکورہ بالا قطع و یقین کی حجیت کو رد کرتے ہوئے کہتے
ہیں کہ اس قطع و یقین کو شارع کی طرف سے اس روایت کے ذریعہ غلط قرار دیا گیا ہے ۔

البتہ اس بات کا جواب تو کافی حد تک دیا جا چکا ہے کہ قطع کی حجیت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا
جا سکتا کیوں کہ یہ حجیت بناوٹی یا گڑھی ہوئی نہیں ہے بلکہ قطع کو حجیت سے جدا کرنا آفتاب سے روشنی کو جدا کرنے
کے مترادف اور عقلاً محال ہے ۔ اس حدیث سے جو معنی مراد لئے گئے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہیں ۔ کیوں کہ جب
ہم ایسی روایات کی شان صدور اور اس کے مخصوص زمانہ پر غور کرتے ہیں جس میں ائمہ معصومین ؑ نے ان روایات
کو پیش کیا ہے تو یہ بات پورے طور سے روشن ہو جاتی ہے کہ ان حضرات ؑ نے درحقیقت بے اساس و بے بنیاد
اجتہاد، بے دلیل نتیجہ گیری اور غیر منطقی قیاس آرائی کے ذریعہ شخصی طور پر احکام اسلامی کے استنباط کو رد کرنے
اور اس فرس بے لگام کو روکنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا تھا ۔

مندرجہ بالا تجزیہ و تحلیل اور تقسیم، بحث کے مختلف پہلوؤں اور اس میں موجود گوناگون نزاعی
وشوں کو پورے طور سے واضح کر دیتی ہے ۔ لیکن میرے خیال میں اس بحث کے مختلف پہلوؤں کا اصل
محور و مرکز وہی پہلا مسئلہ ہے ۔ اور اگر اسی نکتہ پر مکمل نقد و تبصرہ کیا جائے تو دوسرے تاریک گوشے
خود بخود روشن ہو جاتے ہیں ۔ کیوں کہ افعال انسانی کے لئے واقعی قدر و قیمت تسلیم کر لینے کے بعد امکان
ادراک عقل سے انکار یا پھر تابعیت عقل و حکم شرع کی ملازمت سے انکار کرنا معقول نہیں معلوم ہوتا ۔ چنانچہ اگر
س پہلے نظریہ کی ہر طرح سے تحقیق کی جائے اور اشعری حکما و متکلمین کے مقابلے میں امامیہ فقہا کے موقف کو
ابت نیز عقلی و ذاتی حسن و قبح کے معنی کی پوری وضاحت کی جائے تو یہ دعویٰ مدلل طور سے ثابت ہو جائے گا ۔

افعال کی ذاتی قدر و قیمت کے بارے میں اشاعرہ و عدلیہ کی نزاع — ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اشاعرہ شارع کے بیان سے الگ ہو کر افعال کی خوبی یا بدی کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ خوب وہ عمل ہے جسے خود شارع پسند کرے اور اسے بجالانے کا حکم دے اور بد وہ عمل ہے جسے شارع ناپسند کرے اور اس سے منع کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمام افعال و اعمال جو اس وقت شریعت مقدسہ میں خوب اور نیک شمار ہوتے ہیں اگر اس کے برعکس شارع ان پر عمل کرنے سے روک دیتا تو وہ سب افعال بد اور قبیح ہو جاتے اور عقل کی کچھ چل نہ پاتی۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ یہی ہے کہ خوبی یا بدی کی خود ذاتی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ شارع کے امر و نہی پر منحصر ہے۔ لیکن عدلیہ یعنی امامیہ کہتے ہیں کہ شارع کے بیان سے الگ بھی افعال و اعمال کی اپنی ایک حیثیت اور قدر و قیمت ہے۔ البتہ بعض افعال خوبی یا بدی کا پہلو رکھتے ہیں اور بعض افعال نہ ذاتی طور سے خوب ہیں نہ بد بلکہ صرف ان افعال و اعمال کے تابع ہوتے ہیں جو ذاتاً خوب یا بد ہیں۔ امامیہ مزید وضاحت کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ شارع مقدس کا افعال انسانی کے لئے امر یا نہی کرنا ہمیشہ عقل کی بنیاد اور اس کے معیار کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ یعنی شارع جس فعل کا حکم دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل پہلے سے خوب تھا اسی بنا پر شارع نے اس کے بجالانے کا حکم دیا اور کسی کام سے اس کی نہی کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے سے قبیح اور بد تھا اس لئے شارع نے بھی اسے منع کر دیا۔ نہ کہ اس کے امر یا نہی کے مطابق اعمال خوب یا بد ہوں گے۔

خوبی اور بدی — کا صرف ایک ہی مطلب نہیں ہے بلکہ مجموعاً اس سے تین معنی مراد لئے جاتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اشاعرہ ان میں سے کس معنی سے انکار کرتے ہیں۔ آیا وہ ان تینوں معنیوں سے انکار کرتے ہیں یا ان میں سے بعض کو قبول بھی کرتے ہیں۔

۱) خوبی کمال اور بدی، نقص کے معنی میں — مثلاً اگر ہم کہیں کہ انسان کا عالم ہونا خوب ہے اور اس کی جہالت بد۔ تو یہاں خوبی و بدی کے معنی یہ ہیں کہ علم انسان کے عروج و کمال کی نشانی ہے اور اس کے برعکس جہالت انسان کے نقص اور اس کی کمتری کی دلیل ہے۔

۲) خوبی انسان کی طبیعت سے ہم آہنگ اور بدی اس کے برعکس ہے۔ مثلاً ہم کہیں کہ یہ پھول خوبصورت ہے۔ وہ آواز دلنشیں اور سریلی ہے۔ یا وہ وحشتناک منظر خراب ہے۔ وہ تعفن بد ہے تو اس مقام پر خوبی و بدی کا تعلق دراصل ان چیزوں سے انسانی طبیعت کی سازگاری یا ناسازی سے ہوتا ہے۔ حسن و قبح کے ان دو معنی پر سب متفق ہیں کسی کو اس میں اختلاف نہیں۔ اس بات کو اشاعرہ، معتزلہ

وامامیہ نے قبول کیا ہے۔ اور یہ تو واضح ہے کہ اگر ہم کہیں گلاب کے پھول کی مہک اچھی ہے یا علم حاصل کرنا اچھا ہے تو یہ ایسی چیز نہیں کہ اسمیں شارع کے بیان کی ضرورت پیش آئے۔ لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ خوبی و بدی کے مسئلہ میں اختلاف و نزاع دراصل اس کے تیسرے معنی میں ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

۲) کیا خوبی و بدی انسان کے لئے اختیاری افعال کے صفات ہوں؟ مثال کے طور پر عدل خوب ہے اور ظلم بد، احسان و ایثار وفداکاری خوب ہے اور وعدہ خلافی و عہد شکنی بد۔ تو یہاں خوبی و بدی کے معنی یہ ہیں کہ خوب وہ عمل ہے جس کے انجام دینے والے کو اہل خرد اور صاحبان عقل ہونے کی بنا پر اچھا کہیں اور اس کی تعریف کریں اور بد وہ عمل ہے جسے انجام دینے پر اہل خرد، اہل خرد ہونے کی حیثیت سے اس عمل کو انجام دینے والے کی برائی کریں۔ دوسرے لفظوں میں خوب وہ فعل ہے جس کا فاعل عقلا کے نزدیک ستائش اور بد وہ فعل ہے جس کا فاعل عقلا کی سرزنش کا مستحق قرار پائے۔ یہی وہ خوبی یا بدی ہے جس میں اشاعرہ و امامیہ کے درمیان اختلاف و نزاع پایا جاتا ہے۔ اشاعرہ کا موقف یہ ہے کہ عقل کبھی کسی عمل کے انجام دینے والے کو بغیر شارع کے حکم کے مدح و ستائش یا مذمت و برائی کا مستحق قرار نہیں دے سکتی جبکہ امامیہ اس بات کے قائل ہیں کہ عقلا عقلمند ہونے کی بنا پر انسان کے بہت سے اختیاری افعال سے متعلق بغیر شارع کے حکم کی مدد کے عقلی طور پر خود فیصلہ کرکے ان کی تحسین یا مذمت کرسکتے ہیں۔ اور اپنے اسی موقف میں اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عقلا کے ان ہی فیصلوں اور شرع کے احکام کے درمیان ایک تلازم و ملازمت پائی جاتی ہے۔ اور اسی ملازمت و تلازم پر یقین کے ذریعہ ہم احکام شرع تک پہنچ سکتے ہیں۔

اور یہ جو ہم نے عقلا کے عاقل و دانا ہونے کی شرط لگائی ہے تو اس لئے کہ ان کا عاقلانہ پہلو پورے طور سے مشخص ہو کیونکہ بہت سے مواقع پر عقلا کسی عمل کے حسن و قبیح کا اظہار عقل کے حکم کے تحت نہیں کرتے بلکہ اکثر کسی خاص جذبہ کے تحت بھی اعمال کی اچھائی یا برائی بیان کرتے ہیں۔ جو ہمارا مطمح نظر نہیں ہے۔ اور اس پر غور نہ کرنے سے اکثر خلط مبحث ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے اپنے نفسانی جذبات و احساسات سے متاثر ہو کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہو۔ جیسے یہ کہ جانوروں کو مارنا برا ہے یا بیمار کی مدد کرنا اچھا ہے، عموماً خلاف مروت کام کرنا برا ہے یا وطن پرستی خوب ہے وغیرہ ایسے موقعوں پر ان کے فیصلے نرم دلی، شفقت، رحم، حمیت و غیرت جیسے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ عقلا کی ایسی رایوں اور فیصلوں میں عدلیہ و اشاعرہ کے درمیان کوئی نزاع یا ٹکراؤ نہیں ہے۔ عدلیہ امامیہ بھی اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ایسے موقعوں پر شرع کا حکم بھی لازمی طور پر عقلا کی رائے کے موافق ہوگا کیونکہ مندرجہ بالا احکام اگرچہ جمہور عقلا کی طرف سے صادر ہوئے ہیں لیکن یہ احکام عقل کے بجائے احساسات و جذبات

سے متاثر ہوئے ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ فلسفہ کے دلائل و براہین کے مطابق شارع مقدس یعنی خدا وند عالم کے لئے محال ہے کہ وہ بھی جذبات و احساسات سے متاثر ہوتا ہو۔ اس لئے کہ یہ سب ممکن کے صفات ہیں اور خدا واجب ہے۔ واجب میں ممکن کے صفات کا پایا جانا محال ہے۔

مندرجہ بالا مواقع سے روشن اور واضح وہ حالات ہیں جہاں عقلا معاشرہ کے آداب و سنن، رسم و رواج کے پہلوؤں سے متاثر ہو کر فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجلس میں آنے والے کے لئے تعظیماً کھڑے ہونا اور اس کا استقبال کرنا خوب ہے یا مہمان کی عزت افزائی کرنا بہتر ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان فیصلوں کی بنیاد فقط اجتماعی و معاشرتی آداب و سنن پر استوار ہے۔ لہٰذا زمان و مکان کی تبدیلی کے تحت آداب و سنن کی تبدیلی سے یہ فیصلے بدل بھی جاتے ہیں۔ کبھی کوئی فیصلہ ایک سماج میں اور محدود زمانہ کے لئے موزوں ثابت ہوتا ہے اور کبھی دوسرے سماج میں کسی دوسرے زمانہ کے لئے عقل اس کے بالکل برعکس فیصلہ صادر کرتی ہے۔

بہرحال مقصد یہ ہے کہ عدلیہ و امامیہ حکم شرع اور عقل کے ان فیصلوں کی ملازمت و تلازم کے قائل ہیں جو صرف عقلائی جنبہ رکھتے ہوں۔ کسی احساس، جذبات و عادات و رسوم سے متاثر نہ ہوں۔

عقل عملی اور عقل نظری — خوبی و بدی کے تینوں معانی کے تذکرہ کے بعد اس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ تیسرے معنی کا ادراک دراصل عقل عملی کا ادراک ہے جبکہ پہلے اور دوسرے معنی کا ادراک عقل نظری سے تعلق رکھتا ہے۔

حکماء نے انسان کے ادراکات کو انہی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ۱) عقل نظری ۲) عقل عملی۔ یہاں عقل سے مراد وہی معقولات ہیں جنہیں عقل درک کرتی ہے چنانچہ یہی معقولات ہیں جن کو تقسیم کیا گیا ہے ورنہ عقل ایک ہی ہے۔ اس بنا پر اسے معقول نظری و معقول عملی بھی کہہ سکتے ہیں۔

جب عقل، موجودات عالم اور ان کے حقائق کے سلسلہ میں ادراک کرتی ہے تو اسے عقل نظری کہتے ہیں اور جب عقل نیکیوں اور برائیوں، حسن و قبح سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے تو اسے عقل عملی کہتے ہیں۔ دوسری لفظوں میں اشیاء کی معلومات کی فراہمی اور ان کا ادراک عقل نظری کہلاتا ہے مثلاً انسان یہ درک کرے کہ کل جزء سے بڑا ہوتا ہے یا مثلث کے تمام اضلاع مجموعی طور پر قائمہ کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کے وہ حقائق ہیں جو عقل انسانی کی دریافت ہیں اور انسان کو انہیں حاصل کرنا چاہیے لیکن یہ حقائق انسان کے افعال و اعمال سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں رکھتے۔ ایسے ادراکات عقل نظری شمار ہوتے ہیں۔ اور اگر انسان ایسے اعمال کا ادراک کرے جو اس کے افعال

و کردار سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں تو ان ادراکات کو عقل عملی کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عقل درک کرے کہ عدل شائستہ اور خوب ہے اور انسان کے لئے سزاوار ہے کہ وہ عدل و داد کے تحت عمل کرے یا اس کے برخلاف ظلم قبیح اور ناپسندیدہ ہے اور انسان کو چاہیئے کہ اس سے دور رہے۔ یہ دوسری قسم کا مرحلہ کوئی ماورائے عقل کی دریافت کا مرحلہ نہیں ہے بلکہ یہ سب عقلی حقائق کا ادراک اور دریافت ہے۔ یہ ادراک براہ راست انسانی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ پہلی قسم کے ادراک کا ربط پوری کائنات سے ہے۔

مذکورہ بالا مطالب کی وضاحت ایک اور طریقہ سے کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ خوبی و بدی اپنے پہلے معنی یعنی کمال ونقص کے عنوان سے ایک آفاقی حقیقت ہے کیونکہ کمال، ہستی اور نقص، عدم کے آئینہ دار ہیں اور ایسی چیزیں ہیں جنھیں عقل کو درک اور ان سے آگاہی حاصل کرنا چاہیئے۔ ہاں ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی خوبی و بدی اپنے دوسرے معنی میں مثلاً پھول کی خوبصورتی یا بلبل کی صدا کی دلکشی، یہ بھی وہ حقیقتیں ہیں جن کو عقل فقط محسوس کرتی ہے۔ اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ خوبی و بدی کے تیسرے معنی یعنی خود فاعل یا عامل کا لائق مدح یا قابل مذمت ہونا معقولات کی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی یہ افعال عقل عملی کے دائرہ میں آتے ہیں نہ کہ عقل نظری کے۔ البتہ یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بہت سے مواقع ایسے بھی ہیں جہاں یہ دونوں قسمیں یعنی عقل عملی و عقل نظری باہم مخلوط ہو جاتی ہیں۔ دوسری لفظوں میں ایک قسم دوسری قسم کا سرچشمہ و منبع بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جہاں عقل عملی یہ درک کرتی ہے کہ "حصول علم اور تحقیق اچھی چیز ہے۔" تو اس ادراک سے پہلے عقل نظری کا حکم "علم کی خوبی" کے سلسلہ میں موجود رہتا ہے۔

اشاعرہ کے استدلال پر نقد و تبصرہ — اشاعرہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں چند دلائل پیش کرتے ہیں جن میں سب سے اہم حسب ذیل ہے۔

اشاعرہ کہتے ہیں کہ اگر خوبی و بدی عقلی مفاہیم ہیں تو کسی حالت میں بھی وہ ثابت اور پائیدار معیار نہیں بن سکتے۔ کیونکہ عقلوں کے فیصلے باہم تفاوت اور فرق رکھتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ کسی عمل کو اچھا اور بہتر جانتا ہے اور دوسرا گروہ اسی عمل کو برا اور ناپسند قرار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک عمل کسی عقل کی نظر میں بہترین شمار ہوتا ہے لیکن دوسری مرتبہ وہی عمل اسی عقل کے محسوسات میں اغراض و خواہشات وغیرہ کے زیر اثر قبیح اور ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] الاصول العامہ للفقہ المقارن ص ۲۸۵

اشاعرہ مندرجہ بالا استدلال سے دو نتیجے برآمد کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ خوبی و بدی کی تشخیص کے لئے عقل کو بروئے کار نہیں لانا چاہئے۔ عقل کے معیار کے ثابت و استوار نہ ہونے کی وجہ سے پے در پے غلط نتیجے برآمد ہوں گے۔ کیوں کہ عقل کے فیصلے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا خوبی و بدی کے معیارات کو شرع کی میزان پر تولتے ہوئے شارع کے اقوال و احکام کی بنیاد پر ہی اعمال کو خوبی و بدی کے صفات سے متصف کرنا چاہئے دوسرا نتیجہ اس استدلال سے یہ برآمد ہوتا ہے کہ مختلف حالات کے تحت افعال و اعمال کی دگرگونی اور حسن و قبح کی اضافیت و نسبیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خوبی و بدی ذاتی طور سے انسان کے اعمال کی صفت نہیں بن سکتی۔ نہ انسان کے اعمال ذاتی طور سے کسی حیثیت و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اعمال کی خوبی و بدی میں کوئی تغیر و تبدل نہ پایا جاتا۔ بلکہ خوب ہمیشہ خوب ہوتا اور بد ہمیشہ بد ہی رہتا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جو وضاحت دی ہے اس سے اس استدلال کا بطلان واضح ہے۔ کیونکہ اول تو یہ کہ عدلیہ و امامیہ گروہ عقلا و اہل خرد کے تمام فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اگر عقل، خالص عقلی فیصلہ صادر کرے تو وہ فیصلہ قابل قبول ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح عقل کے ادراک و محسوسات میں کسی طرح کا تفاوت و اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ اور اگر فرق پایا بھی جائے تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ عقل نے غیر جانب داری کے برخلاف کسی غرض یا تاثیر کے تحت ہی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ مثلاً اگر ایک سماج میں کالے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا صفات حسنہ و اخلاق کریمہ اور انسان کی عالی ظرفی شمار کیا جاتا ہے اور دوسرے سماج میں ان ہی کالوں کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھانا بھی معیوب، ننگ و عار اور اخلاقی پستی سمجھا جاتا ہے تو اس اختلاف فکر و نظر کو خالص عقلی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کے فیصلوں میں عقل ہزاروں قسم کے تاثرات، نفسانی ہوا و ہوس، نسلی تعصب اور کسی مخصوص سماج کے ساختہ و پرداختہ آداب و سنن سے متاثر ہوئی ہے۔

مزید برآں ہم اس بحث کے درمیان ذکر کر آئے ہیں کہ انسان کے افعال تین نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بعض افعال اپنی اچھائی یا برائی میں کامل و تام اسباب و علل کے حامل ہوتے ہیں مثلاً عدل و ظلم یعنی یہ بات محال ہے کہ کسی عمل میں عدل کا مفہوم بھی پایا جائے۔ ساتھ ہی وہ خوبی کے دائرہ سے الگ بھی ہو یعنی اسے بدی کے تحت بھی شمار کیا جائے۔ اسی طرح اس کا برعکس مفہوم یعنی ظلم جو بیک وقت بد بھی ہو اور خوب بھی ہو ناممکن ہے۔ انسان کے اس قسم کے افعال ذاتی طور سے خوبی و بدی کے حامل ہوتے ہیں۔

انسان کے افعال و اعمال کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ اپنی خوبی یا بدی سے متعلق علت و سبب تام نہیں رکھتے۔ بلکہ فلسفیوں کی اصطلاح میں خوبی و بدی کا "اقتضاء" رکھتے ہیں یعنی ان کا اصلی رجحان ان دونوں (خوبی و بدی) میں سے کسی ایک کی طرف ہوتا ہے اور جب تک کوئی مخالف عامل ان کی جہت میں تغیر و تبدل نہ پیدا کرے خود ان میں کوئی دگرگونی یا تبدیلی واقع نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی اصل صفت پر باقی و قائم رہتے ہیں۔ مثلاً سچ بولنا یا جھوٹ بولنا۔ درحقیقت یہ دونوں افعال علی الترتیب اپنی اصل حالت یعنی خوبی اور بدی پر ہی قائم رہتے ہیں لیکن جب سچائی دوسرے کو آزار و تکلیف پہنچانے کا سبب بن جائے تو ہرگز خوب و قابل ستائش نہیں ہو سکتی بلکہ قبیح و قابل مذمت ہو جائے گی۔ یا جھوٹ جو دراصل بد ہے، اگر اجتماعی مصلحت و منفعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بولا جائے تو یہی جھوٹ نیک اور اچھے افعال میں شمار کیا جائے گا۔

تیسری قسم کے افعال خود اپنے اندر کوئی ذاتی جہت و کیفیت نہیں رکھتے یعنی ماہیتاً نہ وہ خوبی سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ بدی سے۔ اب یہ اس بات پر منحصر ہے کہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے خوبی یا بدی کے عناوین میں سے کون سا عنوان ان پر منطبق ہوتا ہے تاکہ اسی کے مطابق اس کی تشخیص ہو سکے۔ ایسے بہت سے افعال ہیں مثلاً باتیں کرنا، آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا وغیرہ جن میں براہ راست نیکی یا بدی کا کوئی رجحان نہیں پایا جاتا۔ اور ان سے متعلق کوئی کلی رائے قائم کی جا سکتی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک عمل مختلف عنوانات کے تحت ایک دم برعکس صفات کا حامل قرار پائے۔ مثلاً یہ بات کبھی خود بخود طے نہیں کی جا سکتی کہ کسی کے گھر جانا اچھا ہے یا برا جب تک یہ عمل کسی مقصد کے تحت نہ قرار پائے یعنی انسان کسی کے گھر کس نیت و ارادے سے جا رہا ہے اگر وہ وہاں کسی کی ملاقات یا مزاج پرسی کے لئے جا رہا ہے تو یہ عمل خوب و مستحسن ہوگا۔ اور اگر تکلیف پہنچانے یا ظلم کرنے کے لئے جا رہا ہے تو یہ عمل بد، قبیح اور قابل مذمت شمار کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا بیان میں اشاعرہ کے استدلال کا جواب روشن اور واضح طور سے موجود ہے۔ کیونکہ انسان کے وہ افعال و اعمال جن میں خود ذاتی طور سے خوبی یا بدی پائی جاتی ہے نہ کبھی اختلاف نظر کا شکار ہوتے ہیں اور نہ کبھی ان میں کوئی تغیر یا تبدیلی ہی ہوتی ہے۔ ہاں فقط دوسری اور تیسری قسم کے افعال ذاتی عناوین کے انطباق کی وجہ تغیر پذیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس تبدیلی کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ افعال بشر کبھی بھی ذاتی خوبی و بدی کے حامل نہیں ہوتے۔ بلکہ جیسا کہ بیان ہو چکا پہلی قسم کے افعال خود اپنی ذاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دیگر افعال کے لئے معیار بھی قرار پا سکتے ہیں۔

عدلیہ و امامیہ کے استدلال پر نقد و تبصرہ ـــ عدلیہ و امامیہ کا گروہ مخالفین کے دلائل کو رد کرتے ہوئے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لئے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ اگر عقل، اچھائی یا برائی کو درک نہیں کر سکتی تو ہم کسی بھی صورت سے شارع مقدس کی طرف سے عاید کردہ اوامر و نواہی کی اطاعت کی منطقی توجیہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر ہم حسن و قبح عقلی سے انکار کردیں تو یہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ شارع کے احکام پر عمل کرنا واجب ہے؟

کیا اطاعت کا واجب ہونا شرعی ذریعہ سے ثابت ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو عقل کا حکم نہ ماننے کی بنا پر اطاعت کے وجوب کے لئے شرع کی طرف سے ایک حکم کی ضرورت ہوگی۔ اور ساتھ ہی پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ اس حکم کی اطاعت بھی شرعی حیثیت سے ثابت ہے یا نہیں؟ اس طرح ایک تسلسل قائم ہو جائے گا جو کبھی تمام نہ ہوگا۔

جبکہ عدلیہ کے نظریہ کے مطابق شرع کے احکام کے سلسلہ میں منطقی توجیہ موجود ہے کیونکہ اسی کی بنیاد پر شرع کی طرف سے اوامر و نواہی کے احکام صادر ہونے کے بعد عقل ان کی اطاعت کا حکم صادر کرتی ہے، اس لئے کہ عدلیہ کے عقیدہ کے مطابق خداوند عالم کی اطاعت ایسی چیز ہے کہ عقل خود مستقل طور سے اس کے حسن و خوبی کا حکم صادر کرتی ہے۔ اور اسے ترک کرنے کو برا سمجھتی ہے۔ لہذا شریعت کا اثبات کلی طور سے عقل کی میزان اور اس کے ادراک پر موقوف ہے۔ اور اگر یہ معیارات و ادراکات قبول نہ کئے جائیں تو خود شریعت کے اثبات کی اصل بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔

کیا عقل، اچھائیوں اور برائیوں کی گرفت کر سکتی ہے ـــ ہم عرض کر چکے ہیں کہ انسان کے افعال و اعمال خود ذاتی قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں اور شارع کی طرف سے کسی حکم کے بغیر بھی با وقعت ہیں۔ اب ایک دوسرا نزاعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر اعمال و افعال کی ذاتی وقعت و حیثیت کو قبول بھی کر لیا جائے تو کیا عقل ان اعمال کی اچھائی یا برائی درک بھی کر سکتی ہے۔ یا خود افعال کی قدر و قیمت اور حیثیت عقل کی پہنچ سے بالاتر ہے۔ اور شرع کو ہی ان کی نشاندہی کرنی چاہیئے؟ یہ نزاع اخباریوں اور اصولیوں کے درمیان ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ گذشتہ بحث کے اصل نقطہ کی وضاحت کے بعد اب یہ سوال اٹھانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ کیوں کہ خوبی و بدی کے تینوں معانی کے تذکرہ کے بعد ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ نزاع کا اصل نقطہ خوبی و بدی کے تیسرے معنی میں پایا جاتا ہے۔ اور اس تیسرے معنی میں خوبی و بدی کا مطلب صرف یہی ہے کہ عقل کے ادراک کے ذریعہ اس کے فاعل کی مدح

یا مذمت کی جاتی ہے۔ اب یہ سوال اٹھانا کہ آیا عقل افعال انسانی کی قدر و قیمت کو درک کر سکتی ہے؟ ایک غیر منطقی بات ہے۔ کیونکہ افعال کی قدر و قیمت سے مراد دراصل وہی عقل کا ادراک ہے نہ کوئی اور چیز ہم الگ سے یہ سوال اٹھا کر اس پر بحث و تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

حکم عقل و حکم شرع کے درمیان تلازم و ملازمت ۔۔۔ یہی وہ مسئلہ ہے جو صد فی صد اصول فقہ سے تعلق رکھتا ہے جبکہ بقیہ دوسرے مسائل علم کلام و اخلاق کا پہلو بھی رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس بحث کے لئے بڑی وسعت درکار ہے لیکن ہم مجمل طور سے اسے بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

افعال کی ذاتی حیثیت و وقعت ثابت ہو جانے اور عقل کے ذریعہ ان افعال کی خوبی یا بدی کو درک کرنے کا یقین پیدا ہو جانے کے بعد زیادہ تر اصولیین یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ حکم شرع اور ادراک عقل کے درمیان عقلی ملازمت و تلازم کا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اور اس رابطہ کی بنا پر ہم عقلی دریافت کے ذریعہ آسانی سے شرع کے احکام کو معلوم کر سکتے ہیں۔ ان علماء اصول کے درمیان فقط چند افراد مثلاً صاحب کتاب "الفصول فی الاصول"[9] افعال کی ذاتی حیثیت کو قبول کرنے کے باوجود عقل و شرع کے اس تلازم و رابطہ سے انکار کرتے ہیں اور بظاہر اصولیین میں کوئی گروہ اس نظریہ کا طرفدار نظر نہیں آتا۔

علم اصول کے تمام علماء و دانشور یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب بھی عقلا، بشرطیکہ وہ عاقل ہوں کسی موضوع پر متفق و متحد ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس موضوع میں کسی غیر عاقلانہ فکر کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ یہ بات بدیہی ہے کہ اس سلسلہ میں شارع کا نظریہ بھی وہی ہوگا۔ کیونکہ شارع مقدس بھی عاقل بلکہ خالق عقل ہے۔ اس استدلال کا نتیجہ کبرائے کلی ہے۔ جو ہمیشہ فقہی استدلال میں عقلی صغریات کے ساتھ موجود رہتا ہے:

كلما حكم به العقل حكم به الشرع

یعنی جہاں بھی عقل کسی چیز کا حکم دیتی ہے۔ بلاشبہ شرع بھی وہاں اس چیز کا حکم صادر کرے گی

فہرست جلد چہارم مجلۂ توحید